سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ

حصہ اوّل

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ رحمانیہ
اقرا سنٹر، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور

یعنی

سیرت شمس الاسلام

سیّدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ

حصہ اوّل

رئیس القلم حضرت مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ناشران

مکتبہ رحمانیہ ○ اردو بازار ○ لاہور ○ مکتبہ چراغ اسلام قذافی مارکیٹ اردو بازار لاہور

تقریب

للّٰہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

بانئ دارالعلوم شمس الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نوراللہ مرقدہ کی سوانح حیات کی تڑپ ہر ایک فرزندِ دارالعلوم کے دل میں مدتوں سے موجزن تھی، اور ہر بہی خواہِ دارالعلوم خواہشمند تھا کہ بانئ دارالعلوم کی سوانح حیات بھی دارالعلوم کی طرح نور افزائے دیدۂ و دل ہو لیکن کلّ امر مرہون بوقتہٖ کے اصول پر حضرت صاحب سوانح کی وفات کے پورے چھہتّر برس بعد تیاری سوانح کی یہ سعادت حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی ممدوح نے اپنے دل کی لگی سے یہ اہم کام حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی دام فیضہ کے سپرد کیا مولانائے ممدوح نے بطیب خاطر قبول فرماکر دو تین سال کی مدت میں کافی محنت و عرق ریزی سے اسے اختتام تک پہنچایا۔ اور آج ہم اس قابل ہیں کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات کے کمالات و سوانح زندگی کا یہ مقدس ذخیرہ انتہائی مسرت و ابتہاج کے ساتھ ملک اور قوم کے سامنے پیش کر دیں۔ ابتداءً یہ سوانح ذاتی طور پر حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے مولانائے ممدوح سے لکھوائی۔ لیکن میری گذارش پر اس سے اپنا حق اٹھا کر اسے شعبۂ نشر و اشاعت دارالعلوم دیوبند کے حوالہ فرما دیا اور آج ۲۵ رجب ۱۳۷۳ھ کی مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے اپنے متفقہ ریزولیوشن کی رو سے یہ کتاب ادارۂ نشر و اشاعت سے لیکر براہ راست دارالعلوم دیوبند کی ملکیت قرار دیدی ہے، اور اس سوانح کو اس کا واجبی حقدار قرار دیا ہے کہ اسے براہ راست دارالعلوم طبع اور شائع کرائے اور دارالعلوم ہی اس کا اور اس کے منافع کا حقدار ہو، جیسا کہ اس سوانح کی عظمت و شان کا اقتضاء تھا۔ مجلس کے ریزولیوشن کے الفاظ یہ ہیں۔

"حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کی سوانح عمری جو حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے تالیف فرمائی ہے اس کی مستحق ہے بلکہ اس کا حق ہے کہ اسے دارالعلوم دیوبند کی جانب سے طبع کرا کر شائع کیا جائے ..... اس کتاب کے جمیع منافع دارالعلوم کی ملکیت ہوں گے۔"

اندازہ کیجئے کہ صاحب سوانح تو حضرت نانوتوی رح ہوں اور سوانح نگار حضرت مولانا مناظر احسن صاحب جیسا اہلِ قلم، اہلِ دماغ اور اہلِ دل بزرگ ہو اور اس کا سب سے بڑا طلبگار اور کفیل دارالعلوم دیوبند ہو تو کتاب کی عظمت و افادیت کس درجہ کی ہوگی۔

ننگ اسلاف **حسین احمد غفرلہٗ**
۲۵ رجب ۱۳۷۳ھ

فہرست مضامین سوانح قاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

(از حضرت الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند)

اَلْحَمْدُ لِحَضْرَةِ الْجَلَالَة وَالنَّعْتُ لِخَاتَمِ الرِّسَالَة

امّا بعد

دنیا میں مذہبی اور قومی مقتداؤں کی سوانح نگاری کا معمول قدیم سے چلا آرہا ہے، اور ان میں بھی خصوصیت سے ایسی ممتاز و معتمد شخصیتوں کی سیرت و سوانح کا تحفظ اور بھی زیادہ ضروری سمجھا گیا ہے جو اپنے ذاتی اوصاف و کمالات کے ساتھ کوئی خاص نصب العین اور نظریہ لے کر اٹھی ہوں، اور اپنی دعوت و رہنمائی سے کسی قوم کا مرکز و مدار قرار پاگئی ہوں۔ ایسی شخصیتوں کی زندگی کا دنیا کے سامنے پیش کیا جانا محض اس لئے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ زندہ رہیں، بلکہ اس لئے کہ اُن کے زندگی بخش نصب العین سے قومیں زندہ رہیں۔ یعنی ایک رہنمائے ملّت کو مرنے کے بعد اس لئے زندہ نہیں رکھا جاتا کہ صرف اس کا نام باقی رہے بلکہ اسلئے کہ اس کا کام باقی رہے اور کام سے اسکی قوم کامیاب ہوکر باقی رہے۔ پھر ایسی شخصیت جبکہ کسی قوم کے ناہموار اور بگڑے ہوئے حالات میں سامنے آئے اور اپنی قریب المرگ قوم کو سہارا دے کر سنبھال لے جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ ایسی شخصیت کو مدام باقی رکھنا درحقیقت اس کے اصلاحی نقوش کو قائم رکھنا ہے تاکہ اُن سے اس جیسی شخصیتیں آئندہ بھی بنتی رہیں۔ پس ایسی منفرد شخصیت کا اس کے اصول و نظریات کے پردہ میں قائم رکھنا حقیقتاً شخصیت سازی کی فیکٹری قائم کرنا ہے۔ جس سے ڈھل ڈھل کر

شخصیتوں کے بنتے رہنے کا غیر منقطع سلسلہ قائم رہے، اور بہ یقیناً کسی ایک شخصیت کے قائم رکھنے سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔

حُجَّۃُ الاِسْلَام حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ بارہویں صدی ہجری کی ایسی ہی ایک فرد فرید اور ممتاز شخصیت ہیں جو نہ صرف اپنے منتخب علم و عمل، ممتاز اخلاق و کردار اور مثالی کمالات و فضائل ہی کے ساتھ ہندوستان کی سرزمین پر نمایاں ہوئے بلکہ ساتھ ہی ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر نصب العین بھی لے کر اُٹھے، جس میں مردہ دلوں میں روح پھونکنے اور قوم کے پژمردہ پیکر میں ازسرنو جان ڈالنے کی اسپرٹ موجود تھی، اور جس نے عملی طور پر بالآخر یہی تاثیر دکھلائی بھی۔ اور انہیں قوم کا ایک یگانہ روزگار ہیرو بناکر پیش کیا۔

حضرت مولاناؒ ایک مسیحائے ملّت کی حیثیت سے اس وقت نمایاں ہوئے، جب کہ ۱۸۵۷ء کے انقلابی دور میں ہندوستان اپنی آٹھ سو سالہ اسلامی عظمت و شوکت سے محروم ہو رہا تھا، اس کی سیاست کے ساتھ اس کی دیانت کے چہرہ پر بھی مردنی چھا چکی تھی، مشرق کا آفتاب مغرب میں ڈوب رہا تھا، ایشیائیت کے ساتھ اسلامیت بھی رخصت ہو رہی تھی، نئی شوکت کے زیر اثر اسلامی نظام کو مانع ترقی اور مخرب قومیت باور کرانے کی آوازیں خود مسلم حلقوں سے اُٹھنے لگی تھیں اسلامی علوم و فنوں پر سفاکانہ اور قاتلانہ حملے منظم طریق پر شروع ہو چکے تھے اسلامی تہذیب و شائستگی کی راہیں بے نشان اور ناقابل گذر بنائی جانے لگی تھیں، ملّی استقلال نصرانیت کی پُرفریب ڈپلومیسیوں کے دھاروں میں بہا چلا جا رہا تھا۔ غرض جبکہ ہندوستان کے دین و دیانت سیاست شوکت علم اخلاق خودداری اور خوداختیاری کا آفتاب گہن میں آچکا تھا اور صدیوں کی ایک اقتدار یافتہ قوم بے بسی اور بے کسی کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہچکولے کھا رہی تھی، اس وقت حضرت شمس العلوم شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ نہ صرف اپنے غیر معمولی علم و فضل اور زہد و اتقاء کے ساتھ بصورت آفتاب سرزمین ہند پر چمکے بلکہ

ایک ایسے علمی، اخلاقی اور ملی نصب العین کے ساتھ رونما ہوئے جس کے جوہری اجزاء ترویج کتاب وسنت، تہذیب اخلاق وکردار اور نظام استقلال ملی تھے۔ آپ کی مسیحا نفسی نے قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دیا۔ اُن کے لئے علم الٰہی کی روشنی کو ملک گیر ہی نہیں ہمہ گیر بنایا جس سے قوم ورطۂ حیرت سے نکلی۔ خلق وعمل کا میدان ہموار کیا، جس سے قوم کا تعطل اور جمود ختم ہوا، قومی خود ارادیت کا پرداز ڈالا جس سے بے بسی اور بے کسی اور احساس کمتری کے وساوس کافور ہوئے۔ غرض علم، اخلاق اور قدرتی تنظیم کے روشن نصب العین سے قوم کی ذہنیت میں روشنی آئی اور وہ اندھیریوں میں بھٹکنے کے بجائے روشنی کی فضاؤں میں گامزن ہونے کے لئے کمربستہ ہوگئے وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَانْقَذَكُمْ مِنْهَا

آپ کے نصب العین کا مرکزی نقطہ تعلیمی نہضت تھی جس سے علم الٰہی کی شعاعیں ہندو بیرون ہند پر پڑیں، پھر اس کے تحت آپ کی اخلاقی قوتوں کے تصرفات کا مرکز تربیت وارشاد تھا جس سے وجد وحال کے نقشے طالبوں کے دلوں میں جمے، آپ کے جوش عمل کا نقطہ اعلاء کلمۃ اللہ تھا جس سے جوش جاں سپاری مجاہدوں میں پیدا ہوا۔ آپ کی دینی مدافعت بیضۂ اسلام کی حفاظت اور تمام غیر اسلامی حملوں سے مذہبی سرحدات کی نگہداشت تھی جس سے دین کو قرار ہوا۔ آپ کی اندرونی طور پر عقلی آزادی اور فکری بے قیدی کے حملوں کی علمی مدافعت کا نقشہ آپ کی وہ فلسفیانہ تصانیف تھیں، جنہوں نے وقت کے فلسفہ پسند اور منطق نواز حلقوں میں ہلچل پیدا کردی۔ قوم کے عملی نقائص اور معاشرتی کمزوریاں رفع کرنے کے لئے آپ کے اصلاحی اقدامات کا خاکہ علمی مواعظ اور عملی تنظیم تھی جس سے بگڑی ہوئی معاشرت درست ہوئی پھر دفاع وتعمیر کے اس مرکب نصب العین کو بروئے کار لانے اور منظم طریق پر چلانے کے لئے آپ نے جو اہم ترین مرکزی مورچہ تیار کیا وہ دار العلوم دیوبند تھا جس میں آپ کے نصب العین کے تمام بنیادی نقوش مرتسم تھے جو ایک ایک کرکے ابھرے۔ اس یادگار زمانہ مرکز کے راستہ سے آپ نے ایک ایسا حکیمانہ نظام یادگار چھوڑا جس سے بیک وقت عالم، درویش، مجاہد اور صالح ومصلح افراد ڈھل ڈھل کر نکلتے رہیں اور کام چند شخصیتوں تک محدود

نہ رہ جائے۔ آپ کی اس مرکزی دعوت اور بنیادی دعایت نے نہ صرف نگاہوں اور دلوں کے رخ ہی آپ کی طرف پھیر دیئے بلکہ وقت کے نازک حالات کی ان چارہ سازیوں نے جو آپ کے وجود با جود سے نمایاں ہوئیں، عرب و عجم کی توجہات کو آپ کی ذات میں مرکوز بنا دیا، اور آپ ایک ایسے محبوب القلوب اور مرجع خلائق زعیم و رہنما کی صورت سے قوم میں نمودار ہوئے کہ لوگ جوق جوق آپ کے پیش کردہ نصب العین کے دامن میں پناہ لینے لگے۔ اس حقیقت کو حضرت والا کے جانشین خاص و تلمیذ ارشد مجاہد بے بدل حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نور اللہ مرقدہ نے اپنے جلیل القدر استاد کے مرثیہ میں بسلسلۂ ذکر بنار دار العلوم چند اشعار میں ظاہر کیا ہے۔ جن کا اضافہ اس مقدمہ کے لئے نور اور ناظرین کے لئے سرمایۂ سرور ہوگا۔ فرمایا

اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ اک مردِ خدا[1] — آرہا تیز روی سے ہے لئے ساتھ عَلَم
بے نیازی و توکل رُخِ روشن سے نمود — قطعِ منزل کے لئے دونوں قدم تیغِ دودَم
چہرۂ خوب سے انوارِ تواضع ظاہر — نظرِ نیک سے آثارِ غنا مُستفہم
کس بلا کی تھی نظر پڑتے ہی جس کے فی الفور — پڑ گئی جان میں جان آہی گیا دَم میں دَم
ناتوانوں کو ملا اس کی حمایت سے یہ زور — زینۂ بامِ ترقی پہ بڑھا سب کا قدم
تھی نرالی ہی کچھ اس مرد صفا کی سج دھج — تھے عجائب ہی کچھ اس شیرِ خدا کے دَم خَم
گاڑ کر اس نے عَلَم ایک ندا کی ایسی — یک بیک چونک پڑے اہلِ مَدَر اہلِ خِیَم
اس کی آواز تھی یا بانگِ خلیل اللّٰہی — کہہ کے لبیک چلے اہلِ عرب اہلِ عجم
عقل و انصاف کا جس سر میں ذرا بھی تھا اثر — ذوقِ علمی کا تھا جس سینہ میں تھوڑا بھی دَم
دین کا ذرہ بھی تھا قلب میں جس کے مُودَع — خیر کا شمّہ بھی تھا جس کے مقدر میں رقم
باندھ کر حیست کمر کہتے ہوئے نحن معک — چل پڑے جو بھی ملا اس یمِ رحمت کا قدم
اس مربی دل و جان کی مسیحائی سے — علمِ دیں زندہ ہوا جہل نے لی راہِ عَدَم

[1] مراد حضرت نانوتوی قدس سرہ [illegible]

ظلمت جہل وضلالت میں پڑے سوتے تھے — نورِ علمی سے ہوا اس کے جہاں صبح ودم
ابرِ علم وعمل وفضل کا بادل برسا — جس جگہ اس یم رحمت کا پڑا نقش قدم
جہل کو جب سبھی کہنے لگے اِخسأ اِخسأ — چلدیا پاؤں دبے چپکے سے بابخت دژم
علم کو لاکے ثریا سے ثریٰ پر رکھا — آنکھوں سے دیکھ لیا علّم مالم یعلم
دولت علم سے سیراب کیا عالم کو — قاسم علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اس کا عَلَم
اس کی آواز تھی بیشک دم عیسیٰ کی صدا — جس کے صدقے سے لیا علم نے دوبارہ جنم
طائرِ علم شریعت کے لئے یہ دیبن — برکتِ حضرتِ قاسم سے ہے مامون حرم
سلسلے علم کے امصار وقری تک جاری — اس کی ہمت سے ہوئے بل یہ ترا فیضِ اعم
جملہ اعیان واکابر تھے جلو میں اس کے — اسکی شوکت کو پہنچتی تھی کہاں شوکتِ جم

دارالعلوم دیوبند ہی کے اس ہمہ گیر تعلیمی نظام نے جو مدارس کی صورت میں ہندوستان بھر میں پھیلا، دہریت والحاد کے اس سیلاب پر بند لگایا جس کا دھارا مغرب کی جانب سے بہتا ہوا دیارِ ہند کے گھروں میں داخل ہوا اور چاہتا تھا کہ خشک وتر کو بہالیجائے۔ اگر لارڈ میکالے نے یہ کہہ کر اپنا نظام تعلیم ہندوستان میں پھیلایا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں، اور روح وفکر کے لحاظ سے انگریز۔ تو اس جلیل القدر شخصیت نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالتے ہوئے لسان حال سے یہ عملی صدا بلند کی کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندی وسندھی ایرانی وافغانی خراسانی وترکستانی ہوں۔ لیکن روح وفکر کے لحاظ سے عربیت واسلامیت کی روح سے معمور اور بھرپور ہوں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانان ہند کی قومیت کی تخریب کے لئے جو سیلاب تعلیمی رنگ سے میکالے کے روپ میں اٹھا، اور ان کی مذہبی تخریب کے لئے جو دھارا پادریوں کی منظم تبلیغ یا آریوں کے منظم پرچار کی صورت میں بہا اس پر بند لگانے کا کام صرف اس تعلیمی تحریک نے کیا جو حضرت نانوتوی قدس سرہ کے روپ میں نمودار ہوئی، اور

جس کو آپ نے شخصی رکھنے کے بجائے جمہوری اصول پر چلا کر ہمہ گیر بنایا اور دین کے سپاہی بنانے کی ایک ایسی مشین (دارالعلوم) تیار کر دی کہ فلسفہ و سیاست اگر سو برس تک بھی نئے نئے روپ میں سامنا کرتے رہے تو اس تعلیمی نظام کے کل پرزے اسے ہر رنگ میں پہچانتے اور دفع کرتے رہیں گے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

بہر حال ملک کے ان مایوس کن حالات میں حضرت قاسم العلوم نے اٹھ کر اسلام کی تعمیر و دفاع کیلئے اپنے آپ کو ظاہری و باطنی کمالات کے ساتھ پیش کیا۔ تلوار کے وقت تلوار سے، قلم کے وقت قلم سے اور زبان کے وقت زبان سے اسلام اور ملک و ملت کی نادر روزگار خدمت انجام دی۔ تعلیم کتاب و سنت کی ترویج کے لئے آپ کا مرکزی مورچہ دارالعلوم دیوبند تھا جس میں دنیائے اسلام کے ہر منطقہ کے طالبان علوم کا ہجوم ہوا۔ تربیت اخلاق کیلئے چھتہ کی مسجد آپ کی خانقاہ بنی جس میں طالبوں کیلئے حلقے جمنے لگے۔ اعلاء کلمۃ اللہ کے سلسلہ میں سنانی جوہر نمائیوں کیلئے شاملی کا میدان ہموار ہوا جس میں مجاہدین کے جتھے جمع ہوئے۔ دینی مدافعت کا میدان مباحثہ شاہجہانپور و رڑکی و میرٹھ بنا جس میں مذاہب کے جتھوں میں اسلام کی منادی کی۔ مذہبی اور مسلکی دفاع کیلئے حلقہ درس اور مجالس مذاکرہ منعقد کی گئیں جن میں مریضان فکر و نظر کو چشمۂ حق میں دیا جانے لگا۔ اثبات مذہب حق کے لئے فلسفیانہ علوم اور ایک نئی اور اچھوتی حکمت کی بنیاد ڈالی جس میں عقلی ہی نہیں حسی انداز میں اصول و فروع اسلام کو مضبوط اور مدلل طریق پر پیش کیا گیا، اور فکر و نظر کو اسی انداز میں ڈھال دینے کا دائمی راستہ ہموار کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی جامع زندگی اگر ہمہ وقت مسلمانوں کے ساتھ نمایاں رکھی جائے تو بلاشبہ وہ رکھی جانے کی مستحق ہے، اور اندازہ کیا جائے کہ اس کے اسوہ سے مسلمانوں کے حوصلے کہاں سے کہاں پہنچ سکتے ہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جہاں ہمارے لئے یہ حقیقت خوش کن ہے کہ اس دور آخر میں حضرت قاسم العلوم جیسی ہستی ہمیں ملی جن کے بارہ میں خود ان کے

شیخ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی شہادت ہے کہ
"ایسے لوگ صدیوں پہلے پیدا ہوا کرتے رہتے تھے کئی صدی بعد اللہ نے ایسی شخصیت پیدا فرمائی ہے۔"
اور ضیاء القلوب میں ارشاد فرمایا کہ
"قصہ برعکس ہو گیا میں ان کی جگہ ہوتا (یعنی مرید بنتا) اور وہ میری جگہ ہوتے (یعنی میرے پیر بنتے)۔"
وہیں یہ تلخ حقیقت بھی انتہائی تکلیف دہ ہے کہ ان کی سبق آموز زندگی اور سوانح حیات سے اب تک ہم محروم رہے۔

اس سے انکار نہیں (اور انکار کرنا کفران نعمت بھی ہوگا) کہ قاسمی علوم و اخلاق اور عزائم و افکار کا ذوق فی الجملہ قدیم اساتذہٗ دار العلوم اور مشائخ دیوبند کی مجلسوں تقریروں اور حلقہ ہائے درس کی بدولت مستفیدین کی ذہنیت میں پیوست ہوتا رہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ طریقہ غیر شعوری فیضان کا تھا جو شخصیات کے ذریعہ زبان بزبان اور عمل اور بعمل منتقل ہوتا رہا، کبھی بانتساب اور کبھی بلا انتساب۔ کوئی اصولی اور علمی یا باضابطہ افادہ کا انداز نہ تھا جس کا مقصد خالص اسی زندگی کا پہنچانا ہوتا۔ اور چونکہ اس کا مدار شخصیتوں کے قول و عمل یا اتفاقی بیان و تحدیث سے رہا۔ اسلئے نتیجہ یہ ہوا کہ شخصیات کے اٹھتے رہنے سے وہ فیضان بھی کم اور گم ہوتا رہا اور اس کے باضابطہ منضبط نہ ہونے سے سوائے اہل درس اور مجلس نشین یا صحبت یافتہ افراد کے عام علمی حلقے تک بھی اس سے مستفید نہ ہو سکے۔ بلکہ خواص کی حد تک بھی اگر یہ کہہ دیا جائے تو بے محل نہ ہوگا کہ قاسمی زندگی کا فیض تو کسی حد تک ہی پہنچا، لیکن زندگی سامنے نہ آئی۔

بہرحال اس قاسمی زندگی کا جامع اسوہ بھی عام نہ ہو سکا اور خاص طبقہ میں کسی حد تک غیر شعوری انداز سے آیا بھی تو وسائل فیضان کے اُٹھ جانے سے اس میں بھی کمی آگئی۔ پھر کم و بیش جو کچھ بھی آیا وہ بھی دوسروں کی زندگی کے سانچوں میں ڈھل کر آیا، جسے خالص اسوۂ قاسمی بھی کہنا

مشکل ہے اس لئے ضرورت تھی اور بہت پہلے سے تھی کہ محض رابطہ کے انداز سے نہیں بلکہ ضابطہ سے بھی اصولی اور عملی طور پر اس کے افادہ کی صورتیں پیدا کی جاتیں، اور حضرت قاسم العلوم کی زندگی ان ہی کی زندگی کہہ کر سامنے لائی جاتی، جو افسوس ہے کہ اب تک نہیں لائی جا سکی۔

اس کی یہ وجہ نہیں کہ اس زندگی کے منضبط کرنے کی طرف جماعت دیوبند میں سے کسی نے توجہ نہیں کی، یا مجلسی فیضان کو کافی سمجھ کر اس کے علمی انضباط کو غیر ضروری سمجھا گیا۔ نہیں بلکہ یہ زندگی بطون اوراق میں منضبط کی گئی اور بار بار کی گئی اور بہت سے سوانح نگار اہل قلم نے اس میدان میں عملی تگ و تاز کی لیکن واقعات کی رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں یہ انضباطی قوتیں اپنا کام کر رہی تھیں وہیں کچھ مخفی اور پس پردہ تخریبی قوتیں اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں جو اس زندگی کو ملک اور اہل ملک کے سامنے آنے دینا نہیں چاہتی تھیں اور جس حد تک اُن کے علی الرغم یہ زندگی بطور سوانح حیات سامنے آ گئی اور بطون اوراق میں منضبط ہو کر خواص و عوام میں پھیلی وہ ایک ناکافی تاریخ تھی جس سے شخصیت کی مکمل تصویر سامنے نہیں آ سکتی تھی۔ مثلاً اس سلسلہ میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد متصلاً سب سے پہلے جو سوانح مرتب ہوئی وہ حضرت اقدس جامع کمالات ظاہری و باطنی عالم ربانی عارف بعلام الغیوب مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ العزیز نے مختصر مگر جامع طریق پر تالیف فرمائی اور کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مؤلف کے صاحب سوانح سے بوجوہ مختلفہ قریب تر ہونیکے سبب یہ تالیف مشاہدات اور عینی بیانات پر مشتمل اور ساتھ ہی اپنی بلیغ عبارت اور جامع تعبیر کے سبب حضرت والا کی زندگی کے بہت سے گوشوں پر اشاراتی انداز میں حاوی ہے اور بقول حضرت مولانا مناظر احسن صاحب دام فضلہ، ایک کراماتی سوانح ہے جس میں ہر قسم کے واقعات کے اشارے ملتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ انتہائی اختصار اور کمال اجمال کے سبب سوانح نہیں بلکہ سوانح قاسمی کی ایک فہرست ہے جس سے واقعات پر عبور رکھنے والا بطور یادداشت کے فائدہ اٹھا سکتا ہے ایک بے خبر از سر نو اس سے واقعات پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رسالہ بطور سوانح عمری لکھا بھی نہیں گیا تھا، بلکہ میں نے اپنے

بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی وفات کے حادثہ سے خواص وعوام پر جو کوہِ غم آپڑا، جس سے ہر شخص پر ایک سکتہ اور تحیر کا عالم طاری تھا۔ قلوب کا کرب و اضطراب رفع نہیں ہوتا تھا جن میں مولانا محمد یعقوب صاحبؒ بھی شامل تھے تو مولانا نے لوگوں کی تسلی اور اپنے غم دل کو ہلکا کرنے کے لئے قلم برداشتہ یہ چند اوراق تحریر فرمائے۔ اس لئے اس کو ایک تسلی نامہ تعزیت شمار کہنا چاہیئے جس کا مقصد ہی زندگی کو منضبط کر کے پیش کرنا نہ تھا بلکہ اذکروا محاسن موتاکم کے تحت ذکر رفتگان سے اپنے دلوں کے بوجھ کو ہلکا کرنا تھا اس لئے اسے سوانح کہہ کر ناقص یا ناتمام کہنے کی جرأت کرنا ہی بے جا جسارت ہوگا۔ بلکہ وہ جس مقصد کیلئے تحریر کی گئی اُس میں کافی ہی نہیں بلکہ اس حد تک مکمل ہے کہ اس پر کسی اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اس لئے اسے سوانحعمری کے نقطۂ نظر سے دیکھنا ہی نہ چاہیئے۔ ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک جامع ذات کی جامع زندگی جو زندگیٔ اقوام کے اہم نصب العین کی علمی و عملی تفصیلات اپنے اندر رکھتی ہے، صرف ۳۲ صفحات میں ادا کی جا سکتی ہے؟ کوزہ میں کوزہ ہی کی قدر پانی سما سکتا ہے دریا نہیں سما سکتا۔ چنانچہ اس مختصر سوانح کا تذکرہ جب حضرت قطب وقت آیۃ من آیات اللہ مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی مجلس میں ہوا تو فرمایا کہ مولانا محمد قاسم کی سوانح مولانا محمد یعقوب کیا لکھ سکتے ہیں۔ دنیا میں اگر ان کی حقیقی سوانح حیات کوئی لکھ سکتا ہے تو وہ صرف میں ہوں۔ مگر میں کیا کروں آنکھوں سے معذور ہوں۔ پس یہ سوانح درحقیقت سوانح کا ایک اجمالی خاکہ اور تفصیلی سوانح کا ایک جامع متن ہے جس سے صرف باخبر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ عام حلقے کماحقہ اس سے پیاس نہیں بجھا سکتے۔

اسی لئے اس کے بعد متعدد بزرگ سوانح نگاری پر متوجہ ہوئے اور سوانح عمریاں کافی مواد کے ساتھ تفصیلی طور پر مرتب ہوئیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ صورت واقعات یہ ہے کہ سوانح عمریاں مرتب ہوتی رہیں اور کسی مخفی ہاتھ سے سامنے آنے سے پہلے ہی تلف بھی ہوتی رہیں۔

حضرت والد مرحوم نے فرمایا کہ میں نے حضرت نانوتوی رح کے وصال کے بعد بڑے مولانا (شیخ الہند رحمہ اللہ) سے عرض کیا کہ وقت کا تقاضا ہے کہ آپ دو چیزیں مرتب فرمادیں ایک قرآن شریف کا اردو ترجمہ اور اس کے مختصر تفسیری فوائد اور دوسرے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی سوانح حیات مولانا نے بڑی امنگ اور آرزو سے فرمایا کہ میں انشاء اللہ ضرور ان دونوں باتوں کی تعمیل کروں گا۔ اس پر والد مرحوم نے فرمایا کہ " پھر میں وہ تمام مواد آپ کی خدمت میں پیش کردوں جو میرے پاس موجود ہے ؟ فرمایا کہ ضرور "۔ اس پر میں نے ایک بہت بڑا پلندہ جس میں حضرت کے ملفوظات واقعات، علوم مکتوبات اور حالات کا ایک ذخیرہ بندھا ہوا تھا لاکر پیش کردیا۔ مولانا اس سے بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ اب سوانح مرتب کروں گا اور ان قلمی یادداشتوں سے میرا ذہن ان سیکڑوں واقعات کی طرف منتقل ہوگا جو میرے ذہن اور سینہ کی امانت ہیں۔ اب انشاء اللہ وہ سب سینہ سے سفینہ میں آجائیں گے۔ حضرت والد مرحوم نے فرمایا کہ مولانا اس پلندے کو مردانہ بیٹھک کی الماری میں رکھ کر خوش خوش گھر میں تشریف لے گئے۔ شاید ایک گھنٹہ بعد ہی جب اس ذخیرہ کو لینے کے لئے باہر تشریف لائے اور الماری کھولی تو وہ پلندہ غائب تھا۔ پھر ہر چند اسی جگہ جگہ تلاش کیا اور خاک تک چھان ماری مگر پلندہ نہ ملا۔ فرمایا کہ حضرت مولانا اور ہم سب پر اس درجہ اس کا صدمہ پڑا کہ جیسے حضرت نانوتوی کی وفات آج ہوئی ہے۔ اور عرصہ دراز تک یہ صدمہ اور حسرت ہم پر چھایا رہا آخر صبر کرکے بیٹھ رہے۔

حضرت والد مرحوم ہی نے فرمایا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی ایک مفصل سوانح جس میں کثرت سے علوم و معارف اور مختلف علمی حقائق کو اسباب حدوث اور واقعات کے ساتھ بیان کیا گیا تھا مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رح (تلمیذ خاص حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) نے مرتب کی جو تقریباً ایک ہزار صفحات تک پہنچ چکی تھی اور سلسلہ آگے بھی چلا۔ یہ گویا حضرت کی علمی سوانح تھی جس میں سیرت و کردار پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی تھی۔ چنانچہ اس کا تذکرہ مولانا فخر الحسن صاحب کے بعض اعلانات میں بھی ملتا ہے جس کی طباعت کا وعدہ بھی، طباعت وکتابت اور کاغذ کی سہولت

بیسر آجانے پر کیا گیا تھا حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ مولانا فخر الحسن اپنی خانگی مجبوریوں سے گنگوہ کی سکونت ترک فرما کر کانپور منتقل ہوئے، مکان کا ایک حصہ اپنی کتابوں کے لئے مخصوص کر لیا۔ اسی میں یہ سب قلمی یادداشتیں بھی رکھ دیں۔ اس کتب خانہ کی ترتیب کے چند دن بعد ہی ان کے کتب خانہ کو آگ لگائی گئی۔ جس سے سارا کتب خانہ جل کر راکھ ہو گیا اور اسی میں وہ سوانح کا مسوّدہ بھی ضائع ہو گیا۔

حضرت والد مرحوم ہی نے یہ بھی فرمایا کہ مدراس کے ایک عالم حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے پاس بغرض بیعت و تعلیم حاضر ہوئے اور انہوں نے مجلس نشینی کے ساتھ ہی حضرت کے ملفوظات اور متعلقہ حالات قلمبند کرنے کا بھی التزام کیا اور مسلسل دو برس دیوبند قیام کر کے کم و بیش پندرہ سو صفحات کا ایک عظیم تاریخی اور علمی ذخیرہ جمع کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ حضرت کے وصال کے بعد میں نے خطوط کے ذریعہ ان کا پتہ چلانا چاہا۔ اور جب مراسلت سے پتہ نہ چلا تو مدراس کا سفر اسی ضرورت سے کیا۔ لیکن ان مسودات کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بجز اس کے کہ ان سے کچھ لوگ اس ذخیرہ کو لے گئے اور پھر پتہ نہیں دیا۔ غرض اس طرح یہ ذخیرہ بھی گم یا گمنام ہو گیا اور اس کا تذکرہ ہماری حسرت و یاس بڑھانے کے لئے باقی رہ گیا۔

ابھی چند سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ مجھے جناب قاری محمد عتیق صاحب مجوّد دارالعلوم کے پاس سے حضرت کی سوانح کا ایک ناقص مسودہ من حیث لا یحتسب دستیاب ہوا، جو ص۲ سے ص۵۶ تک مسلسل ہے اور درمیان کے کچھ منتشر اوراق مسودہ کے بیچ میں سے نکلے۔ اس میں فہرست مضامین کے اوراق مکمل ملے جن میں ۲۴ عنوانات اصولی قائم کئے گئے ہیں اور ہر اصولی عنوان کے نیچے ضمنی عنوانات کی کافی تعداد ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سوانح سوانح کے اصول پر نہایت مکمل طریقہ سے مرتب کی گئی ہے۔ سنِ ولادت سے لیکر سنِ وفات تک مکمل حالات بیان ہوئے ہیں جیسا کہ عنوانات سے واضح ہوتا ہے حتیٰ کہ وفات کے عنوان کے نیچے مرض وفات تک کی توضیح۔ نوعیتِ علاج معالجین کی فہرست۔ انداز علاج۔ حالاتِ نزع و وفات بعد وفات بشرات و منامات

نمازِ جنازہ کی تفصیلی کیفیت جنازہ پر غیر معمولی ہجوم کے واقعات۔ تعزیت کنندوں کا مہینوں ہجوم، مراثی اور قصائد تعزیت و تواریخ۔ اخبارات میں مضامین تعزیت وغیرہ اتنے ضمنی عنوانات صرف ایک عنوان وفات کے نیچے درج ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر مکمل صورت میں یہ سوانح مرتب ہوئی ہوگی۔ درمیانی اوراق میں بعض صفحات پر ص ۱۵۰ کا ہندسہ پڑا ہوا ہے اور بعض پر اس سے بھی آگے کا۔ جس سے واضح ہے کہ اس سوانح کی ضخامت بھی کافی ہوگی۔ سوانح نگار عموماً مشاہدات بیان کرتا ہے۔ اکثر واقعات میں اپنی شرکت بھی ظاہر کرتا ہے۔ حتیٰ کہ خانگی معاملات درج کرتے ہوئے ان میں بھی اپنا معتمدانہ دخل ظاہر کرتا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ سوانح نگار حضرت صاحب سوانح کے مزاج میں دخیل اور بارسوخ فرد ہے۔ مگر افسوس کہ سوانح کا اول و آخر ندارد ہے جس سے مؤلف کا پتہ چل سکتا۔

مگر اس میں بھی حیرتناک بات یہ ہے کہ ص ۵۶ سے آگے جہاں سے عنوانات فہرست میں جہاد اور اجتماعی خدمات کا ذکر ہے وہیں سے مسودات غائب ہیں۔ یعنی ذاتی سیرت تو ص ۵۶ تک فی الجملہ آگئی ہے مگر خدمات و معاملات کا حصہ غائب ہے۔ اس حصہ کے منتشر اور پھٹے ہوئے کچھ اوراق ملے جن میں حضرت کا جنگ روم و روس کے سلسلہ میں ترکوں کے لئے چندہ کرنا۔ خلافت اسلامیہ ترکی سے مسلمانان ہند کو وابستہ رکھنے کی مساعی۔ دارالعلوم کے احاطہ میں طلبہ کو فنون سپہ گری سکھلانا۔ دارالعلوم میں محکمۂ قضاء قائم کر کے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ کو قاضی بنانا اور مسلمانوں کے معاملات کو شرعی اصول پر طے کرنے کی صورتیں پیدا کرنا وغیرہ مذکور ہے مگر ناقص انداز میں، کوئی صفحہ ندارد ہے کوئی پھٹا ہوا ہے، کوئی ناقابل انتفاع ہے۔ بمشکل آئی گلاس سے کچھ پڑھا جاتا ہے۔ بہرحال اس سوانح کے چند اوراق ملنے سے جہاں خوشی ہوئی وہیں دو چند اوراق نہ ملنے سے قلق و صدمہ بھی ہوا۔

ان واقعات سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت والا کی سوانح نگاری پر کافی توجہ کی گئی اور ایک نہیں کئی کئی سوانح عمریاں کئی کئی اندازوں سے کئی کئی مصنفوں نے مرتب کیں۔ وہیں یہ بھی

اندازہ ہوتا ہے کہ ان سوانحات کے مسودوں کا مسلسل ضائع ہوتے رہنا اور وہ بھی خصوصیت سے مخصوص گوشہ ہائے زندگی کا۔ جو اس زندگی کی روح اور عطر زندگی کہلائے جانے کے مستحق تھے۔ محض اتفاقی نہیں۔ بخت واتفاق کا قضیہ ایک آدھ بار ہو سکتا ہے لیکن مسلسل اور ایک ہی انداز سے یہ اضاعتِ اوراق پتہ دیتی ہے کہ کوئی مخفی ہاتھ ان مسودات کے پیچھے لگا ہوا تھا، اور منصوبہ یہ تھا کہ یہ زندگی سامنے نہ آنے پائے۔ یہ ہاتھ کون تھا، اور کس کا تھا؟ اگر کسی ایک ہی جگہ اضاعت کے یہ سب واقعات پیش آتے تو کسی ایک مقامی گروہ یا شخص کی طرف انہیں منسوب کیا جا سکتا تھا، لیکن ایسے متعدد مواقع میں حوادث کا پیش آنا جن میں مشرق و مغرب کا فرق تھا۔ کوئی دیوبند میں کوئی مدراس میں اور کوئی کانپور میں، اس کی واضح دلیل ہے کہ اضاعت مسودات کے درپے کوئی منظم جماعت تھی جو ہر جگہ کی خبریں رکھتی اور ہر وقت اپنا تخریبی مشن انجام کو پہنچاتی تھی۔ بظاہر یہ درپے جماعت وہی ہو سکتی ہے جس کے درپے خود حضرت والا تھے۔ جن کی تعلیمی عدالتی تمدنی معاشرتی اور سیاسی شوکت انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہی ان کی اور ان کے آثار کی تخریب کو موضوع بنا سکتے تھے اور جو گروہ حضرت والا کی حیات میں خود ان کی ذات ہی کی نگرانی ضروری سمجھتا تھا، وہی ان کی وفات کے بعد ان کے آثار کی نگرانی بلکہ انہیں مٹا دینے کی فکر کر سکتا تھا کیونکہ حضرت کی وفات کے بعد ان کے یہ علمی اور اصلاحی آثار ہی ان کی قائم مقامی کر سکتے تھے، اور ظاہر ہے کہ اسی طاقتور گروہ کے اعضاء و اجزاء من و تو میں ملے ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے، جو ہر وقت اور ہر جگہ اپنا کام بسہولت انجام دے سکتے تھے۔

بہر حال اس صورت حال کو سامنے رکھ کر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت والا کے پسماندوں نے ان کے آثار کو باقی رکھنے کی فکر نہیں کی۔ البتہ اس حد تک ہمیں اپنی تقصیر کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ یہ تمام مساعی حضرت والا کے بلا واسطہ تلامذہ اور مستفیدین کی طرف سے وفات سے قریب العہد دور میں رونما ہوئیں جس پر تقریباً پون صدی کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس پچھتر سالہ دور میں جماعتی حیثیت سے یقیناً کوئی اقدام پھر اس سلسلہ میں نہیں کیا گیا۔ بجز اس کے کہ اکابر کی مختلف مجالس میں

حضرت والا کے تذکرے حاضرین کے سامنے کسی وقتی محرک سے ہو جاتے تھے جن کو کسی نے یاد کر لیا اور کسی نے فراموش کر دیا۔ تاہم اسی میں کسی نے اپنے ذاتی جذبہ اور شوق سے ان منتشر واقعات کو قلمبند کر لیا تو وہ بطون اوراق میں محفوظ ہو گئے ورنہ دماغوں کی لوح محفوظ میں محفوظ رہ کر عالم بالا کی لوح کی طرف رجوع کر گئے۔

ظاہر ہے کہ اب جبکہ اس قرن کے افراد طبقاتی حیثیت سے ختم ہو چکے ہیں کوئی باقی بھی ہے تو علم میں نہیں اور علم میں ہے تو وہ ان احوال کا حافظ و مبصر نہیں۔ حضرت والا اور ان کے احوال و سوانح کو بالمشافہ مشاہدہ کرنے والے موجود نہیں۔ خود حضرت کے وصال پر ہی ۶۷ برس گذر چکے ہیں۔ سوانح کے سلسلہ میں جو ذخیرہ بھی مل سکتا ہے وہ کاغذی ہی ہو سکتا ہے۔ سماع و مشاہدہ کا اب سوال ہی باقی نہیں۔ سو اس کاغذی ذخیرہ کے سلسلہ میں جس حصہ سے استفادہ کیا جا سکتا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) مختصر سوانح قاسمی۔ مؤلفہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ (مطبوعہ)

(۲) مختصر حالات زندگی۔ جمع کردہ مولانا منصور علی خاں صاحب مرادآبادی تلمیذ رشید حضرت نانوتوی رح بضمن رسالہ مذہب منصور مؤلفہٗ خود۔ (مطبوعہ)

(۳) الکلم الطیب، متفرق واقعات۔ مؤلفہ احقر راقم الحروف۔ جو اپنے مختلف بزرگوں سے سنکر اس رسالہ میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ (مطبوعہ)

(۴) امیر الروایات۔ مختلف واقعات جمع کردہ مولانا حبیب احمد صاحب کیرانوی مرحوم از امیر شاہ خان صاحب مرحوم۔ (مطبوعہ)

(۵) اشرف التنبیہ مختصر احوال از حضرت حکیم الامۃ تھانوی قدس سرہ العزیز (مطبوعہ)

(۶) سوانح مخطوطہ۔ مؤلف کا پتہ معلوم نہیں ہوا مگر واقعات مستند اور بزرگوں کے شواہد سے مؤیَّد ہیں۔ (مخطوطہ)

(۷) منتشر احوال ووقائع - از قصص الاکابر لحصص الاصاغر از حضرت حکیم الامۃ تھانوی قدس سرہٗ (مطبوعہ)

(۸) استطرادی واقعات - جو کتب ذیل میں جا بجا ملتے ہیں - الہدیۃ السنیہ مولفہ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمہ اللہ - مواعظ از حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ - حیات شیخ الہندؒ از حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ (مطبوعات) تذکرۃ الرشید از مولانا عاشق الٰہی صاحب مرحوم جس میں ضمناً کچھ واقعات آ گئے ہیں - سوانح خود نوشت حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی تصانیف سے اُن ہی کی عبارات وکلمات سے جو سوانح جمع کی ہیں ان کا مجموعہ مگر ناتمام (مطبوعہ بہ رسالہ دارالعلوم)

(۹) یادداشت واقعات - جو احقر نے اوقات مختلفہ میں خاندانی بزرگوں سے پوچھ پوچھ کر یا سن کر قلمبند کر لئے - (مخطوطہ)

(۱۰) ذیلی مضامین - جو مختلف اخبارات میں آئے جیسے سر سید نے تہذیب الاخلاق میں بذیل تعزیت حضرت کے واقعات کی طرف اشارے کئے - (مطبوعہ)

(تلك عشرة كاملة)

ظاہر ہے کہ ان منتشر مطبوعہ اور مخطوطہ یادداشتوں سے واقعات کو چن کر ترتیب دینا اور انہیں ایک سوانح کی صورت سے سامنے لانا آسان کام نہ تھا - پہلے میں نے خود ارادہ کیا کہ اس کیلئے وقت دوں لیکن اول تو تاریخ نگاری کی واقعی مجھ میں اہلیت بھی نہ تھی - سلیقہ تو بجائے خود ہے اور پھر دارالعلوم کی اہم ذمہ داریوں کے ہجوم میں وقت نکالنا بھی بس کی بات نہ تھی - اس لئے علمائے جماعت میں نگاہ دوڑائی - حضرت مولانا عمادالدین صاحب شیر کوٹی مدفیوضہم پر نگاہ پڑی، مراسلت کی - مولانا نے آمادگی ظاہر فرمائی اور اُن کے وعدہ پر یہ مسودات ان کی خدمت میں جالندھر ارسال کر دیئے گئے ممدوح نے ابتدا کے دو تین ورق لکھ کر بطور نمونہ میرے پاس بھیجے، اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد قلت فرصت اور قلت بضاعت کا عذر کر کے مسودات واپس فرما دیئے - آمادگی اور عزم کے بعد

بیک دم ترک عزم کی کوئی وجہ وجیہ ذہن میں نہ آئی۔ مگر چند ہی روز کے بعد مسودات کی واپسی من اللہ ایک انعام خداوندی ثابت ہوئی۔ اِدھر مسودات واپس آئے اور اُدھر دس بیس ہی دن کے بعد ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں جالندھر کے مسلمان وطن سے بے وطن ہو کر پاکستان جانے پر مجبور ہوئے جن میں مولانا ممدوح بھی بصد مصائب و مشکلات جان بچا کر لاہور پہنچ گئے۔ اُن کا مکان لوٹ لیا گیا اور وہ کتب خانہ جلا دیا گیا جس میں یہ مسودات رکھے گئے تھے۔ اب واضح ہوا کہ حق تعالیٰ نے ان کے قلب کو سوانح نویسی سے ہٹا کر مسودے واپس کر دینے پر گویا اس لئے مجبور فرمایا تھا کہ ان مسودات کو بچانا اور باقی رکھنا منظور تھا۔ ورنہ پہلے مسودات کی طرح یہ مسودے بھی ہمارے ہاتھ سے جا چکے تھے لیکن اس صورت حال کے بعد سوانح کی تدوین و تالیف کا مسئلہ پھر بدستور اپنی جگہ قائم اور میرے لئے موجب خلجان بنا رہا۔

آخر کار تالیف سوانح کے لئے برخودار مولوی حافظ قاری محمد سالم سلمہ کی تحریک اور توجہ دلانے پر دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز فرزند ملک کے مشہور فاضل یگانہ، انشاء و ادب عابر سبیل تاریخ بارع طریق تصنیف عارج ادج روایت شناور بحر درایت سلالۂ آل رسول مخدوم و محترم حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی دام تفارہ کا اسم گرامی سامنے آیا جسے میں رحمانی خطرہ اور الہامی داعیہ سمجھتا ہوں جو برخودار موصوف کے ذہن میں آیا اور اپنے کو عَلَى الْخَبِيْرِ سَقَطْتَ کا مصداق پایا گویا ان کے ایک مایۂ ناز قاسمی فرزند ہونے کی حیثیت سے میں اپنے آپ کو اس کا حقدار سمجھتا تھا کہ اس بارہ میں ان پر اخلاقی دباؤ ڈال کر انہیں مجبور کروں لیکن ادباً گذارش احوال واقعی کو کافی سمجھا اور التماس نامہ بھیج دیا۔ جواب آنے پر حیرت اور حیرت کے ساتھ مسرت ہوئی کہ گویا وہ بھی رضا و تسلیم کے لئے تیار ہی بیٹھے تھے، پہلے ہی مراسلہ پر جواب موصول ہوا کہ میری انشاء اور علم نگاری کی ابتداء بھی القاسم[1] ہی سے ہوئی تھی، کیا عجب ہے کہ انتہا بھی القاسم (یعنی حضرت قاسم العلوم کی سوانح نگاری) ہی پر ہو جائے۔

---

[1] مولانا بعد فراغ دارالعلوم ہی میں روک لئے گئے اور رسالہ القاسم دارالعلوم کے مدیر کی حیثیت سے عرصۂ دراز تک القاسم کی قلمی خدمت فرماتے رہے۔ محمد طیب غفرلہٗ

(متعنا اللہ بطول حیاتہم)۔

طلب وقبول کے اس توافق کو منجانب اللہ سمجھتے ہوئے میں نے تمام مذکورہ مسودات اور متعلقہ اوراق مولانا کی خدمت میں روانہ کردیئے اور ممدوح نے بکمال توجہ و اعتنا یہ اہم کام شروع فرمادیا جو پوری جماعت پر بطور ایک واجب الاداء قرضہ کے عائد تھا اور جس کی کئی ضخیم جلدیں ایک ہزار صفحات سے زائد پر آج نور افزائے دیدۂ ودل ہیں جن میں سے پہلی جلد ذاتی و عائلی حالات، دوسری جلد خدمات و اصلاحات اور تیسری جلد افکار و نظریات پر مشتمل ہے۔

تالیف اور مؤلف کے بارہ میں کچھ لکھنا مادح خورشید مداح خود است کا مصداق ہے۔ مولانا کے تفقہ و کمال باریک بینی نکتہ آفرینی سنجیدہ کلامی عذوبہ بیانی اور فقہ سنجی سے کون ناواقف ہے، جو کچھ لکھ کر انھیں متعارف بنایا جائے۔ اس سوانح کی نوعیت اور اس کے روایتی و درایتی وزن کا اندازہ سوانح نگار کی مشہور زمانہ ہستی کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ مجھے اس سوانح کی بہت سی خصوصیات مثل اتقان روایت ایقان درایت نخاط استنباط اور واضح تعلیل و قیاس وغیرہ کو سراہنا نہیں اور وہ میری ستائش سے بالاتر بھی ہیں۔ مجھے تو اس سوانح نگاری کی ایک اہم اور امتیازی خصوصیت پر بطور بیان واقعہ نہ بطور مدح سرائی روشنی ڈالنا ہے اور وہ یہ کہ

یہ سوانح یقیناً بعد از وقت لکھی جارہی ہے جب کہ واقعات متعلقہ جاننے اور مشاہدہ کرنے والوں کا دور ختم ہوچکا ہے بجز اس کے کہ لکھی پڑھی جزئیات کو کسی اچھی ترتیب سے جوڑ دیا جائے۔ اضافۂ معلومات کی کوئی صورت نہیں اور جو لوگ معلومات اپنے سینوں میں لئے ہوئے رہگزائے عالم جاودانی ہوچکے ہیں۔ اُن کے یا ان کی معلومات کو لوٹا لانے کی کوئی سبیل نہیں۔ لیکن حق تعالیٰ نے اس فقدان معلومات کا تدارک مولانا ممدوح کے دماغ کی اعلیٰ افتاد سے کرادیا۔ گویا اس ناقص مواد کی صورت میں سوانح نگاری کے لئے مولانا کا انتخاب اسی لئے مقدر فرمادیا کہ ان روایتوں کی قلت کی تلافی ان کی مخصوص و ممتاز درایت سے کرائی جائے اور وہ یہ کہ واقعات میں سے واقعات پیدا کرلینا اور ایک جزئی واقعہ سے اس کا اندرونی کلیہ نکال کر بقیہ جزئیات واقعہ کا پھر اس سے استنباط

کر لینا اور پھر قرائن وشواہد سے انہیں مشیّد اور مضبوط کر کے دکھلا دینا مولانا ہی کی ایک بے مثال خصوصیت ہے منصوص حکم میں سے فقہی طور پر بذریعہ علت جامعہ کسی استنباطی حکم کا نکال لانا باب استنباط واجتہاد کا ایک عام معمول اور مقررہ طریق ہے۔ لیکن واقعہ میں سے واقعہ نکال لینا اور روایت میں سے روایتی واقعہ استخراج کر لینا بلاشبہ تاریخی درایت کا ایک عجیب وغریب شاہکار ہے جو ہر ایک دماغ کو نصیب نہیں۔ اس دور میں یہ صرف مولانا ہی کی خصوصیت نظر آتی ہے۔ مولٰنا ممدوح نے اس سوانح میں محض واقعہ نگاری اور حوادث نویسی کا کام نہیں کیا جو بقول ان کے محض بہی کھاتہ کا حساب کتاب ہے کہ اعداد وشمار لکھ کر آخر میں میزان لگا دی جائے۔ بلکہ حاصل شدہ معلومات میں سے غور وتدبر کی راہ اور فکر ونظر کی مدد سے کلیات پیدا کر کے کلی ہی رنگ میں ان جزئیات معلومہ کو سپرد قلم کرنا جس سے زندگی جزوی ہونے کے بجائے اصولی نظر آئے محض مورخ کا کام نہیں بلکہ فقیہ فی التاریخ کا کام ہے۔ پس وہ جزئیات جو روات کے فقدان سے مفقود ہو چکی تھیں مولانا کے کلیت پسند قلم نے انہیں بطون غیب سے کھینچ کر نکالا اور فقدان روایت کا وجدان درایت سے تدارک فرما دیا۔

مجتہدین دین کا رتبہ عام فقہاء اور محدثین سے نیابت رسول میں اسی لئے بالاتر ہے کہ رسول شرائع اصلیہ لاتے ہیں اور یہ مجتہدین ان میں سے شرائع وضعیہ نکال کر ظاہر کر دیتے ہیں۔ جس سے انبیاء کا دین مفصل اور مدلل ہو کر ایک مرتب گلدستہ اور باغ وبہار نظر آنے لگتا ہے جس میں ہر رنگ کے پھول اپنی اپنی جگہ نصب اور کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بالکل اسی طرح مورخین اگر جزئیات معلومہ پیش کرتے ہیں تو فقیہ فی التاریخ اصولی رنگ سے ان جزئیات اصلیہ میں سے جزئیات فرعیہ نکال کر تاریخ کے خالی گوشوں کو پر کر دیتے ہیں جس سے روایت اور راویوں کے فقدان کا قرار واقعی تدارک ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ اگر اس سوانح کے روایتی مواد کے ساتھ مولانا کی درایت کا مواد شامل نہ ہوتا تو یہ سوانح ناقص اور چند جزئیات میں محدود ہو کر رہ جاتی اور اصولی تو کسی طرح بھی نہ بن سکتی جو اس کا واقعی مقام تھا۔ پھر مولانا کا یہ درایتی مواد محض استنباط جزئیات

تک ہی محدود نہیں رہا۔ بلکہ ممدوح نے معلوم جزئیات کو بھی ترتیب ایسے اصولی اور کلیاتی رنگ سے دیا ہے جس سے ان جزئیات کے پردہ میں بھی ساری سوانح اصولی نظر آنے لگی ہے اصل یہ ہے کہ مولانا ممدوح نے کمال فراست سے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی طبیعت اور فطری رفتار کو بھانپ لیا ہے کہ وہ خلقۃً اصولی ہے اور ان کی زندگی کا ہر گوشہ اصولیت و ہمہ گیری کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اس لئے انہوں نے حضرت والا کے ہر شعبۂ زندگی کی جزئیات کو اس کے متعلقہ اصول سے منسلک کر کے اس پرواز پر اٹھایا ہے کہ منقول جزئیات تو اپنے اپنے اصول پر چسپاں ہوتی چلی گئی ہیں اور غیر منقول جزئیات اس اصولی راہ کے تقاضا سے ذہنوں میں خطور کرتی چلی گئی ہیں اور اس طرح منقول سے غیر منقول واقعات تک پہنچنے کا راستہ بھی ہموار ہو گیا اور منقول اور غیر منقول جزئیات نے اصولی رنگ بھی اختیار کر لیا۔ پس مولانا نے تفریعی جزئیات ہی پیش نہیں کیں بلکہ تفریع کا راستہ بھی تیار کر دیا ہے جس سے یہ فرعیات ذہنوں میں از خود گھومنے لگتی ہیں اور زندگی کے خالی گوشے بھی متعلقہ جزئیات سے خود بخود بھرے ہوئے متخیل ہونے لگتی ہیں۔ جس سے حضرت والا کی زندگی کا اصلی اور مکمل رخ اور صحیح نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر حضرت والا کی زندگی کے ان سارے جزئی واقعات کا مکمل نقشہ خالص روایات سے بھرا جاتا تو وہ بغیر ان تمام شخصیتوں کے مجتمع ہوئے جو ان واقعات سے متعلق تھیں یا بغیر ان کی اپنی اپنی روایتیں جمع کئے جو ان واقعات پر مشتمل تھیں یہ نقشہ نہیں بن سکتا تھا۔ لیکن عادۃً یہ ممکن کب تھا۔؟ اس لئے سوانح کے غیر روایتی حصہ کی تکمیل کا راستہ بجز حاضر دماغ مؤلف کی اصول پسندی، کلیہ آفرینی اور تفریع نمائی کے دوسرا نہ تھا۔ پس یہ سوانح اپنی جمع و ترتیب میں ہر طرف سے ہر پھر کر ایسے ہی دماغ کی متلاشی تھی جو اس کے روایتی حصہ کو اپنے درایتی حصہ سے پورا کر سکے اور پھر روایتی اور درایتی جزئیات کو اصول کا جامہ پہنا کر اس طرح پیش کرے کہ اصولاً زندگی کا ہر رخ جزئیات سے بھرپور دکھائی دینے لگے۔ الحمد للہ کہ یہ دماغ بہار کے ایک چھوٹے سے موضع گیلانی میں ایسے دستیاب ہو گیا، اور سوانح کے

اس روایتی مواد کا یہ تقاضا خدا نے پورا کر دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ سوانحات کے مسودات کے مسلسل تلف وضیاع کا زخم موجودہ مختصر سوانح کی روایتی تکمیل سے انشاء اللہ بھر جائے گا۔ اور اس لئے سوانح نگاری کے سلسلہ میں مولٰنا کی شخصیت کا انتخاب من جانب اللہ ایک الہامی واقعہ نظر آتا ہے۔

حق تعالیٰ مولانا ممدوح کو ہم سب خدام قاسمی کی طرف سے جزاء خیر عطا فرمائے اور اُن کے مراتب میں اس سے زیادہ ترقی فرمائے جتنی کہ اس سوانح سے مستفید ہونے والوں کو قاسمی نقش قدم پر چل کر ملنے والی ہے۔ وماذٰلك علی اللہ بعزیز۔

سوانح کا مسودہ موصول ہونے پر ضرورت سمجھی گئی کہ ایک بار اس کی خواندگی کر لی جائے تاکہ کتابت وغیرہ کے سلسلہ میں کوئی فروگذاشت ہو گئی ہو تو اسے درست کر دیا جائے۔ چونکہ کتاب اہم تھی اس لئے بجائے کسی ایک شخص کو یہ کام سپرد کرنے کے ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔ جس کے تین ارکان تجویز ہوئے۔ حضرت الاستاذ العلامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی استاذ دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب صدر شعبہ کتابت دارالعلوم دیوبند احقر راقم الحروف محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ ہم تینوں نے روزانہ مقررہ وقت پر جمع ہو کر مسودہ کی خواندگی کی اور باجازت حضرت مؤلف دام مجدہٗ نظر ثانی کے طور پر کی۔ اثناء خواندگی میں

(۱) اگر عبارت میں کوئی حرف یا کلمہ کتابت میں آنا رہ گیا تھا تو اسے سیاق سباق کی مدد سے بڑھا دیا ہے اور مکرر آ گیا تو حذف کر دیا گیا ہے۔

(۲) روایت واقعہ میں اگر رواۃ کی طرف سے کہیں تسامح پایا گیا یا کسی روایت کا دوسری روایت سے تعارض محسوس ہوا تو اس کا مناسب تدارک اور رفع تعارض کر دیا گیا۔

(۳) کسی مختصر واقعہ کی تفصیل ضروری سمجھی گئی تو اسے حاشیہ میں لے لیا گیا ہے۔

(۴) کہیں کہیں توثیق روایت کے لئے کوئی تائیدی واقعہ جو دوران خواندگی میں ذہنوں میں آیا

تو وہ حاشیہ میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

(۵) کہیں کہیں واقعات کے شرعی ماخذ بھی حسب ضرورت حاشیہ میں درج کر دیئے گئے ہیں۔

(۶) کسی ناتمام روایت کی تکمیل کی ضرورت سمجھی گئی تو واقعہ کا باقی ماندہ حصہ حاشیہ یا متن میں اندرون بریکٹ درج کر دیا گیا ہے۔

(۷) کسی استنباط میں اگر تعبیر مجمل یا موہم دیکھی گئی جس سے خلاف مراد مطلب اخذ کیے جانے کا احتمال ہوا تو اس تعبیر کی ضرورت کی حد تک تشریح حاشیہ میں دے دی گئی ہے۔

(۸) کسی واقعہ کی مناسبت سے کوئی واقعہ ہی ذہنوں میں آ گیا تو اسے بھی حاشیہ میں درج کر دیا گیا ہے۔

(۹) کسی اصول کی مثالوں کے بارہ میں حضرت مصنف نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے آرزو ظاہر کی کہ کاش اس کی کوئی مثال درج کتاب ہوتی اور وہ اتفاق سے ہم لوگوں کے ذہن میں آ گئی تو اسے بھی حاشیہ میں لے لیا گیا ہے۔

(۱۰) کسی جگہ صراحت سے اگر حضرت مصنف نے ہی خود توجہ دلائی کہ یہاں اضافہ ہونا چاہیئے تو وہاں بطور تعمیل ایماء مصنف ممدوح حاشیہ میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

(تلك عشرة كاملة)

بہر حال حضرت مصنف دام مجدہ کی اجازت اور فراخ حوصلگی پر اعتماد کرتے ہوئے قرأت و سماعت کی اس مجلس میں متعدد مواقع پر اس قسم کی تشریح و تنقیح حذف و ازدیاد اور توضیح و تصحیح وغیرہ سے کام لیا گیا ہے مگر اسی حد تک کہ اصل کلام کی روح پر کوئی اثر نہ پڑنے پائے اور ہر ایسے موقع پر احقر نے اپنے دستخط ثبت کر دیئے ہیں۔

سوانحات قاسمیہ کے سلسلہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ کی مؤلفہ سوانح چونکہ ایک جامع متن کی حیثیت رکھتی ہے اور بقول حضرت مولانا مناظر احسن صاحب ایک کراماتی سوانح ہے جس میں ہر ایک واقعہ کا اشارہ مل جاتا ہے۔ گویا یہ مفصل سوانح عمری اسی متن کی

شرح ہے۔ نہایت ہی نامناسب اور ناقدر شناسی ہوتی اگر اس تفصیلی سوانح کو اسکے حق میں حجاب بنا کر اسے ہمیشہ کے لئے چھپادیا جاتا۔ اس لئے ابتدار کتاب میں اس تفصیلی سوانح کے متن کے طور پر یہ مختصر سوانح بھی بجنسہ لے لی گئی ہے تاکہ اجمال و تفصیل دونوں سے بیک وقت فائدہ اٹھایا جائے۔ اور تفصیلی سوانح میں جہاں بھی اس مختصر کا کہیں حوالہ آیا ہے وہاں اس کے صفحات کا عدد بھی نقل کر دیا گیا ہے تاکہ اصل عبارت کتاب کی طرف رجوع کرنا آسان ہو جائے۔

افادۂ مزید کے لئے حضرت والا کی مخصوص نامزد اشیاء کے چند فوٹو بھی ناظرین کی دلچسپی کے لئے جا بجا شامل کتاب کر دیئے گئے ہیں۔ تاکہ سیرت کے ساتھ بعض چیزیں اپنی صورت کے ساتھ بھی سامنے آجائیں۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اس خدمت کو قبول فرمائے اور لوگوں کو اس کے علمی و عملی پہلوؤں سے نفع اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے اور حضرت صاحب سوانح کی مقبولیت کے طفیل میں ہم سب کو حسن خاتمہ کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔ والحمد للہ اولاً و آخراً والیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ۔

محمد طیب غفرلہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۰ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوانح عمری

سیدنا الامام الکبیر حضرت شمس الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب

قدس سرہٗ

مؤلفہ

مصنف امام حضرت اقدس عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی

قدس سرہٗ

الٰہی تیری قدرت کا ظہور ہے کہ یہ تماشے دکھلاتا ہے۔ پھر ان کو پردۂ اختفا میں چھپاتا ہے۔ کیا کیا آفتاب طلوع ہوئے اور چمک دمک دکھلا کر پھر غروب ہو گئے سب صفت وثنا تیری ہی ہے جس کسی تعریف ہے اور سب وصف وکمال تیرا ہی ہے جس کسی کی توصیف ہے تو ہر عیب سے پاک و بری اور سب تیرے قبضہ میں خشکی ہو یا تری۔ آسمان ایک بلبلہ ہے اور زمین ایک مشت خاک۔ اور تو سب میں جلوہ گر اور سب سے برتر اور پاک۔ کس زبان سے تیری ثنا ہو سکے جب فخر الاولین والآخرین سید المرسلین رحمۃ للعالمین حضرت سیدنا محمد رسول اللہ فرماتے ہیں لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ لاکھوں بلکہ لا انتہا رحمت وسلام وصلوٰۃ نثار روح پاک اور تمام آل واصحاب پر بلکہ تمام ازواج طیبین وطاہرین علماء وزہاد وفقراء وعباد پر۔ آمین۔ **بعد** حمد وصلوٰۃ بندۂ احقر ذرۂ کمتر محمد یعقوب نانوتوی[1] ابن مقدام العلماء جناب مولوی مملوک العلی مرحوم نانوتوی

---

[1] نانوتہ ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہے اول ایسی آب وہوا خراب نہ تھی۔ اب نہر کے سبب آب وہوا وہاں کی نہایت خراب ہو گئی اور آبادی میں بھی کمی آ گئی دیوبند سے بارہ کوس غرب میں اور سہارنپور سے (باقی اگلے صفحہ پر)

عرض رساں خدمت احباب ہے کہ آپ صاحبوں نے احقر سے فرمایا تھا کہ جو کچھ حال و سوانحمری حضرت مخدوم مکرم جناب مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم کے یاد آئیں۔ مناسب ہے کہ بذیل تحریر جمع ہو جائیں۔ تا ہمارے اور آئندہ لوگوں کے لئے یادگار رہے۔ آپ لوگوں کے امر کی اجابت واجب سمجھ کر باوجود قلت فرصت۔ مختصر مختصر جو جو یاد آتا ہے لکھتا ہوں۔ مولانا احقر سے چند ماہ بڑے تھے۔ ان کی پیدائش شعبان یا رمضان سنہ[۱] بارہ سو اڑتالیس[۵] ہے اور نام تاریخی خورشید حسین اور بندہ کی پیدائش صفر کی تیرہویں سنہ بارہ سو انچاس ہے اور نام تاریخی منظور احمد اور حقیر کے اور مولوی صاحب کے (علاوہ قرب نسب) بہت سے روابط اتحاد تھے ایک مکتب میں پڑھا ایک وطن ایک نسب ہمزلف ہوئے ایک استاد سے ایک وقت میں علم حاصل کیا اور بعضی کتابیں میں نے مولانا سے پڑھیں ایک پیر کے مرید ہوئے ہمسفر دو سفر حج کے رہے اور ایک زمانہ دراز تک ساتھ رہے مگر ان کے کمالات کا اثر ہمارے قصور استعداد سے ہم میں ظاہر نہ ہوا۔ مولوی صاحب کے والد شیخ اسد علی صاحب ہر چند جناب والد مرحوم کے ساتھ دہلی گئے تھے اور شاہنامہ وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں اور اپنی پڑھنے کے زمانہ کی (ہمارے سامنے) حکایتیں بیان فرمایا کرتے تھے مگر حال ایسا تھا کہ گویا

(گذشتہ صفحہ سے) پندرہ کوس جنوب میں اور گنگوہ سے نو کوس مغرب میں اور دہلی سے چار منزل ساٹھ کوس شمال میں ہے۔ ۱۲

(متعلقہ صفحہ ہذا) [۱] جناب مولوی صاحب کی پیدائش کا سن تاریخی نام سے معلوم تھا اور مہینہ اور تاریخ محفوظ نہ تھا میرا یاد ربیع الثانی یا جمادی الثانی تھا اور تاریخ محفوظ رہی نہیں اور جن جن صاحبوں پر اس کے معلوم ہونے کا گمان تھا ان سے پوچھا ہر کسی نے مختلف بیان کیا ایک صاحب پندرہویں شعبان کہا مگر میرے ماموں صاحب جناب حکیم صاحب نے اس کی تغلیط کی اور ایک نے انتیسویں رمضان اور ایک صاحب نے ۲۷ محرم اور یہ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ۱۲ محمد یعقوب

[۵] مطابق سنہ اٹھارہ سو بتیس عیسوی (۱۸۳۲ء) ۱۲

علم سے کچھ مناسبت ہی نہیں رکھتے۔ تمام عمر کھیتی کی اور ویسے ہی عادات اور ڈھنگ موٹے
قصبات کے سے تھے مگر نہایت ہی صاحب مروت و اخلاق کنبہ پرور، مہمان نواز نمازی پرہیزگار
تھے۔ ان کے والد شیخ غلام شاہ تھے۔ احقر نے ان کی بھی زیارت کی تھی تھوڑے پڑھے ہوئے
تھے مگر ذاکر شاغل تھے درویشوں کی خدمت کرتے۔ تعبیر خواب میں مشہور تھے جناب مولوی
صاحب نے ایام طفلی میں یہ خواب دیکھا تھا کہ گویا میں اللہ جل شانہ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں ان
کے والد نے یہ تعبیر فرمائی کہ تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا اور بہت بڑے عالم ہو گے، اور
نہایت شہرت ہوگی یہ تعبیر ان کی درست ہوئی، اور میری بہن نے خواب میں دیکھا کہ ایک ترازو
چھوٹی (جیسے لڑکے کھیلا کرتے ہیں) آسمان سے گری ہے اور اس پر ابابیل جانور سیاہ رنگ
کے بہت لپٹے ہوئے ہیں اگر چھڑاتے ہیں تو چھوٹتے نہیں۔ سن کر یوں فرمایا کہ قحط ہوگا چنانچہ
وہ قحط جس میں باندیاں بک گئیں واقع ہوا غالباً پانچا کال اس کو کہتے تھے میرا نسب اور مولانا
کا شیخ غلام شاہ کے پردادا میں ملتا ہے اس طرح محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش
ابن علاؤالدین بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبدالسمیع بن مولوی محمد ہاشم اور محمد یعقوب بن مملوک العلی
ابن احمد علی بن غلام شرف بن عبداللہ بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبدالسمیع بن مولوی محمد ہاشم
اور میاں شیخ محمد بخش کے بھائی شیخ خواجہ بخش میرے والد اور شیخ کرامت حسین دیوبندی کے نانا
ہوتے تھے جوانی میں دکن گئے وہاں نکاح کیا تھا وہاں ایک بیٹا محمد ہاشم نام تھا یہاں اولاد
پسری نہ تھی۔ اس سبب سے میرے والد کے نانا ان کے چچا ہوتے ہیں اور انواع رشتے جیسے
برادری میں ہوا کرتے ہیں باہم مرتبط ہیں، مولوی صاحب کے نانا مولوی وجیہ الدین صاحب
نانوتوی فارسی بہت عمدہ جانتے تھے اردو کے شاعر تھے اور کچھ کچھ عربی سے بھی آگاہ تھے
بڑے تجربہ کار اور پرانے آدمی ہنگام آمدن حکومت انگریزی سہارنپور میں وکیل ہوئے اور نہایت عزت
واحترام اور تمول سے گذران کی نہایت طباع اور خوش فہم تھے اور چند پشت اوپر مولوی محمد ہاشم
صاحب مرحوم میں ہمارے نسب میں جا ملتے ہیں اور آگے نسب حضرت قاسم بن محمد بن

مولوی صاحب کا ابتدائے عمر سے عمدہ صفات سے متصف ہونا

ابی بکر صدیق رضؓ میں جا پہنچتا ہے یہ مولوی محمد ہاشم زمان شاہجہاں میں مقرب بادشاہی ہوئے اور نانوتہ میں مکان بنائے اور چند دیہات جاگیر تھے جو تبدیل حکومات کے سبب ان کی اولاد کے پاس نہ رہے مولوی صاحب کے اور کوئی بھائی نہ تھا۔ ایک بہن دیوبند میں اب زندہ موجود ہیں اور ان کے والد اور دادا صاحب کے بھی کوئی بھائی نہ تھا۔ بھائی پیدا ہوئے مگر لڑکپن میں مرگئے اور چچا جوانی میں مرگئے اور دادا کے بھائی تھے وہ کسی لڑائی میں جوان عمر شہید ہوئے اور اوپر جو بھائی تھے ان کے اولاد پسری یہاں کوئی نہیں رہی دکن میں ان کے اولاد ہوئی بقاعدہ معروف وہ بھی گویا ایک ہی تھے۔ غرضکہ چار پشت تک مولانا متفرد ہوئے جناب مولوی صاحب لڑکپن سے ذہین۔ طباع۔ بلند ہمت۔ تیز۔ وسیع حوصلہ۔ جفاکش جری۔ چست وچالاک تھے۔ مکتب میں اپنے سب ساتھیوں سے ہمیشہ اول رہتے تھے قرآن شریف بہت جلد ختم کرلیا۔ خط اس وقت سب سے اچھا تھا۔ نظم کا شوق اور حوصلہ تھا اپنے کھیل اور بعض قصے نظم فرماتے اور لکھ لیتے چھوٹے رسالے اکثر نقل کئے،

حاجی امداد اللہ صاحب سے مولانا کا تعلق

جناب مخدوم العالم حاجی امداد اللہ صاحب سے جو ربط نسب کا تھا حضرت مخدوم کی ننھیال ہمارے خاندان میں تھے اور بہن ان کی یہاں بیاہی تھی اکثر نانوتہ تشریف لاتے تھے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نہایت محبت واخلاص فرماتے جزو بندی کتاب کی حضرت سے ہم دونوں نے سیکھی اور اپنی لکھی ہوئی کتابوں کی جلدیں باندھیں۔ ہمارے وطن میں ایک قضیہ پیش آیا۔ شیخ تفضل حسین شیعہ مذہب ہوگئے تھے اور ہماری جائداد کی شریک تھے اُن سے اور مولوی صاحب کے دادا شیخ غلام شاہ سے فساد ہوا اور شیخ تفضل حسین مولوی صاحب کے ماموں میاں فصیح الدین کے ہاتھ سے زخمی ہوکر مرگئے ہرچند کہ اس مقدمہ میں خیریت رہی اور حاکم کی طرف سے کسی کو کچھ سزا نہ ہوئی۔ مگر بنائے مخاصمت کچھ پہلے سے تھی اب زیادہ ہوگئی۔ تب یہ خوف ہوا کہ بادا کوئی صدمہ مخالفوں کے ہاتھ سے ان کو پہنچے اس لئے دیوبند بھیجدیا یہاں مولوی مہتاب علی صاحب کا مکتب تھا،

مولوی صاحب کا فارسی کتابوں کا پڑھنا اور عربی شروع کرنا

شیخ کرامت حسین مرحوم کے گھر پر شیخ نہال احمد پڑھتے تھے۔ مولوی صاحب کو انہوں
نے عربی شروع کرائی پھر سہارنپور اپنے نانا کے پاس رہے۔ وہاں مولوی محمد نواز صاحب
سہارنپوری سے کچھ پڑھا۔ فارسی اور عربی کی کتابیں اول کی کچھ حاصل کیں۔ اس[1] زمانہ میں احقر کے
والد مرحوم حج کو تشریف لے گئے۔ احقر ایک برس کامل وطن رہا۔ حفظ قرآن شریف پورا ہو گیا تھا
مگر صاف نہ تھا صاف کرتا تھا مولوی صاحب سہارنپور سے وطن آئے اور ان کے نانا کا انتقال
اس سال کے وبائی بخار میں، معہ بہت سے لوگوں کے ہو گیا تھا اس زمانہ میں مولوی صاحب
کا ساتھ رہا۔ مولوی صاحب جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے ہر کھیل میں خواہ
ہوشیاری کا ہو یا محنت کا سب سے اول اور غالب رہتے تھے خوب یاد ہے کہ اس زمانہ
میں ایک کھیل جوڑ توڑ نام ہم کھیلتے تھے اور بہت پرانے مشاق لوگ اس کو عمدہ کھیلتے تھے
اور ہم نئے کھیلنے والے مات کھا جاتے تھے۔ مولوی صاحب نے جب اس کا قاعدہ معلوم
کر لیا پھر یاد نہیں کسی سے مات کھایا ہو بہت ہوا تو برابر رہے بلکہ ہر کھیل میں جو مرتبہ کمال ہوتا تھا
وہاں تک اس کو پہنچا کر چھوڑتے دروازہ مکان کا ایک دراز کوچہ تھا اور وحشت ناک جگہ تھی
اور وہاں آسیب بھی مشہور تھا مگر راتوں کو بہت بہت دیر سے بے تکلف گھر جاتے اور کچھ

[1] سنہ بارہ سو ستاون ہجری میں حضرت مولانا محمد اسحٰق صاحب اور جناب مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی
نے کہ دونوں نواسے اور جانشین مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تھے اچانک ارادہ ہجرت کا کیا
ذی قعدہ میں شاید روانہ ہو گئے دہلی میں اندھیرا ہو گیا اور آپ صاحبوں کے ساتھ ایک بہت بڑا قافلہ عرب کو
روانہ ہوا یہ دیکھ کر حضرت والد مرحوم کو بھی حج کا دھیان ہوا خفیہ تدبیر رخصت اور سامان سفر کرتے رہے آخر
جب رخصت ایک سال کی مل گئی اور سرکار نے براہ قدردانی آدھی تنخواہ بھی دی۔ رجب سنہ ۱۲۵۸ ہجری میں وطن
سے روانہ ہوئے اور اول ذی الحجہ کو مکہ پہنچے زیارت حرمین سے فارغ ہو کر برس دن میں پھر دہلی پہنچے اس
وقت یہ سفر جلد طے ہونے میں عجیب سمجھا رخصت کے دن پورے ہو چکے تھے وطن نہ آ سکے ذی الحجہ
میں جب چھٹی سالانہ ہوئی وطن تشریف لائے اور مولوی صاحب کو دہلی ساتھ لے گئے۔

خوف نہ کرتے جب والد مرحوم حج سے تشریف لائے اور وطن آئے تب مولوی صاحب سے کہا کہ میں تم کو ساتھ لے جاؤنگا بعد اجازت والدہ کے دہلی روانہ ہوئے ذی الحجہ سنہ اونسٹھ کے آخر میں وطن سے چلے اور دوسری محرم سنہ ساٹھ کو دہلی پہنچے چوتھی کو سبق شروع ہوئے مولوی صاحب نے کافیہ شروع کیا اور احقر نے میزان اور گلستان والد مرحوم نے میرے ابواب کا سننا اور تعلیلات کا پوچھنا ان کے سپرد کیا تھا اور ہر جمعہ کی رات کو کہ چھٹی ہوتی تھی صیغوں اور ترکیبوں کا پوچھنا معمول تھا۔ یاد ہے کہ مولوی صاحب سب میں عمدہ رہتے تھے اسی زمانہ میں ہمارے مکان سے قریب مولوی نوازش علی صاحب کی مسجد میں طالب علموں کا مجمع تھا ان کی پوچھ پاچھ بحث شروع ہوئی مولوی صاحب کی جب باری آئی سب پر غالب آئے اور جب گفتگو ہوتی اس میں مولوی صاحب کو غلبہ ہوتا بلکہ ہم میں سے جو کوئی مغلوب معلوم ہوتا مولوی صاحب کی مدد چاہتا یا مولوی صاحب خود اس کو مدد دیتے پھر تو مولوی صاحب ایسا چلے کہ کسی کو ساتھ ہونے کی گنجایش نہ رہی۔ یہ معقول کی مشکل کتابیں میر زاہد۔ قاضی۔ صدرا۔ شمس بازغہ ایسا پڑھا کرتے تھے جیسے حافظ منزل سناتا ہے کہیں کہیں کوئی لفظ فرماتے جاتے اور ترجمہ تک نہ کرتے والد مرحوم کے بعض شاگردوں نے کہا بھی کہ حضرت یہ تو کچھ سمجھتے نہیں معلوم ہوتے۔ جناب والد مرحوم نے فرمایا کہ میرے سامنے طالب علم بے سمجھے چل نہیں سکتا اور واقعی ان کے سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا وہ طرز عبارت سے سمجھ لیتے تھے کہ یہ مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں اور یہی حال جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی سلمہ اللہ تعالی کا تھا۔ مولوی صاحب سے اسی زمانہ سے دوستی اور ہم سبقی رہی آخر حدیث جناب شاہ عبد الغنی صاحب مرحوم کی خدمت میں پڑھی اور اسی زمانہ میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا والد مرحوم نے مولوی صاحب کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال کے متعرض نہ ہوجیو میں ان کو پڑھالوں گا اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کرلو چند روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحب سب معمولی مقالے دیکھ چکے اور حساب پورا کرلیا از بسکہ یہ واقعہ

مولوی صاحب کا وطن آنا
مولوی صاحب کا والد کے ہمراہ دہلی جانا
مولوی صاحب کا کافیہ شروع کرنا
مولوی صاحب کا سب طالب علموں پر غالب آنا
معقول کی مشکل کتابوں کا بھی اس طرح پڑھنا جیسے کوئی حافظ منزل سناتا ہے
مولوی صاحب کا حضرت شاہ عبد الغنی صاحب سے حدیث پڑھنا
مولوی صاحب کا اقلیدس خود دیکھنا

نہایت تعجب انگیز تھا طلبہ نے پوچھ پاچھ شروع کی یہ کب عاری تھے ہر بات کا جواب باصواب تھا
آخر منشی ذکاء اللہ چند سوال نے کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے اور وہ نہایت مشکل سوال تھے اُن کے
حل کر لینے پر مولانا کی نہایت شہرت ہوئی اور حساب میں کچھ ایسا ہی حال تھا جب امتحان سالانہ کے
دن ہوئے مولوی صاحب امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا سب اہل مدرسہ کو علی الخصوص ہیڈ
ماسٹر صاحب کو کہ اس وقت مدرس اول انگریزی تھے نہایت افسوس ہوا پھر مولوی صاحب نے مطبع احمدی
میں تصحیح کتب کی کچھ مزدوری کر لی اور کتابیں معمولی تمام کر چکے تھے حدیث حضرت شاہ عبدالغنی صاحب
کی خدمت میں پوری کی اس عرصہ میں والد مرحوم کا گیارہویں ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو بمرض یرقان قبل السابع
انتقال ہوگیا ایام مرض والد مرحوم کے ممتد نہ تھے گیارہ روز کل مرض رہا مگر چار پانچ روز بہت غفلت
اور کرب رہا لخلخہ سونگھانا اور پنکھا کرنا ہر وقت تھا ہم سو جاتے تھے اور مولوی صاحب برابر بیٹھے رہتے
تھے بعد انتقال مولانا والد مرحوم کے احقر اپنے مکان ملوک میں جو چیلوں کے کوچہ میں تھا جا رہا۔
مولوی صاحب بھی میرے پاس آرہے کوٹھے پر ایک جھلنگا پڑا ہوا تھا اس پر پڑے رہتے تھے
روٹی کبھی پکوا لیتے تھے اور کئی کئی وقت تک اسی کو کھا لیتے تھے میرے پاس آدمی روٹی پکانیوالا
نوکر تھا اس کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جب مولوی صاحب کھانا کھاویں سالن دے دیا کرو مگر بدقت کبھی
اس کے اصرار پر لے لیتے تھے۔ ورنہ وہی روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑ رہتے تھے ایک سال کے قریب
(بعد انتقال والد مرحوم) احقر دہلی رہا پھر اجمیر کی نوکری کے سبب دہلی چھوٹی اور مولوی صاحب سے
جدائی پیش آئی۔ مولوی صاحب چند روز اسی مکان میں تنہا رہے پھر چھاپہ خانہ میں رہے،
پھر دار البقا میں چند روز رہے اس زمانہ میں جناب مولوی صاحب. مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری
نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کی کہ پانچ چھ سیپارہ آخر کے باقی تھے مولوی صاحب
کے سپرد کیا مولوی صاحب نے اس کو ایسا لکھا کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر
اور کیا ہو سکتا ہے اس زمانہ میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحب کے کمال سے آگاہ نہ
تھے جناب مولوی احمد علی صاحب کو بطور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا آخر کتاب کو

مولوی صاحب کا حساب کے مشکل سوالوں کا حل کرنا

وفات حضرت مولانا

مولوی صاحب کا دردی روز میں پڑا رہنا عسرت کرنا

مولوی صاحب کا بخاری پر تحشیہ کرنا

ایک نئے آدمی کے سپرد کیا اس پر مولوی احمد علی صاحب نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں
کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں اور پھر مولوی صاحب کا تحشیہ ان کو دکھلایا جب لوگوں نے جانا اور وہ
جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا جو اول سے التزام ہے اور
اس جگہ پر امام بخاری نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کئے ہیں اور ان کے جواب لکھنے معلوم ہے
کہ کتنے مشکل ہیں اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھ لے اور سمجھ لے کہ کیسا حاشیہ لکھا ہے
اور اس حاشیہ میں یہ بھی التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے محض اپنے فہم سے نہ
لکھی جائے۔ اس وقت کی اکثر حکایات سنی سنائی عرض کرتا ہوں۔ کیونکہ پانچ برس تک پھر ملاقات
مولوی صاحب سے نہیں ہوئی جب احقر اجمیر گیا مولوی صاحب اسی مکان میں رہتے تھے
اور بعض ایک دو آدمی اور تھے اور پھر اتفاق سے سب متفرق ہو گئے اور مولوی صاحب تنہا
رہ گئے۔ مکان مقفل رہتا تھا رات کو مولوی صاحب کواڑ اتار کر اندر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو
درست کر دیتے تھے اور صبح کو کواڑ اتار کر باہر ہو جاتے تھے اور پھر کواڑ درست کر دیتے تھے
چند ماہ اسی ہُو کے مکان میں گذر گئے جس زمانہ میں مولوی صاحب میرے پاس رہتے تھے
مولوی صاحب کی صورت پر جذب کی حالت برستی تھی بال سر کے بڑھ گئے تھے نہ دھونا نہ کنگھی
نہ تیل نہ کترے نہ درست کئے عجب صورت تھی مولوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہیبت عنایت
کی تھی ان کے سامنے بولنے کا ہر کسی کو حوصلہ نہ تھا۔ باوجودیکہ نہایت خوش مزاج اور عمدہ
اخلاق تھے اس لئے میں تو کچھ کہہ نہ سکا ایک اور دوست سے کہلایا تب بمشکل بال کترواکر
درست کئے اور دھلوائے جوئیں بہت ہو گئیں تھیں ان سے نجات ہوئی مزاج تنہائی
پسند تھا اس لئے کچھ عرض نہ ہو سکتا تھا مولوی صاحب کو اول عمر سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات
عنایت فرمائی تھی اکثر ساکت رہتے اس لئے ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ اور باوجود
خوش مزاجی اور ظرافت کے ترش رو مغموم جیسی صورت رکھتے اور ان کے حال سے بھلا ہو یا
برا نہ کسی کو اطلاع ہوتی نہ آپ کہتے یہاں تک کہ بیمار بھی اگر ہوتے تب بھی شدت کے وقت کبھی

مولوی صاحب کی سادگی کا وصف

کسی نے جان لیا تو جان لیا ورنہ خبر بھی نہ ہوئی اور دوا کرنا تو کہاں بعضے احباب کی زبانی سنا ہے کہ چھاپہ خانہ میں جناب مولوی احمد علی صاحب کے جب مولوی صاحب کام کیا کرتے تھے مدتوں یہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولوی کہہ کر پکارتے اور آپ بولتے نہیں کوئی نام لے کر پکارتا خوش ہوتے تعظیم سے نہایت گھبراتے بے تکلف ہر کسی سے رہتے اب تک جو شاگرد یا مرید تھے ان سے یارانہ کے طور پر رہتے اور کچھ اپنے لئے صورت تعظیم کی نہ رکھتے۔ علماء کی وضع عمامہ یا کرتہ کچھ نہ رکھتے ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔ میں کہتا ہوں اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے کیا اس میں سے ظاہر ہوئے اور آخر سب کو خاک میں ہی ملا دیا اپنا کہنا کر دکھلایا مسئلہ کبھی نہ بتلاتے حوالہ کسی پر فرماتے فتوی پر نام لکھنا اور مہر کرنا تو درکنا۔ اول امامت سے بھی گھبراتے آخر کو اتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھا دیتے تھے۔ وعظ بھی نہ کہتے تھے۔ جناب مولوی مظفر حسین صاحب مرحوم کاندھلوی نے اول وعظ کہلوایا اور خود بھی بیٹھ کر سنا اور بہت خوش ہوئے جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی اس آخری زمانہ میں قدماء کے نمونہ تھے تقوے اللہ اکبر ایسا تھا اور اس سے وہ نسبت پیدا تھی کہ مشتبہ چیز اگر معدہ میں پہنچ گئی تو اسی وقت قے ہو جاتی تھی اور اتباع سنت نہ ایسا دیکھا اور نہ ایسا سنا سبحان اللہ بیواؤں کے نکاح کی بنا ان اطراف میں اولاً اُن سے ہی ہوئی اور والد مرحوم نے اس کو نہایت خوبصورتی سے اجرا فرمایا اور اُن دونوں بزرگواروں کے قدم قدم حضرت مولانا نے اس کو پورا شائع کیا یہ اجر ان صاحبوں کے نامہ اعمال میں تا بہ قیامت رہے گا، اور ایک یہ کیا ہزاروں دین کی باتیں ایسی ہی کیں جناب مولوی مظفر حسین صاحب کی خدمت میں اس زمانہ سے نیاز تھا جب کہ حضرت مولوی صاحب دہلی تشریف لاتے تو والد مرحوم کے پاس ہمارے مکان میں فروکش ہوتے اور والد مرحوم جب وطن جاتے تو کاندھلہ ہو کر جاتے جب وطن سے لوٹتے کاندھلہ ٹھہر کر دہلی روانہ ہوتے اور یہی حال جناب حاجی امداد اللہ صاحب۔ کے تھانہ بھون میں آتے جاتے ملاقات کر آتے۔ یا وہاں مقام ہی ہوتا۔ سبحان اللہ کیا جلسہ تھا۔ پیر محمد والی مسجد میں

مولوی صاحب کی عجز و انکساری

مولوی صاحب کا وعظ

وہ گلزار تھا کہ شب و روز سوائے ذکر اور قال اللہ قال الرسول کچھ اور دھیان نہ تھا۔ آخر شب میں ذکر جہر کا یہ رنگ ہوتا کہ غافل بھی جاگ اٹھتے اور توفیق ذکر اللہ کی پاتے غرضکہ یہ آنا جانا اور ملاقاتیں ان صاحبوں کی خدمت میں نیاز کے سبب ظاہر ہوئی ورنہ جو لکھا ہوا تھا وہ ہر طرح ہوتا تھا۔ مولوی صاحب نکاح نہ کرتے تھے اور جناب بھائی اسد علی صاحب حضرت کے والد کو ادھر تو ترک نوکری اور اختیار درویشی کا رنج تھا اُدھر یہ فکر ہوئی کہ دیوبند رشتہ کیا تھا آخر جناب حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت کے فرمانے سے نکاح پر راضی ہوئے مگر یہ شرط کی کہ تمام عمر زوجہ کے نفقہ اور اولاد کی پرورش کے لئے کچھ کمالانے کے مجھ سے متقاضی نہ ہوں بے چاروں نے ناچار یہ شرط قبول کی نکاح ہوگیا۔ اب نوکری آپ نے اگر کی تو کیا کی کسی چھاپہ خانہ میں چار پانچ روپے کی تصحیح کی خدمت قبول کی اور پھر مزاج میں مہمان نوازی اور سخاوت بھلا کیا بچتا کہ گھر دیتے بلکہ جب وطن آتے اور یہاں مہمان آتے والدین کو دشواری ہوتی تب یہ کیا کہ بی بی کا زیور اس کی اجازت سے بیچ کر صرف کر دیا وہ ایسی تابعدار تھیں کہ والدین کی خدمت میں جو مشقت اٹھائی مولوی صاحب کی مزاج داری ان کو علاوہ براں ہوئی اور والدین کی رضا کے لئے جب ناخوش ہوتے تو ان کو ہی کچھ کہہ لیتے آخر میں ان کے بڑے شکر گزار رہے اور اللہ جل شانہ نے بہت کچھ عنایت فرمایا جو کچھ فتوح ہوتی ان کے حوالہ کر دیتے وہ اللہ کی بندی خدا سلامت رکھے ایسی سخی اور دست کشادہ ہے کہ جناب مولوی صاحب کی مہمانداری کو اسی کے باعث رونق تھی کبھی یاد نہیں کہ کسی وقت کوئی آگیا ہو اور گھر میں کھانا نہ ملا ہو۔ بلکہ خود فرماتے کہ ہماری سخاوت احمد[1] کی والدہ کی بدولت ہے جو میں قصد کرتا ہوں وہ مہمان نوازی میں اس سے بڑھ کر کرتی ہے۔ چاول نانوتہ میں بہت پیدا ہوتے ہیں مہمانوں سے فرماتے کہ ہم نے تمہارے لئے چاول پکانے میں تکلف نہیں کیا بلکہ ہمارے گھر آمدنی اراضی کے یہی چاول ہوتے ہیں وہی تمہارے آگے پکا کر رکھ دیتے ہیں اور مہمانوں کے کھلانے میں مولوی صاحب کو کچھ

مولوی صاحب و دیگر عزیزوں کا فکر کرنا مولوی صاحب کا نکاح سے انکار کرنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے فرمانے سے نکاح کرنا

مولوی صاحب کی سخاوت کا حال۔

[1] احمد مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے کا نام ہے ۱۲

دریغ نہ ہوتا تھا۔ ایک بار دسترخوان پر کھچڑی کے ساتھ بہت ساگھی آیا۔ دس پندرہ آدمی تھے
جناب مولوی رشید احمد صاحب نے فرمایا کہ اتنا گھی یہ فضول ہے اس میں سے آدھا رکھ لیا
اور آدھا گھر بھیج دیا ایک بار مہمانوں کی کسی سواری کے لئے دانے کی ضرورت تھی چنے نہ ملے کہ
دانہ دَل کر دیویں گھر میں کابلی چنے رکھے ہوئے تھے وہی دَلوا کر دانہ دیدیا۔ مہمان نوازی مولوی
صاحب پر ختم ہے مجھے یاد ہے کہ مولوی صاحب نے لڑکپن میں ایک خواب دیکھا تھا اس کی
تعبیر بھی تھی یوں دیکھا تھا کہ میں مرگیا ہوں اور لوگ مجھے دفن کر آئے تب قبر میں حضرت
جبریل تشریف لائے اور کچھ نگین سامنے رکھے اور کہا یہ اعمال تمہارے ہیں اُن میں
ایک نگین بہت خوشنما اور کلان ہے اس کو فرمایا کہ یہ عمل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ہے۔
ایام طالب علمی میں مولوی صاحب نے ایک اور خواب دیکھا تھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر
کھڑا ہوں اور مجھ میں سے نکل کر ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں۔ جناب والد مرحوم سے ذکر
کیا انہوں نے فرمایا کہ تم سے علم دین کا فیض بکثرت جاری ہوگا جس زمانہ میں نکاح ہوا اور
والد کو یہ خیال تھا کہ ابنائے زمانہ کی طرح جب فکر ہوگا آپ نوکری کر ہی لیں گے اور بعد گذرنے
کتنی مدت کے کچھ نہ کیا تب مایوس ہو گئے اور ان کو اس امر کا بہت رنج تھا کہ اور بھائی پڑھ کر نوکر
ہو گئے کوئی پچاس کا کوئی سو کا کوئی کم کوئی زیادہ۔ سب خوش و خرم ہیں اور ان کا حال ویسا ہی
اور آمدنی آراضی کی مکتفی خرچ کو نہ ہوتی تھی جناب حاجی امداد اللہ صاحب مدظلہ سے شکایت
کی کہ بھائی میرے تو یہی ایک بیٹا تھا اور مجھے کیا کچھ امید نہیں کچھ کماتا تو ہمارا یہ افلاس دور ہو جاتا
تم نے اسے خدا جانے کیا کر دیا کہ یہ نہ کچھ کماتا ہے نہ نوکری کرتا ہے۔ حضرت اس وقت تو
ہنسکر چپ ہو رہے پھر کہلا بھیجا کہ یہ شخص ایسا ہونے والا ہے کہ وہ سو پچاس والے سب
اس کی خادمی کریں گے اور ایسی شہرت ہوگی کہ اسی کا نام ہر طرف پکارا جائے گا اور تم تنگی
کی شکایت کرتے ہو خدا تعالیٰ بے نوکری ہی اتنا کچھ دے گا کہ ان نوکروں سے بڑھتا رہے گا
جناب بھائی اسد علی صاحب کی ہی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے وسعت دی اور مولوی صاحب سے

بہت خوش انہوں نے انتقال کیا اور تصدیق اس پیشینگوئی کی اپنی آنکھ سے دیکھ گئے
قدر مریدوں کی پیر ہی پہچانے اور جو ایسی نظر رکھے وہی جانے حضرت نے آخر میں ضیاء القلوب
کی چند سطر ان دونوں صاحبوں کی تعریف میں لکھی ہیں نہایت درست ہیں۔ یوں حضرت
نے اپنی کسر نفسی کو کام فرمایا ہے مگر اظہار مرتبہ ان دونوں صاحبوں کا اس سے منظور ہے
اور خود احقر سے ارشاد فرمایا تھا اول حج میں جب حاضر خدمت ہوا تھا کہ مولوی رشید احمد
صاحب میں اور مجھ میں کچھ فرق نہیں لوگوں کو یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے' اور مولوی
محمد قاسم صاحب کو فرمایا تھا کہ ایسے لوگ کبھی پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے اب مدتوں
سے نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ نے اس کمال پر یہ ضبط عنایت فرمایا کہ کبھی کوئی کلمہ خودستائی کا
یا کسی طرح کوئی صورت رعونت یا خود بینی کی خلوت جلوت تنہائی مجمع اپنے بیگانوں میں کبھی
ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ اب اس سفر میں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ مولوی صاحب
کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کرو اور غنیمت جانو ہائے افسوس یہ خبر نہ تھی کہ اس کے یہ معنی
ہیں اور یہ واقعہ یوں اچانک آجائے گا۔ چند بار شدت مرض ہو کر اللہ تعالیٰ نے شفا دی تھی۔ اب
کی بار بھی وہی خیال باندھ رکھا تھا کیا کیجئے جو باتیں رہ گئیں رہ گئیں۔ اب سوائے افسوس
کیا ہو سکتا ہے جو تحریریں ناتمام رہ گئیں اب بھلا کون ان کو تمام کر سکتا ہے اور جن میں کچھ نقصان
ہو گیا ان کی تکمیل کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ بعد نکاح والد اکثر مکدر رہتے تھے اور آرزو
کرتے تھے کہ کوئی پوتا ہوتا تو اس سے امید نسل جاری ہونے کی بندھتی اول کئی لڑکیاں
ہوئیں جن میں سے دو زندہ اب ہیں۔ ایک بزرگ نے کہا کہ تم یہ آرزو کرتے ہو اور مولوی صاحب
کو ناخوش رکھتے ہو اُن کو مکدر نہ کرو اللہ تعالیٰ تم کو بھی خوش کرے گا تب سے مولوی صاحب
کی اکثر مزاج داری کرتے اور مہمانوں کی خدمت اور تواضع سے کسی طرح نہ گھبراتے تب
اللہ تعالیٰ نے میاں احمد کو عنایت کیا۔ آج بحمدہ تعالیٰ میاں احمد جوان ہیں اٹھارہ برس کی
عمر ہے اللہ تعالیٰ اپنے والد کی مثل کرے آمین اور میاں ہاشم پیدا ہوئے آج انکی عمر

حاجی صاحب کا اپنی کتاب میں مولانا کا اعزاز لکھنا

حاجی صاحب کا زبانی مولوی صاحب کے فضائل بیان کرنا

حاجی صاحب کا مولوی صاحب کی ہم لوگوں کو تحریر و تقریر محفوظ رکھنے کا ارشاد

مولوی صاحب کی اولاد کا حال

آٹھ برس کی ہے یہ نام مولوی صاحب کے والد کا رکھا ہوا ہے۔ اس عرصہ میں کئی لڑکے لڑکیاں پیدا ہوئیں اور چھوٹی ہی عمر میں چل بسیں اب ایک لڑکی تین چار برس کی آخری اولاد ہے اللہ ان سب کو عمر و سعادت و خوبی نصیب کرے اور مولوی صاحب کا نام ان کی نسل سے قائم رکھے ہمارے بھائی اسد علی صاحب بڑے سیدھے آدمی تھے حقہ بہت پیتے تھے مولوی صاحب کو حقہ سے نفرت تھی ایک بار حقہ بھرنے کو کہا مولوی صاحب باپ کے تابعدار حقہ بھر کر سامنے لا رکھا جب لوگوں نے سنا بہت ملامت کی کہا ہیں کہہ کر خود نادم ہوا پھر کبھی مولوی صاحب سے نہ کہا۔ والد سے اس بات پر اکثر تکدر رہتا تھا۔ مولوی صاحب مسجد میں رہتے رات کو مسجد میں سو رہتے کھانا مسجد میں کھاتے۔ پیر بھائی دو تین تھے ان کو کہا تھا کہ سب کھانا لایا کرو اور مل کر کھالیا کریں گے۔ پا پیادہ چلتے جفاکشی کرتے ان کو رنج نہ ہوتا۔ مولوی صاحب ایسے جفاکش تھے اول میں جب ضرورت نہانے کی ہوتی تھی مسجد میں پانی گرم ہوتا تھا اور تہجد کے وقت نہاتے مگر شرم کے سبب تالاب میں جاکر نہا لیتے۔ یہ کڑکڑات کا جاڑا اور پالا اور مولوی صاحب تالاب میں نہائیں۔ مولوی صاحب نے ریاضتیں ایسی کی ہیں کہ کیا کوئی کرے گا اشغال دشوار جیسے حبس اور سہ پایہ مدت تک کئے ہیں اور بارہ تسبیح اور ذکر ارّہ کا دوام تھا ہی سر کے بال شدت حرارت کے سبب اڑ گئے تھے حرارت مزاج میں ایسی آگئی تھی کہ کسی صورت سے فرو نہ ہوتی تھی کیونکہ یہ حرارت قلب کی تھی اور اس کے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوئی۔ یہی آخر مرض کا باعث ہوئی اور اسی میں آخر انتقال کیا۔ آمد معانی اور مضامین کی ایسی تھی یوں فرماتے تھے کہ بعضی بار حیران ہو جاتا ہوں کہ کیا کیا بیان کروں اور اکثر تقریر طویل کے سبب کہیں سے کہیں نکل جاتے باقی احوال کو اللہ جانے باوجودیکہ کشف تام تھا مگر کبھی زبان سے کچھ نہ فرماتے ادنی ادنی اہل نسبت کے پاس بیٹھنے سے اثر ہوتا ہے مولانا کو یہ ضبط تھا کہ کبھی کچھ اثر ظاہر نہ ہوتا تھا۔ ایک بار مولوی صاحب نے میرٹھ میں مثنوی مولانا روم پڑھانا شروع کی دو چار شعر ہوتے اور عجیب غریب بیان ہوتے۔ ایک صاحب کہ کچھ

نام اصلی مولوی صاحب کا عمر نفسی

مولوی صاحب کی فاقہ کشی اور ریاضت

سواری پیادہ پا

مولوی صاحب کی ریاضت اور اذکار و اشغال

مولوی صاحب کی آمد معانی و مضامین

مولوی صاحب کا ضبط

رنگ باطنی رکھتے تھے سن کر یوں سمجھے کہ یہ اثر تبحر علمی کا ہے اور چاہا کہ کچھ مولانا کو فیض باطنی
دیا جائے درخواست کی کہ کبھی تنہا ملئے آپ نے فرمایا کہ مجھے کار چھاپہ خانہ کا اور پڑھانا طلبہ کا
رہتا ہے تنہائی کہاں آپ جب چاہیں تشریف لائیں وہ صاحب ایک روز تشریف لائے اور کہا
کہ آپ ذرا میری جانب متوجہ ہوں اور خود آنکھ بند کر کر مراقب ہوئے مولانا سبق پڑھا رہے
تھے البتہ موقوف کر دیا مگر کبھی آنکھ کھلی اور کبھی قدرے بند اُن کی طرف متوجہ ہوئے اُن کا یہ
حال ہوتا تھا کہ کبھی قریب گرنے کے ہو جاتے تھے اور پھر سنبھل بیٹھتے تھے کچھ دیر یہ معاملہ رہا
پھر وہ اٹھ کر نیچی نگاہ کئے چلے گئے پھر بہت معذرت کی مولانا کی کسر نفسی نے اُن کے
کمال کو ہرگز ظاہر نہ ہونے دیا اور جو کچھ ظاہر ہوا میرے گمان میں بامر اللہ تھا۔ ہرگز اپنی طرف سے
اظہار کسی امر کا نہ فرماتے تھے بات کہاں سے کہاں پہنچی جب احقر بنارس سے وطن کی طرف
پہنچا اتفاق نانوتہ جانے کا نہ ہوا دیوبند میں اہل و عیال کو چھوڑ کر رڑکی چلا گیا وہاں کام نوکری
کا کرنے لگا اتفاق گھر جانے کا نہ ہوا مولوی صاحب گھر تھے میں نے عرض کر بھیجا کہ ملنے کو جی
چاہتا ہے اور مجھے فرصت نہیں، خود پیادہ یا دو منزلہ کر کے احقر کے ملنے کو تشریف لائے اور ہمیشہ
جب تک قوت تھی کبھی سواری کی طرف رخ نہ تھا۔ اسی عرصہ میں غدر ہو گیا بعد رمضان احقر
کو سہارنپور لینے کو تشریف لائے چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے اس وقت راہ چلنا بدون
ہتھیار اور سامان دشوار تھا جب احقر وطن پہنچا چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے
جس میں مولانا کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی۔ اسی زمانہ میں ہمارے بھائی ہم عمر اکثر بندوق
اور گولی لگانے میں مشق کرتے رہتے تھے ایک دن آپ مسجد میں سے آئے کہ ہم گولیاں
لگا رہے تھے اور نشانہ کی جائے پر ایک نیم کا پتہ رکھا تھا اور اس کے گرد ایک دائرہ کھینچا تھا
قریب سے بندوق لگاتے تھے گولیاں مٹی کی تھیں مولوی صاحب نے فرمایا کہ بندوق کیونکر لگاتے
ہیں مجھے بھی دکھلاؤ کسی نے ایک فیر کی اور قاعدہ نشانہ کا ذکر کیا آپ بندوق ہاتھ میں لیکر فیر کی۔
صاف گولی نشانہ پر لگی اور وہ سب مشاق کتنی دیر سے لگا رہے تھے دائرہ میں لگ جانے کو نشانہ پر

پہنچا جانتے تھے اور یہ بات اتفاقی نہ تھی اپنی فہم سے حقیقت نشانہ بازی کی سمجھ کر بدن ایسی وضع پر سادھ لیا جو فرق ہو جانے کی وجہ تھی نہ ہوئی تیر اندازوں کو دیکھا ہے کہ سر سے پا تک ایک خط مستقیم ہو جاتے ہیں حاصل یہ کہ اس طوفان بے تمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے، ہم نے کبھی مولانا کو گھبراتے نہ دیکھا خبروں کا اس وقت میں چرچا تھا۔ جھوٹی سچی ہزاروں گپ شپ اڑا کرتی تھی مگر مولوی صاحب اپنے معمولی کام بدستور انجام فرماتے تھے چند بار مفسدوں سے نوبت مقابلہ کی آگئی اللہ رے مولوی صاحب ایسے ثابت قدم تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں کا مقابلہ ایک بار گولی چل رہی تھی یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے جس نے دیکھا جانا گولی لگی ایک بھائی دوڑے پوچھا کیا ہوا فرمایا کہ سر میں گولی لگی عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔ انہیں دنوں ایک نے منہ در منہ بندوق ماری جس کے سنبھے سے ایک موچھ اور کچھ داڑھی جل گئی اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا اور خدا جانے گولی کہاں گئی اور اگر گولی نہ تھی تو اتنے پاس سے سنبھ بھی بس تھا مگر حفاظت الٰہی بر سر تھی کچھ اثر نہ ہوا اس زخم کی خبر اجمالی بعض دشمنوں نے جو سنی تو سرکار میں مخبری کی کہ تھانہ بھون کے فساد میں شریک تھے۔ حالانکہ مولانا فسادوں سے کوسوں دور تھے ملک و مال کے جھگڑے اگر سر رکھتے تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی کہیں کے ڈپٹی یا صدر الصدور ہوتے اس لئے حاجت روپوشی کی ہوئی حضرت حاجی صاحب بھی ایسے ہی باعث سے روپوش ہو گئے تھے۔ ایام روپوشی میں ایک روز دیوبند تھے زنانہ مکان کے کوٹھے پر مردوں میں سے کوئی تھا نہیں زینہ میں آکر فرمایا پردہ کرلو میں باہر جاتا ہوں عورتوں سے رک نہ سکا باہر چلے گئے بعضے مرد بازار میں تھے ان کو اطلاع کی وہ اتنے میں مکان پر پہنچے ادھر سرکاری آدمیوں کی پہنچ گئی تھی انہوں نے آکر تلاشی لی ہر چند بظاہر مولوی صاحب کی تلاش نہ تھی مگر پھر خوف کی جگہ تھی اس کے بعد سے مسجد میں رہتے اور پھر کسی نے تعرض نہ کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے چند بار بچایا اس زمانہ کی کیفیات عجیب غریب گذری ہیں لکھنا ان کا طول ہے۔ اسی وقت میں دیوبند

مولوی صاحب کا ایام غدر میں نہ گھبرانا

مولوی صاحب کا بندوقچیوں سے تلوار لیکر مقابلہ کرنا

مولوی صاحب پر ایک شخص کا بندوق مارنا

مولوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ہر آفت سے بچا لیا

اور املیا وغیرہ مختلف جائے پر متفرق اوقات بن رہے - بوڑیہ، گمتھلہ - لاڈوہ - پنجلاسہ - جمنا پار کئی دفعہ گئے آئے آخر حضرت حاجی صاحب عرب کو روانہ ہو گئے احقر کو بعد ان کے یہی سوجھی کہ تو بھی چل مولانا کی روپوشی محض عزیز و اقارب کے کہنے سے تھی ورنہ ان کو اپنی جان کا کچھ خیال نہ تھا مولانا نے بھی ارادہ کیا اس روپوشی کی بلا کے سبب والدین نے بخوشی اجازت دیدی احقر بے سامان تھا قلیل سا زاد راہ بہم پہنچایا تھا مگر مولوی صاحب کے بدولت وہ سب راہ بخیر و خوبی طے ہوئی ہر چند مولوی صاحب بھی بے سامان تھے مگر بدولت توکل سب راہ بخیر و خوبی پوری ہوئی اور سب کام انجام ہو گئے کشتیوں کی راہ پنجاب ہو کر سندھ کی طرف کو گئے کراچی سے جہاز میں بیٹھے - جمادی الثانی سنہ ۱۲۷۷ بارہ سو ستتر میں روانہ ہوئے اور آخر ذی قعدہ میں مکہ معظمہ پہنچے بعد حج مدینہ شریف روانہ ہوئے اول صفر مراجعت کی اسی مہینہ کے آخر میں جہاز میں بیٹھے ربیع الاول کے آخر میں بمبئی آئے - جمادی الثانی تک وطن پہنچے جاتی دفعہ کراچی سے جہاز بادبانی میں سوار ہوئے تھے - رمضان کا چاند دیکھ کر مولوی صاحب نے قرآن شریف یاد کیا تھا اول وہاں سنایا اور جہاز میں کیا سیر تھا بعد عید مکہ پہنچکر حلوائے مسقط خرید فرما کر شیرینی ختم دوستوں کو تقسیم فرمائی - مولوی صاحب کا اس سے پہلے قرآن یاد کرنا کسی کو ظاہر نہ ہوا تھا آہستہ آہستہ پڑھتے اور یاد کر لیتے اور حافظوں کے نزدیک ٹھہرا ہوا ہے کہ بلند آواز سے یاد ہوتا ہے - بعد ختم مولوی صاحب فرماتے تھے کہ فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا ہے اور جب یاد کیا پاؤ سیپارہ کی قدر یا کچھ اس سے زائد یاد کر لیا اور جب سنایا ایسا صاف سنایا جیسے اچھے پرانے حافظ - پھر تو اکثر بہت بہت پڑھتے - ایک بار یاد ہے کہ ستائیس پارے ایک رکعت میں پڑھے اگر کوئی اقتدا کرتا رکعت کر کرا اس کو منع فرما دیتے اور تمام شب تنہا پڑھتے رہتے - بعد زیارت حرمین شریفین ایک برس کچھ کم و زیادہ میں وطن آئے - مراجعت براہ بمبئی اور ناسک ہوئی ریل ناسک تک تھی وہاں سے گاڑیوں میں آئے پیچھے بعد تحقیقات سرکار نے مطالبۂ عام

مولوی صاحب اور حاجی صاحب کا مکہ معظمہ کو جانا

مولوی صاحب کا قرآن شریف حفظ کرنا

اٹھادیا تھا۔ چند خاص شخصوں کی نسبت جن پر سرکار کا شبہ قوی تھا اشتہار جاری رہا۔ پھر گھر پر اپنے رہے غدر میں دہلی کا تو سب کارخانہ درہم برہم ہوگیا تھا مولوی احمد علی صاحب کا مطبع گیا گذرا تھا اس زمانہ میں سوائے وطن اور کوئی جگہ جانے کی نہ تھی کبھی وطن کبھی دیوبند رہتے تھے اسی وقت میں احقر نے حضرت سے بخاری قدرے پڑھی پھر منشی ممتاز علی صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا مولوی صاحب کو پرانی دوستی کے سبب بلالیا وہی تصحیح کی خدمت تھی۔ یہ کام برائے نام تھا مقصود ان کا مولوی صاحب کو اپنے پاس رکھنا تھا احقر اس زمانہ میں بریلی اور لکھنؤ ہوکر میرٹھ میں اسی چھاپہ خانہ میں نوکر ہوگیا۔ منشی جی حج کو گئے تھے، اس وقت میں ایک جماعت نے مسلم پڑھی احقر بھی اس میں شریک رہا۔ وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی۔ مولوی فضل الرحمٰن اور مولوی ذوالفقار علی صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں۔ مدرس کے لئے تنخواہ پندرہ روپے تجویز ہوئے اور چندہ شروع ہوا چند ہی روز گذرے کہ چندہ کو افزونی ہوئی اور مدرس بڑھائے گئے اور مکتب فارسی اور حافظ قرآن مقرر ہوئے اور کتب خانہ جمع ہوا مولوی محمد قاسم صاحب شروع مدرسہ میں دیوبند آئے اور پھر ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہوئے۔ مدرسہ کے احوال لکھنا یہاں طول لاطائل ہے سالانہ کیفیتوں سے یہ سب امر واضح ہوجاتے ہیں ۱۲۸۵ھ ہجری میں مولانا کو حج کی پھر سوجھی چند رفقاء کو ساتھ لے کر حج کر آئے اور منشی ممتاز علی صاحب بھی اسی سال بقصد قیام عرب کو گئے مگر ایک سال بعد واپس آگئے پھر مولوی صاحب دہلی گئے منشی جی کا چھاپہ خانہ دہلی میں ہوا منشی جی کے پیچھے میرٹھ میں مولوی محمد ہاشم صاحب کے مطبع میں کام کیا اس زمانہ میں پڑھانا اکثر تھا سب کتابیں بے تکلف پڑھاتے تھے اور اس طرح کے مضامین بیان فرماتے تھے کہ نہ کسی سے سنے نہ سمجھے اور عجائب وغرائب تحقیقات ہر فن میں بیان فرماتے جس سے تطبیق اختلافات اور تحقیق ہر مسئلہ کی بیخ و بن تک ہوجاتی

دیوبند کے مدرسہ کی بنیاد

مولوی صاحب کی مدرسہ کی سرپرستی

تھی۔ آج ان کے فیض تعلیم کا اثر موجود ہے ہر چند ذرہ آفتاب کا کیا نمونہ مگر پھر اسی جمال کا آئینہ ہے اور وہی اس کے حوصلہ کی بموجب اس میں جلوہ گر ہے جو چاہیں دیکھ لیں اور ان کی تحریرات و تقریرات کو سن لیں مولوی صاحب نے اس عرصہ میں چند تحریرات کے بعضے جواب کسی سوال کے بعض فرمایش کسی دوست کی بعض اتفاقیہ اگرچہ مجموعہ ان کا کثیر ہے مگر ایسے پریشان ہیں کہ اجتماع ان کا مشکل ہے زیادہ تر فیض رسانی کی طرف اسی زمانہ میں توجہ ہوئی مولوی صاحب سے پڑھنا نہایت ہی دشوار تھا جو شخص طباع ہو اور پہلے سے اصل کتاب سمجھا ہوا ہو تب مولوی صاحب کی بات سمجھ سکتا تھا ہر چند مولوی صاحب نہایت ہندی کی چندی کر کر بیان فرماتے مگر پھر مشکل بات مشکل ہی ہوتی ہے اسی زمانہ کے درمیان میں دہلی میں پادریوں کے وعظ کا چرچا تھا اور مسلمانوں میں سے بعضے بے چارے اپنی ہمت سے ان سے مقابلہ کرتے تھے کوئی اہل علم جن کا یہ کام تھا اس طرف توجہ نہ کرتا تھا مولوی صاحب نے اپنے شاگردوں کو فرمایا کہ تم بھی کھڑے ہو کر بازار میں کچھ بیان کیا کرو اور جہاں وہ لوگ بمقابلہ نصاریٰ بیان کرتے ہیں ان کی امداد کیا کرو آخر مباحثہ کی ٹھہری اور مولوی صاحب بے کسی صورت و شکل بنائے اور اپنا نام چھپا جا موجود ہوئے، ایک پادری تارا چند نام تھا اس سے گفتگو ہوئی آخر وہ بند ہوا اور گفتگو سے بھاگا اسی زمانہ میں مولوی منصور علی صاحب دہلوی سے جو فن مناظرہ اہل کتاب میں یکتا ہیں ملاقات ہوئی مولوی منصور علی صاحب بیبل کے گویا حافظ ہیں اور ان کا طرز مناظرہ بھی جداگانہ ہے اب انہیں کے شاگرد بمقابلہ پادریوں کے دہلی میں وعظ کہا کرتے ہیں۔ اتفاقات تقدیر سے ۱۲۹۳ھ بارہ سو ترانوے ہجری میں چاند پور ضلع شاہجہاں پور میں کوئی تعلقہ دار ہے پیارے لال اصل ہندو کبیر پنتھی ہے اس کو شاید میل نصرانیت کی طرف ہوا اس نے ہندو پنڈت اور پادری نصاریٰ اور عالم مسلمانوں کو جمع کرنا چاہا باہم ایک گفتگو ہو اور تحقیق مذہبی کا ایک میلہ

مولانا صاحب کا میرٹھ میں درس دینا اور نکات عجیب و غریب بیان کرنا

[illegible]

ابتدائے میلہ خدا شناسی

قائم کیا اور میلہ خدا شناسی اس کا نام رکھا بریلی اور وہاں کے اطراف کے لوگوں نے مولوی صاحب کو اطلاع کی مولوی صاحب نے سامان سفر درست کیا اور روانہ ہوئے اور دہلی سے مولوی منصور علی صاحب کو بلوایا اور یہاں سے بعضے اور لوگ ساتھ روانہ ہوئے شاہجہانپور پہنچے اور وہاں سے اس گاؤں میں پہنچے اول گفتگو کے باب میں اور اس کے وقت مقرر کرنے میں ایک بحث رہی پھر آخر گفتگو ہوئی طرز گفتگو کی نہ تھی بلکہ ہر شخص اپنی باری پر کچھ بیان کرتا تھا ہر چند وقت مقید تھا مگر مولوی صاحب نے ابطال تثلیث و شرک اور اثبات توحید ایسا بیان کیا کہ حاضرین جلسہ مخالف و موافق مان گئے کیفیت اس جلسہ کی چھپی ہوئی ہے جو کوئی چاہے دیکھ لے مولانا کی تقریر اس میں مندرج ہے آخر میں حسب عادت پادریوں نے بحث تقدیر پیش کی پادری جب عاجز آتے ہیں یہی مسئلہ پیش کیا کرتے ہیں مولانا نے اس مشکل مسئلہ کو ایسا بیان فرمایا کہ ہر خاص و عام کی سمجھ میں بخوبی آگیا۔ اگلے سال یعنی ۱۲۹۴ھ میں پھر اس جلسہ کی خبر ہوئی پھر مولانا تشریف لے گئے اس سال میں مجمع ہنود میں ایک بہت بڑے پنڈت دیانند سرستی نامور تھے۔ ہر چند نو ایجاد مذہب ان کا توحید اور انکار بت پرستی میں اور عام ہنود کی نسبت جدا گانہ ہے مگر دید کے ایمان اور بعضے اور مسائل جیسے آواگون وغیرہ میں برابر ہیں تقریر اس شخص کی اکثر سنسکرت کے ساتھ ملی ہوتی تھی اس لئے دشواری ہوئی مگر مولوی محمد علی صاحب جو بمقابلہ مذہب ہنود مشہور ہیں انہوں نے کچھ اس کا جواب کہا پھر مولانا نے بحث وجود اور توحید کا ذکر کیا اور ایسا بیان کیا کہ حاضرین کو سوائے سکوت اس کے استماع کے اور کام نہ تھا پھر کچھ گفتگو تحریف کی ہوئی یہ بھی بحمد اللہ تعالیٰ الزام تحریف کا ان کے اقرار سے ثابت ہوا حتیٰ کہ پادری لوگ عین جلسہ میں سے ایسے بے سر و پا بھاگے کہ ٹھکانا نہ معلوم ہوا۔ اپنی بعض کتابیں بھی بھول گئے اس جلسہ سے جناب کامیاب واپس آئے اور نصرت دین اسلام کہ تا بقیام قیامت منصور رہے گا ان کی ذات سے پوری ظاہر ہوئی اور ان دو سال کے جلسوں میں عام مخلوق نے جان لیا کہ یہ شخص کس پایہ کا

مولوی صاحب کا جلسہ مناظرہ میں پنڈتوں اور پادریوں کو ساکت کر دینا

ہے اور فضل الٰہی کی کیا صورت ہوا کرتی ہے۔ جز بتائید آسمانی نیست کا نقشہ ظاہر ہو گیا حتی
کہ پادری بھی بول اُٹھے کہ اگر تقریر پر ایمان لایا جاتا تو یہ تقریر خوش ایسی لطیف اور دل میں
اثر کرنے والی ہے کہ اس پر ایمان لائے مگر ایمان جس کے نصیب میں ہے وہی اس سے
مشرف ہوتا ہے ورنہ حق واضح ہے کیفیت اس میلہ کی وہاں سے آکر مرتب ہوگئی تھی مگر
اتفاق طبع کا نہ ہو سکا اب کہ مرض اور وقت آخر تھا طبع اس کا شروع ہوا اب امید ہے کہ
ختم ہو کر مشتہر[1] ہو اور سب صاحب اس سے مستفید ہوں اس وقت میں یہ سنا تھا کہ غالباً
حاجت کسی تحریر کے پیش کرنے کی بھی ہوگی اس پر مولوی صاحب نے وہیں بیٹھ کر کچھ تحریر
کیا تھا اور اس کا نام حجۃ الاسلام رکھا ہے وہ کتاب طبع ہوگئی ہے پھر اسی سال ارادہ جناب
مولنا مولوی رشید احمد صاحب کا حج کو جانے کا تھا احقر بھی تیار ہوا اور چلتے میں مولانا
کو بھی ساتھ لے ہی لیا اور مولوی صاحب کے ساتھ اور کچھ کتنے ہی معتقد و خادم آپ کے
روانہ ہوئے شوال ۹۴ھ میں روانہ ہوئے اور ربیع الاول ۹۵ھ کے اول پھر اپنے وطن واپس
آئے۔ اس سفر میں تمام قافلہ علماء کا تھا اٹھارہ بیس مولوی فاضل ساتھ تھے اور عجیب لطف کا
مجمع تھا حضرت کی زیارت سے اور ان متبرک مکانوں کی زیارت سے مشرف ہو کر جب
واپس ہوئے ہدہ پہنچکر مولانا کو بخار ہو گیا یہ خیال ہوا کہ جدائی ایسے بزرگ اور بزرگ مقاموں
اور پیادہ پا زیادہ چلنے کے سبب سے ہے اور نہ کچھ پہلے حج سے بھی طبیعت ناساز بھی جدہ
پہنچتے ہی جہاز پر سوار ہو گئے اس جہاز کا لنگر اٹھنے والا تھا اور دیگر جہازوں کی خبر عشرہ بلکہ
دو ہفتہ تک کی تھی اس لئے یہ خیال کیا کہ پندرہ روز میں بمبئی جا پہنچیں گے اور اتنی تکلیف
اٹھا لیں گے واقعی اس جہاز میں اتنی ہی تکلیف ہوئی جتنی جاتی دفعہ جہاز میں آسائش و
راحت پائی تھی دو روز جہاز پر چڑھے ہوئے ہوئے تھے کہ مولانا کو دورہ صفراء معمولی ہوا
اور بخار بھی۔ وہاں نہ جگہ راحت کی نہ دوا نہ کچھ تدبیر مرض کی شدت ہوئی ایک دن یہ نوبت ہوئی

ماتحت طبع حجۃ الاسلام

ہمراہی مولانا رشید احمد صاحب احقر اور مولوی صاحب کا مکہ کو جانا

مولوی صاحب کا [illegible]

[1] مدت ہوئی کہ وہ کتاب طبع ہوگئی ۱۲

کہ ہم سب مایوس ہو گئے اور جہاز میں وبا تھی ہر روز ایک دو آدمی انتقال کرتے تھے عدن پہنچے وہاں قرنطینہ ہو گیا یعنی بہ سبب مرض نہ جہاز کے آدمی کنارہ پر اتر سکے اور نہ شہر کے آدمی جہاز پر آ سکے بعدہٗ پھر مکلا میں قدرے قیام کیا وہاں سے البتہ نیمبو بکنے آئے وہ لئے تربوز اور گلاب اور بعض ادویہ جہاز میں مل گئیں تھیں جہاز کے ڈاکٹر نے کونین دی اور مرغ کا شوربہ غذا کو کہا وہاں مرغ کہاں میسر تھا آخر مرغ بھی اپنے پاس سے دیا مولانا کو دورہ میں غذا سے نفرت مطلق ہو جاتی تھی اب کچھ رغبت شروع ہوئی بمبئی ایسے پہنچے کہ بیٹھنے کی طاقت دشواری سے تھی دو تین روز ٹھہر کر وطن کو روانہ ہوئے ہر چند موسم سرما تھا مگر جبلپور کے میدانوں میں دو پہر کو لو چلنے لگی اور مولانا کی طبیعت بگڑی خیر الحمد للہ اس وقت نارنگی نیمبو یہ چیزیں پاس تھیں کھلائیں پانی پلایا۔ وطن پہنچنے کے بعد مرض رفع ہوا گو نہ طاقت آئی مگر کھانسی ٹھہر گئی اور کبھی کبھی دورہ سانس کا ہو تا زیادہ بولنا دیر تک کچھ فرمانا مشکل ہو گیا پھر اس میں بھی کسی قدر تخفیف ہوئی اسی سال شعبان میں رڑکی سے خبر ملی کہ پنڈت دیانند تشریف لائے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے مذہب پر کچھ اعتراض مشتہر کئے ہیں۔ اہل رڑکی مولانا کو مجبر ہوئے کہ آپ تشریف لائیں مولانا باوجود ضعف اور مرض کے تشریف لیگئے اور بہت سے خادم ساتھ ہوئے اور اطراف و جوانب سے بہت سی مخلوق مولانا کی تقریر کے اشتیاق میں جمع ہو گئی مگر وہ بندہ اللہ کا گفتگو پر یکجا نہ ہوا اینڈی بینڈی شرطیں کرتا تھا جس سے عاقلان خود میدانند اس کی نیت سمجھ میں آتی تھی آخر غرض وہ چلدیا اور مولانا نے وہاں ایک وعظ کہا اور اس کے اعتراضوں کے جواب ذکر فرمائے پھر واپس دیوبند تشریف لا کر رمضان وطن میں کیا اور اس عرصہ میں تحریر اس تقریر کی شروع کی جو اس کے جواب میں فرمائی تھی اصل اعتراض اس کا استقبال قبلہ پر تھا کہ یہ بت پرستی ہے اس رسالہ کا نام قبلہ نما ہے بہت بڑے حجم کا رسالہ ہے پھر پنڈت دیانند کہیں پھر پھرا کر میرٹھ پہنچے اور وہاں وہی ان کے دعوے تھے اچھی جس کو شرم نہ ہو جو چاہے کرے۔ اتفاقاً جناب مولوی صاحب بھی ان دنوں میرٹھ کا ارادہ فرما رہے تھے کہ وہاں سے بعضے صاحبوں نے بلانے کے بارہ میں تحریک کی غرض مولانا میں ہر چند

مولوی صاحب کے نام سے دیانند کا فرار ہونا اور مولوی صاحب کا وعظ فرمانا

مرض کے بقیہ اور ضعف کے سبب قوت نہ تھی مگر ہمت کر کے پہنچے تو وہ بہانہ و حیلہ کر کے وہاں سے کافور ہو گیا وہاں بھی اس کا جواب ویسے ہی مولانا نے کچھ بیان فرمایا اور پھر کچھ تحریر شروع کی جس کو مولوی عبدالعلی صاحب نے بطرز جواب لکھا اور نام جواب ترکی بترکی رکھا پنڈت کے بعض معتقدوں نے کچھ تحریر بجواب مولانا۔ بے سر و پا لکھی تھی اور کچھ اوٹ پٹانگ مسلمانوں کے مذہب پر اعتراض کئے تھے یہ رسالہ اس کے جواب میں ہے اور اس عرصہ میں چند بار جلد جلد وہی دورہ ہوا اور کئی بار صورت سانس کی سی ہو گئی پھر اللہ جل شانہ نے تخفیف فرما دی یوں خیال تھا کہ اب یہ مرض ٹھہر گیا خیر دورہ ہے ہر چند صحت اور نجات کی امید پوری نہ تھی۔ کیونکہ علاج ہر قسم کے ہوئے صورت آرام کی نہ ہوئی یونانی طبیبوں نے ہر قسم کا علاج کیا ڈاکٹروں نے ہر طرح سے تدبیر کی ہندی ادویہ کشتے رس وغیرہ برتے مگر مرض رفع نہ ہوا دو برس اسی کیفیت پر گذر گئے کہ گاہ کچھ صورت تخفیف کی ہو کر قدرے طاقت آئی اور پھر دورہ سانس کا ہوا اور وہی صورت ضعف کی ہو گئی ایک روز کے مرض میں مدتوں کی طاقت سلب ہو جاتی تھی اور مولانا نے برخلاف عادت اس مرض میں جو علاج ہوا اسکو قبول کیا جو دوا کھلائی کھائی جو تدبیر کسی نے کی اس کو کر لیا البتہ مزاج لطیف و نفیس تھا ویسی ہی دوا کو پسند فرماتے اور بعد عرض کرنے خدام کے جو دوا ہوتی استعمال فرما لیتے کئی بار مسہل بھی ہوا سر دست تخفیف ہو جاتی تھی مگر جڑ مرض کی نہیں جاتی تھی۔ حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی آخر تک مصروف رہے اور ڈاکٹر حافظ عبدالرحمٰن صاحب مظفر نگری نے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ مگر تقدیر سے چارہ نہیں اور موت کا کچھ علاج نہیں اور وقت مقدر ٹلتا نہیں اگر دوا اور تدبیر پر کام ہوتا بیشک مولانا کو صحت ہوتی وہ دوائیں مولانا کے لئے میسر ہوئیں کہ جو امراء کو بھی شاید بدشواری میسر آویں اور ویسا علاج ہوا کہ جو بادشاہوں کو بھی شاید ہی نصیب ہو کہاں طمع اور خوف کی بات اور کہاں عقیدت قلبی آخر کو صورت مرض کی یہ ہوئی کہ جناب مولوی احمد علی صاحب کو فالج ہو گیا تھا اس میں سہارنپور تشریف لے گئے اور حافظ عبدالرحمٰن صاحب کو مظفر نگر سے بلایا تھا اسی روز گئے اور پھر شام کو واپس ریل میں آئے۔

مولوی صاحب کا تقریر فرمانا اور مولوی عبدالعلی کا جواب ترکی بترکی نام رکھنا

مولوی صاحب کا باسبب مرض کبھی صحت پانا اور کبھی بیمار ہو جانا

نکان کے سبب طبیعت علیل ہو گئی مگر چند روز کے بعد صحت ہو گئی جب قوت آئی علاء الدین
بندہ زادہ کی استدعا پر کچھ پڑھانا بھی شروع کیا۔ بعد عصر کچھ ترمذی کی ایک دو حدیث ہوتی جب تک
کھانسی نہ اٹھتی بیان فرماتے تھے اور جب کھانسی کم ہوتی تب بھی ذرا ٹھہر کر بیان فرماتے اور جب
شدت ہو جاتی موقوف فرما دیتے پھر اسی عرصہ میں سہارنپور کا قصد کیا اور جناب مولوی احمد علی صاحب
کو تخفیف اصل مرض میں ہو گئی تھی مگر بخار اور ضعف شدید تھا مولوی صاحب ٹھہرنے کے باعث
ہوئے دو ہفتہ وہاں قیام فرمایا اور اتنا قیام خلاف عادت تھا وہاں دورہ ہوا اور ساتھ ہی اس کے
ذات الجنب بھی ہوا یہاں دوسرے دن خبر ہوئی اسی روز حافظ انوار الحق صاحب روانہ ہوئے اور
صبح کو مولوی صاحب کو ریل میں لے آئے مگر آئے کیا کہ سانس نہ آتی تھی ناچار فصد لی درد موقوف
ہوا پھر کچھ درد کا اثر معلوم ہوا اس کے لئے جونک لگائی دو تین دن طبیعت صاف رہی اس عرصہ
میں دہلی سے کچھ دوائیں مقوی آئی تھیں ان کا استعمال ہوا ضعف نہایت تھا بات کرنی دشوار تھی
اس میں حرارت کو شدت ہو گئی اور کبھی کبھی غفلت ہو جاتی تھی اول ایک مُلیّن دیا تھا رائے
ہوئی کہ پھر مُلیّن دیا جائے ملیّن دیا دو دست ہو کر غفلت کو شدت ہوئی ظہر کے وقت تک جواب
دیتے تھے مگر ہوش نہ تھا یہاں تک کہ نماز کے لئے کہا تو سوائے اچھا کے اور کچھ نہ کر سکے
نہ تیمم کی طرف توجہ ہوئی نہ نماز کی طرف تب ایک صورت یاس کی ہوئی یہ منگل کا دن تھا آخر روز
میں وہ جواب بھی موقوف ہو گیا اور ایک تشنج کی آمد شروع ہوئی اس کو نزع اور یوں جانا کہ
اب وقت آخر ہے مگر وہ رات اور دن اور اگلی رات اور دوپہر جمعرات کے اسی کیفیت پر گذرے
اس وقت میں سب احباب امروہہ۔ مراد آباد۔ میرٹھ۔ سہارنپور۔ گنگوہ۔ نانوتہ وغیرہ سے جمع ہو گئے
تھے چوتھی جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ بارہ سو ستانوے ہجری جمعرات کو بعد نماز ظہر اچانک دم آخر ہو گیا
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔ ایک قیامت ہو گئی گھر میں وسعت نہ تھی مدرسہ میں لاکر جنازہ
رکھا اور بعد غسل و کفن باہر شہر ایک قطعہ زمین حکیم مشتاق احمد صاحب نے خاص قبرستان
کے لئے اسی وقت وقف کر دیا وہاں اول مولانا صاحب کو دفن کیا مغرب سے پہلے نماز ہوئی

باہر شہر کے میدان میں نماز ہوئی اتنا مجمع ان بستیوں میں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا بعد مغرب دفن
کیا اور اس خزانہ خوبی کو سپرد زمین کر دیا اور ہاتھ جھاڑ کر چلے آئے مولوی صاحب کے انتقال کا سا غم و الم
کبھی نہیں دیکھا تھا ایک ماتم عام تھا ہر چند شور و غوغا اور سر پیٹنا اور کپڑے پھاڑنا نہ تھا کیونکہ بہ برکت
صحبت مولانا جتنے لوگ تھے حدود شرعی سے باہر نہ ہوتے تھے مگر ایسا غم عام ہم نے دیکھا
نہ سنا اللہ تعالیٰ درجات عالی جنت میں نصیب فرماوے اور جوار خیر میں جگہ دیوے جناب مولوی
رشید احمد صاحب گنگوہی سلمہ کو منگل کے روز خبر کی بدھ کے دوپہر سے پہلے مولوی صاحب تشریف
لائے اور جمعہ کے روز سہارنپور کو تشریف لے گئے مولوی صاحب کو یہ ایسا صدمہ ہوا ہے کہ اس
سے زیادہ کیا متصور ہو گا مگر ایسے ضابط کہ سکوت اور نماز میں اکثر گذرتی رہی مولوی صاحب کی
طبیعت پہلے سے بھی ناساز تھی اب یہ صدمہ ہوا سہارنپور پہنچکر شنبہ کے روز جناب مولوی احمد علی صاحب
کا انتقال ہو گیا یہ آفت پر آفت اور مصیبت پر مصیبت ہو گئی مگر مولوی صاحب کے صدمہ کے
جنب اور مقابلہ میں یہ صدمہ بہت ہی کم ہو گیا ورنہ خدا جانے اس کا کتنا صدمہ ہوتا۔ جناب
مولوی صاحب نے دو صاحبزادے چھوڑے ایک میاں احمد جن کی عمر اٹھارہ برس کی ہے۔
شادی ہو گئی طالب علمی میں مصروف ہیں بحمد اللہ طبیعت تیز مزاج سنجیدہ ہے مولانا کے قدم
بقدم خدا تعالیٰ کرے اور ویسی ہی شہرت اور عزت خدا نصیب کرے اور صلاح و تقوے اور
نشر علم و خیر ان کی ذات سے فرماوے چھوٹے صاحبزادے میاں محمد ہاشم آٹھ برس کی عمر
بہت ذی ہوش مستقیم مزاج ہیں قرآن شریف حفظ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کمالات ظاہری اور
باطنی نصیب فرماوے اور تین صاحبزادیاں ہیں ایک بی بی اکرامن یہ سب سے میاں احمد
سے بھی بڑی ہیں۔ مولوی صاحب کی اول اولاد یہی ہیں نکاح ان کا جناب مولوی صاحب نے میاں
پیرجی مولوی عبداللہ صاحب سے کیا ہے یہ احقر کے ہمشیرہ زادے ہیں اور اولاد میں شاہ ابوالمعالی
انبہٹوی کے ہیں اور مولوی انصار علی صاحب مرحوم کے بیٹے ہیں۔ احقر سے اکثر کتابیں پڑھی ہیں
اور جناب مولوی صاحب سے بھی پڑھا ہے نہایت عمدہ آدمی ہیں ان کے تین لڑکیاں اس وقت

[حاشیہ: ایک نسخہ میں "خزانۂ خوبی" کی جگہ "…" ہے]

مولوی احمد علی صاحب کا انتقال

صاحبزادوں کا حال

صاحبزادیوں کا حال

موجود ہیں اللہ تعالیٰ ان کی نسل میں برکت کرے مولوی صاحب کی سب اولاد میں صلاح و خوبی
عام ہے اخلاق عمدہ مہمان نوازی عادت مستمرہ ہے ان سے چھوٹی بی بی رقیہ ہیں ان کا نکاح مولوی
پیرجی محمد صدیق سے کیا ہے یہ مولوی صاحب کے ماموں مولوی امین الدین صاحب مرحوم کے
نواسے ہیں اور اولاد میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں نہایت نیک اور
سنجیدہ مزاج ہیں ان کے ایک لڑکا ہے جناب مولوی صاحب نے دونوں لڑکیوں کا نکاح بالکل
سنت کے موافق کیا بدون اطلاع کسی کے جمعہ کے روز بعد جمعہ نکاح کر دیا البتہ جناب
مولوی رشید احمد صاحب کو بلوالیا تھا اور ان کو غالباً اطلاع فرما دی تھی اور کسی کو خبر نہ تھی اور نہ
کچھ جہیز وغیرہ کی فکر کی گئی مگر بعنایت خداوندی دونوں کے پاس زیور کپڑا جیسے ہماری برادری
میں ہوا کرتا ہے موجود ہے نہایت خوش و خرم گذران ہے۔ اللہ کا شکر اور احسان ہے۔
چھوٹی صاحبزادی بی بی عائشہ ان کی عمر چار برس کی ہے۔ مولوی صاحب کو ان سے بہت
محبت تھی بخلاف اور اولاد کے مولوی صاحب ان کو پاس بٹھلا لیتے اور ان سے باتیں کرتے
اللہ تعالیٰ عمر و صلاح نصیب فرماوے یہ اس عمر پر بہت ہوشیار اور خوش مزاج ہیں اللہ تعالیٰ
اور مزید فرماوے جناب مولوی صاحب سے بہت سے لوگوں کو نسبت شاگردی ہے مگر عمدہ
ان میں سے ایک مولوی محمود حسن صاحب فرزند کلاں مولوی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی ہیں
اکثر کتابیں مدرسہ دیوبند میں پڑھیں اور حدیث مولانا کی خدمت میں حاصل کی اور تکمیل وہاں
ہوئی دیوبند مدرسہ کی طرف سے ان کو دستار فضیلت اول بار بندھی دوسرے مولوی فخر الحسن
صاحب گنگوہی ہیں وارستگی مزاج میں مولانا کے قدم بقدم بلکہ کچھ بڑھ کر ہیں عمدہ استعداد ہے
انہوں نے بھی مدرسہ دیوبند میں تحصیل کی ہے اور اول جناب مولوی رشید احمد صاحب
سے تحصیل کی تھی تیسرے مولوی احمد حسن امروہوی ان سے مولانا کو کمال محبت تھی نہایت عمدہ
ذہن و ذکار اور اعلیٰ درجہ کی عمدہ استعداد ہے اور جناب مولانا سے کمال مناسبت ہے اور ان صاحبوں
کے علاوہ مولانا کے بہت سے شاگرد ہیں۔ مولانا باوجود اجازت حضرت حاجی صاحب مخدوم و مکرم

آپ کے اعلیٰ درجہ کے شاگردوں کا حال

وقبلہ ایک زمانہ تک کسی کو بیعت نہ کرتے تھے پھر آخر بہت تاکید کے بعد چند لوگ بیعت ہوئے اور بہت سے ان میں محقق صاحب حال ہیں مگر مولوی صاحب نے کسی کو اجازت نہیں فرمائی اور اب آخر میں بیعت سے انکار فرمادیتے تھے اگر کوئی طالب ہوا کچھ وظیفہ بتلادیتے جیسے مولٰنا کے شاگرد اور مرید فدائی اور جاں نثار خادم ہیں ایسے کہاں ہوتے ہیں حالانکہ مولانا سب کی ساتھ دوستانہ اور برابری کا سا برتاؤ رکھتے تھے بلکہ تعظیم وتکریم سے گھبراتے تھے ؛ بعد انتقال جناب مولوی صاحب بہت سی تاریخیں اکثر صاحبوں نے نکالیں سب کا یہاں ذکر کرنا طول ہے ان میں دو مادے پسند احقر ہوئے ہیں ان کو ذکر کرتا ہوں۔ ایک خود احقر نے نکالا ہے "کیا چراغ گل ہوا" اور اس کو نظم بھی کیا ہے۔ کئی طور پر اور دوسرا مادہ نہایت عمدہ بغایت پسندیدہ مولوی فضل الرحمٰن صاحب دیوبندی نے بھی نکالا ہے۔ "وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے" مولوی صاحب نے ایک قطعہ نظم بھی فرمایا ہے جس کا یہ ایک مصرعہ ہے اور دونوں بزرگوں کی وفات کی تاریخ عبدالرحمٰن خاں صاحب مالک مطبع نظامی کانپور نے نہایت عمدہ نکالی ہے یہ ہے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا دَائِمًا اور احقر نے یہ مادہ اس کے لئے پایا ہے مصیبت پر آئی مصیبت فقط

اب دعا پر ختم کلام کرتا ہوں۔ یا اللہ یا رب یا کریم اپنے فضل عمیم وعنایت عام وتفضل تام سے ان حضرات کو اعلیٰ علیین میں مقام کرامت فرما اور ہم پس ماندوں کو ان کے طریق مستقیم ہدایت پر استقامت نصیب فرما اسی پر زندہ رہیں اور اسی پر مریں اور اسی پر حشر ہو آمین ثم آمین۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوانح قاسمی

جلد اول

ذاتی اور عائلی حالات

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

تمہید ہند کی قدیم راجدہانی دہلی کے شمالی مغربی سمت میں دامن ہمالیہ کے نیچے جو علاقہ شرقاً وغرباً دور تک پھیلا ہوا ہے، یہی نہیں کہ ہندوستان کے دونوں بابرکت دریا گنگا وجمنا پہاڑ سے اتر کر اسی سرزمین کی مٹی چومتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، اور شمالی ہند کے میدانوں کو ہر سال نئی زندگی ان ہی کی بدولت میسر آتی ہے، بلکہ اسی خطۂ پاک سے ان دونوں باطنی اور معنوی نہروں کے بھی سوتے پھوٹے ہیں، جن کی طراوت بخشیوں سے شمال کے ساتھ جنوب کی بھی روح صدیوں سے سرو تازگی حاصل کر رہی ہے، کلیر جلیل وبرتر کی علائی بارگاہ اور گنگوہ پرشکوہ کی قدوسی درگاہ کو خانوادۂ چشت کے دائرے میں مرکزیت کا مقام حاصل ہے اس سے کون ناواقف ہے، ان کے سوا بھی تھانہ بھون[۱]

[۱] سرکار سہارنپور میں تھانہ کے نام سے دو پرگنے موسوم تھے تمیز کے لئے ایک کو "تھانہ بھیم" اور دوسرے کو "تھانہ بھون" یا "بھیون" کہتے تھے اخیر زمانہ میں حکیم الامۃ قدس اللہ سرہ کے قیام نے تو اسلامی مرکزوں میں سے ایک مستقل مرکز تھانہ بھون کو بھی بنا دیا، مگر حضرت والا سے پہلے بھی خود حضرت کے پیر ومرشد المہاجر الامام المکی نور اللہ ضریحہ اور حافظ ضامن شہید جیسی زندۂ جاوید ہستیاں تھانہ بھون کی سرزمین مسلمانوں کو عطا کر چکی تھی، صاحبِ کشاف العلوم قاضی عبد الاعلی مولانا شیخ محمد جیسے اہل علم وفضل کی بدولت اس کا نام شہرت کے آسمان پر پہنچ چکا تھا۔ عربی انسائکلوپیڈیا یا دائرۃ المعارف میں "التھانوی" کا مستقل عنوان قائم کر کے کشاف العلوم کے مصنف کا تذکرہ کافی مدح وستائش کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ حال کے اردو انشا پردازوں میں "شوکت تھانوی" نثر میں خاص طرز کے بانی ہونے کی حیثیت سے ملک میں روشناس ہیں اور بھی مختلف حیثیتوں سے تھانہ بھون کا قصبہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ۱۲

انبہٹہ[1]۔ منگلور[2]۔ کاندھلہ[3]۔ کیرانہ[4]۔ جیسی فضائل خیز اور محاسن ریز برگزیدہ آبادیاں جن میں ہر آبادی اپنی مستقل تاریخ رکھتی ہے، ان کو سوچئے، اور تاریخ کے مختلف ادوار میں جو مختلف خدمات ان کے باشندوں نے انجام دیں ان کو پیش نظر رکھئے بلکہ حافظہ مدد دے تو اس واقعہ کو بھی یاد کیجئے کہ خود دلی جب حیاتی سرگرمیوں سے خالی ہو کر جسد بے جان کی شکل میں پڑی ہوئی تھی تو پایۂ تخت ہند کے اس مرکزی شہر کی رگوں میں بھی نیا اور تازہ علمی و دینی گرم خون نواح دہلی کے اسی علاقے کے اَلْبَدْو[5] یا دہقانی آبادی پھلت نامی سے دوڑایا گیا تھا، جو رہتک کے بعد

[1] حضرت شاہ ابوالمعالی جو صوفیہ ہند کے اساطین میں شمار کئے جاتے ہیں اور شارح سنن ابو داؤد مولانا خلیل احمد کا موطن پاک یہی قصبہ ہے ۱۲ [2] بعض مشہور اہل دل مثلاً شاہ رحم الٰہی شاہ اسمٰعیل وغیرہ کے سوا مسلمانوں کے روشن مستقبل کے مصنف مولوی طفیل احمد منگلور ہی کے باشندوں میں تھے ۱۲ [3] مثنوی مولانا روم کے خاتمہ نگار مفتی الٰہی بخش کاندھلہ ہی کے تھے، ان کے سوا مولانا مظفر حسین، پچھلے زمانہ کے جلیل القدر بزرگ سے، کاندھلہ میں غیر معمولی عظمت پیدا ہوئی، ممکن ہے کسی موقعہ پر ان کے کچھ حالات کا اس کتاب میں بھی تذکرہ کیا جائے، مولانا نور الحسن جن کا بڑے شاندار الفاظ میں سرسید نے آثار الصنادید میں ذکر کیا ہے، ان کی اولاد و احفاد میں موروثی طور پر علم و فضل آج تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، مولانا یحییٰ اور ان کے برادر خورد مولانا الیاس (بستی نظام الدین) مرحوم کی مخلصانہ خدمات سے آج دنیا واقف ہے۔ شیخ الحدیث مظاہر العلوم مولانا زکریا اور شارح مشکوٰۃ مولانا ادریس سب کاندھلوی ہیں ۱۲ [4] علاوہ دوسرے مشاہیر کے کاسر صلیب، فنڈر کوب مولانا رحمۃ اللہ الہندی کیرانہ ہی کی خاک پاک سے اٹھے مکہ معظمہ میں آپ کا قائم کیا ہوا مدرسہ صولتیہ سرزمین حجاز میں مسلمانان ہند کی نمائندگی اس وقت تک کر رہا ہے ۱۲ [5] حضرت یوسف علیہ السلام کا خاندان فلسطین کی صحرائی آبادی سے جب مصر منتقل ہوا تو اس وقت حضرت یوسفؑ نے اپنے دہقانی وطن کو البدو فرمایا تھا، اس موقع پر فلسفی مورخ ابن خلدون کے ایک اجتہادی نقطۂ نظر کا خیال آتا ہے جس سے اسلام کے ساتھ حق تعالیٰ کے "لطف خفی" کی ایک عجیب و غریب شہادت سامنے آجاتی ہے، تاتاری ترک تازے سے اسلامی ممالک خصوصاً دار الخلافہ بغداد کی پامالی کا ذکر کر کے ابن خلدون نے لکھا ہے کہ مسلمانان عالم اس زمانہ میں عیش و نشاط میں غرق تھے تصنع اور تکلف کی عیاشانہ زندگی میں حد سے گذر چکے تھے، ہمتیں ان کی پست، باہمی امداد کا جذبہ ان میں مردہ ہو چکا تھا، بہادری غیرت، مردانہ صفات کا ان سے ازالہ ہو چکا تھا، اس وقت حق تعالیٰ کے مخفی لطف و کرم نے ایمانی زندگی کے بچا لینے میں عجیب معجزہ نمائی کی، حالات نے اس زمانہ میں مصر کو اسلام کا مرکز بنا دیا، مصر کے امراء عموماً اس زمانہ میں ترکی النسل تھے، ان میں یہ عام مذاق پھیل گیا کہ ترکستان کے علاقے سے تجار ترکی غلاموں کو مصر فروخت کرنے کیلئے لاتے اور مصر کے یہ امراء ان کے خریدار بنتے، یہ ترکی غلام جنہیں قدرت غلامی کی چادر اڑھا کر مصر لاتی اسی چادر میں حق تعالیٰ کا لطف و کرم پوشیدہ پاتے جن غلاموں کو شاہی محل سرا میں داخل ہونے کا موقع ملتا تھا عموماً وہ مسلمان ہو جاتے تھے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

خانزادۂ ولی اللّٰہی کا مرجع و منشار تھا' اس کا افسوس ہے کہ مہا بھارت کی رزمیہ نظم کے تاریخی استناد کی ذمہ داری مورخین اپنے سر لینا نہیں چاہتے، ورنہ ہندوستان کی ارض الفصل (یعنی اہم معرکوں کے فیصلہ کی سرزمین) اور اس کے تاریخی میدان کا بھی بہت بڑا رقبہ آپکو اسی عجیب و غریب علاقہ میں نظر آسکتا تھا جو پانی پت کی طرف منسوب ہو کر نہ جاننے والوں کے نزدیک حد سے زیادہ مختصر ہو کر رہ گیا ہے[۵۱]۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ان کا ایمان پختہ ہوتا تھا کیونکہ ان کو باضابطہ قرآن و حدیث و فقہ اور اسلامی علوم کی تعلیم دلائی جاتی تھی، ساتھ ہی حربی فنون کی عملی مشق بھی کرتے تھے شہ سواری نیزہ بازی تیر اندازی شمشیر زنی میں ماہر بنائے جاتے سیاسی بصیرت کے مواقع بھی ان کو بآسانی میسر آتے تھے' ان خصوصیتوں کے ساتھ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کے اخلاق "بدوی" تھے۔ جو مدنی آلودگیوں سے قطعاً پاک تھے، شہری زندگیوں کی نزاکتوں سے بھی تازہ وارد ہونے کی وجہ سے لگاؤ نہیں رکھتے تھے نتیجہ یہ تھا کہ اپنی ان ہی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے حکومت میں ترقی کی راہیں ان پر کھلتی جاتی تھیں تا آنکہ حکومت کے آخری اقتدار پر بھی ان ہی کا قبضہ ہو جاتا تھا ابن خلدون کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ یہ سب کچھ "عنایة من الله سابقة ومطالعه فی خلقه ساویة" کے ظہور کی شکل تھی ان ہی کی بدولت اس عہد میں اسلام کے باغ میں پھر بہار آئی۔ دیکھو ابن خلدون ج۵ ص۳۷۱ مصر کے ممالک سلاطین کی طرف ابن خلدون نے مذکورہ بالا الفاظ میں اشارہ کیا ہے' غالباً اس بیچارے کو یہ معلوم نہ تھا کہ بجنسہ اسی لطف خفی کا ظہور سرزمین ہند میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ابتداء میں ہوا۔ غلاموں کے خاندان کی حکومت میں وہی ساری باتیں دہرائی گئی تھیں جن کا ذکر ابن خلدون نے مصر کے متعلق کیا ہے' اسلام نے بنی آدم کے قابل رحم طبقہ یعنی غلاموں کے ساتھ جو حسن سلوک کیا تھا میرے خیال میں اسی کا غلاموں کی طرف سے یہ قدرتی جواب تھا کہ جب احرار اسلامی ملت کی حفاظت کی صلاحیت سے محروم ہو گئے' تو قدرت نے غلاموں سے اسلام کی حفاظت کا انتظام کرالیا' انشاء اللہ آئندہ بھی آخری نبوت کی آخری کتاب کی حفاظت کے سلسلہ میں اسی قسم کی معجزہ نمائیوں سے قدرت کام لیتی رہیگی فتربصوا حتی یاتی الله بامرہٖ

(متعلقہ صفحہ ہذا) [۵۱] سری رام صاحب ماتھر دہلوی نے مہابھارت کا جو اردو ترجمہ کیا ہے اسی ترجمہ کی جلد چہارم کے شروع میں کورو اور پانڈو کے جنگی صفوف کو نقشہ کی صورت میں سمجھاتے ہوئے بیان کیا ہے کہ کورو کی فوج کی ترتیب ایسی تھی کہ گرڈ گدھ کی شکل اس سے بن جاتی تھی' اور پانڈو نے اسکے مقابلہ میں اپنی فوج کو جس طریقہ سے مرتب کیا تھا اس سے مگرمچھ کی شکل بن جاتی تھی اسی لئے کورواہ کورو کے ساتھ لڑنے والوں کی فوج گرڑ بیوہ اور پانڈوں کی فوج مگر بیوہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ بہر حال گرڑ اور مگر ان دونوں شکلوں کو بنا کر ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں کھڑا کیا' سری رام صاحب نے دونوں فوجوں کے درمیانی زمین کا جغرافیائی نقشہ بنا کر ان ناموں کو اس نقشہ میں درج کیا ہے جو آج کل اس علاقے کے مختلف مقامات کے مشہور ہیں' اسی سلسلہ میں کورو کی فوج بہ شکل گرڑ کی چونچ کے نیچے انھوں نے سہارنپور اور سہارنپور کے نیچے دیوبند' دیوبند کے نیچے مظفر نگر پھر سردھنہ اور میرٹھ کو لکھ کر دادری پر اس کو ختم کیا ہے اور پانڈو کے مگر بیوہ کے سامنے بھٹنڈہ کو مگر کے منہ کے بالمقابل درج کرتے ہوئے تلونڈی سرسہ' بالا خورتیہ کے مقام پر اس کو ختم کیا ہے جس سے اس میدان جنگ کے طول و عرض کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ جس علاقہ سے ہم بحث کر رہے ہیں وہ بھی اسی میدان میں داخل تھا ۱۲

اور مہابھارت یا اس کی روایتوں کے متعلق کچھ بھی کہا جائے مگر اس علاقہ کے مشرقی گوشہ میں ہردوار اور مغربی سری پر تھانیسر کے قریب کورک شیتر کی قدیم تیرتھ گاہیں کیا بجائے خود اسکی زندہ شہادتیں نہیں ہیں کہ اس خاص خطہ کی عظمت و احترام کی تاریخ قدیم اور بہت پرانی ہے۔

ایسی صورت میں اگر یہ سمجھا جائے تو غالباً اس کو صرف خوش اعتقادی نہ قرار دیا جائے گا، کہ شاید اُعجوبہ طرازیوں اور نادرہ نمائیوں کیلئے ازل ہی سے نواح دہلی کے اس ہمالیائی وادی ایمن کو قدرت کی نظر انتخاب نے چن لیا ہے، وہی ازلی تقدیر اسباب و تدبیر کا قالب اختیار کر کے اپنے اپنے وقت پر جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔ ماضی سے گذر کر حال کی طرف آئیے۔

قصبہ نانوتہ دیکھئے سنو سال کی مدت بھی مشکل سے پوری ہوئی ہوگی اسی وادی ایمن کے بقعہ مبارکہ میں عرب ہوتا تو شاید ہم نخلستان ہی کا لفظ استعمال کرتے، مگر ہندوستان کا چونکہ واقعہ ہے، اس لئے یوں سمجھئے کہ دیسی کھجوروں کے ایک کافی طویل و عریض گھنے بن کے بیچ میں ایک آبادی نانوتہ[۱] نامی تھی اور وہ بحمد اللہ اس وقت بھی موجود ہے، دلّی سے ساٹھ کوس اترا اور سہارنپور سے پندرہ کوس دکھن، گنگوہ سے نو کوس پورب، دیوبند سے بارہ کوس پچھم، یہی اس آبادی کی حدود اربعہ ہیں، جب تک ریل نہ تھی، چار دن میں چار منزلوں میں اترتے ہوئے دلّی اور نانوتہ کے درمیانی فاصلہ کو لوگ طے کیا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ

---

[۱] آئین اکبری میں ابوالفضل نے "صوبہ دہلی" کی آٹھ سرکاروں میں سرکار سہارنپور کو بھی شریک کرتے ہوئے اسی کے ذیلی پرگنوں میں "نانوتہ" نامی پرگنہ کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن ایک جگہ تو اس کا یہی مشہور نام "نانوتہ" ہی اس نے درج کیا ہے اور دوسری جگہ بجائے "نانوتہ" کے اس نے "نانوتھ" لکھا ہے، واللہ اعلم بالصواب یہ کتابت کی غلطی ہے، یا تلفظ کی یہ دونوں شکلیں مروج تھیں"

سہارنپور کی ایک پرانی تاریخ لالہ نند کشور پرشاد نے ۱۸۶۰ء میں لکھی ہے جس میں انھوں نے غالباً دیہاتی عوام سے سن سنا کر لکھا ہے کہ "نانو" نام کی کوئی قوم جو گوجر یا راجپوت تھی اس کی طرف منسوب ہو کر ابتدا میں یہ آبادی "نانوتہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ مگر میرے نزدیک وجہ تسمیہ یہ افواہی روایت چنداں دل آویز نہیں معلوم ہوتی۔ اس قصبہ کی آبادی ۱۸۶۵ء میں بلحاظ مردم شماری ۷۸۸۴ تھی جیسا کہ جغرافیہ ضلع سہارنپور مصنفہ مولانا فصیح الدین صاحب دیوبندی برادر خورد حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ مہتمم اول دارالعلوم دیوبند سے واضح ہے (جغرافیہ سہارنپور صفحہ مطبوعہ)

کاندھلہ، تھانہ بھون وغیرہ قصبات راستے ہیں ملتے تھے، جب سے سہارنپور شاہدرہ کے درمیان چھوٹی پٹری والی لائن قائم ہوگئی ہے، اب ایک اسٹیشن کھجور بن کے درمیان والی یہ آبادی نانوتہ بھی ہے۔

قدرت کی ان کارفرمائیوں کو ملاحظہ کیجئے، کہتے ہیں کہ کھجور کے بن والی اس آبادی کو آس پاس کے قصبوں اور دیہاتوں میں لوگ چھوٹا شہر کے نام سے موسوم کرتے تھے، خیال یہ پھیلا ہوا تھا کہ صبح سویرے باسی منہ "نانوتہ" کا لفظ جس کے منہ سے نکل جاتا ہے، دن بھر روٹی سے پھر اس کی ملاقات ناممکن ہو جاتی ہے، گویا اپنی ہم زلف آبادیوں میں وہ منحوس ٹھیرایا گیا تھا، حقارت اور ذلت کی نظر سے قرب و جوار کے لوگ اس کو دیکھتے تھے، اسی لئے بجائے "نانوتہ" کے نام کی نحوست سے بچنے کے لئے اس کو "چھوٹا شہر"[۱] کہتے تھے، مگر یہ کون جانتا تھا کہ ہندوستان کے ٹوٹے ہوئے مسلمانوں کے جوڑنے کا کام اسی چھوٹے شہر کی مٹی سے قدرت لیگی، لوگ مغالطہ میں مبتلا ہوئے اگرچہ یہ مغالطہ بھی کوئی نیا مغالطہ نہ تھا، یہ غلط فہمی تو کھجور بن کے درمیان کی ایک ہندوستانی آبادی کے متعلق ہوئی مگر "العرش العظیم"[۲] سے بھی عرب کی جس نخلستانی آبادی کی خاک کا

---

[۱] کہتے ہیں کہ نانوتہ کے نام "چھوٹے شہر" سے قصبہ کے بعض باشندوں کو برہم پاکر حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی یہ بگڑنے کی کیا بات ہے، بلکہ اس نام سے تو خوش ہونا چاہئے، ہندوستان میں گنتی ہی کے تو چند مقامات ایسے ہیں جن کے آخر میں "شہر" لفظ جزء بنا ہوا ہے۔ مثلاً بلند شہر مچھلی شہر، ان ہی میں آپ کا یہ "چھوٹا شہر" بھی ہے۔ یہی فخر کیا کم ہے کہ "شہرت" کو لوگوں نے اس کے قوام حقیقت میں داخل کر دیا ہے، اس لطیفہ کا ذکر حضرت والا کے حفید رشید و سعید مولانا محمد طیب صاحب نے اپنے ایک گرامی نامہ میں فرمایا ہے کہتے ہیں مولانا روم کا شعر بھی مشہور ہے کہ ع وہ مردہ مرد را احمق کند؛ کم از کم نانوتہ تو اس عیب سے شہر کہلانے کی وجہ سے پاک ہو جاتا ہے اور ضمناً اپنی حماقت کا گویا وہ اعتراف کرتے ہیں جن کی آبادی کے نام میں "شہر" کے لفظ کا یہ فصل نہیں پایا جاتا ۱۲

[۲] مرقد انور کا وہ حصہ جسے نبوت کبریٰ کی خوابگاہ ہونے کا شرف حاصل ہوا، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ العرش العظیم سے اس کو افضل قرار دیتے تھے۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے شرح موطا وغیرہ

پایہ بلند و بالا ہونے والا تھا، کون نہیں جانتا کہ نہ جاننے والوں نے ملامت و نفرت کا مستحق قرار دے کر اسی طیبہ و طاہرہ آبادی کو مدت تک "یثرب" کے نام سے بدنام کر رکھا تھا، کچھ بھی ہو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ "نانوتہ" کو ایک زمانہ تک لوگ "چھوٹا شہر" کہتے رہے، وہ کیا جانتے تھے کہ یہی ٹوٹی ہوئی کشتی مسلمانان ہند کے لئے کشتی خضر بننے والی ہی اور اسی ٹوٹی پھوٹی دیوار کے نیچے ان غریبوں، بے کسوں کا خزانہ دبا ہوا ہے، جن کے آباؤ اجداد اس ملک میں صالحین و قانتین کی شکل میں وارد ہوئے تھے، اگرچہ اب تو اس کو نکتہ بعد الوقوع ہی قرار دیا جائیگا۔

نانوتہ کی وجہ تسمیہ

ورنہ میں تو کہتا ہوں کہ الاسماء تنزل من السماء کی روایت میں الاسماء کا لفظ اگر ہر قسم کے اسمار اور ناموں کو عام ہے، تو اسی سے شاید پانے والے اس آسمانی اشارے کو پا سکتے تھے کہ کسی قسم کی دعوت کا نیا نبوتہ یا جدید پیغام اسی چھوٹے شہر سے تقسیم ہونے والا ہے۔

بہر حال یہ تو بتانا مشکل ہے کہ اس کھجور بن کے بیچ میں یہ آبادی کب سے قائم ہے، لیکن آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی جدید تنظیم کے سلسلے میں سرکار سہارنپور کا ایک پرگنہ "نانوتہ" نامی بھی قرار دیا گیا تھا، اگرچہ اس کتاب کے مطبوعہ اعداد و شمار کی صحت پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، تاہم اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس پرگنہ کا آباد رقبہ جس میں کاشتکاری ہوتی تھی انتیس ہزار دو سو چوبیس بیگھے پر مشتمل تھا، اور سائرات وغیرہ کی زمین آباد رقبہ سے بہت زیادہ تھی، دستور کے مطابق اس پرگنہ میں بھی حکومت کی طرف سے چالیس سوار اور تین سو پیادے مقرر تھے جو عموماً افغان تھے (دیکھو آئین اکبری ص ۱۴۲ ج ۲)

کھجوروں کے بن سے گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے جیسا کہ چاہئے، نانوتہ کی آب وہوا شروع ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ زیادہ بہتر نہ تھی، سوانح قدیم کے مصنف علام جو نانوتہ ہی سے وطنی تعلق رکھتے تھے آب وہوا کے متعلق ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"اول ایسی آب وہوا خراب نہ تھی"

اس فقرے میں "ایسی" کا لفظ بتارہا ہے کہ اس مقام کی آب وہوا قابل تعریف توکسی زمانہ میں نہیں سمجھی گئی، اسی بنیاد پر یہ خیال گذرتا ہے کہ بجز ان افغانوں، یا پٹھانوں کے جو سرکاری حیثیت سے یہاں رہنے پر مجبور تھے یا خستہ حال سادات کے وہ گھرانے جن کے بچے کھچے لوگ اب بھی نانوتہ اور نانوتہ کے قریب کے موضع تین پور میں پائے جاتے ہیں، شاید مسلمانوں کے شریف لکھے پڑھے کھاتے پیتے، اچھی زندگی رکھنے والے گھرانوں کی زیادہ توجہ "نانوتہ" میں سکن پذیر ہونے کی طرف غالباً نہ ہوئی[۱]

شاہجہانی عہد میں مولوی محمد ہاشم کا نانوتہ میں قیام

اور جیساکہ سوانح قدیم کے مصنف امام نے لکھا ہے۔

"مولوی محمد ہاشم زمان شاہجہاں میں مقرب بادشاہی ہوئے اور نانوتہ میں مکان بنائے" ص۲۵ سوانح قدیم

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سادات کے بعد شرفاء اسلام کا پہلا خانوادہ جس نے نانوتہ میں قیام پذیر ہوکر اس کو ایک اسلامی قصبہ کی حیثیت عطا کی، اس کی بنیاد غالباً عہد شاہجہانی میں ان ہی مولانا مولوی محمد ہاشم مرحوم کے وجود باجود سے قائم ہوئی۔

یہ مولوی محمد ہاشم، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دودمان عالی سے نسلی تعلق رکھتے تھے، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ صدیقی شیوخ کی "قاسمی شاخ" سے کھجورین کی یہ آبادی اسلامی شرفا کی بستی بن گئی، یہ قدرتی نیرنگیاں ہیں کہ ابتداء بھی اس شاخ کی "قاسم ہی نام

[۱] مگر لالہ نند کشور نے اپنی کتاب تاریخ ضلع سہارنپور میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہاں گوجر یا راجپوت قوم کے لوگ آباد تھے۔ بعد کو سادات کا کوئی خاندان اسلامی عہد میں یہاں متوطن ہوا لالہ صاحب کا بیان ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ایک بزرگ سید احمد نامی نانوتہ میں کافی مشہور و معزز ہستی شمار ہوتی تھی ان ہی سید احمد کے صاحبزادے سید مصطفیٰ جہانگیر کے زمانہ میں اچھے ممتاز درویشوں میں گنے جاتے تھے صوبہ دار اس علاقہ کا ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ شاہ مصطفیٰ کے متعلق یہ بھی لالہ صاحب ہی کا بیان ہے کہ وہ شاعر بھی تھے اور یہ کہ ان کا مزار قصبہ نانوتہ میں اب بھی موجود ہے، لالہ صاحب جو سہارنپور کے ڈپٹی کلکٹر بھی رہ چکے تھے تحقیق سے ان کو پتہ چلا کہ خود نانوتہ اور اسی کے قریب موضع تین پور میں سیدوں کے چند خستہ حال گھرانے جو پائے جاتے ہیں وہ ان ہی سید مصطفیٰ سے نسبی تعلق رکھتے ہیں ۱۲

سے ہوئی، اور ہند ہی نہیں بلکہ بیرون ہند کے مسلمانوں کی بھی کافی معقول تعداد کو اس مبارک شاخ کے سایہ تلے پناہ لینے کی جب سعادت میسر آئی تو اس کی تکمیل کا کام بھی جیساکہ دنیا جانتی ہے "قاسم" ہی نام والی مبارک ہستی سے لیا گیا۔ سوانح قدیم کے مصنف امام نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ مولوی محمد ہاشم صاحب مرحوم کو شاہجہانی دربار سے "چند دیہات جاگیر تھے"۔

جس کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ نانوتہ کے اس پرگنہ کے دیہات بھی مولوی محمد ہاشم صاحب کی جاگیر میں شریک تھے۔ فضل و کمال کی قدر شناسیوں کا بازار شاہجہانی عہد میں جتنا گرم ہوا، علم و ہنر کا نرخ اس زمانہ میں جتنا اونچا ہوا اس سے تھوڑی بہت واقفیت جو رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ "مقرب" ہو جانے کے بعد کسی صاحب علم کا مذکورہ بالا جاگیر تک رسائی پانا یقیناً دشوار نہ تھا، اگر نانوتہ پرگنہ کے تحت کے سارے گاؤں، سمجھا جائے کہ مولوی صاحب کی جاگیر میں داخل تھے تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے[1]۔

بلکہ سوانح قدیم کے مصنف امام نے نانوتہ کی آب و ہوا کا تذکرہ کرتے ہوئے خود اپنا یہ ذاتی مشاہدہ جو درج فرمایا ہے کہ

---

[1] پادشاہ نامہ میں عہد شاہجہانی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے "دریں دولت خداداد کہ بازار دانش رواج دیگر گرفتہ ست و کار دانشور ان رونق از لبسر" ص۲۴۱/ج۱ یہ یا اسی قسم کے الفاظ تاریخوں میں جو پائے جاتے ہیں، صرف الفاظ نہیں بلکہ واقعات کی صحیح تعبیر ہے، کون نہیں جانتا کہ اسی زمانہ میں علماء درحقیقت زر و نقرہ کے ساتھ تولے جاتے تھے "ملا عبدالحکیم سیالکوٹی دو دو دفعہ بزر سنجیدہ شد" طالب کلیم آملی کا منہ موتیوں سے بھر اگیا۔ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ صرف ایک دفعہ قاری نے قرآن کی چند آیتیں شاہجہاں کو سنائیں، دل بادشاہ کا خوش ہوا، ایک گاؤں قاری صاحب کو جاگیر میں عطا فرمایا گیا، اور دور کیوں جائیے اسی نانوتہ کے قریب کیرانہ کا قصبہ ہے حستو نامی جراح کی جاگیر میں پورا قصبہ دے دیا گیا تھا، لکھا ہے کہ لاکھ روپے کی آمدنی تھی، امیر کبیر کی شان کے ساتھ یہی حستو جراح کیرانہ میں زندگی گذارتا تھا، ایک سو چالیس بیگھے میں باغ لگایا تھا اور پختہ دیوار سے باغ گھیرا گیا تھا، ایک بہترین حوض بھی اس میں تھا، سارے جہان کے پھل پھول کے درخت اس باغ میں نصب کئے گئے تھے۔ آم برہانپور اور دکن سے منگوائے گئے تھے، کہتے ہیں کہ پستہ ہندوستان میں سرسبز نہیں ہوتا، مگر حستو جراح کے باغ میں لگایا گیا تو بڑھا، پھلا پھولا" دیکھو ماثر الامراء ج ۳

"اب (یعنی عہد انگریزی میں) نہر کے سبب آب و ہوا وہاں کی (یعنی نانوتہ کی) نہایت خراب[1] ہوگئی، اور آبادی میں بھی کمی آگئی" ص۲۳

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں نانوتہ کی جتنی آبادی ہے، پہلے اس کی آبادی یقیناً اس سے زیادہ تھی، غالباً اس "کھجور بن" کی طرف کشش و انجذاب کا سبب بھی "جاگیر" ہی، مگر بایں ہمہ ان ہی کے ان الفاظ سے یعنی

"نانوتہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے"

ایک طرف تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ بجائے دیہات کے نانوتہ کا شمار بہر حال "قصبات" کے ذیل میں کیا جاتا تھا مگر اسی سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اطراف و جوانب کے مقابلہ میں نسبتاً نانوتہ چھوٹا قصبہ سمجھا جاتا تھا، ابو الفضل نے بھی سرکار سہارنپور کے پرگنوں کی فہرست درج کرتے ہوئے "نانوتہ" کا ذکر سب سے آخر میں جو کیا ہے شاید اس کی وجہ بھی یہی ہو، مگر یہ کون جانتا تھا کہ جو چھوٹا سمجھا جا رہا ہے بڑائی اسی کے لئے مقدر ہو چکی ہے، اور کھجوروں کے جس تیرہ و تار بن میں آبادی کا تخیل بھی دشوار تھا[2]، وہاں شرفاء اسلام کا قصبہ آباد ہوگا، اور کیسا قصبہ؟ دیکھنے میں خواہ کتنا ہی چھوٹا نظر آرہا ہو، مگر بن جانے سے خدا ہی جانتا ہے کتنی اسلامی آبادیاں آج اسی کی بدولت محفوظ ہو گئیں، اللھم حرسھا واحفظھا عن النوائب

---

[1] مولوی ذکاء احمد نے تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ میں لکھا ہے کہ لارڈ آک لینڈ کی منظوری سے نہر جمن کھودی گئی، مولوی صاحب نے اسی موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ دہلی اور کرنال کے اضلاع میں اس نہر کے سبب سے دبائی بخار ایسا پھیلا تھا کہ کرنال سے انبالہ میں چھاؤنی کو منتقل کرنا پڑا، مگر ۱۸۴۲ء میں لارڈ ہارڈنگ کے زمانہ میں پانی کی نکاسی کا انتظام معقول کیا گیا ۱۲

[2] قصص الاکابر میں حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ ضریحہ کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جہاں اپنی شخصیت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھنا چاہتے تو پوچھنے پر فرما دیتے کہ میرا وطن الٰہ آباد ہے توجیہ اس کی خود یہ فرماتے کہ ہر آبادی اللہ میاں ہی کی آباد کی ہوئی ہے، بس نانوتہ کو بھی اگر الٰہ آباد کہا جائے تو واقعہ کا اقرار ہے، اسی کے ساتھ اگر یہ سمجھا جائے کہ ظاہر اسباب کی رو سے شرفاء اسلام کا اس مقام پر آباد ہونا جہاں نانوتہ واقع ہے بظاہر دشوار تھا مگر باوجود اس کے مشیت الٰہی نے وہاں آبادی قائم کی اسی لئے اس لدنی آبادی کو "الٰہ آباد" اگر کہا جائے تو ایسے حالات کی رو سے اس نام کی وہ مستحق ہے ۱۲

کچھ بھی ہو، سوانح قدیم کے مصنف امام نے مولوی محمد ہاشم کا ذکر کرنے کے بعد جو یہ لکھا ہے کہ

"چند پشت اوپر مولوی محمد ہاشم صاحب مرحوم میں ہمارے نسب جا ملتے ہیں" ۲۵ھ

اس فقرے میں "ہمارے" کے لفظ سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ نانوتہ میں قیام پذیر ہونے کے بعد مصنف امام کے زمانہ تک جو تقریباً دو سو[۲] سال کا زمانہ گذرا ہے ان دو صدیوں میں مولوی ہاشم صاحب مرحوم کی اولاد و احفاد کی تعداد کافی طور پر بڑھ چکی تھی[۱]۔ دوسرے ذرائع اور خود ان کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نانوتہ کے ان صدیقی قاسمی شیخزادوں کے رشتے شادی بیاہ کے ذریعہ اطراف وجوانب کے دوسرے قصبات مثلاً تھانہ بھون، گنگوہ، دیوبند، رامپور (منہیاران) وغیرہ کے شرفاء سے قائم ہوتے رہے، جن میں بعض عثمانی، بعض فاروقی، بعض انصاری وغیرہ شیخ زادوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

رشتہ داریوں کا یہ سلسلہ الحمد للہ اس وقت تک جاری ہے، اس زمانہ میں سواریوں کی وجہ سے ظاہر ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے، مگر جس زمانہ میں نہ سڑکیں تھیں نہ سریع السیر سواریاں، اس وقت براتوں کے ساتھ آمد ورفت یقیناً آسان نہ تھی، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی محمد ہاشم کے بعد آخر زمانہ ہی میں نہیں، بلکہ ابتدائی پشتوں ہی میں ان قصبات کے شیخزادوں میں یہ روابط قائم تھے، خصوصاً دیوبند جو نانوتہ سے کافی فاصلہ رکھتا ہے یعنی پندرہ سولہ میل دور ہے، یہاں سے نانوتہ براتیں آتی جاتی رہتی تھیں، سوانح قدیم کے مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند کے شیخزادوں کا جو خاندان محلہ دیوان کی طرف منسوب ہے اور آجتک اس ڈیوڑھی کی شکستہ در و دیوار سے قصبہ دیوبند کے ان صنادید کی رفعت شان کا اندازہ ہوتا ہے"

ھ۵ اس کا پتہ نہ چل سکا کہ مولوی محمد ہاشم مرحوم کی اولاد جو اس وقت بیسیوں خاندانوں کی شکل میں یہاں آباد ہے ان کی صحیح تعداد کیا ہے، البتہ شیوخ صدیقی کے اس مفصل نسب نامہ سے اس پر ایک حد تک روشنی پڑ سکتی ہے جو نانوتہ میں تاحال منشی اقبال احمد ابن منشی ظفر احمد صاحب صدیقی کے یہاں محفوظ ہے جس میں اس نسب نامہ کے مورث اعلیٰ شیخ میراں کی تمام شاخوں کا تفصیل سلسلہ اور وقتاً فوقتاً ان شاخوں کے جابجا منتقل ہونے کے حوالے دیئے گئے ہیں ۱۲ محمد طیب غفرلہ

اس خاندان کی رشتہ داری نانوتہ والوں سے بہت قدیم ہے، شاہجہانی عہد کے مولوی محمد ہاشم کی پانچویں پشت میں خواجہ بخش نامی ایک شیخ زادے تھے، ان کی لڑکی کی شادی دیوبند کے دیوان والوں کے خاندان میں ہوئی تھی، دیوبند کے مشہور رئیس شیخ کرامت حسین (جو حضرت نانوتوی کے خسر ہوتے ہیں) کے نانا شیخ خواجہ بخش تھے۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ نانوتہ کے شیخ زادے بھی حالانکہ صدیقی تھے، اور ان کی رشتہ داریاں بھی جہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ صدیقیوں کے عثمانی اور فاروقی شیخ زادوں ہی کے گھرانوں تک محدود رہیں، چاہئے تو یہی تھا کہ ایسی صورت میں اپنے موروثی عقیدہ سنیت ہی پر وہ قائم رہتے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی جاگیر اور جائداد جو ان کی رفاہیت کی بنیاد تھی، ان کی دینی زندگی کے لئے خطرہ بنتی چلی گئی، تفصیلات کا علم تو نہ ہو سکا، مگر سوانح قدیم کے مصنف امام نے مولوی ہاشم کی جاگیر کا تذکرہ فرماتے ہوئے اخیر میں جو یہ ارقام فرمایا ہے، کہ

"تبدل حکومت کے سبب ان کی اولاد کے پاس نہ رہی" ص ۲۶

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلطان اورنگ زیب عالمگیر انار اللہ برہانہ کے بعد مغل حکومت کے حکمرانوں میں عموماً طور پر مختلف تاریخی مؤثرات کے تحت اعتقادی انقلاب جو برپا ہوا، خود بہادر شاہ، عالمگیر کے بعد ہندوستان کا جو مغل بادشاہ ہوا، تشیع[۵] کا شکار ہو چکا تھا،

[۵] میرا اشارہ شاہ عالم بہادر شاہ کی طرف ہے جسے ستر سال کی عمر میں بادشاہی کی قدیم آرزو کی تکمیل کا موقعہ ملا تھا، اس وقت وہ کافی بوڑھا ہو کر سٹھیا چکا تھا، سب سے پہلے تو اس نے اپنے "سید" ہونے کا اعلان کیا اور ایک بے سروپا قصہ پر اس کی بنیاد قائم کی گئی، پھر تمام ممالک محروسہ میں یہ شاہی گشتی جاری ہوئی کہ امام خطبہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے وصی ہونے کا برسر منبر اعلان و اقرار کرے، احمد آباد میں سخت خونیں فساد برپا ہوا، لاہور میں بھی ہنگامے ہوئے، وہ فاضل اجل ہونے کا ڈھونگ بھی اپنے متعلق رکھتا تھا، لاہور کے علماء جن میں مولانا یار محمد سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز تھے ان کو بلا کر اس نے براہ راست خود مناظرہ کیا، مولانا یار محمد جب اس کی باتوں کا کھرے الفاظ میں جواب دینے لگے تو بولا کہ تم میری بادشاہی کی قوت سے نہیں ڈرتے تو مولانا نے فرمایا کہ جس سے تم ڈراتے ہو اسی کو تم سے میں مانگنے آیا ہوں، مجھے شہادت کی آرزو ہے، کاش میری اس آرزو کو تم پوری کردو ۱۲

اور اس کے بعد پے در پے ایسے حالات مسلسل رونما ہوتے رہے جن کا لازمی نتیجہ تھا کہ نہ صرف مرکز بلکہ صوبوں پر بھی ان ہی لوگوں کا سیاسی اقتدار قائم ہوگیا جو کھلم کھلا شیعہ تھے، ورنہ تشیع کی طرف رجحان کے مرض سے تو شاید ہی اس زمانہ کی کوئی قابل ذکر ممتاز ہستی پاک نظر آتی ہے، یہ ایک عام دبا تھی، جس میں ہند کی اسلامی حکومت اپنے ایام سکرات میں مبتلا ہوگئی تھی اور شاید مسلمانوں کی یہی ازلی تقدیر ہے کہ جس علاقہ میں بھی ان کے خاتمہ کا وقت آجاتا ہے، تو عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اس علاقہ کے مسلمان حکمرانوں پر تشیع کا جنون سوار ہوجاتا ہے، مسلمانوں کی سیزدہ صد سالہ تاریخ اس واقعہ کی شہادتوں سے لب ریز ہے۔[۱]

توحید جو اسلام کی بنیادی روح ہے اس کے اثر کو کھوتے ہوئے جب اس حد تک قلوب پہنچ جاتے ہیں کہ خالق کے رحم و کرم سے زیادہ مخلوق کے سایہ میں امن اور چین کی توقعات زیادہ نظر آنے لگتی ہیں، تو تشیع کا نظریہ ان کی پشت پناہی کے لئے تیار ہوجاتا ہے، گویا یوں سمجھئے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر جس حد تک شرک اور شر کے جذبات سے آدمی قریب ہوتا جاتا ہے اسی حد تک تشیع کے نظام کی دل کشی اس پر مسلط ہوتی چلی جاتی ہے، مسلم و مشرک دونوں متضاد عنوانوں میں تشیع مصالحت کی ایک عجیب و غریب دلچسپ شکل ہے۔

خیر میں کیا کہنے لگا، بات بہت طویل ہوجائے گی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ "اعتقادی انقلاب" کا جو دورہ مغل حکومت پر پڑا تھا اور عام ہلچل مسلمانوں میں اس انقلاب کی وجہ سے جو پیدا ہوئی، معلوم ہوتا ہے، کہ اس سے صدیقی و عثمانی و فاروقی وغیرہ شیخ زادوں کے یہ قصبات بھی محفوظ نہ رہ سکے، ہم جب یہ جانتے ہیں کہ بارہا کے سادات جو آخر میں بادشاہ ہی نہیں بلکہ تاریخ کی زبان میں "مغل حکومت" میں "بادشاہ گر" بنے ہوئے تھے، یہ شیعہ بھی تھے، اور ان کا وطن بھی اسی علاقہ میں تھا

[۱] یہ افسانہ بڑا طویل اور کافی دردناک ہے تشیع سے اسلامی فتنہ کی ابتدا ہوئی حضرت عثمان خلیفہ سوم اس فتنے کے پہلے شکار ہیں، تاتاریوں سے نہ مندمل ہونے والا زخم مسلمانوں کی تاریخ کو جو لگا کون نہیں جانتا کہ اس زخم میں سب سے بڑا ہاتھ ان ہی لوگوں کا تھا حتیٰ کہ آج یورپ کے پاؤں کے نیچے اسلامی ممالک جو روندے جا رہے ہیں لوگوں کو شاید اس کا علم نہ ہوگا کہ ابتدا میں یورپ کے سلاطین کی ہمت افزائیوں میں مصر کے فاطمی سلاطین کا ہاتھ تھا ۱۲

جس میں ان شیخ زادوں کے قصبات آباد تھے، ایسی صورت میں سوانح قدیم کے مصنف امام کی الفاظ "تبدل حکومت" کا مطلب سمجھا جاسکتا ہے کہ کیا تھا، آخر اودھ کی شیعہ حکومت جیسا کہ دنیا جانتی ہے دھڑا دھڑ سنیوں کو ان کی قدیم جاگیروں سے جب محروم کرتی چلی جارہی تھی، اور شیعہ ہونے پر جاگیر کی بحالی کے قصے اس زمانہ میں بکثرت پیش آتے رہتے تھے، تو اس پر کیوں تعجب کیا جائے، اگر سادات بارہا کے ہم وطن سنی شیخ زادوں کے لئے ان کی جاگیریں باعث فتنہ بن گئی ہوں۔

حضرت میر شاہ خاں مرحوم مغفور کی طرف کتاب "امیر الروایات" میں روایت جو منسوب کی گئی ہے وہ فرماتے تھے کہ

"الدہن، میرٹھ، ہاپوڑ، گلاوٹی، بلند شہر کا حال تو مجھے معلوم ہے کہ یہاں کے لوگ سب تفضیلی بلکہ بعض تو رافضی تھے"۔

یہ شہادت جو ان کے ذاتی علم پر مبنی ہے، اس کے تذکرے کے بعد اپنے سماعی علم کا اظہار ان الفاظ میں خاں صاحب ممدوح ہی نے فرمایا ہے کہ

"اور سنا ہے کہ دیوبند میں بھی سب تفضیلی تھے"۔

اکے دکے نہیں بلکہ دیوبند کے سارے عثمانی شیخزادوں کے متعلق یہ روایت کہ "سب تفضیلی ہوگئے تھے"، اگر یہ صحیح ہے تو اس سے تشیع کے اس دباؤ کی غیر معمولی قوت کا اندازہ ہوتا ہے جس کے نیچے مغل حکومت کے آخری دور میں ہندوستان کے مسلمان آگئے تھے، اور یہ تو خیر میر شاہ خاں صاحب کا بیان ہے، خود حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے اس مشہور مکتوب میں جو حکیم ضیاء الدین مرحوم کے نام ہے، اور فیوض قاسمیہ کے نام سے حضرت ممدوح کے چند مکاتیب کا مجموعہ جو شائع ہوچکا ہے اسی مجموعہ میں یہ خط بھی شریک ہے۔ اس خط میں آپ نے مولوی حامد حسین صاحب لکھنوی (مجتہد شیعہ) سے اپنی ملاقات اور مکالمہ کا ذکر فرماتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

پس ازاں عرض کردم کہ بنواحی کہ زادہ بوم احقرست، شیعیان وسنیان چناں مخلوط اند	بعد اس کے میں نے عرض کیا کہ جس علاقے میں احقر کا وطن ہے وہاں شیعہ اور سنی دونوں فرقے باہم ایک دوسرے کی

کہ رشتہ و رابطہ قرابت طرفین رابطرفین محکم و مستحکم ست ص۵ فیوض قاسمیہ	ساتھ کچھ اس طرح گھلے ملے ہوئے ہیں کہ دونوں فرقوں میں رشتہ داریوں کے تعلقات بھی مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں۔

یقیناً اس سے بھی میر شاہ صاحب مرحوم کے بیان کی توثیق ہوتی ہے۔ اگرچہ مولانا مرحوم نے اپنے اس نامہ گرامی میں صراحتاً اپنے قصبہ نانوتہ کے متعلق یہ نہیں ظاہر فرمایا ہے کہ وہاں کے صدیقی شیوخ اور عام مسلمانوں کا تشیع کی طرف رجحان تھا یا نہیں، لیکن جو حالات تھے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے نانوتہ کا استثناء یوں ہی مشکل ہے۔

ماسوا اس کے سوانح قدیم کے مصنف امام نے بھی ایک قصہ کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ نانوتہ کے قاسمی صدیقی برادری کے ایک رکن جن کا نام شیخ تفضل حسین تھا، اور خاندانی جائداد میں ان کی بھی شرکت تھی، وہی

"شیخ تفضل حسین شیعہ مذہب ہو گئے تھے" ص۲۶

جو اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ سنیت کے موروثی عقیدہ کو ترک کر کے شیعہ عقائد کے اختیار کرنے والے قصبہ نانوتہ میں بھی پائے جاتے تھے، اور آخر زمانہ تک تبدیلی کا سلسلہ اس قصبہ میں بھی جاری تھا،

میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے الدآبن، ہاپوڑ، گلاوٹھی، دیوبند وغیرہ قصبات میں تفضیل اور تفضیل سے بھی آگے بڑھ کر رفض کے جراثیم پھیل گئے تھے، نانوتہ بھی اس اثر سے پاک نظر نہیں آتا، ایسی حالت میں تشیع و تسنن کی آویزش ظاہر ہے کہ قدرتی بات ہے، خود مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مکتوب گرامی میں جس کا ذکر ابھی گذرا، اسی میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ فقیر جس علاقہ کا باشندہ ہے، وہاں شیعہ اور سنی باہم ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے ہوئے ہیں، اس واقعہ کا بھی اظہار کیا ہے، کہ

ازیں وجہ اتفاق ملاقات بیش تر می افتد و گفتگوئے ہر قسم بمیاں می آید تا انکہ گاہ	اسی لئے ان دونوں فرقوں کے لوگوں کی ایک دوسرے سے ملاقات بھی عموماً ہوتی رہتی ہے اور ہر قسم کی باتیں باہم کرتے ہیں،

بے گر گفتگوئے مذہبی نیز بر زبان می آمد (فیوض قاسمیہ ص۵)	جن میں کبھی کبھی مذہبی گفتگو بھی چھڑ جاتی ہے

بلکہ شیخ تفضل حسین کے شیعہ ہو جانے کے قصے کو بیان کرتے ہوئے سوانح قدیم کے مصنف امام نے جو یہ خبر دی ہے کہ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد اور شیخ تفضل حسین کے درمیان جھگڑا ہو گیا، اور یہ جھگڑا بالآخر اس حد تک ترقی کر کے پہنچا کہ

"مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم رح) کے ماموں میاں فصیح الدین کے ہاتھ سے (شیخ تفضل حسین) زخمی ہو کر مر گئے" ص۲۶

اگر اس فساد کا تعلق تشیع و تسنن ہی کے قصے سے تھا، اور بظاہر یہی بات معلوم بھی ہوتی ہے تو سمجھنا چاہئے کہ زبان سے آگے بڑھ کر ہاتھ اور ہتھیار تک بھی ترقی کر کے کبھی کبھی نانوتہ کے شیعوں اور سنیوں کی یہ آویزش پہنچ جاتی تھی۔

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ "خانہ جنگی" کا یہی "شر" شاید اس "خیر" کا مقدمہ تھا، جس سے نانوتہ ہی نہیں بلکہ "اسلامی ہند" کی عام آبادیاں آئندہ زمانہ میں مستفید ہونیوالی تھیں۔

تیرہویں صدی کے مجدد کا ظہور اور نانوتہ میں انکی تشریف فرمائی

میرا اشارہ "اسلامی ہند" کے اس دینی تلاطم، اور روحانی انقلاب کی لاہوتی نعمت کی طرف ہے، جو مادی حکومت سے محروم ہو جانے کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئی، یہ حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود با جود تھا، حضرت شہید کی قدر و قیمت خصوصاً اس زمانہ میں آپ کی سیاسی جدوجہد سے وابستہ سمجھی جاتی ہے، جو سرحد کی پہاڑیوں میں تطہیر پنجاب کے لئے کی گئی، جیسا کہ معلوم ہے تطہیر پنجاب کا مقصد بحمد اللہ پورا ہوا، اسی لئے ان کی اس سیاسی جدوجہد کو بھی ناکام قرار دینے والے کم از کم میرے نزدیک سید شہید کے نصب العین کے سمجھنے میں ناکام ہوئے ہیں، بہر حال جہاں سید شہید کے تجدیدی کارناموں میں "تطہیر پنجاب" بھی اس میں شک نہیں کہ بڑا تابناک کارنامہ ہے وہیں ان سیاسی کاروبار بلکہ صحیح معنوں میں مجاہدانہ فرائض کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب

کی تجدید کا تعلق ایک طرف تو خود اسلام سے تھا، جو طول امد اور مسلمانوں کی قساوت قلب کی وجہ سے پہچانا نہیں جا رہا تھا، اور دوسری طرف مسلمانوں کے ان قلوب کو آپ نے نشانہ بنایا تھا، جن کا ایمانی احساس اسی قساوت قلبی کی بیماری کی وجہ سے غباوت کا شکار ہو چکا تھا، گویا ایک طرف تو اپنی تجدیدی شست و شو سے سید شہید "الدین الخالص" اور "ان الدین عند اللہ الاسلام" کی واقعی حقیقت کو نمایاں فرمانا چاہتے تھے، اور دوسری طرف آپ کی کوشش یہ تھی کہ ممکنہ حد تک مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا کر دیئے جائیں جن میں اسی "الدین الخالص" کی شناخت و یافت کا صحیح سلیقہ ہو، چنانچہ آپ اور آپ کے باوقار وزراء کار کی جد و جہد نے ایمانی زندگی کی نئی رو دوڑا کر مختلف آبادیوں میں اسی قسم کے صالح افراد کی کافی تعداد پیدا کر دی،

اسی لئے کسی گوشہ میں بیٹھ کر سید شہید نے کام نہیں کیا، بلکہ "منصب تجدید" کی ذمہ داریاں جس دن سے ان کے اندر پیدا ہوئیں، اسی دن سے وہ اٹھ کھڑے ہوئے، اور جن بزرگوں کی وزارت سے ان کی پشت مبارک مضبوط کی گئی تھی، ان کو لے کر ملک کے اطراف و جوانب میں گھومنے لگے اسی سلسلہ میں آپ علاقہ دلّی کے اس شمالی مغربی حصہ میں بھی داخل ہوئے، بڑے بڑے شہروں کے سوا ایسے قصبات مثلاً گنگوہ، دیوبند، انبہٹہ وغیرہ میں پہنچ کر اسلام کی تطہیر اور مسلمانوں کے تزکیہ میں سب مشغول نظر آتے ہیں تفصیل کے لئے حضرت والا کی مستقل سوانح عمریوں کو پڑھنا چاہئے خصوصاً آپ ہی کے دودمان عالی کے چشم و چراغ الشاب الصالح السعید التقی والنقی مولانا ابو الحسن سید علی سلمہ اللہ تعالیٰ وایدہ اللہ بروح منہ کی "سیرت سید احمد شہید" آپ کے سامنے دین کی اس نعمت کبریٰ کی حقیقت واضح کریگی، جو دنیا کی سلطنت کو کھونے کے بعد ہند کے مسلمانوں کو میسر آئی، جہاں تک میرا خیال ہے مسلمان فکر معقول سے اگر کام لیں گے تو شاید وہ یہ پائیں گے کہ مبادلہ کے اس معاملہ میں انشاء اللہ وہ خسارے میں نہیں رہے ہیں ع ان کان فی القلب ایمان واسلام

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت سید شہید اپنے اس تجدیدی دورے اور گشت کے سلسلہ میں کھجوروں کے بن والے اس قصبے میں بھی تشریف فرما ہوئے، جو اپنے ہم چشم قصبوں میں

چھوٹا اور اس وقت تک چھوٹا شہر سمجھا جاتا تھا'

اس دور افتادہ مقام میں سید صاحب کے قدم رنجہ فرمانے کا ظاہری سبب جہاں تک میں سمجھتا ہوں غالباً وہی "تسنن و تشیع" کی آویزش کا "شر" تھا، جس سے "یہ خیر" پیدا ہوئی۔ تفصیلات کا تو علم نہ ہو سکا، لیکن سیدنا الامام الربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے تذکرۃ الرشید میں یہ روایت درج کی گئی ہے کہ

"ہنگام قیام نانوتہ میں مسمی غلام حسین شیعوں کا مولوی تھا، وہ بھی سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ایک مکان میں بیٹھے تھے، جب وہ اندر آیا تو آپ متوجہ نہ ہوئے، اس پر جوں ہی اثر پڑا، تو وہ بد نصیب جوتیاں بھی وہیں چھوڑ کر بھاگا، کہ یہ شخص سید بڑا جادوگر ہے، اور جب تک سید صاحب نانوتہ میں مقیم رہے وہ جنگل میں رہا کیا، شہر میں نہ آیا" ص ۲۷۳ ج ۲

اسی طبقہ کے ایک بزرگ سے ملنے کے لئے شیعوں کے کسی عامی آدمی کا نہیں، بلکہ ان کے مولوی کا آنا یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے، شیعہ و سنی تعلقات سے جو واقف ہیں وہی سمجھ سکتے ہیں کہ بجز خاص حالات کے یہ صورت بہت کم پیش آتی ہے، اور خواہ سید صاحب نے ظاہری طور پر بے توجہی سے کام لیا ہو، مگر غلام حسین کا متاثر ہونا، اور اس حد تک متاثر ہونا کہ بے اختیار ہو کر بھاگنا یہ واقعہ خود بتا رہا ہے کہ سید شہید نے غلام حسین پر باطنی توجہ ضرور ڈالی تھی،

بہر حال یہی واقعہ جو ایک ثقہ و حجت امام سے مروی ہے یہ بتا رہا ہے کہ نانوتہ کی سرفرازی میں اس قصبے کے مسلمانوں کا وہ رجحان بھی ضرور دخیل تھا، جو تشیع کی طرف ان میں پیدا ہو گیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آویزش میں تسنن پر جن لوگوں کا اصرار تھا، ان ہی لوگوں کی دعوت پر سید صاحب غالباً نانوتہ تشریف لائے، اس کا پتہ تو نہ چلا کہ نانوتہ کے رافضیوں میں بھی کسی کو توبہ نصیب ہوئی، یا "غلام حسین" نے "ساحر" کا جو شرارہ چھوڑا، اسی شرارے میں خود بھی جلا اور دوسروں کو بھی جلاتا رہا، مگر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہی سے یہ دوسری روایت

تذکرۃ الرشید میں جو نقل کی گئی ہے یعنی مولانا نے فرمایا کہ

"سید صاحب جب نانوتہ تشریف لے گئے تھے، وہاں بھی بہت سے لوگ مرید ہوئے، ایک مرید نے بیان کیا کہ "میری آنکھوں میں پھر رہا ہے کہ سید صاحب مسجد جامع کے وسطی دروازے میں کھڑے ہیں، نہایت شکیل و جمیل تھے اور آپ نے اپنی پگڑی اتار کر ایک سرا اپنے ہاتھ میں لیکر باقی بیعت کرنے والوں کو پکڑوادی، لوگ برابر دوسرے سرے تک اسکو پکڑے ہوئے تھے، اور پگڑی کن کھجورے کی شکل معلوم ہوتی تھی، کیونکہ دونوں طرف سے اس کو تھامے ہوئے تھے۔" ص۲۷۲

اس روایت کی بنیاد پر یہ سمجھا جا سکتا ہے، کہ نانوتہ کے مسلمانوں کی عمومیت سید شہید سے کافی طور پر متاثر ہوئی۔ ظاہر ہے کہ جو شیعہ تو نہیں ہوئے تھے، لیکن بقول امیر شاہ خاں اس اطراف کے عام قصبوں میں تشیع کا مقدمہ یعنی تفضیل کی بیماری پھیلی ہوئی تھی، اس بیماری سے جیسے دوسرے قصبات کو صحت نصیب ہوئی، نانوتہ نے بھی اس خوش نصیبی میں اپنا حصہ ضرور پایا ہوگا، اور ایک اسی بیماری کا نام کیوں لیجئے، سید شہید کی تجدید کا رخ جن دو اصولی باتوں کی طرف تھا، یعنی غیر اسلامی آلودگیوں سے اسلام کی تطہیر اور اسی کے ساتھ خود مسلمانوں کے نفس کا ایسا تزکیہ کہ حقیقی اسلام کے پہچاننے میں ان کو دشواری پیش نہ آئے، ان دونوں نعمتوں سے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مستفید نہ ہوئے، جنھوں نے سید صاحب کے عمامہ پر بیعت کی تھی۔

بلکہ سوانح قدیم میں ایک اطلاع جو یہ دی گئی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم کے جد امجد کے والد کے ایک سگے بھائی جن کا نام شیخ خواجہ بخش تھا، وہی

"جوانی میں دکن گئے وہاں نکاح کیا، وہاں ایک بیٹا محمد ہاشم نام تھا۔" ص۲۵

اس سے نانوتہ اور دکن کے ایک قدیم تعلق کا جہاں پتہ چلتا ہے، وہیں اگر یہ سوچا جائے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس وقت دامن ہمالہ کی ایک آبادی سے دکن کی سطح مرتفع کی طرف سفر یوں ہی آسان نہ تھا، پھر اسی کے ساتھ جب ہم یہ جانتے ہیں کہ "مرہٹہ گردی" کے

فتنوں نے راستے کے خطرات میں غیر معمولی اضافہ بھی کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں شیخ خواجہ بخش نے اپنے وطن مالوف کو چھوڑ کر دکن ہی کو وطن ثانی بنانے کے لئے کیوں ترجیح دی؟

جہاں تک میرا خیال ہے شیخ خواجہ بخش کی ہجرت کا یہ زمانہ وہی ہے، جب دکن میں آصفی حکومت قائم ہو چکی تھی، طوائف الملوکی کے ان ایام میں آصفی حکومت ہی سرزمین ہند میں ایسی حکومت تھی جس کے زیر سایہ اطمینان کی سانس ان لوگوں کو میسر آ سکتی تھی جو تسنن کے مسلک پر اصرار کرتے ہوئے مرنا چاہتے تھے، ورنہ خود دلی، اودھ کے شیعہ نواب وزیر کے نمائندوں کے زیر اثر تھی اور لکھنؤ تو نواب وزیر کی حکومت کا مرکز ہی تھا، یہی حال بنگال و بہار کی نظامت کا تھا یعنی مرشد آباد پر بھی شیعوں کا اقتدار قائم تھا۔

کچھ بھی ہو، قطعی فیصلہ تو مشکل ہے، مگر میرا خیال یہی ہے کہ نانوتہ سے شیخ خواجہ بخش کی یہ ہجرت غالباً اسی "تبدل حکومات" کے زیر اثر ہوئی، جس سے تمام ملک متاثر ہو رہا تھا شیخ تفضل حسین جیسے لوگ تو

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اسی طرف گھوم جاتے تھے، جدھر گھوم جانے کی دعوت زمانہ دے رہا تھا، بڑے بڑے قصبات، مثلاً بلگرام امروہہ وغیرہ کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں کے باشندوں نے اس سلسلے میں عموماً زمانہ سازی سے کام لیتے ہوئے اپنی جاگیروں اور انعامی زمینوں وغیرہ کی حفاظت[1] کی، مگر ان ہی کے ساتھ تقریباً ہر آبادی میں دوسرا گروہ بھی مسلمانوں کا تھا، جو زمانہ کے ہر اشارے کو ٹھکراتے ہوئے اپنے دین کو بچانے کے لئے دنیا اور دنیا کے

[1] مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی کتاب مآثر الکرام میں آپ کو اودھ کی چیرہ دستیوں اور زبردستیوں کی تفصیل ملے گی۔ تذکرہ کاملان رامپوری میں لکھا ہے کہ اودھ کے تسلط روہیل کھنڈ کے وقت امروہہ کے امرا نے تبدیل مذہب اور حاضری دربار کی بدولت اپنی جاگیروں کو قائم رکھا، اسی میں ہے کہ لیکن محمد رشید علی خاں جو رؤسا امروہہ سے تھے ان کا خاندان شیعہ نہ ہوا اس لئے کثیر حصہ جائداد کا ضبط ہو گیا۔ دیکھو کتاب مذکور ص۱۳۱

ہر قسم کے منافع کو قربان کرنے پر آمادہ ہوگیا، اسے حسن ظن خیال کیجئے یا جو کچھ بھی سمجھئے میرا خیال یہی ہے کہ شیخ خواجہ بخش اور ان کے خاندان کا تعلق غالباً اسی ثانی الذکر گروہ سے تھا، شیخ خواجہ بخش تو وطن کو خیر باد کہنے پر آمادہ ہو گئے، لیکن ان کے بھائی جن کا نام شیخ محمد بخش تھا، یہی شیخ محمد بخش مولنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد کے والد مرحوم تھے، سوانح قدیم کے مصنف امام نے مولوی محمد ہاشم کی اولاد کے جن خاندانوں کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"تبدل حکومات کے سبب دیہات جو جاگیر میں تھے ان کے پاس نہ رہے"

ان ہی میں معلوم ہوتا ہے کہ "محمد بخش" صاحب کا خاندان بھی تھا، جس کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ آئندہ کیا جائے گا۔

اس وقت مذکورہ بالا معلومات کے پیش کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ نانوتہ کا دینی ماحول زمانہ کے اقتضاء کے مطابق اس وقت جو کچھ ہو کر رہ گیا تھا، اس کا کچھ اندازہ لوگوں کو ہو جائے۔

اگرچہ تفصیلاً ان لوگوں کا تو مجھے علم نہ ہو سکا، جن کی انگلیاں کن کھجوروں کی طرح حضرت سید شہید کے عمامے کے ساتھ نانوتہ کی جامع مسجد میں لپٹی نظر آتی تھیں، لیکن خوش قسمتی سے سوانح قدیم کے مصنف امام کے بیان سے پھر بھی چند باتوں کا پتہ چلتا ہے، مثلاً

(۱) اسی زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی شیخ محمد بخش جن کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں رکھنے والوں نے ان کا یہ نام رکھا تھا، اس وقت مسلمان اس کی تمیز بھی کھو بیٹھے تھے کہ اولاد بخشی کی قوت خالق تعالیٰ جل مجدہٗ کی ذات واحد کے ساتھ وابستہ ہے یا نہیں، اس کا نتیجہ تھا کہ باوجود مؤمن مسلم ہونے کے اس معاملہ میں لاپروائیوں سے کام لینے لگے تھے، خود ان ہی شیخ محمد بخش صاحب کے بھائی جو نانوتہ سے ہجرت کر کے دکن چلے گئے تھے آپ سن چکے کہ ان کا نام بھی "خواجہ بخش" تھا۔ اور تو اور امام ربانی حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو والد کے ظل عاطفت سے ایام طفلی ہی میں محروم ہو گئے تھے، اسی لئے دادا کی آغوش شفقت میں آپ کی تربیت و پرورش ہوئی، مگر کتنی عجیب بات ہے کہ حضرت گنگوہی کے پالنے پوسنے والے ان کے جد بزرگوار تک

کا نام "پیر بخش" تھا[لہ]۔

بہر حال میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نانوتہ کے ان ہی شیخ محمد بخش کے صاحب زادے جن کا اسم گرامی "غلام شاہ" تھا، ان ہی کے متعلق مصنف امام نے یہ ذاتی شہادت سوانح قدیم میں درج فرمائی ہے، یعنی یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ "احقر نے بھی ان کی زیارت کی تھی" اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا ہے کہ وہ یعنی غلام شاہ صاحب

"تھوڑے پڑھے ہوئے تھے، مگر ذاکر شاغل تھے، درویشوں کی خدمت کرتے تھے" ص۲۵

قطعی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن ذکر و شغل کی یہ دولت باوجود کم پڑھے لکھے ہونے کے جہاں تک میرا خیال ہے، غالباً حضرت سید شہید ہی کی بیعت کے بعد "غلام شاہ" تک منتقل ہوئی تھی، کیونکہ سنین کے ملانے سے اتنی بات تو یقینی ہے کہ غلام شاہ صاحب بھی نانوتہ میں اس وقت موجود تھے جب سید صاحب کی تشریف آوری کی سعادت سے یہ قصبہ بہرہ اندوز ہوا تھا۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ درویشوں کی خدمت جس کا فطری ذوق تھا، اس کے وطن میں حضرت سید شہید جیسے کھلے ہوئے درویش جب تشریف فرما ہوئے تھے، تو ان کی خدمت سے وہ کیسے محروم رہ سکتے تھے، میرے پاس کوئی تاریخی وثیقہ تو نہیں ہے لیکن غلام شاہ صاحب کے اسی ذوق کی بنیاد پر دل میں یہ بات آتی ہے کہ سید شہید اگر ان کے یہاں بھی رہے ہوں تو یہ کچھ بعید نہیں ہے، کچھ بھی ہو میرا احساس، قرائن و قیاسات کی روشنی میں یہی ہے کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے متاثر ہونیوالوں میں نانوتہ کے یہ شیخ غلام شاہ بھی تھے، اور "ذکر و شغل سے ان کا تعلق بھی یہ سید شہید ہی کی بیعت یا کم از کم عقیدت کا رہین منت معلوم ہوتا ہے، سوانح قدیم کے

لہ اسی زمانہ میں ایک مولوی سالار بخش نامی بھی تھے، اپنے نام کی توجیہہ کرتے ہوئے کہتے کہ "سال آر" کے معنی سال کا لانے والا ہے اور ظاہر ہے کہ سال و ماہ کا لانے والا خدا ہی ہے، پس میں خدا بخش ہوں اس لطیفہ کا ذکر حکیم الامت کے ملفوظات میں کیا گیا ہے ۱۲

مصنف امام ہی کے بیان سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ "مسلمانوں کی باطنی تزکیہ" کا جو نصب العین سید شہید کے سامنے تھا، اس سے بھی غلام شاہ صاحب کو بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کچھ حصہ ملا تھا یعنی غلام شاہ صاحب کے ذاکر و شاغل ہونے کا تذکرہ فرماتے ہوئے آگے مصنف امام نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ

"تعبیر خواب میں مشہور تھے"

"تاویل الاحادیث" جس کی بڑی اہم قسم "تعبیر خواب" ہے، عموماً یہ نعمت ان ہی لوگوں کو عطا ہوتی ہے جو احسانی مشاغل سے اپنی ایمانی فراست کو چمکانے اور مجلی کرنے میں کامیابی حاصل کرتے ہیں، مصنف امام نے اپنی کتاب میں ان کی بعض سچی تعبیروں کا بھی ذکر فرمایا ہے، جن میں ایک خواب اور اس کی تعبیر کا تذکرہ تو انشاء اللہ آئندہ کیا جائیگا، مگر خواب کی دوسری تعبیر تو ایسی تھی، کہ صرف نانوتہ ہی نہیں بلکہ شاید پورے ہندوستان نے اس تعبیر کی صحت کی توثیق کی تھی، مصنف امام نے بیان کیا ہے کہ ان کی خواہر محترمہ نے خواب دیکھا کہ ایک چھوٹی ترازو (جیسے لڑکے کھیلا کرتے ہیں) آسمان سے گری ہے، اس پر ابابیل سیاہ رنگ کے بہت لپٹے ہوئے ہیں، اگر چھڑاتے ہیں، تو چھوٹتے نہیں "غلام شاہ صاحب سے اس خواب کی تعبیر پوچھی گئی،

"سن کر فرمایا کہ قحط[۱] ہوگا"

تعبیر بیان کرنے کے بعد زیادہ دن نہیں گذرے تھے، کہ بقول مصنف امام

"وہ قحط جس میں باندیاں بک گئیں واقع ہوا، غالباً پانچا کال اس کو کہتے تھے" ص۲۵

اس موقع پر اگر اس واقعہ کی یاد کو بھی تازہ کر لیا جائے کہ شیعہ ہو جانے کی وجہ سے شیخ تفضل حسین کے قتل کا جو قصہ نانوتہ میں پیش آیا تھا، اس میں دوسرے فریق یعنی سنیوں کے سرگروہ

---

[۱] بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اناج جو انسان کے رزق کا اہم عنصر ہے اس کا لین دین ترازو ہی سے ہوتا ہے آسمان سے ایسی ترازو کا اترنا جس کی شکل تو ترازو کی تھی مگر لین دین کا کام اس سے نہیں لیا جا سکتا تھا، یہ گویا علامت تھی کہ روزی میں تنگی پیدا ہوگی اور لوگ اسی لاحاصل سے لپٹ پڑینگے مگر ان کو اس سے فائدہ حاصل نہ ہوگا، واللہ اعلم بالصواب

یہی غلام شاہ صاحب تھے، میں نے اس کا ذکر پہلے بھی کہیں کیا ہے، یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ رفض کے خلاف جوش و خروش کی اس کیفیت میں اگر سید شہید کی تاثیری صحبت و معیت کو دخیل خیال کیا جائے تو سید شہید کے حالات اور اصلاحی خصوصیات سے جو واقف ہیں جن کا ضمناً ذکر میں نے بھی تھوڑی دیر پہلے کیا ہے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس خیال کو بے بنیاد ٹھیرانے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

(۲) دوسری بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ نانوتہ کے صدیقی شیوخ کے جد اعلیٰ جیسا کہ عرض کرچکا ہوں، مولوی محمد ہاشم مرحوم نے شاہجہاں کے عہد میں اس قصبہ کو اپنا وطن بنایا، خود وہ تو عالم و فاضل تھے، اور ان کے پوتے کا نام بھی مصنف امام نے "محمد مفتی" ارقام فرمایا ہے، واللہ اعلم بالصواب "مفتی" ان کا علَم تھا، یا افتاء کا کام کرتے تھے، اسی لئے اسی صفاتی لقب سے مشہور ہوئے، مگر اس کے بعد اس کا سراغ نہیں ملتا کہ نانوتہ کے شیوخ میں علم و فضل کا شوق آئندہ نسلوں میں باقی رہا، یا جیسے عموماً اس قسم کے خاندانوں میں زیادہ "علم پدر" کا شمار "میراث" میں نہیں کیا جاتا، بلکہ صرف مادی دولت و ثروت پر قناعت کرکے بقول مولانا حالی ان کا کل سرمایۂ نازیہ رہ جاتا ہے کہ ع

اجداد تھے ان کے مقبول داور

اسی عام مصیبت کا شکار یہ خاندان بھی ہوگیا تھا۔

بہر حال عدم العلم، اگرچہ شئی کے عدم کو مستلزم نہیں، مگر قرائن و قیاسات کا اقتضاء ہے کہ "علم پدر" کی طرف نانوتہ کے شیخ زادوں کی توجہ (بہ ظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ) زیادہ دن تک باقی نہ رہی، اگر یہ صورت نہیں پیش آئی تو مولوی اور مفتی کی اولاد کے ناموں میں "محمد بخش" "خواجہ بخش" وغیرہ ناموں کی شرکت کی توجیہ آخر ہم کیا کرسکتے ہیں؟

مگر ٹھیک اس زمانہ کے بعد یعنی سید شہید کی رونق افروزی نانوتہ میں جب ہوئی، اسی کے بعد ہم یہ پاتے ہیں کہ "غلام شاہ" صاحب اور ان کے ہم عصروں میں متعدد حضرات ایسے نظر آتے ہیں، جن کے قلوب میں "میراث پدر" کے حصول کا جذبہ اچانک بیدار ہوجاتا ہے، خود

تو معمر ہو چکے تھے، اسی لئے اپنے بچوں کو یہی نہیں کہ نانوتہ کے مکتب خانوں، یا نانوتہ کے قریب سہارنپور وغیرہ جیسے مقامات میں تعلیم کیلئے بھیج رہے ہیں، بلکہ ہندوستان کی راجدھانی دلی جو سلطنت ہی کا نہیں بلکہ سارے کمالات کا اس زمانہ میں مرکز بھی اور گو نانوتہ سے دلی زیادہ دور نہ تھی، تاہم چار دن سے کم میں وہاں بھی لوگ اس زمانہ میں پہنچ نہیں سکتے تھے، مگر تمام خطرات سے بے پرواہو کر اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اپنی آنکھوں سے دور کر کے دلی روانہ کر رہے تھے۔

غلام شاہ جن کے صاحبزادے کا نام "اسد علی" تھا، مصنف امام نے ان ہی کے متعلق لکھا ہے کہ

"جناب والد مرحوم کے ساتھ دہلی گئے تھے" صفحہ ۲۴

والد مرحوم سے مصنف امام کی مراد جیسا کہ معلوم ہے مولانا مملوک العلی صاحب ہیں، ان ہی کے ساتھ پڑھنے کے لئے غلام شاہ صاحب کے یہ صاحبزادے دلی تشریف لے گئے تھے، مصنف امام ہی نے اس کی بھی خبر دی ہے کہ "اسد علی صاحب" اپنے والد کے اکلوتے صاحبزادے تھے اس سے اس واقعہ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، اور ان کے اسی فقرے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا مملوک العلی صاحب جن کے والد کا نام شیخ احمد علی تھا، اور غلام شاہ مرحوم کے معاصر تھے انہوں نے بھی اپنے لڑکے کو دلی تعلیم کے لئے روانہ کیا تھا، مولٰنا مملوک العلی صاحب نے دلی میں جو کچھ بھی لکھا پڑھا، اس کا تفصیلی ذکر تو انشاء اللہ اپنے مقام پر کیا جائے گا، لیکن اس کا اندازہ کرنے کے لئے کہ نانوتہ میں حصول علم کا جو شوق اور نیا ولولہ پیدا ہوا تھا، اس کا پیمانہ کیا تھا، ڈاکٹر سر سید احمد مرحوم کا یہ قول کافی ہو سکتا ہے، مولٰنا مملوک العلی صاحب کے متعلق ایک موقعہ پر لکھتے ہیں لکھتے کیا ہیں اپنی چشم دید شہادت ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں کہ

"کتب درسیہ کا استحضار ایسا ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینہ عالم خالی ہو جائے، تو ان کے لوح حافظہ سے پھر نقل ان کی ممکن ہے"[1]

---

[1] آثار الصنادید حصہ دوم صفحہ ۱۲

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب العلمی کے دنوں میں شاید ہر وہ کتاب مولانا مملوک العلی کو زبانی یاد ہو گئی تھی، جو دلّی میں انھیں پڑھائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ طالب علم کے حسن ذوق کی یہ آخری حد ہو سکتی ہے۔

بہرحال مجھے کہنا یہ ہے کہ مولٰنا مملوک العلی صاحب کے ساتھ نانوتہ سے پڑھنے کے لئے دوسرے صاحب شیخ اسد علی دلّی جو تشریف لے گئے تھے، مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دلّی میں ان کی طالب العلمی کی مدت بھی کچھ کم نہ تھی، اسد علی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"اپنے پڑھنے کے زمانہ کی حکایتیں ہمارے سامنے بیان فرمایا کرتے تھے"، صـ۲۴

جس زمانہ کا یہ قصہ ہے، اس وقت سرکاری دفاتر میں "فارسی" کی حیثیت وہی تھی جو آج کل انگریزی کی ہے اور اس دفتری فارسی نصاب کی انتہائی کتابوں میں فردوسی کا شاہنامہ حصہ نظم کا اہم ترین عنصر تھا، شاہ نامہ کے ختم کرنے والوں کی حقیقت اس زمانہ کے حساب سے گویا سمجھنا چاہئے کہ وہی تھی، جو آج بی۔ اے کے گریجویٹوں کی ہے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ شیخ اسد علی صاحب نے دلّی کے قیام کے زمانہ میں

"شاہ نامہ وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں"، صـ۲۴

فارسی میں شاہ نامہ تک پہنچنے کے لئے خصوصاً جس زمانہ کا یہ قصہ ہے کافی مدت درکار تھی، اسی لئے میرا خیال ہے کہ شیخ اسد علی صاحب کے قیام کی مدت بھی دلّی میں سمجھنا چاہئے کہ کافی تھی،

خلاصہ یہ ہے کہ نانوتہ میں مذکورہ بالا مثالوں سے جس تعلیمی ہلچل کا پتہ چلتا ہے، اتنی بات تو یقینی ہے کہ سید شہید بریلوی قدس اللہ سرہ اس قصبہ میں جب تشریف لائے ہیں تو لوگوں کو اپنی بیعت میں داخل کیا ہے، یہ قصہ اسی کے بعد کا ہے، پھر اسی کے ساتھ جب ہم یہ پاتے ہیں کہ دلّی جہاں اس زمانہ میں نت نئی قسموں کی دکانیں، دین و علم کے نام سے لوگوں نے قائم کر رکھی تھیں مگر نانوتہ کے ان طالب علموں کو دیکھا جاتا ہے کہ سب کی طرف سے نظر پھیرے ہوئے، خصوصیت کے ساتھ درس کے ان ہی حلقوں میں جا کر شریک ہوتے ہیں جن کا تعلق حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے

تعلیمی وتدریسی سلسلے سے تھا، اسی سے خیال گذرتا ہے کہ بصیرت کی یہ تمیز سید شہید ہی کی تاثیر نظر ہی سے پیدا ہو سکتی تھی، اسلامی آبادیوں میں "دیدہ وردں" کا پیدا کرنا جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ان کی مہم کا بڑا اہم جز تھا، وہ ان آبادیوں میں پہنچ کر صلاحیت رکھنے والوں کا تزکیہ فرماتے تھے جس کے بعد حق و باطل کی تمیز کی قوت ان میں خود بخود پیدا ہو جاتی تھی، بلکہ ان کی تجدید کا دوسرا جز یعنی غیر اسلامی آلودگیوں سے "اسلامی تعلیمات" کی تطہیر اس میں شک نہیں کہ اس سلسلے میں بھی سید صاحب نے بہت کچھ کیا، لیکن درحقیقت شاہ ولی اللہ اور ولی اللہی اسباط علماً اس کام کو کر چکے تھے، اسی لئے اس سلسلے میں سید صاحبؒ کے کام کا بجائے علم کے زیادہ تر تعلق "عمل" سے ہے، یعنی "ولی اللہی" سلسلے میں جو علمی نتائج منقح ہو چکے تھے، ان کی عام اشاعت سید صاحب کے ذریعہ ہندوستان کے طول و عرض میں ہوئی، فجزاہ اللہ عنا وعن امۃ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم خیر الجزاء۔

خیر سید شہیدؒ کی رونق افروزی کے بعد میرے خیال کے مطابق نانوتہ کے باشندوں میں جس قسم کے انقلابی آثار کا مشاہدہ کیا گیا، اور جیسا کہ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ اپنے استاد مولانا محمد یعقوبؒ (جن کا ذکر اس کتاب میں مصنف امام کے عنوان سے آپ سن رہے ہیں) ان ہی کے حوالہ سے یہ روایت بیان کیا کرتے تھے کہ

"ایک مرتبہ میں مسجد میں تھا (شاید نانوتہ اپنے وطن ہی کی مسجد میں تھے) کہ نہایت نورانیت مسجد میں معلوم ہوئی، مجھے اس کی ٹٹول ہوئی، دیکھا کہ ایک صاحب ہیں، جن کا باطن نہایت نورانی تھا، اور ان کے تمام لطائف ذاکر تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے مجاہدہ وریاضت کی ہے، انھوں نے جواب دیا کہ نہیں تو" ---------

مولانا یعقوبؒ فرماتے ہیں کہ اسی کے بعد اس شخص نے کہا کہ

"البتہ میں تھوڑی دیر حضرت سید احمد صاحب کی خدمت میں بیٹھا ہوں"

(قصص الاکابر در الہادی ۵۶ھ جمادی الثانی)۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ جس شخص کی صحبت میں تھوڑی دیر کی شرکت ان عجیب وغریب نتائج کو پیدا کردیا کرتی تھی، جو سالہاسال کی ریاضتوں کے بعد بھی لوگوں کو میسر نہیں آتے، اگر اسی ہستی گرامی کی طرف نانوتہ کے ان انقلابی آثار ونتائج کو میں منسوب کرتا ہوں، تو اس کے انکار کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

بہرحال میرا خیال یہی ہے، اس سلسلے میں آگے بڑھنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند مؤثرات وعوامل کا ذکر کرلیا جائے جن سے نانوتہ کے مستقبل کی تاریخ متاثر ہوتی ہے،

عرض کرچکا ہوں کہ سید شہید اپنے تبلیغی دوروں کے سلسلے میں اس علاقہ کے مرکزی شہر سہارنپور بھی تشریف فرما ہوئے تھے، بیان یہ کیا جاتا ہے کہ سہارنپور میں ایک مسجد "بونبی والی" کے نام سے مشہور تھی، سید صاحب اسی مسجد کے پاس سے گذر رہے تھے کہ اچانک ٹھٹکے اور دریافت فرمایا کہ اس مسجد میں کوئی بزرگ رہتے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا کہ جی ہاں! سید صاحب مسجد میں آکر ان صاحب سے ملے اور اسی کے بعد وہ عجیب وغریب واقعہ پیش آیا، جس کا ذکر یہاں مقصود ہے۔

کہتے ہیں کہ بونبی والی مسجد میں جو صاحب تھے، ان کا نام شاہ عبدالرحیم ولائتی تھا، پہلے یہ پنجلاسہ (مشرقی پنجاب) کے ایک بزرگ جن کا نام شاہ رحم علی تھا، مرید ہوئے تھے، اور ان کے زیرتربیت رہ کر کالاآم کے پہاڑ میں بڑی بڑی سخت ریاضتیں کی تھیں، مگر اپنے اس پیر سے مجاز نہ ہوسکے تب امروہہ پہنچکر حضرت شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ سے مرید ہوئے، اور ان کی تعلیم وتربیت سے مستفید ہوہی رہے تھے کہ ان کا بھی انتقال ہوگیا، اور خلافت کی سند ان سے بھی نہ مل سکی، سہارنپور میں آکر بونبی والی مسجد میں قیام فرمالیا تھا کہ اچانک دولت بیدار خود ان کے سرہانے آگئی، یعنی سید شہید رحمۃ اللہ علیہ جیسا کہ عرض کیا گیا ان کے پاس ملنے کے لئے بونبی کی مسجد میں تشریف لائے، بیان کیا جاتا ہے کہ ملنے کے ساتھ ہی خلوت ہوگئی، پھر بڑے بڑے قصے درمیان میں پیش آئے، آخری نتیجہ یہی تھا کہ دو پیروں سے مرید ہونے اور باضابطہ تعلیم پانے کے بعد بھی

سید شہید کے دست حق پرست پر شاہ عبدالرحیم نے بیعت فرمائی اور اجازت بھی ان کو سید صاحب ہی سے حاصل ہوئی، حضرت تھانوی کی روایت ہے کہ

"ثقات سے سنا ہے کہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر کیفیات و نسبت کا مبادلہ کرتے تھے" ارواح ثلاثہ ص۱۲۵

اسی کتاب میں امیر شاہ خاں صاحب مرحوم کا یہ بیان بھی درج ہے کہ

"مولٰنا محمد قاسم نانوتوی سے انھوں نے سنا تھا، فرماتے تھے کہ آخر میں شاہ عبدالرحیم صاحب پر سید صاحب کی نسبت کا غلبہ ہوگیا تھا" ص۱۲۶

مشائخ دیوبند کے شیخ الشیوخ یعنی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے مرشدِ برحق حضرت میانجی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر یہی حضرت شاہ عبدالرحیم ولائتی ہیں جن پر سید شہید کی نسبت کا غلبہ بقول حضرت نانوتوی رح ہوگیا تھا، خلافت و اجازت بھی میاں جی جھنجھانوی قدس اللہ سرہ کو شاہ عبدالرحیم ہی سے حاصل[۱] ہوئی۔

حضرت میانجی صاحب جھنجھانوی قدس اللہ سرہ العزیز تک دین جس شکل میں شاہ عبدالرحیم ولائتی سے منتقل ہوکر پہنچا تھا، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی کہ ایک طرف جیسا کہ خود شاہ عبدالرحیم ولائتی کا بیان براہ راست ان ہی سے یہ نقل کیا جاتا ہے کہ سید شہید

---

[۱] جیسے شاہ عبدالرحیم ولائتی رحمہ اللہ دو پیروں سے مرید ہونے کے بعد بھی مجاز نہ ہو سکے، اور قدرت کا ازلی فیصلہ تھا کہ سید شہید کی مہم کی تکمیل کا کام ان سے لیا جائے گا، کچھ یہی صورت حضرت حاجی امداد اللہ کے ساتھ پیش آئی، ابتدا میں وہ حضرت شاہ محمد آفاق دہلوی کے خلیفہ شاہ نصیرالدین صاحب سے بیعت ہوئے مگر شاہ نصیرالدین کی وفات کی وجہ سے اپنی تکمیل کیلئے شیخ کی ضرورت باقی رہی، آخر بعض مبشرات کے تحت حضرت میانجی نور محمد جھنجھانوی کی خدمت میں پہنچکر سید شہید کی عطا کردہ نعمت و دولت کو جو شاہ عبدالرحیم ولائتی کے ذریعہ ان تک پہنچی تھی حضرت حاجی امداد اللہ نے حاصل فرمائی، مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی کے متعلق جو یہ مشہور ہے کہ حاجی امداد اللہ رح کو کبھی فرماتے وہ میرے بھتیجے ہیں اور میں ان کا چچا ہوں، اس کا مطلب یہی ہے کہ مولانا مراد آبادی شاہ آفاق کے خلیفہ تھے ۱۲

کی خدمت میں انھوں نے عرض کیا۔

"میں ذکر وشغل حضرات قادریہ وچشتیہ کے کرچکا ہوں" (ارواح ثلثہ ص۱۳۰)

اور دوسری طرف سید شہید کی نسبت کے غالب آجانے کے بعد ان سے جب پوچھا گیا کہ سید شہید سے آپ کو نئی چیز کیا ملی تو فرمایا کہ

"سید صاحب کی برکت سے نماز پڑھنی بھی آگئی اور روزہ رکھنا بھی آگیا۔" ص۱۲۵

جہاں تک میں سمجھتا ہوں شاہ عبدالرحیم صاحب کے ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ باطنی حالات کے استغراق میں شریعت کے عملی مطالبات کی طرف سے صوفیہ میں گونہ ایک قسم کی لاپروائی آخر زمانہ میں عموماً جو پیدا ہوگئی تھی، سید شہید کی برکت سے اس کوتاہی کی تکمیل ہوگئی یعنی باطن کے ساتھ ظاہر، غرض دین کے دونوں ضروری پہلوؤں کی تعمیر مستحکم بنیادوں پر اس راہ سے ہوگئی اور ظاہر و باطن کی جامعیت کی یہی دولت سرمدی تھی جو میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی کو اپنے پیر سے ملی، اسی کا نتیجہ تھا، جیسا کہ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ کسی خوش گلو نعت خواں کے متعلق میاں صاحب سے لوگوں نے عرض کیا کہ نعت بہت اچھی پڑھتا ہے، حضرت بھی سن لیں تو کیا مضائقہ ہے، جواب میں فرمایا کہ

"لوگ مجھے کبھی کبھی امام بنا دیتے ہیں، اور غناء بلا مزامیر میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔" (ارواح ثلثہ ص۱۳۱)

صوفی صافی اور چشتی وصابری ہونے کے باوجود محض منصب امامت کے احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماء کے اختلافی نقطۂ نظر کی اتنی رعایت بتا رہی ہے کہ جامعیت کا کتنا پختہ رنگ میاں جی صاحب قدس اللہ سرہ پر چڑھا ہوا تھا۔

میں نے براہ راست حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نائب مہتمم دیوبند (بلکہ اپنے عہد میں دیوبند کے تعلیمی نظام کی بھی روح رواں) سے ایک دفعہ (حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی کا تذکرہ فرماتے ہوئے) ان کا یہ فقرہ سنا ہے کہ حضرت میاں جی رح فرماتے تھے، کہ

"میاں میں نے ایک ایسی ہنڈیا پکائی ہے، جو نہ سو برس پہلے پکی تھی، اور نہ
سو سال بعد پکے گی"۔

غالباً یہ "جامعیت" کی یہی ہنڈیا تھی، جس میں ایک طرف پوری طاقت کے ساتھ ان باطنی کمالات کی نشو و نما کی ضمانت پوشیدہ ہے، جو حضرات مشائخ چشت میں سلفاً و خلفاً منتقل ہوتے چلے آرہے تھے اور دوسری طرف اسی کے ساتھ علماء شرع کے متعین کئے ہوئے حدود کی بھی رعایت اس حد تک محفوظ رکھی گئی ہے جس کی مثال مذکورہ بالا واقعہ ہو سکتا ہے۔

بہر حال یہی "محمدی نور" یا "نور محمدی" تھا جس سے حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا سینہ فیض گنجینہ جگمگا اٹھا تھا، پہلوں کو بھی اس پر تعجب ہوا اور آج بھی حیرت ہوتی ہے کہ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ باوجودیکہ خود باضابطہ عالم یا سند یافتہ عالم نہ تھے[ا] لیکن وقت کے علماء راسخین کی اکثریت ان کے قدموں پر کیوں جھک گئی تھی، خدائے بخشندہ کی بخشش قبول عام کی اس عام اور حقیقی توجیہ کے سوا اگر یہ سوچا جائے کہ خدائی مرضی کا ظہور کن اسباب و علل کے پیرایہ میں ہوا، تو ادنیٰ تامل یہ واضح ہو سکتا ہے کہ اسلام کے ظاہر و باطن یا جسم و روح کے خدام (علماء و صوفیاء) میں بہ تدریج منافرت کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتے ہوئے جب اس نقطہ پر پہنچ گئی کہ تقریباً ان دونوں طبقوں میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو دوسرے سے مستغنی ٹھہرالیا، اور مسلمانوں کے

[ا] حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بعض کتابوں میں خود ان ہی کی زبانی یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ بھائی ہم نے ایک باب اور دیباچہ گلستاں کا اور ایک باب بوستاں کا اور کچھ مفید نامہ اور کچھ دستور المبتدی اور چند ورق زلیخا کے پڑھے تھے، اور حصن حصین مولوی قلندر صاحب سے پڑھی تھی۔ ص کرامات امدادیہ۔ مگر ارواح ثلثہ میں مولانا تھانوی کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے صرف کافیہ تک پڑھا تھا ص۱۲ نیز قصص الاکابر میں مولانا تھانوی رحمی کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت حاجی صاحب کی ظاہری تحصیل صرف کافیہ تک تھی اور اس کے بعد کچھ مشکوٰۃ و بس ص قصص
بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ باضابطہ طالب العلمی کے دنوں میں صرف وہی کتابیں پڑھی تھیں جن کا ذکر خود فرماتے تھے، بعد کو شوقیہ کچھ کافیہ اور پھر مشکوٰۃ بھی کچھ پڑھ لی ہوگی ۱۲

دین کے ان دونوں نمائندہ طبقوں میں مختلف اسباب و وجوہ کے زیر اثر ایک قسم کی رقابت پیدا ہوگئی، اور بڑھتے بڑھتے یہی رقابت اس حد تک پہنچ گئی کہ ہر ایک دوسرے کے وجود کو غیر ضروری بلکہ الاسلام کے لئے مضر خیال کرنے لگا، اور ساتھ ہی تعبیریں ایسی پھیلادی گئیں، جن سے سمجھا جانے لگا کہ خود الدین ہی کی حقیقت کی تعیین میں یہ اختلاف ہے، شریعت وطریقت وحقیقت وغیرہ الفاظ کے پردے میں کچھ اسی قسم کی باتیں باور کرائی جاتی تھیں کہ علماء کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے کہتے تھے کہ شریعت یعنی جو کچھ ان کی فقہی کتابوں میں لکھا ہوا ہے، یہی دین کا اول بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی یہی ہے اور باطن بھی یہی ہے، اور صوفی یعنی "مشائخ" کے زمرے میں شمار ہونے والے سکھاتے تھے کہ "وہی سب کچھ ہے جو فقہاء اور علماء کی کتابوں میں نہیں پایا جاتا، بلکہ سینوں سے سینوں تک جو کچھ ان کے یہاں چلا آتا ہے، یا ان کے یہاں کے سفینوں میں لکھا ہوا ہے، حقیقی "اسلام" وہی ہے۔

جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں، شریعت و طریقت وغیرہ کا یہ افسانہ کافی طویل ہے، یہاں میری غرض صرف یہ ہے کہ جھگڑے کی اصل بنیاد نہ شریعت تھی نہ طریقت نہ حقیقت، بلکہ یہ سارا قصہ طبقاتی کش مکش کی ایک شکل تھی، یعنی بالکلیہ یہ مولویوں اور صوفیوں کا جھگڑا تھا، جسے خواہ مخواہ الاسلام کی طرف منسوب کرکے ہر طبقہ والے اپنے وجود کی ضرورت کو ثابت کرتے ہوئے اس غلطی کے مرتکب ہوئے تھے کہ دوسرے طبقہ کے وجود کو غیر ضروری ہی نہیں بلکہ آخر میں تو دین کے لئے مضر حتی کہ مہلک تک ٹھیرانے لگے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ روایت تذکرۃ الرشید میں منسوب کی گئی ہے کہ نماز پڑھنے سے مسلمانوں کو روکنا، اور ناپاکی (جنابت) سے پاک ہونے کے لئے بجائے غسل کے صرف بھبوت کا بدن پر مل لینا، فدا حسین[1] کے طریقہ کی خصوصیت تھی،

---

[1] یہ وہی شاہ فدا حسین ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حالی نے حیات جاوید میں لکھا ہے کہ سرسید احمد خاں مرحوم کے نانا خواجہ فرید الدین دبیر الدولہ امین الملک شاہ فدا حسین کے حقیقی بھائی تھے (بقیہ برصفحہ آئندہ)

مولانا گنگوہیؒ سے یہ روایت بھی اسی کتاب میں منقول ہے کہ اسی زمانہ میں جلال آباد (تھانہ بھون سے چند میل کے فاصلے پر ہے) اس قصبہ میں ایک شخص ضامن علی نامی تصوف کے مدعی ہو کر رنڈیوں سے کہتے تھے کہ

"بی تم شرماتی کیوں ہو، کرنے والا کون، اور کرانے والا کون وہ تو وہی ہے" ص ۲۴۲ ج ۲ تذکرۃ الرشید

اسلامی ہند کے جس دور سے ہمارے اس مضمون کا تعلق ہے، یعنی حضرت حاجی امداد اللہ رح جس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں، اسی وقت ذرا دتی کے دینی حلقوں کا جائزہ لیجئے، آپ کو مولویوں اور صوفیوں کی یہ کش مکش اپنی انتہائی شکل میں نظر آئے گی، ایک طرف مولوی محبوب علی صاحب تھے جو باوجودے کہ حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، مگر نفل کی دو رکعتیں جو صوفیوں میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے، اور حضرت شاہ صاحب نفل کی اس نماز کو فعل مشائخ قرار دیتے ہیں، مگر شاہ صاحب کے سامنے مولوی محبوب علی صاحب محض اسلئے کہ نفل کی ان دو رکعتوں کا انتساب حضرت غوث پاک کی طرف کیا جاتا ہے، بھرے مجمع میں اعلان

(بقیہ صفحہ گذشتہ) سید صاحب کا شاہ فدا حسین — اس تعلق کا انکشاف میں خیال کرتا ہوں کہ سید صاحب کے دینی عقائد اور خیالات کے تجزیہ و تحلیل میں بہت زیادہ معاون ثابت ہوگا۔ سید صاحب پر اپنے نانا خواجہ فرید الدین کا غیر معمولی اثر تھا انھوں نے "سیرت فریدیہ" کے نام سے اپنے نانا صاحب کی سوانح عمری بھی لکھی ہے، خواجہ فرید اپنے بھائی شاہ فدا حسین کے رسول شاہی فرقہ کے ایک فقیر ممکا شاہ کے مرید بھی تھے اور گو چار ابرو کا صفایا جو اس طریقہ کی خصوصیت تھی، خواجہ فرید نے زندگی بھر نہیں کرایا، مگر مولنا حالی نے لکھا ہے کہ "مرنے سے دو برس پہلے ان کو یہ خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو مرشد کی پوری پوری پیروی بھی کرنی چاہئے۔ آخر ایک دن چار ابرو کا صفایا کرا دیا" ص ۲۳ حیات جاوید۔ بہرحال عام طور پر یہ مشہور ہے کہ کلیۃً مغربی خیالات ہی سے سید صاحب متاثر تھے، اس مشہور خیال میں ممکن ہے کہ مذکورہ بالا انکشاف کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترمیم کرنی پڑے کہ سید صاحب کے قلم کی ناقابل برداشت بے باکیاں جہاں تک میرا خیال ہے ان کے ان ہی غیر شعوری احساسات کے بظاہر نتائج ہیں جن کی پرورش ایام طفولیت ہی میں خود ان کے گھر میں ہوئی تھی" ۱۲

کہتے ہیں کہ

"سن لو حضرت (شاہ عبدالعزیز) اس نماز کو ناجائز فرما رہے ہیں، مگر گالیوں کے ڈر سے صاف جواب نہیں دے سکتے۔" (ص۲۴ تذکرۃ الرشید ج ۲)

اور دوسری طرف اسی زمانے میں اسی دلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز ہی کے معاصر یہ صوفی فدا حسین نامی تھے، جن کا تعلق فقیروں کے ایک خاص گروہ سے تھا، جسے لوگ "رسول شاہی" کہتے تھے، ان لوگوں کا حال کتابوں میں پڑھئے۔

بہرحال ان قصوں کو میں کہاں تک بیان کروں، یہ تو ایک مستقل کتاب کا مضمون ہے، میں صرف مولوی و صوفی کی کش مکش کے ان نتائج کو مثالوں سے سمجھانا چاہتا ہوں، ملاحظہ کیجئے کہ ایک ہی دین کے پیرو، عوام نہیں بلکہ اس دین کے مختلف شعبوں پر کام کرنیوالوں کی جماعتی رقابتوں کی آگ ترقی کر کے کہاں تک پہنچ چکی تھی۔

وہ بڑی مبارک و مسعود گھڑی تھی جس وقت سہارنپور میں بونبی کی مسجد کے پاس حضرت سید شہید کا گذر ہوا، اور حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی رحمۃ اللہ علیہ پر سید شہید کا اور سید شہید پر شاہ عبدالرحیم کی نسبتوں کا اثر پڑا، رخ وہیں سے بدلا، حضرت میاںجی نور محمد جھنجھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کے ذریعہ مولویت و صوفیت کی یہی جنگ صلح کے قالب میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ ضریحہ تک پہنچی، چنانچہ حضرت حاجی صاحب کے حالات اور انکی خصوصیات کے تذکروں میں لوگ اس قسم کی چیزوں کا ذکر عموماً پاتے ہیں، مثلاً مرشد تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کمالات امدادیہ میں فرماتے ہیں،

"حضرت صاحب (یعنی حاجی امداد اللہ ان کے مرشد) علماء کی، گو وہ حضرت کے خادم ہی ہوں، اس قدر توقیر فرماتے تھے کہ اکثر ان کی طرف سے جو ہدایا و تحفے، حضور میں پیش ہوتے ان کو یہ کہکر کہ مولوی صاحب کا تبرک ہے اپنے سر پر رکھ لیتے، چنانچہ میرے روبرو بھی ایسا واقعہ پیش آیا۔" (کمالات امدادیہ ص۳۲)

کیا صوفی اور مولوی کی جماعتی لاگ ڈانٹ کے سلسلے میں طرزِ عمل کی یہ عجیب و غریب تبدیلی کوئی معمولی واقعہ ہے، جسے پڑھ لیا جاوے، اور پڑھ کر کچھ سوچے بغیر پڑھنے والے آگے بڑھ جائیں۔ ذرا غور تو کیجئے، مولویت کے اس احترام کو باوجود خادم اور مرید ہونے کے محض اس لئے کہ تحفہ بھیجنے والے آدمی کا تعلق مولویوں کے گروہ سے ہے، اس کے تحفہ اور ہدیہ کو حاجی صاحب جس وقت یہ فرماتے ہوئے کہ "یہ مولوی صاحب کا تبرک ہے" اپنے فرق اقدس پر رکھ لیا کرتے تھے، اس کا نفسیاتی اثر دیکھنے والے اور سننے والے مولویوں پر کیا پڑتا ہوگا؟

حضرت تھانوی جو خود بھی علماء ہی کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اپنے ذاتی مشاہدے حضرت حاجی صاحب کے اس طرزِ عمل کی توثیق فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں۔

"اکثر مشائخ علماء سے منقبض رہا کرتے ہیں، حضرت کی یہ توقیر دلیل ہے کہ شریعت کی آپ کے قلب میں نہایت ہی عظمت تھی" (کمالات امدادیہ صفحہ ۴۲)

شریعت سے یہاں حکیم الامت کی مراد الدین کا وہ شعبہ ہے جس پر کام کرنے والوں کا اصطلاحی نام علماء ہے اور مقصد وہی ہے کہ علماء سے انقباض کا جو سلسلہ دراز ہوتے ہوئے اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ صوفیوں کی ایک جماعت باضابطہ اس کی تبلیغ کرتی پھرتی تھی کہ دین کے جس شعبہ کی خدمت مولویوں نے کی ہے وہ دین ہی نہیں ہے جس کا ایک نمونہ اسی زمانہ میں رسول شاہی فقراء کی جماعت بنی ہوئی تھی، امیر شاہ خاں صاحب نے رسول شاہیوں کے ساتھ اسی عہد کے فقیروں کے ایک اور گروہ کا تذکرہ کیا ہے جو امام شاہیوں[1] کے نام سے مشہور تھا، خاں صاحب ان ہی امام شاہیوں کے ایک مرشد نسیم شاہ نامی کا قصہ بیان کیا کرتے تھے کہ وہ حضرت سند الوقت شیخ الکل شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک دن حاضر ہوا اور خطاب کرکے کہنے لگا کہ

---

[1] امام شاہیوں کا تذکرہ دوسری کتابوں میں بھی کیا گیا ہے، کتاب مناقب العارفین میں ان کے خرافات کا ذکر جن الفاظ میں کیا گیا ہے ان کے دہرانے کی ہمت بھی اپنے اندر نہیں پاتا، وہ العیاذ باللہ قرآن کا مضحکہ بھی اڑاتے تھے اور اپنے آپ کو دین اسلام کا پیر بھی کہتے تھے نسیم شاہ کو گلزار شاہ سے خلافت ملی تھی (ارواح ثلثہ)

"شاہ صاحب! شریعت کی قید میں کب تک رہو گے، نکلو اس قید سے اور چھوڑ دو اس شریعت کو" (ارواح ثلاثہ) ص۲۶

اور یہ تو خیر انتہائی شکل تھی، مگر جیسا کہ حضرت تھانوی ؒ نے ارقام فرمایا ہے۔

"اکثر مشائخ علماء سے منقبض رہا کرتے ہیں"

انقباض کی یہ کیفیت اس زمانہ میں عام طور پر مولویوں کی طرف سے صوفیوں میں پائی جاتی تھی، ایسے وقت میں حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے بجائے انقباض کے ان ہی مولویوں کے ساتھ اتنا انبساطی تعلق یقیناً ایک انقلابی طرز عمل تھا۔

خصوصاً جب اسی کے ساتھ اس کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ حاجی صاحب قبلہ اپنی زندگی کی ابتدائی ایام سے آخر وقت تک بجز ایک "صوفی" کے اور کچھ نہ تھے، میرا مقصد یہ ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں، ابھی اس کا ذکر گزرا بھی کہ جن علوم کی تعلیم آدمی کو مولوی بناتی ہے، ان علوم سے حاجی صاحب کو کسی زمانہ میں اکتسابی تعلق قائم کرنے کا موقعہ نہ مل سکا تھا۔

خود ہی فرمایا کرتے تھے کہ فارسی ادب کی بعض کتابوں کے پڑھ لینے کے بعد ہی،

"شوق درود وظائف کا ہوا اور دہلی میں آکر شاہ نصیرالدین صاحب سے بیعت کی" (ص۷ کرامات امدادیہ)

اور حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کی اس روایت کو اگر سامنے رکھ لیا جائے، جسے "قصص الاکابر" میں آپ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے فرماتے تھے کہ

"حضرت حاجی صاحب کی عمر جبکہ ۲۵-۳۰ سال کی تھی تب ہی سے دہلی کے شہزادے اور بیگمات وغیرہ آپ کے معتقد تھے" (ص۹۶ قصص)

تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ آخر زمانہ میں تو خیر اپنے وقت کے شیخ المشائخ وہ تھے ہی، مگر زندگی کے ابتدائی ایام میں بھی لوگوں نے ان کو صوفی سمجھا، اور صوفی ہی پایا، مولوی یا ملا ہونے یا اس طبقہ کے لوگوں میں گنے جانے کا موقعہ کسی زمانہ میں بھی ان کو نہ ملا، ایسی

صورت میں مولویوں کے ساتھ ان کے طرزِ عمل کی اس غیر معمولی تبدیلی کی توجیہ بجز اس انتساب گرامی کے اور کس واقعہ سے کی جائے جو حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حضرت میانجی نور محمد جھنجھانوی کے توسط سے ان کو میسر آیا تھا، ازلی توفیق، کا مجھے انکار نہیں، بلکہ حضرت حاجی صاحب کے حالات میں اس غیبی لطیفہ کا جو تذکرہ کیا گیا ہے، قصص الاکابر میں حضرت حکیم الامت تھانوی کی زبانی یہ منقول ہے کہ

"حضرت (یعنی حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ) نے خواب دیکھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، حضرت کی ایک بھاوج تھیں، وہ کھانا پکانے کا انتظام کیا کرتی تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ تم ہٹو، ان کے (حاجی صاحب) کے مہمان علماء ہیں اور ان کی مہمانی ہمارے ذمہ ہے، ہم انتظام کریں گے" ص۶۱

اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، کہ "مولویت وصوفیت" کی جنگ کا اختتام کم از کم سرزمین ہند میں حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ کے لئے غیب ہی سے مقدر ہو چکا تھا، لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ہر غیبی واقعہ عالم شہادت کے اسبابی پردوں ہی کو چہرے پر ڈالے ہوئے نمایاں ہوتا ہے یہاں بھی اس غیبی لطیفہ کا ظہور مذکورہ بالا شکل میں ہوا۔

بلکہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اس قسم کے مکاشفات کا انتساب ان کے سوانح نگاروں نے جو کیا ہے، مثلاً حضرت حکیم الامت تھانوی نے اپنی کتاب "کرامات امدادیہ" میں مولوی عبد الغنی بہاری مرحوم کی کتاب "شمائم امدادیہ" کے حوالہ سے خود حضرت حاجی صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ طلب حق کے ابتدائی دنوں میں ایک دفعہ خواب میں بارگاہ رسالت پناہی کی سعادت حاجی صاحب کو حاصل ہوئی، خواب ہی میں دیکھتے ہیں کہ ان کے جد امجد جن کا اسم گرامی حاجی حافظ بلاقی رحمۃ اللہ علیہ تھا، وہی حاجی صاحب کے ہاتھ کو پکڑے ہوئے رسول اللہ اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش فرما دیتے تھے، سننے کی بات اسی کے بعد آپ کے بیان کا یہ جزء ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ لیکر حوالہ حضرت میاں جیو صاحب چشتی (یعنی میانجی نورمحمد جھنجھانوی قدس اللہ سرہ العزیز) کے کردیا" صٓ ۲۷ کرامات امدادیہ

خواب میں یہ واقعہ اس زمانہ میں پیش آیا تھا کہ بقول حاجی صاحب کے

"اس وقت تک بعالم ظاہر حضرت میاں جیو صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ سے کسی طرح کا تعارف نہ تھا"

اس کے بعد پھر میاں جیو صاحب کی خدمت میں حاضری کی تفصیل بیان کی ہے۔

میری غرض اس واقعہ کے ذکر سے یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی کے توسط سے حضرت سید احمد شہید کی عطا فرمودہ جو نعمت میاں جیو تک پہنچی تھی اس نعمت کی تقسیم عام کے لئے حضرت حاجی امداد اللہ ہی کا انتخاب غیب میں کیا گیا تھا، اس کی تائید یقیناً عالم رؤیا کے اس مکاشفے سے بھی ہوتی ہے اور یہ قصہ تو اس وقت کا ہے جب تک میاں جیو صاحب سے حاجی صاحب کا تعارف بھی نہ ہوا تھا، میاں جیو کی غلامی میں داخل ہونے کے بعد تقریباً اسی مسئلہ کا اعادہ بجائے رؤیا اور خواب کے مراقبہ کی حالت میں حاجی صاحب کے سامنے جو فرمایا گیا ہے، اس کا تذکرہ بھی اسی کتاب کرامات امدادیہ میں کیا گیا ہے، یعنی حضرت حاجی صاحب خود فرماتے تھے کہ مدینہ منورہ میں ایک دفعہ مسجد نبوی کے اس خاص مقام میں جسے روضہ جنت کہتے ہیں، سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار اقدس سے متصل مسجد نبوی میں اس جگہ واقع ہے جسے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سرہانا ہم کہہ سکتے ہیں، صحیح حدیثوں میں اس کو جنت کے باغوں میں کا ایک باغ فرمایا گیا ہے، بہرحال اسی "روضۃ من ریاض الجنۃ" میں حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ میں مراقب تھا "مراقبہ" میں ان پر منکشف ہوا کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مقدس سے بصورت میاں جیو قدس اللہ سرہ (یعنی میاں نورمحمد جھنجھانوی نکلے، اور عمامہ لپٹا ہوا اور تر (یعنی بھیگا ہوا) اپنے دست مبارک میں لئے ہوئے تھے، میرے سر پر غایت شفقت سے رکھدیا اور کچھ

نہ فرمایا اور واپس تشریف لے گئے "۔ (کمالات ص۳۱)

تعلق سے پہلے بھی بارگاہ رسالت سے حاجی صاحب میاں جیو قدس اللہ سرہ کے سپرد کئے جاتے ہیں اور تعلق پیدا ہو جانے کے بعد بھی، میاں جیو ہی کی شکل میں مرشد حقیقی کی حقیقت حاجی صاحب کے سامنے جلوہ افروز ہوتی ہے، بلاشبہ یہ اتفاقی واقعہ نہیں، بلکہ غیب و شہادت کے تعلقات سے تھوڑی بہت سی واقفیت جو رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ "غیب و شہادت کے اتفاق" کے سوا اس کی دوسری توجیہ نہیں ہو سکتی، بلکہ "عمامہ" جو مولویت کی عام علامت ہے اس کو "تر" یعنی بھیگی ہوئی شکل میں حاجی صاحب کے سر پر جو رکھا گیا، فقیر کے ناقص خیال میں یہ "خشک مولویت اور صوفیت" کے اس اجتماع کی طرف بظاہر غیبی اشارہ معلوم[1] ہوتا ہے، جو حضرت حاجی صاحب کے مشرب ناب کا طغرائے امتیاز ہے، بہر حال کچھ ہو، یہ واقعہ ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ

برنگ فقر چوں ملائی آمد
بہ فیض امداد الٰہی آمد

لیکن واسطہ فی الفیض اس قصہ میں جہاں تک میرا ناچیز خیال ہے حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ہی معلوم ہوتی ہے، ان ہی کے ذریعہ سے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا چڑھایا ہوا انقلابی رنگ حاجی صاحب قبلہ تک منتقل ہوا، بلکہ اسی کے ساتھ اگر حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے اس بیان کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے، "جو کرامات امدادیہ" میں براہ راست ان ہی کی طرف منسوب کر کے درج کیا گیا ہے، یعنی حاجی صاحب نے فرمایا کہ

"ظاہر میں اول بیعت میری طریقہ نقشبندیہ میں حضرت نصیر الدین صاحب دہلوی خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق صاحب سے ہوئی، اور باطن میں بلا واسطہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

[1] اگرچہ حکیم الامت قدس اللہ سرہ العزیز نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ سلوک بعد جذب و تمکین بعد تلوین و بقاء بعد فنا" کی طرف اشارہ ہے ممکن ہے کہ اس کی طرف بھی اشارہ ہو ۱۲

ایک بلند جگہ پر رونق افروز ہیں، اور حضرت سید احمد شہید کا ہاتھ آپ کے دستِ مبارک میں ہے، اور میں بھی اسی مکان میں بوجہ ادب کھڑا ہوں حضرت سید صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ میں دیدیا۔" ص۱۱۲

اس سے تو واقعہ بالکل صاف اور یہ دعویٰ انشاء اللہ غیر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب قبلہ کا وجود گویا ایک حیثیت سے حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کا نقشِ ثانی، اور بروز صفائی تھا، اسی "نصب العین" کی تکمیل کے لئے قدرت نے ان کو چن لیا تھا، جس کے لئے بارہویں صدی کے مجدد کو اٹھایا گیا تھا۔

تمام شعبوں میں نہ سہی، مگر "صوفی وملا" کی باہمی رقابت اور طبقاتی کش مکش کے قصوں کو ختم کر کے فقیری میں ملائیت اور ملائیت میں فقیری کو سمونے اور جذب کرنے کی نظریاتی کوشش درحقیقت شاہ ولی اللہ نے فرمائی تھی، اسی میں عمومیت اور مسلمانانِ ہند کی اکثریت کو اسی مسلک کے زیر اثر لانے کی تکمیل کی ذمہ داری (جس کا آغاز سید شہید نے فرمایا تھا) کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تھانہ بھون کے اسی فاروقی شیخ زادے کے سپرد کی گئی جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ سے آج دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔

مرشد تھانوی حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ کے ملفوظات میں ایک سے زائد مقامات میں اس قسم کے فقرے ملتے ہیں، مثلاً قصص الاکابر میں ہے، مولانا تھانوی نے فرمایا

"حضرت حاجی (یعنی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) اپنے زمانہ میں مثل حضرت سید احمد کے تھے۔" ص۶۶

ان دونوں بزرگوں میں منجملہ دوسرے اشتراکی وجوہ کے ایک خاص مشترک شان یہ بھی ہے کہ مولویت کے تعلیمی نصاب کی تکمیل کا رہین منت نہ حضرت سید شہید کا "دین مبین" تھا اور نہ حضرت حاجی صاحب کی دینی زندگی درسی کتابوں کی احسان مند تھی، حکیم الامت ہی کی طرف اسی کتاب میں جو یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ

"مثل شاہ سید احمد صاحب کے ابتداہی سے آپ کی (یعنی حضرت حاجی امداد اللہ کی)
ایسی حالت تھی" ۶۸ قصص الاکابر

اس کا مطلب بھی یہی ہے،

سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مذکورہ بالا معلومات جو پیش کئے گئے ہیں ان کو حافظہ میں محفوظ کرتے ہوئے اب سید شہید کے ان ہی مثنیٰ حاجی صاحب کی بابت سوانح قدیم کے مصنف امام کی ان شہادتوں کو بھی سن لیجئے، حاجی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے وہ ارقام فرماتے ہیں کہ

"حضرت مخدوم (حاجی صاحب) کی نانہال ہمارے خاندان میں تھی"۔ ۲۶

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب قبلہ کی نانہال ہونے کا شرف نانوتہ کو حاصل تھا، بالفاظ دیگر یہ سمجھنا چاہیئے کہ حاجی صاحب کا مادری وطن یعنی آپ کی والدہ ماجدہ کا گھر نانوتہ ہی تھا، صرف یہی نہیں، مصنف امام نے آگے لکھا ہے کہ

"اور بہن ان (حاجی صاحب) کی یہاں (نانوتہ میں) بیاہی تھیں"۔ ۲۶

رشتے کے ان ہی تعلقات کا نتیجہ یہ تھا جیسا کہ وہی فرماتے ہیں کہ حاجی صاحب

"اکثر نانوتہ تشریف لایا کرتے تھے"۔ ۲۶

"کرامات امدادیہ" جو حضرت تھانوی کی تالیف ہے، اس میں مولانا محمد منیر نانوتوی کے متعلق ایک غیر معمولی واقعہ کا تجربہ درج کیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مولوی محمد منیر صاحب جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ہم عمروں میں تھے، وہی بچپن میں بیمار ہوئے، اطباء کی طرف سے سخت پرہیز کا حکم تھا، مہینوں پرہیزی کھانا کھاتے کھاتے تنگ آچکے تھے، اتفاقاً حضرت حاجی صاحب نانوتہ تشریف لائے، مولانا محمد منیر صاحب کی والدہ صاحبہ نے ان کی دعوت کی، دعوت کے کھانے میں حاجی صاحب نے مولوی محمد منیر کو صرف شرکت ہی کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ فرمایا کہ جی بھر کر کھالو، دوسرے دن ان کی خالہ کے یہاں دعوت ہوئی، وہاں بھی یہی حکم

ان کو دیا گیا، مولوی منیر صاحب کا بیان تھا کہ سیر ہو کر دونوں جگہ مرغن کھانے میں نے کھائے مگر اطبا نے جن خطروں کی دھمکی دی تھی ان میں کوئی خطرہ پیش نہ آیا، اسی قصے کے ذیل میں مولوی محمد منیر نے یہ بھی فرمایا کہ

"دونوں صاحبہ (یعنی ان کی والدہ اور خالہ دونوں) حضرت حاجی صاحب سے مرید تھیں" ۲۵

جس کا مطلب یہی ہوا کہ نانوتہ کو صرف حاجی صاحب کے مادری وطن اور ننہال بننے ہی کی سعادت حاصل نہیں ہے، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نوعمری ہی کے زمانے سے نانوتہ والے حاجی صاحب کے معتقد بھی تھے، جب ان کی بیعت وارادت کے دائرے میں بھی لوگ داخل ہو چکے تھے تو آگے عقیدت ونیاز کے لئے کیا چیز باقی رہ جاتی ہے۔

اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ نانوتہ کی تاریخ کے جس دور تک ہم اس وقت تک پہنچے ہیں، اس زمانے میں عموماً نانوتہ کے شرفاء کے قلوب پر حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کافی وزن پڑا ہوا تھا، یہ اس قصبے کے باشندوں کی خوش قسمتی تھی کہ قدرت کی طرف سے ان کو ایک ایسا "دل" عطا کیا گیا تھا، جو ولی اللہی رنگ سے رنگین، اور ولی اللہی نور سے منور تھا۔

اور ٹھیک جیسے اس ولی اللہی قلب کی روشنی سے یہ قصبہ اپنی تاریخ کے اس عہد میں جگمگا رہا تھا یہ خدا ہی کی طرف کی بات تھی، اور اسی کے لطف خفی کے ظہور کی یہ شکل تھی کہ حضرت سید شہید کی رونق افروزی کے بعد یہاں کے باشندوں میں طلب علم کا نیا جوش وولولہ پیدا ہوا تھا، اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ اسی کے بعد ایک تعلیمی وفد طلب علم کی مہم پر نانوتہ سے دلی روانہ ہوا تھا، اسی سلسلہ میں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ وفد کے ارکان میں سب سے زیادہ نمایاں کامیابی شیخ احمد علی نانوتوی کے صاحبزادے مولوی مملوک العلی نے حاصل کی تھی، سرسید احمد خاں کی ذاتی شہادت ان ہی کے متعلق گذر چکی جس کا حاصل یہ تھا کہ درسی کتابیں دنیا سے اگر ناپید بھی ہو جائیں تو سید صاحب کا خیال تھا کہ مولانا مملوک العلی کے حافظہ سے دنیا ان کتابوں کی نقل بآسانی حاصل کر سکتی ہے، گویا یہ ساری کتابیں ان کو زبانی یاد تھیں۔

بہرحال مولانا مملوک العلی کے فضل وکمال کی داستان تو الگ ہے، اس وقت میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسے نانوتہ اس زمانے میں ایک ولی اللہی قلب کے زیر قدم آگیا تھا، اسی طرح جس دماغ کے دباؤ کے نیچے اس زمانہ میں اس قصبہ کے شیوخ اور عام شرفا کو ہم پاتے ہیں اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی نظر آتی ہے کہ اس کی تربیت کا کام بھی کلیۃً ولی اللہی طریقۂ تعلیم کے ماحول میں انجام پایا تھا۔

تفصیل کا تو یہاں موقعہ نہیں ہے، لیکن مولانا مملوک العلی کے طلب علم کے ابتدائی ایام کے متعلق جو روایت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرکے کتاب ارواح ثلثہ میں درج کی گئی ہے، میرے نزدیک تو نتیجہ تک پہنچانے کے لئے یہی روایت کافی ہو سکتی ہے، مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ

"مولانا مملوک العلی صاحب نانوتوی جب تحصیل علم کے لئے دہلی تشریف لے گئے تو صورت حال یہ تھی کہ جس استاد سے پڑھنا شروع کرتے وہ کچھ قلت مناسبت محسوس کر کے ایک سبق کے بعد دوسرا سبق نہ پڑھاتا تھا، مولنا سخت ملول وغمگین تھے، اسی عالم پریشانی میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا غم سنایا، کہ میں علوم کے شوق میں وطن چھوڑ کر آیا ہوں جس سے پڑھنا شروع کرتا ہوں، ایک سبق کے بعد پڑھانے کا نام نہیں لیتا، شاہ صاحب نے فرمایا اچھا کل آنا، مولانا اگلے روز حاضر ہوئے، حضرت شاہ صاحب نے ہدایت النحو کا ایک سبق پڑھا دیا۔ اور فرمایا کہ جاؤ اب جس استاد سے پڑھو گے، وہ پڑھانے سے انکار نہ کرے گا"۔ صفحہ ۱۴۶ ارواح

اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً مولانا مملوک العلی کے استاذوں نے علمی مناسبت ان میں نہیں پائی جو نانوتہ کے اس ماحول کا نتیجہ تھا، جس سے نکل کر مولانا مرحوم دلی کے علمی حلقوں کے نوگرفتاروں میں شریک ہوئے تھے، وہیں دلّی جہاں ہر قسم کی اونچی اونچی

دکانیں علوم و فنون کی بھی اور فقر و درویشی کی بھی چل رہی تھیں، اسی دلّی میں اپنے درد و غم کے اظہار کے لئے حضرت شاہ عبدالعزیز کی بارگاہ عالی کا انتخاب مولانا نے کیا، یہ صورت حال بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ خانوادہ ولی اللہی کی عظمت و عقیدت کے ساتھ وہ دلّی میں داخل ہوئے تھے، میرے اس خیال کی کہ نانوتہ کی اس نئی علمی ہل چل میں حضرت سید شہید کا مبارک ہاتھ نظر آتا ہے اس واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اور اس کو بھی جانے دیجئے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جو اس زمانے میں درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر چکے تھے انھوں نے ایک سبق تبرکاً مولانا کو پڑھا کر صرف اسی بات کی اجازت نہ دی کہ دلّی کے جس استاذ سے چاہو پڑھو، بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے کشفی پیشین گوئی بھی شاہ صاحب نے فرما دی کہ جس استاذ سے بھی پڑھو گے وہی تمہیں پڑھائیگا، مگر اس اجازت عام اور کشف تام کے باوجود جانتے ہو مولنا مملوک العلی نے کیا کیا؟

حالانکہ اس زمانہ میں جیساکہ جاننے والے جانتے ہیں دلّی اہل کمال سے بھری ہوئی تھی، قدم قدم پر تدریسی حلقے قائم تھے، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ مولانا مملوک العلی کے استاذوں کی فہرست میں بجز ایک نام کے کم از کم کوئی دوسرا نام مجھے تو آج تک نہیں ملا ہے، اور ان کے یعنی مولانا مملوک العلی کے ان معلم فرید، استاذ وحید کی خصوصیت کیا تھی؟

"شاگرد رشید، اور مخلص خالص العقیدت جناب جنت مآب زبدۂ اکابر روزگار مولنا رفیع الدین رضوان اللہ علیہ کے تھے، اور ان کی خدمت میں ایسا اخلاص وافر رکھتے تھے کہ حضرت موصوف آپ کی تربیت میں مادام الحیات ایسے مصروف تھے، جیسے باپ فرزند کی تربیت میں۔" (ص۱۵ حصہ سوم آثار الصنادید)

مولانا مملوک العلی کے استاذ وحید کی خصوصیت مذکورہ بالا الفاظ میں ڈاکٹر سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں بیان کی ہے،

اب جو حضرت مولانا رفیع الدین کی شخصیت سے واقف ہے، اور جانتا ہے کہ یہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے اور مولانا شاہ عبدالعزیز کے حقیقی بھائی کا

نام ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ مولانا مملوک العلی کے دماغ کو خانوادہ ولی اللٰہی کا ساختہ پرداختہ دماغ اگر میں قرار دیتا ہوں، تو ایک واقعہ کے اظہار کے سوا یقیناً یہ اور کچھ نہیں ہے، مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان تلمیذ رشید کا اسم گرامی مولوی رشید الدین خاں تھا، مولانا مملوک العلی کے سوانح نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ انھوں نے اول سے آخر تک جو کچھ بھی پڑھا، ان ہی مولانا رشید الدین خاں صاحب ہی سے پڑھا، سرسید احمد خاں نے بھی مولانا مملوک العلی کا تعارف "شاگرد رشید مولوی رشید الدین خاں" کے الفاظ سے کراتے ہوئے آگے مولانا کے دوسرے حالات کا ذکر کیا ہے۔

بہرحال شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے براہ راست صاحبزادے مولانا رفیع الدین صاحب نے اپنے جس شاگرد کی تعلیم و تربیت سرسید احمد خاں کی شہادت کے مطابق اپنے فرزند کی طرح کی تھی اور مادام الحیات یعنی جیتے جی شاہ صاحب اپنے اس محبوب شاگرد کی ساخت و پرداخت تراش و خراش میں مشغول رہے، دینی علوم جو خانوادہ ولی اللٰہی کا سرمایۂ امتیاز تھا، صرف وہی نہیں بلکہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے صاحبزادے مولوی بشیر احمد صاحب نے دلی کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں تصریح کی ہے کہ

"مولوی رشید الدین خاں کو خصوصیت کے ساتھ شاہ رفیع الدین نے ریاضیات کی تعلیم دی" ص۹۰۹ ج۲ تاریخ دار الحکومت دلی

جس سے معلوم ہوا کہ نقلی و عقلی علوم حتیٰ کہ ریاضی جیسے خالص عقلی فن تک کی تعلیم بھی مولوی رشید الدین خاں صاحب کی ولی اللٰہی خاندان میں پوری ہوئی، مولوی رشید الدین خاں کی اسی جامعیت کا غالباً یہ نتیجہ تھا کہ مولانا مملوک العلی کو ان کے سوا کسی دوسرے استاذ کے پاس جانے کی ضرورت نہ ہوئی، کیونکہ اس زمانہ میں جو کچھ بھی لکھایا پڑھایا جاتا تھا، سب کے لئے ان کے یہی ایک استاد مولوی رشید الدین کافی تھے۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ نانوتہ سے جس تعلیمی وفد میں شریک ہو کر مولانا مملوک العلی طلب علم

کے لئے دلی تشریف لائے تھے، جیسا کہ عرض کرچکا ہوں، خود یہ واقعہ اُس تحریک کا نتیجہ تھا، جس سے سید شہید کی رونق افروزی کے بعد اہل نانوتہ کو ہم متاثر پاتے ہیں، دلی پہنچ کر پابوسی کے بعد حصول علم میں کامیابی کی ضمانت بھی مولانا مملوک العلی صاحب کو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عطا کی گئی، اور اس کے بعد اول سے آخر تک مولانا مملوک العلی نے سب کچھ مولوی رشید الدین خاں صاحب سے پڑھا، ان سارے تاریخی مؤثرات و عوامل کو سامنے رکھ لینے کے بعد اس پر کیوں تعجب کیا جائے، اگر مولانا مملوک العلی کو میں ایک ایسا ولی اللہی دماغ یقین کروں جس میں جو کچھ بھی آیا ولی اللہی سرچشمہ سے ہی آیا، اسی گھاٹ پر وہ اترے بھی اور اسی ایک گھاٹ سے سیر ہو کر وہ واپس بھی ہوئے، ان میں دین کی سوجھ بوجھ بھی اسی راہ سے پیدا ہوئی، اور دنیاوی عقل کی نشوونما میں بھی ان کا دماغ ولی اللہی توانائیوں کے سوا کسی دوسرے کا کسی حیثیت سے منت کش نہ ہوا، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مولانا مملوک العلی جن کی زندگی بعد کو جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا دلی میں گذری اور دلی ہی میں آپ کی وفات بھی ہوئی تو وفات کے بعد دلی والوں نے جو یہ طے کیا کہ شہر کے ہزارہا ہزار قبرستانوں کے مقابلہ میں مولٰنا کی تدفین کے لئے اسی حظیرۃ القدس کا انتخاب کیا جائے جس میں خود حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے اسلاف و اخلاف آرام فرما ہیں تو خود یہ واقعہ بتا رہا ہے کہ مولٰنا مملوک العلی کی ولی اللہیت دلی والوں کے نزدیک بھی ایک اجماعی مسئلہ کی صورت اختیار کر چکی تھی، ورنہ کوچہ چیلان جہاں مولٰنا مملوک العلی کی وفات اپنے ذاتی مکان میں ہوئی تھی، وہاں سے پرانی دلی کے اس دور دراز مقام تک آپ کے جنازے کو لے جانا کیا آسان تھا؟ جہاں حضرت شاہ ولی اللہ کا خاندانی مدفن ہے۔ بلکہ شاہ صاحب کے خاندان والوں کا اس پر راضی ہو جانا کہ مولٰنا مملوک العلی کو ان کے خاندانی ہڈواڑ میں جگہ دی جائے، خود یہی واقعہ اس خصوصیت کی بین شہادت ہے، جو مولانا مرحوم کو حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے دودمان عالی سے اپنوں اور غیروں کے نزدیک حاصل تھی، گویا یہ مان لیا گیا تھا کہ

مولانا مملوک العلی بھی اسی خاندان کے ایک رکن رکین ہیں، آخر ولی اللٰہی خاندان کے بزرگوں کے حلقہ میں جس نے ساری زندگی گذار دی، اور ان ہی بزرگوں کے قدموں کے نیچے قیامت تک کے لئے جو سو گیا، جس کے محیا اور ممات کی یہ حالت ہو، اس کی ولی اللٰہیت میں تایا جائے کہ شک کی گنجائش ہی کیا پیدا ہوتی ہے۔

بہر حال کھجوروں کے بن والی آبادی (نانوتہ) جیسے ایک خالص ولی اللٰہی قلب و روح یعنی حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مکی کے زیر قدم قدرت کی مخفی کار فرمائیوں کی بدولت آگئی، اب دیکھئے کہ قدرت کا وہی پوشیدہ ہاتھ اسی آبادی کو ایسے دماغ (یعنی مولٰنا مملوک العلی) کے نیچے کیسے لاتا ہے جس کی تربیت و پرداخت اور نشو و نما بالکلیہ ولی اللٰہی ماحول میں انجام پائی تھی۔

قصہ کی پوری تفصیل کی تو یہاں گنجائش نہیں، لیکن اس سرگذشت کے جتنے اجزار کی ضرورت ہے ان کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ قصہ کے ان ہی اجزار میں آپ کو انشاء اللہ وہ روشنی بھی مل جائیگی جو آپ کے سامنے ان گم شدہ کڑیوں کو بھی پیش کر دے گی، جن سے مسلمانان ہند کی تعلیمی تاریخ کے ماضی اور حال میں تسلسل پیدا ہو جاتا ہے، اور واضح ہو گا کہ نئی تبدیلیاں اس ملک کے مسلمانوں کی دینی اور غیر سرکاری تعلیم کے نظام میں جو پیدا ہوئیں، یہ تبدیلیاں کس راہ سے داخل ہوئیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان پر قابو یافتہ ہونے کے بعد تعلیم کے جس نظام کو انگریزوں نے اس ملک میں جاری کیا تھا اس کے پیچھے جو نیت کار فرما تھی، اب تو وہ طشت از بام ہو چکی ہے تعلیم کے اس نظام کے نتائج جو سب کے سامنے ہیں ان کے سوا اس قسم کے اعترافات مثلاً میکالے کی رپورٹ کے الفاظ یعنی

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو، اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون

اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق اور رائے، الفاظ
اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو"

(مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۱۴۷ بحوالہ سجر باسو صفحہ ۸۵)

یہ اور اسی نوعیت کی شہادتوں کا اس وقت تک کافی ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، نہ صرف خواص بلکہ عوام بھی تقریباً ان سے واقف ہیں۔

مگر اس مقصد تک پہنچنے کے لئے درمیان میں تجربے کی جن منزلوں سے حکومت تسلط کو گذرنا پڑا، اس کی داستان کافی دلچسپ لیکن اسی کے ساتھ حد سے زیادہ طویل بھی ہے، ہم اپنی اس کتاب میں اس کی گنجایش نہیں نکال سکتے، مگر اسی "شر" سے چونکہ "خیر" کا ایک پہلو بھی پیدا ہوا اس لئے چند جوہری حقائق کا تذکرہ مفید ہوگا۔

اسی زمانہ میں جب "ایسٹ انڈیا کمپنی" کا نقاب حکومت کے چہرے سے ابھی اترا بھی نہ تھا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں اشاعت تعلیم کے نام سے مختلف ادارے مختلف خصوصیتوں کے ساتھ قائم ہونے لگے تھے، غیر مسلم آبادی کے لئے کلکتہ، پونا، بمبئی، بنارس وغیرہ شہروں میں جو تجربے خانے اس سلسلہ میں جاری کئے گئے، میرے دائرہ بحث سے ان کا قصہ خارج ہے، اس کے لئے لارڈ میکالے کا وہ خانگی پوشیدہ خط ہی کافی ہو سکتا ہے، جسے بڑی امیدوں کے ساتھ بطور بشارت کے اپنے والد کے نام لاٹ صاحب نے بھیجا تھا، جس میں لکھا تھا کہ

"اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے، کوئی ہندو جو انگریزی دان ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا"۔ (صفحہ ۱۳۸ مسلمانوں کا روشن مستقبل)

بہر حال ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ اس نئی قائم ہونے والی حکومت نے تجربات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا جہاں تک میرا خیال ہے ان کی ابتدا مسلمانوں کے دار السلطنت دلّی کے اس کالج سے ہوئی جو پہلے شاید مدرسہ شاہجہاں آباد کے نام سے مشہور رہا، اور بعد کو دلّی کے اسی کالج کا نام عربک کالج ہو گیا تھا، غالباً مسلمانوں کے لئے الگ تجربے خانے کی ضرورت

اسی لئے محسوس ہوئی، کہ جس راہ سے ہندوؤں کو اپنے ڈھب کا بنایا جا رہا تھا، وہی راہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے لئے چنداں نتیجہ خیز نہیں ثابت ہو رہی تھی۔

اپنے خط میں لارڈ میکالے نے ہندوؤں کا ذکر جس طریقہ سے کیا ہے خود یہی اس خیال کی تائید کے لئے کافی ہے، کچھ بھی ہو، دلی میں عربی کالج قائم کیا گیا، اور تجربوں کا جو سلسلہ اس کالج میں شروع ہوا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے، کہ اس کالج کے قیام پر ابھی کل سولہ سال گذرے تھے، مسٹر ٹامسن نے اسی زمانے میں اسی کالج کے متعلق حکومت میں رپورٹ پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"یہ (یعنی دلی کالج) سولہ سال سے قائم ہے، اور اس عرصے میں بے شمار تجویزوں اور تحریکوں کا یکے بعد دیگرے تجربہ کیا گیا۔" (ص۹۶ مرحوم دہلی کالج)

سولہ سال کی محدود مدت میں "بے شمار تجویزوں اور تحریکوں کے تجربہ" کی آماجگاہ جو مدرسہ بنا ہوا تھا، بجائے تعلیم گاہ کے "تجربہ خانہ" ہی کے نام سے موسوم ہونے کا شاید زیادہ مستحق ہے، یہ تجربے کئے جاتے تھے اور ان کے نتائج حکومت کے سامنے پیش ہوتے رہتے تھے، تفصیلات کے لئے تو دلی کالج کی متعلقہ رپورٹوں اور ان کتابوں کو پڑھئے جن میں اس کالج کی تاریخ بیان کی گئی ہے لیکن مثلاً بعض رپورٹوں کے ان اقتباسات کو پڑھئے، اسی کالج کے صدر مسٹر بترو نے اپنی رپورٹ میں ایک دفعہ لکھا تھا

"نتیجہ یہ ہوا کہ ان علوم نے (جو دلی کالج میں پڑھائے جاتے تھے) اس تعصب اور تنگ خیالی میں جو محض عربی و فارسی کے طلبہ میں پائی جاتی ہے، تخفیف اور اعتدال پیدا کر دیا ہے۔" ص۴۴

یہ ایک منفی اور سلبی اثر تھا جو مسٹر بترو کے نزدیک اس کالج کی تعلیم پر مرتب ہوا تھا، اور اس منفی و سلبی اثر کے ساتھ جو ایجابی و اثباتی نتیجہ اپنے تجربوں کا مسٹر بترو کو خوشگوار محسوس ہوا تھا اسی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہوئے کہ

"جو تعلیم مشرقی کالج کے نوجوانوں کو دی گئی ہے اس کا ایک "خوش گوار نتیجہ" یہ ہے"

یہ "خوش گوار نتیجہ" کیا تھا۔ ان ہی سے سنئے فرماتے ہیں۔

"وہ (یعنی مشرقی کالج میں تعلیم پانے والے نوجوان) بڑی مستعدی سے کوشش کر رہے ہیں، تاکہ "تلاش حق" میں زیادہ آزادی سے کام کر سکیں"۔ (مرحوم دہلی کالج ص۳۴)

ظاہر ہے کہ "حق کی تلاش" کا جذبہ حق سے محرومی کے احساس کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے، پھر مسٹر بٹرو نے دلی کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس میں اور مسٹر میکالے نے جدید نظام تعلیم کے تحت تعلیم پانیوالے ہندوؤں کے متعلق جو رپورٹ کی تھی کہ ان میں کوئی

"اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا"۔

دونوں میں سوچئے کیا فرق تھا، بس روح تو ایک ہی تھی، البتہ اس روح کے پیدا کرنے کے لئے دلی کالج میں جو قالب اختیار کیا گیا تھا، وہ دوسرے مقامات کی قائم ہونے والی تعلیم گاہوں سے کچھ مختلف تھا، ۱۸۴۶ء میں دلی کالج کے متعلق ۔ ۔ کی طرف سے جو رپورٹ حکومت میں پیش ہوئی تھی، اسی رپورٹ پر ریمارک کرتے ہوئے وقت کے لفٹنٹ گورنر نے لکھا تھا کہ

"ہم ان نوجوانوں کو زیادہ تر اپنی درس گاہ (عربی کالج دہلی) کی روشن خیالی کے اثر میں لانے کے خواہش مند ہیں جو آئندہ چل کر اپنے اہل وطن کی نظروں میں اپنی قدیم عالمانہ زبانوں کے فاضل سمجھے جائیں گے"۔ (ص۱۰۳ مرحوم دہلی کالج)

اسی سے دلی کے اس عربی کالج کے بیرونی قالب کے خدوخال کو آپ پہچان سکتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ باطنی روشن خیالی کے ساتھ چاہا گیا تھا کہ مولوی اور عالم ہونے کے لئے ہندوستان کے عوام جن چیزوں کو ضروری سمجھتے ہیں ان سے بھی ان کے ظاہر کو آراستہ کیا جائے میکالی نے تو لکھا تھا کہ

"خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں۔ لیکن عربی کالج کی مشین میں جو کل پرزے ڈھالے جاتے تھے ان کے متعلق یہ طے کیا گیا تھا کہ "صورت و شکل

اور دیگر بیرونی لوازم کے حساب سے تو وہ مولوی ہوں" اور "مذاق ورائے سمجھ کے اعتبار سے آزادی کے ساتھ حق کی تلاش کرنے والی جماعت ہو"

اسی ضرورت (یعنی قدیم عالمانہ زبانوں کے فاضل اپنے اہل وطن کی نظروں میں اسی کالج سے فارغ التحصیل ہونے والے حضرات سمجھے جائیں) اسی کا اقتضا یہ ہوا کہ گو کالج ہمیشہ یوروپین لوگوں کی سخت اور کڑی نگرانی میں رہا۔ مگر ملک کی عالمانہ زبانوں کا فاضل بنانے کے لئے ان زبانوں کے جاننے والوں اور پڑھانے والوں کی طرف بھی توجہ کی گئی، جو افلاک سے گر کر خاک پر لوٹ رہے تھے، ان کی تنگ دلی اور تنگ نظری سے خطرہ بھی حکومت محسوس کرتی تھی مگر بغیر ان کے کام کے چلنے کی کوئی دوسری صورت بھی نظر نہیں آتی تھی، یہ سوچ کر جیسا کہ مسٹر بترو نے لکھا ہے

"جب موجودہ نسل کے اساتذہ رخصت ہو جائیں گے اور اُن کے جانشیں وہ ہونگے، جنہوں نے جدید طریقے پر تعلیم پائی ہے، تو روشن خیالی میں اور بھی زیادہ ترقی ہو جائے گی" (۳۴ مرحوم دہلی کالج)

غریب مولویوں کو منھ لگانے کا ارادہ کیا گیا، جہاں تک معلومات اب تک فراہم ہوئے ہیں، ان کی مدد سے میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ دلی کے اس کالج میں غالباً سب سے پہلے جس مولوی کا تقرر ہوا، وہ مولانا مملوک العلی کے استاد مولانا رشید الدین خاں صاحب مرحوم تھے، آثار الصنادید میں سرسید احمد خاں مرحوم نے مولوی رشید الدین خاں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابتدا میں حکومت کی طرف سے قضا کا عہدہ ان کے آگے پیش کیا گیا، لیکن اپنے تدریسی مشاغل کی وجہ سے آپ نے انکار فرما دیا تب:۔

لہ چاہئے تو یہی تھا کہ مولوی کے ساتھ پنڈت کے لفظ کا بھی اضافہ اس موقعہ پر کیا جاتا، کیونکہ دلی کے عربی کالج میں عربی فارسی کے ساتھ سنسکرت اور ہندی کی تعلیم کا نظم بھی کیا گیا تھا، لیکن جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت اور ہندی کی طرف جیسی توجہ اس کالج میں چاہئے تھی نہیں کی جاتی تھی، بلکہ مختلف اوقات میں سنسکرت اور ہندی کو کالج سے خارج کر دینے کی تجویزیں بھی ہوتی رہیں، خود اس کالج کے نام میں "عربی" کا لفظ جو پایا جاتا ہے یہی غمازی کر رہا ہے کہ نشانے پر کن لوگوں کو رکھا گیا تھا ۱۲

"بہ تقاضائے احیان مختلفہ حکام کی طرف سے دقوع میں آیا اور بجد رہے
بہ سبب کمال قناعت کے ایک امر جزدی پر قانع ہوکر عہدۂ مدرسی
شاہ جہاں آباد قبول فرمایا" (ص۵ ج ۳ آثار الصنادید)

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں صرف عربی و فارسی وغیرہ کی پرانی نصابی کتابوں کی تعلیم سے اس مدرسہ کی ابتدار کی گئی۔ لیکن کالج کے قیام کا جو حقیقی نصب العین تھا اس کو اس سے قریب کرنے کے لئے کافی احتیاط سے تدریجی قدم اٹھایا جاتا تھا۔

اگرچہ ان کتابوں کا اس زمانہ میں پتہ نہیں چلتا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں چاہاگیا تھا کہ عربی ہی زبانوں میں ان کتابوں کو مغربی زبانوں سے ترجمہ کرکے پڑھایا جائے، جن سے آزادی کے ساتھ تلاش حق کا جذبہ طلبہ میں پیدا ہو، افسوس ہے کہ اس مسئلہ کی طرف توجہ نہیں کی گئی، ورنہ اس قسم کی شہادتیں مل سکتی تھیں مثلاً مولوی عبدالحق[۵] صاحب نے اپنی کتاب "مرحوم دہلی کالج" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

"ایک کتاب کے عربی ترجمہ کے لئے تیس ہزار روپئے کی منظوری دی گئی"

مولوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"بہت سا روپیہ ان کتابوں کے چھاپنے پر صرف ہوتا تھا"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں مغربی علوم و فنون کی کتابوں کے تراجم نہ صرف کرائے گئے، بلکہ یہ ترجمے چھاپے بھی گئے، پھر مولوی صاحب نے اسی سلسلہ میں جو یہ خبر دی ہے کہ

"اگر ترجمہ ایسا ہوتا جو سمجھ میں نہ آتا تو اس کی تشریح کے لئے مترجم کو معقول تنخواہ پر ملازم رکھ لیا جاتا تھا" ص۱۶

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ کتابوں کو نصاب میں شریک کرکے سمجھنے اور سمجھانے کی

---

۵ مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو مصنف مرحوم دہلی کالج ۱۲ (محمد طیب غفرلہ)

کوشش بھی کی جاتی تھی،

مگر افسوس ہے کہ ان کتابوں کا یہ حشر کیوں ہوا کہ اس وقت تک کسی کتب خانہ میں بھی مجھے اس سلسلے کی کوئی کتاب باوجود تلاش کے نہ مل سکی۔ شاید اس کی وجہ وہی ہو جو مولوی عبدالحق صاحب نے لکھی ہے کہ

"ان کتابوں کی عام طور پر مانگ نہ ہوتی تھی، اسی لئے ان کا سارا بار الماریوں پر تھا۔" ص۲۱

غالباً ان ہی الماریوں سے یہ کتابیں ان کیڑوں کے پیٹ میں منتقل ہو گئیں جن کی گذر بسر کا بڑا ذریعہ یہی علمی سرمائے ہیں۔

عربی زبان کے لباس میں مانوس بنا لینے کے بعد عربی زبان کو ترک کر کے اردو زبان کا انتخاب جدید علوم و فنون کی کتابوں کے لئے کیا گیا، اردو کے ساتھ ہندی خط اور زبان کی بھی تعلیم اس مدرسہ میں طلبہ کو دی جاتی تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مجموعی حیثیت سے ہندوستان کیلئے جو مناسب ترین نصاب ہو سکتا تھا، اس کی بڑی اچھی ابتدا دلی کے اس کالج میں آج سے سوا سو برس پہلے ہو چکی تھی لیکن کاش! یہ سب کچھ علم کے لئے ہوتا، مگر سدی کا مطلب جیسا کہ معلوم ہو چکا دوسرا تھا، شاید یہی چیز اس مفید ترین نصاب کے مقبول اور مرجح ہونے میں مانع ہوئی جس پر تھوڑی بہت بحث آئندہ بھی کی جائے گی۔[ے]

ے خاکسار نے اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں وحدت نصاب کے جس نظریہ کو پیش کیا ہے، تقریباً اس کا حاصل بھی یہی ہے لیکن دلی کالج میں مولویوں کو مسٹر بنانے کے لئے یہ نصاب نافذ کیا گیا تھا اور ہم مسٹروں کو مولوی بنانے کے لئے چاہتے ہیں کہ نصاب کی دوئی کو ختم کر کے مشرقی و مغربی اسلامی و غیر اسلامی علوم کے نصاب کو متحد کر دیا جائے دلی کالج کے قیام کی جو غرض تھی اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اول سے آخر تک اس کالج کو ہمیشہ انگریزوں کی براہ راست نگرانی میں رکھا گیا، سب سے پہلے ناظم یا سپرنٹنڈنٹ اس کے مسٹر ٹیلر تھے پھر مسٹر تبردس، ان کے بعد ڈاکٹر اسپرنگر، پھر مسٹر کارگل، اسکے پرنسپل رہے۔ آخر غدر سے پہلے مسٹر ٹیلر کا تقرر پرنسپل کے عہدے پر ہوا، اور ان ہی پر کالج کا پہلا دور ختم ہو گیا، ظاہر ہے کہ مسٹروں کی نگرانی میں کسی قسم کی درسگاہ بھی چلائی جائے، نکلنے والے اس سے مسٹر ہی بن بن کر نکلیں گے۔ اس سے غیر معمولی فرق نتائج میں پیدا ہو جاتا ہے ۱۲

خیر یہ قصہ تو طویل ہے کہنا یہ ہے کہ "اپنے اہل وطن کی نظروں میں قدیم عالمانہ زبانوں کے فاضل سمجھے جائیں" اس مقصد کی تکمیل کے لئے مولویوں کا اور ذیلی طور پر اس کالج میں چند پنڈتوں کا تقرر بھی عمل میں آیا۔

مولویوں کے سلسلے میں صدارت کی خدمت جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، مولانا رشید الدین کے سامنے پیش کی گئی، اور اصرار بلیغ کے بعد مولانا نے اس خدمت کو قبول فرمایا۔ ۱۷۹۲ء جو مولوی عبدالحق صاحب کی تحقیق کی رو سے اس کالج کے قیام کا سن ہے، اس وقت مولانا مملوک العلی صاحب کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی، اس لئے یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ دلی پہنچ کر مولانا رشید الدین خاں کے حلقہ درس میں مولانا مملوک العلی اسی زمانہ میں شریک ہوئے، جب دلی کالج میں مع الفار رشید الدین خاں کام کر رہے تھے۔ سر سید احمد خاں نے مولانا رشید الدین کے ذکر میں لکھا ہے کہ

"از بسکہ اپنے اوقات کو بیشتر تربیت مستفیضان کمال میں مصروف رکھتے تھے" ص۵۱

کچھ اس سے بھی، اور اس زمانہ کا جو عام دستور تھا اس کی بنیاد پر بھی یہ سمجھنا چاہیئے کہ علاوہ کالج کے اوقات کے یقیناً مولانا رشید الدین خاں خانگی طور پر بھی لوگوں کو پڑھایا کرتے تھے، اسی لئے یقینی طور پر تو یہ کہنا مشکل ہے کہ مولانا رشید الدین صاحب سے مولانا مملوک العلی نے جو تعلیم حاصل کی اس کی نوعیت کیا تھی۔ کالج میں باضابطہ شریک ہو کر مولانا سے مستفید ہوئے تھے یا گھر پر پڑھتے تھے، جہاں تک قرائن و قیاس کا اقتضاء ہے میرا خیال یہی ہے کہ مولانا مملوک العلی کالج میں بھی شریک تھے اور خارج اوقات میں بھی پڑھا کرتے تھے۔ سید صاحب نے مولانا مملوک العلی کو شاگرد رشید مولانا رشید الدین خاں جو قرار دیا ہے، اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، نیز جس معاشی انقلاب کے شکار مسلمان اس زمانہ میں ہو گئے تھے، اس کا اقتضاء بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ دلی کالج کے تعلیمی وظائف سے مستفید ہونے کے مواقع جن لوگوں کو حاصل تھے وہ اس غنیمت باردہ سے کیوں نہ فائدہ حاصل کرتے۔

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ مولانا مملوک العلی کو ایام طلب علم میں بھی نئے رنگ ڈھنگ اور

نئے قوانین و قواعد والی اس درسگاہ کے تجربہ کا موقعہ بھی میسر آیا اور بعد کو جیسا کہ سرسید احمد خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، مولانا مرحوم اس کالج کے تدریسی اسٹاف میں شریک ہو گئے۔

سید صاحب کے الفاظ مولانا مملوک العلی کے متعلق یہ ہیں کہ

"اگرچہ چودہ پندرہ برس سے مدرسہ شاہ جہان آباد میں عہدہ مدرسی رکھتے تھے۔ لیکن اب کئی سال سے سرگروہ مدرسین ہیں، کہ مدرسی اول اس سے عبارت ہے" ص۵

جس کا مطلب یہی ہوا کہ شروع میں مولانا مملوک العلی کا تقرر صدر مدرسی پر نہیں ہوا، بلکہ ہیڈ مولوی کی ماتحتی میں مددگاروں کی حیثیت سے اس کالج میں چند مولوی جو کام کرتے تھے[1]. ان ہی مددگاروں میں ایک مددگار مولوی مدرس کی حیثیت کالج میں آپ کی تھی، لیکن چودہ پندرہ برس بعد اپنی خاص امتیازی قابلیت اور شاید اس لئے بھی کہ مولانا رشید الدین خاں کے رشید شاگرد شہر دہلی میں وہی سمجھے جاتے تھے، مولانا رشید الدین کی وفات کے بعد آپ ہی کا انتخاب صدارت کی اس جلیل خدمت کے لئے ہوا۔

جیسا کہ میں نے حاشیہ میں لکھا ہے قطعی طور پر یہ کہنا تو دشوار ہے کہ ابتدائی تقرر مولٰنا مملوک العلی صاحب کا کالج میں جب ہوا تو اس وقت آپ کی تنخواہ کیا تھی، لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ پچاس پچاس روپئے کی دو اسامیوں میں سے کسی ایک اسامی پر آپ کا تقرر ہوا تھا تو گو اس زمانہ کے لحاظ سے اس تنخواہ کی ظاہر ہے کہ کوئی اہمیت نہیں ہے، اب جبکہ کالج

---

[1] مولوی عبدالحق صاحب نے "مرحوم دہلی کالج" میں لکھا ہے کہ ہیڈ مولوی جس کی تنخواہ ایک سو بیس روپیہ ماہوار تھی، ان کے سوا دتی کالج میں پچاس پچاس روپے کے دو مولویوں کے سوا پچیس پچیس، تیس تیس روپے ماہوار پانے والے اور بھی چند مولوی تھے، یقینی طور پر تو اس کا پتہ نہ چلا کہ مولانا مملوک العلی کا تقرر مددگار مدرسی پر جب ہوا تھا تو اس وقت ان کی تنخواہ کیا تھی مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ابتدائی تقرر غالباً پچاس روپیہ ماہوار والی جگہ پر ہوا ہوگا، اسی لئے صدارت کے عہدے پر ترقی میں آسانی ہوئی کہ مقابلہ میں صرف ایک ہی آدمی تھا ۱۲

کے چپراسیوں کی بھی عام تنخواہ پچاس ہی کردی گئی ہے تو پچاس روپے پانے والے مدرس غریب کو
کون پوچھتا ہے، لیکن اجڑی دلی کے جس زمانے کا یہ قصہ ہے۔ اس زمانہ میں یہ مقدار بہت تھی۔
بقول مولوی عبدالحق صاحب دلی کالج کے طلبہ پر جب تعلیمی فیس حکومت کی طرف سے عائد
کی گئی اور حکم دیا گیا کہ

"۳۵ روپئے ماہوار سے زیادہ جن طلبہ کے والدین کی آمدنی ہو ان سے یہ
فیس وصول کی جائے، تو اس اصول کے عمل درآمد سے معلوم ہوا کہ شاید ہی
کوئی شخص ایسا ہوگا جس کی آمدنی ۳۵ روپئے ماہوار سے زیادہ ہو"

مولوی صاحب نے پرانے وثائق سے اسی کے بعد یہ شہادت نقل کی ہے کہ

"جملہ تعداد طلبہ کی ۳۴۴ تھی اس میں صرف ۱۶ طالب العلم ایسے
تھے جو فیس ادا کرتے تھے"

آخر میں خود بھی لکھتے ہیں کہ

"اس سے اہل دہلی کی خوش حالی کا اندازہ ہوسکتا ہے" (مرحوم دہلی کالج ص۱۰۱)

ہندوستان کی راجدھانی کے رہنے والوں کی اس عجیب و غریب معاشی پستی کے زمانے میں
ظاہر ہے کہ پچاس روپے ماہوار کی تنخواہ ہی نے جیسا کہ ظاہر ہے "مولانا مملوک العلی کو ممتاز کردیا
ہوگا" پھر مددگاری سے ترقی کر کے مولانا مرحوم بقول سرسید احمد خاں "سرگروہ مدرسین کہ مدرسی
اول اس سے عبارت ہے" کی غیر معمولی خدمت پر جب فائز ہوئے ہوں گے، تو خود ہی
سوچنا چاہئے کہ مالی اعتبار سے اسی دلی میں وہ کیا کچھ نہ سمجھے جاتے ہوں گے، جہاں
۳۵ روپئے ماہوار سے زیادہ آمدنی رکھنے والوں کا حال آپ پڑھ چکے، اور جب پایۂ تخت
کے باشندوں کا یہ حال تھا، تو نانوتہ جیسے قصبوں کے رہنے والوں کی زبوں حالیوں کا اسی
سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، طالب العلم کی شکل میں جو دلی آیا تھا، اور اسی شہر میں جو
لٹ لٹانے کے بعد بھی اس وقت تک نام نہاد ہی سہی مگر تخت شاہی کا مستقر تھا،

اسی شاہی مستقر کی سب سے بڑی سرکاری تعلیم گاہ میں سرگردہ مدرسین ہوجانا، اور ماہوار آمدنی کی جس تعداد کا تصور بھی اس شہر کے رہنے والوں کے لئے دشوار تھا، اسی ماہوار کے حاصل کرنے میں اسی طالب العلم کا کامیاب ہوجانا دلّی کے لئے نہ سہی مگر نانوتہ کیلئے ایک بڑے اہم تاریخی واقعہ کی حیثیت اگر اس نے حاصل کرلی ہو تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے کچھ بھی ہو، مولانا مملوک العلی صاحب کی مالی برتری خواہ اس زمانہ کے اعتبار سے کتنی ہی ناقابل لحاظ ہو۔ لیکن جس عہد کا یہ واقعہ ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ نانوتہ کی عام آبادی اس برتری سے متاثر ہوئی تو میرے اس خیال کو بے بنیاد ٹھیرانے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہوسکتی۔

صرف تنخواہ ہی نہیں بلکہ مولوی عبدالحق صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس کالج میں امتحان کا جدید طریقہ بھی نافذ ہوچکا تھا، یعنی ممتحنوں سے پرچے بنوائے جاتے تھے، مثلاً ایک موقع پر مولوی صاحب نے لکھا ہے،

"ریاضیات اور تاریخ کے پرچے گورنمنٹ نے مرتب کراکر بھیجے، باقی پرچے کالج کے مدرسین نے تیار کئے" ص۴۵

قطع نظر اس سے کہ "کالج کے مدرسین" میں کوئی وجہ نہیں کہ مولانا مملوک العلی ہی نہ ہونگے مولوی عبدالحق نے اسی موقعہ پر تصریح بھی کی ہے۔

"باقی جماعتوں کے امتحان مولوی مملوک علی نے اور انگریزی کا قائم مقام پرنسپل نے لیا" ص۱۵

جس کا مطلب یہی ہوا کہ امتحان کے معاملہ میں قائم مقام پرنسپل اور مولانا مملوک علی کی حیثیت اس کالج میں گویا مساوی سمجھی جاتی تھی۔

اگرچہ صراحۃً اس کا پتہ تو نہ چلا کہ دلی کالج میں امتحانی کاروبار کا یہ سلسلہ موجودہ یونیورسٹیوں کی طرح کاروباری طریقہ پر جاری تھا۔

لیکن اپنے سارے اصول وضوابط میں دلی کا یہ کالج جب کالج ہی تھا تو "امتحان" کے میدان میں بھی کالج کی اس تجارتی خصوصیت سے کیوں سمجھا جائے کہ اس کو محروم رکھا گیا ہوگا

اسی کے ساتھ اس کو بھی سوچئے، کہ ان ہی دنوں میں یعنی جب دہلی کا یہ کالج ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ "دہلی ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی یا انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی" کی بنیاد بھی پڑ چکی تھی جس میں علاوہ اراکین کے شاہ اودھ اور ان کے شاہی خانوادے کے امراء کی مالی امدادیں بھی شریک تھیں، حیدرآباد کے امیر کبیر شمس الامراء، نیز سر سالار جنگ، راجہ ام بخش وغیرہ کے بھی اس سلسلہ میں چندے وصول کئے گئے تھے اور معقول معاوضہ لیکر انگریزی، عربی، سنسکرت وغیرہ علمی زبانوں سے کتابیں ترجمہ کرائی جاتی تھیں۔

اور گو سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں مولانا مملوک العلی کے متعلق لکھا ہے، کہ

"انشاء نظم ونثر کی طرف کم توجہ ہے اگر ایسا فاضل اس طرف متوجہ ہوتا، تو یقین ہے کہ اس فن میں اقران و امثال سے ممتاز ہوتا" صنہ

لیکن باوجود کم توجہی کے مولانا مملوک العلی کے ایک معاصر بزرگ مولوی کریم الدین اپنی کتاب طبقات الشعراء میں یہ اطلاع دیتے ہیں کہ مولانا مملوک العلی نے

"تحریر اقلیدس کا ترجمہ اردو میں چار مقالہ اول کا اور دو مقالوں آخر گیارھویں اور بارھویں کا کیا ہے" (ص۱۴۹ مرحوم دہلی کالج)

یعنی اقلیدس کے چھ مقالوں کا ترجمہ مولانا مرحوم نے اردو میں کیا تھا، نیز مولوی عبدالحق صاحب اسی کے اوپر اس پر مزید اضافہ یہ کرتے ہیں کہ

"مولوی صاحب (مولانا مملوک العلی) نے سنن ترمذی کا ترجمہ بھی اردو

لہ مرحوم دہلی کالج سے یہ معلومات ماخوذ ہیں، مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ ترجموں کے مسودے بہ شرح ۶ رتا ایک روپیہ فی صفحہ ابتدا میں خریدے جاتے تھے، بعد کو طے ہوا کہ ادبی و تاریخی کتابوں کے لئے فی صفحہ ۶ر اور سائنس وفلسفہ کے لئے فی صفحہ ۱۰ر شرح مقرر کی جائے، دیکھو کتاب مذکور ص۱۲

میں کیا تھا۔" ص۱۴۹

بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست تصنیف و تالیف کا خاص ذوق مولٰنا مملوک العلی نہیں رکھتے تھے، لیکن مذکورہ بالا انجمن ہی کے حکم اور تقاضے سے ترجمہ کے یہ دونوں کام مولانا نے انجام دیئے۔ افسوس ہے کہ آج یہ دونوں کتابیں ناپید ہیں، ان کی صحیح ضخامت کا پتہ نہ چل سکا۔ لیکن اتنی بات تو بہر حال ماننی ہی چاہئے کہ آمدنی کا ایک ذریعہ ترجمہ کا یہ کام بھی ہوگا۔

مولانا مملوک العلی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نے سوانح قدیم میں لکھا ہے کہ

"بعد انتقال والد مرحوم کے احقر اپنے مکان مملوک میں جو کہ کوچہ چیلان میں تھا جارہا" ص۲۹

آگے کی عبارت سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ مکان معمولی نہ تھا، بلکہ اس میں بالاخانہ بھی تھا۔ خود یہ بھی مولانا مملوک العلی کی مالی رفاہیت و وسعت کی دلیل ہے اور نانوتہ جیسی آبادی کو زیر اثر لانے کے لئے قدرت کا یہی انعام اور اس کی طرف سے بخشا ہوا یہ امتیاز کافی تھا، مگر بات اسی حد پر ختم کب ہوتی ہے، بعد والوں نے نہیں، بلکہ مولانا مملوک العلی کے زمانہ کے مصنفوں کی کتابوں میں ہمیں جب اس قسم کی شہادتیں ملتی ہیں، مثلاً مولوی کریم الدین صاحب یہ لکھتے ہوئے کہ

"عمر ان کی (یعنی مولانا مملوک العلی کی) ۱۸۴۷ء میں" ساٹھ برس کی ہوگی" (مرحوم دہلی کالج) ص۱۴۹

آگے مولانا کی خصوصیتوں کو گنواتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ

"بہت خندہ پیشانی، اور عقل مند و ذکی و ذہین اور تیز فہم اور محقق و مدقق ہیں"

ان اجمالی صفات کے ساتھ وہی بیان کرتے ہیں کہ

"فارسی اور اردو، اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں، ہر ایک علم و فن میں جو ان زبانوں میں ہے مہارت تامہ ان کو حاصل ہے"

اور آخر مولانا کے ان ہی معاصر مصنف کی شہادت یہ ہے کہ

"ایسے فاضل بے بدل بہت کم ہوتے ہیں، اور واقع میں بنائے مدرسہ عربی (دہلی عربی کالج) ان کی ذات سے مستحکم ہے"

ان ہی کے الفاظ یہ بھی ہیں کہ

"مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کبھی کسی زمانہ میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو"

"المعاصرۃ اصل المنافرۃ" عربی کی مشہور ضرب المثل ہے، "سخن گستران پیشین" میں "محویت" دنیا کا پرانا قاعدہ ہے۔ "درزمانہ تست" "بے قدری کا ہمیشہ بڑا اہم سبب اہل کمال کے لئے ثابت ہوا ہے، مگر آپ دیکھ رہے ہیں، ہندوستان کے دارالسلطنت میں بیٹھ کر ہندوستان کے ایک زندہ عالم کے متعلق اس کا ایک ہم عصر مصنف جب اپنے احساسات کو مذکورۂ بالا الفاظ میں ظاہر کر رہا ہوگا، تو اس کے علمی و نظری امتیازات کے متعلق خود اس کے مولد و موطن یعنی نانوتہ پر اس کا کیا ردعمل ہونا ہوگا۔

میں نے جو یہ دعویٰ کیا تھا کہ نانوتہ کی آبادی کو ایک ولی اللہی دماغ کے نیچے اس زمانے میں قدرت کا ہاتھ لے آیا تھا، اس کا یہی مطلب تھا۔

واقعہ یہ ہے جیسا کہ مولانا مملوک العلی کے دوسرے دیکھنے والے یعنی سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں یہ گواہی دی ہے کہ

"سیرت و سریرت میں "درویشانہ" تھے"

مگر بجائے سیرت و سریرت کے صورت یعنی مولانا کی ظاہری وضع و طریقہ سید صاحب ہی کا بیان ہے کہ وہ

"نری دنیاداروں کی ہے"

ممکن ہے کہ سید صاحب کے ان الفاظ سے مولانا مملوک العلی کے عقیدت مندوں کے قلوب کو کچھ اذیت محسوس ہوئی ہو۔ مگر میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہے، "سریرت

وسیرت" کو محفوظ کر لینے کے بعد شرعی حدود کی پابندی کرتے ہوئے اگر کسی خاص پیشہ کے پیشہ وروں کی ظاہری شکل وصورت کی پابندی کو اپنے لئے کوئی ضروری نہیں قرار دیتا تو پیشہ ورانہ اعتراض تو اس پر ہو سکتا ہے، مگر دین کی طرف سے خلاف ورزی کا الزام قائم کرنے والے شاید دین کے خود مجرم بن جاتے ہیں۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مولویوں کی ٹیپ ٹاپ، اور جبہ و دستار کے طمطراق سے مولانا کو فطرۃً مناسبت نہ تھی۔ ان کے دوسرے معاصر مولوی عبد الکریم صاحب نے اپنی ایک اور کتاب جس کا نام "فرائد الدہر" ہے، اور عربی زبان کے شعراء کا یہ ایک مبسوط تذکرہ ہے، اس میں بھی مولانا مملوک العلی کا تذکرہ کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ

"باوجود کثرت علم وفضل کبھی وعظ عام نہیں کیا"

اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کہ دوسروں پر مولویت اور پیشوائیت کا اثر قائم ہو، کچھ اس قسم کی چیزوں سے مولانا کنارہ تھے۔

سچ پوچھئے تو مولانا مملوک العلی کو بجائے دل کے "ولی اللٰہی دماغ" قرار دینے کی بڑی وجہ یہی ہوئی، ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن خصوصیات اور نشانیوں کو دیکھ کر ماننے والے آدمی کو روحانیت و باطنی راہوں کا سالک و مرشد مان لیتے ہیں۔ بظاہر ان چیزوں سے مولٰنا مملوک العلی صاحب اپنے آپ کو خالی رکھنے کی کوشش کرتے تھے، اسی لئے بجائے تقدس و تشیخ کے ان کے علم و تحقیق، فکر و نظر کی گہرائیوں سے لوگ زیادہ متاثر نظر آتے ہیں، دنیا ان کو اسلامی علوم کا متبحر فاضل اور وقت کا یگانہ عالم سمجھتی تھی۔

اردو زبان جس کے متعلق مہارت تامہ کا دعویٰ ان کے معاصر مولوی عبد الکریم صاحب نے بھی کیا ہے، یہ بھی آپ پڑھ چکے کہ عربی کالج میں اردو زبان کا امتحان بھی مولٰنا ممدوح لیا کرتے تھے، اگرچہ علماء دین کے عام مذاق کے مقابلہ میں ہم اردو زبان کے ساتھ مولانا کی اس دلچسپی کو بھی ان کی خصوصیت قرار دے سکتے ہیں، لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب بات وہ ہے جس کا اظہار مولوی عبد الکریم

صاحب ہی نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اُسکے اصل اصول سے بہت جلد اُن کا ذہن چسپاں ہوجاتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے" (ص۱۴۵ مرحوم دہلی کالج)

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یورپ کے جدید علوم وفنون کے سمجھنے اور اُنکی تہ تک پہنچنے کا مولانا کو صرف شوق ہی نہیں تھا، بلکہ اپنے اس شوق کو جہانتک اُن کے امکان میں تھا اس کو پورا بھی کیا تھا، وہی شوق جس کا ذوق افسوس ہے کہ دینی مدارس کے علماء میں ابتک پیدا نہیں ہوا ہے، اور اس سے مولانا مرحوم کی جبلت اور فکر وخیال کی آزادی، انصاف پسندی کا اندازہ ہوتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جدید علوم وفنون سے دلچسپی میں عربی کالج کے ماحول کو ضرور دخل تھا، لیکن اس ماحول کے مفید پہلوؤں سے استفادہ کرنے میں جیساکہ آپ دیکھ رہے ہیں، نہ وقت کا تقلیدی رواج مانع ہوا، اور نہ علم کا زعم بے جا اس راہ میں رکاوٹ بنا، مولانا مملوک العلی کے اس خصوصی رجحان میں چونکہ مجھے ان تبدیلیوں کی جھلک نظر آتی ہے، جو دینی علوم کے تدریسی نظام میں بعد کو رونما ہوئیں، اسی لئے مولانا کی اس مذاقی خصوصیت کا میں نے ذکر بھی کیا ہے،

ورنہ ذکر تو نانوتہ کا اور ان امور کا ہو رہا تھا، جن سے تیرہویں صدی ہجری کے ابتدائی سالوں میں ضلع سہارنپور کا یہ قصبہ قدرتاً اثر پذیر ہو رہا تھا، ایک طرف مثیل سید شہید حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کی شکل میں ولی اللہی قلب وضمیر کی روشنی وحرارت اس قصبہ کو گرما رہی تھی اور دوسری طرف مولانا مملوک العلی نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ولی اللہی دماغ تھا، جس کی علمی وعقلی عالی وجاہی سربلندیاں ٹوٹی، اور چھوٹی ہوئی ہمتوں کے لئے نہوض وقیام کا پیغام بنتی چلی جارہی تھیں، محکومیت وادبار کے اس تاریک عہد میں مولانا مرحوم کا وجود عزت وراحت کی زندگی کے امکان قصبہ کے افسردہ خاطر، پژمردہ دل باشندوں کے آگے پیش کر رہا تھا، دہلی سے تھوڑے

تھوڑے دنوں کے وقفہ سے اپنے ایک ہم وطن کی کدوکاوش جدوجہد کے نتائج و ثمرات
دن دونی ترقیوں اور غیر معمولی عزت افزائیوں کی خبروں کی شکل میں ان کی ڈھارس بندھا رہا تھا
زمانہ تیزی کے ساتھ ان ہی حالات میں آگے کی طرف بڑھ رہا تھا، مولانا مملوک العلی اپنی عمر
کے چھیالیسویں سال میں قدم رکھ چکے تھے، اور حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی ناسوتی
زندگی کے حساب سے پچیسویں منزل میں داخل ہو چکے تھے، یہ حال تو نانوتہ اور نانوتہ کے
باشندوں اور ان بزرگوں کا تھا، جن سے میرے نزدیک اس قصبہ میں "نئے نیوتہ" یا "جدید پیغام"
کی بنیاد قائم ہو رہی تھی،

اور نانوتہ سے باہر ہندوستان کے عام مسلمان اس "فاجعہ کبریٰ" کے شکار ہو کر تڑپ رہے
تھے، جو سرزمین ہند کے اسلامیوں کے سئے گویا "کربلائی حوادث" کا اعادہ تھا، جس گھرانے
کے پاک خون سے کربلا کی قربان گاہ سیراب ہوئی تھی، اسی گھرانے کے ایک فرزند سعید
یعنی حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ دودمان ولی اللہی کے چشم وچراغ مولانا اسمٰعیل شہید
اور دوسرے عاشقان پاک طینت کے ساتھ بالاکوٹ کے دامن کو لالہ زار بنا کر خود تو حیات جاوید
کے آشیانوں میں اپنا مسکن بنا چکے تھے، لیکن مسلمانان ہند امید کے اس بھڑکتے ہوئے چراغ
کے اچانک گل ہو جانے کے ساتھ ہی اپنی قومی زندگی کو موت کے تیرہ و تار گڑھے کے سامنے
کھڑی ہوئی پا رہے تھے۔ ان کی سیاسی جدوجہد اسی پہاڑی درے میں اپنی آخری سانس
بظاہر پوری کر چکی تھی اور کچھ ہند ہی نہیں بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے اس عہد تک تمام دنیائے
اسلام کی عام زبوں حالیوں کو دیکھ دیکھ کر صرف مسلمان ہی یاس و ہراس میں مبتلا ہو کر اپنے
ڈراؤنے مستقبل سے سہم نہیں رہے تھے، بلکہ کامل گم گشتگی یا "ضلال مبین" کا ایسا گھپ اندھیرا
عالم اسلام پر چھایا ہوا تھا کہ

"اب اسلام صرف چند سالوں کا مہمان ہے"[1]

[1] موج کوثر مشتا مولد محمد اکرام صاحب ایم۔اے ۱۲

یہ یا اسی قسم کی پیشگوئیاں، اور بد فالیاں بازاریوں کی زبانوں ہی پر نہیں بلکہ زودیم دکر دمر اور میور جیسے ڈاکٹروں، اور لارڈوں کے قلم سے نکل نکل کر کاغذی صفحات پر ثبت ہونے لگی تھیں، امنگیں خصوصاً ہندوستان کے متعلق اس حد تک بلند ہو چکی تھیں کہ انڈیا کی سپریم کونسل کے باوقار رکن سر چارلس ٹریلیوین جو اسی ملک میں حکومت کی طرف سے گورنری کے عہدے پر بھی فائز ہو چکے تھے وہ یہ امیدیں باندھنے لگے کہ

"جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے اسی طرح یہاں (ہندوستان) میں بھی سب ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں[1] گے۔"

سر چارلس ٹریلیوین نے اپنی مذکورہ بالا بد اندیشی کو درج کرتے ہوئے یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ ہندوستان کا ہر باشندہ ایک ساتھ عیسائی ہو جائے گا۔ دعویٰ کیا تھا کہ

"یہ میرا یقین ہے"

مگر یہ تدبیری مقدمات کے نتائج تھے، جن کا عقلی ناخنوں سے جال بننے والے انتظار کر رہے تھے۔ لیکن تدبیر کرنے والی عقل کا جو پیدا کرنے والا ہے، اس کی تقدیر، تدبیر کے ان گورکھ دھندوں پر ہنس رہی تھی، دیکھنے والے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کا خواب دیکھ رہے تھے مگر جس کے قاہر ارادوں کے ساتھ ہر آرزو کی تکمیل وابستہ ہے وہ اپنی قیومی زندہ قوتوں کے ساتھ جاگ رہا تھا، لاہوتی تقدیر کے آگے ناسوتی تدبیروں کی رسوائیوں کا یہ بڑا دلچسپ تماشا تھا۔

مسلمانان ہند کے دین کی وہی روشنی جسے بالاکوٹ اوٹ میں دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ ۱۲۴۶ھ ہجری میں غائب ہو گئی،

ابھی غیبوبیت کے اس حادثہ پر پورے دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ ۱۲۴۸ھ ہجری میں اسی دین کا

"آفتاب تازہ"

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۱۴۳

اسی ہندوستان کے قصبہ نانوتہ کے نخلستانی افق سے پایا گیا کہ طلوع ہو رہا ہے، الہامی سنوح کے سوا سے اور کیا سمجھا جائے کہ ۱۲۴۸ھ کے اعداد کو ابجد کے حروف پر منطبق کرنے کا ارادہ جب کیا گیا تو اس کا مجموعہ بھی

"خورشید حسین"

ہی نکلا، حسین کے گھر کی روشنی کو دین کا یہ آفتاب اس ملک میں واپس لائے گا، قدرت کی طرف سے الہام کئے ہوئے اس نام میں کون کہہ سکتا ہے اس کا اشارہ مخفی نہ تھا۔

یہ حضرت قاسم العلوم والخیرات سیدنا الامام الکبیر الاجل مولانا **محمد قاسم** النانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز کی ذات بابرکات تھی، جن کی خدمات و مساعی سے آگاہی حاصل کئے بغیر انیسویں صدی اور اس کے بعد کی صدیوں کا مورخ مسلمانان ہند کی دینی زندگی کے کسی پہلو کا بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ تصور بھی نہیں کر سکتا، آپ کے سامنے اسی تاریخی حقیقت کی آگاہی کا سامان ضروری تمہید کے بعد پیش کیا جاتا ہے۔ واللہ ولی الامر والتوفیق

آغازِ سوانح

نسب نامہ

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا نسبی سلسلہ شاہجہانی عہد کے عالم مولوی محمد ہاشم صاحب پر منتہی ہوتا ہے جو جاگیر پاکر نانوتہ میں آباد ہوئے، صدیقی شیوخ اس قصبہ کے عموماً ان ہی مولوی ہاشم کی اولاد میں ہیں، سوانح قدیم کے مصنف امام نے مولانا مرحوم کے شجرہ نسب کو درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔

محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن علاء الدین بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبد السمیع، بن مولوی محمد ہاشم " ص ۲۵

جس کا مطلب یہ ہوا کہ درمیانی سات واسطوں سے مولانا مرحوم کا نسب مولوی محمد ہاشم سے جاکر مل جاتا ہے، یہ تو گذر چکا کہ مولوی ہاشم صاحب کی جاگیریں چند دیہات تھے، لیکن حکومتوں کے انقلاب سے جیسا کہ مصنف امام نے لکھا تھا،

مولوی محمد ہاشم صاحب کی پچھلی نسلوں کی معاشی حیثیت بگڑ گئی، اسی کے ساتھ یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ جاگیر خواہ جتنی بڑی بھی ہو، لیکن مسلمانوں میں وراثت کا جو عام قانون ہے، اس کی وجہ سے تقسیم ہو ہو کر جاگیریں اور جائدادیں عموماً اپنی بڑائی کو قدرتاً کھوتی رہتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو حکومتوں کے انقلاب کا بھی اثر ہوا اور کچھ قانون وراثت کے تحت مولوی محمد ہاشم کی اولاد کی وہ حالت باقی نہ رہی، جو ابتدا میں تھی، ظاہر ہے کہ اس حادثے کے شکار جیسے دوسرے خاندان ہوئے اسی طرح مولانا محمد قاسم جس خاندان میں پیدا ہوئے تھے، اس خاندان کا بھی حصہ رسدی کے مطابق متاثر ہونا ناگزیر تھا۔

مگر اسی کے ساتھ مصنف امام ہی نے ایک خبر دی ہے جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ تقریباً چار پشتوں سے مولانا محمد قاسم کے خاندان میں اتفاقاً مسلسل یہ عجیب صورت

پیش آتی رہی کہ جائداد پر تقسیم کا عمل نہ ہوسکا یا ہوا تو بہت کم ہوا، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب (یعنی خود مولانا محمد قاسم) کے کوئی بھائی نہ تھا، ایک
بہن دیوبند میں اب زندہ موجود ہیں، اور ان کے (یعنی مولانا محمد قاسم
کے) والد اور دادا صاحب کے بھی کوئی بھائی نہ تھا" ص۲۶

بھائی نہ تھا، اس کا مطلب آگے وہی یہ بیان کرتے ہیں کہ

"بھائی پیدا ہوئے، مگر لڑکپن میں مر گئے"

مراد ان کی جیساکہ آگے کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ خود مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے چند بھائی پیدا ہوئے، مگر بچپن ہی میں سب کا انتقال ہوگیا، افسوس ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ان بھائیوں کے نام کا پتہ نہ چلا، اسی طرح مولانا کے والد صاحب اور دادا صاحب کے متعلق بھی بھائی کے نہ ہونے کا دعویٰ مصنف امام نے جو کیا ہے اس کا مطلب خود ہی یہ بیان کرتے ہیں کہ مولانا محمد قاسم

"کے چچا جوانی میں مر گئے اور دادا کے بھائی تھے وہ کسی لڑائی میں
جوان عمر شہید ہوئے" ص۲۶

حاصل یہی ہوا کہ مولانا مرحوم کے والد صاحب اور دادا صاحب کے بھی اگرچہ بھائی تھے، لیکن جائداد کے وارث اور مالک ہونے سے بیشتر وفات پا گئے، مذکورہ بالا بیان میں مصنف امام نے مولٰنا کے جد امجد کے بھائی کے متعلق جو یہ اطلاع دی ہے کہ کسی لڑائی میں جوان عمر شہید ہوئے"، افسوس ہے کہ نہ اُن کے نام ہی کا پتہ چل سکا اور نہ یہ معلوم ہوسکا کہ جس جنگ میں شریک ہوکر وہ شہید ہوئے یہ جنگ کہاں کس کے مقابلہ میں ہوئی تھی، شہید کا لفظ جو ایک ذمہ دار عالم کے قلم سے نکلا ہے، بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ شاید مسلمانوں سے یہ مقابلہ نہ تھا، نیز اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سرفروشی اور جاں بازی غالباً اس خاندان کی کچھ موروثی خصوصیت تھی،

عہ ۱۳۱۱ھ میں

کچھ بھی ہو یہاں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ تین پشتوں تک تو یوں اس خاندان کی موروثی جائداد تقسیم ہونے سے بچی رہی۔ آگے چوتھی پشت یعنی مولٰنا محمد قاسم کے پردادا جن کا اسم گرامی محمد بخش تھا، پہلے بھی ان کے بھائی شیخ خواجہ بخش کا ذکر "نانوتہ کے اجمالی تبصرہ" کے سلسلے میں آچکا ہے، بتایا گیا تھا کہ شیخ خواجہ بخش نانوتہ سے منتقل ہو کر دکن چلے گئے، اور دہیں بودوباش اختیار کر کے دکنی ہی ہو گئے تھے۔

بہرحال ان ہی شیخ محمد بخش اور شیخ خواجہ بخش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اور اوپر جو بھائی تھے ان کی اولاد پسری یہاں کوئی نہیں رہی، دکن میں ان کی اولاد ہوئی"۔ ص۲۶

مقصد ان کا شیخ خواجہ بخش سے ہے" جو دکن چلے گئے تھے، آگے اسی کے بعد ارقام فرماتے ہیں کہ

"بقاعدہ معروف وہ بھی (یعنی مولانا کے پردادا شیخ محمد بخش) گویا ایک ہی تھے"۔ ص۲۶

بقاعدہ معروف کے الفاظ کا مطلب غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ دکن جیسے دور دراز علاقے میں چلے جانیکی وجہ سے اپنی موروثی جائداد سے استفادہ کا موقعہ شیخ خواجہ بخش کو نہ مل سکا، اور شیخ محمد بخش اور ان کے صاحبزادے شیخ غلام شاہ ہی کے قبضے میں ان کے ترکے کی بھی جائداد رہی۔ بلکہ مصنف امام نے شیخ خواجہ بخش کے متعلق جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"ان کی (یعنی شیخ خواجہ بخش کی) پسری اولاد یہاں کوئی نہیں رہی"۔ ص۲۶

اس فقرے میں "پسری" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ خواجہ بخش کی دختری اولاد موجود تھی، ورنہ اس قید کے اضافہ کی ضرورت ہی کیا تھی، علاوہ اس کے مصنف امام نے اس سے پیشتر بھی ایک موقعہ پر اسی کتاب میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ انکے

والد یعنی مولانا ملوک العلی اور دیوبند کے رئیس شیخ کرامت حسین دیوبندی ان دونوں حضرات کے نانا بھی شیخ خواجہ بخش تھے، جس کا مطلب یہی ہوا کہ شیخ خواجہ بخش کی دختری اولاد نانوتہ اور دیوبند میں باقی رہ گئی تھی، واللہ اعلم بالصواب مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف امام نے جو یہ لکھا ہے کہ "بقاعدہ معروف مولٰنا محمد قاسم کے پردادا شیخ محمد بخش گویا ایک ہی تھے" اس سے شاید انھوں نے ادھر اشارہ کیا ہے کہ گو شیخ محمد بخش کے بھائی خواجہ بخش کی دختری اولاد دکن میں نہیں بلکہ نانوتہ اور نانوتہ کے قرب وجوار میں موجود تھی لیکن اس پر بھی ان کی حیثیت ایک ہی وارث کی باقی رہی، اور عہد انحطاط میں اس ملک کے مقامی باشندوں کے عام رجحانات سے متاثر ہو کر لڑکیوں کو باپ کی جائداد سے محروم کر دینے کا عمومی رواج خود مسلمانوں میں بھی جو پھیل گیا تھا، شاید "قاعدہ معروف" سے ان کا اشارہ اسی طرف ہو[۱]۔

صاف لفظوں میں اس لئے نہ لکھا کہ شیخ خواجہ بخش کی دختری اولاد میں مولانا محمد یعقوب خود بھی شریک تھے، آئندہ اس کا ذکر جو آئے گا کہ اپنی موروثی جائداد کی تقسیم کے سلسلے میں مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے نظر ثانی فرمائی اور تلاش کر کر کے حقداروں تک اُن کے جائز شرعی حقوق کے پہنچانے کی کوشش فرمائی۔ غالباً اسی قسم کی مروجہ بے احتیاطیوں کی بنیاد پر آپ نے اس طرز عمل کو اختیار کیا تھا۔

بہر حال اسباب خواہ کچھ ہوں، لیکن مصنف امام نے جیسا کہ لکھا ہے۔

"غرضکہ چار پشت تک مولٰنا منفرد تھے"۔

---

[۱] قصص الاکابر حضرت سیدنا المرشد التھانوی کے بعض ملفوظات کے ایک مجموعہ کا نام ہے، اس میں ایک ملفوظ یہ بھی ہے یعنی مولانا تھانوی نے فرمایا۔ "مولٰنا محمد قاسم فرمایا کرتے تھے کہ جلال آباد کی جائداد خریدنا جائز نہیں کیونکہ وہاں لڑکیوں کا حق نہیں دیا جاتا" (قصص از الہادی جمادی الاولی ۵۳ھ)
جلال آباد تھانہ بھون کے قریب ایک مشہور قصبہ کا نام ہے۔ اس سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ دختری حصہ کے اسقاط کا رواج جیسے ملک کے دوسرے علاقوں میں ہو گیا تھا، اسی طرح تھانہ نانوتہ وغیرہ کے قرب وجوار میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگ عادی تھے ۱۲

اتفاقاً اس خاندان میں جس میں مولانا محمد قاسم پیدا ہوئے تھے، یہی صورت پیش آئی، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہئے کہ تقریباً ایک صدی تک اس خاندان کی موروثی جائداد بدستور بغیر کسی تقسیم کے ایک سے ایک تک منتقل ہوتی ہوئی پہنچتی رہی،

اس کا اندازہ تو مشکل ہے کہ بجائے خود اس موروثی جائداد کی قدر و قیمت کیا تھی[1]، لیکن اتنی بات تو بہرحال تسلیم ہی کرنی پڑے گی کہ اس ایک صدی میں شیوخ نانوتہ کے دوسرے خاندانوں کی ایسی جائدادوں کے مقابلہ میں جن میں تقسیم و تجزیہ کا عمل قانون وراثت کے تحت جاری رہا ہوگا، مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کی اس موروثی جائداد نے گونہ امتیاز اس قصبے میں ضرور حاصل کرلیا ہوگا۔

اسی کے ساتھ جب ہم سوچتے ہیں کہ دیوبند کے غیر معمولی ثروت و دولت رکھنے والے دیوان والوں کے خاندان جن کی امارت رفتہ کی یادگار اس وقت تک دارالعلوم دیوبند کی فلک بوس عمارتوں کے سامنے اپنی امتیازی شان کو باقی رکھے ہوئے ہے، جس کا ذکر گذر چکا ہے۔

اسی کافی خوش حال اور فارغ البال خاندان سے مولانا محمد قاسم کے خاندان کے بزرگوں سے مسلسل رشتہ داریوں کا سلسلہ جاری تھا، آپ مجھ ہی سے سن چکے کہ شیخ کرامت حسین دیوبندی جو دیوبند کے اسی خاندان کے ایک مشہور رئیس گذرے ہیں، ان کی والدہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد کی حقیقی بھتیجی تھیں، یعنی

---

[1] حضرت والا کے حفید رشید سعید مولانا محمد طیب صاحب رئیس الاہتمام دارالعلوم دیوبند نے دریافت کرنے پر اپنے گرامی نامہ میں جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگریسی حکومت کے نئے قوانین بننے سے پہلے کی غذائی ضرورتیں آپ کے پورے خاندان [illegible] کثیر مہمانوں کی اسی جائداد کی پیداوار سے پوری ہوتی تھیں، اگرچہ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ زمین کی کچھ مقدار کا بعد کو مولانا طیب صاحب کے والد ماجد حضرت حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے بھی اضافہ فرمایا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اس کو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حافظ صاحب مرحوم اپنی چند بہنوں کے ساتھ والد کی موروثی جائداد کے وارث ہوئے تھے غالباً اسی کی تکمیل جدید خریداری سے کی گئی تھی ۱۲

شیخ خواجہ بخش کی صاحبزادی تھیں، یہ مانا کہ جیسے آجکل ہندوستان کے مسلمانوں میں ازدواجی تعلقات کی بنیاد عموماً مالی حیثیت پر جو قائم ہوگئی ہے، ہم نسل ہونے سے زیادہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس خاندان سے رشتہ قائم ہورہا ہے اس کی مالی حیثیت کیا ہے۔

پچھلے زمانہ میں "لچھمی دیوی" کی پوجا مسلمانانِ ہند میں اس طریقہ سے عام طور پر جاری تھی، اور کفو کا خیال مالی معیار پر غالب تھا، تاہم ہم کفو ہونے کے بعد اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس زمانے میں بھی کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ اس کا خیال بھی کسی نہ کسی حد تک ضرور رکھتے تھے کہ باپ کے گھر میں لڑکی جس قسم کے معاشی ماحول میں رہی ہے سسرال میں بھی کم از کم اسی قسم کا ماحول اس کو میسر آئے تو اچھا ہے، خصوصاً جس زمانے کا حال ہم بیان کررہے ہیں، یہ مسلمانوں کے انحطاط کا زمانہ تھا، آج تناور درختوں کی شکل میں جتنے بُرے رسوم اور رواج ہمارے گھروں میں کھڑے نظر آرہے ہیں، ان کے پودے انحطاط اور تنزل کے ان ہی ایام میں نصب ہوچکے تھے،

کچھ بھی ہو، میرا خیال یہی ہے کہ دیوبند کے اس خاندان میں مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان والوں کی رشتہ داریاں جس زمانہ میں قائم ہوئی ہیں، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں مولٰنا مرحوم کے گھرانے کی معاشی حالت اگر دیوبند کے دیوان والوں کے یہاں سے بہتر نہ تھی تو کمتر ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، دیوان والوں کی مالی برتری کا اندازہ علاوہ ان شکستہ در و دیوار کے جو اس وقت بھی اپنے بنانے والوں کے متعلق اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ قصبہ کے "صنادید"[۱] میں ان کا شمار تھا، اس قسم کی روایتیں اسی گھرانے

[۱] مولوی سید محمد میاں صاحب جو خود بھی خاص قصبہ دیوبند سے وطنی موروثی تعلق رکھتے ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے دیوان جن کا نام شیخ لطف اللہ تھا، وہی دیوان محلہ کے رہنے والوں کے مورث اعلیٰ تھے افسوس ہے کہ باوجود جستجو کے تاریخ کی عام کتابوں میں خصوصاً مآثر الامراء میں بھی دیوبند کے شیخ لطف اللہ کا مجھے پتہ نہ چل سکا۔ ورنہ علاوہ عمارت کے مغل حکومت کے عہدہ دیوانی پر سرفرازی اس خاندان کی امارت و وجاہت کی کافی دلیل ہوسکتی ہے ۱۲

کے اسلاف کے متعلق زبان زد عام ہیں۔ مثلاً مولنا محمد میاں صاحب نے اسی خاندان کے ایک بزرگ (شیخ کرامت حسین اور ان کے بیٹے شیخ نہال احمد) کے متعلق اپنی کتاب "مسلمانوں کا شاندار ماضی" نامی میں لکھا ہے کہ

"بہت مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ اس طرف سے گذرنے والی بارات کو اپنے یہاں ٹھہرالیا ہے اور اس کی دعوت کی"۔ ص۵۹ کتاب مذکور حصہ پنجم

میں نے دوسرے مقامات سے بھی اس قصبہ کو سنا ہے "اتفاقاً ایک آدھ دفعہ نہیں، بلکہ "بہت مرتبہ" راہ سے گذرنے والی باراتوں کو اپنے یہاں مہمان بنالینا، اور ان کی دعوت کا بغیر سابقہ تیاری کے اچانک انتظام کی قدرت، ظاہر ہے غیر معمولی ثروت و رفاہیت کے بغیر عام حالات میں آسان نہیں ہے، خصوصاً اس زمانے کی باراتوں کا جو حال تھا، دستور کے مطابق کافی تعداد باراتیوں کی بھی ہوتی ہو گی، چھکڑے، گاڑیاں، گھوڑے، ہاتھی، اونٹ وغیرہ سارے سازوسامان کے ساتھ باراتیں چلتی تھیں۔

بہر حال میرا قیاس جو معقول وجوہ پر مبنی ہے اگر صحیح ہے، تو یہ ماننا چاہئے کہ مولنا محمد قاسم کے خاندان میں چار پشتوں تک جس جائداد میں تقسیم و تجزیہ کا عمل نہ ہوا تھا، وہ کافی اور معقول تھی، اس خاص مسئلہ پر زور دینے کی ضرورت اس لئے بھی محسوس ہوئی کہ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب کے متعلق بعض لطائف تقریروں اور تحریروں میں، جو پھیل گئے ہیں ان سے کافی غلط فہمی جہاں تک میرا احساس ہے پھیلی ہوئی ہے مثلاً ارواح ثلثہ میں امیر شاہ خاں صاحب کی طرف منسوب کر کے یہ لطیفہ درج کیا گیا ہے کہ اپنے وقت کے مشہور ادیب جلیل مولنا فیض الحسن، صاحب سہارنپوری جو مولنا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد اور مولوی شبلی اور مولوی عبداللہ ٹونکی وغیرہ مشاہیر کے استاذ تھے، ادب کی نصابی کتابوں، سبعہ معلقہ، حماسہ وغیرہ پر عربی زبان میں مولنا نے مستقل شرحیں لکھی ہیں، بیضاوی اور مشکوٰۃ شریف پر بھی ان کے فاضلانہ حواشی ہیں، لاہور کے اورنٹیل کالج کے پہلے صدر غالباً مولانا فیض الحسن ہی تھے،

بہر حال کہنا یہ ہے کہ مولانا فیض الحسن اور مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ میں ہم عمری کی وجہ سے ایک گونہ ایسے تعلقات تھے کہ باہم دونوں میں مزاح اور ظرافت کی گفتگو بھی کبھی کبھی ہوجایا کرتی تھی، اسی سلسلہ میں کہتے ہیں کہ ایک دن مولانا فیض الحسن صاحب نے مولانا نانوتوی کو خطاب کر کے کہنا شروع کیا کہ

"اے اسد علی کے بیٹے تو تو کھیتی کرتا تجھے کس نے مولوی بنادیا تیرے پاس تو دو بیل ہوتے اور ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر تک تک، بر بر کرتا ہوتا۔" ارواح ثلاثہ (۲۷۷)

الفاظ کے معمولی رد و بدل کے ساتھ اسی کتاب میں یہی لطیفہ مولانا محمد طیب صاحب نے بھی اپنے والد مرحوم کی طرف منسوب کر کے نقل کیا ہے، (دیکھو ص۱۸۳ ارواح ثلاثہ) پچھلی روایت میں "اسد علی کے بیٹے" کی جگہ

"بے حیا گنوار کے لونڈے"

کے الفاظ ہیں۔

مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مولوی فیض الحسن کی خبر جس چبھتے ہوئے فقرے سے اس کے بعد جواباً لی ہے، اس کا ذکر تو انشاء اللہ مولانا مرحوم کی ان لطیف بذلہ سنجیوں کے ذیل میں کیا جائے گا، جن میں "نبوت کبریٰ" کے اسوہ اور نمونے کی جھلک پائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں اس کے نقل کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ یہ یا اسی قسم کی بعض روایتیں لوگوں میں جو مشہور ہو گئی ہیں ان سے نہ جاننے والے ممکن ہے کہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ مولانا مرحوم کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب شاید نرے کسان تھے۔

غنیمت ہے کہ امیر شاہ صاحب والی روایت کو درج کرتے ہوئے خود امیر شاہ صاحب کی طرف سے یا راوی نے اپنی طرف سے ان الفاظ کا اضافہ قوسین میں کر دیا ہے کہ

"مولانا (یعنی مولانا محمد قاسمؒ) کے والد ماجد باوجود خواندہ ہونے کے کھیتی کرتے تھے۔"

ورنہ جن الفاظ میں راویوں نے مولٰنا فیض الحسن صاحب مرحوم کے لطیفہ کا چرچا پھیلا دیا ہے ان کے سننے والے پر شاید یہی اثر مرتب ہو سکتا تھا کہ مولٰنا کے والد لکھے پڑھے بھی نہ تھے، اور خود ہل جوتا کرتے تھے، مگر آپ مجھ ہی سے سن چکے، نانوتہ کے اجمالی تبصرہ میں بیان کر چکا ہوں کہ حضرت سید شہید کے مواعظ اور صحبت سے اثر پذیر ہونے کے بعد نانوتہ سے جو تعلیمی وفد طلب علم کے سلسلہ میں دلی روانہ ہوا تھا، اس وفد میں شیخ اسد علی صاحب بھی شریک تھے مصنف امام کی چشم دید شہادت گذر چکی جس میں انھوں نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ شاہ نامہ تک فارسی کی کتابیں دلی میں پڑھ چکے تھے اور ان کے سامنے اپنے پڑھنے کے زمانہ کی حکایتیں بیان فرمایا کرتے تھے (سوانح قدیم صـ۳) میں نے عرض کیا تھا کہ شاہ نامہ اس زمانہ کے اعتبار سے فارسی ادب کے حصہ نظم کی آخری کتاب تھی، شاہ نامہ تک پڑھ چکنے کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ فارسی ادب کے کامل نصاب کی تعلیم شیخ اسد علی صاحب حاصل کر چکے تھے، موجودہ رواج کے مطابق جو حیثیت انگریزی ادب کے گریجویٹ کی ہوتی ہے گویا فارسی ادب کے لحاظ سے شیخ اسد علی تعلیم کے اس معیار کی تکمیل کر چکے تھے، میرے خیال میں تو کسی ایسے تعلیم یافتہ آدمی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ "خواندہ" تھے بجائے ازالہ کے اس غلط فہمی کو شاید بڑھا ہی دیتا ہے، جو لطائف و ظرائف کی ان روایتوں کی بدولت عموماً پھیل گئی ہے، امیر خاں صاحب کی روایت میں یہ استدراک کہ وہ "خواندہ" تھے خود بتا رہا ہے کہ غلط فہمی کے احتمال کو پا کر راوی نے اس کا ازالہ کرنا چاہا مگر جس لفظ سے ازالہ کی کوشش کی گئی ہے، میرے نزدیک وہ بھی واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے، خیال کرنے کی بات ہے کہ فارسی جیسی ادبی و علمی زبان کے اعلیٰ معیاری نصاب کو جو ختم کر چکا ہو، نانوتہ یا سہارنپور ہی نہیں بلکہ اس زمانہ میں سارے ہندوستان کے کمالات کا جو سب سے بڑا مرکز تھا، یعنی دلی کے علمی حلقوں میں جس شخص کو اپنی مذکورہ بالا تعلیم کی تکمیل کے مواقع میسر آئے ہوں، اس کے متعلق صرف "خواندہ" کے لفظ کا اطلاق کس حد تک درست ہو سکتا ہے،

اسی طرح یہ کہنا کہ "شیخ اسد علی صاحب کھیتی کرتے تھے" اور مولوی فیض الحسن صاحب کے لطیفہ کو

پیش نظر رکھ کر یہ سمجھ لینا کہ واقعۃً شیخ صاحب خود ہل جوتتے تھے، میرے نزدیک یہی واقعہ کی صحیح تعبیر نہ ہوگی، اتنی بات صحیح ہے کہ دلّی سے واپس آنے کے بعد شیخ اسد علی صاحب نے کوئی دوسرا معاشی ذریعہ اختیار نہیں کیا، بلکہ جو موروثی زمینداری ان کے گھر میں چلی آرہی تھی، اسی کی دیکھ بھال میں مشغول رہے، ان کی اسی مشغولیت کی تعبیر یہ کی گئی ہے کہ وہ کھیتی کرتے تھے۔ بالفاظ دگر مطلب یہ تھا کہ ان کی گذر بسر کا ذریعہ وہی کاشتکاری تھی جو ان کے گھر ہوتی تھی۔

اور یہ میں اسلئے کہہ رہا ہوں کہ قطع نظر دوسری معلومات کے یہ مشکل ہے کہ دلّی جیسے متمدن شہر کی تعلیمی صحبتوں میں زندگی گذارنے کے بعد ہل جوتنے کی صلاحیت آدمی میں باقی رہے، خواہ یہ حال افسوس ناک ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ انسان کی چند اہم فطری صلاحیتوں میں سے ایک بڑی مفید صلاحیت کا یہ فقدان اور انسانی کمالات میں سے ایک بڑے کمال سے یہ محرومی ہے، مگر کیا کیجئے کہ دماغی اور ذہنی قوتوں میں تعلیم سے جتنی زیادہ بلندی پیدا ہوتی ہے؛ اسی نسبت سے جسمانی قوتیں انحطاط وضعف کا شکار ہوتی چلی جاتی ہیں پہلے بھی یہی تھا اور آج تک تعلیم کا جو نظام دنیا میں جاری ہے خواہ جدید ہو یا قدیم دونوں میں یہ نقص باقی ہے۔

بہرحال کم از کم میرے لئے یہ باور کرنا آسان نہیں ہے کہ دلی کی اس تعلیم کے بعد شیخ اسد علی صاحب میں ہل جوتنے کی صلاحیت باقی رہی ہوگی، مولوی فیض الحسن صاحب نے ان کی طرف اگر اس کا انتساب کیا ہے تو ہم اس انتساب کو مجازی انتساب سے زیادہ اور کچھ قرار نہیں دے سکتے، کاشتکاری کے لوازم میں چونکہ قلبہ رانی بھی ہے، اسلئے ملزوم کو دیکھ کر لازم کو انھوں نے شیخ صاحب کی طرف مزاح وظرافت کے موقعہ پر منسوب کردیا اور ہر قسم کی گفتگو میں اتنا مجاز متحمل ہے، بلکہ ظرافت ظرافت ہی کب باقی رہتی ہے، اگر مجاز کا رنگ اس پر نہ چھڑکا جائے۔

باقی جن دوسری معلومات کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہیں کہ دہلی سے واپسی کے بعد جیسا کہ مصنف امام کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے شیخ اسد علی صاحب جب نانوتہ اپنے وطن تشریف لائے تو جیسا کہ چاہئے تھا دلی سے تعلیم پاکر واپس لوٹنے والے اس نوجوان پر لوگوں کی نظریں پڑنے لگیں، سب کا حال تو معلوم نہ ہو سکا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نانوتہ ہی کے رہنے والے ایک وکیل صاحب جن کا اسم گرامی شیخ وجیہ الدین تھا، اور اپنے علاقے کے ضلع یعنی سہارنپور میں وکالت کرتے تھے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ جس زمانے میں انگریزوں نے سہارنپور میں حکومت کا نظم قائم کیا تو شیخ وجیہ الدین

"سہارنپور میں وکیل ہوئے، اور نہایت عزت و احترام و تمول سے گذران کی" ص۲۵ سوانح قدیم

یہی وکیل صاحب جو عزت و احترام کے ساتھ "تمول" میں بھی نمایاں حیثیت کے مالک تھے مصنف امام کا بیان ہے کہ

"وہ (شیخ وجیہ الدین نانوتوی) فارسی بہت عمدہ جانتے تھے اردو کے شاعر تھے اور کچھ کچھ عربی سے بھی آگاہ تھے، بڑے تجربہ کار اور پرانے آدمی تھے" ص۲۵

بہر حال کہنا یہ ہے کہ ان ہی شیخ وجیہ الدین صاحب وکیل نے شیخ اسد علی صاحب کو اپنی دامادی کے لئے قبول فرمایا، اور ان کا عقد وکیل صاحب کی صاحبزادی صاحبہ سے ہو گیا، اسلام کی یہی عفیفہ خاتون وہ خوش بخت، بلند اختر بیوی صاحبہ ہیں، جن کو سیدنا الامام الکبیر النانوتوی قدس اللہ سرہ کی والدہ ماجدہ ہونے کا تاریخی شرف و امتیاز قدرت کی طرف سے عطا ہوا،

میں پوچھتا ہوں کہ شیخ اسد علی صاحب اگر واقعی ہل جوتنے والے گنوار کسان تھے، تو کوئی وجہ ہو سکتی تھی کہ شیخ وجیہ الدین صاحب متمول عزت و احترام رکھنے والے تعلیم یافتہ

آدمی ان کا انتخاب اپنی دامادی کے لئے کرتے، کیا برادری میں اپنی لڑکی کے لئے ان کو دوسرا لڑکا نہیں ملتا تھا یا نہیں مل سکتا تھا۔

میرے نزدیک تو وکیل صاحب کا یہ انتخاب ہی، ان ساری غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے کافی ہے، جو خواہ مخواہ ان مزاحی روایتوں کی بدولت لوگوں میں پھیل گئی ہیں، اور بات وہی ہے کہ گو نانوتہ کے ان صدیقی شیوخ کی مالی حالت بہت کچھ بگڑ چکی تھی،

تاہم ایسے خانوادے جن میں ورثہ کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ خصوصاً مولانا محمد قاسم کا خاندان جو چار پشتوں سے بقول مصنف امام "منفرد" چلا آرہا تھا، یعنی ایک کے بعد ایک ہی آدمی ساری موروثی جائداد کا وارث بنتا ہوا چلا آرہا تھا، ایسے خاندانوں کا معاشی معیار پھر بھی غنیمت تھا، اور اسی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ شیخ اسد علی صاحب اس زمانے کے حساب سے ایک مرفہ الحال بزرگ تھے، پھر دلی کی تعلیم نے ان کی شخصیت میں کم از کم نانوتہ جیسے قصبہ کے لحاظ سے گونہ امتیاز بھی پیدا کر دیا تھا، اگرچہ اس کا کوئی تاریخی وثیقہ میرے پاس موجود نہیں ہے،

لیکن شیخ وجیہ الدین نے اپنی دامادی کے لئے شیخ اسد علی کا انتخاب اگر اسلئے کیا ہو کہ وکالت کا امتحان دلا کر اسی پیشہ میں ان کو بھی لگا دیا جائیگا، جس میں وہ خود مشغول تھے، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے، اس زمانہ میں جب انگریزوں نے اس ملک میں اپنی حکومت کے نئے نظام کو نافذ کیا، جس کا ایک بڑا امتیازی عنصر "وکلاء" کا وجود بھی تھا،

تو جیسا کہ دنیا جانتی ہے، وکیل بننے کے لئے جس قابلیت کی ضرورت تھی، اس سے شیخ اسد علی صاحب کافی طور پر بہرہ ور ہو چکے تھے، آخر گلستاں بوستاں تک کے پڑھنے والے لوگ اس زمانے میں قانونی امتحان میں کامیاب ہو ہو کر جب مشہور وکیلوں میں شمار ہوئے، ان میں بعضوں نے لاکھوں روپئے کمائے[۱]، تو شیخ اسد علی جو دلی سے شاہنامہ سکندر نامہ تک کی

---

[۱] غیر انگریزی خواں وکیلوں میں یوپی صوبہ کے ایک مشہور وکیل منشی امتیاز علی صاحب مرحوم بھی گذرے ہیں، بعد کو تو خیر ریاست بھوپال کے وزیر اعظم ہی ہو گئے تھے، لیکن وزارت سے پہلے ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ "بیس بائیس برس میں صرف اسی پیشۂ وکالت کے سبب سے تیس بتیس لاکھ روپئے پیدا کیا" ص ۳۱

تعلیم کی تکمیل کر کے واپس ہوئے تھے، ان کے لئے وکالت کا امتحان اور وکیل بن کر کامیاب ہونے میں دشواری ہی کیا ہوتی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مولانا نانوتوی جیسا بیٹا جس شخص نے علم و عقل کی دنیا میں پیش کیا ہو، ایسے بیٹے کے باپ کے متعلق سوچئے تو سہی کہ وکالت کے میدان میں ناکام ہونے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی۔

یہ سوال میرے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے یعنی شیخ اسد علی صاحب نے آخر تمول اور عزت و احترام کی اس کھلی ہوئی راہ یعنی وکالت کے پیشے کو جو اُن کے خسر کا پیشہ تھا، کیوں نہ اختیار کیا، یہ نہیں تو حکومت قائمہ کی کچہریوں، اور دوسرے سرکاری دفاتر میں بے شمار نئی جائدادیں جو قائم ہو رہی تھیں، جن میں یہی اردو فارسی کے پڑھے ہوئے لوگ بکثرت لئے جا رہے تھے، اُن کے خسر حکومت میں کافی اثر بھی رکھتے تھے، چاہتے تو اپنے داماد کو ان محکموں کی ملازمتوں میں بآسانی شریک کرا سکتے تھے، مگر اس قسم کے تمام قریبی امکانات سے دامن کش ہو کر انھوں نے نانوتہ کے قصبے میں قیام کر کے ایک ایسی زندگی کیوں اختیار کی، کہ ہل جوتنے کے انتساب کی بھی گنجائش ان کی اس زندگی میں نہ سمجھنے والوں کے لئے نکل آئی، میں نے جیسا کہ عرض کیا شیخ اسد علی صاحب کے متعلق یہ خیال کہ واقعی وہ ہل جوتنے والے کسان تھے" اگرچہ صرف خیال ہے، تاہم اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دلی سے لوٹنے کے بعد ان کو نانوتہ اور نانوتہ کی قصباتی زندگی ہی میں غرق پایا جاتا ہے، مصنف امام جنھوں نے شیخ اسد علی صاحب کو براہ راست دیکھا تھا، اور دیکھا تھا کیا معنی، ان ہی کے ساتھ زمانہ تک زندگی گذاری تھی، ان کی شہادت بھی یہی ہے۔

"تمام عمر کھیتی کی" ص ۲۴

جس کا مطلب میرے نزدیک اگرچہ یہی ہے، کہ موروثی جائداد کی کاشتکاری کی نگرانی کی یہ تعبیر ہے، اور یہ عام تعبیر ہے، جو اس قسم کے زمینداروں کے متعلق عموماً مروج ہے، بہر حال مذکورہ بالا شہادت میں "تمام عمر" کا لفظ بتا رہا ہے کہ دلی سے واپس ہونے کے بعد کھیتی کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ شیخ اسد علی صاحب نے اختیار نہیں کیا، آخر ایسا کیوں ہوا، اسی قصبہ کے رہنے والے شیخ

وجیہ الدین ان کے خسر بھی تھے، جب وہ وکالت کرتے تھے تو وکالت یا اسی قسم کی دوسری سرکاری خدمات میں حصہ نہ لینے میں یہ سوچنے کی بات ہے، کون سی چیز مانع ہوئی؟

بعض روایتیں یا حکایتیں اس سلسلہ میں جو مشہور ہیں، مثلاً ارواح ثلاثہ میں بعض ثقات کی تحریروں کے حوالہ سے ایک روایت پائی جاتی ہے کہ

"ایک مرتبہ مولانا نانوتوی کے والد ماجد (شیخ اسد علی) نے حضرت حاجی امداداللہ صاحب قدس اللہ سرہ سے شکایت کی، کہ بھائی میرے تو یہی ایک بیٹا تھا، اور مجھے کیا کچھ امیدیں تھیں، کچھ کماتا تو افلاس دور ہو جاتا، تم نے خدا جانے کیا کر دیا کہ نہ کچھ کماتا ہے اور نہ نوکری کرتا ہے۔" ص۲۰۱

اسی طرح اس کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ مولانا نانوتوی نے اپنے والد کی زندگی میں جب اپنی موروثی جائداد کے متعلق شرعی نقطۂ نظر سے نظر ثانی کر کے کئی کئی پشتوں کے محروم الارث لوگوں تک ان کے جائز شرعی حصوں کی واپسی کا نظم فرمایا، تو اُن کے والد شیخ اسد علی صاحب کیلئے مولانا کا یہ طرز عمل باعث گرانی ثابت ہوا، کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی حاجی صاحب قبلہ قدس اللہ سرہ سے شیخ اسد علی صاحب نے شکایت کی کہ

"دنیا کی اولاد اپنے گھروں کو بھرتی ہے، اور یہ (مولانا محمد قاسم) "گھر کھوو" پیدا ہوا ہے کہ بنی بنائی جائداد کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔" (ماخوذ از تحریری یادداشت مولانا محمد طیب الحفید)

یہ اور اسی قسم کی دوسری روایتوں سے جیسا کہ ظاہر ہے، عام خیال بھی پیدا ہو سکتا ہے اور شاید دوسروں کا یہی خیال ہو بھی کہ فطرتاً مولانا نانوتوی کے والد ماجد طالب دنیا اور جیسا کہ عام مسلمانوں کا حال اس زمانے میں ہو گیا تھا کہ جائز و ناجائز کی تمیز کے بغیر "جو کچھ مل جائے لئے چلے جاؤ" اسی حال میں وہ بھی گرفتار تھے۔

بلاشبہ مذکورہ بالا روایات کا اقتضا یہی ہے، مگر میں کیا کروں، میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ آخر جب ان پر طلب دنیا کا جذبہ اسی طرح سے سوار تھا، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، تو اسی زرکشی

اور دنیا طلبی کے وسیع امکانات جو اُن کے سامنے کھلے ہوئے تھے، ان امکانات سے مستفید ہونے میں انھوں نے گریز کی راہ قصداً کیوں اختیار کی، ان سارے امکانات پر لات مار کر تمام عمر کھیتی کی، ان چند لفظوں میں ان کی پوری سوانح عمری سمٹ کر کیوں ختم ہوگئی۔

الحمد للہ کہ نظریۂ[1] آبائیت کی آلودگی سے قرآن نے مسلمانوں کی ذہنیت کو پاک کردیا ہے آذر سے ابراہیم، اور نوح سے پسر نوح کی پیدائش کے قرآنی قصوں نے کسی بڑے کے باپ یا بیٹے ہونے کی ان کے نزدیک کوئی قیمت باقی نہیں چھوڑی ہے، حضرت یوسفؑ کے بھائی بھی جب اخوان یوسف بن سکتے ہیں، تو رشتہ کی قربت اور نزدیکی کا رعب یقیناً بےمعنی رعب بن کر مسلمانوں کے لئے رہ گیا ہے، اسی صورت میں آئندہ جو کچھ میں عرض کروں گا، اس کے متعلق کسی خوش اعتقادی کے مغالطہ کا خیال خود مغالطہ ہوگا، بلکہ شواہد اور تاریخی روایات کی روشنی نے جس نتیجہ تک مجھے پہنچایا ہے محض اس کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد شیخ اسد علی مرحوم کے متعلق جو سوال میں نے اٹھایا ہے غور وفکر کے بعد اس سوال کا جو جواب مجھے ملا ہے، ممکن ہے کہ دوسروں کو شاید مولٰنا نانوتوی کے ساتھ میری خوش عقیدگی کی شدت اس جواب میں دخیل

---

[1] یہ میری ذاتی اصطلاح ہے جو قرآن سے ماخوذ ہے، قرآن نے ایک سے زائد مقامات میں دو خاص طبقوں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک کی خصوصیت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ حق کا معیار ان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ ان کے باپ دادا اسکو حق مانتے تھے ماوجدنا علیہ اٰباءنا الاولین (جس پر ہم نے اپنے اگلے باپ دادوں کو پایا) یہی حق کا سب سے بڑا معیار ان کے نزدیک تھا، اسی نظریہ کی تعبیر میں "آبائیت" سے کرتا ہوں جو شخص خود والد بننے والا ہے اُسکے لئے یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہوگی کہ کسی چیز کو اس لئے حق قرار دے رہا ہے کہ اسکے والد مرحوم اسی کو حق خیال کرتے تھے، اسکے مقابلہ میں دوسرا طبقہ وہ ہے جسے میں "افکیہ" کہتا ہوں، ان کے نزدیک کسی چیز کے غلط ہونے کی یہ کافی دلیل ہے کہ پہلے زمانہ کے لوگ اس کو حق تسلیم کرتے تھے، قرآن میں ہے کہ ان ھذا الا افک قدیم (نہیں ہے یہ مگر پرانا جھوٹ) اسی مقدمہ کو کسی حقیقت کی تغلیط کے لئے وہ کافی خیال کرتے تھے، افک کے لفظ کی طرف منسوب کرکے میں نے اس طبقہ کا نام "افکیہ" رکھ چھوڑا ہے، اسی مقدمہ کی تعبیر وہ کبھی ان ھذا الا اساطیر الاولین (نہیں ہے یہ مگر اگلوں کے اسطورے یا قصے) کے الفاظ میں بھی کرتے تھے، یہ عجیب بات ہے کہ اس وقت تک یہ دونوں متقابل طبقات تقریباً دنیا کے اکثر اقوام وممالک میں پائے جاتے ہیں ۱۲

نظر آتی ہو، لیکن اپنے حال سے میں خود زیادہ واقف ہوں۔ عقیدت و نیاز کا تعلق حضرت والا کی ذات گرامی سے میں ضرور رکھتا ہوں۔ مگر یقین کیجئے کہ اس جواب میں عقیدت سے زیادہ حقیقت نے میری راہ نمائی کی ہے۔

بہر حال سوچنے والے جو کچھ سوچیں اس کا ان کو اختیار ہے، پر دل میں میرے جو بات آئی ہے اُسے کیسے چھپاؤں۔ اس سے تو لوگ واقف ہی ہوں گے، قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ

اللہ یجتبی الیہ من یشاء و یھدی الیہ من ینیب (شوریٰ)۔	اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں چن لیتے ہیں، اور اپنی طرف راہ نمائی فرماتے ہیں اس شخص کی جو ان کی طرف جھکتا ہے۔

اسی سے یہ قانون پیدا کیا گیا ہے، کہ بارگاہ الٰہی میں جن لوگوں کو قرب و نزدیکی کا امتیاز بخشا جاتا ہے۔ ان میں کچھ لوگ تو اجتبائی ہوتے ہیں، یعنی مشیت حق اپنے قرب اور نزدیکی کے لئے ان کو نامزد کر کے چن لیتی ہے، اور ان ہی میں کچھ ہوتے ہیں جنھیں انابت اور جھکنے کے بعد ہدایت کی روشنی بخشی جاتی ہے۔

جس کا حاصل یہی ہوا کہ دوسری صورت میں پیش قدمی انابت کی شکل میں بندے کی طرف سے ہوتی ہے، جس کے صلہ میں ہدایت کی نعمت سے وہ سرفراز کئے جاتے ہیں۔ لیکن اجتبائی رنگ میں بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ داد حق ہی ان کی دستگیری کرتی ہے، ظاہر ہے کہ قادر مقتدر کی بارگاہ استغنا و کرم میں دونوں ہی کی گنجائش ہے، بجائے حیوان و نبات، و جماد کے نوع انسانی میں پیدا ہونے کے لئے انتخاب جیسے کسی سابقہ عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا، تو اسی انسان کو اجتبائی مقام سے اگر امتیاز بخشا جائے تو اس پر تعجب کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

اس تمہیدی مقدمہ کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر النانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فقیر نے جو کچھ سنا یا کتابوں میں پڑھا ہے، مجموعی حیثیت سے ان چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے قدرتاً یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت والا کا تعلق بھی ان ہی برگزیدہ نفوس و ارواح

طیبہ سے معلوم ہوتا ہے جو اجنبانی رنگ میں چنے جاتے ہیں، جو تھوڑی بہت واقفیت بھی آپ کی خصوصیات و حالات سے رکھتے ہیں، اگر غور کریں گے تو میرے اس خیال کی تائید سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں مشکل ہی سے ہچکچائیں گے، اور جو نہیں واقف ہیں، ان کو چاہئے کہ صبر سے کام لیں، اسی کتاب میں ان کو ایسی چیزیں ملتی چلی جائیں گی، جن کی روشنی میں انشاء اللہ ان کو بھی وہی نظر آئے گا جسے میں دیکھ رہا ہوں کچھ نہیں یہی واقعہ کہ جسکی ناسوتی زندگی کا وقفہ پچاس سال سے بھی کم تھا، وہی ہندوستان جیسے طویل و عریض کروڑہا کروڑ مسلمانوں سے بھرے ہوئے ملک کی تاریخ کا ایک ایسا سوال کیسے بن گیا کہ تیرھویں صدی اور اس کے بعد کی صدیوں میں اس ملک کے ان ہی مسلمانوں کی دینی زندگی کے کسی پہلو کو کوئی اس سوال کے حل کئے بغیر سمجھ ہی نہیں سکتا، کیا یہ کوئی معمولی واقعہ ہے۔

اور اس کو بھی جانے دیجئے، کیونکہ ابھی تو یہ دعویٰ اجمال کے رنگ میں آپ۔ کے سامنے آیا ہے دعوی کا وزن تو تفصیلات کے علم کے بعد ہی ہو سکتا ہے، مگر اپنے اس احساس میں فقیر تنہا بھی تو نہیں ہے، افسوس ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک سابق مہتمم حضرت شاہ مولنا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی بلندیوں سے عوام واقف نہیں ہیں، تاہم ان کی جلالت قدر کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم مبرور مولنا عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ ان ہی مولانا رفیع الدین کے ساختہ پرداختہ تھے، مفتی صاحب ان ہی کے مرید تھے، اور باطنی راہوں کا سلوک ان ہی کی راہ نمائی میں طے فرمایا تھا، حضرت مفتی صاحب کے دیکھنے والے بحمد اللہ ابھی زندہ ہیں، ان کی معصومیت، جو للہیت و صدیقیت کی ایک جیتی جاگتی زندہ تصویر تھی، جس نے اس کا مشاہدہ کیا ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ مفتی صاحب کی شخصیت کا معمار خود کیسا اور کیا ہوگا۔[۱]

---

[۱] اپنی زندگی کے قیمتی اوقات میں ان لمحوں کو یہ کوتاہ نصیب بھی گرانمایہ یقین کرتا ہے جو حضرت مفتی صاحب رہ کی دید میں کبھی گذرے تھے، تراویح کی چند نمازیں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم کی معیت میں مفتی صاحب کے پیچھے میسر آئی تھیں اللہ اللہ برزوا للہ الواحد القہار (اور کھل پڑے لوگ اللہ واحد قہار کے آگے) تجوید و قراءۃ کی صفتوں سے آزاد تلاوت مفتی صاحب نے نماز میں اس آیت کی کی، پھر اسی فقیر ہی نے نہیں بلکہ صف میں (بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کیجئے)

بہر حال کہنا یہ ہے کہ ان ہی مولٰنا رفیع الدین صاحب مرحوم کی طرف منسوب کرکے ارواح ثلاثہ میں بروایت مولانا نظام الدین حیدر آبادی مرحوم جو یہ قول ان کا پایا جاتا ہے یعنی مولانا رفیع الدین حضرت نانوتوی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ

"میں نے انسانیت سے بالا درجہ ان کا (مولانا نانوتوی کا) دیکھا، وہ شخص ایک فرشتہ مقرب تھا، جو انسانوں میں ظاہر کیا گیا تھا" ص۱۸۳ ارواح ثلاثہ

مولٰنا رفیع الدین کہتے تھے کہ اسی احساس اور یافت کا یہ اثر اور نتیجہ ہے

"میں پچیس ۲۵ برس حضرت مولانا نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، اور کبھی بلا وضوء نہیں گیا"

یہ ایک ایسی شخصیت کی شہادت ہے، جس کے قرب و ولایت کی تصدیق اس کے عہد کے اللہ والوں نے کی ہے۔

اور مولانا رفیع الدین کے متعلق تو ممکن ہے کہ قرب و صحبت کی وجہ سے شدت گرویدگی کا شبہ بھی کیا جائے، لیکن حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز جو حضرت نانوتوی سے عمر میں تقریباً چونتیس سال بڑے[۱] تھے، گویا مولٰنا گنج مرادآبادی کے مقابلہ میں مولانا نانوتوی بچے تھے، دونوں حضرات میں تلمذاً یا ارشاداً کسی قسم کا ظاہری تعلق بھی نہ تھا، بلکہ جہاں تک میں جانتا ہوں ایک کی دوسرے سے شاید شفاہی ملاقات بھی نہ تھی، لیکن بایں ہمہ جانتے ہیں، حضرت گنج مرادآبادی جیسی بین الکرامات والکشوف ہستی نے مولٰنا نانوتوی کو کیا پایا تھا، حافظ تجمل حسین مرحوم دسنوی نے اپنی کتاب کمالات رحمانی میں حضرت گنج مرادآبادی سے براہ راست یہ الفاظ سن کر نقل کئے ہیں یعنی مولٰنا نانوتوی کے ذکر پر حضرت گنج مرادآبادی نے فرمایا۔

"اس کم سنی میں ان کو ولایت ہو گئی" ص۱۲۴ کمالات رحمانی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) جتنے بھی شریک تھے سبھوں نے جو کچھ دیکھا اور جو حال لوگوں پر طاری ہوا ملاحظہ سے یہ کیفیت کیا ٹل سکتی ہے مولانا شبیر احمد صاحب تک چیخ مار کر چپت، گرے ہوئے تھے، ہر ایک مدہوش تھا، مفتی صاحب قبلہ بار بار اسی آیت کی تکرار فرماتے جاتے تھے ۱۲

(متعلقہ صفحہ ہذا) [۱] حضرت گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز کی ولادت ۱۲۱۳ھ میں ہوئی اور مولانا نانوتوی ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے تھے ۱۲

ہے تو یہ مختصر سا فقرہ لیکن ہم جب سوچتے ہیں کہ پیدا ہونے کے بعد آدمی زندگی کی مختلف منزلوں سے گذرتا ہے، بچپن، جوانی، کہولت وغیرہ عام طور سے زندگی کے ان سارے ادوار میں لغزشوں سے قطعاً بے لاگ ہو کر گذر جانا آسان نہیں ہے، لیکن اب تک مولٰنا نانوتوی کے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں اُن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہی دشوار مسئلہ ان کے لئے اتنا آسان کر دیا گیا تھا کہ کہنے والا شاید یہ کہہ سکتا ہے کہ پانے والوں نے جس حال میں ان کو زندگی کے آخری دنوں میں پایا، تقریباً یہی حال ان کا جوانی میں بھی تھا، اور شاید بچپن میں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولی بنے نہیں تھے، بلکہ ولی ہی پیدا ہوئے تھے، اور ان کی اسی پیدائشی ولایت نے اسی لئے کم سنی ہی میں فعلیت کی شکل اختیار کر لی تھی، جس کی شہادت وقت کی سب سے بڑی مکاشف ہستی نے ادا کی،

آخر میں پوچھتا ہوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے اُن کے والد بزرگوار یعقوب علیہ السلام نے

كذلك يجتبيك ربك	یوں ہی تیرا رب تجھے چن لے گا۔

کے الفاظ کے ساتھ جو بشارت سنائی تھی، تو حضرت یوسف کی اس اجتبائی شان پر استدلال جیسا کہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے، اسی سے تو کیا گیا تھا کہ جو بڑائیاں عالم شہادت میں حضرت یوسف کے سامنے آئندہ زندگی میں آنے والی تھیں، غیب کے عالم میں وہی بڑائیاں مثالی رنگ میں بحالت خواب اُن کو دکھائی گئی تھیں۔

پھر آپ ہی سوچئے بیان کرنے والوں سے جب ایک نہیں بلکہ اس قسم کی متعدد روایتیں ہم تک پہنچتی ہیں مثلاً

سوانح قدیم ہی میں مصنف امام رقم طراز ہیں

(۱)

"مولوی صاحب (یعنی حضرت نانوتوی رح) نے ایام طفلی میں یہ خواب دیکھا تھا کہ گو یا

میں اللہ جل شانہ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں" ص۲۵

اور جیسے ایام طفلی ہی میں حضرت یوسف علیہ السلام نے سورج چاند اور گیارہ ستاروں کو اپنے سامنے خواب میں سربسجود پاکر اس خواب کا تذکرہ اپنے والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام سے فرمایا تھا جس کی تعبیر میں ان کے والد پیغمبر نے "مقام اجتبار" کی خوش خبری ان کو سنائی تھی۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ حضرت نانوتوی نے بھی اپنے اس خواب کا تذکرہ اپنے جدامجد شیخ غلام شاہ صاحب سے فرمایا۔ جن کے متعلق گذرچکا کہ ذاکروشاغل تھے اور خوابوں کی تعبیر یعنی تاویل الاحادیث کی نعمت ان کو عطا کی گئی تھی، اپنے پوتے کے اس خواب کو سن کر فرمایا کہ

"تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا، اور بہت بڑے عالم ہو گے اور نہایت شہرت ہوگی" ص۲۵ سوانح قدیم

کیا اس تعبیر میں اسی اجتبائی رنگ کی جھلک نظر نہیں آتی،

(۲) اسی طرح ارواح ثلاثہ میں ہے۔

"مولانا محمد قاسم صاحب نے بچپن میں ایک خواب دیکھا کہ میں مرگیا ہوں، اور لوگ مجھے دفن کر رہے ہیں، تب قبر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے، اور کچھ نگینے سامنے رکھے، اور یہ کہا کہ یہ تمہارے اعمال ہیں، اس میں ایک نگینہ بہت خوش نما اور کلاں ہے، اس کو فرمایا کہ یہ عمل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے" ص۲۰

میرے خیال میں یہ خواب بھی جو بچپن ہی میں حضرت کو دکھایا گیا تھا، عالم شہادت کے اس واقعہ کا جسے آج دنیا بچشم سر دیکھ رہی ہے، اسی کا یہ مثالی عکس تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تو ہے کہ انی جاعلک للناس اماما (یعنی خدا نے کہا کہ تمہیں لوگوں کا میں امام بناؤں گا) کا وعدہ اُن سے کیا گیا، اور یہ وعدہ

پورا ہوا، اور پورا ہو رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک اولوالعزم پیغمبر کے ساتھ خدا کا وعدہ تھا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی حضرت نانوتوی کو امام ماننے والوں کو بھی آج کوئی گننا چاہے، تو کیا گن سکتا ہے، ذرا سوچئے! ان لوگوں کو جو تقریباً ایک صدی سے عالم دین بن بن کر دارالعلوم دیوبند سے نکل رہے ہیں، اور ملک کے طول وعرض میں پھیل رہے ہیں، اور خود وہی نہیں، بلکہ کون نہیں جانتا کہ ان میں ایسے کتنے ہیں، جن کے ماننے والوں اور ان سے اثر پذیر ہونے والے عقیدتمندوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے، ان میں حکیم الامت مرشد تھانوی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن، حضرت امام کشمیری، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی حضرت مولانا حسین احمد مدنی مولانا خلیل احمد انبہٹوی وغیرہم جیسے حضرات ہیں، جن میں ایک ایک اپنے وقت اور حلقۂ اثر میں مستقل امام اور پیشوا مانے جاتے ہیں۔

بہرحال کھلی ہوئی بات ہے کہ بالآخر علماء دیوبند کے اکابر واصاغر کی ساری امامتوں اور پیشوائیوں کی انتہا اسی ہستی پر ہوتی ہے، جس کے سامنے ایام طفولیت ہی میں حضرت ابراہیم کا مثل ایک خوش نما کلاں نگینہ کی شکل میں پیش ہوا تھا کہ اس کی تمام شانوں اور خصوصیتوں میں یہی شان اور یہی خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں ودرخشاں ہے۔

(۳) اسی کتاب ارواح ثلاثہ میں یہ روایت بھی پائی جاتی ہے کہ

"مولانا (محمد قاسم) نے ایک خواب ایام طالب العلمی میں دیکھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مجھ میں سے ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں" صـ۲۰۱

یقیناً آج جو کچھ آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے، اسی کی یہ مثالی شکل تھی، جو ظہور سے پہلے دیکھنے والے کے سامنے اس لئے پیش ہوئی تھی، کہ دین اور علم کی جو جلیل خدمت اس کے ہاتھوں انجام پائی اس خدمت کے لئے وہ پہلے ہی سے چن لیا گیا تھا، اور یہی "اجتباء" کا مطلب ہے:

(۴) اسی کتاب ارواح ثلاثہ میں دوسری جگہ صـ۱۶۹ میں امیر شاہ صاحب کی طرف منسوب کر کے

ایک روایت یہ بھی درج کی گئی ہے کہ

"خان صاحب نے فرمایا کہ مولانا نانوتوی نے خواب میں دیکھا تھا کہ خانہ کعبہ کی چھت پر کسی اونچی شئے پر بیٹھا ہوں، اور کوفہ کی طرف میرا منہ ہے، اور ادھر سے ایک نہر آتی ہے، جو میرے پاؤں سے ٹکرا کر جاتی ہے۔" ص۱۶۹

بہ ظاہر یہ رؤیا بھی حضرت والا کو کم عمری میں ہوئی، کیونکہ آگے اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ اپنے اس خواب کا تذکرہ مولٰنا نانوتوی نے حضرت شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی کے بھائی مولانا محمد یعقوب سے فرمایا، مولانا محمد یعقوب سے جو واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مولانا کی ملاقات ان سے کم عمری ہی کے عہد میں ہو سکتی تھی۔

میرے نزدیک اس میں بھی مولٰنا نانوتوی کے اجتہائی مقام ہی کی طرف اشارہ ہے۔ اسکی بحث تو اپنی جگہ پر آئندہ آئے گی کہ تیرھویں صدی کے آخر میں مسلمانان ہند کی دینی زندگی کی وحدت کو جو شدید خطرہ فتنہ غیر مقلدیت کے طوفان کی وجہ سے پیش آگیا تھا، اور قریب تھا کہ یک جہتی کا یہ شیرازہ بکھر کر پراگندہ ہو جائے یشتر بے مہاری کے اس سیلاب میں ڈر تھا کہ، سلف کے سارے کارنامے شاید تہ و بالا ہو کر رہ جاویں، اس کڑے وقت، اور کٹھن گھڑیوں میں درس حدیث کے قاسمی یا دیوبندی طریقہ کی خصوصیت نے کیا کام کیا۔ لیکن اتنی بات تو سب کے سامنے ہے کہ فرقہ اہل حدیث کی طرف سے امام ابوحنیفہ اور ان کے اجتہادی مسائل پر جو حملے پہلے ہوئے یا اس وقت تک ہوتے رہتے ہیں ان حملوں کے مقابلہ میں محدثانہ تحقیقی رنگ میں جواب دینے کی جتنی اچھی صلاحیت دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتوں میں پائی جاتی ہے، انصاف کی بات یہی ہے کہ اس کی نظیر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ بیرون ہند کے اسلامی ممالک کے علماء میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ مولٰنا یعقوب نے اس خواب کو سن کر فرمایا کہ خواب دیکھنے والے

"شخص سے مذہب حنفی کو بہت تقویت ہو گی۔" ص۱۶۹

بوقت ضرورت اس سلسلہ میں مزید شواہد اور تائیدوں کو پیش کیا جاسکتا ہے، لیکن اس وقت تک آپ کے سامنے جو کچھ پیش ہو چکا ہے، اس کے متعلق یہ سوچتے ہوئے کہ عموماً ان روایتوں کے راوی فہمیدہ و سنجیدہ حضرات ہیں، ان میں دارالعلوم دیوبند کے صدر اول حضرت تھانوی کے استاذ جلیل مولٰنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، اور ارواح ثلاثہ کی روایتوں کے راوی عمومی حضرت امیر شاہ صاحب سے ذاتی واقفیت جو نہیں رکھتے، وہ تو معذور ہیں لیکن اس ملکوتی صفات ہستی کو جنھوں نے دیکھا اور برتا ہے، وہی جانتے ہیں کہ اپنے بزرگوں کے متعلقہ روایات کے بیان کرنے میں وہ کتنے محتاط اور نزاکت پسند واقع ہوئے تھے، جہاں تک ان کے امکان میں تھا، عموماً ان ہی الفاظ کے دہرانے کی کوشش کرتے تھے جو ان بزرگوں سے اُن کے کانوں تک پہنچے تھے، یہی چوتھی روایت یعنی کعبہ کی چھت والے خواب کو بیان کر کے خانصاحب مزید یہ اضافہ بھی کرتے تھے کہ

"میں نے یہ خواب اور اس کی تعبیر خود مولٰنا نانوتوی سے سنی ہے۔" ص۱۶۹

یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ

"اس وقت میں اکیلا تھا اور پاؤں دبا رہا تھا، اور مولٰنا نے بے تکلف مجھ سے اپنا نام لیا۔"[لہ]

بہر حال یہ اور اسی قسم کے دوسرے قرائن و شواہد کی روشنی میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر قدس اللہ سرہ العزیز ناسوتی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے وہ سب کچھ ہو چکے تھے، جس کا تفصیلی معائنہ اسی زندگی کی مختلف منزلوں میں دنیا کو کرایا گیا، بالفاظ دگر پیدا ہو کر وہ بڑے نہیں بنے تھے۔ بلکہ پیدائش سے پیشتر جن بڑائیوں سے وہ سرفراز ہو چکے تھے، پیدا ہونے کے بعد ان ہی بڑائیوں کا صرف ظہور ہوا تھا، انابت کے بعد ہدایت کی نعمت سے

لہ اس اضافہ کی ضرورت خاں صاحب کو اس لئے ہوئی تھی کہ حضرت نانوتوی کا عام دستور جیسا کہ خانصاحب ہی نے بیان کیا ہے، یہ تھا کہ اس قسم کے خوابوں کا ذکر عام محفلوں میں اگر آجاتا تو بجائے اپنے نام کے فرماتے کہ ایک شخص نے ایسا خواب دیکھا تھا ۱۲

جو نوازے جاتے ہیں، اور انابت کے بغیر ہی جنھیں چن لیا جاتا ہے، یعنی اجتباء کا منصب جلیل جنھیں عطا ہوتا ہے، خود ہی بتائیے، دونوں میں فرق ہی کیا رہے گا، اگر یہ نہ مانا جائے جس کے ماننے پر حقائق و واقعات نے مجھے مجبور کیا ہے۔

اس موقعہ پر اجتبائی امتیاز کو تقدیر کے مسئلہ سے مخلوط نہ کیا جائے، تقدیر کے ذیل میں اگر اس کو داخل کیا جائے گا تو اجتبائیوں کا امتیاز ہی کیا باقی رہے گا، قانون تقدیر کا مطلب تو یہ ہے کہ جو کچھ ہونے والا ہے، بڑا ہونے والا ہے، یا چھوٹا ہونے والا، سب ہی کے متعلق ہونے سے پہلے جانا جاتا ہے کہ وہ کیا ہوگا۔ یہ علم ہے جس میں عالم کا کمال ہی یہ ہے کہ اسکا علم معلوم کے عین مطابق ہو، اسی لئے کہتے ہیں کہ تقدیر میں عالم اپنے معلوم کا تابع ہوتا ہے، اور اجتباء تو حکم ہے، جس میں محکوم حاکم اور حاکم کے حکم و مرضی کا تابع ہوتا ہے[ل]۔

خیر میں کن جھگڑوں میں پھنس گیا، عرض یہ کر رہا تھا کہ خواہ دوسروں کی تشفی و تسلی ہوئی ہو یا نہ ہوئی، لیکن مجھ تک جو معلومات پہنچی ہیں، اضطراراً اسی نتیجہ تک انھوں نے مجھے پہنچا دیا ہے کہ جس غنی عن العالمین کی داد قابلیت کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ بلکہ ہر قابلیت اس کی داد و دہن کے ساتھ مشروط ہے، اسی نے بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کو منصب اجتباء سے سرفراز فرما کر پیدا کیا تھا، اسی اجتبائی شان کے کچھ آثار و لوازم تو وہ تھے جن کا ذکر آپ سن چکے

ل انشاء اللہ اس مسئلہ کی تفصیل سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے حکیمانہ نظریات اور دین کی عارفانہ تشریحات کے باب میں کی جائے گی، اس موقعہ پر شبہ کا ازالہ ضروری تھا، اس لئے مسئلہ کی طرف اجمالی اشارہ کر دیا گیا، لوگوں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ایسی باتیں مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور قول کہ کنت نبیا و آدم منجدل بین الماء و الجسد (او کما قال) یعنی میں نبی تھا اسی زمانہ میں جب آدم بھی اس وقت پانی اور ڈھانچہ کے درمیان پڑے ہوئے تھے، اگر اس کو تقدیر کے ذیل میں شمار کیا جائے گا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ہی کیا باقی رہے گا، تقدیر کے لحاظ سے تو ہر مچھر اور ہر مکھی یہ کہہ سکتی ہے کہ میں اسی وقت مچھر اور مکھی بن چکی تھی، جب آدم ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، کیونکہ تقدیر الٰہی کی رو سے تو کائنات کا ہر ذرہ یہی حیثیت رکھتا ہے، یہی اصولی فرق اجتباء اور تقدیر میں ہے، مقام اجتباء ایک لاہوتی امتیاز ہے جس سے خاص بندوں کو نوازا جاتا ہے، اور تقدیری بات تو عام ہے ۱۲

وہ عالم بھی بنے، کروڑہا کروڑ انسانوں کو ان کی امامت پر فخر اور ناز بھی ہے، ان کی جاری کی ہوئی نہریں ہندو بیرون ہند کی علمی وادیوں میں دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ کھیل بھی رہی ہیں، ان سے اسلامی دین کی وہ تشریحی شکل جو امام ابوحنیفہ اور اُن کے ماننے والے ائمہ وعلماء کی جدوجہد کی بدولت صورت پذیر ہوئی، یہ ان کا صدقہ ہے کہ دین کا یہ حنفی قالب شکست و ریخت، ٹوٹ پھوٹ کے خطرے سے ہندوستان میں محفوظ رہا بلاشبہ یہ سب کچھ دیکھا گیا اور دیکھا جا رہا ہے، مگر ہم سب نے تو وقوع کے بعد دیکھا جو کچھ دیکھا۔ لیکن جس نے یہ سب کچھ دکھایا اس نے تو وقوع وظہور سے پہلے بہت پہلے ان سارے تماشوں کو دیکھ لیا تھا، آخر "جذبائیت" کے لئے آپ ہی بتائیے کہ اور کیا دکھایا جاتا۔

اور میرا خیال ہے اور اسی خیال کے ظاہر کرنے کے لئے مجھے ایک طویل تمہیدی گفتگو کرنی پڑی کہ سیدنا الامام الکبیر کے والد ماجد شیخ اسد علی مرحوم جن کا اور جن کی بعض خصوصیات وحالات کا میں ذکر کر رہا تھا، ان کے متعلق اس قسم کی پھیلی ہوئی افواہیں کہ شاید وہ ناخواندہ تھے، یا اسی حد تک نوشت وخواند سے معمولی تعلق رکھتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ ان پر "خواندہ" کے لفظ کا اطلاق کیا جا سکتا تھا۔

یا واقعۃً وہ ایسے دہقانی کسان تھے کہ خود ہل جوتتے تھے، عرض کر چکا ہوں کہ ان افواہوں کی حیثیت اگر بازاری گپوں کی نہیں تو کم از کم سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ غلط عقیدت مندیوں کی یہ پیداواریں ہیں، اور ممالک کا تو حال معلوم نہیں، لیکن ہندوستان کے لوگوں کو نہ معلوم کسی بڑے آدمی کے متعلق اس قسم کی باتوں کے منسوب کرنے میں کیوں مزہ آتا ہے کہ اس کی بڑائیاں حد سے زیادہ گہری پستیوں سے پیدا ہوئیں، بجائے خود جیسا کہ میں کہہ بھی چکا ہوں اگر واقعۃً ایسی صورت پیش آئے اور اس قسم کے واقعات بھی ضرور پیش آتے رہے ہیں، اور آتے رہیں گے حی (زندہ) سے میت (مردہ) اور میت (مرے) سے حی (زندے) کو نکالنے کا قرآنی قانون کائنات کا عام قانون ہے، آذر سے ابراہیم، نوح سے پسر نوح کی پیدائش جب ہو سکتی ہے تو اس دنیا میں

اس کے بعد سب کچھ ہو سکتا ہے، مگر گفتگو کو لذیذ کرنے کیلئے یا جس کے ساتھ عقیدت کا اظہار کیا جارہا ہو، یہ سمجھ لینا کہ بیرونی اضافوں کے بغیر گفتگو ہی میں لذت رہے گی "اور نہ عقیدت مندی کے فرائض سے ہم سبکدوش ہوں گے"، میرے خیال میں یہ بڑی جسارت اور حد سے گذری ہوئی تفریط و بد احتیاطی ہے، مثالاً دیکھئے

دیوبند سے تعلق رکھنے والوں میں شاید ہی کوئی شخص ہوگا جو اس قصے کو مزے لیکر نہیں بیان کرتا، کہ مولانا محمد قاسم کو ایک دفعہ کسی مؤمن بھائی نے اپنے قبیلہ کا آدمی سمجھ لیا، جہاں تک میں جانتا ہوں، اتنی بات تو غالباً صحیح ہے، حضرت مولانا اشرف علی کے ملفوظات قصص الاکابر میں بھی ہے کہ

"ایک مرتبہ مولانا (محمد قاسم) دیوبند سے نانوتہ تشریف لے جارہے تھے ایک جولاہے نے بوجہ سادگی (وضع وقطع) کے اپنا ہم قوم سمجھ کر پوچھا کہ سوت کا آج کیا بھاؤ ہے" مولانا نے جواب دیا کہ بھائی آج بازار جانا نہیں ہوا، وہ جولاہہ کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا"

(الہادی ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ)

مگر ایک دفعہ نہیں بیسیوں بار جن مزید اضافوں کے ساتھ مختلف محفلوں میں اسی قصہ کو میں نے یا دوسروں نے سنا ہے کیا اسی حد پر وہ ختم ہو جاتے ہیں کہا جاتا ہے کہ اسی مغالطہ میں مبتلا ہو کر کہ مولانا کا تعلق قوم مؤمن سے ہے، کسی صاحب نے آپ کو راستہ میں پکڑا اور سر پر گٹھری غالباً کہنے والے گھاس بھی کہتے ہیں لدوا کر دور تک لے گیا، اور بیگار بنے ہوئے مولانا بھی چلے گئے پھر خدا جلنے اور کیا کیا ہوا، شاید جس کے پاس لے گئے وہ آپ کو پہچانتا تھا، بے چارا حد سے زیادہ ذلیل ہوا، وغیرہ وغیرہ

مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں اصل واقعہ کل اتنا ہے جس کا ذکر حضرت تھانوی نے فرمایا ہے، اس پر لذت گوش و زبان کے لئے ماہروں کے یہ اضافے ہیں، عموماً اس قسم کی روایتوں کا نام میں نے "جیونی روایات" رکھ چھوڑا ہے، ضرورت ہے کہ گپ تراشیوں کی اس عادت بد سے لوگوں کو روکا جائے

ان بزرگوں کے واقعی حالات و کیفیات ہی اتنے اثر انگیز، عبرت خیز ہیں، کہ اختراعی اضافوں کی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہتی۔

بہرحال شیخ اسد علی صاحب مولانا کے والد مرحوم کے متعلق صحیح معلومات کی روشنی میں جہاں تک میں پہنچا ہوں وہ یہی ہے کہ ایک ذاکر و شاغل تعبیری بصیرت رکھنے والے باپ کے وہ صاحبزادے تھے، اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل دہلی کے علمی حلقوں ہیں کی، اور زندگی کا ایک حصہ دہلی کی متمدن مجلسوں میں ان کا گذرا تھا، سہارنپور کے متمول، صاحب علم وکیل کے وہ داماد تھے اسی لئے میرا خیال ہے کہ دنیاوی ترقیوں کی راہیں ان پر کھلی ہوئی تھیں، مگر خلاف توقع یہ چشم دید شہادت سوانحمری قدیم کے مصنف امام ہمیں سناتے ہیں، اور عجیب الفاظ میں سناتے ہیں، یعنی لکھتے ہیں کہ

"مگر حال (شیخ اسد علی صاحب) کا ایسا تھا کہ گویا علم سے کچھ مناسبت ہی نہیں رکھتے" ص ۲۴

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ شیخ اسد علی صاحب پر بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خاص قسم کا کوئی حال طاری تھا، ایسا حال جس نے دلی کے سارے لکھے پڑھے کو ان کے لئے کچھ ایسا بنا دیا کہ گویا انھوں نے کچھ نہیں پڑھا تھا۔

"جو کچھ لکھا پڑھا تھا نیاز نے اسے ایک دم بھلا دیا"

بعضوں پر تو یہ حال کسب و کوشش کے بعد طاری ہوتا ہے، لیکن اجتبائی قانون کے تحت جو چنے جاتے ہیں

(حاشیہ متعلقہ ص ۱۳۸) لـه یہ مشہور بزرگ و عالم حضرت ملا جیون رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی کی طرف اشارہ ہے، ملا صاحب مرحوم کو اورنگ زیب عالمگیر کا استاد قرار دے کر ان کے عقیدت مندوں نے خرافات کا ایک طومار تیار کر دیا ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گیا ہے ان کی معصومیت کے بیان کو رنگین کرنے کیلئے یہ ساری داستانیں جہاں تک میرا خیال ہے، تراشی گئی ہیں، ورنہ جس نے ملا صاحب کی کتابیں نور الانوار و تفسیرات احمدیہ وغیرہ پڑھی ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کی کتابوں کے لکھنے والے کی طرف اتنی احمقانہ باتوں کا انتساب کسی حیثیت سے بھی صحیح ہو سکتا ہے، میرے نزدیک تو عالمگیر کے استاد ہونے کا قصہ بھی فرضی ہے، تفسیرات احمدیہ کے مقدمہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہی اس خیال کی تردید کے لئے علاوہ دوسرے دلائل کے کافی ہے ۱۲

ان کی ساری چیزیں غیر کسبی اور اجتبائی رنگ ہی میں رنگین ہوتی ہیں، جو چنا گیا تھا اور مقام اجتبار سے جسے سرفرازی بخشی گئی تھی، وہ آ رہا تھا، اسی کی آمد آمد کی یہ تمہیدی شعاعیں تھیں، گویا طلوع خورشید سے پہلے تباشیر صبح کی حیثیت ان امور کی ہوتی ہے، اور اس کا تجربہ پہلی دفعہ نہیں بلکہ "اجتبائی ہستیوں" کے ظہور سے پیشتر عموماً کیا گیا ہے، اصطلاحاً ان ہی چیزوں کا نام "ارہاص" ہے، ذرا خیال تو کیجئے، شیخ اسد علی صاحب کے اس "حال" کو ایک طرف علمی زندگی گذارنے کے بعد ان کی نفس کی باطنی اور اندرونی حالت تو ایسی ہو گئی کہ دیکھنے والا یہ باور کرنے پر مجبور ہوتا تھا کہ گویا ان کو علم سے مناسبت بھی نہیں ہے، اس کے متعلق تو شاید یہ خیال بھی گذر سکتا ہے کہ علمی مشغلوں سے علیحدگی کی وجہ سے ممکن ہے کہ ان کا یہ حال ہو گیا ہو، مگر ہم اس کی توجیہ کیا کریں کہ تہذیب و شائستگی کے سب سے بڑے مرکز دہلی کی سوسائٹیوں میں پرورش پانے والے نوجوان کے متعلق مصنف امام ہی کی یہ شہادت ہے کہ باطن ہی نہیں۔ بلکہ اسی باطن کے مطابق شیخ اسد علی صاحب کے "ظاہر" کی حالت بھی یہ ہو گئی تھی کہ ان کے

"عادات، اور ڈھنگ موٹے قصبات کے سے تھے"

شہری ماحول میں مہینے دو مہینے نہیں بلکہ سالہا سال تک زندگی گذارنے کے بعد اس قسم کا انقلاب قلب کی غیر معمولی شکستگی اور انکسار کے بغیر عام حالات میں آسان نہیں ہے جس کی سب سے بین اور روشن دلیل یہ ہے، خود ان ہی مصنف امام کی چشم دید گواہی اسی کے ساتھ یہ بھی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ ایک طرف تو شیخ اسد علی صاحب کا یہ حال تھا، جو بیان کیا گیا، لیکن ان ہی شیخ اسد علی کی زندگی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ

"نہایت ہی صاحب مروت واخلاق، کنبہ پرور، مہمان نواز، نمازی، پرہیز گار تھے" ص۲۵

فدا "نہایت ہی" کے تاکیدی الفاظ کو پیش نظر رکھئے، اور اسی کے ساتھ اس کا بھی خیال کیجئے کہ یہ بیان کسی شاعر، یا افسانہ نگار کا نہیں، بلکہ وقت کے قطب، صاحب دل، امام علامہ کے ذمہ دار قلم کا یہ تحریری وثیقہ ہے، گو یاد یکھنے میں یہ چند الفاظ ہیں مگر تعلق مع اللہ وتعلق مع الخلق دونوں کے اعتبار سے فضائل و کمالات کی کونسی قسم ہے، جو ان ہی مختصر الفاظ میں سمٹی ہوئی نظر نہیں آ رہی ہے۔

عام مخلوق کے ساتھ "مروت واخلاق" اقربا کے ساتھ "کنبہ پروری" مسافروں اور اجنبیوں کے ساتھ "مہمان نوازی" کے فرائض کی تکمیل اعلیٰ پیمانے پر کرتے ہوئے، خالق کے دربار کی پنجوقتہ حاضری، اور اس کے نشان زدہ حدود سے آگے بڑھنے میں "پرہیز" یا "تقویٰ" کے اصول پر قیام، دونوں سلسلوں میں "غایت ونہایت" تک پہنچتے ہوئے ہونے کی گواہی جس کے متعلق ایک شاہد عدل ثقہ و حجت دے رہا ہو، ہم اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتے ہیں کہ دلی کے حاصل کئے ہوئے سرمایہ سے ان ہی چیزوں کو اس نے چھوڑ دیا تھا، جو چھوڑنے ہی کے قابل تھیں، اور باقی وہی رہ گئی تھیں جو باقی رہنے ہی کی مستحق تھیں۔

اور یہ جو کچھ ہو رہا تھا، خود شیخ اسد علی صاحب کو اس کی خبر ہو، یا نہ ہو، مگر بظاہر قدرت کے "قانون اجتبا،" کا یہ عام اقتضار تھا، وہ اپنی صدی کی غیر معمولی "انقلابی ہستی" کے امین تھے، اور عرض کر چکا ہوں کہ پہلی دفعہ نہیں، بلکہ اس قسم کی انقلابی ہستیوں کے امینوں کے متعلق اسی قسم کے آثار کا عموماً مشاہدہ ہر زمانہ میں کیا گیا ہے۔

دراصل ان ہی معلومات، اور غیر مشتبہ شہادتوں کی روشنی میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ شیخ اسد علی مرحوم کے متعلق اس قسم کے عام لطیفے جو زبان زدعوام ہیں کہ مولانا نانوتوی کے دینی رجحانات کی شدت کو دیکھ ان کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس بات کی شکایت کی کہ ہمارا لڑکا عام دنیا داروں کے لڑکوں کی طرح "کماؤ" نہیں ہے، یا موروثی جائداد پر نظر ثانی کا ارادہ حضرت نانوتوی نے جب فرمایا تو ان کے والد نے ان کو "گھر کھوؤ" قرار دے کر حاجی صاحب سے گلہ کیا، یہ یا اسی طرح اور بھی جو باتیں بیان کی جاتی ہیں، سننے والوں کو چاہئے کہ سننے کے ساتھ انہیں تسلیم نہ کریں، بلکہ دوسرے حالات اور واقعات سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے کہ ان لطائف کا انتساب شیخ صاحب مرحوم کی طرف کس حد تک صحیح ہو سکتا ہے۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ ان افواہی لطائف کی سند کیا ہے، جہانتک میری جستجو اور تلاش کا تعلق ہے، ان کی نوعیت افواہی روایتوں سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی، برعکس اس کے

شیخؒ صاحب کی پرہیزگاری، دینداری، اخلاق و مروت، جود و سخا کا تحریری وثیقہ دارالعلوم دیوبند کے صدر اول حکیم الامت تھانوی کے استاذ مولنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ آپ کے سامنے میں پیش کر رہا ہوں، ایک ایسے ثقہ و حجت و امام کی چشم دید عینی شہادت کے مقابلہ میں ان افواہی روایتوں کی وقعت ہی کیا رہ جاتی ہے، زیادہ سے زیادہ ان روایتوں کی بنیاد پر اگر کسی حیثیت سے ان کی صحت تسلیم بھی کر لی جائے تو بھی کہا جا سکتا ہے کہ جائز ذرائع سے آمدنی کی توفیر کا خیال وہ بھی رکھتے تھے، خصوصاً کنبہ پروری مہمان نوازی کا جذبہ جس پر مستولی ہو، عام حالات میں اس قسم کا خیال ان کے متعلق خلاف توقع نہیں ہو سکتا، گھر میں ان کے ایک ہونہار لڑکا پیدا ہوا تھا، امید بندھی ہو گی کہ توفیر آمدنی کی اس حال میں اس سے دلچسپی مگر مولنا نانوتوی نے "جائز" کے دائرے کو بھی تنگ کر کے مالا بدمنہ یا ناگزیر ضروریات ہی کی حد تک اپنی معاشی جد و جہد کو چونکہ محدود فرما لینے کا عزم بالجزم کر لیا تھا جس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ آئے گی، تو یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے اس حال سے شیخ صاحب کو گونہ گرانی محسوس ہوئی ہو، جس کا اظہار حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے انھوں نے بے تکلفی کی وجہ سے کبھی کر دیا ہو، اسی طرح موروثی جائداد کی "شرعی تقسیم" کے ارادے سے سرگرانی کا جو قصہ ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اگر مان بھی لیا جائے کہ اس کی کچھ اصلیت تھی، تو یہ سوچنے کی بات ہے کہ تین پشتوں سے جیسا کہ گذر چکا شیخ صاحب کے خاندان میں ایک مورث کا وارث بھی ایک ہی ہوتا چلا آرہا تھا، اس لئے قریب کی پشتوں میں بے احتیاطی کی گنجائش ہی نہ تھی، یہ ممکن ہے کہ تین چار پشت آگے "قاعدہ معروفہ" کے مطابق لڑکیوں کو محروم کر کے جائداد پر قبضہ کر لیا گیا ہو، ایسی صورت میں شیخ صاحب جیسے آدمی کے متعلق یہ توقع دشوار ہے کہ پشتہا پشت کی ان گئی گذری بھولی بسری باتوں کا خیال ان کو ہوتا، خصوصاً یہ اس زمانہ کی بات ہے جب ہندوستان کی حکومت بھی انقلاب کا شکار ہو چکی تھی۔

بجائے دارالاسلام کے اب اس ملک میں غیر اسلامی حکمرانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہو چکا تھا،

ایسی صورت میں اچانک دینی ذمہ داریوں کے احساس کی جس شدید ذکاوت و نزاکت کا ظہور ان کے صاحبزادے (حضرت نانوتوی) میں ہوا، اور عملی طور پر پشتہا پشت کے ان ختم شدہ قصوں کے جگانے پر جب وہ آمادہ ہوئے ہونگے، تو شیخ صاحب کو ان کے طرز عمل سے کچھ گرانی اگر پیدا ہوئی ہو، تو یہ خلاف توقع گرانی نہیں ہو سکتی، مگر اسی کے ساتھ بالاتفاق یہ بھی جب بیان کیا جاتا ہے کہ بالآخر نظر ثانی کی جو تجویز ان کے صاحبزادے نے پیش کی تھی، شیخ صاحب نے اس تجویز کو صرف مان ہی نہیں لیا، بلکہ اپنی زندگی ہی میں اپنی مملوکہ جائداد کے ٹکڑے، پرچے تکہ بوٹی کرانے پر راضی ہو گئے، اور یوں مقبوضہ جائداد کے معقول حصے سے بخوشی دست بردار ہو گئے، تو کیا یہ واقعہ خود ان کی اسی پرہیزگاری کی دلیل نہیں ہے، جس کی گواہی مصنف امام نے دی ہے، حالانکہ اپنے لڑکے سے وہ کہہ سکتے تھے کہ تم کو جو کچھ کرنا ہے میرے مرنے کے بعد اس جائداد کے مالک و قابض ہونے کے بعد کیجو، مگر میں جب تک زندہ ہوں، جائداد کا شرعاً و قانوناً میں مالک ہوں، تم کو میری جائداد پر نظر ثانی کرانے کا کیا حق ہے، خدا نخواستہ اگر ان کا دینی جذبہ اسی قدر مردہ ہوتا جو ان افواہی روایات کا اقتضار ہے، تو غالباً وہ یہی کرتے، اور مولانا نانوتوی کم از کم قانوناً ان کو نظر ثانی کے اس قصے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے، اسی لئے ان روایتوں پر جہاں تک میں خیال کرتا ہوں غور کرنے کے بعد شیخ صاحب کے متعلق آدمی اسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے، جس کا علم مصنف امام کی مذکورہ بالا تحریری شہادت سے ہو رہا ہے۔

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ ایک بڑے بیٹے کے شیخ صاحب اتنے بڑے باپ تو یقیناً نہ تھے جتنی بڑائیاں ان کے صاحبزادے کو قدرت کی طرف سے ارزانی ہوئی تھیں، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ اتنے چھوٹے بھی نہ تھے کہ حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ جیسے بیٹے کے پدر بزرگوار ہونے کا انتساب ان کی طرف کسی حیثیت سے موجب شرمندگی ہو، بلکہ چشم بینا کے سامنے تو بیٹے کی بڑائیاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود باپ کے اندر سے جھانک رہی ہیں، حضرت نانوتوی کی طرف تقریباً تواتر کی شکل میں یہ الفاظ روایتوں میں عموماً منسوب

کئے گئے ہیں، فرمایا کرتے تھے۔

"اسی علم نے خراب کیا، ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا" ارواح ص۲۰۵

اسی ملفوظا کا ذکر کرتے ہوئے حضرت تھانوی یہ بھی اضافہ فرماتے تھے کہ حضرت نانوتوی نے فرمایا

"ایسا گم ہوتا کہ کوئی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا" (قصص الہادی ص۳۱ ماہ جمادی الاولیٰ)

اس کیفیت میں اور شیخ اسد علی صاحب کے متعلق آپ جو یہ سن چکے کہ لکھنے پڑھنے کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو ایسا بنا لیا تھا کہ بقول مصنف امام

"کہ گویا علم سے کچھ مناسبت ہی نہیں رکھتے" ص۲۴

روشنی کی ان دونوں کرنوں میں کیا فرق ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ شیخ اسد علی صاحب حالانکہ اپنے فرزند سعید کی مقدرہ بڑائیوں کے ظہور کے بعد بھی زندہ رہے اور کافی مدت تک زندہ رہے، لیکن بڑے بیٹے کے باپ بن جانے کے بعد بھی روپوش رہنے کی کوشش کو انھوں نے مسلسل جاری رکھا، اسی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ ان مختصر معلومات کے سوا جن کا ذکر کیا گیا، اور کوئی بات ان کے متعلق نہ معلوم ہو سکی۔

اور یہ حال تو حضرت نانوتوی کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، باقی آپ کی والدہ ماجدہ طیب اللہ ثراہا، سو بجز اس کے کہ سہارنپور کے ایک متمول و معزز و محترم وکیل شیخ وجیہ الدین نانوتوی کی وہ صاحبزادی تھیں، باوجود تلاش کے اور کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ ان کے اسم گرامی کا بھی ذکر کتابوں میں نہیں کیا گیا ہے، اور مخدرات اسلامی کے لحاظ سے یہ بات قابل تعجب بھی نہیں ہے، صرف حضرت والا کے حفید سعید مولانا محمد طیب صاحب کی ایک تحریری یادداشت میں ایک واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے جس میں والدہ ماجدہ کا ذکر آ گیا ہے، اور واقعہ بھی ایسا ہے کہ "اجتبائیت" کا جو دعویٰ خاکسار کی طرف سے پیش کیا گیا ہے جب تک اس کو تسلیم نہ کر لیا جائے عام حالات میں شاید ہی سننے والے اس کو باور کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ مولانا محمد طیب سلمہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت نانوتوی کی عمر غالباً پانچ چھ

سال کی تھی، مولانا کے نانا یعنی مولوی وجیہ الدین صاحب وکیل نے عید کے لئے ایک عمدہ جوڑا سلوا کر اپنی صاحبزادی کے پاس بھیجا کہ بچے کو بھی جوڑا عید میں دینا، لکھا ہے کہ اس جوڑے کو دکھا کر آپ کی والدہ نے فرمایا

"ایسا جوڑا عید میں کسی کے پاس نہ نکلے گا۔"

اب یہی سننے کی بات ہے، بچہ کی عمر پانچ چھ سال کی ہے، بیان کیا گیا ہے کہ اس فقرے کے سننے کے ساتھ دیکھا گیا کہ حضرت نانوتوی جو اس وقت صرف پانچ یا چھ سال کے "قاسم" ننھے "رو پڑے" اور کہا کہ میں ایسے قیمتی کپڑے پہنوں گا؟ مجھ جیسے پر ایسا اچھا جوڑا پھبے گا؟ حضرت کی "اجتبائی شان" کو جب تک تسلیم نہ کر لیا جائے؟ خود ہی سوچئے کہ ایک بچے سے اس ردعمل کی کسی حیثیت سے بھی توقع کا امکان ہے، بچوں میں عموماً مقابلہ اور تفرد کا غیر شعوری جذبہ زیادہ نمایاں ہوتا ہے لیکن تفرد وامتیاز کا خود خیال تو کیا آتا خیال دلانے پر بجائے اترانے اور اکڑنے کے آپ دیکھ رہے ہیں، اسی خیال نے ان کو رلا دیا، سچ تو یہ ہے کہ اسی "معصوم گریہ" میں مستقبل کا پیش آنے والا "خندہ" مسکرا رہا تھا، مگر والدہ صاحبہ کا دھیان اس "بشریٰ" کی طرف نہ گیا، جو مژدہ سنا رہا تھا کہ اے خاتون اسلام مبارک ہو تجھے ایسا بچہ جو دوسروں کو بلند کرنے کے لئے خود پستی کی زندگی اختیار کرے گا، اور دوسروں کو ہنسانے کے لئے خود روئے گا، مگر دنیا کے عام بچوں پر قیاس کر کے اپنے بچے کی اس حرکت پر بیان کیا جاتا ہے کہ ان کو غصہ آیا اور فرمانے لگیں۔

"جب کوئی اچھی چیز آتی ہے، تو تیرے یہاں رونا ہی پڑ جاتا ہے، کبھی خوش ہو کر اچھا کپڑا نہیں پہنا، اچھا کھانا نہیں کھایا۔"

لکھا ہے کہ والدہ ماجدہ کے ان الفاظ پر مولٰنا اور زیادہ روئے، اور رونے ہی پر بس نہیں کیا، بلکہ کسی کام سے دیکھا کہ والدہ کہیں چلی گئی ہیں، تو جیسا کہ مولٰنا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ مولٰنا نے

"چپکے سے جا کر جوڑے کو چولھے میں رکھ دیا جو جل کر راکھ ہو گیا۔"

اس قصے کو نقل کر کے مولانا طیب نے یہ بھی آخر میں ارقام فرمایا ہے کہ

"مزاج کی یہ افتاد ابتدا ہی سے تھی کہ تکاثر و تفاخر کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے"

میں پوچھتا ہوں کہ "اجتبائیت" کے دعوے کے غیر شعوری اعتراف کے سوا مولانا کے اس بیان کو اور کیا قرار دیا جائے، اور انھوں نے تو اپنے جد امجد کو دیکھا نہیں تھا سنی سنائی باتوں نے اس نتیجہ تک ان کو پہنچا دیا ہے، مگر حضرت والا کی والدہ ماجدہ کی طرف مذکورہ بالا الفاظ جو منسوب کئے گئے ہیں یعنی کبھی خوش ہو کر اچھا کپڑا نہیں پہنا، اور اچھا کھانا نہیں کھایا اگر واقعی یہ ان ہی کے الفاظ ہیں، تو حضرت کے ایام طفولیت کی زندگی کے ایک خاص پہلو کی گویا یہ ایک مکمل روداد ہے، جس میں "اجتبائی تجلیوں" کی روشنی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا، ورنہ یہ دوامی عادت کسی بچے کی عام حالات میں کیا قابل تصور ہو سکتی ہے، مگر جو پیدا ہونے کے بعد نہیں بنتا، بلکہ بنا بنایا ہوا ہی وہ پیدا کیا جاتا ہے، اس قسم کی اجتبائی اور انتخابی ہستیوں کی عام حالت یہی ہوتی ہے۔

بہر کیف آپ کی والدہ ماجدہ کے متعلق یہی ایک روایت ہے جس میں ان کا ذکر بڑی معلومات کی حد تک ملتا ہے۔

مصنف امام کے حوالے سے یہ بات تو گذر چکی کہ علاوہ ایک ہمشیرہ صاحبہ کے مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے "بھائی پیدا ہوئے مگر لڑکپن میں مر گئے"۔ مگر اس کا پتہ نہ چل سکا کہ ان بھائیوں اور بہن میں مولانا نانوتوی کی بڑے یا چھوٹے ہونے کے اعتبار سے کیا حیثیت تھی، بہ ظاہر جس کی تائید بعض قرائن سے ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ہمشیرہ صاحبہ جن کا ذکر عقد بیوگان کی مہم کے سلسلے میں انشاء اللہ آیندہ آئے گا، شاید عمر میں آپ سے بڑی تھیں۔

تاریخ ولادت اب کچھ بھی ہو اپنے بہن بھائیوں میں آپ بڑے ہوں یا چھوٹے اتنی بات یقینی ہے، کہ ۱۲۴۸ھ ہجری کے کسی مہینہ میں بہ مقام نانوتہ آپ کی ولادت باسعادت سے ظلمت کدۂ ہند منور و روشن ہوا، مہینہ کے متعلق اتنے اختلاف ہیں کہ عیسوی حساب سے ہجری کا یہ سن

۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۳ء دونوں میں واقع ہو سکتا ہے۔

آئندہ جن بڑائیوں کے ساتھ آپ دنیا کے سامنے نمایاں ہوئے، ظاہر ہے کہ ولادت کے وقت ان کا اندازہ کون کر سکتا تھا، اور یہ بات دنیا کے اکثر بڑے آدمیوں کے متعلق عام ہے، میں تو اسی کو غنیمت خیال کرتا ہوں کہ حضرت والا کی ولادت کا سال لوگوں نے یاد رکھا، ورنہ کتنی تاریخی ہستیاں ہیں جنکی وفات کی تاریخ کے یاد رکھنے والوں کی تعداد کروڑوں سے متجاوز ہی ہو، مگر ان ہی کی پیدائش کی صحیح تاریخ کا بتانے والا ایک آدمی بھی نہیں ملتا۔

مگر تعجب ہوتا ہے کہ حضرت والا کے لئے تاریخی نام کے نکالنے کی جب کوشش کی گئی، عرض کر چکا ہوں کہ پانے والوں نے "خورشید حسین" کے حروف کی ابجد کے حساب سے ۱۲۴۸ھ میزان پائی، یہی آپ کا تاریخی نام تجویز کیا گیا۔ اپنی بعض تحریروں میں حضرت نے اپنے اس تاریخی نام کا تذکرہ بھی فرمایا ہے، مشہور نام کا کسی وقتی مصلحت کی وجہ سے کبھی اخفاء اگر مقصود ہوتا، تو بجائے "محمد قاسم" کے فرمایا کرتے، میرا نام "خورشید حسین" ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرفاء نانوتہ میں بچوں کی ولادت کی تاریخ کو کسی قسم کی اہمیت ضرور حاصل تھی، مصنف امام نے بھی سوانح قدیم میں حضرت کے اس تاریخی نام کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً یہ بھی لکھا ہے کہ خود ان کا نام "منظور احمد" رکھا گیا تھا، اور اسی کے ساتھ اس کی بھی تصریح انھوں نے کی ہے کہ "بندہ کی پیدائش صفر ۱۳، ۱۲۴۹ھ کی ہے۔"

اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ پیدائش کے سال وماہ کے یاد رکھنے کا دستور نانوتہ کے شیوخ میں مروج تھا، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر میرا ذہن تو کچھ ادھر بھی جاتا ہے کہ حضرت والا کا عام مشہور نام "محمد قاسم" جو رکھا گیا تھا، یہ محض کوئی اتفاقی واقعہ غالباً نہ تھا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ صدیقی شیوخ کا یہ خانوادہ جو نانوتہ میں آباد ہوا تھا، اپنے شجرۂ نسب کو محمد بن ابی بکر الصدیق کے صاحبزادے "قاسم بن محمد" پر ختم کرتا تھا، میں یہ مانتا ہوں کہ ہندوستان کے قصباتی مسلمانوں کے تمام حالات کو دیکھتے ہوئے یہ دعوے شاید خلاف توقع

ہوگا کہ اپنے مورث اعلیٰ "قاسم بن محمد" کے حالات، اور ان کی علمی و دینی خصوصیات سے نانوتہ کے شیوخ کما حقہ واقف[1] تھے۔ اور اپنے ان ہی تاریخی معلومات کی بنیاد پر شیخ اسد علی صاحب نے خاندان کی اس مرکزی ہستی کے نام پر اپنے صاحبزادے کا نام "محمد قاسم" رکھا ہوگا۔

مگر "فیوض قاسمیہ" کے نام سے حضرت والا کے بعض مکاتیب کا ایک مجموعہ جو شائع ہوا ہے، ان ہی میں ایک مکتوب گرامی حضرت محمد بن قاسم کے متعلق بعض ایسی نادر غیر مشہور معلومات پر مشتمل ہے، کہ اپنی حد تک میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج تک تاریخ کی کسی بڑی یا چھوٹی کتاب میں یہ چیزیں باوجود تلاش کے مجھے نہیں مل سکی ہیں۔

مولانا نے اس مکتوب میں ارقام فرمایا ہے، کہ یزدجرد شاہ ایران کی شہزادی "شہر بانو" جو سیدنا امام زین العابدین کی والدہ ماجدہ تھیں، ان کے سوا ماہ بانو، اور مہر بانو نامی یزدجرد کی دو شہزادیاں اور بھی تھیں، جن میں ایک "قاسم بن محمد" کی والدہ تھیں طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قاسم بن محمد کی والدہ کا نام "ماہ بانو" تھا۔

اس میں شک نہیں کہ یزدجرد کی ان تینوں شہزادیوں کا ذکر بعض مورخین نے اپنی کتابوں میں بھی کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان میں ایک تو امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور باقی دو شہزادیاں خلیفہ اول کے صاحبزادے محمد بن ابی بکر اور خلیفہ دوم کے صاحبزادے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سپرد کی گئیں، لیکن جہاں تک میری تلاش کا تعلق ہے، "شہر بانو" کے نام کی تصریح تو کتابوں میں کی گئی ہے، مگر "ماہ بانو" اور "مہر بانو" یہ دونوں نام پہلی دفعہ حضرت والا کے اسی

[1] قاسم بن محمد کے تفصیلی حالات طبقات ابن سعد میں پڑھے جا سکتے ہیں، والد کی شہادت کی وجہ سے بچپن ہی سے اپنی پھوپھی ام المومنین صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آغوش تربیت میں انکی پرورش ہوئی، علم و فضل میں ان کا پایہ کتنا بلند تھا اس کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ عہد تابعین میں مدینہ کے فقہاء سبعہ کے ایک رکن رکین یہ بھی تھے، سیرت کردار، دل و دماغ کی بلندی کیلئے یہی کافی ہے کہ بنی امیہ کے لوگوں نے عمر بن عبد العزیز کو جب زیادہ پریشان کیا تو انہوں نے دھمکی دی تھی کہ مدینہ جا کر خلافت کو مسلمانوں کی شوریٰ کے سپرد کر دوں گا، اور فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے سب سے بڑے حق دار قاسم بن محمد ہیں۔ دیکھئے طبقات ۱۲

مکتوب میں فقیر کی نظر سے گذرے، اسی طرح اسی مکتوب میں ایک خبر آپ نے یہ بھی دی ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ "قاسم بن محمد" امام جعفر صادق کے نانا بھی تھے۔ (فیوض قاسمیہ ص۱۶)

میں قطعی طور پر تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت والا تک اپنے مورث اعلیٰ قاسم بن محمد کے متعلق یہ نادر غیر مشہور معلومات کن ذرائع سے پہنچی تھیں، لیکن عام مشہور و متداول تاریخی کتابوں میں ان کا نہ ہونا، نیز اسی کے ساتھ اس کو بھی اگر پیش نظر رکھ لیا جائے، کہ "تاریخ" کے فن سے حضرت والا کے مطالعہ کا چنداں خصوصی تعلق بھی چونکہ نہ تھا، اس لئے بہ ظاہر یہی خیال گذرتا ہے کہ غالباً صدیقی شیوخ کے قاسمی خانوادہ میں اپنے مورث اعلیٰ کے متعلق اس قسم کی معلومات خاندانی طور پر منتقل ہوتی ہوئی چلی آتی تھیں، اور ان معلومات پر اس حد تک بھروسہ کیا جاتا تھا کہ تحریر و تقریر میں حضرت نانوتوی جیسے ذمہ دار بزرگ بھی ان معلومات کے تذکرے میں مضائقہ نہیں محسوس فرماتے تھے[۱]۔۔۔

اگرچہ یہ ایک ضمنی بات تھی، لیکن مقصد میرا اس کے ذکر سے یہ ہے کہ حضرت والا کا اسم گرامی خاندان کے مورث اعلیٰ کے نام پر ان ہی معلومات کی بنیاد پر تفاؤلاً اگر رکھا گیا ہو، جو نانوتہ کے شیوخ میں اباً عن جدٍ منتقل ہوتی ہوئی چلی آرہی تھیں، تو اس ضمنی بات کو پیش نظر

---

[۱] دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ سے حضرت مولٰنا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک قلمی یادداشت ملی ہے جس میں اپنے دست مبارک سے منجملہ دوسری چیزوں کے حضرت والا نے اپنا نسب نامہ بھی درج فرمایا ہے، اس نسب نامہ میں نانوتہ کے صدیقی قاسمی شیوخ کے مورث اعلیٰ مولوی محمد ہاشم سے اوپر کے اسماء بھی بایں ترتیب پائے جاتے ہیں، یعنی محمد ہاشم بن شیخ شاہ محمد بن قاضی طٰہٰ بن شیخ مفتی مبارک ابن امان اللہ بن جمال الدین بن قاضی شیخ میران بڑے بن قاضی مظہر الدین بن نجم الدین ابن نور الدین بن حسام الدین بن ضیاء الدین بن نور الدین بن نجم الدین بن نور الدین بن رکن الدین بن رفیع الدین بن ضیاء الدین بن شہاب الدین بن خواجہ یوسف بن شیخ جلیل بن صدر الدین بن شیخ رکن الدین سمرقندی، بن صدر الدین حاجی بن اسماعیل شہید بن نور الدین قتال بن شیخ محمود بن بہاء الدین بن عبد اللہ بن زکریا بن شیخ نور ابن سراج الدین ابن شیخ سادھن صدیقی ابن وجیہ الدین ابن مسعود بن عبد الرزاق بن قاسم بن محمد بن ابی بکر ابن ابی قحافہ الخ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاندانی نسب نامہ سے نانوتہ کے شیوخ کو کافی دلچسپی تھی۔ نسلاً بعد نسلٍ یہ شجرہ ان میں منتقل ہوتا رہا ۱۲

رکھتے ہوئے اس استبعاد کا غالباً ازالہ ہو جاتا ہے، جو ہندوستان کے قصباتی مسلمانوں کے عام حالات کی بنیاد پر پیدا ہو سکتا ہے۔

بہر حال "محمد قاسم" آپ کا عام نام اور "خورشید حسین" تاریخی نام رکھا گیا، اور اسی چیز نے آپ کے سال ولادت کو کم از کم ہجری سن کے حساب سے غیر مشکوک بنا دیا ہے لیکن ماہ ولادت کا مسئلہ صرف اختلافی نہیں بلکہ تعجب انگیز حد تک اختلافی ہے، مصنف امام جو آپ سے عمر میں صرف چند مہینے چھوٹے تھے، نزدیکی و قرب کے گوناگوں تعلقات کے باوجود انھوں نے اس سلسلہ میں رمضان، شعبان، ربیع الثانی، جمادی الثانی، محرم ان پانچ مہینوں کی طرف آپ کی ولادت کی تاریخ کو مختلف اقوال کی بنیاد پر منسوب کیا ہے، حاشیہ میں لکھا ہے کہ ان کی یاد کے مطابق ربیع الثانی یا جمادی الثانی کا مہینہ تھا پھر دوسروں کے اقوال نقل کر کے آخر میں فرماتے ہیں "اور یہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا"، بھی کے لفظ سے بہ ظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے، صرف آخری قول ہی نہیں، بلکہ اس کے سوا بھی جو دوسرے اقوال بیان کئے جاتے ہیں، قطعی صحت کی ضمانت کسی کے متعلق نہیں لی جا سکتی، اور جب مہینے ہی کا مسئلہ مشتبہ و مشکوک ہے تو تاریخ کا تعین کون کر سکتا ہے۔

پس ماہ ولادت کے مسئلہ میں اسی پر قناعت کرنا چاہئے کہ ۱۲۴۸ھ کے مذکورہ بالا مہینوں میں سے کوئی مہینہ تھا، طرفہ تماشا یہ ہے کہ مہینوں کے نام جو اس سلسلے میں لئے گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اس سال کے ابتدائی، وسطانی، آخری تینوں قسموں کے مہینوں کی ان میں گنجائش[1] ہے۔

---

[1] عملاً ماہ ولادت کے اسی اشتباہ کی وجہ سے عیسوی سن کا مسئلہ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مشتبہ ہو جاتا ہے، یعنی محرم، ربیع الثانی، جمادی الثانی، شعبان کے مہینوں کے حساب سے تو عیسوی سن آپ کی ولادت کا ۱۸۳۲ء قرار پاتا ہے، مگر بجائے ان کے اگر مانا جائے کہ حضرت کی ولادت ماہ رمضان میں ہوئی۔ تو ۱۲۴۸ ہجری کے رمضان کو حساب سے ۱۸۳۳ء میں پڑنا چاہئے۔ گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ تاریخ و ماہ ہی نہیں بلکہ عیسوی سن کے اعتبار سے سن ولادت تک مخفی نہیں تو مشتبہ ضرور ہو گیا۔ گم نام رکھنے کی کوشش میں چاہئے تو اسے کامیابی قرار دے سکتے ہیں ۱۲

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کی زندگی میں کسی کو اس کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی کہ خود آپ سے آپ کی ولادت کی تاریخ دریافت کرے، اور یہ خوف آپ کے اس بیان پر یعنی اپنے کو "ایسا گم کرنا کہ کوئی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا" غالباً مبنی تھا، اس قسم کے سوالات عموماً ان ہی لوگوں کے متعلق کئے جاتے ہیں، جن کے حالات کو قلمبند کرنے کا ارادہ کیا جاتا ہے خصوصاً امتیاز حاصل کرنے والی ہستیوں کے متعلق تو یہ قاعدہ عام ہے مصنف امام نے ماہ ولادت کے اختلاف کو حاشیہ میں درج کرتے ہوئے ابتداء میں جو یہ الفاظ لکھے ہیں کہ

"جناب مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم) کی پیدائش کا سن تاریخی نام سے معلوم تھا۔" ص۲۴

خود اس میں بھی گو نہ اس کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ سن کا علم محض تاریخی نام کی بدولت محفوظ رہ گیا، ورنہ خود مولانا سے پوچھنے پر سن کا مسئلہ بھی اگر موقوف رہتا، تو شاید پوچھنے والے بھی پوچھنے کی ہمت نہ کرتے اور جس سے پوچھا جاتا وہ بھی اس کا شافی جواب غالباً لوگوں کو نہ دیتا۔

حضرت والا کے ایام شیر خوارگی، وعہد طفولیت کے حالات پر عام پردہ جو پڑا ہوا ہے، اس کی بڑی وجہ یہی ہے، ورنہ اجنبائیت کی جس شان کو لے کر آپ پیدا ہوئے تھے، اس کا اقتضاء تو یہی ہے کہ زندگی کی ہر منزل میں اس شان کی خصوصیتوں کا ظہور کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ہوا ہوگا، مگر بجائے واقفیت کے جس چیز کے متعلق لوگوں کو ناواقف بنانے کی مسلسل کوشش کی گئی ہو، ہم جیسے بے خبروں کی رسائی کی آپ ہی بتائیے کہ کیا شکل ہے۔

مصنف امام جو آپ کے ہمجولی بزرگ ہیں انھوں نے بھی عہد طفولیت کے بعض واقعات و حالات کا اگرچہ ذکر کیا ہے، مگر یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں جب ہوش وحواس کی بیداری کی ابتداء کا وقت بچوں کے لئے آجاتا ہے، آغاز بیداری کے اس عہد سے پہلے کی سرگذشت کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوسکا، بجز اس کے کہ آپ کے حلیہ نگاروں میں بعضوں نے لکھا ہے کہ

"قدرے داغ چیچک نمودار تھے" (مذہب منصور ص۱۹۵)

یعنی چہرۂ مبارک پر معلوم ہوتا ہے کہ چیچک کے داغ کے کچھ نشانات تھے قطعی طور پر نہیں

کہا جاسکتا کہ چیچک کا حملہ عمر کی کس منزل میں آپ پر ہوا تھا، مگر عام طور پر چونکہ یہ بچوں ہی کا مرض ہے اس لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ بچپن میں چیچک کی بیماری میں بھی آپ مبتلا ہوئے تھے۔

عید کے موقعہ پر ناناجان کے گھر سے آئے ہوئے جوڑے کو نذر آتش کردینے کے جس قصہ کا ذکر گذرا، ظاہر ہے کہ یہ واقعہ بھی طفولیت کے اسی عہد سے مناسبت رکھتا ہے جب بیہوشی کی منزل سے آپ گذر چکے تھے، اسی طرح حضرت والا کے حفید رشید مولانا طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کی تحریری یادداشت میں ایک اور واقعہ کا تذکرہ جو کیا گیا ہے، حاصل جس کا یہ ہے کہ ان ہی دنوں میں جب حضرت کی طفولیت کا زمانہ تھا، شدید قحط پڑا، نتیجہ یہ ہوا کہ اچھے اچھے گھرانوں میں بجائے گیہوں کے جوار ہی کے استعمال پر لوگوں کو مجبور ہونا پڑا، ان ہی گھرانوں میں شیخ اسد علی آپ کے والد کا گھر بھی تھا، لکھا ہے کہ بجائے گیہوں کے اچانک جوار ہی کی روٹیوں کا سلسلہ آپ کے گھر میں بھی جب شروع ہوا، تو عادی نہ ہونے کی وجہ سے مولانا کچھ اکتا سے گئے، اب والدہ نے خیال دلایا یا خود خیال آیا کہ سہارنپور میں ناناجان کے پاس چلا جاؤں جہاں جوار کی اس مصیبت سے نجات ملیگی، مگر خیال ابھی خیال سے آگے نہیں بڑھا تھا کہ اسی کے ساتھ جیسا کہ مولنا طیب کے الفاظ ہیں،

"یہ خیال دل میں آیا کہ خدا نے جوار ہی دی ہے، اور بعض ایسے شخص ہیں کہ ان کو جوار بھی میسر نہیں، پس خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے، اور صبر سے اسی پر قناعت کرنا چاہیئے۔"

زندگی کے موجودہ عبوری دور میں سکون و قرار کا یہ "گُر" کہ بجائے اوپر کے، زندگی کے احتیاجی شعبوں میں نیچے کی طرف دیکھ کر تسلی حاصل کرنی چاہیئے، یا بریدہ دیکھ کر جیسا کہ سعدی نے لکھا ہے، جوتیوں سے محرومی کی شکایت کا ازالہ ہوگیا، اگر واقعی اسی خیال کے زیر اثر ناناجان کے یہاں جانے کا خیال دل سے آپ کے نکل گیا تھا، تو طفولیت کے جس زمانہ کا یہ قصہ ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو خدائے بخشندہ کی بخشی ہوئی ازلی سعادت اور سلامت فہم کے سوا اور کیا قرار دیا جائے، یقیناً زور بازو سے حاصل کی ہوئی سعادت کا یہ رنگ نہیں ہوتا، قرآنی اصطلاح کی بنیاد پر اسی کا نام میں نے "اجتبائیت" رکھا ہے، اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ قدم قدم پر اسی کے شواہد و بینات

کتنی واضح شکلوں میں سامنے آتے چلے جا رہے ہیں، ورنہ عام بچوں سے کیا اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ بجائے اترانے کے عید کے ایسے جوڑے دیکھ کر وہ رو دیں جسے پہن کر اپنے ہم عمروں میں انہیں امتیاز حاصل ہو سکتا تھا، یا گیہوں کی روٹیوں کو چھوڑ کر جوار ہی کی روٹیوں پر اس لئے صبر کریں کہ بہتوں کو جوار کی روٹیاں بھی میسر نہیں آ رہی ہیں۔

عہد طفولیت کے ان ہی دنوں کے متعلق مصنف امام نے کھیل کود اور دوسرے طفلانہ مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے حضرت والا کی طرف چند ایسی خصوصیتوں کا انتساب کیا ہے کہ آپ کی اجتبائی شان کا سہارا لئے بغیر عام حالات میں بچوں سے اس قسم کی باتوں کی توقع مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے، بلکہ بطور "قدر مشترک"۔ چونکہ عموماً ان تمام خصوصیتوں میں جہانتک میرا خیال ہے زیادہ تر دخل ان ہی "لاہوتی مواہب" یا خداداد نعمتوں کو ہے جن سے جسمانی طور پر آپ سرفراز کئے گئے تھے، اس لئے جی چاہتا ہے کہ حضرت والا کے جسدی خدوخال یا چاہئے تو اسے حضرت والا کا آپ "حلیہ" بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اس کو اسی موقعہ پر درج کر دوں۔

حلیہ مبارک

موقعہ کی مناسبت سے چاہئے تو یہی تھا کہ بچپن میں آپ کی شکل و صورت کی جو نوعیت تھی اسے درج کرتا۔ مگر جن ذرائع سے کام لے رہا ہوں، اس معاملہ میں ان سے کچھ مدد نہ مل سکی، کوئی چارہ اس کے سوا اور نہ تھا کہ معمر ہونے کے بعد دیکھنے والوں نے آپ کو جس حال میں دیکھا تھا، اور اس زمانہ کا جو "قدوسی حلیہ" حضرت والا کا ان کو نظر آیا اسی کو پیش کر دوں شاید اسی حلیہ سے بچپن کے "حلیہ" کا اندازہ کچھ کر لیا جائے۔

حکیم الامت التھانوی قدس اللہ سرہ اپنے استاد مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ یعنی ہمارے "مصنف امام" کے حوالہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ان سے ایک دن کسی نے پوچھا کہ مولانا (یعنی مولانا محمد قاسم) کو یہ کمالات کس طرح حاصل ہوئے، اسی سوال کے جواب میں مولانا محمد یعقوب صاحب نے منجملہ دوسرے اسباب و وجوہ کے یہ بھی فرمایا کہ

"مولانا (محمد قاسم) فطری طور پر معتدل القویٰ اور معتدل المزاج تھے"۔

(قصص الاکابر ص۱۳ ماہ جمادی الاول ۵۷ھ)

جیسا کہ معلوم ہے مولانا محمد یعقوب صاحب باضابطہ فن طب کے بھی ماہر اور استاذ تھے، مولٰنا مرحوم کے بچپن کے ساتھی اور رفیق تھے۔ ان کی یہ شہادت کہ فطری طور پر مولٰنا کے قویٰ اور مزاج دونوں معتدل تھے، میرے نزدیک تو صرف یہی ایک فقرہ حضرت نانوتوی کی جسمانی خصوصیات اور ان غیر معمولی خداداد نعمتوں کے ثبوت کے لئے کافی ہے جن سے جسداً آپ نوازے گئے تھے، اسی کے ساتھ حضرت ہی کے دوسرے طبیب تلمیذ رشید مولانا منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی مرحوم کے ان الفاظ کو ملا لیجئے، انھوں نے لکھا ہے کہ مولٰنا محمد قاسم ان کے استاذ

"میانہ قد، نہ موٹے اور نہ بالکل لاغر تھے"

آگے فرماتے ہیں۔

"چہرہ لانبا، بینی دراز اٹھی ہوئی" (مذہب منصور ص۱۹۷)

سوانح مخطوطہ میں ہے کہ

"پیشانی فراخ، کشادہ ابرو، جلد شفاف و نرم، زبان پتلی، دانت موتی کی لڑی، گردن اونچی، سینہ کشادہ" ص۸

رنگ کے متعلق سوانح مخطوطہ میں تو لکھا ہے کہ "رنگ گندمی" تھا، مگر حکیم منصور علی خاں فرماتے ہیں کہ آپ کا رنگ سانولا تھا! واللہ اعلم، اپنے ان الفاظ سے ان حضرات کی کیا مراد ہے اسی سوانح مخطوطہ میں حضرت والا کے معتمد علیہ خاص حاجی محمد یٰسین مرحوم جو "دیوان جی" بھی کہلاتے تھے، اور حضرت کی خانگی زندگی کے جزو کل کا انصرام ان ہی سے متعلق تھا انشاء اللہ مناسب مقام پر ان کا تفصیلی ذکر کیا جائے گا، ان کے حوالہ سے اسی کتاب میں نقل کیا ہے، دیوان جی کہتے تھے کہ

"جب مولانا حجرۂ (ذکر) سے باہر قدم رنجہ فرماتے توکسی روز چہرہ زرد زعفرانی اور ایسا ہیبت ناک ہوتا کہ دیکھنے والے کو ہیبت اور خوف غالب ہوتا، اور کبھی ایسا سفید و سرخ و صبیح و ملیح ہوتا کہ خواہ مخواہ طبیعت ہنسنے بولنے کو چاہتی" ص۱۵

دیوان جی کے اس بیان سے توکچھ "گندمی رنگ" ہی کی تائید ہوتی ہے، ممکن ہے کہ جس زمانہ میں مولانا منصور علی خاں کو حضرت کے دربار کی حاضری کی سعادت میسر آئی ہو اس زمانہ میں چہرے کے رنگ میں کچھ تغیر پیدا ہوگیا ہو، اور بجائے گندمی کے ان کو آپ کا رنگ سانولا محسوس ہوا ہو، آئندہ اس تغیر کے اسباب کا انشاء اللہ کچھ تذکرہ کیا بھی جائے گا، تاہم اس زمانہ میں آپ کا رنگ مولانا منصور علی خاں کو سانولا نظر آیا تھا، آپ کے اعضاء مبارک کا یہ رنگ بہر حال باقی تھا حکیم صاحب قبلہ ارقام فرماتے ہیں کہ

"ان کی دست بوسی اور قدم بوسی کے واسطے ہاتھ اور پیر کی نزاکت اور خوبصورتی کافی تھی وہ کچھ ایسے موزوں اور دل کش تھے کہ بے اختیار بوسہ دینے کو جی چاہتا تھا"

اپنے شفیق و رؤف استاد کے متعلق آگے ان کے والہانہ الفاظ قلم سے یہ نکل پڑے ہیں۔

"ان کی سی نزاکت اور دلبری کسی معشوق میں بھی نہ دیکھی" ص۱۹۷

مگر اعتدال مزاج کے جسمانی آثار چڑھاؤ اگر ایک طرف یہ تھے، تو دوسری طرف اسی شفاف و نرم نازک دست و پا کے متعلق ان ہی حکیم منصور علی خاں صاحب کی چشم دید شہادت یہ بھی ہے، حج کے آخری سفر میں حکیم صاحب قبلہ کو بھی حضرت مولانا کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا تھا، انھوں نے لکھا کہ مناسک حج سے فارغ ہونے کے بعد مولانا کے ساتھ مدینہ منورہ جا رہا تھا، قبہ خضرا جوں ہی نظروں کے سامنے ہوا حکیم صاحب کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ

"جناب مولانا مرحوم نے اپنی نعلین اتار کر بغل میں دبالیں اور پا برہنہ چلنا شروع کیا، میں نے ان کی دیکھا دیکھی اپنی جوتیاں اتار ننگے پیر ہمراہ مولانا مرحوم چلنا شروع کیا"

سننے کی بات اسی کے بعد ہے، حکیم صاحب جو ذاتاً و صفاتاً پٹھان تھے، عمر بھی اس وقت ان کی زیادہ

نہ تھی، عنفوان شباب کا زمانہ تھا' اور مولانا کی کہولت کا عہد تھا' پچاس کے قریب عمر تھی'مگر حکیم صاحب کے سامنے اسی شفاف و نرم و نازک جلد کے متعلق یہ عجیب تجربہ پیش آیا۔ لکھا ہے کہ راستہ نوکیلے خاردار پتھر کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا' مولانا کو پابرہنہ دیکھ کر حکیم صاحب بھی پابرہنہ ہو گئے' مگر خود ان ہی کا بیان ہے'

"اس قدر پتھریاں پاؤں میں چبھنے لگیں کہ متحمل نہ ہو سکا آخر جوتا پہن کر چلنے لگا "

لیکن جن سنگین کانٹوں کی چبھن ایک نوجوان پٹھان کے پاؤں کے لئے ناقابل برداشت بن چکی تھی' سنئے حکیم صاحب کے بجنسہ الفاظ ہیں کہ

"مگر مولانا مرحوم مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اسی طرح چل کر پابرہنہ پہنچ گئے"

اس تماشے کو دیکھ کر خود حکیم صاحب کو بھی تعجب ہوا بہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"مولانا مرحوم جو از فرق تا قدم نہایت نازک و نرم اندام تھے"

اپنے تعجب کا اظہار ان الفاظ میں حکیم صاحب نے کیا ہے کہ

"تعجب تھا کہ ننگے پیر کیونکر آدمی ان خاردار پتھریوں میں چل سکتا ہے "

تو حکیم صاحب نے اس کے بعد اپنے تعجب کا ازالہ ان الفاظ سے کیا ہے' فرماتے ہیں کہ

"مگر قوت عشق کے نزدیک سنگ و گل برابر ہے" ص۱۸۱

حضرت والا کی زندگی کے ایک مستقل اور خاص پہلو کی طرف حکیم صاحب نے مذکورہ بالا الفاظ میں اشارہ کیا ہے' زندگی کا پہلو ہی نہیں بلکہ فقیر کے خیال میں توکل زندگی ہی ان کی یہی تھی' یہی اول بھی تھا اور یہی آخر بھی' یہی ظاہر بھی اور یہی باطن بھی' انشاء اللہ اپنی جگہ پر تفصیلی بحث اس مسئلہ پر کی جائے گی۔

یہاں صرف میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عشق و سرمستی کا تقاضہ یہ تو ہو سکتا ہے اور یہی ہوا بھی ہے کہ پتھر کے نوکیلے ٹکڑے پھول بن جائیں' لیکن بااین ہمہ چاہئے تھا کہ ایسی صورت میں پائے مبارک

چھالوں اور آبلوں سے بھر جاتے' خیال کرنے کی بات ہے پتھر کے یہ ٹکڑے معمولی پتھر کے ٹکڑے نہ تھے پارہ ہائے سنگ خارا تھے' وقت بھی دن کا نہیں رات کا تھا کہ دیکھ دیکھ کر قدم اٹھانے کا موقعہ ملتا' مگر حکیم صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدم کو لہولہان ہو جانا چاہئے تھا' اس میں نہ کسی قسم کا انشکاف پیدا ہوا اور نہ آبلے ابھرے یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اس مشق اور عادت کا نتیجہ ہو' جس کا ذکر اسی کتاب میں دوسرے موقعہ پر حکیم صاحب ہی نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

"باوجود سواری کے اکثر پیدل چلتے تھے" (صـ۱۹۷ مذہب منصور)

لیکن سوال یہی ہے کہ اس مشق کے خوگر ہونے کی ہمت اور جرأت کہاں سے پیدا ہوئی' جب تک یہ نہ مانا جائے کہ مزاج و قوی کے جس اعتدال کی بدولت صوری اور ظاہری خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہو کر آپ جیسے پیدا ہوئے تھے' اسی طرح معنوی اور باطنی زیبائیوں اور رعنائیوں سے بھی قدرت نے آپ کو سرفراز کیا تھا' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر و باطن صورت و معنی دونوں پہلوؤں کے امتیازی آثار کا تجربہ طفولیت ہی کے عہد سے لوگوں کو ہونے لگا تھا۔ مصنف امام نے لکھا ہے کہ نانوتہ میں حضرت والا کا موروثی مکان ایک ایسی جگہ پر تھا جس میں پہنچنے کے لئے بڑی لمبی اور دراز گلی کو طے کرنا پڑتا تھا' ان ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہے کہ قصبہ کا یہ طویل کوچہ وحشتناک اور کچھ ڈراؤنا سا تھا' اور جیسا کہ ہندوستان کے قصبوں اور دیہاتوں کا عام قاعدہ ہے نانوتہ کا یہ کوچہ آسیب زدہ سمجھا جاتا تھا' بھوت' جن و شیطان وغیرہ جیسی خبیث روحوں کے تعلق سے یہ کوچہ کافی بدنام تھا' عموماً ہندوستان کی عورتوں اور بچوں پر اس قسم کے قصوں کا اثر اب بھی پایا جاتا ہے اور ہم جس زمانہ کی بات کر رہے ہیں' اس وقت تو اس ملک کی قصباتی اور دہقانی زندگی کا یہ لازمی لطیفہ تھا' مصنف امام نے اپنا ذاتی تجربہ اس "بھوتاہی گلی" اور حضرت والا کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ نو عمری کے ان ہی دنوں میں

"راتوں کو بہت بہت دیر سے بے تکلف گھر جاتے اور کچھ خوف نہ کرتے" صـ۲۷

اس عملی مثال کے ساتھ حضرت والا کی ان معنوی خصوصیتوں کا جن کے آثار کا ظہور بچپن ہی کے

زمانہ میں شروع ہوگیا تھا، ان ہی کا ذکر ان الفاظ میں مصنف امام نے کیا ہے، کہ

"مولوی صاحب لڑکپن سے، ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز، وسیع حوصلہ، جفاکش، جری و چست و چالاک تھے" ص۲۶

اور اب سمجھا جاسکتا ہے کہ خورد سالی کے ان دنوں میں مولانا کیا تھے اور کیسے تھے، ان کے ظاہر و باطن کی تعمیر کتنی عجیب و غریب خصوصیتوں سے ہوئی تھی، ورنہ عام حالات میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ باہر میں پانے والے اندر سے کھوکھلے ہیں اور اندر جن کا سرمایہ دار ہے باہر ان کا اسی حد تک عموماً مفلس ہوتا ہے، شاید مردانہ حسن و جمال کا یہی مطلب ہے، جس کا ظہور مولانا کے ظاہر و باطن میں ہوا تھا، بلکہ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں تو پھر یہی کہوں گا کہ حضرت والا کی جس "اجتبائی شان" کی یافت مجھے ہوئی ہے منجملہ دوسرے مظاہر کے اسی شان کا ایک "مظہر خاص" آپ کے ظاہر و باطن کا یہ دل کش تناسب، اور دل آویز موزونیت بھی ہے۔

آخر میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں، مجھ ہی سے یہ قصہ بھی آپ سن چکے کہ نانا جان کے گھر کے جس جوڑے کو پہن کر اپنے ہم عمروں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کا موقعہ آپ کے سامنے آیا تو بجائے ہنسنے کے اس پیش کش پر آپ کی سلیم فطرت بے قرار ہوگئی، حتی کہ رونے لگے، مگر یہ حال آپ پر اس امتیاز کے سلسلے میں طاری ہوا، جو اپنی کوشش کا نہیں بلکہ دوسروں کی دی ہوئی چیز کا رہین منت تھا، اب اسی کے ساتھ اسی خورد سالی کے زمانہ کا دوسرا قصہ سنئے، مصنف امام نے بیان کیا ہے کہ

"مکتب میں اپنے سب ساتھیوں سے ہمیشہ اول رہے" ص۲۶

دیکھا آپ نے دوسرے کی دی ہوئی چیز سے جو امتیاز پیدا ہوتا تھا، اس سے اتنا گریز، مگر جس امتیاز کا تعلق دوسروں کی نہیں بلکہ اپنی جد و جہد، ذاتی کد و کاوش سے تھا، اس میں ایک دو دفعہ نہیں بلکہ مکتبی زندگی کے سارے دنوں میں "ہمیشہ" ممتاز رہنا، دونوں میں جو جوہری فرق ہے ظاہر ہے کہ عمر کے اس عہد میں اس "فرق" کے تفصیلی شعور کی توقع نہیں کی جاسکتی

مگر بہر حال اس "شعور" کا ظہور آپ ہی میں ہوا' بتایا جائے کہ "خداداد شعور" کے سوا اسے اور کیا قرار دیا جائے، اور نوشت و خواند ہی کے دائرے تک یہ بات محدود نہ تھی، مصنف امام نے یہ لکھتے ہوئے کہ

"مولوی صاحب جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے" ص۲۷

آگے اپنی چشم دید گواہی قلم بند فرمائی ہے کہ

"ہر کھیل میں خواہ ہوشیاری کا ہو' یا محنت کا' سب سے اول اور غالب رہتے تھے"

حالانکہ ہوشیاری والے کاموں میں امتیاز حاصل کرنے والے "محنت" کے کاروبار میں عموماً پھسڈی ہی ثابت ہوتے ہیں، مگر یہاں دونوں باتیں آپ پر آسان کی گئی تھیں وہ "تعلیم گاہ" کے بھی یکہ تاز اور "بازی گاہ" کے بھی شہ باز تھے، بلکہ ایک لطیفہ اسی سلسلے میں مصنف امام نے جو بیان کیا ہے وہ اس لحاظ سے خاص طور پر مستحق توجہ ہے کہ اپنی دلچسپی کے ان دونوں میدانوں یعنی تعلیم گاہ و بازی گاہ دونوں میں ایک خاص قسم کے رشتہ اور ربط پیدا کرنے کی کوشش کا ایک نادر نمونہ ہے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اپنے کھیل اور بعض قصے نظم فرماتے" ص۲۷

بچپن میں نظم یا کلام کو موزوں کرنے کا مذاق بجائے خود یہ تو کوئی اہم بات نہیں ہے، لیکن قصوں کے ساتھ

"اپنے کھیل"

کو بھی نظم کا لباس پہنا کر علم اور کھیل دونوں کے ذوق میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی شاید یہ ایک واحد تاریخی مثال ہے، بلکہ دوسری جگہ مصنف امام ہی نے ان کھیلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جو مولانا بچپن میں کھیلا کرتے تھے یہ لکھتے ہوئے کہ

"خوب یاد ہے کہ اس زمانہ میں ایک کھیل "جوڑ توڑ" نام ہم کھیلتے تھے، اور بہت پرانے مشاق لوگ اس کو عمدہ کھیلتے تھے، اور ہم نئے کھیلنے والے مات

کھا جاتے تھے" ص۲۷

ان "نئے کھیلنے والوں اور مات کھا جانے والوں میں" جیسا کہ مصنف امام کے فحوائے کلام سے معلوم ہوتا ہے خود حضرت مولنا بھی تھے، شاید شکست کی ندامت حد سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتی، پھر آپ جانتے ہیں کیا کیا گیا؟ یہ تو آپ سن ہی چکے کہ "کھیل کو بھی نظم کا لباس پہنا کر علم اور کھیل میں رشتہ قائم کیا جاتا تھا" اب سنئے، مصنف امام فرماتے ہیں،

"مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم صاحبؒ) جب اس کا (یعنی جوڑ توڑ کے اس کھیل کا قاعدہ معلوم کر لیا پھر یاد نہیں کہ کسی سے مات کھائی ہو، بہت ہوا تو برابر رہے" ص۲۷

سمجھا آپ نے کیا مطلب؟ جزئیات سے کلیات بنانے کی مشق کا موقعہ تو ان کو اعلیٰ تعلیم گاہوں میں بعد کو ملا، مگر ابھی جب مکتب ہی کی زندگی نانوتہ میں بسر کر رہے تھے، اس میں بھی "جوڑ توڑ" کے کھیل کے بنیادی کلیات کی سراغ رسانی کا کام شروع ہو چکا تھا، اور بالآخر اس "کلی قاعدے" کو معلوم کر کے پرانے گربز مشاق کھیلنے والوں کو چت کرنے لگے، کھیل کود کے ساتھ اس حکیمانہ رجحان کا امتزاج کچھ "جوڑ توڑ" ہی کی حد تک محدود نہ رہا، مصنف امام نے آگے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"بلکہ ہر کھیل کا جو مرتبۂ کمال ہوتا وہاں تک اس کو پہنچا کر چھوڑتے" ص۲۷

اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ قانون آفرینی اور کلیت سازی کا یہ ذوق ان تمام کھیلوں پر محیط ہو گیا تھا، جن کا نانوتہ کی بازی گاہوں میں اس وقت رواج تھا، شاید نظم کا لباس ان ہی "کلیات" کو عطا کیا جاتا تھا، افسوس ہے کہ کوئی معمولی نمونہ بھی ان نظموں کا ہم تک نہ پہنچ سکا، ورنہ "ملاعب الصبیان" یا لڑکوں کے کھیل کی تاریخ کی وہ کوئی دلچسپ چیز بلکہ شاید اپنی آپ نظیر ہوتی، نیز بچوں کے کھیل کی جن دو مستقل قسموں کی طرف مصنف امام نے اشارہ کیا ہے، یعنی ایک قسم انہی کھیلوں کی ایسی تھی جن کا تعلق ہوشیاری سے تھا، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ بچوں کی فکری و ذہنی قوت کی نشو و نما میں ان سے مدد ملتی تھی، اور دوسری قسم ان ہی کھیلوں کی وہ بھی تھی جس کا تعلق جسمانی محنت و مشقت سے تھا، انگریزی عہد کہئے "بافٹ بال" کرکٹ کے زمانے سے پہلے ہمارے

ملک میں بچوں کے کھیلوں کی تنظیم ان دو قسموں میں تقسیم کر کے جو کی گئی تھی، مولنا مرحوم کی ان نظموں میں امید تھی کہ ان کی تفصیل ملتی، ہو سکتا تھا کہ علاوہ عملی فوائد کے اس علمی غلطی کی اصلاح میں بھی اُن سے مدد ملتی جو عام طور پر پھیلی ہوئی ہے کچھ ایسا باور کر لیا گیا ہے کہ مغرب کے

"تبذیری ملاعب"[له]

کے رواج پذیر ہونے سے پہلے بچوں کے کھیلوں کے متعلق کوئی حکیمانہ یا سائنٹفک نقطۂ نظر ہندوستان نہیں رکھتا تھا، اگرچہ اس خیال کی تردید کے لئے مصنف امام کا مذکورہ بالا اجمالی بیان ہی کافی ہے، لیکن جی چاہتا تھا کہ کاش! اس اصول کی تفصیل کا علم مولنا مرحوم کی صغرنی کی ان نظموں سے میسر آتا۔

بہر حال عہد طفولیت میں حضرت والا کی طرف جن فطری رجحانات خصوصیات کا انتساب مصنف امام نے اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں کیا ہے، میرا تو خیال ہے کہ آپ کے کھیلوں کی مذکورہ بالا داستان ہی ان کے ثبوت کے لئے کافی ہے، طباع و ذہین، بلند ہمت، تیز، وسیع حوصلہ، جفاکش، جری وچست، چالاک، سب کچھ آپ کو محض کھیل کی اسی داستان کی بنیاد پر قرار دیا جا سکتا ہے، آپ کی زندگی کی ابتدا بھی ان ہی پیدائشی کمالات کے ظہور سے ہوئی اور سچ پوچھئے تو زندگی کے آخری دنوں تک ان کمالات کی طوفانی موجیں آپ کے اندر سے امنڈتی رہیں، البتہ ان کمالات کے تعلق کی نوعیت بدلتی رہی، جب بچے تھے تو ان کا تعلق "کھیلوں" سے رہا، اور جیسے جیسے عمر بڑھتی چلی گئی "کھیلوں" سے ہٹ کر زندگی کے

له مغرب سے کھیلوں کا جو تحفہ ہندوستان پہنچا ہے، ان کی سب سے بڑی خصوصیت تبذیر یعنی فضول خرچی ہے کھیل کو بھی یورپ والوں نے بیوپار بنا دیا ہے، بازی گاہوں کا رشتہ تجارت گاہوں سے قائم کر دیا گیا ہے، اسی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ ایک ایک ریکٹ کی قیمت ستر ستر اسی اسی روپے ہوتی ہے، بچوں کو اپنے اسکولوں اور کالجوں میں منجملہ دوسرے مصارف کے کافی رقم کھیل کی مد میں ادا کرنی پڑتی ہے، ضرورت ہے کہ آزادی کے بعد زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح کھیلوں کی راہ سے جو لعنت ملک میں آئی ہے اس کا بھی ازالہ کیا جائے ۱۲

مختلف دور میں دوسری چیزوں سے ان کا رشتہ قائم ہوتا رہا۔

کھیلوں کے بعد یا کھیلوں کے ساتھ پہلی چیز جس کے ساتھ آپ کے ان فطری رجحانات اور جبلی ودائع کا تعلق قائم ہوا، وہ علم تھا، تعلیم کی ابتداء، نانوتہ ہی کے قصباتی مکتب میں ہوئی اس کا پتہ تو نہ چلا کہ نانوتہ کے اس مکتب میں جس استاذ کے آگے آپ کی تعلیم کی بسم اللہ ہوئی، ان کا نام کیا تھا، اور آپ کے استاذوں میں شاید یہی ایک استاذ ہیں جن کے اسم مبارک کا پتہ نہ چل سکا، ورنہ ان کے سوا یہ عجیب حسن اتفاق ہے، کہ ابتدائی تعلیم سے آخر تک جن جن بزرگوں کے آگے زانوئے تلمذ حضرت والا نے تہ کیا تھا، ان کے ناموں کی کامل فہرست بحمد اللہ مل گئی ہے۔

نانوتہ کے مکتب خانہ کی تعلیم کے متعلق بس اسی قدر معلوم ہو سکا کہ منجملہ دوسرے ساتھیوں کے ہمارے مصنف امام یعنی حضرت مولٰنا محمد یعقوب نانوتوی صدر اول دار العلوم دیوبند بھی اس مکتب میں آپ کے ایک ساتھی تھے، مولٰنا مرحوم کے ساتھ اپنے مختلف روابط کو بتاتے ہوئے مصنف امام نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"ایک مکتب میں پڑھا ہے" ص۲۴

اس سے مراد نانوتہ کا یہی "مکتب" ہے، جہاں پڑھنے کے لئے دونوں ساتھ بٹھائے گئے تھے علم کے ساتھ آپ کے فطری کمالات کا پہلا تعلق اسی مکتب میں قائم ہوا، اور پہلا نتیجہ اس تعلق کا لوگوں کے سامنے جو آیا، بقول مصنف امام وہ یہ تھا کہ

"قرآن شریف بہت جلد ختم کر لیا" ص۲۶

صرف "جلد" نہیں، بلکہ "بہت جلد" کے لفظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ہجا شناس ہونے کے بعد قرآن کے ختم کرنے کی جو عام مدت اس زمانہ میں تھی، اس کے لحاظ سے مولانا مرحوم کے ختم قرآن کی مدت غیر معمولی طور پر کم خیال کی گئی تھی۔ بہ ظاہر اسی غیر معمولی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے اس کا ذکر بھی مصنف امام نے کیا ہے، اسی بنیاد پر میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آگے

خصوصیت کے ساتھ انھوں نے جو یہ لکھا ہے کہ

"خط اس وقت سب سے اچھا تھا" ص۲۶

ایک تو یوں ہی ان لفظوں ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکتب میں جتنے لڑکے اس زمانہ میں شریک تھے، ان سب کے مقابلہ میں مولانا کا خط سب سے اچھا ہو گیا تھا، دوسرے حسن خط کا ذکر بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کی خطی خصوصیت بھی مکتب میں خاص طور پر لائق توجہ قرار دی گئی تھی، گویا "اقرأ" کے قرآنی حکم کی تعمیل کے بعد "علّم بالقلم" کی عملی تفسیر تعلیمی راہ میں آپ کا دوسرا قدم تھا۔

مکتبی زندگی کی یہ تو وہ باتیں تھیں جو آپ کو سکھائی جاتی تھیں، اور آپ سیکھتے جاتے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی کے ساتھ سکھائے بغیر بھی بعض رجحانات کا ظہور اسی زندگی میں آپ کے اندر سے ہونے لگا تھا، کمسنی کے اس زمانہ میں آپ کی طبیعت کا یہ رجحان خواہ جس حد تک بھی مستحق مدح و ستائش سمجھا گیا ہو، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "اجتبائیت" کے جس انتخابی قانون کے تحت آپ پیدا کئے گئے تھے، وہی غالباً مانع آیا، اور غیب کے ہاتھوں نے اس رجحان کی سمت کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ نانوتہ ہی کے مکتب کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے مصنف امام نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"نظم کا شوق اور حوصلہ تھا" ص۲۶

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "شعر و شاعری" کی طرف میلان کا آغاز اسی مکتبی زندگی میں نمو پذیر ہونے لگا تھا، آپ کی دادیہال کے بزرگوں میں تو اس میلان کا پتہ نہیں چلتا، لیکن گذر چکا کہ آپ کے نانا جان شیخ وجیہ الدین صاحب کیل سہارنپور شعر کا اچھا ذوق رکھتے تھے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ وہ "اردو کے شاعر تھے" شاید یہ ذوق مولانا میں اسی راہ سے منتقل ہوا تھا، لیکن "وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ" والے کی راہ پر چلنے بلکہ اسی کے نقش قدم پر مرمٹنے کے لئے جو پیدا ہوا تھا اس کو شاعری کی راہ پر چلنے، اور شاعروں کی طرح ہر وادی میں بھٹکنے کے لئے کیسے چھوڑ دیا جاتا، میرا

خیال ہے کہ شاعری کا یہ ذوق صرف کھیل کود کے کلیات وقوانین کی ترتیب ہی میں جذب ہو کر ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا، جیسا کہ انشاء اللہ آئندہ معلوم ہو گا، ضرورۃً کبھی کبھی آپ کا دبا ہوا یا دبایا ہوا شعری مذاق ابھرا بھی، لیکن ان ہی اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ نکالنے والے نے اس میدان سے ہاتھ پکڑ کر آپ کو نکال لیا تھا، اجنبائی رنگ والوں کو پہلے بھی اس قسم کے مواقع میں الھذا خلقت (کیا تم اسی لئے پیدا کئے گئے ہو) سے تنبیہ کی گئی تھی اور کوئی تعجب نہیں اگر قالاً یا حالاً "اجتبار" کے اسی مقام سے آپ کے کانوں میں بھی الھذا خلقت (کیا تم شاعری کے لئے پیدا کئے گئے ہو) آواز گونجی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب[۱]

اور سچ پوچھئے تو شاعری کا یہ ذوق یا حوصلہ مکتبی زندگی میں آپ کے اندر سے جو ہویدا ہونے لگا تھا، اور اسی ذوق کی تسکین کے لئے کھیلوں کے قانونی کلیات اور بعض قصوں کو نظم کا لباس آپ جو پہنانے لگے تھے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں شاعری سے زیادہ اس میں دخل آپ کے دوسرے فطری رجحان کو غالباً تھا، اگرچہ یہ رجحان بھی آگے بڑھ کر تکمیل کے مدارج تک پہنچنے سے محروم رہ گیا بلکہ شاید اس کو قصداً محروم کر دیا گیا، میرا اشارہ آپ کے تصنیفی اور تالیفی ذوق کی طرف ہے اس میدان میں حضرت والا کا شبدیز خامہ باوجود غیر معمولی صلاحیتوں کے اتنا پیچھے تو نہیں ہا جتنا

---

[۱] جیسا کہ میں نے وعدہ کیا ہے انشاء اللہ مناسب مقام پر مولانا کی شاعری اور آپ کی نظم کے کچھ نمونوں کا ذکر کیا جائیگا، لیکن حکیم منصور علی خاں صاحب نے اپنی کتاب "مذہب منصور" میں ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے نقل کیا ہے کہ مولانا محمد قاسم ؒ نے اس وقت مومن خاں کے مشہور شعر مانگا کریں گے الخ کو دہرایا۔ اب واللہ اعلم یہ تصرف حکیم صاحب کی طرف سے ہوا یا مولانا مرحوم ہی سے انھوں نے بھی سنا تھا۔ کتاب میں یہ شعر بایں شکل پایا جاتا ہے یعنی ؎ مانگا کریں گے ہم بھی دعا ہجر یار کی ؛ آخر تو ضد ہوئی ہے اثر کو دعا کے ساتھ۔ اس کو دیکھ کر بے ساختہ وہ حدیث یاد آگئی جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ ع کفی الشیب والاسلام للمرء ناھیا، کو دہراتے ہوئے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہی مصرعہ لفظوں کے تقدم و تاخر سے بایں طور ادا ہوا یعنی "کفی الاسلام والشیب للمرء ناھیا" وزن سے شعر ظاہر ہے کہ گر گیا سننے کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا اشھد انک رسول اللہ ما علمک الشعر وما ینبغی لک (یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں اللہ نے نہ آپ کو شعر سکھایا اور آپ کے شعر مناسب بھی نہ تھا) بعضوں نے اسی سلسلہ میں بعض دوسرے مصرعوں کا بھی ذکر کیا ہے ۱۲

شاعری کے میدان میں آپ کے تصنیفی کارنامے معقول تعداد میں دنیا کے سامنے آئے لیکن اپنے موقعہ پر جیسا کہ بتایا جائے گا یہ سارے کارنامے جو کچھ بھی منصہ شہود پر آئے محض وقتی تاثر یا اضطراری کیفیات کے نتائج تھے، ورنہ پیشہ ور مصنفین کی طرح آپ نے کوئی کتاب قصداً نہیں لکھی، خیر یہ تو ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے، یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ درحقیقت مولانا میں تصنیف و تالیف کا ذوق بالکل فطری تھا، اتنا فطری کہ حروف ہجا سے روشناس ہونے کے ساتھ ہی جبلت کے اس تقاضے کا ظہور شروع ہو گیا۔

مگر اس عمر اور حال میں فطرت کے اس تقاضے کی تکمیل کی شکل ہی کیا تھی، بجز اس کے کہ کھیل کود کے متعلق جزئیات سے آپ کا حکیمانہ دماغ جن کلیات کو پیدا کیا کرتا تھا، ان کو نظم کا قالب عطا کر دیا جائے یا بڑی بوڑھیوں سے سنے سنائے قصوں اور کہانیوں کو موزوں کلام بنا دیا جائے، اس عمر میں اس قسم کی معلومات تک رسائی کا امکان تھا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ جیسی چاہیئے، اس سے بھی تسکین نہیں ہوتی تھی، مصنف امام نے بیان کیا ہے کہ علاوہ مذکورہ بالا نظموں کے جنھیں مولانا لکھ لیا کرتے تھے،

"چھوٹے چھوٹے رسالے اکثر نقل کئے" ص۲۶

میرے نزدیک اسی تصنیفی ذوق ہی کی تسکین کی ایک شکل شاید یہی تھی، اپنی نہیں تو دوسروں ہی کی تصنیف کی ہوئی چیزوں کو لکھ لکھ کر لکھنے پڑھنے کے جبلی مذاق کے سکون کا سامان اس طریقہ سے فراہم کیا جاتا تھا، کیونکہ جس زمانہ کی یہ بات ہے، پریس، اور طباعت کا ہندوستان میں کافی رواج ہو چکا تھا، کم از کم مکتب خانوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں کو جہاں تک میرا خیال ہے لکھ لکھ کر پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی، ایسی صورت میں ان چھوٹے چھوٹے رسالوں کے نقل کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جو میں نے عرض کیا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خطاطی کی مشق میں بھی گونہ اس سے مدد ملیگی، یہ خیال بھی شاید سامنے ہو،

بہرحال باوجود تلاش کے صحیح طور پر یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ نانوتہ کی مکتبی زندگی سے علیحدہ

ہو کر طلب علم کے سلسلے میں جیسا کہ ابھی آپکو معلوم ہو گا جب دیوبند اور سہارنپور جانا پڑا' اس وقت
آپ کی عمر کیا تھی مگر ہم جب یہ سوچتے ہیں کہ دیوبند اور سہارنپور کے بعد بالآخر جب آپ دھلی
تشریف لے گئے' تو اس وقت بھی حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی عمر کل گیارہ سال کی تھی'
اسی سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ نانوتہ کے مکتب خانے سے آپ کا تعلیمی تعلق جس وقت منقطع ہوا
اس وقت شاید آٹھ نو سال سے زیادہ عمر غالباً آپ کی نہ ہو گی' جس کا مطلب یہی ہوا کہ آٹھ نو
سال کی عمر میں صرف یہی نہیں کہ قرآن آپ نے ختم فرما لیا تھا' اور حسن خط کے لحاظ سے اپنے ساتھیوں
میں ممتاز ہو چکے تھے' بلکہ مصنف امام کی چشم دید شہادتوں کی بنیاد پر ہم سکتے ہیں کہ عمر کی اسی
قصیر مدت میں آپ گویا چھوٹے موٹے شاعر اور ننھے منے سے مصنف بھی بن چکے تھے' اسی عمر
میں اپنی نظموں کو بھی مرتب کر کے لکھ چکے تھے' اور دوسروں کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کو نقل کرنے
کا کام بھی کر چکے تھے!

اور قصہ صرف ان ہی ذہنی و دماغی کاموں کی حد تک ختم نہیں ہو گیا تھا' بلکہ علاوہ خطاطی کے
جسے گونہ دستکاری ہی جیسے کاموں میں شمار کیا جا سکتا ہے' مصنف امام نے بیان کیا ہے' کہ نانوتہ
کی مکتبی زندگی کی اسی عمر میں آپ کو کتابوں کی جزبندی اور جزبندی ہی نہیں بلکہ "جلدبندی" کی
صنعت کے سیکھنے کا موقعہ ایک خاص وجہ سے مل گیا تھا۔

یاد ہو گا' میں عرض کر چکا ہوں' کہ مشائخ دیوبند کے شیخ اعظم و اکبر سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ
المہاجر المکی قدس اللہ سرہٗ کا مادری وطن یعنی ننھیال بھی نانوتہ ہی تھا اور حضرت حاجی صاحب کی ہمشیرہ
محترمہ کی سسرال بھی نانوتہ ہی میں تھی' اور بھی مختلف قسم کے تعلقات رشتہ داریوں کی وجہ سے
تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ وقتاً فوقتاً حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نانوتہ کو بھی اپنے
قدوم میمنت لزوم سے رونق بخشا کرتے تھے' مصنف امام نے بیان کیا ہے کہ خود وہ بھی اور ان
کے ساتھ حضرت مولانا نانوتوی بھی کم عمری کے اسی زمانہ میں جب حاجی صاحب نانوتہ تشریف
لاتے تو

"ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نہایت محبت و اخلاص فرماتے"۔ ص۲۶

اس عمر میں اللہ والوں کی خدمت میں حاضری اور ایسی حاضری کہ محبت و اخلاص کے تعلقات ان سے پیدا ہو جائیں بجائے خود کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے، مگر آگے سنئے، حاجی صاحب قبلہ نے ان بچوں میں کن صلاحیتوں کو محسوس فرمایا کہ کچھ ان کو ابھی سے سکھانا چاہیئے، اس کا خیال اُن کے دل میں پیدا ہوا، مصنف امام ارقام فرماتے ہیں کہ

"جز بندی کتاب کی حضرت سے ہم دونوں نے سیکھی، اور اپنی لکھی ہوئی کتابوں کی جلدیں باندھیں"۔ ص۲۶

واللہ اعلم بالصواب کسی ملت و امت کے بکھرے ہوئے افراد کی شیرازہ بندی کا جو کام آیندہ لیا جانے والا تھا، اسی کا یہ نیک شگون اور اچھی فال تھا، یا کیا تھا، مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا علاوہ ذہنی و دماغی کام کے ایک مفید و کارآمد ہنر اور دستکاری کے سیکھنے کا موقعہ بھی کم عمری کے اسی زمانہ میں حضرت والا کو مل گیا تھا، اور جہاں تک اس سلسلے میں معلومات فراہم ہوسکیں ان کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ نانوتہ کی مکتبی زندگی کی یہ آخری منزل تھی۔

اگر یہ مان لیا جائے جیسا کہ حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ نو سال سے زیادہ عمر اس وقت حضرت والا کی نہ تھی تو مجموعی حیثیت سے ایک بچے میں ان گوناگوں مختلف الجہات چیزوں کا جمع ہونا منجملہ دوسرے شواہد کے اگر سمجھا جائے تو آپ کی "اجتبائیت" کا تقاضا اسے بھی قرار دیا جا سکتا ہے، یا جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ مزاج و قویٰ کے اعتدال و ثمرات و نتائج میں اسے بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسی موقعہ پر یعنی آپ کے قویٰ اور مزاج کے اعتدال کا ذکر کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانوی اپنے بعض مذاکروں میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ان کے استاذ مولانا محمد یعقوب صاحب یعنی ہمارے مصنف امام نے یہ بھی کہا کہ

"اور حسب سنت اللہ اعتدال مزاج سے نفس کامل فائض ہوتا ہے"۔ ص۲۵ قصص

یہ اس زمانے کے مدرسی فلسفہ یا مشائی حکماء کے طریقہ فکر کی ایک تعبیر ہے، مادہ میں جتنی

زیادہ بہتر استعداد اور صلاحیت ہوتی ہے، واجب اول یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے صورت کا فیضان بھی اسی کے مطابق ہوتا ہے، اسی مفہوم کو مذکورہ بالا الفاظ میں ادا کرنے کے لوگ اس زمانہ میں عادی تھے، لیکن ایمانی حکمت کی رو سے درحقیقت حضرت نانوتوی کی "اجتبائیت" ہی کا یہ ایک معاصرانہ اقرار ہے، ہمارے یہاں جیساکہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں مادّے میں قابلیت اور استعداد بھی دادِ حق ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

وہ چن لئے گئے تھے، چننے والے ہی نے مزاج و قویٰ کے اعتدال کی دولت سے بھی آپ کو سرفراز کیا تھا، اسی نے "نفس کامل" سے بھی آپ کو نوازا، اور اس "نفس کامل" کی جبلت میں ذہانت طباعی، بلند ہمتی، تیزی، وسعت حوصلہ، جفاکشی، جرأت، چستی وچالاکی جیسے فضائل وکمالات کو اسی نے محفوظ کرکے آپ پیدا کیا، آپ کے یہی فطری صفات وکمالات جن کا تخم آپ کی جبلت ہی میں بودیا گیا تھا، مصنف امام کی شہادت ان کے متعلق گذر چکی کہ "لڑکپن" ہی سے ان کے آثار کا ظہور ہونے لگا تھا، اور نانوتہ کی مکتبی زندگی ہی میں آپ کی سرشت ونہاد کے یہ جواہر اپنی چمک دمک دکھلانے لگے تھے، اور اس میں شک نہیں کہ جیسے جیسے عمر بڑھتی چلی جاتی تھی، تعلیم اور اہل کمال کی صحبت وتربیت کی آبیاریوں کی بدولت ان کمالات میں برگ وبار کا اضافہ ہوتا چلا اور صفائی آب وتاب میں آپ کے یہ فطری جواہر ترقی کرتے چلے گئے، مگر جیساکہ پہلے بھی شاید یہ عرض کرچکا ہوں کہ کمالات کے یہ ودائع تو خدائے بخشندہ کے بخشے ہوئے تھے، ان ہی کو لے کر آپ پیدا ہوئے تھے، آپ کی "اجتبائی شان" کا یہ اقتضا بھی تھا، آئندہ زیادہ تر یہی ہوا ہے کہ عموماً رخ اور تعلق ان صفات کا حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتا چلا گیا ہے، نانوتہ کی مکتبی زندگی میں جن چیزوں سے ان کا تعلق تھا، اپنی معلومات کی حد تک اس کو پیش کرچکا ہوں، اب وہ وقت آتا ہے کہ آپ نانوتہ سے قدم باہر نکالتے ہیں، یہی بخشیدہ اجتبائی کمالات آپ کے ساتھ ہیں:

مختلف ماحول کے حساب سے ان کمالات کے تعلق کا رخ بھی جس جس طرح بدلتا چلا گیا ہے!

آئندہ اسی کی تفصیل میرا کام ہوگا، لیکن اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے جی چاہتا ہے کہ دل میں جو ایک خیال آگیا ہے اسے خود اپنی ذات کی حد تک محدود نہ رکھوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ ' نانوتہ کی "مکتبی زندگی" کے مشاغل اور مختلف کاروبار جن کا ذکر آپ سن چکے، اجمالاً ان متفرق امور کو سمیٹ کر اگر دیکھئے تو آپ پر بھی واضح ہوگا کہ مولانا مرحوم کی یہ تعلیمی زندگی چند خاص عناصر و اجزاء پر مشتمل ہے:

(۱) قرآن اور خط نویسی (۲) ایسے کھیل جن کا تعلق ہوشیاری سے بھی تھا، اور محنت سے بھی تھا، (۳) دستکاری یا ہنر سے تعلق رکھنے والا مشغلہ یعنی جز و بندی اور جلد بندی (۴) ایک بیدار دل، پاک روح کی خدمت میں حاضری، اور اس کی محبت و اخلاص کے حصول میں کامیابی:

یہ ظاہر ہے کہ آپ کی تعلیمی زندگی کے ابتدائی دور میں یہ چند چیزیں جو جمع ہوگئی تھیں، یہ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ تھا، کسی سوچے ہوئے "لائحہ عمل" کے تحت یقیناً یہ صورت پیش نہیں آئی تھی، مگر مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ مختلف اسباب و وجوہ کی بنیاد پر آج ارباب فکر و نظر کی توجہ کی جو مشق گاہ بنا ہوا ہے مجھے تو اس "اتفاقی واقعہ" میں اچانک ایک ایسی روشنی نظر آئی کہ اسی "اتفاقی واقعہ" پر اگر اتفاق کر لیا جائے تو شاید بہت سے مشکلات حل شدہ شکل میں ہمارے سامنے آسکتے ہیں۔

ایسی تعلیم جس میں دماغ کے ساتھ جسم اور جسم کے ساتھ دل اور دل کے ساتھ شکم کے تقاضوں کی تکمیل کا سامان کیا جائے، میں پوچھتا ہوں کہ تعلیم کے ایسے مکمل نظام کے لئے اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے جو ہندوستان کے تعلیمی دائرے کی ایک ممتاز ترین ہستی کی "ابتدائی تعلیم" کی روداد میں اتفاقاً ہمیں مل گیا ہے۔ تعلیم کے مختلف نظاموں کے متعلق آج جو یہ شکایت ہے کہ کسی میں دماغ کی تربیت تو میسر آتی ہے مگر جسم کمزور ہو جاتا ہے، اور جسم درست ہوتا ہے تو دل بگڑتے ہیں، یا دل سدھرتے ہیں تو "پیٹ" خالی رہ جاتا ہے، میں اوروں کے متعلق نہیں کہتا۔ لیکن مجھ پر تو یہی منکشف ہوا ہے، کہ اسلامی ہند کی دینی تعلیم

کے سب سے بڑے علَم بردار کی ابتدائی تعلیم کے اس نقشہ میں ان ساری کوتاہیوں کے ازالہ کی ضمانت مستور ہے۔ جب کبھی فکرِ معقول سے کام لیا جائیگا، تو یقین مانئے کہ قرأۃ قرآن اور تعلیم بالقلم کے قرآنی حکم کی تعمیل کے لزوم کیساتھ مسلمانوں کی تعلیم کا صحیح نتیجہ خیز نظام یہی قرار پائیگا کہ تعلیمی زندگی میں جسمانی ریاضت و ورزش کے ساتھ طلبہ کو کسی ایسے ہنر کے سیکھ لینے کا بھی موقعہ دیا جائے کہ اپنے ہاتھ سے کما کھانیکی ضرورت اگر پیش آجائے تو اپنے آپ کو وہ معذور نہ پائیں، اور مدرسہ کی دماغی تعلیم کو خلق خدا کی خدمت کیلئے اس وقت تک کافی نہ سمجھا جائے جب تک کہ قلبی اصلاح کی سند ان لوگوں سے نہ مل جائے جو دل کی راہوں کے چلنے والے ہیں، نانوتہ کی مکتبی زندگی سے عبرت کا درس جو مجھے ملا ہے وہ یہی تھا، نہ معلوم کیوں تقاضا ہوا کہ دوسروں تک بھی اس کو پہنچا دیا جائے۔[۱]

ان فی ذٰلک لذکریٰ لمن کان لہ قلبٌ او القی السمع وھو شھید

[۱] دارالعلوم دیوبند کو دارالعلوم بنانے والی ہستی کی ابتدائی تعلیمی زندگی اتفاقاً جن عناصر اور بنیادوں پر مشتمل ہے اسمیں شک نہیں کہ دماغ کے ساتھ دل کی تربیت کی حد تک دارالعلوم کے قاسمی نظام تعلیم میں ابتداہی سے اس کی طرف خاص توجہ بزرگوں کی مرتکز رہی اور اس لحاظ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے نتائج کافی شاندار رہے ہیں مگر جسمانی ریاضت اور شکمی تقاضوں کی تکمیل میں جن چیزوں سے مدد مل سکتی تھی، خیال تو ان کا بھی لوگوں کو وقتاً فوقتاً ہوتا رہا مگر عملی شکل جیسی کہ چاہیئے ان کو نہیں مل سکی تھی، تقریباً پون صدی کے بعد دارالعلوم میں دارالصنائع کا افتتاح بھی عمل میں آیا، مولانا طاہر القاسمی سلمہ اللہ تعالیٰ جو دارالصنائع کے ناظم ہیں ان کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اپنے جد امجد کی ابتدائی تعلیمی زندگی کے ایک کارآمد نمونہ کی بقا و ارتقا کا موقعہ قدرت کی طرف سے ان کو عطا گیا ہے اصولی طور پر اس کا خیال رکھا جائے کہ زیادہ توجہ ہنر و دستکاریوں کے ان ہی شعبوں کی طرف مبذول رکھی جائے جو مقامی ہوں اور یورپ و امریکہ کی میکانکی صنعتوں سے مقابلہ کا خطرہ جن میں ممکنہ حد تک کم ہو تو مجھے امید ہے کہ افادیت کے لحاظ سے ایسی دستکاریاں زیادہ بہتر اور نتیجہ خیز ثابت ہونگی، بلکہ "جلد بندی" کے جس کام کو مولانا نے سیکھا تھا غور کیا جائے تو اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ گویا علم ہی کی ایک شاخ سے اس کا تعلق ہے، نیز یہ ایسی دستکاری ہے جس کیلئے ضرورت مند ہمیشہ مقامی کاریگروں کے محتاج رہینگے جلد بندھوانے کیلئے لوگ اپنی کتابیں یورپ و امریکہ بھیجیں گے اس کا خطرہ مشکل ہی سے پیش آسکتا ہے، بہرحال صنعتیں مقامی ہوں مقابلہ کے خطرہ کی گنجائش ان میں کم ہو اور گونہ علم سے ان کا تعلق ہو، یہ ساری خصوصیات مولانا مرحوم کے اس صنعتی نمونہ میں موجود ہیں، اس راہ میں کتابی نویسی، کمپوزیٹری، طباعت، جرنلزم (اخبار نویسی) وغیرہ بیسیوں ایسی صنعتوں کا انتخاب کیا جاسکتا ہے، یہ خبر بھی مسرت کے ساتھ میں نے سنی ہے کہ جسمانی تربیت کیلئے دارالعلوم میں طلبہ کیلئے کھیلوں کا کچھ انتظام کیا گیا ہے، مگر اسی کے ساتھ جب سنتا ہوں کہ دماغ کے ساتھ دلوں کی تربیت کی اہمیت دارالعلوم میں کم ہو رہی ہے تو کچھ سناٹا سا چھا جاتا ہے کہ صلاح کے سارے نظام کا دار و مدار قلب ہی کی صلاح کے ساتھ وابستہ ہے "اذا فسد فسد الجسد کلہ" نبوت کبریٰ کا الہامی انکشاف ہے ۱۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شر سے خیر کی پیدائش بہر حال نانوتہ کی مکتبی زندگی کے ان ہی ایام میں ایک کافی مہیب وخوفناک حادثہ نانوتہ میں پیش آیا ایسا حادثہ جو بظاہر "شر" کے قالب میں سامنے آیا تھا، لیکن جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ سمجھنے والے بسا اوقات جس چیز کو سمجھتے ہیں کہ وہ بری ہے، وہی انجام کے لحاظ سے بھلی بن جاتی ہے، زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تجربات قرآن کے اس دعوی کی شہادتوں سے لبریز ہیں، آج کچھ اسی قسم کی صورت سے ہم نانوتہ میں اپنے آپ کو دو چار پاتے ہیں، اس قصہ کا مصنف امام نے تذکرہ کیا ہے، اپنے تمہیدی بیان میں اس کے بعض اجزاء کا ذکر خاکسار بھی کر چکا ہے، میں نے بیان کیا تھا کہ نانوتہ میں سنیوں کے ساتھ شیعہ طبقہ کے لوگ بھی آباد تھے، مغل حکومت کے آخری سکراتی دور میں چونکہ عموماً ملک کے مرکزی مقامات پر اسی طبقہ کا تسلط قائم ہو گیا تھا، اس لئے "العاجلہ" کو "الآجلہ" پر یا دنیا کو "دین" پر ترجیح دینے والے کمزور دل و دماغ کے لوگ اس زمانہ میں مسلک تسنن کو ترک کر کے دیکھا جا رہا تھا کہ تشیع کا طریقہ اختیار کر رہے ہیں؛

شہروں سے گذر کر قصبات اور دیہات تک "شیعہ گردی" کی یہ وبا اس زمانہ میں پھیل گئی تھی، حتی کہ کھجوروں کے درمیان کی یہ آبادی یعنی نانوتہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے محفوظ نہ رہ سکی۔ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"ہمارے وطن (یعنی نانوتہ) میں ایک قضیہ پیش آیا" صہ ۲٦

یہ قضیہ کیا تھا ان ہی سے سنئے فرماتے ہیں کہ

"شیخ تفضل حسین شیعہ مذہب ہو گئے تھے" صہ ۲٦

"اور ہماری جائداد کے شریک تھے"

یہ شیخ تفضل حسین نانوتوی کون تھے، کیا تھے، تفصیلی طور پر ان باتوں کا تو پتہ نہ چل سکا، لیکن آگے مصنف امام نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"ہماری جائداد کے شریک تھے" صہ ۲٦

اس فقرے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نانوتہ کے قاسمی صدیقی شیوخ ہی کے خانوادے سے غالباً ان کا تعلق تھا، موروثی جائداد میں شرکت کی عام وجہ رشتہ کا یہی تعلق ہو سکتا ہے۔ "ہماری" کے لفظ سے مصنف امام کی مراد شاید "برادری" ہے، یعنی نانوتہ کے صدیقی شیوخ کو جو جائداد جاگیر میں حکومت کی طرف سے ملی تھی، اس جائداد میں شیخ تفضل حسین بھی شریک تھے۔

کچھ بھی ہو، دو باتیں تو قطعی ہیں، یعنی شیخ تفضل حسین پہلے سنی تھے، اور سنت کے طریقہ کو چھوڑ کر شیعہ ہو گئے تھے اور جس جائداد کے مالک نانوتہ کے صدیقی شیوخ تھے، اس میں شیخ تفضل حسین کا بھی حصہ تھا۔

اب نہیں کہا جا سکتا کہ تبدیلی مذہب اس کا سبب تھا، یا جائداد کی شرکت کی وجہ سے کچھ خرخشہ پیدا ہوا، مگر ہوا یہی کہ شیخ تفضل حسین اور سیدنا الامام الکبیر کے جد امجد شیخ غلام شاہ کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی اور یہ کشیدگی بڑھتی ہی چلی گئی۔

تا اینکہ کشیدگی کی شدت اس نوبت تک ترقی کر کے پہونچ گئی، کہ بقول مصنف امام

"ان سے (یعنی شیخ تفضل حسین سے) اور مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب) کے دادا شیخ غلام شاہ سے فساد ہوا، اور شیخ تفضل حسین مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب) کے ماموں میاں فصیح الدین کے ہاتھ سے زخمی ہو کر مر گئے"۔ ص۲۶

جس کا مطلب جیسا کہ ظاہر ہے یہی ہو سکتا ہے کہ نانوتہ نے اس قضیہ میں باضابطہ رزم گاہ کی صورت اختیار کر لی، اور معاملہ اتنا طویل کھنچا کہ نوکروں چاکروں یا کیروں سے، جن سے عموماً زمیندار طبقہ کے لوگ اس قسم کے مواقع میں کام لیتے ہیں، کام نہ چل سکا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست دونوں فریق کے سرغنے اس بلوے میں شریک ہوئے، میاں فصیح الدین حضرت کے ماموں جو غالباً سہارنپور کے وکیل شیخ وجیہ الدین کے صاحبزادے تھے، ان کا میدان میں اترنا اور اترنا ہی نہیں بلکہ غنیم کے گل سر سبد شیخ تفضل حسین پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس حملہ سے وہ جاں برنہ ہو سکے اسی سے اس "بلوے" کی اہمیت ظاہر ہو رہی ہے، اور زمانہ بھی اب انگریزوں کا تھا، بگڑے ہوئے

ملک میں امن و آئین کے قائم کرنے میں انگریزوں کی نئی حکومت پوری قوت خرچ کر رہی تھی، قیاس کا اقتضاء یہی ہے کہ "بلوہ" اور بلوے میں قصبہ کی ایک متمول صاحب ثروت شخصیت کا قتل ہو جانا، اس نے صورت حال کو کافی نازک اور ہولناک بنا دیا ہوگا، افسوس ہے کہ مصنف امام جو اس واقعہ کے عینی شاہد تھے انھوں نے تفصیل کی طرف توجہ نہ فرمائی، تاہم اسی سلسلہ میں انھوں نے جو یہ لکھا ہے کہ

"ہر چند کہ اس مقدمہ میں خیریت رہی، اور حاکم کی طرف سے کسی کو کچھ سزا نہ ہوئی" ص۲۶

اس سے اتنی بات تو یقینی طور پر معلوم ہوئی ہے کہ "بلوے" کا یہ مقدمہ حکومت کے سامنے پیش ہوا بلکہ ان کے الفاظ

"کسی کو کچھ سزا نہ ہوئی"

اس سے اگر یہ سمجھا جائے کہ سزایابی کا خطرہ ایک سے زائد آدمیوں کے سامنے پیش آگیا تھا تو یہ بے بنیاد خیال نہ ہوگا، بالکل ممکن ہے کہ میاں فصیح الدین کے ساتھ حضرت والا کے جد امجد شیخ غلام شاہ صاحب اور آپ کے والد ماجد شیخ اسد علی وغیرہ حضرات سب ہی مدعا علیہم قرار پا گئے ہوں، "خیریت رہی" کی خبر جو مصنف امام نے دی ہے، خود یہی خبر بھی یہ بتا رہی ہے کہ دلوں پر کافی دہشت طاری تھی اور صورت حال کے لحاظ سے یہی ہونا بھی چاہئے تھا۔ بلکہ تعجب ہوتا ہے، کہ "بلوہ و قتل" جیسے سنگین جرائم کے ہوتے ہوئے یہ خیریت آخر کیسے گذری، ممکن ہے کہ شیخ وجیہ الدین کی وکالت و وجاہت کام آئی ہو۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نانوتہ میں جب یہ حادثہ پیش آیا، اور حادثے کے بعد مقدمہ قائم ہوا یہ مقدمہ کب تک چلتا رہا، آپ دیکھ رہے ہیں کہ معمولی مقدمہ نہ تھا، بجائے خود جرم کی نوعیت بھی حد سے زیادہ سنگین تھی، پھر جن لوگوں پر الزام لگایا گیا تھا، وہ بھی معمولی لوگ نہ تھے، دور بھی انگریزی حکومت کا تھا، معمولی مقدمات میں غیر معمولی دور از کار موشگافیوں کی وجہ سے کافی وقت صرف ہو جاتا ہے؛ اور یہ مقدمہ تو اپنی اہمیت کی وجہ سے اس کا مستحق تھا کہ (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کیجئے)

کافی احتیاط سے کام لیا جائے، اسی لئے میں نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اس حادثے کے وقت مولنا کی عمر کیا تھی، تاہم سنین کے مقابلہ و موازنے سے پتہ چلتا ہے اور شاید پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ نانوتہ سے پہلی دفعہ حضرت والا تحصیل علم کی غرض سے جب باہر نکلے ہیں تو اس وقت آپ کی عمر میرے حساب کی رو سے آٹھ اور نو سال کے درمیان میں ہونی چاہیئے، اور اب اسی کو بیان کرنا چاہتا ہوں، دیکھئے یہی خاندانی حادثہ جس نے سارے خاندان کو کافی مدت تک سراسیمہ بنا رکھا تھا، شر کے اسی واقعہ کو "خیر" اور عظیم و کبیر بلکہ عجیب و غریب خیر کا ذریعہ قدرت کے غیبی ہاتھ نے کیسے بنا دیا۔

مصنف امام ہی کے حوالہ سے اس کا تفصیلاً ذکر گذر چکا کہ مسلسل چار پشتوں سے مولنا نانوتوی کے خاندان کے ساتھ یہ اتفاقی واقعہ پیش آ رہا تھا کہ ایک مورث کا ایک ہی شخص تنہا وارث ہوتا چلا آ رہا تھا۔ تجزی و تقسیم سے آپ کی موروثی جائداد زیادہ متاثر نہ ہو سکی تھی یہ تو گویا ایک فائدہ کا پہلو تھا، لیکن اسی کے ساتھ بجنسہٖ یہی واقعہ ایک نازک خطرے کا سبب بھی قدرتاً بنا ہوا تھا، یعنی خاندان کے آخری وارث کا اختتام پورے خاندان کے اختتام کا مسئلہ بن جاتا تھا، جس زمانہ میں شیخ تفضل حسین کے قتل کا یہ واقعہ نانوتہ میں پیش آیا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہو چکے تھے، اور چار پشتوں کے تنہا چشم و چراغ، صرف آپکی ذات مبارک تھی، ایسی صورت میں بد اندیشوں نے اگر یہ سوچا ہو کہ اس خاندان کو ہمیشہ کے لئے

(حاشیہ متعلقہ ص۱۷۳) ۵ انگریزی طریقہ عدل و انصاف فصل خصومات کی غیر معمولی طوالت اور کوہ کندن کاہ بر آوردن کے تماشوں کے دیکھنے والوں سے تو آج ہندوستان بھرا ہوا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ غلام حسین طباطبائی جنھوں نے اپنی کتاب سیر المتاخرین ۱۱۹۵ھ میں ختم کی ہے یعنی تقریباً دو سو سال مدت گذری، ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے انگریزی طریقہ عدالت کا رواج ملک میں اسی وقت ہو چکا تھا طباطبائی نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عدالت فصول و موکھا دارد عمرہا انتظار آں باید کشید و تاہم انفصال قضایا ہیچ نمی باید فہمید کہ چہ می شود و چہ خواہد گردید پایان کار بچہ خواہد انجامید (ص ۸۴۴ سیر المتاخرین) غریب دیہاتیوں کو اسی زمانہ میں ہائی کورٹ تک جانا پڑتا تھا، اسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دراں بلا ہا مبتلا گشتن و از اہل و عیال و اوطان مالوفہ کنارہ گرفتن و پایان کار خود کہ بکجا خواہد رسید ندانستن اعاذنا اللہ تعالیٰ و جمیع عبادہ من ذلک الشرور و الآفات ۱۲

نیست نابود کرنے کی یہ آسان ترین شکل ہے کہ خاندان کے اس آخری چراغ کو بجھا دیا جائے
تو بداندیشیاں جب حد سے گذر جاتی ہیں، ان کے لحاظ سے اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے؛
خصوصاً جب حکومت کی طرف سے مخالفوں کا گروہ مایوس بھی ہو چکا تھا، یعنی مقدمہ بھی
ہار چکا تھا، تو ایسی حالت میں اس قسم کے مذبوحانہ اقدامات باعثِ حیرت نہیں ہوسکتے؛
خصوصاً ایک معصوم بچہ جو مدافعت اور مقابلہ کی قوت بھی اپنے اندر نہ رکھتا ہو، خیر خواہوں اور
بدخواہوں کی تمیز کی توقع بھی جس سے نہیں کی جاسکتی تھی، کچھ نہیں تو کھلانے پلانے ہی کے بہانے
سے یہ آسان تھا کہ زہر وغیرہ جیسی مخفی چیزوں سے ان کا کام تمام کر دیا جائے۔

مصنف امام نے اس کا ذکر کرنے کے بعد کہ مقدمہ اگرچہ حسب دل خواہ فیصل ہوا "اور حاکم
کی طرف سے کسی کو کچھ سزا نہ ہوئی" آگے جو یہ ارقام فرمایا ہے، کہ

"مگر بناء مخاصمت کچھ پہلے سے تھی اب زیادہ ہوگئی" ص۲۶

اس سے میری سمجھ میں بھی آتا ہے کہ ہار کی ذلت اور کھسیانا پن کے جذبہ سے مغلوب ہوکر
گویا بلی کھمبے کے نوچنے پر آمادہ ہوگئی، یعنی کسی ایسی چیز پر اپنے ناخن کی تیزی کو مشق کرنے لگتی
ہے، جو بلی کے پنجوں کا جواب اپنے پنجوں سے نہیں دے سکتا۔ مذکورہ بالا فقرے کے بعد
مصنف امام کے جو یہ الفاظ ہیں کہ

"تب یہ خوف ہوا کہ مبادا کوئی صدمہ مخالفوں کے ہاتھ سے ان کو (یعنی مولانا محمد قاسم
کو) پہنچے" ص۲۶

اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے، کہ شدت مخاصمت کے جنون و دیوانگی کے شکار
ہوکر غیظ و غضب کی آگ کے بجھانے کی تدبیر شیخ تفضل حسین کے طرفداروں کی سمجھ میں یہی آئی
کہ اس چراغ ہی کو بجھا دیا جائے جس کے بجھنے کے ساتھ ہی اس خاندان ہی کی روشنی ہمیشہ
کے لئے گل ہو جائے گی، ورنہ ایک معصوم بچے کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ مخالفوں کی طرف سے
پیدا ہونے کی صورت ہی کیا ہوسکتی ہے۔

بہرحال اسباب خواہ کچھ ہی ہوں مگر مصنف امام کی شہادت سے اتنی بات تو قطعی معلوم ہوتی ہے کہ شیخ تفضل حسین کے اس قصے کی تان بالآخر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر ٹوٹی خطرہ پیدا ہوا کہ دشمنوں کی طرف سے کوئی نقصان آپ کو نہ پہنچے "شر" کا یہی خطرہ تھا، اب دیکھئے کہ خطرہ کی اسی تاریک رات سے "خیر" کی صبح کا سپیدہ کس نشان کے ساتھ طلوع ہوتا ہے، اور یہ قرآنی حقیقت کہ

وعسیٰ ان تکرھوا شیئًا وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئًا وھو شر لکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون	قریب ہے کہ تم کسی چیز کو برا سمجھو اور وہی تمہارے لئے خیر ہو اور قریب ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہی تمہارے لئے بری ہو، اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے

جس کے تفسیری تجربات سے انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی لبریز ہے آج اسی حقیقت کا ظہور "اسلامی ہند" کی تاریخ کے خاص عہد میں کیسے عجیب و غریب طریقے سے ہوا ہے، لاتعلمون (تم نہیں جانتے) کے لفظ سے انسان کے فطری جہل پر جو تنبیہ کی گئی ہے، اسی جہل سے علم پیدا ہوا اور کیسا ہوا؟

ہوا یہ کہ "مخالفوں سے صدمہ پہنچے" کا اندیشہ جب پیدا ہوا تو سوال ہوا کہ اس معصوم بچے کو پہنچنے والے صدمہ سے بچانے کی ممکنہ تدبیر کیا ہو سکتی ہے، نانوتہ میں رہ کر ایسے دشمنوں کی حفاظت کی صورت کیا ہو سکتی ہے، جو گو اس وقت دشمن بن کر غیر ہو گئے تھے مگر تھے تو وہ اپنے ہی، نانوتہ کے جس محلہ میں حضرت والا کا دولت خانہ تھا، اسی محلہ کے رہنے والے وہ بھی تھے، صبح و شام روز و شب ان کی آمد و رفت کا سلسلہ ہر گلی کوچہ میں جاری تھا، جو نشانہ بنایا گیا تھا، وہ اپنی معصومیت کے دور میں تھا، کچھ یہ اور اسی قسم کی باتوں کو سوچ کر یہ طے کیا گیا، کہ گو گھر سے باہر نکلنے کی عمر ابھی نہیں ہوئی ہے، لیکن جب گھر ہی کے لوگ دشمن ہو گئے ہوں تو اس گھر سے "باہر" ہی زیادہ محفوظ ہو سکتا ہے، مگر "باہر" بھیجا جائے تو کہاں بھیجا جائے، تمہیدی بیان میں عرض کر چکا ہوں کہ نانوتہ کے ان صدیقی قاسمی شیوخ کی رشتہ داریاں اطراف و جوانب کے مختلف قصبات کے شیوخ سے قائم تھیں، تھانہ بھون، کاندھلہ، رامپور اور سب سے زیادہ

توسہارنپور علاقہ کا مرکزی مقام یعنی ضلع ہی وہ تھا، جہاں حضرت کے ناناجان شیخ وجیہ الدین ایک خوش باش فارغ البال آدمی کی زندگی گذار رہے تھے، میرے پاس ایسا کوئی تاریخی وثیقہ تو نہیں ہے جس کی بنیاد پر یہ دعوی کروں کہ باہر بھیجنے کا مشورہ جب اس معصوم بچے کے متعلق پیش ہوا تو مذکورہ بالا مقامات کا بھی نام لیا گیا تھا، لیکن عقلاً بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جب رشتہ داروں ہی میں کہیں بھیجنا مقصود تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ فہرست میں یہ نام بھی نہ آئے ہوں خصوصاً سہارنپور مختلف وجوہ سے مستحق ترجیح تھا، مگر کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے، غلط راہوں سے سوچنے والوں کا ڈر معلوم ہوتا ہے ان کے برے دھیان خدا جانے ان کو کہاں کہاں لے جائیں، حالانکہ "گل" کے ساتھ غریب "بلبل" کو لفظاً صرف اگر ہم قافیہ ہونے کی سعادت حاصل ہو گئی ہے تو اس کا یہ کتنا غلط مطلب ہو گا کہ مسکین "بلبل" پر اپنے "محبوب گل" کے ساتھ رنگ وبو کے دعوے کا جنون بھی سوار ہوا ہے، بجز ہرزہ اندیشی، اور یاوہ خیالی کے اس قسم کے وسوسوں کو اور کیا سمجھا جائے، لاکھ ہم قافیہ ہو، لیکن بلبل بہرحال بلبل ہے اور "گل" "گل" ہے۔ گل کے ساتھ ہمسری کا ہلکا سا اندیشہ بھی یقیناً "بلبل" کو "بلبل" ہونے کے مقام سے گرانے گا۔

بہرحال کچھ بھی سوچا جائے اور کچھ بھی کہا جائے۔ یہ عرض کرتے ہوئے کہ

یالائمی فی الھوی لعذری معذرۃ ۔۔۔ مِنّی الیک ولو انصفت لو تلم

جو بات دل میں آئی اسے پیش کر دیتا ہوں۔

قصہ یہ ہے کہ باہر بھیجنے کی تجویز جب نانوتہ میں طے ہوئی تو جیسا کہ مصنف امام نے خبر دی ہے بھیجنے والوں نے نہ آپ کو تھانہ بھیجا نہ سہارنپور نہ کہیں اور بلکہ وہی لکھتے ہیں کہ

"اسی لئے (یعنی خطرے سے محفوظ کرنے کیلئے) دیوبند بھیجدیا"، ص ۲۶

دیوبند! وہی دیوبند جو اس وقت بھی آخری منزل، اور خواب گاہ گرامی ہونے کے شرف سے ارجمند ہے نانوتہ کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ وہی آپ کا وطن ثانی، اور دار الہجرت قرار پایا، جن دینی و علمی شعاعوں سے ہند و بیرون ہند کے وسیع علاقے آج جگمگا رہے ہیں، اور

خدا ہی جانتا ہے کہ کب تک جگمگاتے رہیں گے، دیوبند ہی کے افق سے یہ شعاعیں پھوٹیں، ان ہند گیر کرنوں کا آفتاب اسی کے مطلع سے طلوع ہوا کمسنی اور معصومیت کے اس عہد میں اپنے قدوم سعادت لزوم سے اسی دیوبند کی سرفرازی، سچ پوچھئے تو اچانک اس حال نے دوسرے حال کی طرف مجھے منتقل کر دیا۔ "گل" کے ساتھ "بلبل" کے ہم قافیہ ہونے کا خیال فجاءۃً سامنے آگیا تیرہ سو سال پہلے کی تاریخ دماغ میں بیدار ہو گئی، داخل ہونے والے صلوات اللہ علیہ وسلامہ داخل ہوتے ہوئے فرمارہے تھے۔

هذا المنزل ان شاء الله تعالیٰ | اترنے کی جگہ یہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ

خدا کی مشیت پوری ہوئی، وہیں اترے اور آج تک فرودگاہ عالی ہونے کا شرف اسی سرزمین پاک کو حاصل ہے، اور انسانیت اپنی نجات کے لئے ڈھونڈھے گی، تو اسی خاک پاک سے سر اٹھا کر اشفع تشفع، سل تعطہ کے مقام محمود میں سجدہ ریز ہوگی۔

خیال یہی آیا کہ یہی مدینہ جو منزل بننے کے بعد طابہ وطیبہ بن گیا تھا، اور اب تک بنا ہوا ہے، قیامت تک بنا رہے گا، اسی مدینہ میں جب وہ طیبہ بلکہ یثرب تھا، بیان کیا گیا ہے، کہ والدہ محترمہ کے ساتھ عہد طفولیت میں آپ کو لایا گیا تھا، "گل" کی تاریخ کا یہ حصہ "بلبل" کے اس قصہ کے ساتھ کتنا مشابہ ہے، جو اس وقت پیش آرہا ہے، تابع میں متبوع کا جو رنگ ارادہ اور اختیار سے پیدا ہو، یقیناً حقیقی ستائش کا مستحق یہی اختیاری رنگ ہے۔ مگر جو چنے جاتے ہیں، ان کی "اجتبائیت" کا شاید یہی اقتضاء بھی ہوتا ہے، کہ اپنے متبوع کا رنگ کسی نہ کسی طرح تابع میں بھی اضطراراً بھی جھلکتا ہوا معلوم ہو، یہ شاید "اجتبائیت" کی شان کو ظاہر کرنے کیلئے قدرت کی طرف سے یہ مخفی کارروائیاں ہوتی ہیں تاکہ پہچاننے میں آسانی ہو، اس قسم کے امتیازی نشانوں سے وہ نوازا جاتا ہے۔

دیکھئے تو یہی دیوبند جو عوام کی زبان پر ابھی دیوبند نہیں بلکہ عموماً دیے بنڑ کی شکل میں چڑھا ہوا ہے اسی دیے بنڑ میں آٹھ نو سال کا ایک بچہ داخل ہو رہا ہے، کون جانتا تھا کہ کچھ دن بعد

یہی معصوم بچہ اس ڈے بنڈر کو دیو (شیطان) کے باندھنے کا ذریعہ بنا کر واقعی اس کو دیو بند بنا دے گا۔ سلسلت مردۃ الجن والشیاطین (یا زنجیر کر دیئے گئے ہیں جن اور شیاطین کے سرکش لوگ) کا عجیب و غریب منظر اسی قصبہ کی بدولت ہندوستان کے ہر ہر شہر قصبات بلکہ دیہات تک میں نگاہوں کے سامنے آئیگا، ہند ہی نہیں بلکہ بیرون ہند بھی اس دیو بندی کی اس مہم سے حصہ پائے گا۔

بہرحال ہوا یہی کہ اس کم عمری میں اپنے والدین[۱] سے جدا ہو کر نانوتہ سے باہر پہلی دفعہ آپ اسی آبادی میں پہنچائے گئے، جہاں آپ کی آخری ناسوتی زندگی پوری ہوئی۔

گذر چکا کہ دیوبند والوں سے حضرت والا کے خاندان کی قدیم رشتہ داریاں تھیں، آپ کے پردادا شیخ محمد بخش کے بھائی شیخ خواجہ بخش کی صاحبزادی کی شادی دیو بند کے محلہ دیوان والوں کے یہاں ہوئی تھی جس زمانہ میں پہلی دفعہ حضرت والا کی تشریف آوری دیو بند میں ہوئی ہے تو ان ہی شیخ خواجہ بخش کے نواسے شیخ کرامت حسین کا دیو بند میں دور دورہ تھا، دیوان محلہ کے سر کردہ خاندان بھی شیخ کرامت حسین تھے عرض کر چکا ہوں کہ کسی زمانہ میں دیوان محلہ والوں کی معاشی حالت غیر معمولی طور پر بہتر تھی جس کا اندازہ ان کی امیرانہ ڈیوڑھی کی در و دیوار شکستہ سے ہوتا ہے، جو دار العلوم دیو بند کے صدر مشرقی دروازے کے سامنے اپنے بنانیوالوں کی تعمیری اولوالعزمیوں کا خاموش درس دیکھنے والوں اور سننے والوں کو اب بھی دے رہے ہیں۔

---

[۱] دیو بند پہلی دفعہ جس وجہ سے آپ بھیجے گئے، مصنف امام کا بیان تو یہی ہے کہ خطرے سے محفوظ کرنے کیلئے ایسا کیا گیا تھا، ان سے بڑھ کر ظاہر ہے کہ اور کس کی شہادت وزنی ہو سکتی ہے مگر اپنی ایک قلمی یادداشت میں مولانا طیب الحمید سلمہ اللہ تعالیٰ نے ارقام فرمایا ہے کہ "آپ کی (یعنی مولانا محمد قاسم) کی والدہ نے چھوٹی عمر میں آپ کو دیو بند واسطے تعلیم کے بھیجدیا تھا" بظاہر کسی سے سنی ہوئی بات مولانا طیب کے کان میں پڑی ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عمر میں جس تعلیم کی مولانا کو ضرورت تھی اسکے لئے کیا نانوتہ کافی نہ تھا، اس زمانہ کا دیو بند ظاہر ہے کہ آجکل والا دیو بند یقیناً نہ تھا بلکہ جو حال آس پاس کے دوسرے قصبات کا تھا تقریباً تعلیم و تدریس کے لحاظ سے وہی حال دیو بند کا بھی ہوگا۔ یہ احتمال ہے کہ اتنے کم عمر بچے کا خواہ وجہ کچھ بھی ہو، ماں سے جدا ہونا عام حالات میں آسان نہیں ہے خصوصاً اکلوتا بچہ مگر با وجود اسکے آپ کی والدہ صاحبہ کو بزرگوں نے کچھ اسی قسم کی باتیں کہہ کر کہ دیو بند میں تمہارے بچہ کی تعلیم اچھی طرح سے ہوگی راضی کر لیا ہوگا، اسی واقعہ کی تعبیر یہ کی گئی کہ تعلیم کے لئے ماں نے آپ کو دیو بند بھیجدیا تھا۔ جب یہ معلوم ہے کہ حضرت کے والد ماجد اس وقت زندہ تھے تو دیو بند بھیجنے کے قصہ کو والدہ ماجدہ کی طرف خصوصیت کے ساتھ منسوب کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، ہاں ماں کا اپنے ایسے کم عمر اکلوتے بچہ کی جدائی پر راضی ہو جانا یہ واقعہ مستحق ہے کہ ان ہی کی طرف منسوب کیا جائے۔

دیوبند میں آپ کو کہاں رکھا گیا، اگرچہ اس کا واضح جواب مصنف امام کی کتاب میں نہیں ملتا لیکن مولانا محمد طیب الخشید سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قلمی یادداشت[1] میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"دیوبند میں آپ کی (یعنی مولٰنا نانوتوی) کی چند قرابتیں قریبہ بلکہ اقرب ہیں"

یہ خبر دیتے ہیں کہ

"شیخ کرامت حسین کے یاں جن سے مسلسل رشتہ داریاں تھیں قیام کیا۔"

اس سے زیادہ صریح شہادت اور کیا ہو سکتی ہے، اسی لئے ماننا چاہیئے کہ حضرت الاجب پہلی دفعہ اپنی طفولیت کے اس عہد میں دیوبند تشریف لائے، تو موجودہ دارالعلوم کی عمارت سے جو بالکل متصل حویلی شیخ کرامت حسین کی تھی، یہی آپ کی فرودگاہ قرار پائی۔

گھوم گھوم کر ذہن اس گذرے ہوئے زمانہ کی طرف چلا جاتا ہے، جب دیوان محلہ میں پہلی دفعہ حضرت والا نے نزول اجلال فرمایا، اس ڈیوڑھی کی مغربی سمت والی زمین جو اب دارالعلوم قاسمیہ کی فلک پیما عمارتوں سے بھری ہوئی ہے، دارالحدیث کا قبہ بیض دور دور سے نظر آتا ہے، یہ کون جانتا تھا کہ اس غیر آباد زمین پر اسلامی ہند کی دینی تاریخ کا اتنا بڑا ہنگامہ اسی ننھے منے بچے کے ہاتھوں برپا ہونے والا ہے، انسان کے سوا دہ ساری چیزیں جنکی تسبیح کو قرآنی نص کی رو سے ہم نہیں سمجھتے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس سلسلہ کی چیزیں اس میدان یا باغ میں جو پھیلی ہوئی تھیں، ان میں سرگوشیاں نہ ہوتی ہوں گی۔

"سلام ہو تجھ پر اے ہمارے آباد کرنے والے ہمیں متبرک بنانیوالے بچے"

کم از کم شعر کے کانوں میں اس سلام کی آواز اب بھی گونج رہی ہے۔ شاعر کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اس خطے کا ذرہ ذرہ، جڑی بوٹی، شجر و حجر آنیوالے کا استقبال کر رہے ہیں، اپنے آباد کرنیوالے کے قدم چوم رہے ہیں۔

خیر بے ساختہ خیالات کا ہجوم ہے جو دل و دماغ پر چھاتا چلا جاتا ہے، اپنی ذہنی لذتوں کو اپنی ہی حد تک محدود رکھنے میں کچھ بخل کی بو محسوس ہوئی، اس لئے اضطراراً قلم سے یہ الفاظ ٹپک پڑے آئیے اب اصل قصہ کو سنئے، قیام کا نظم بھی شیخ کرامت حسین مرحوم کی اس ڈیوڑھی میں ہوا، اور گو

---

[1] کاش مولانا طیب صاحب فٹ نوٹ میں ان قرابت داریوں کی کچھ تفصیل فرما دیتے تو مناسب تھا!

تصریح تو نہ مل سکی، لیکن مولانا طیب الحفید سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اسی یادداشت میں بعض واقعات کا جو ذکر کیا ہے، ابھی آپ کے آگے وہ دہرائے بھی جائیں گے، ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیوان محلہ کی اسی ڈیوڑھی میں قیام کے ساتھ طعام کا بھی نظم تھا، اور جس زمانہ کی یہ بات ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ خشک قیام پر وہ۔۔ کے رشتہ دار بھی راضی نہیں ہو سکتے تھے، پھر جس گھر سے مسلسل رشتہ اربابوں اور قرابت قریبہ بلکہ اقرب ہونے کے ہونے ہوئے کیا یہ سوچنے کی بات ہو سکتی ہے کہ ایک بچہ کا کھانا ان لوگوں پر گراں ہو سکتا تھا، یا فیملی گسٹ[۱] بنانے کی ہمت اس زمانہ کا کوئی شریف آدمی کر سکتا تھا، خصوصاً شیخ

---

[۱] یہ یورپ کا عام دستور ہے ہندوستان یا اسی قسم کے ممالک سے طلب علم کے سلسلہ میں بیچارے طلبہ یورپ جب جاتے ہیں تو مختلف خاندانوں میں وہ قیام کا کرایہ اور طعام کا معاوضہ، غیر معمولی معاوضہ ادا کرنے والے مہمان بنائے جاتے ہیں، قیام کا کرایہ اور طعام کا معاوضہ ادا کرکے بھی مہمان مہمان ہی باقی رہتا ہے، یورپ کی نئی اصطلاحوں میں ایک جدید اصطلاح ہے، غالباً اسکی وجہ یہی ہے کہ طلبہ علم کے ساتھ حسن سلوک مغربی تمدن کیلئے ناقابل فہم مسئلہ ہے، انیسویں صدی کے آخری قرن کا مشہور مستشرق فاضل وجاسوس پروفیسر ویمبری جو بھیس بدل بدل کر مدتوں اسلامی ممالک میں گھومتا رہا ہے، اس نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ ہنگری جہاں کا وہ باشندہ تھا، کسی گاؤں میں گھر تھا اسی گاؤں کے متصل کسی قصبہ کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتا تھا، غریب تھا اپنے مصارف خود برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن پورے قصبہ میں ایسا کوئی آدمی نہ تھا جو اسے دو وقت کا کھانا دے سکتا ہو، مدرسہ کے بعض امیر لڑکوں نے مقرر کردیا تھا کہ ہفتہ میں باری باری کے ساتھ کھالیا کرے اور وہاں ہی امیر بچوں کے اترے ہوئے کپڑے تو میری کو مل جاتے تھے، دیکھئے اس کا سفرنامہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبۂ علم کے ساتھ مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے حسن سلوک کا رواج جاگیر وغیرہ کی شکل میں جو پایا جاتا ہے گویا اس راہ سے سینکڑوں سال تک مسلمانوں نے فری لاجنگ اور فری بورڈنگ کے طریقہ کو تعلیمی دائروں میں جو جاری رکھا شاید یہ مسلمانوں کی قومی خصوصیت ہے، صحیح حدیثوں میں طلبہ علم کے احترام کی طرف غیر معمولی توجہ جو دلائی گئی ہے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ اسی کا اثر ہے، مسجد نبوی میں صفہ کو قائم کرکے عملی طور پر بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے کہ تشنہ کامان علم کے ساتھ مسلمانوں کو کیا برتاؤ کرنا چاہئے، شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ صرف دینی علوم کے طلبہ ہی نہیں بلکہ جیسا کہ اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں فقیر نے لکھا ہے کہ انگریزی عہد کے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے ساتھ بھی مسلمان یہی سلوک کرتے رہے، مگر جیسے جیسے مسلمانوں کی زندگی اسلامی اصول و ضوابط کے دائرہ سے باہر ہوتی چلی گئی، وہ اس روایتی حسن سلوک سے دور ہوتے چلے گئے، دوسرے مفید مراسم کے ساتھ طلبہ علم کے ساتھ عملی ہمدردیوں کا جوش کم ہوتا چلا جارہا ہے، میں نے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ صوبہ بہار کے شہروں میں تیس چالیس سال پہلے یہ عام بات تھی کہ مسلمان وکیلوں اور مختاروں کے ڈیرے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانیوالے طلبہ سے بھرے رہتے تھے، قیام کے ساتھ عموماً ان کے طعام کا بھی مفت نظم قائم تھا، مگر اب ان ہی شہروں میں دیکھ رہا ہوں کہ رشتہ کا بھی خیال نہیں کیا جاتا اور کوئی اس پر آمادہ نہیں کہ اپنے غیر مستطیع رشتہ داروں کے بچوں کیلئے پلنگ برابر خوابگاہ کیلئے جگہ اور دو وقت کا کھانا دے سکے، فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ خود اس فقیر کے ذاتی تجربات اس سلسلے میں بڑے دردناک ہیں، جنکا ذکر بھی شاید اس کتاب میں کردیا گیا ہے ۱۲

کرامت حسین جو بڑی بڑی براتوں کو مہمان بنالینے کے عادی تھے، ان کے متعلق تو اس قسم کا وہم بھی شاید وہم سے بھی زیادہ بد تر بات ہو گی۔

شیخ کرامت حسین مرحوم کی فراغبالی اور سیر چشمی، مہمان نوازی وغیرہ فضائل کے جو قصے عام طور پر مشہور ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے سمجھ میں تو یہی آتا ہے، کہ اپنے معصوم کمسن مہمان کے آرام و آسائش اور ہر قسم کی سہولتوں کا وہ ضرور خیال کرتے ہوں گے، مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کے امیرانہ گھرانوں میں قدرتاً کھانے والوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، خصوصاً اس زمانہ میں کہ ہلکا سا تعلق بھی کسی کے گھر مہمان بن جانے اور مہینوں پڑے رہنے کے لئے کافی تھا میزبان کو بجائے گرانی کے خوشی ہوتی تھی کہ اس باورچی خانہ سے اتنے آدمی مستفید ہوتے ہیں، اب اسے آپ اچھی رسم قرار دیں یا بری، مگر واقعہ کی صورت اس زمانہ میں کچھ یہی تھی گو "سفرہ عام" کا یہی ذوق بعض شرمیلے کم سخن مہمانوں کے لئے باعث کلفت بھی بن جاتا تھا۔ جس کا میرے نزدیک ایک نمونہ یہ واقعہ ہی ہو سکتا ہے۔

مولانا محمد طیب صاحب نے عہد طفلی کے اسی قیام دیوبند کا ذکر فرماتے ہوئے اپنی قلمی یادداشت میں مندرجہ ذیل روایت کو خود حضرت نانوتوی کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے کہ

"مولنا مرحوم (یعنی حضرت نانوتوی) فرماتے تھے کہ میں نے کبھی تازہ یا سی روٹی یا دانہ ڈبکا مٹھائی کھٹائی اپنی زبان سے نہیں مانگی، اگر کسی نے دے دیا لے لیا، اور کھا لیا، ورنہ خیر، بعض دفعہ بھوک بہت لگتی، مگر مانگنے کی تکلیف کو بھوک کی تکلیف پر گوارا کر کے صبر کرتا، اور جب مہینہ دو مہینے میں دو چار روز کے واسطے گھر نانوتہ جاتے اور پھر دیوبند کی واپسی کا وقت قریب آتا، تو آپ بھوک کی تکلیف یاد کر کے بہت روتے، آپ کی والدہ ہر چند پیار کر کے چمکار کے پوچھتیں کہ تجھ کو دیوبند میں کچھ تکلیف ہے۔ مولنا فرماتے کہ میں نے اپنے دل میں یہ خیال کیا کہ اگر میں نے والدہ سے اس تکلیف کا ذکر کیا تو دیوبند والوں کی ناشکری ہو گی، اور ان کو رنج گذریگا،

اپنے نفس پر تکلیف کا ہونا، مضائقہ نہیں، والدہ کو اصل حال سے مطلع نہیں کیا،
اور برابر اسی طرح گذاری "۔۔۔۔

ظاہر ہے کہ براہ راست خود حضرت نانوتوی سے یہ قصہ یقیناً مولنا طیب نے نہیں سنا ہے، بلکہ روایت بالواسطہ ہے، راوی کا نام بھی نہیں بتایا گیا ہے، پھر روایت باللفظ بھی نہیں بلکہ بالمعنی ہے، تاہم اس روایت سے پہلی بات تو وہی ثابت ہوتی ہے کہ شیخ کرامت حسین مرحوم کے یہاں آپ کا قیام فیملی گسٹ یا معاوضہ ادا کرکے رہنے والے مہمانوں کی طرح نہ تھا، اور قیام کے ساتھ ان ہی کے یہاں طعام کا بھی نظم تھا، رہی بھوک کی تکلیف؟ سو خود مولنا ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تکلیف میں زیادہ دخل خود ان کی شرمیلی فطرت اور نہ مانگنے کی عادت کو تھا، بھلا آٹھ نو سال کی عمر میں جس کا دماغ یہ فلسفہ بناتا ہو، کہ بھوک بھی تکلیف ہے اور مانگنے کی ذلت یہ بھی تکلیف ہے، پھر دونوں تکلیفوں میں موازنہ کرکے یہ فیصلہ کہ بھوک کی تکلیف مانگنے کی ذلت کی تکلیف کے مقابلہ میں قابل برداشت ہے، اندازہ کیجئے کہ اس کے اخلاقی احساسات کی نزاکتوں کا کیا حال ہوگا، بھوک کی تکلیف جسمانی تکلیف ہے، اور ذلت و بے آبروئی، یہ روحانی تکلیف ہے، یہ فیصلہ اسی کا قلب سلیم کرسکتا ہے، اور وہ بھی کم عمری کے اس زمانہ میں، جس کے سارے اخلاقی احساسات جبلۃً بیدار ہوں، اس عمر میں بھی جس میں بچوں کی ساری ضرورتوں کی تکمیل کا دارومدار اپنے بڑوں سے مانگنے ہی پر ہوتا ہے، مانگنا ہی نہیں بلکہ مانگنے پر اصرار، بے جا ضد، ہٹ، اس عمر کا عام اقتضاء ہے، مگر جس کا حال یہ ہو خود بیان کرتا ہو کہ کسی سے کبھی کوئی چیز مانگی ہی نہیں، اگر اپنے اس فطری غریزہ کی وجہ سے گھر میں بھی بھوک کی تکلیف میں مبتلا ہونے پر اسے مجبور ہونا پڑے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے اور شیخ کرامت حسین کا گھر خواہ قریب ترین عزیزوں ہی کا گھر کیوں نہ ہو، مگر اپنا گھر تو وہ یقیناً نہ تھا، مگر اس تکلیف کا شکار وہاں ان کو ہونا پڑا، تو جہاں تک میرا خیال ہے، اس کی ذمہ داری میزبان سے زیادہ غریب میزبان کے اس عجیب و غریب

معصوم مہمان پر اور اس ننھے منے مہمان کے ان جبلّی غرائز پر عائد ہوتی ہے، جن کے حلقوں میں اس کے سارے جسمانی و روحانی تقاضے جکڑے ہوئے تھے، خیال تو کیجئے، کہ ایک طرف کمسنی کا تقاضاً اس شکل میں بھی پورا ہو رہا ہے کہ واپسی کے وقت دیوبند کی "بھوک" کی یاد آپکو اشکبار کرتی ہے، بچے تھے، بچوں کی طرح رونے لگتے ہیں، مادر مہربان کی طرف سے بہلائے اور چمکارے جاتے ہیں، مگر کیوں روتے ہو؟ اس سوال کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی جو بچہ تھا، بچوں کی سی باتیں کر رہا تھا، اور بچوں کی طرح رو رہا تھا، اچانک اتنے بلند مقام پر نظر آتا ہے کہ پیران کہن سال کی بھی رسائی عام حالات میں اس مقام تک آسان نہیں، آخر خود سوچئے، مولانا طیب صاحب کی روایت کا یہ جز اگر صحیح ہے اور نہ صحیح ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ والدہ ماجدہ کے اس سوال پر آپ کے سامنے اپنے میزبان کا احسان آکر کھڑا ہو گیا، اور اس سے زیادہ اس احسان کا احساس ٹوکنے لگا، کہ جس نے اپنے یہاں تمہارے قیام کا بھی طعام کا بھی نظم کر رکھا ہے، ماں کے سامنے بھوک کی شکایت پیش کر کے اس کو رسوا کرو گے؟ ایک طرف میزبان کی اس ناشکری کا خیال، اور دوسری طرف یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں آئی کہ والدہ کو

"رنج گذرے گا"

مولانا طیب کی روایت کے بجنسہ الفاظ ہیں جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی بھوک کی خبر سے ان کو رنج ہوگا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیوبند والوں کی طرف سے والدہ کے دل میں رنجش پیدا ہو گی بلکہ میرے نزدیک تو دونوں کی گنجائش ہے۔

آٹھ نو سال کی عمر ہی میں جس کا ذہن واقعات اور ان کے مختلف پہلوؤں کے اتنے دور دراز گوشوں تک اچانک پھیل جاتا ہو، اور مسئلہ کے ہر فریق کے جذبات کے متعلق جو اتنا ذکی الحس واقع ہوا ہو، میں نے جیسا کہ عرض کیا باہر کیا گھر میں "بھوک" کی تکلیف اس کے سامنے پیش ہو جائے تو یہ اچنبھے کی بات نہ ہوگی، شیخ کرامت حسین بیچارے تو اس خیال میں ہونگے کہ جیسی عام بچوں کا حال ہوتا ہے یہی حال اس بچے کا بھی ہوگا، بھوک لگے گی مانگ لیا کرے گا مگر انکو کیا

معلوم تھا کہ طفولیت کے اس قالب میں "مکارم اخلاق" کی روح دبی ہوئی ہے، وہ پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ دوسروں کو آرام پہنچانے کیلئے تکلیف ہی میں اپنی ساری زندگی گذار دے گا۔ رحمۃ اللہ علیہ

مولانا طیب صاحب کی اس قلمی یادداشت سے علاوہ مذکورہ بالا امور کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیام دیوبند کے اسی زمانہ میں مہینہ دو مہینے پر دیوبند سے دو چار روز کیلئے اپنے وطن نانوتہ بھی تشریف لیجاتے تھے، تمہیدی بیان میں بتا چکا ہوں کہ دیوبند سے نانوتہ کا فاصلہ کل بارہ کوس تھا، والدین بلکہ اس وقت تو آپ کے جد امجد شیخ غلام شاہ صاحب بھی بقید حیات تھے، ان سب کی آنکھوں کی ٹھنڈک لگی خنکی صرف یکی ذات احد تھی، مہینہ دو مہینے سے زیادہ جدائی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کیلئے ناقابل برداشت بن جاتی تھی اور گو آمد و رفت کے اس سلسلہ میں خطرات بھی تھے، دشمن گھات میں تھے مگر بااین ہمہ آپ کو نانوتہ دو چار روز ہی کیلئے سہی بلالیا جاتا تھا۔

بہرحال دیوبند کے قیام کے ان دنوں کی اس خصوصیت کو یاد رکھنا چاہئے، کہ جوع (دھوک) کے ذاتی تجربہ کا موقعہ اس شخص کے لئے مہیا کیا گیا، جسکی بدولت ایک دو نہیں بلکہ ہزار ہزار بارہ بارہ سو طلبہ علم حق کو قریب قریب ایک صدی سے مسلسل دونوں وقت کھانا تقسیم ہو رہا ہے، اور زیادہ تر مفت بغیر کسی معاوضہ کے تقسیم ہو رہا ہے، قرآن میں جب صاحب نبوت کبریٰ علی صاحبہا الف سلام وتحیۃ کو فاما الیتیم فلا تقھر واما السائل فلا تنھر (تو یتیم کو نہ ڈانٹ اور سوال کرنے والے کو نہ جھڑک) کا حکم دیا گیا، تو اس سے پیشتر الم یجدك یتیما فآوی ووجدك ضالا[1] فھدی (کیا نہ پایا تجھے یتیم تو نہیں پناہ

[1] قرآن کے بعض الفاظ کی نوعیت عجیب ہے وطلباء ادنیٰ میں پہلی دفعہ جب وہ کان میں پڑتے ہیں تو کچھ جھجک سی محسوس ہوتی ہے سننے والے کچھ گھبرا جاتے ہیں اور سورۂ والضحیٰ کے اس لفظ "ضال" کا حال بھی یہی ہے سارے جہاں کے ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ضال کے لفظ کا انتساب لوگوں کو پریشان کئے ہوئے ہے اور طرح طرح کی تاویلوں اور توجیہوں میں لوگ الجھ جاتے ہیں، حالانکہ اسی لفظ کا جو ٹھیک لغوی مفہوم ہے اس کے سوا اس واقعہ کے اظہار کی کوئی دوسری شکل ہی نہیں ہو سکتی تھی جسے قرآن بیان کرنا چاہتا ہے، مطلب یہ ہے کہ فھدی (پس خدا نے راہ دکھائی) ظاہر ہے کہ یہ اسی ہدایت اور رہنمائی کی تعبیر ہے، جو وحی کے ذریعہ سے کی گئی اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس ہدایت یعنی وحی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی متعین راہ نہ تھی اور عربی زبان میں ضال اسی کو کہتے ہیں جو راہ ڈھونڈھ رہا ہو، مگر اسے صحیح راستہ نہ مل رہا ہو، پس وحی سے پہلے خود ہی سوچنا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے (باقی اگلے صفحہ پر)

دی اور پایا تم کو ناراہ یافتہ تو راہ دکھائی) کے الفاظ میں اس یتیمی اور ناراہ یافتگی کی یاد دلائی گئی تھی جس کے ذاتی تجربے سے خود پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گذرنا پڑا تھا۔

اور طلب علم کے ایام میں بھوک کا یہ تجربہ کہاں کرایا گیا؟ دیوبند میں، اور دیوبند میں بھی، دیوان محلہ کی اس خاص حویلی میں جس کے مغربی سمت میں ٹھیک پشت پر وہ مطبخ قائم ہے جہاں سے ہر روز سیکڑوں کی تعداد رکھنے والے طلبہ کی جماعت کو بھوک کی تکلیف سے نجات بخشی کا ذریعہ اسی کو بنایا گیا، جو اسی محلہ میں بھوک کے دکھ سے طلب علم کے ابتدائی دنوں میں کبھی تڑپایا اور رلایا گیا تھا۔

دیوبند کی اس پہلی رونق افروزی کے ایام میں قیام و طعام کے نظم کا یہ تذکرہ تھا، باقی جہاں آپ ہی کا قائم کیا ہوا دار العلوم دیوبند یا قاسمی یونیورسٹی ہے، وہاں پہنچکر آپ جہاں پڑھنے تھے جس سے پڑھتے تھے اور جو کچھ اس زمانہ میں آپ نے دیوبند میں پڑھا لکھا، سیکھا ان سوالوں کے تفصیلی جوابات کا علم جیسا کہ چاہیئے اگرچہ نہ ہو سکا، تاہم متفرق ذرائع سے اس سلسلے میں جو باتیں معلوم ہوسکی ہیں، انھیں پیش کر دیا جاتا ہے:

مصنف امام نے اس کا تذکرہ کرنے کے بعد کہ نانوتہ سے آپ دیوبند بھیجدیئے گئے ارقام فرمایا ہے۔

"یہاں (دیوبند میں) مولوی مہتاب علی صاحب کا مکتب تھا، شیخ کرامت حسین مرحوم کے گھر پر شیخ نہال احمد پڑھتے تھے، مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کو انھوں نے (یعنی مولوی مہتاب علی نے) عربی شروع کرائی" ص ۲۶

سچ پوچھئے تو ان ہی چند فقروں میں ان ساری باتوں کا اجمالاً ذکر آ گیا ہے، جنھیں ہم بیان کرنا چاہتے ہیں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۵) اس حال کی تعبیر آخر کیا کی جاتی، بلکہ اسی سے وحی کی ضرورت کا اندازہ ہوتا ہے، نوع انسانی کا برگزیدہ ترین فرد، سارے انسانی کمالات کا جو اکمل ترین مظہر اتم تھا، وحی کے بغیر جب وہ بھی ضال اور راہ نایافتہ تھا تو وحی کی ہدایت سے خود سوچنا چاہیئے کہ کون مستغنی ہو سکتا ہے، اگر ضال کا لفظ یہاں استعمال نہ ہوتا تو وحی کی قدر و قیمت کا جو صحیح اندازہ اس لفظ کی وجہ سے ہو رہا ہے کیا ہو سکتا تھا، اور میرا تجربہ کچھ اسی ایک لفظ "ضال" کے متعلق ہی نہیں ہے بلکہ قرآن کا ہر وہ لفظ جس سے شروع میں بھڑک پیدا ہو، یقین کیجئے کہ وہ وہاں کوئی بڑی اہم "حقیقت" پوشیدہ رکھتا ہے۔ ۱۲

مصنف امام نے جس وقت اپنی سوانح عمری مرتب فرمائی تھی، اور جن لوگوں کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی تھی، اس زمانے کے ان لوگوں کے لئے یہ ساری مجمل باتیں جانی پہچانی تھیں لیکن بجز ایک شیخ کرامت حسین مرحوم کے جن کا نام اسی کتاب کی تمہید میں مختلف حیثیتوں سے گذر چکا ہے، تھوڑے بہت حالات سے بھی ان کے کم از کم گذشتہ اوراق کے پڑھنے والے واقف ہو چکے ہیں، مگر ان کے سوا آج کون جانتا ہے کہ یہ مولوی مہتاب علی صاحب جن کا دیوبند میں مکتب قائم تھا، کون بزرگ تھے، اور شیخ نہال احمد جو ان سے پڑھتے تھے ان کی حیثیت کیا تھی، وہ گھر جس میں شیخ نہال احمد مولوی مہتاب علی صاحب سے پڑھتے تھے کہاں تھا؟ اور تو اور جہاں تک میں جانتا ہوں آج دیوبند میں بھی مشکل ہی سے کوئی ایسا آدمی مل سکتا ہے جو ان چیزوں کا صحیح واقف کار اپنے آپ کو پاتا ہو، جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھے گا ناواقفیت کی تاریکی بھی زیادہ گہری ہوتی چلی جائے گی، اسی لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب تک مختلف ذرائع سے ان امور کے متعلق جو معلومات فراہم ہوئی ہیں ان کو درج کر دیا جائے آج ممکن ہے ان کی قیمت کا صحیح اندازہ نہ ہو، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ کل تلاش کرنے والے کن کن چیزوں کو تلاش کریں گے۔

بہر حال سنئے یہ شیخ مہتاب علی صاحب ہمارے حضرت الاستاذ الامام شیخنا و شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نور اللہ مرقدہ کے سگے بڑے چچا یعنی تایا تھے، ادب عربی کی نصابی کتابوں کے مشہور شارح حضرت مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ یعنی شیخ الہند کے والد ماجد ان ہی شیخ مہتاب علی کے چھوٹے بھائی تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم کا بہت اچھا سلیقہ شیخ مہتاب علی صاحب مرحوم میں پایا جاتا تھا، مولانا طیب الحفید سلمہ اللہ نے اپنی قلمی یادداشت میں لکھا ہے کہ شیخ الہند کے والد مولنا ذوالفقار علی صاحب نے بھی ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی شیخ مہتاب علی صاحب سے پائی تھی، ان ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ جس زمانہ میں دیوبند کے اس مہتابی مکتب میں علم کی روشنی حاصل کرنے کے لئے شریک کرائے گئے تھے تو اس وقت شیخ الہند مرحوم کے والد ماجد مولنا ذوالفقار علی بھی اسی مکتب

میں زیر تعلیم تھے، اور جس جماعت میں مولانا نانوتوی لئے گئے تھے، مولوی ذوالفقار علی صاحب اس سے اوپر کی جماعت تک ترقی کر کے پہنچ چکے تھے، اتنی باتوں کا تو شیخ مہتاب علی صاحب مرحوم کے متعلق اب تک پتہ چل سکا ہے۔[1]

رہے شیخ نہال احمد انشاء اللہ تعالیٰ ان کا ذکر آگے بھی آئے گا، اور مختلف حیثیتوں سے آئیگا درحقیقت یہ ان ہی شیخ کرامت حسین یعنی دیوان محلہ کی ڈیوڑھی کے رئیس کے صاحبزادے ہیں، ان کے بعد دیوان محلہ کے رئیس وہی قرار پائے، گویا حاصل یہی ہوا کہ جہاں قیام و طعام کا نظم تھا، یعنی وہی دیوان محلہ کی ڈیوڑھی، اسی ڈیوڑھی کے کسی حصہ میں یہ مکتب خانہ قائم تھا اور یہی شیخ کرامت حسین کا گھر تھا، لیکن ڈیوڑھی کے کس حصہ میں یہ مکتب قائم تھا، مولانا طیب الحفید کی قلمی یادداشت میں ہے کہ

"یہ مکتب شیخ نہال احمد کی بیٹھک میں قائم تھا"

واللہ اعلم بالصواب۔ یہ بیٹھک شیخ کرامت حسین کی بیٹھک تھی، جو وراثۃً ان کے بعد نہال احمد کی بیٹھک بن گئی، یا شیخ نہال احمد صاحب کے لئے کوئی الگ بیٹھک بنادی گئی تھی، جس سے انکے بچپن میں تو مکتب کا کام لیا گیا، اور بعد کو وہی مکتب شیخ نہال احمد کی بیٹھک بن گیا، بظاہر قرینہ یہی ہے کہ دراصل یہ شیخ کرامت حسین ہی کی نشست گاہ تھی، جسے مصنف امام نے تو ان ہی کی طرف منسوب کردیا، اور چونکہ ان کے بعد شیخ نہال احمد کی بیٹھک بھی وہی رہی اس لئے مولٰنا طیب صاحب نے اس کو شیخ نہال احمد کی طرف منسوب کیا، بہرحال تھا یہ حصہ اسی دیوان محلہ کے اس قصر عظیم کا جو آج بھی کسی نہ کسی حیثیت کے ساتھ کھڑا ہوا ہے، مولانا طیب صاحب نے اپنی قلمی یادداشت

---

[1] مولانا طیب صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولٰنا ذوالفقار علی کا بھی حضرت نانوتوی اسی لئے غیر معمولی ادب کرتے تھے کہ بچپن کے استاد شیخ مہتاب علی صاحب کے وہ چھوٹے بھائی تھے ۱۲ "چھوٹے بھائی کا ادب کر کہ اسکے بڑے بھائی سے تم نے پڑھا ہے" مزدور اساتذہ سے ڈگری کی خریداری کا بھاؤ بٹہ کرنیوالے شاگردوں کیلئے ممکن ہے کہ "ادب کی یہ قسم عجیب و غریب" معلوم ہو، مگر یہ اس زمانے کی بات ہے جب استاد بھی استاد اور شاگرد بھی شاگرد تھے، تعلیمی دائروں کو بھی بیوپار کا بازار نہیں بنادیا گیا تھا ۱۲ فیالصیغۃ العلم والادب۔

دیوان محلہ کے اس حصہ کی جس سے مراد بیٹھک اور مکتب کا کام لیا جاتا تھا، اس کے محل وقوع کی نشاندہی کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

"جہاں اس وقت میری (یعنی مولٹنا طیب) کی مردانہ بیٹھک ہے"۔

جنھوں نے مولانا طیب صاحب کی مردانہ بیٹھک کو دیکھا ہے اور دیوان محلہ کی ڈیوڑھی جو اسی بیٹھک کے سامنے ہے، اس کو بھی دیکھا ہے، وہ مولانا طیب صاحب کے اس انکشاف سے سمجھ سکتے ہیں کہ دیوان محلہ کے جو حدود آج کل ہیں، کسی زمانہ میں ان کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہونی چاہئے۔ گویا یہ ماننا چاہئے، کہ دیوان محلہ کی ڈیوڑھی اور مولانا طیب کی مردانہ بیٹھک کے درمیان جو ایک قصباتی سڑک[1] واقع ہے، غالباً یہ سڑک پہلے نہ تھی، اور مولٹنا کی بیٹھک دیوان محلہ کی ڈیوڑھی سے بغیر کسی درمیانی فصل کے غالباً ملی ہوئی تھی، خدا کا شکر ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے اس تاریخی "مکتب خانہ" کا محلِ وقوع صرف یہی نہیں کہ مولٹنا طیب الحفیدؔ کے مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں متعین ہی ہو جاتا ہے، بلکہ زمانہ کے الٹ پھیر نے اسی گھر میں اس تاریخی مکتب خانہ کو پہنچا دیا جس گھر کے ساتھ نہ صرف دیوبند کا دارالعلوم بلکہ سچ پوچھئے تو فراخنائے ہند کی دینی تعلیم کی عمومیت کا نظام تقریباً ایک صدی سے وابستہ ہے، مجھے امید ہے کہ مکتب کے اس تاریخی مکان کی حفاظت کی جائیگی کہ دینی تعلیم کی عمومیت کا سرچشمہ یہیں سے پھوٹا۔

بہر حال جن سے پڑھتے تھے، جہاں پڑھتے تھے، بلکہ شاید اسی کے ساتھ جن لوگوں کے ساتھ پڑھتے تھے کسی نہ کسی حد تک یہ باتیں تو معلوم ہو چکیں، اب رہ گیا آخری سوال یعنی دیوبند کی مکتبی تعلیم کے اس دور میں آپ کو کن کن چیزوں کے پڑھنے کا موقعہ ملا، افسوس ہے کہ مصنف امام کے اس مجمل بیان کے سوا جو گذر چکا یعنی مولوی مہتاب علی صاحب نے اس مکتب میں مولٹنا محمد قاسم کو

[1] قصباتی سڑک سے میری مراد یہ ہے کہ شہروں میں تو عموماً پتھر کی سڑکیں ہوتی ہیں لیکن روہیلکھنڈ کے عام قصبات میں رواج ہے کہ اینٹوں سے پاٹی ہوئی سڑکیں بنائی جاتی ہیں جو شہری سڑکوں کی جیسی چوڑی چکلی تو زیادہ نہیں ہوتیں لیکن صفائی اور مسطح ہونے کے لحاظ سے بہتر ہوتی ہیں۔ عموماً دیوبند میں اسی قسم کی سڑکیں پائی جاتی ہیں اور اس سڑک کا بھی یہی حال ہے ۱۲

عربی شروع کرائی، مزید اور کچھ نہ معلوم ہو سکا، لیکن اسی سے اس کا پتہ چلا کہ نانوتہ سے جس وقت آپ باہر نکلے ہیں، اس وقت اتنی لیاقت اور قابلیت آپ میں پیدا ہو چکی تھی کہ عربی شروع کرانے کی صلاحیت مولوی مہتاب علی صاحب نے آپ کے اندر پائی، عربی شروع کرانے کا مطلب اس زمانہ کے لحاظ سے یہی ہو سکتا ہے کہ میزان و منشعب کے ذریعہ عربی صرف آپ سیکھنے لگے، جاننے والے جانتے ہیں کہ تھوڑی بہت فارسی جانے بغیر صرف کی ان ابتدائی کتابوں کو کوئی پڑھ نہیں سکتا اس لئے ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ نانوتہ سے جس وقت باہر قدم آپ نے رکھا، اس وقت کم از کم میزان منشعب تک کے سمجھنے کی قابلیت فارسی ادب میں آپ حاصل کر چکے تھے، اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آیندہ دیوبند کے بعد سہارنپور پہنچکر پڑھنے کا جو مرحلہ پیش آیا جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، اس میں عربی کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "فارسی" کی کتابیں بھی سہارنپور میں آپ نے پڑھیں جس کا مطلب یہی ہوا کہ فارسی ادب کا کامل رواجی نصاب ابھی پورا تو نہیں ہوا تھا، مگر میزان و منشعب جیسی کتابوں کی فارسی عبارت کے سمجھنے سمجھانے کا سلیقہ آپ میں پیدا ہو چکا تھا۔

دیوبند کے اس مہتابی مکتب کے ایام طالب العلمی کا ایک لطیفہ یہاں قابل ذکر ہے، مولانا طیب الحفید سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس لطیفہ کا تذکرہ اگرچہ ضمناً سرسری طور پر قلمی یادداشت میں فرمایا ہے، مگر جس طریقہ سے انھوں نے اس کا تذکرہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لطیفہ عام طور پر لوگوں میں مشہور و معروف تھا، بہ ظاہر یہ ایک لطیفہ ہے، مگر میرے نزدیک وہ لطیفہ نہیں بلکہ حضرت والا کی اجتبائی شان کی جھلک اس میں بھی مجھے محسوس ہوتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت نانوتوی کے متعلق عموماً یہ سمجھا جاتا ہے، اور آپ کی تصنیف کردہ کتابوں سے بھی ایک حد تک اسی کا اندازہ ہوتا ہے، کہ مطالعہ اور کتب بینی کا چنداں ذوق آپ نہیں رکھتے تھے آپ کی کتابوں کو پڑھ جائیے، زیادہ تر آپ کے ذاتی اجتہادی نتائج اور ایسی باتیں جنھیں آپ کی اپج ہم کہہ سکتے ہیں، ان سے عموماً آپ کی گرانمایہ تصنیفات لبریز نظر آئیں گی، رہا دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کا حوالہ یا اعادہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عادت نہیں تھی، انشاءاللہ حضرت والا کی

اس علمی خصوصیت پر تفصیلی بحث آئندہ کی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ اس عام مشہور قصے کا واقعہ سے کس حد تک تعلق ہے!

یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ کاغذلیسی یا ورق گردانی جو مولویت یا علمی زندگی رکھنے والوں کا گویا ایک مرض ہے، یہ مانا جاتا ہے کہ اس مرض کے آپ مریض اور اس بیماری کے آپ بیمار نہیں تھے نہ صرف عوام بلکہ حضرت حکیم الامت التھانوی قدس اللہ سرہ العزیز تک بھری مجلسوں میں بغیر کسی جھجھک عموماً فرمایا کرتے تھے کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں"

ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ اس زمانہ میں نظامیہ درس کا جو نصاب تھا اسکی تکمیل آپ نے نہیں فرمائی تھی، کیونکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، آپ کے تکمیلی نصاب کی کتابوں کی فہرست جو اپنے موقعہ پر درج ہوگی، اسی سے اس احتمال کی تردید ہو جاتی ہے، حضرت تھانوی سے بڑھ کر اس واقعہ کا علم اور کسے ہو سکتا ہے، بلکہ مقصد مبارک حکیم الامت کا وہی ہے کہ مطالعہ کے ذریعہ کتب بینی کی عام مولویانہ رسم سے آپ کو دلچسپی نہ تھی، اسی لئے کتابوں کے پڑھنے کا زیادہ موقعہ آپ کو نہ مل سکا، اور قصے کو حضرت تھانوی صرف اسی فقرے پر ختم نہیں فرما دیتے تھے، بلکہ آگے اس کا اضافہ بھی فرماتے کہ

"پڑھنے کے زمانہ میں بھی بہت شوق و مشقت سے نہ پڑھا تھا" قصص لاکابر الہادی ۲۹ ماہ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ

اس وقت میری اصلی غرض کا تعلق حکیم الامت قدس اللہ سرہ کے بیان کے اسی جزء سے ہے ظاہر ہے کہ "شوق و مشقت سے نہ پڑھا تھا" طالب العلمانہ زندگی کی طرف اس کا انتساب کوئی معمولی بات نہیں ہے، کامل اعتماد، اور غیر مشتبہ وثوق تام ہی کے بعد اتنی بڑی اہم شہادت کی گنجائش حضرت حکیم الامت جیسی ذمہ دار ہستی کے بیان میں پیدا ہو سکتی ہے، تواتر اور شہرت کی راہ سے جب تک یہ بات ان تک نہ پہنچی ہوگی، ہرگز وہ اسکی جرءت نہیں فرما سکتے تھے۔

اب ایک طرف رکھئے اس متواتر یا کم از کم مشہور خبر کو کہ حضرت نانوتوی نے پڑھنے کے زمانے

میں بھی بہت شوق اور مشقت سے نہ پڑھا تھا' اور دوسری طرف سنئے اس لطیفے کو جس کا تعلق حضرت نانوتوی کے پڑھنے ہی کے اس زمانے سے ہے، جب آپ دیو بند کے مکتب میں زیر تعلیم تھے، مولانا طیب الحفید سلمہ نے یہ لکھتے ہوئے کہ

"مولوی مہتاب علی صاحب مرحوم جو مولانا (حضرت نانوتوی) کے استاذ تھے، ظریف شخص تھے اور براہ فراست ہر ایک شاگرد کا اس کے حسب حال اس کا نام رکھتے تھے"

حال کے مطابق ظریفانہ ناموں کی تجویز مولوی مہتاب علی صاحب کی جو فراست کیا کرتی تھی' اسی فراست نے حضرت نانوتوی میں جس "حال" کو پایا' اور پاکر اسی کے مطابق نام تجویز کیا' یہ نام کیا تھا؟ سنئے مولٰنا طیب فرماتے ہیں کہ

"چنانچہ مولانا مرحوم (حضرت نانوتوی) کا نام"

"علم کی بکری"

"رکھا تھا"

"علم کی بکری" ہے تو یقیناً ایک ظریفانہ نام' مولوی مہتاب علی صاحب کی فطرت میں مزاح و ظرافت کا جو جذبہ تھا اس کی غمازی خود ان کا رکھا ہوا نام کر رہا ہے، مگر آپ سن چکے کہ یہ نام یوں ہی بلا وجہ کیف ما اتفق نہیں رکھ دیئے جاتے تھے، بلکہ حال کے مطابق مولوی مہتاب علی صاحب کی صرف ظرافت ہی نہیں بلکہ فراست بھی ان ناموں کی تجویز میں دخیل تھی' پس اب یہی سوچنے کی بات ہے کہ مکتب کے جس بچہ کو "علم کی بکری" کا نام دیا گیا تھا' اس کے کس حال کا مشاہدہ مولوی مہتاب علی صاحب کی فراست نے کیا تھا' اور ان کا یہ رکھا ہوا نام اس بچہ کے کس حال کو ہم پر واضح و نمایاں کرتا ہے!

بکری کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہوتی ہے کہ ہر وقت زمین میں منہ جھکائے، کھانے کی جو چیز بھی مل جائے' اسے کھاتی رہتی ہے' اور جنگلوں میں جب بجائے گھاس کے' درخت کے پتوں کے چرنے کا موقعہ اسے مل جاتا ہے تو پتوں کی خاردار شاخیں خواہ جس قسم کے کانٹوں ہی

سے کیوں نہ بھری ہوں۔ لیکن دونوں ٹانگیں اٹھائے جہاں تک ممکن ہوتا ہے بلند سے بلند شاخوں کے پتوں تک پہنچنے اور ان کے چبا لینے کی کوشش سے کبھی نہیں تھکتی، بلکہ بسا اوقات امکانی حدود سے بھی آگے نکل جانے کی کوشش سے باز نہیں آتی[۵]، یا ایسی چیز جسے وہ کھا سکتی ہو، تلاش کرتی رہتی ہے، صبح سے شام تک اسی ایک واحد مشغلے میں بکری مشغول رہتی ہے، اسی بنیاد پر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دیوبند پہنچنے کے بعد بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے لکھنے کا جتنا سلیقہ مولانا میں پیدا ہو چکا تھا، اور اس وقت تک جو چیزیں آپ پڑھ سکتے تھے ان کا پڑھنا اور پڑھنے میں مستغرق و مشغول رہنا یہی حال آپ کا تھا، جو مولوی مہتاب علی صاحب کی فراست پر منکشف ہوا، اور اپنے ننھے منّے کم سن شاگرد میں مطالعہ کے اسی غیر معمولی شوق و ذوق کو دیکھ کر بکری کی تشبیہ ان کی سمجھ میں آئی، جیسے ہر اس چیز میں جس میں کچھ ملنے کی امید ہو، بکری منھ ڈالتی چلی جاتی ہے، کتابوں کے ساتھ یہی تعلق اپنے شاگرد کا ان کو محسوس ہوا، اور ظرافۃً یہی نام تجویز کر دیا۔ اس کے سوا آپ ہی بتائیے کہ کسی طالب العلم کے کس حال کو بکری کے کسی حال کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے'؟

اب کچھ بھی ہو "علم کی بکری" کے اس ظریفانہ سانحہ ہی فریسانہ نام سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے، کہ کتابوں سے یا کتابی معلومات سے جیسا کہ سمجھا جاتا ہے کہ مولنا نانوتوی کو دلچسپی نہ تھی، یا کتابوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، طالب العلمی ہی کے دنوں میں دیکھا جاتا تھا کہ اس کے متعلق زیادہ شوق آپ میں نہیں پایا جاتا۔ اور اس کے سمجھنے یا دکرنے میں زیادہ مشقت اور محنت سے کام نہیں لیتے۔ یہ حال آپ کا، اور گو اس عمر کے لحاظ سے جو دیوبند کی مکتبی تعلیم کے زمانہ میں آپ کی تھی، بہ ظاہر اس دعویٰ کا انتساب آپ کی طرف عوام کے لئے

---

[۵] عربی زبان کی ایک ضرب المثل کی تشریح میں لوگ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن کسی پہاڑ پر بکری چڑھی تھی، اس عرصہ میں دھنک آسمانی فضا میں نمودار ہوئی، جس کا ایک حصہ اس پہاڑ سے گذرتا تھا جس پر بکری چر رہی تھی، دھنک کو اور اس کے سبز و سرخ منظر کو دیکھ کر بکری نے خیال کیا کہ سامنے ایک بڑی چراگاہ آگئی۔ منھ مارا۔ کنارے پر کھڑی تھی، دھنک تک تو نہ پہنچ سکی، لیکن چرائی کے اس غیر معمولی ذوق و شوق نے غریب بکری کو زمین تک پہنچا دیا، پہاڑ سے گر پڑی اور جاں بحق ہو گئی ۱۲

کچھ ناقابل برداشت ہو، جسے اب میں پیش کرنا چاہتا ہوں، مگر شبر کو شیر پر اگر قیاس نہ کیا جائے اور جو چنے جاتے ہیں ان اجتبائی ہستیوں کے حالات کی پیمائش اس گز سے نہ کی جائے، جس سے عوام ناپے جاتے ہیں تو پھر مسئلہ میں یہی نہیں کہ دشواری باقی نہیں رہتی، بلکہ دل چاہتا ہے، اور ہر عقل تقاضا کرتی ہے کہ واقعہ کی نوعیت یہی ہونی چاہیئے، جواب آپ کے سامنے آتی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو سمجھانے سے بآسانی اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتیں جب تک آدمی کو ان کے تجربے کا خود براہ راست موقعہ نہ ملے۔

ذوق این مے نہ شناسی بخدا تا نچشی

اس قسم کے حقائق سے اس فیصلہ کا تعلق ہے من لم یذق لم یدر (جس نے نہ چکھا نہ جانا) مرض عشق کے شکار سے کسی نے پوچھا، اور اس نے پوچھا جو اب تک کسی پر عاشق نہیں ہوا تھا، کہ آخر یہ عاشقی ہے کیا بلا؟ جواب میں غریب عاشق نے کہا کہ "جو کچھ میں ہوں وہی تم ہو جاؤ، تب جانو گے کہ یہ عاشقی کس بلا کا نام ہے"، شاعر نے اسی مقصد کو ادا کرتے ہوئے کہا ہے

پرسید یکے کہ عاشقی چیست گفتم کہ چو ماشوی بدانی

بہر حال مجھے کہنا یہ ہے، کہ دیوبند حضرت والا جس وقت تشریف لائے ہیں، جیسا کہ معلوم ہو چکا اس سے پہلے ہی نانوتہ ہی کے مکتب خانوں میں نہ صرف یہی کہ اردو فارسی کے حرف آشنا ہو چکے تھے بلکہ ایک حد تک ان دونوں زبانوں کی مکتبی تعلیم کی کافی منزل طے کر چکے تھے، آخر یہ صورت حال نہ ہوتی، تو دیوبند پہنچنے کے ساتھ مولوی مہتاب علی صاحب ان کو عربی میں کیوں لگا دیتے اور لگا کیسے سکتے تھے، فارسی کی سواد خوانی کی کچھ نہ کچھ صلاحیت عربی صرف کی ابتدائی کتابوں (میزان منشعب وغیرہ) کے پڑھنے کے لئے ضروری ہے، بلکہ ذہن و فہم کی شگفتگی بھی ایک خاص حد تک طالب العلم کی جب تک نہ پہنچی ہو، عربی صرف کی ابتدائی کتابیں بھی ایسا استاد شروع نہیں کرا سکتا جو بچوں کی تعلیم کا صحیح سلیقہ اور کافی تجربہ رکھتا ہو، جب تک اپنے شاگرد میں مولوی مہتاب علی صاحب نے یہ محسوس نہ کر لیا ہو کہ جو کچھ اس کو سمجھایا جائے گا، اسے سمجھ لیگا، اس وقت

تک وہ ہرگز آپ کو عربی میں لگانے کی جرأت نہ کرتے۔

اسی لئے میرا خیال ہے کہ دیوبند کے مہتابی مکتب میں جس وقت آپ شریک ہوئے ہیں، اس وقت اردو اور فارسی کی کتابوں کے مطالب کے سمجھ لینے کی قابلیت بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ میں پیدا ہو چکی تھی، خواہ آٹھ نو سال کی عمر کے کسی بچے کے لئے اس قسم کی کیفیت باعث تعجب ہی کیوں نہ ہو، مگر پچاس سال سے کم عمر پانے والی شخصیت سے جو کام آئندہ لیا گیا، کیسا کام؟ کہ سَو سَو سال سے زیادہ جینے والے بھی ہزاروں کی تعداد میں مل کر بھی اس کام کو ان مشکلات اور حالات میں اگر انجام دینا چاہتے، جن میں وہ گھرے ہوئے تھے تو شاید وہ انجام نہ پاتا، پچاس سال سے بھی کم عمر میں جب اس نے یہ کر کے دکھایا، جسے آج دنیا دیکھ رہی ہے، ہندوستان کا ہر صوبہ ہر ضلع ہر سب ڈویژن بلکہ گاؤں گاؤں دیکھ رہا ہے، ہندوستان کے باہر والے بھی دیکھ رہے ہیں۔ تو ایسے شخص کے متعلق اس پر کیوں تعجب کیا جائے کہ اتنی چھوٹی عمر میں ایسی قابلیت اس میں کیسے پیدا ہو گئی، ہو سکتا ہے کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں بچوں میں اس کی نظیر نہ مل سکے، مگر میں پوچھتا ہوں کہ جوانوں اور بڈھوں کی لاکھوں لاکھ ہی نہیں کروڑ ہا کروڑ کی تعداد میں جب اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے، جو کام قدرت نے اس سے انجام دلایا اور جن حالات میں انجام دلایا خود سوچئے کہ آٹھ نو کروڑ مسلمانوں سے بھرے ہوئے اس ملک ہندوستان میں اس کی مثال کیا آسانی سے مل سکتی ہے؟ اسلامی ہند کی تیرہویں اور چودھویں صدی میں ڈھونڈھئے، اس کے جوڑ کے کتنے آدمی آپ کو ملیں گے؟ جو نہیں جانتے ہیں وہ تو خیر معذور ہیں، شاید اصل حقیقت ان پر اس کتاب کے پڑھنے سے واضح ہو گی، مگر جو جانتے ہیں میں ان سے پوچھتا ہوں کہ جب جوانوں اور عمر رسیدہ لوگوں میں اس کی نظیر مشکل سے دستیاب ہو سکتی ہے، تو پھر بچوں میں بھی اگر دوسرے ہم سن بچوں کے مقابلہ میں وہ کچھ انوکھا انوکھا نرالا نرالا سا اپنی ہر شان میں نظر آ رہا تھا، تو یہ اچنبھے کی کون سی بات ہے)

کچھ بھی ہو میرا خیال ہے اور یہ خیال واقعات و حقائق کی روشنی میں میرے اندر پیدا ہوا ہے

کہ آپ جب مولوی مہتاب علی صاحب کے مکتب میں زیر تعلیم تھے، اسی زمانہ میں جو کچھ پڑھ سکتے تھے اور ہر ایسی کتاب جس کے سمجھ لینے کی صلاحیت اپنے اندر پاتے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پڑھے بغیر اس کتاب کو ہاتھ سے چھوڑ نہیں سکتے تھے۔

میرے نزدیک آپ کے فریس وظریف استاذ کا عطا کیا ہوا یہ ظریفانہ خطاب یعنی "علم کی بکری" ظرافت کے ساتھ آپ کے ایام طفولیت کے اسی خاص پہلو کا شارح بھی ہے، ہر چیز کے چک لینے اور جو گھاس بھی سامنے آجائے اس کے چر لینے کی عام عادت بکریوں میں جو ہوتی ہے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کبھی کبھی امکانی حدود سے تجاوز کر کے دیکھا جاتا ہے کہ بکریاں ببول کے جن درختوں کے ساتھ الجھی ہوئی ہیں بڑی بڑی نوک رکھنے والے تیز کانٹے بھی چبھ رہے ہیں، لیکن ایک شاخ تک پہنچ کر چاہتی ہیں کہ اوپر کی شاخوں کے پتوں تک پہنچ جائیں، اگر مشبہ بہ کی اس خصوصیت کو سامنے رکھ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ رسائی کے حدود میں جو کتابیں آپ کو مل جاتی تھیں، صرف ان ہی کو نہیں بلکہ عمر اور علم کے لحاظ سے جن کتابوں کے مضامین آپ کی حد پرواز سے اس زمانہ میں باہر بھی تھے تشبیہ کا اقتضار تو یہی ہے، کہ شاید ان کو بھی نہیں چھوڑتے ہوں گے۔

یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں طباعت اور پریس کا اتنا رواج ہندوستان میں نہیں ہوا تھا، جس نے آج ملک کے کوچہ و بازار کو کتابوں، رسالوں، اخباروں سے پاٹ دیا ہے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ جس زمانہ سے ہماری بحث کا تعلق ہے، اس وقت ہندوستان میں مطابع قائم ہو چکے تھے اور اردو کی تو نہیں لیکن فارسی ادب نثر و نظم کی کتابوں کی طباعت نشر و اشاعت کا اگر عہد شباب نہیں تو ریعان شباب کا زمانہ یقیناً وہی تھا، جس زمانہ سے ہم اس وقت گذر رہے ہیں، یہ زمانہ تو کم از کم ہندوستان کی حد تک فارسی ادب کا عہد مرگ ہے، لیکن اس سے پہلے پریس سے روشناس ہونے کے بعد اسی فارسی ادب کی کتابوں پر کامل جوانی کا زمانہ اسی ملک میں گذر چکا ہے، بہتر سے بہتر معیاری کتابیں جو اب تک قلمی شکل میں ملتی تھیں، پریس سے چھپ چھپ کر عام و خاص تک پہنچ رہی تھیں، پرانے علمی خاندانوں کے مرحوم

کتب خانوں کا جائزہ لیجئے، آپ کو معلوم ہوگا کہ جن کتابوں کے نام تک سے ہماری موجودہ نسلیں ناواقف ہیں، گھر گھر پھیلی ہوئی تھیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ظریف وشفیق فریس وقیاف استاذ کی طرف سے یہ ظریفانہ خطاب یقیناً بلاوجہ آپ کو نہیں ملا تھا، دیوبند جس وقت پہنچے تھے، اور دیوبند پہنچنے کے بعد بھی جو کچھ آپ سیکھ رہے تھے، اس کے لحاظ سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اردو اور فارسی زبانوں کی کتابوں کے ساتھ آپ کے غیر معمولی شغف اور دلچسپی کو دیکھ کر استاد نے آپ کا یہ نام رکھ دیا تھا، لیکن جیسا کہ آپ سن چکے دیوبند ہی میں عربی کی ابتدائی کتابیں یعنی عربی زبان کے علم صرف کی ابتدائی کتابیں میزان ومنشعب وغیرہ بھی آپ کو شروع کرادی گئی تھیں، ان کتابوں کے پڑھنے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ عربی زبان کی کتابوں کے سمجھنے کی صلاحیت تو پیدا نہیں ہو سکتی، لیکن قدرتاً عربی آمیز فارسی کے سمجھنے میں کچھ نہ کچھ سہولت ضرور پیدا ہو جاتی ہے، عربی آمیز فارسی کے ایسے الفاظ جو عربی صرف سے ناواقف آدمی کے لئے دشوار سمجھے جاتے ہیں، ان کی دشواری میں گونہ کمی ضرور پیدا ہو جاتی ہے، اگرچہ کسی نے صراحۃً اس کا تذکرہ تو نہیں کیا ہے، لیکن ہمارے مصنف امام رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی میں آپ کی پہلی تشریف آوری کا جہاں ذکر کیا ہے، وہیں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"مولوی صاحب (یعنی حضرت نانوتوی) نے کافیہ شروع کیا، اور احقر (یعنی خود مصنف امام) نے میزان وگلستان" ص۲۵

آگے لکھا ہے کہ

"والد مرحوم نے میرے ابواب کا سننا، اور تعلیلات کا پوچھنا ان کے (یعنی حضرت نانوتوی) کے سپرد کیا تھا"

"ابواب" اور "تعلیلات" علم صرف کی ان فنی اصطلاحوں سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کافیہ شروع کرنے والے بچہ کے حوالہ ان صرفی امور کی پوچھ گچھ کا کام اسی وقت

کیا جا سکتا ہے، جب اس کا اطمینان ہو کہ پوچھنے والا ان کے متعلق کافی ملکہ اپنے اندر پیدا کر چکا ہے، اسی بنیاد پر میرا خیال ہے کہ مولوی مہتاب علی صاحب نے بھی صرف کی اس ابتدائی تعلیم میں کافی توجہ سے کام لیا تھا، اور خود مولانا مرحوم بھی کافی محنت اور شوق سے ان چیزوں کو سمجھتے اور یاد کرتے تھے جو کچھ آپ کو اس مکتب میں سکھایا جاتا تھا، مصنف امام نے اسی موقعہ پر یعنی دہلی کی ابتدائی تعلیمی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ہر جمعہ کی رات کو چھٹی ہوتی تھی، صیغوں اور ترکیبوں کا پوچھنا معمول تھا، یاد ہے کہ مولوی صاحب سب میں عمدہ رہتے تھے۔" صفحہ ۲۸

"ترکیبوں" کے لفظ کا تعلق تو خیر نحو سے ہے، جس کی باری پرانے نصاب کی رو سے بعد کو آتی تھی میں قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ دلی تشریف لے جانے سے پہلے علم نحو کی جو کتابیں "کافیہ" سے پہلے پڑھائی جاتی ہیں، مولانا نانوتوی نے علم نحو کی ان کتابوں کو کہاں پڑھا؟ دیوبند کے اسی مہتابی مکتب میں یا دیوبند کے بعد سہارنپور میں اس کا موقعہ آپ کو ملا۔ کیونکہ دیوبند کے متعلق جیسا کہ نقل کر چکا ہوں، مصنف امام نے صرف یہ لکھا ہے کہ یہاں ان کو عربی شروع کرائی گئی، شروع تو یقیناً صرف ہی کی کتابوں سے ہوا، مگر تعلیم کی جو مدت دیوبند میں گذری اس میں صرف کے ساتھ ساتھ جیسا کہ عام قاعدہ ہے علم نحو کے شروع کرنے کا موقعہ یہاں آپ کو ملا یا نہیں، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، اس سلسلہ میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ کافیہ سے پہلے اس زمانہ میں عربی پڑھنے والوں کو جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، وہ آپ پڑھ چکے تھے، لیکن اس راہ کی مختلف منزلیں کہاں کہاں پوری ہوئیں، کہاں تک دیوبند ہی میں پہنچ چکے تھے، اور دیوبند سے الگ ہونے کے بعد سہارنپور میں کیا کیا پڑھا؟ ان سوالوں کے تفصیلی جوابوں کا علم نہ ہو سکا، اور جو کچھ معلوم ہو سکا ہے اس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

بہر حال اتنی بات تو قطعی ہے کہ "ابواب" و "تعلیلات" جن کا براہ راست علم صرف سے تعلق ہے ان کی غیر معمولی مشق بہم پہنچانے کا موقعہ یقیناً آپ کو دیوبند میں بھی ملا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ مولوی مہتاب علی صاحب علم صَرف کی تعلیم کے ساتھ کچھ خصوصی تعلق رکھتے تھے، جس کا کچھ اندازہ خود ان کے برادر خورد حضرت شیخ الہند کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب کی ادبی قابلیت سے بھی ہوتا ہے۔

کچھ بھی ہو، میرا خیال یہی ہے، اور مختلف قرائن وقیاسات کی تائید اس خیال کو حاصل ہے کہ دلی پہنچنے کے بعد "ترکیبوں" کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا، مگر "صیغوں" کے پہچاننے اور جاننے میں مولانا نانوتوی بقول مصنف امام جو "سب میں عمدہ رہتے تھے" تو "سب سے" عمدہ رہنے کے اس امتیاز میں اگر کلیۃً نہیں تو اکثر وبیشتر حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیوبند کی مکتبی تعلیم ہی کو زیادہ دخل ہے، وہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی "بنیاد" شروع میں مضبوط اور مستحکم کردی گئی، اور عربی صَرف کی اسی استواری کا یہ نتیجہ اگر ہوا ہو، کہ عربی آمیز فارسی کی کتابوں تک آپ کے مطالعہ کا دائرہ وسیع ہوگیا ہو، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔

اس کا صحیح طور پر علم نہ ہوسکا کہ دیوبند کے اس مہتابی مکتب میں آپ کتنے دنوں زیرِ تعلیم رہے بہرحال یہ مدت جتنی بھی ہو، اس مدت میں بجز ان دنوں کے جو مہینہ دو مہینے بعد نانوتہ میں گذرتے تھے یعنی تین چار دن کے لئے جیسا کہ گذرا آپ گھر بلائے جاتے تھے، زیادہ حصہ اس عزیز اور قیمتی وقت کا دیوبند ہی میں گذرا، اور ٹھیک اسی محلہ میں گذرا، اسی خطہ میں گذرا، جس کے سامنے آپ کا قائم کردہ دارالعلوم آج قائم ہے، سیدنا الامام الاستاذ مولنا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کتاب ارواح ثلاثہ میں دارالعلوم دیوبند کی موجودہ پرشکوہ عمارتوں کے متعلق یہ فقرہ جو درج کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ

"حاجی صاحب مرحوم (یعنی حاجی عابد حسین[1] مرحوم)، کے سامنے (دارالعلوم کا) وہ مستقبل

---

[1] قصبہ دیوبند کے خانوادۂ سادات سے آپ کا تعلق تھا، ان کا ذکر تفصیلاً اپنے موقعہ پر آئے گا، دارالعلوم دیوبند سے ان کا خصوصی تعلق ہے، ابتداء میں حاجی صاحب کا خیال تھا کہ مدرسہ کے لئے دیوبند کی جامع مسجد کے حجرے کافی ہیں ۱۲

نہ تھا، جو حضرت (مولانا نانوتوی) کو نظر آرہا تھا' ان کی فراست کے سامنے یہ مکتب مدرسہ اور پھر مدرسہ سے دار العلوم ہونے والا تھا۔" صفحہ ۱۸۹

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جن کا شمار بساط قاسمی کے اخص الخواص بزرگوں میں تھا' ان بزرگوں کی زبان مبارک سے سنے ہوئے اس فقرے نے میرے ذہن کو ایک خاص خیال کی طرف منتقل کر دیا' اگرچہ میرا یہ ایک ذاتی خیال اور ذہنی انتقال ہے' مگر اب جب کہ دیوبند کے اس مکتب سے حضرت والا کی روانگی کے ذکر کا موقعہ آگیا ہے' جی نہیں مانتا کہ اپنے اس ذاتی خیال کو اپنے خیال ہی کی حد تک محدود رکھوں۔

ذرا سوچئے' ان دنوں کو جب آج سے ایک صدی سے بھی پہلے دیوان محلہ کی عمارت کے اندر' یا اسی عمارت سے تعلق رکھنے والے ایک مکان میں مولوی مہتاب علی صاحب کا مکتب خانہ قائم ہے' اس ڈیوڑھی کے سامنے بسمت مغرب اسی وسیع و عریض خطے میں جس میں دار العلوم کی بیسیوں عمارتیں پھیلی ہوئی ہیں' بجائے ان عمارتوں کے وہاں کچھ میدان کچھ تالاب' کچھ باغوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے' بچے مکتب سے چھوٹتے ہونگے' ان کے کھیل کود' سیر و تفریح کا طبعی مرکز سامنے کا یہی علاقہ ہوگا' ان ہی بچوں میں ایک "بچہ" وہ بھی تھا' جس کے لئے قدرت کی طرف سے مقدر ہو چکا تھا کہ اسی علاقہ میں اسی بچے کے ہاتھوں سے چند سال بعد ایک عظیم الشان دار العلوم کا سنگِ بنیاد رکھا جائے گا' اور ایک حد تک اپنی ہی زندگی میں بعض بلند و بالا عمارتوں کو اسی میدان میں اپنے سامنے کھڑی پائے گا' اس خیال کو پیش نظر رکھئے' اور اس کے بعد سوچئے کہ عمر پانے کے بعد جس بچے کے ہاتھوں واقعیت کا قالب جس کام نے اختیار کیا' اگر نو عمری اور طفولیت کے زمانہ میں اسی بچہ کے دل و دماغ میں اسی کا خیال' صرف خیال' اجمالی ہلکا سا خیال' اگر آیا ہو' تو کیا یہ ایسا خیال ہے جس کا ہم خیال بھی نہیں کر سکتے؟ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ کہ حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کے سامنے "وہ مستقبل نہ تھا' جو حضرت کو نظر آرہا تھا' اس سے اتنی بات تو بہر حال ثابت ہے کہ دار العلوم دیوبند کی طویل و عریض' بلند و بالا عمارتیں آج اس

قصبہ کے جس خطہ اور حصہ میں ہر دیکھنے والے کو وقوع پذیر ہونے کے بعد نظر آرہی ہیں، سیدنا الامام الکبیر کے ایک محرم اسرار عاشق زار کی یہ شہادت ہے کہ وقوع سے پہلے وہ ان کو دیکھ رہے تھے؟ بحث اگر کچھ ہو سکتی ہے تو اسی سوال پر، دار العلوم کا اتنا تفصیلی خاکہ یعنی جو مکتب ہے، وہ مدرسہ، اور مدرسہ بالآخر دار العلوم بن جائے گا۔

ظاہر ہے کہ عہد طفولیت میں اس کی گنجائش مشکل ہی سے پیدا ہو سکتی ہے بلکہ حضرت شیخ الہند نے جیسا کہ فرمایا ملکۂ فراست کے روشن ہونے کے بعد ہی یہ توقع کرنی چاہئے کہ اس کی روشنی میں اتنی وضاحت کے ساتھ مستقبل کی اتنی مفصل تصویر آپ کے سامنے آئی ہوگی لیکن اس میں کچھ مضائقہ نہیں اگر ہم یہ سوچیں کہ مکتبی زندگی میں اپنے موجودہ مکتب سے زیادہ بہتر شکل میں درس گاہ کا خیال اسی میدان میں جو مکتب کے سامنے ہی تھا، کبھی کبھی آجاتا ہو، خصوصاً تعمیری وسعت کے لئے محلہ دیوان کی ڈیوڑھی کی عمارتیں تخیل کو سہارا دینے کے لئے وہیں موجود بھی تھیں۔

بہرحال اب اسے شاعری سمجھا جائے یا ایک قسم کا وجدانی احساس کہ دار العلوم دیوبند کی عمارتیں آج جس علاقے میں پھیلی ہوئی ہیں، کچھ تعجب نہیں اگر مکتبی زندگی میں حضرت والا کو کسی تعلیم گاہ کے قیام کا امکان کسی نہ کسی پیمانہ پر وہاں محسوس ہوا ہو، اور مناسب و موزوں حالات کی مسلسل آبیاریوں سے جن کا ذکر آگے آرہا ہے اسی اجمالی خیال کے تخم کی پرورش ہوتے ہوئے بالآخر ایک تناور درخت کی شکل اس نے اختیار کرلی ہو، اپنے اس خیالی احساس پر نسبتاً زیادہ زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ دار العلوم کے لئے دیوبند، اور دیوبند میں بھی اس خاص خطہ کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ مختلف کتابوں میں اس سوال کو اٹھایا گیا ہے، اور جس کی سمجھ میں جو توجیہ آئی ہے، وہ پیش کی گئی ہے[1]، آئندہ اس کتاب میں بھی

---

[1] دیکھئے کتاب "مسلمانوں کا شاندار ماضی" مؤلفہ مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی ص۲۲ حصہ پنجم۔ اور بھی مختلف کتابوں میں بحث مل سکتی ہے ۱۲

مجھے اس سوال پر بحث کرنا ہے، سچ پوچھئے تو اس بحث کی راہ میں چاہتا ہوں کہ آہستہ آہستہ کتاب پڑھنے والوں کے لئے ہموار ہوتی چلی جائے، گویا یوں سمجھئے کہ اسی بحث کی اجمالی قسط آپ کے آگے رکھی گئی ہے، دارالعلوم کے سفرۂ عام یعنی مطبخ کی طرف بھی ہلکا سا اشارہ اسی سلسلہ میں کیا گیا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ اسی سوال کے جواب میں علاوہ دوسرے بزرگوں کے مکاشفات کے حضرت سید احمد مجدد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کشفی قصہ عموماً نقل کیا جاتا ہے۔

"حضرت سید احمد صاحب بریلوی جب سرزمین دیوبند سے گذرے تو اس زمانہ میں اس جگہ جہاں دارالعلوم قائم ہے کوڑیاں پڑا کرتی تھیں، سید صاحب نے فرمایا کہ "یہاں سے علم کی بو آتی ہے" (مسلمانوں کا شاندار ماضی حصہ پنجم ص۶۵)

فراست ایمانی کے نور سے کہتے ہیں، کہ حضرت مجدد الف ثانی پر بھی ڈھائی تین سو سال پہلے کچھ اسی قسم کی بات کھولی گئی تھی[1]۔ ایسی صورت میں اب خود خیال کیجئے کہ ایک اجنبائی روح کے متعلق خاکسار کے مذکورہ بالا احساس کو محض بے بنیاد قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، ہونہار بچوں کی نفسیاتی کیفیتوں کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے، ان کو دارالعلوم دیوبند کے محل وقوع کی بنیاد کا سراغ بانی دارالعلوم دیوبند کی مکتبی زندگی کی گہرائیوں میں جہاں تک سمجھتا ہوں ڈھونڈھنے سے مل سکتا ہے، دیوبند اور دیوبند میں بھی اس خاص علاقہ ہی کا انتخاب دارالعلوم کے لئے کیوں کیا گیا؟ اس سوال کے جواب کی بہت سی منزلیں صرف اسی مسئلہ سے طے ہو سکتی ہیں، اور اب اس قصہ کو اسی نقطہ پر ختم کر کے جو سوال اٹھایا گیا تھا، یعنی ایک طرف حضرت حکیم الامت جیسے بزرگوں کی یہ شہادت کہ "پڑھنے کے زمانہ میں بھی بہت شوق اور مشقت سے نہیں پڑھا تھا" اور دوسری طرف پڑھنے ہی کے زمانہ میں اپنے ظریف و شفیق استاد کی بارگاہ سے "علم کی بکری" کا ظریفانہ خطاب جو آپ کو عطا ہوا تھا، بظاہر

---

[1] شفاہاً مختلف حضرات سے خاکسار نے یہ بات سنی ہے، مولانا محمد میاں صاحب نے بھی اپنی اسی کتاب میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے ۱۲

ان دونوں باتوں میں گونہ "تضاد" کی کیفیت جو محسوس ہوتی ہے، اسی کے متعلق عرض کر رہا تھا، بات یہاں تک پہنچی تھی کہ دیوبند کی مکتبی زندگی میں جیسا کہ اس خطاب کا اقتضاء ہے 'کتابوں کے پڑھنے یا ان کے اسناد کے محاورے میں کتابوں کے چرلینے کا شدید جذبہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر مسلط تھا، اس سلسلے میں جو کچھ مل جاتا تھا، عمر اور رسائی کی حد تک ان کے استاد کی شہادت یہی ہے کہ اسے چاہتے تھے کہ نگلتے ہی چلے جائیں، دیوبند میں قابلیت کے بڑھانے کا بھی موقعہ ملا، اسی سے سمجھنا چاہیئے کہ مطالعہ کا دائرہ بھی روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہوگا، جب تک دیوبند میں رہے اسی حال میں رہے۔

دیوبند سے سہارنپور اسباب کا تو علم نہ ہوسکا، مصنف امام نے صرف اتنی اطلاع دی ہے کہ دیوبند کے بعد

"پھر سہارنپور اپنے نانا کے پاس رہے" ص۲۶

یعنی قیام وطعام کا نظم تو نانا جان کے یہاں تھا، جن کے متعلق گذر چکا کہ "سہارنپور میں وکالت کرتے تھے" اور بقول مصنف امام نہایت عزت واحترام اور تمول سے "زندگی ان کی اس زمانے میں گذر رہی تھی، جہاں تک میرا خیال ہے نانا کے گھر سہارنپور میں جتنے دنوں بھی قیام کا موقعہ حضرت کو ملا شاید آپ کی پوری زندگی میں عافیت وآسائش کے ایسے دن آپ کو کم ہی ملے ہوں گے، دیوبند میں بھی گو رشتہ داروں کے یہاں تھے، لیکن شرم وحیا کی وجہ سے آپ سن چکے کہ کبھی کبھی دیوبند میں آپ کو تکلیف بھی اٹھانی پڑی، لیکن سہارنپور میں تو نانا کا گھر آپ کو ملا تھا، اور نانا بھی کیسے خوش حال فارغ البال کامیاب وکیل، اب اسی کے ساتھ اس واقعہ کو بھی ملائیے کہ حضرت کے نانا جان جن کا نام شیخ وجیہ الدین تھا، عرض کر چکا ہوں کہ عربی سے آگاہی کے ساتھ فارسی ادب میں وہ کافی دستگاہ رکھتے تھے، مصنف امام کا قول نقل کر چکا ہوں کہ

"مولوی صاحب کے نانا، مولوی وجیہ الدین صاحب نانوتوی فارسی بہت عمدہ

جانتے تھے" ص۲۵

یہ خبر بھی ان ہی کی ہے کہ شیخ وجیہ الدین "اردو کے شاعر بھی تھے" مصنف امام نے ان کی "طباعی" اور خوش فہمی کی بھی تعریف کی ہے۔

ذرا سوچئے، کہ جس گھر میں اردو فارسی کی شعر و شاعری، نثر و نظم کا چرچا پھیلا ہوا ہو اور طباعی و خوش فہمی کی داد دی جا رہی ہو، اسی گھر میں ایک رکن عزیز کی حیثیت سے اسی شخص کو شریک ہونے کا موقعہ جب ملا ہوگا، جو دیوبند سے اپنے فریس و ظریف استاذ کا خطاب "علم کی بکری" لے کر سہارنپور پہنچا تھا، تو شوق کے سمند پر اس ادبی و علمی صحبت کے تازیانہ کا کیا اثر مرتب ہوا ہوگا۔

مولوی مہتاب علی کے بعد مولوی محمد نواز سہارنپوری آپ کے دوسرے استاذ

صرف صحبت ہی نہیں، بلکہ مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سہارنپور میں مولوی محمد نواز سہارنپوری نام کے کوئی بزرگ اس زمانہ میں تھے، فارسی اور عربی کی تعلیم لوگوں کو دیا کرتے تھے۔ مولانا نانوتوی کو بھی ان کے نانا نے مولوی محمد نواز صاحب کے سپرد کر دیا۔ اور دیوبند میں فارسی و عربی کی تعلیم جن کتابوں تک پہنچ چکی تھی، ان کے بعد کی کتابیں ان ہی مولوی محمد نواز سے مولانا پڑھنے لگے، افسوس ہے کہ باوجود تلاش کے حضرت کے ان سہارنپوری استاذ مولوی محمد نواز کے نام اور یہ کہ عربی و فارسی کی تعلیم ان کا کام تھا، اس کے سوا اور کچھ نہ معلوم ہو سکا، اور صحیح طور پر اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ اپنے سہارنپوری استاذ سے حضرت نانوتوی نے کون کون سی کتابیں پڑھیں، البتہ اتنی بات جس کا پہلے بھی کہیں شاید ذکر آ چکا ہے کہ دہلی پہنچکر آپ کو کافیہ شروع کرایا گیا، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سمجھنا چاہئے کہ کافیہ سے پہلے عربی کے صرف و نحو کی جو کتابیں قدیم نظامی نصاب میں پڑھائی جاتی تھیں، ان میں کچھ تو شیخ مہتاب علی صاحب دیوبندی سے آپ نے پڑھیں، اور جو کتابیں وہاں نہ پڑھ سکے وہی کتابیں مولوی محمد نواز سے آپ نے

پڑھی ہوں گی۔ عربی کے ساتھ فارسی کی تعلیم کا بھی اجمالاً ذکر مصنف امام نے کیا ہے، لیکن نام ان فارسی کتابوں کا بھی معلوم نہ ہو سکا، بلکہ صحیح طور پر یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ سہارنپور میں قیام کی مدت کیا تھی؛

بہرحال میں جو کچھ عرض کر رہا تھا، وہ یہ بات تھی کہ "علم کی بکری" کے خطاب سے کتابوں کے مطالعہ کے جس شوق مفرط کا پتہ چلتا ہے، یہ حال طاری تو ہوا تھا آپ پر دیوبند میں، اور ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جس کی وجہ سے سمجھا جائے کہ مطالعہ کے اس شوق و ذوق میں سہارنپور پہنچ کر کسی قسم کی کمی یا سستی پیدا ہوئی ہو، بلکہ سہارنپور میں جو ماحول آپ کو ملا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ بجائے گھٹنے کے اس میں مزید اضافہ ہی ہوا ہوگا، نانوتہ اور دیوبند کے حساب سے سہارنپور اب بھی شہر ہے اور پہلے بھی شہر ضلع کا مرکزی مقام تھا، توقع اسی کی جاتی ہے کہ کتابوں کے ملنے میں بھی یہاں آپ کو سہولت زیادہ میسر آئی ہوگی اور جیسے جیسے نصابی کتابیں فارسی و عربی کی نکلتی جاتی تھیں، قدرتاً مطالعہ کے دائرے میں وسعت بھی پیدا ہوتی چلی جاتی ہوگی علاوہ گھر کے باہر کے شہری ماحول سے اس مذاق کے نکھرنے میں مدد ملی ہوگی۔

سہارنپور کی تعلیمی زندگی کے یہ دن لطف اور مزے کے ساتھ گذر رہے تھے کہ اچانک سہارنپور میں ہولناک قسم کا وبائی بخار پھوٹ پڑا، یہ ۱۸۴۲ عیسوی مطابق ۱۲۵۸ھ کا واقعہ ہے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"ان کے (یعنی مولانا محمد قاسم کے) نانا کا انتقال اس سال (یعنی ۱۲۵۸ ہجری) کے وبائی بخار میں مع بہت سے لوگوں کے ہو گیا" ص ۲

ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

سہارنپور کے قیام کی ضمانت ان ہی بیچارے شیخ وجیہ الدین مرحوم کے وجود کے ساتھ وابستہ تھی، سارا قصہ ہی ختم ہو گیا، نہ وکیل صاحب باقی رہے، اور نہ ان کی وکالت نہ وکالت کی آمدنی، لازمی نتیجہ اس حادثہ کا جو ہو سکتا تھا وہ پیش آیا۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ

"مولوی صاحب (یعنی مولوی محمد قاسم صاحب) سہارنپور سے وطن آئے"! ص۲۷

جس نانوتہ سے طلب العلم کے لئے باہر نکلے تھے، تقدیر پھر نخلستان کے اسی چھوٹے شہر نانوتہ کی طرف کھینچ کر لے آئی، اور کامل ایک سال تک سہارنپور سے واپس ہونے کے بعد نانوتہ ہی میں مسلسل آپ کا قیام رہا۔

واپسی کے بعد نانوتہ میں ایک سال کی مدت میں آپ کیا کرتے رہے، مصنف امام یعنی حضرت مولٰنا محمد یعقوب صاحب نے اپنے متعلق تو ارقام فرمایا ہے کہ ان کے والد مولانا مملوک العلی صاحب دہلی کالج سے بہ یافت نصف تنخواہ ایک سال کی رخصت حاصل کرکے حج کیلئے روانہ ہوگئے۔[1] اسلئے

---

[1] مصنف امام نے حاشیہ پر لکھا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان کے دونوں چشم و چراغ یعنی مولٰنا شاہ محمد اسحاق اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا یعقوب جو حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور دلی اللٰہی درسگاہ میں شاہ صاحب کے جانشین تھے، دونوں حضرات کے دل میں ہندوستان سے ہجرت کا خیال اچانک ۱۲۵۸ھ میں پیدا ہوا، اور خیال میں اتنی شدت پیدا ہوئی کہ ہندوستان کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر دونوں حضرات حجاز تشریف لے گئے، مصنف امام کا بیان ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے ساتھ مسلمانان ہند کا ایک بڑا قافلہ بھی عرب روانہ ہوا۔ اسی حال نے ان کے والد مولٰنا مملوک العلی صاحب کے قلب میں بھی کچھ جذبات پیدا کئے، مگر وہ دہلی کالج میں سرکاری ملازم تھے، ساتھ تو ان دونوں حضرات کا نہ دلیکے مگر کوشش کرکے سفر حج کی رخصت حاصل کی، ان کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رخصت کی منظوری میں کچھ دشواریاں پیش آئیں، مگر بعد کو رخصت بھی منظور ہوئی اور اس رعایت کے ساتھ منظور ہوئی کہ سال بھر کی نصف تنخواہ بھی دی جائے، بادبانی جہاز سے مولانا مملوک العلی روانہ ہوئے۔ تقریباً چار مہینے میں حجاز پہنچے، شاید چار ہی مہینے واپسی کی نذر ہوئے، حرمین میں قیام اور حج و زیارت کے مشاغل سے فارغ ہونے میں چار مہینے لگے، یوں پورے ایک سال میں یہ سفر پورا ہوا، مصنف امام نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں سال بھر کی اس مدت کو سفر حج کا مختصر ترین زمانہ سمجھا گیا تھا لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ اتنا طویل سفر اتنی مختصر مدت میں کیسے پورا ہوا، چونکہ سال ہی بھر کی چھٹی تھی، دلی جس وقت مولٰنا مملوک العلی پہنچے رخصت کی مدت ختم ہوچکی تھی، مجبوراً بجائے وطن کے دہلی کالج میں حاضر ہوکر کام میں مشغول ہوگئے، تقریباً چار مہینے کے بعد ذی الحجہ کے مہینے میں موسمی تعطیل جب ملی تب وطن پہنچکر گھر کے لوگوں سے ملے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کی چھٹی غالباً دہلی کالج میں نہیں ہوتی تھی اور موسمی تعطیل کا رواج تھا، یہاں سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ شاہ اسحاق و شاہ یعقوب مولٰنا مملوک العلی کے اساتذہ و شیوخ نے ہجرت کی ان کے ساتھ اور بھی لوگ گئے مگر حجاز پہنچنے کے بعد مولانا مملوک العلی کو ہندوستان واپس لوٹنے اور انگریزی حکومت کی ملازمت میں مشغول رہنے کی جو اجازت ملی اس کا مطلب کیا ہوا، ہجرت کو فرض قرار دینے والے بزرگوں کو اسلاف کے طرز عمل پر غور کرنا چاہئے، والقصہ بطولہا ۱۲

دلی جہاں اپنے والد کے ساتھ رہتے تھے، وہاں سے وہ بھی نانوتہ بھیج دیئے گئے، ارقام فرماتے ہیں کہ

"احقر ایک برس کامل وطن (نانوتہ) رہا، حفظ قرآن شریف پورا ہو گیا تھا، مگر صاف نہ تھا صاف کرتا تھا" ص۲۷

جس کا مطلب یہی ہوا کہ وہ تو قرآن کا دور کرتے رہے، لیکن اسی زمانہ میں سہارنپور سے مولٰنا نانوتوی جو نانوتہ واپس آئے تو کیا کرتے رہے؟ یہ تو لکھا ہے کہ

"اس زمانہ میں مولوی صاحب کا ساتھ رہا" ص۲۷

مگر کرتے کیا رہے؟ اس سوال کے جواب میں بجائے کسی تعلیمی شغلہ کے صرف ان کھیلوں کا تذکرہ انھوں نے کیا ہے جو مولانا مرحوم کے ساتھ وہ نانوتہ میں سال بھر کھیلتے رہے تھے، کھیلوں کے سلسلہ میں مولٰنا نانوتوی کے جن کمالات کا ذکر پہلے آچکا ہے، مصنف امام نے ان کا تذکرہ اسی موقعہ پر فرمایا ہے، ہم ان کی تفصیل سے فارغ ہو چکے ہیں اس لئے دوبارہ اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں میرے سامنے صرف یہ سوال ہے کہ دیوبند اور سہارنپور کی تعلیمی زندگی کے بعد کیا نانوتہ پہنچکر سال بھر کی یہ مدت مولانا مرحوم نے صرف کھیل کود میں گذار دی؟ واقعہ یہ ہے کہ ان کے دیوبندی استاد مولوی مہتاب علی صاحب کے عطا فرمودہ خطاب (علم کی بکری) کا علم اگر نہ ہوتا، تو مصنف امام کے ظاہر کلام کی بنیاد پر آپ کا سوانح نگار شاید اسی نتیجہ تک پہنچتا، مگر اس خطاب اور جن مضمرات پر یہ خطاب مشتمل ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ماننا مشکل ہے کہ علم کے ساتھ اتنے شدید تعلق کے بعد اچانک نانوتہ پہنچکر اس سے منقطع ہو گئے تھے اگرچہ کوئی تصریحی شہادت ہمارے پاس نہیں ہے، لیکن نانوتہ کی زندگی کے اس یک سالہ مدت کے بعد دلی میں جب ہم آپ کو اس حال میں پاتے ہیں کہ مولٰنا مملوک العلی صاحب اپنے صاحبزادے یعنی مولوی محمد یعقوب کی تعلیمی نگرانی مولٰنا کے سپرد فرما دیتے ہیں پہلے بھی کہیں ذکر کر چکا ہوں کہ "ابواب اور تعلیلات" کی مشق ان کا سننا اور پوچھنا یہ سارے کام حضرت والا ہی کے متعلق خود ان کے استاد ہی نے کر دیئے تھے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب یہ مانا جائے کہ ایک سال کی یہ مدت

علم سے کلی بے تعلقی کے ساتھ نہ گذری ہو، ورنہ صرف ونحو کی ابتدائی تعلیم پانے والوں کا عام حال تو یہی ہے کہ سال تو خیر بڑی بات ہے، چند مہینے بھی علمی شغلہ سے اتفاقاً الگ ہونے کی صورت پیش آگئی تو پڑھا بے پڑھا سب اُن کے لئے برابر ہو جاتا ہے، اور یہاں تو کامل سال بھر کی مدت نانوتہ میں سہارنپور سے واپسی کے بعد گذری ہے، بہرحال میرا خیال یہی ہے کہ علم کا جو معمولی ذوق وشوق آپ میں دیوبند کے مکتب کے اندر ابھرا تھا، وہ سہارنپور میں بھی ترقی پذیر ہی رہا اور گو نانوتہ پہنچ کر حالات غیر مناسب ضرور پیش آگئے تھے، لیکن اس ذوق سے کلیتہً بے تعلق ہونے کی بھی کوئی وجہ نہ تھی یہ ہو سکتا ہے کہ نانوتہ کے مکتب خانوں کے پڑھانے والوں کی تعلیم وتدریس کی جو آخری حد تھی، اس سے چونکہ مولٰنا آگے نکل چکے تھے، اس لئے وہاں کے مقامی مکتبی استاذوں سے استفادہ کی کوئی صورت آپ کے لئے باقی نہ رہی ہو لیکن جو دیوبند ہی میں "علم کی بکری" بن چکا ہو، اس کو چرنے کے لئے چرانے والے کی ضرورت ہی کیا باقی رہی تھی ؟ مگر عمر کے لحاظ سے مطالعہ کا ذاتی ذوق ایک نادر تجربہ ہے، مگر اس پر کافی بحث ہو چکی ہے کہ اجتبائی ہستیوں کو عام افراد پر قیاس نہ کرنا چاہیئے، پیش آنے سے سالہا سال پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بچوں میں حضرت یوسف علیہ السلام ہی کو خواب میں واقعہ کیوں دکھلایا گیا ۔ حالانکہ سب ہی نبی زادے اور پیغمبروں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے تھے، قدرت کے اس انتخابی دین کی بھلا کوئی کیا توجیہ کرے ۔

کچھ بھی ہو، اسے حسن ظن ہی خیال کر لیجئے ۔ مگر کم از کم میں تو اپنے اندر اس بات کے ماننے کی گنجائش نہیں پاتا کہ سہارنپور سے لوٹنے کے بعد نانوتہ میں مولٰنا نے اپنی زندگی کا پورا ایک سال صرف کھیل کود میں گذار دیا ۔ اگرچہ جن کھیلوں کا انتساب اس زمانے میں آپ کی طرف کیا گیا ہے، اور کھیلوں میں بھی "کلیات آفرینی" اور "قانون سازی" کے جن طبعی میلانات کا ظہور اس زمانے میں آپ کے اندر سے ہوا، جن کا تفصیلی ذکر پہلے کر چکا ہوں، ان کو دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کھیلوں کو بھی آپ کے غیر معمولی دل ودماغ نے فکری آماجگاہ، اور نظری وذہنی مشق گاہ کی شکل میں

بدل دیا تھا، اس کے ساتھ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، کہ مطالعہ کا سلسلہ بھی اس زمانہ میں جاری نہ ہوگا بلکہ مصنف امام نے جیسے اپنے متعلق لکھا ہے کہ یاد کر لینے کے بعد اس زمانہ میں قرآن کو صاف کرتے رہتے یعنی یاد کی ہوئی چیز کو پختہ کرانے میں ان کا وقت گذر رہا تھا، کیوں نہ سمجھا جائے کہ ان کو دیکھ ہی کر شاید مولانا نانوتوی میں بھی یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ دیوبند اور سہارنپور کی پڑھی ہوئی چیزوں کو تازہ کرتے رہیں، دلی پہنچکر لوگوں کو جو یہ محسوس ہوا کہ صیغوں اور ترکیبوں کے متعلق مہارت اس بچے میں پائی جاتی ہے، مصنف امام کا بیان نقل کر چکا ہوں کہ

"مولوی صاحب (یعنی مولوی محمد قاسم صاحب) سب میں عمدہ رہتے تھے" ص ۲۵

صیغوں اور ترکیبوں کے متعلق دلی پہونچنے کے ساتھ یہ سند آپ کو مل چکی تھی جس کا مطلب یہی ہوا کہ صرف و نحو میں اپنے ہم چشموں کے درمیان مولانا سب سے بہتر اور اچھے قرار دیئے گئے تھے۔ اسی بنیاد پر مولوی یعقوب صاحب کے صرف و نحو کی تعلیمی نگرانی آپ کے سپرد کی گئی تھی، اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کہ دیوبند و سہارنپور میں جن چیزوں کے سیکھنے کا موقعہ آپ کو ملا تھا، ان ہی کو معلوم ہوتا ہے کہ سال بھر کی اس مدت میں آپ پختہ کرتے رہے۔

تعلیم پانے کیلئے نانوتہ سے دوسری روانگی

با این ہمہ اتنی بات تو بہر حال معلوم ہوتی ہے کہ تدریسی طور پر درسی کتابوں کے پڑھنے کی راہ سے ترقی کرنے کی راہ اس زمانہ میں آپ پر بند رہی، کیوں بند رہی؟ تفصیلی جواب تک تو رسائی نہ ہو سکی لیکن بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ جہاں تک پہنچ چکے تھے اس سے آگے پڑھانے کی صلاحیت ان لوگوں میں شاید نہیں پائی جاتی تھی جو نانوتہ میں معلمی کا کام کرتے تھے، مولوی محمد یعقوب صاحب نے بھی سال بھر کی یہ مدت صرف اس مشغلہ میں کہ قرآن

صاف نہ تھا، صاف کرتا تھا

جوگذاری، اس کی وجہ بھی غالباً یہی تھی،

جن گھرانوں میں امتیاز و معاش کا دار و مدار تعلیم ہی پر ہو، ان کے لئے تدریسی ترقی سے محرومی کی یہ حالت بڑی صبر آزما اور خاندان کے بزرگوں کے لئے ناقابل برداشت بن جاتی ہے، دوسری راہوں سے بچے کچھ بھی سیکھ رہے ہوں، لیکن جن کتابوں کے پڑھنے اور ختم کرنے کے ساتھ امتیاز اور معاشی راہ کی کشائش وابستہ ہو، جن بچوں کو کسی وجہ سے ان کے پڑھنے اور ختم کرنے کا موقعہ نہیں ملتا، تو سمجھا جاتا ہے کہ ان کا وقت بے کاری میں گذر رہا ہے، مولانا مرحوم کے سامنے بھی کچھ اسی قسم کی صورتِ حال معلوم ہوتا ہے کہ پیش آگئی تھی۔

نانوتہ کے لئے تعلیمی راہ کا دروازہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے کھل چکا تھا، وہ دہلی میں مقیم تھے، اور دلی کی سب سے بڑی مرکزی درسگاہ دلی کالج کے استاذ تھے، نہ صرف نانوتہ بلکہ عثمانی شیوخ کی برادری اطراف و جوانب کے جن قصبات میں پھیلی ہوئی تھی، وہاں تک کے بچے مولانا مملوک العلی کے ان خاص حالات سے کافی استفادہ کر رہے تھے[1]۔

مگر غیر مستفید ہو رہے تھے، تو مولانا محمد قاسم جو علاوہ ہم وطن ہونے کے مولانا مملوک العلی سے عزیزداری اور رشتہ داری کے گوناگوں تعلقات رکھتے تھے، ان کے استفادے کا مسئلہ تو ہر لحاظ سے آسان تھا، خصوصاً مولانا نانوتوی کے والد ماجد شیخ اسد علی مرحوم تو اس تعلیمی وفد کے رکن بھی تھے جو نانوتہ سے دلی روانہ ہوا تھا، اگرچہ اس وفد کے ارکان میں غیر معمولی کامیابی مولانا مملوک العلی کو ہوئی اور بے چارے شیخ اسد علی صاحب صرف فارسی ادب کی تکمیل کر کے وطن واپس ہوگئے تھے

[1] یہ ایک بڑا تفصیل طلب مضمون ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ نانوتہ میں مظاہر العلوم کے مدرس اول مولانا مظہر نانوتوی یا احیاء العلوم وغیرہ جیسی مشہور کتابوں کے مترجم مولوی محمد احسن صدیقی نانوتوی یا دیوبند میں مولانا ذوالفقار علی حضرت شیخ الہند کے والد ماجد مولانا فضل الرحمٰن مولانا شبیر احمد کے والد ماجد، اور اسی قسم کے بیسیوں بزرگوں کو ہم اس زمانہ میں جو پاتے ہیں، کہ علم و فضل کے ساتھ مشہور رہیں۔ ان میں بعض حضرات انگریزی حکومت کی طرف سے محکمہ تعلیمات کے انسپکٹر بھی تھے، مثلاً شیخ الہند کے والد ماجد اور مولانا شبیر احمد صاحب کے والد ماجد دونوں حضرات کا جو حال ہے، جہاں تک میرا خیال ہے اس علاقہ کی اس جدید علمی روشنی میں بہت زیادہ دخل مولانا مملوک العلی ہی کے وجود باجود کو ہے، دلی پہنچنے اور وہاں کی تعلیمی سہولتوں سے مستفید ہونے کا موقعہ ان لوگوں کو بظاہر مولانا مملوک صاحب ہی کی وجہ سے میسر آیا۔

لیکن مولانا ملوک العلی پر حق تھا کہ شیخ اسدعلی صاحب اگر کامیاب نہ ہو سکے، تو ان کے بچے ہی کے ذریعہ اپنے رفیق سفر کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا جائے۔

مگر اب اس کا علاج کیا تھا، جس زمانہ میں مولنا ملوک العلی مولنا نانوتوی کو اپنے ساتھ دلی لے جا سکتے تھے، اس وقت مولنا کی کم عمری اس طویل سفر میں مانع تھی، اسی لئے چھوڑ دیا گیا کہ مقامی طور پر نانوتہ میں جو کچھ پڑھ سکتے ہوں پڑھ لیں، پھر دیوبند اور سہارنپور بھیجدیئے گئے جو دلی سے نسبتاً قریب تھے، لیکن ٹھیک جس وقت مولنا اس قابل ہوئے کہ دلی روانہ ہو سکتے ہوں یعنی عمر بھی اب آپ کی دس سال سے متجاوز ہو چکی تھی، کہ اچانک حجاز کے سفر کا مرحلہ مولانا ملوک العلی کے سامنے پیش آگیا، آج کل کا زمانہ ہوتا، تو کوئی بات نہ تھی، بلکہ یہ قصہ اس وقت کا ہے، جب حجاز کے مسافر کے متعلق پہلے تو اسی کی توقع مبہم دموہوم ہوتی تھی کہ واپسی کا موقعہ بھی اسے مل سکیگا یا نہیں، حجاز سے واپسی کے متعلق اس زمانہ میں لوگوں کا جو خیال تھا، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ کامل ایک سال کے بعد مولانا ملوک العلی سفر سے جب واپس ہوئے تو لوگوں کو اس پر تعجب ہوا کہ اتنا بڑا طویل سفر اس مختصر مدت میں کیسے پورا ہوا، مولانا ملوک العلی صاحب کے متعلق ہجرت ہی کی نیت اس زمانہ میں منسوب کر دی گئی ہو، تو ان کیلئے سفر حج کا جو محرک قریب تھا، اسکو دیکھتے ہوئے شاید یہ انتساب اور عوام کا خیال محل حیرت نہیں ہو سکتا، ان کے صاحبزادے مولنا محمد یعقوب نے جب خود یہ لکھا ہے کہ

"یہ (یعنی شاہ صاحبوں کی ہجرت کو) دیکھ کر والد مرحوم کو بھی حج کا دھیان ہوا" ص۲

تو جن بزرگوں کو دیکھ کر حج کا ارادہ مولنا میں پیدا ہوا تھا، ان ہی بزرگوں کی پیروی میں ہجرت کی نیت کا انتساب ان کی طرف بہ ظاہر بعید بھی نہ تھا، خصوصاً حج ہی کے ارادے کے متعلق ان کے صاحبزادے جب یہ اطلاع دیتے ہیں کہ ارادہ کے بعد اپنے اس ارادہ کا مدت تک مولانا نے اعلان نہ فرمایا بلکہ

"خفیہ تدبیر رخصت اور سامان سفر کی کرتے رہے"

تو اسی پر قیاس کر کے ہجرت کی مخفی نیت اگر ان کی طرف منسوب کی گئی ہو تو یقیناً یہ بے بنیاد
بات نہ تھی۔ [illegible]

[illegible] بہر حال سہارنپور میں وبائی بخار والے مولانا نانوتوی کے نانا کی وفات کا جو حادثہ پیش آیا اور اسکی
وجہ سے سہارنپور میں قیام کی بظاہر کوئی صورت باقی نہ رہی، مجبوراً نانوتہ واپس ہونا پڑا، ادھر یہی زمانہ
ہے مولانا مملوک العلی کا بھی ایک طویل سفر پر روانہ ہو جانا، جس سے واپسی کی توقع بھی
مشتبہ تھی، یہ صورت حال ایسی تھی کہ اس کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت نانوتوی کی
تعلیمی زندگی کا شاید یہ سب سے زیادہ نازک زمانہ تھا۔ [illegible]
[illegible] خدا خدا کر کے یہ سال پورا ہوا، اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ اس زمانہ میں لوگوں نے
اچنبھے کے ساتھ یہ خبر سنی کہ مولانا مملوک العلی صاحب کل ایک سال کے اندر اندر حج و زیارت
سے فارغ ہو کر دہلی تشریف لے آئے، چونکہ رخصت مولانا مملوک العلی صاحب کی ختم ہو چکی
تھی اس لئے واپسی کے ساتھ ہی سرکاری فرائض یعنی دلی کالج کے کاموں میں مشغول ہو گئے
اور اپنے وطن نانوتہ آنے کا موقعہ آپ کو نہ مل سکا [illegible]
[illegible] ہمارے مصنف امام یعنی مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے کہ ان کے والد مولانا مملوک العلی
صاحب رحمۃ اللہ علیہ رجب ۱۲۵۸ھ میں دلی سے بہ ارادہ حج روانہ ہوئے تھے، رجب، شعبان
رمضان، شوال، ذیقعدہ گویا پانچ مہینے تو راستے میں صرف ہوئے اور پہلی ذی الحجہ کو مکہ معظمہ
پہنچے، مناسک حج سے فارغ ہو کر مدینہ آئے، اور یوں بات [illegible]
[illegible] حرمین کی زیارت سے فارغ ہو کر برس دن میں پھر دلی پہنچے [illegible]
جس کا مطلب یہی ہوا کہ رجب ہی کے مہینہ میں دلی پہنچے ہوں، واپسی کے بعد مولانا
مملوک العلی نے رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذیقعدہ کے مہینے دلی ہی میں بسر کئے، ذی الحجہ
میں سالانہ تعطیل کالج میں ہوئی، تب وطن والوں سے ملنے کے لئے آپ نانوتہ تشریف لائے
۱۲۵۹ھ کا گویا یہ آخری مہینہ تھا، حضرت مولانا نانوتوی جن کی ولادت ۱۲۴۸ھ میں ہوئی

اس حساب سے آپ کی عمر دس سے متجاوز ہو چکی تھی، گیارہویں سال میں قدم رکھ چکے تھے
باقی اس کا پتہ نہ چل سکا کہ دلی کالج میں یہ سالانہ تعطیل جو ہوتی تھی، اس کی مدت کیا تھی بظاہر
ایک مہینے سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی۔ مصنف امام نے لکھا ہے کہ ذی الحجہ کی آخری
تاریخوں میں پھر ان کے والد دلی کے ارادے سے روانہ ہوئے اور یکم محرم کو دلی پہونچ گئے
لکھ چکا ہوں کہ تقریباً ۳۶ کوس کا فاصلہ دلی اور نانوتہ کے درمیان تھا، چار دن میں یہ فاصلہ ریلوے
کے زمانہ سے پہلے طے ہوتا تھا، اسی بنیاد پر یہ سمجھنا چاہئے کہ ۲۶ یا ۲۷ ذی الحجہ کو مولانا مملوک العلی
نانوتہ سے روانہ ہوئے ہوں گے [illegible]
جب مولانا مملوک العلی کے اس سفر کی تاریخوں کو خصوصی اہمیت اس لئے حاصل ہے کہ ان
ہی تاریخوں میں سمجھ لیجئے تو مسلمانان ہند کی دینی تقدیر کا فیصلہ قدرت کی طرف سے نافذ ہوا
اور اسلامی ہند کی دینی امامت و قیادت جس کے لئے زوال حکومت کے بعد ازل ہی سے مقدر
ہو چکی تھی، ایک قصباتی آبادی سے اس کو ہندوستان کے سیاسی اور علمی و دینی مرکز دلی پہنچانے
کا نظم قدرت کی طرف سے عمل میں آیا، [illegible]
افسوس ہے کہ اس موقعہ پر جن تفصیلی معلومات کی ضرورت تھی، وہ فراہم نہ ہو سکے، بس اس
قدر معلوم ہو سکا کہ چھٹیاں ختم ہونے سے واپسی کے بعد نانوتہ میں حضرت نانوتوی دن گذار رہے تھے،
یوں تو مولانا مملوک العلی کے خاندانی تعلقات پہلے ہی سے موجود تھے، مگر بظاہر ایک
اتفاقی واقعہ جو پیش آیا یعنی مولانا مملوک العلی صاحب اپنے صاحبزادے مولوی محمد یعقوب
صاحب کو اپنے ساتھ ہی دلی میں رکھتے تھے، اور وہیں قرآن مجید کے حفظ میں ان کو لگا دیا
تھا، حج کے لئے جب جانے لگے، تو مولوی محمد یعقوب صاحب جن کی عمر بھی اس زمانہ
میں نو دس کے درمیان تھی، ان کو نانوتہ چھوڑ گئے، پہلے بھی کسی موقعہ پر بیان کر چکا ہوں کہ دلی سے
مولوی محمد یعقوب صاحب نانوتہ پہنچے اللہ ٹھیک ان ہی دنوں میں مولانا نانوتوی بھی اپنے
نانا جان کی وفات کی وجہ سے سہارنپور سے گھر لوٹنے پر مجبور ہوئے تھے، دونوں ہم عمر بھی تھے

اور "الارواح جنود مجندۃ" کے قانون کی رو سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں کی روح میں ازلی ائتلاف کا رشتہ قائم تھا، اسی روحانی رشتہ کے ظہور و استحکام کا موقعہ اس زمانہ میں دونوں کو ملا، مولٰنا محمد یعقوب صاحب نے حضرت نانوتوی کی جو مختصر سوانح عمری لکھی ہے اور میری کتاب کا سب سے بڑا ماخذ یہی کتاب ہے، اس میں حضرت نانوتوی کی رفاقت کے ان دنوں کا ذکر کرتے ہوئے "خوب یاد ہے" یا "یاد ہے" یا اسی قسم کے الفاظ جو استعمال کئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کے ان بیتے ہوئے دنوں اور جو واقعات ان میں پیش آئے ان سے وہ خود اور ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر متاثر تھا، مناسب اور موزوں موقعوں پر ان چیزوں کو اسی کتاب سے اخذ کرکے درج کر چکا ہوں، اس وقت اپنے جس احساس کو پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مولٰنا مملوک العلی صاحب کے لخت جگر اور حضرت نانوتوی کے درمیان سال بھر کی اس مدت میں رفاقت و محبت کے جو تعلقات پیدا ہوئے، اور مولٰنا مرحوم کی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور سب سے زیادہ فطری سعادت کے جن آثار کے تجربہ کا موقعہ مولوی محمد یعقوب صاحب کو جو ملا، شاید اسی تجربہ کی خبر مولٰنا مملوک العلی تک پہنچی، مولٰنا مملوک العلی زمانے سے طلبہ کے پڑھنے پڑھانے کا کام کر رہے تھے، قدرتی صلاحیتوں کے پہچاننے کا ملکہ اس قسم کے لوگوں میں عموماً پیدا ہو جاتا ہے، اور مولانا مملوک العلی تو خیر مولانا مملوک العلی ہی تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذی الحجہ کے اسی مہینے کی مختصر مدت میں انھوں نے کچھ فیصلہ کیا، اب یہ معلوم نہیں کہ مولٰنا کے والد اور جد امجد جو اس وقت تک بقید حیات تھے ان لوگوں سے کیا باتیں ہوئیں اور کیا کیا مشورے ہوئے۔

مصنف امام نے اس فیصلہ کے متعلق صرف اتنی خبر سنائی ہے کہ

"جب والد مرحوم حج سے تشریف لائے اور وطن (نانوتہ) آئے تب مولوی صاحب (یعنی مولوی محمد قاسم صاحب) سے کہا کہ میں تم کو ساتھ لے جاؤں گا۔" ص۲

مولانا مملوک العلی صاحب کے فیصلہ کی اس خبر کو جن الفاظ میں مصنف امام نے اس موقعہ پر درج کیا ہے، دوسروں کے متعلق تو نہیں کہتا، لیکن میرے دماغ میں کچھ اس قسم کے سوالات ابھرنے لگے کہ

کیا حج کے اس سفر میں ان کو کوئی غیبی اشارہ ملا؟ کیا مسلمانان ہند کی دینی تقدیر کا مستقبل اُن کو دکھایا گیا؟ "جب حج سے آئے تب تم کو ساتھ لے جاؤں گا" کا فیصلہ جو مولانا نانوتوی کو سنایا گیا، شرط و جزا کے درمیان آخر کچھ تو ربط ہونا چاہئے۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ میرا ایک ذاتی خیال، یا ذہنی انتقال ہے، جو کسی دعوی کی بنیاد نہیں بن سکتا واللہ اعلم بالصواب، اب کچھ بھی ہوا ہو، بیٹے کے تجربات نے متاثر کیا۔ یا حج کے لئے ہندوستان سے روانہ ہو کر مولانا مملوک العلی صاحب جہاں جہاں تشریف لے گئے تھے، وہاں ان کو کوئی روشنی دکھائی گئی، ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے، بس صرف اتنا جانتے ہیں کہ جب مولانا مملوک العلی بیت اللہ کے حج اور رسول اللہ کے روضہ پاک کی زیارت سے فارغ ہو کر پھر اسی ملک کے ان مسلمانوں کی طرف واپس ہوئے جن کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ آئندہ ہندوستان میں ان کے ساتھ کیا صورتیں پیش آنے والی ہیں، جس دین کے ساتھ ان کے اسلاف و اکابر اس ملک میں داخل ہوئے تھے، اس دین کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت کیا ہوگی؟ ان کی مسجدوں کا انجام کیا ہوگا، ان کتابوں کا حشر کیا ہونے والا ہے؟ جو گھر گھر اسی دین کے تعلق سے پھیلی ہوئی ہیں۔

بہر حال ان ہی مسلمانوں میں وہ واپس ہوئے، واپسی کے بعد دیکھا گیا کہ دس گیارہ سال کی عمر والے ایک قصباتی بچے کے متعلق

"میں تم کو ساتھ لے جاؤں گا"

کا فیصلہ ان کے ساتھ ہے، فیصلہ سنایا گیا؟ اپنے ماں باپ کے اکلوتے کم سن بچے کو یہ فیصلہ سنایا گیا، کچھ نہیں معلوم کہ پھر اس بچے کے باپ نے اور دادا نے کیا کہا، صرف بچے کی ماں کے متعلق مصنف امام نے یہ لکھتے ہوئے کہ "بعد اجازت والدہ" خود بچے کے جوابی فیصلہ کی خبر یہ سنائی ہے کہ

"اور دہلی روانہ ہو گئے" ص ۲۵

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سہارنپور سے واپسی کے بعد نانوتہ میں بیکاری کی جو زندگی مولانا مرحوم کی گذر رہی تھی، آپ کے والد اور دادا کے لئے جیسا کہ چاہئے خود ہی ناقابل برداشت ہی ہوئی تھی، اس عمر کے جس حصہ میں آپ تھے، اس وقت پڑھائی کے اس نقصان کو دیکھ دیکھ کر ان بے چاروں پر جو کچھ گذر رہی ہوگی، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس حال میں خدانخواستہ کبھی مبتلا ہوئے ہوں [illegible] اسے پھر [illegible] دلی کیا نہیں تو سمجھتا ہوں کہ دلی ایسے بھی دور حصول علم کے لئے بھیجنے میں ان لوگوں کو تامل نہ ہوتا، ہاں یاں کی یا منا کا رنگ اور ہوتا ہے آپ دیکھ چکے کہ بھیجنے کو تو دیو بند مولانا بھیجدیئے گئے تھے، لیکن ہر مہینے دو مہینے میں نانوتہ جو آتے جاتے رہتے تھے تو اس کی وجہ وہی ماں کی کشش تھی، سہارنپور میں تو والدہ کے والد ہی کے زیر عاطفت پہنچے ہوئے تھے، گھر سے بھی زیادہ وہاں آرام کی توقع کی جا سکتی تھی اور توقع پوری ہو رہی تھی [illegible] مگر اب سوال فاصلہ کا بھی تھا۔ مانا کہ نانوتہ کے لحاظ سے دلی زیادہ دور نہ تھی، لیکن ساٹھ کوس یا ایک سو بیس میل کا فاصلہ جو چار دنوں میں پورا ہوتا ہو، عہد بخار (یعنی ریلوے) سے پہلے یہ فاصلہ بھی یقیناً کچھ کم نہ تھا۔ پھر دلی خواہ جس حد تک بھی اجڑ چکی ہو، مگر دلی دلی ہی تھی، ایسے غدار شہر میں اپنے اکلوتے کم سن بچے کے متعلق طرح طرح کے خیالات اگر ماں کی محبت پیدا کرے، تو حالات کا یہ قدرتی اقتضا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ والدہ کی طرف سے کچھ کشمکش کی صورت کسی نہ کسی رنگ میں پیش آئی ہوگی، ورنہ سفر کے لئے رسمی اجازت میں والدہ کی کیا خصوصیت ہے، بہر حال جیسے باپ کی رضا مندی و اجازت بھی ضروری ہے، مگر اس موقعہ پر مصنف امام نے صرف والدہ محترمہ کی اجازت کا ذکر خصوصیت کے ساتھ جو فرمایا ہے، یہ خود بتا رہا ہے کہ کچھ نہ کچھ اہمیت اس اجازت کو ضرور حاصل تھی [illegible]

بہر حال والدہ کی یہ اجازت حاصل کر لی گئی، اور وہ [illegible]

"دہلی روانہ ہو گئے" [illegible]

اور نورافشانی کا تعلق وابستہ تھا، یعنی دارالعلوم دیوبند بھی۔ اسی محرم کے مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو قائم ہوا۔

بہر حال حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجری ۱۲۶۰ھ کے ماہ محرم کی ۲ر ۱۸۴۴ء کی ۲۳ر جنوری کے مطابق تھی، گویا ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہند سے تیرہ سال بیشتر مولانا نانوتوی شہر دہلی میں داخل ہوئے، نام نہاد مغل بادشاہ بہادر شاہ ابھی لال قلعہ ہی میں براج رہے تھے، انکی تخت نشینی پر سات سال گذرے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا نظام مشہور گورنر جنرل لارڈ الن برا کے قبضۂ اقتدار میں تھا، کمپنی کہئے یا انگریزی علاقے میں سندھ کا اضافہ ان ہی کے زمانہ میں ہوا، اور ہندوستان کی جاندار مرہٹہ حکومت یعنی سندھیا کی ریاست گوالیار کے قابض روح یہی لارڈ الن برا صاحب ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ مولانا نانوتوی کے سارے تحریری ذخیرے میں صرف یہی ایک انگریز لارڈ الن برا کا نام ایک بیان میں بطور مثال کے ملتا ہے، حالانکہ علاوہ عام انگریزوں کے متعدد گورنر جنرلوں کا زمانہ آپ نے پایا ہے، دلی پہنچکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوعمری کے ان دنوں میں لارڈ الن برا کے نام کو آپ نے تمام ناموں سے اونچا پایا۔ اور غیر شعوری طور پر اس کا ارتسام ذہن پر باقی رہا، جس میں کچھ مدد اس واقعہ سے بھی شاید ملی ہو جو چند ہی مہینے بعد پیش آیا، یعنی مولانا نانوتوی جنوری میں دلی تشریف لائے اور جولائی میں یہ خبر ہندوستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک مشہور ہو گئی، کہ لارڈ الن برا معتوب و مغضوب بن کر ہندوستان سے بلا لئے گئے، ۲۳ر جولائی ۱۸۴۴ء میں بجائے ان کے لارڈ ہارڈنگ اب ہندوستان کے سیاہ سپید کے مالک یعنی گورنر جنرل بنا دیئے گئے، خود دلی کے انگریز حاکم بنام رزیڈنٹ اس زمانے میں بے چارے مرزا غالب کے مشہور ممدوح مٹکاف صاحب تھے، جو کشمیری دروازے کی طرف لب سڑک ایک عظیم الشان شاہانہ کوٹھی میں داد عیش و عشرت دے رہے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ آج جن لوگوں کا تذکرہ حضرت نانوتوی کے ہم چشموں کے سلسلے میں

خصوصیت کے ساتھ کیا جاتا ہے، یا یوں کہئے کہ علیگڈھ کی جس سیاسی تحریک کا مدمقابل دیوبندیت کے سیاسی نقطۂ نظر کو، اور دلی کی مذہبی تحریک (غیر مقلدیت) کا مدمقابل دیوبندیت کے مذہبی نقطۂ نظر کو سمجھا جاتا ہے، تحریک دیوبند کے ان دونوں ممتاز نشانے کے بانی یعنی ڈاکٹر سرسید احمد خاں مرحوم علیگڈھ تحریک والے اور میاں نذیر حسین مرحوم دلّی کی تحریک غیر مقلدیت کے پیش رو اور سپہ سالار، یہ دونوں حضرات دلّی ہی میں اس وقت موجود تھے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا نانوتوی جن کی عمر اس وقت یعنی ۱۲۶۰ھ ہجری مطابق ۱۸۴۴ء میں بارہ ساڑھے بارہ سال سے زیادہ نہ تھی، سید صاحب آج سے سات سال پہلے یعنی ۱۸۳۷ء ہی میں دلّی کے صدر امین کے سررشتہ دار مقرر ہو چکے تھے اور میاںصاحب دہلوی اس زمانہ میں جب مولٰنا نانوتوی نے دلی میں کافیہ شروع کی تھی، دلّی کے عام علمی حلقوں میں باوجود آفاقی ہونیکے کافی امتیاز حاصل کر چکے تھے، اسی سے اندازہ کیجئے کہ ۱۲۶۳ھ یعنی مولانا نانوتوی کی آمد کے تین سال بعد سید احمد خاں صاحب کی "آثار الصنادید نامی کتاب جو شائع ہوئی تھی، اس میں میاں نذیر حسین صاحب کا ذکر کرتے ہوئے سید صاحب نے لکھا ہے کہ

> "مولوی نذیر حسین صاحب بہت صاحب استعداد ہیں، خصوصاً فقہ میں ایسی استعداد کامل بہم پہنچائی ہے کہ اپنے نظائر و اقران سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ فن روایت میں آج بے نظیر ہیں"

آخر میں لکھا ہے کہ

> "باعتبار سن کے جوان، اور باعتبار طبیعت حلیم، اور وضع متین کے پیر"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ نظریۂ عدم تقلید کے امام الائمہ اس وقت جوان تھے، جب دیوبندی تحریک کے بانی ابھی بارہ ساڑھے بارہ سال کی عمر سے متجاوز نہ ہوئے تھے

اگرچہ دودمان ولی اللٰہی کے حقیقی چشم و چراغ حضرت سیدنا شاہ محمد اسحاق اور ان کے برادر صغیر شاہ محمد یعقوب یہ دونوں حضرات جو اپنے نانا شاہ عبد العزیز بن شاہ ولی اللہ کے دلی میں

جانشین تھے، مولانا نانوتوی کی تشریف آوری سے دو سال پہلے یعنی ۱۲۵۸ھ ہی میں بہ نیت
ہجرت جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، دلی کو خالی کر کے حجاز تشریف لے جا چکے تھے، نیز مسلمانوں
کی حکومت کے زوال و انحطاط کے زمانہ میں طلب کی کمی سے اہل کمال کی جماعت بھی کافی تتر بتر
تھی تاہم حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادے کے بعض اکابر مثلاً شاہ احمد سعید اور
شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہما ان دونوں بزرگوں کا وجود علماً و عملاً دلی کی بچی کھچی روشنی کی عمر میں جان
ڈالے ہوئے تھا، ان کے سوا بھی مفتی صدر الدین صاحب بذات خود صدر الصدوری کے سرکاری
فرائض کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری کیے ہوئے تھے، اور دلی کی جامع مسجد کے
ساتھ دار البقاء کے نام سے عہد شاہ جہانی میں جو شاہی مدرسہ قائم کیا گیا تھا، اور دست برد
زمانہ سے گویا بے نام و نشان ہو چکا تھا، اسے بھی دلی کے مفتی صاحب مرحوم نے بتوسل سر
سید احمد خان زر خطیر صرف کر کے از سر نو اس مدرسہ کو مرتب کیا۔ اس مدرسہ میں بھی مفتی صاحب کی
طرف سے تنخواہ پانے والے علماء کی معقول تعداد تھی، جن میں حاجی محمد خو میرٹھی جو شاہ اسحاق کے
شاگردوں میں تھے اور ملا سرفراز ماہر ریاضیات وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے سوا بھی
مولوی عبدالخالق، نواب قطب الدین خان، مولوی نصیر الدین شافعی، مولوی رستم علی خان، مولوی حسن علی
رکن الدین، مولوی منور الدین، مولانا ابو الکلام کے نانا اور شاہ اسحاق صاحب کے دوسرے شاگردوں
کی بھی کافی تعداد دلی میں موجود تھی، بلکہ اس وقت تک شاہ عبد العزیز اور شاہ عبدالقادر صاحبان
کے خوان علم کے براہ راست زلہ رباؤں کی یادگار دلی میں باقی تھی، مثلاً مشہور میر محبوب علی
جو اپنی صلابت اور کرختگی میں کافی شہرت رکھتے تھے، شاہ عبدالعزیز ہی کے شاگرد تھے، اسی
طرح مولوی امان علی صاحب جن کے ساتھ سید احمد خان غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے، یہ حضرت مولانا
شاہ عبدالقادر (مترجم قرآن)، کے شاگرد تھے، بلکہ مولانا فضل حق خیر آبادی جن کی عمر اس وقت
غالباً پچاس سال کی ہوگی اور دلی ہی میں وہ کسی بڑے عہدے پر سرفراز تھے، طالبیت میں شاہ
عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور مولانا اسمٰعیل شہید کے رفیق درس تھے، فرصت کے اوقات

میں جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا، فلسفہ اور منطق کا درس دیا کرتے تھے۔ بہرحال دلی کے علمی
آسمان کا آفتاب (شاہ اسحاق) تو غروب ہو چکا تھا، لیکن ان تاریک گھڑیوں میں بھی ادھر ادھر
بحالت انتشار کچھ چھوٹے بڑے ستارے پھر بھی چمکا کرتے تھے [illegible]
[illegible] اگر سید احمد [illegible] نانوتہ سے مولانا مملوک العلی صاحب اپنے ساتھ مولانا نانوتوی کو دلی نہ
لاتے بلکہ جیسے مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دلی بغیر کسی توسط کے طلب علم کی آرزو
لے کر پہنچے تھے، یہی حال مولانا نانوتوی کا ہوتا تو شاید اساتذہ کے انتخاب میں ان کو بھی
اسی طرح کچھ دن پاپڑ بیلنے پڑتے جیسے مولانا گنگوہی کو بیلنا پڑا تھا۔ مولانا گنگوہی فرمایا
کرتے تھے کہ [illegible]
[illegible] ابتدا میں ہم دلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے لیکن تسکین نہیں [illegible]
[illegible] ہوتی تھی، کہیں سبق تھوڑا ہوتا تھا، کہیں شبہات کا جواب نہ ملتا تھا [illegible]
[illegible] (صفحہ ۳۰ تذکرۃ الرشید) [illegible]
آخر مولانا مملوک العلی کے درس میں جب ان کو وہ سب کچھ ملنے لگا جس کی تلاش میں تھے تو دھونی
رما کر وہیں بیٹھ گئے، بہرحال مولانا گنگوہی کو تو ادھر ادھر اساتذہ کے ٹٹولنے اور ڈھونڈھنے میں
کچھ وقت صرف بھی کرنا پڑا، لیکن بجائے مرید کے "مراد" بنا کر قدرت نے جس ہستی کو مولانا
مملوک العلی کے زیر سایہ عاطفت پہنچایا تھا اس کو تو ایک دن کے لئے بھی کسی دوسری
طرف نظر ڈالنے کی ضرورت پیش نہ آئی، کوئی صریح شہادت تو ہمارے پاس نہیں ہے۔ لیکن
گوناگوں تعلقات جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا مملوک العلی کے درمیان تھے، قیام و طعام
کے نظم میں بھی جہاں تک میرا خیال ہے کوئی دشواری پیش نہ آئی، رشتہ کے جو تعلقات ان کے
ساتھ تھے، کم از کم اس زمانے کے لحاظ سے یہ ناممکن تھا کہ وہ مولانا نانوتوی کو اپنا مہمان نہ
بناتے۔ مولانا گنگوہی کے متعلق تو لکھا ہے کہ یتیم ہو جانے کی وجہ سے دادا کی کفالت میں تھے
جو کل تین روپے ماہوار ان کو دلی بھیجا کرتے تھے، انہیں تین میں زندگی کی ساری ضرورتیں پوری

ہوتی تھیں، لیکن مولانا نانوتوی کو شاید اس تین زد پئے کی ضرورت بھی نہیں ہوئی، مولانا مملوک العلی کا گھران کا گھر تھا وہی ان کا مدرسہ بھی تھا اور وہی اقامت خانہ بھی،

غالباً ان قدرتی سہولتوں کا یہ نتیجہ تھا کہ ۲ رمحرم کو مولانا دلی پہنچے ہیں، کم ازکم چار دن میں یہ سفر پورا ہوا ہوگا، سفر بھی ریل میں نہیں، بہلی میں پورا ہوا تھا، مگر صرف ۳ رمحرم یعنی ایک دن کے وقفہ کے بعد ٹھیک چوتھی محرم کو مولانا مملوک العلی صاحب نے آپ کو سبق شروع کرادیا مصنف امام جو شاید اس سفر میں ساتھ بھی تھے ارقام فرماتے ہیں۔

"دوسری محرم سن ساٹھ کو دہلی پہنچے چوتھی کو سبق شروع ہوئے" ص۲۸

واللہ اعلم ایک دن کا یہ وقفہ جو سبق شروع کرانے میں ہوا، اس کا سبب کیا تھا سفر کی تکان اور ماندگی کا ازالہ مقصود تھا، یا آغاز کتاب کیلئے عموماً چہار شنبہ کے دن کو علماء نے جو پسند کیا ہے اُس دن کے انتظار میں درمیان کے اس ایک دن کو ٹال دیا گیا، ۱۲۶۰ھ کے محرم سے پہلے ذی الحجہ کا مہینہ جو گذرا وہ ۳۰ رکا تھا یا ۲۹ رکا، چونکہ یہی مسئلہ مشتبہ ہوگیا، اس لئے ۲ رمحرم کا دن بھی کچھ مشکوک سا ہو کر رہ گیا ہے۔ ورنہ چہار شنبہ والی توجیہ ہی شاید ترجیح کی زیادہ حقدار تھی۔

دلی میں مولانا نانوتوی کی تعلیم کی نوعیت

"حضرات دیوبند" کے متعلق مختلف حیثیتوں سے متعدد تذکرے اب تک جو شائع ہوئے ہیں ان میں سیدنا الامام الکبیر کی تعلیم جو دلی میں ہوئی اس کے متعلق بعض غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کو صاف کرلیا جائے۔

تمہیدی بیان میں آپ سن چکے کہ حضرت مولانا مملوک العلی دلی کے عربک کالج میں سرکاری مدرس تھے، عربک کالج سے مولانا مملوک العلی کا بھی تعلق غالباً باعث غلط فہمی بنا ہوا ہے، انتہا یہ ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) جیسے عالم خبیر کی طرف ارواح ثلاثہ میں یہ بیان منسوب کیا گیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ

"مولانا نانوتوی دہلی میں مولانا مملوک العلی صاحب سے جب تعلیم پاتے تھے تو وہاں کے کالج میں نام مولانا کا داخل تھا" (ص۱۹۳ ارواح)

اور اس سے بھی زیادہ دل چسپ لطیفہ وہ ہے، جسے قصص الاکابر کے جامع نے سیدنا حکیم الامت قدس اللہ سرہ کی طرف بایں الفاظ منسوب کیا ہے یعنی یہ فرماتے ہوئے۔

"کہ مولانا مملوک العلی صاحب جوکہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے والد اور مولانا رشید احمد و مولانا محمد قاسم صاحب کے استاد ہیں، دہلی میں دار البقار سرکاری مدرسہ تھا، اس میں ملازم تھے۔" صت۳۲ الہادی ماہ شعبان ۵۶ھ

گویا ان دونوں ملفوظات کو ملا لینے کے بعد ایک عامی آدمی قدرتاً اسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب کا دلی کے سرکاری مدرسہ میں نام داخل تھا، اور اس سرکاری مدرسہ کا نام "دار البقار" تھا، حاصل جس کا یہی ہوا کہ حضرت نانوتوی مدرسہ دار البقار دلی کے تعلیم یافتہ تھے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں حضرت حکیم الامت کی طرف "دار البقار" کا لفظ جو منسوب کیا گیا ہے اس میں یا جامع ملفوظات سے کوئی اندراجی غلطی ہوئی ہے یا خود حضرت تھانوی کو عربی کالج اور دار البقار میں اشتباہ واقع ہوا، بہرحال دار البقار سے تو حضرت نانوتوی کو کسی قسم کا تعلیمی تعلق نہ تھا، اتنی بات تو قطعی ہے، باقی عربی کالج میں آپ کے نام کا داخل ہونا جیسا کہ مولانا حبیب الرحمٰن کی طرف منسوب کیا گیا ہے، بہ ظاہر اس سے یہ خیال گذرتا ہے کہ ابتدار ہی سے مولانا مملوک العلی نے حضرت نانوتوی کا نام عربی کالج میں شریک کرا دیا تھا، میرے نزدیک کلیتہً یہ انتساب بھی صحیح نہیں ہے، غلط فہمی کا منشار غالباً ہمارے مصنف امام یعنی مولانا محمد یعقوب صاحب کا شاید یہ بیان ہے جو سوانح قدیم میں پایا جاتا ہے، انھوں نے ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ

"والد مرحوم (مولانا مملوک العلی) نے مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا، اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال سے معترض نہ ہوجیو میں ان کو پڑھالوں گا اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو، اور قواعد حساب

آگے دوسرا قصہ ہے جس کا ذکر اپنے موقعہ پر کیا جائے گا۔ اس قصے کے بعد آخر میں مصنف امام ارقام فرماتے ہیں کہ

"جب امتحان کے دن ہوئے تو مولوی صاحب (مولوی محمد قاسم صاحب) امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا" ص ۲۹۹

اوپر اور نیچے کے ان دونوں اجزاء کو پیش نظر رکھتے ہوئے خاکسار اسی نتیجہ تک پہنچا ہے کہ سرکاری عربی کالج میں مولانا نانوتوی کے نام کی شرکت دلی کی تعلیمی زندگی کے صرف ایک سال تک محدود ہے، اور یہ ایک سال بھی جس میں آپ کا اسم مبارک کالج کے باضابطہ رجسٹر میں شریک رہا، غالباً اس وقت کا واقعہ ہے جب عام تعلیم سے آپ فارغ ہو چکے تھے، غالباً آئندہ معاشی زندگی کی سہولتوں کا خیال کر کے شفیق اساتذہ نے مشورہ دیا کہ سرکاری سند بھی حاصل کر لو تو مناسب ہے۔

علاوہ دوسرے قرائن کے خود مصنف امام نے مدرسہ چھوڑ دینے کے واقعہ کا ذکر کر کے جو یہ لکھا ہے کہ

"پھر مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) نے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی کچھ مزدوری کر لی اور کتابیں معمولی تمام کر چکے تھے" ص ۲۹۹

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نانوتوی کی تعلیمی زندگی کے آخری سال کا یہ واقعہ ہے۔

بہر حال کچھ بھی ہو عربی کالج میں ابتداء سے مولانا نانوتوی کا حصول علم کے لیے شریک ہونا قطعاً صحیح نہیں ہے، سب سے بڑی دلیل اس کی یہ ہی ہے کہ مولانا نانوتوی کو مولانا مملوک العلی صاحب اپنے ساتھ سنہ ۱۸۴۴ء مطابق سنہ ۱۲۶۰ ہجری میں دلی میں لائے ہیں اور دلی کالج کی جو رپورٹ مولوی عبدالحق صاحب نے بڑی محنت و کاوش سے تیار کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھیک اسی سال یعنی سنہ ۱۸۴۴ء میں دلی کے اس عربک کالج کے دونوں شعبوں

مشرقی و انگریزی کا نصاب ایک کر دیا گیا تھا۔ یہ لکھنے کے بعد کہ

"دلّی عربی کالج میں انگریزی اور مشرقی شعبے کئی سال تک نصاب تعلیم نیز تقریباً ہر پہلو سے جدا اور مختلف رہے"

مولوی عبدالحق صاحب رقم طراز ہیں کہ

"جب پرنسپل کا تقرر ہوا تو اس نے (مسٹر بترو پرنسپل نے) اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ دونوں شعبوں کی تعلیم کو ملا کر ایک کر دیا جائے"

لفٹنٹ گورنر جن کی منظوری کے بغیر دونوں شعبوں کے انضمام و ادغام کی تجویز نافذ نہیں ہو سکتی تھی، پرنسپل نے ان کی خدمت میں اپنی یہ ادغامی و انضمامی تجویز پیش کی، مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ

"لفٹنٹ گورنر بہادر نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور اس کو قائم رکھنے کی خواہش ظاہر کی، نیز انھوں نے (لفٹنٹ گورنر نے) یہ خیال ظاہر کیا کہ دونوں شعبوں کو ایک ہی مکان میں ایک ہی چھت کے نیچے تعلیم دینے سے اس تجویز کی کامیابی میں زیادہ سہولت پیدا ہو گی"

آخر میں مولوی عبدالحق نے یہ اطلاع دی ہے کہ

"۱۸۴۴ء میں اس پر (یعنی دونوں شعبوں کے انضمام کی تجویز پر) عمل درآمد شروع ہوا" (۳۸ مرحوم عربی کالج)

اور مولانا نانوتوی ٹھیک اسی سال ۱۸۴۴ء میں مولانا مملوک العلی کے ساتھ دلی تعلیم پانے کے لئے تشریف لائے ہیں، مولوی عبدالحق صاحب نے دونوں (مشرقی و انگریزی) شعبوں کے انضمام کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ

"دونوں شعبوں میں اخلاقی اور سائنٹفک مضامین کی تعلیم یکساں طور پر دی جائے"

پھر اس اجمال کی تفصیل وہی یہ کرتے ہیں کہ

"ان مضامین کے ذیل میں حساب، جیومیٹری، الجبرا، نیچرل فلاسفی، جغرافیہ
تاریخ ہند، پولٹیکل اکانومی (معاشیات) اور جورس پروڈنس (اصول قانون) کا خاص
طور پر ذکر کیا گیا تھا۔"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ علاوہ انگریزی ادب کے جو انگریزی شعبہ کی خصوصیت تھی، جدید علوم وفنون
کی کتابیں دونوں شعبوں کے نصاب میں شریک کردی گئی تھیں۔

جب ہم یہ جانتے ہیں کہ مولٰنا نانوتوی نے ان جدید علوم وفنون کی تعلیم باضابطہ درسی طور
پر نہیں حاصل کی تھی، جس کی ایک کھلی دلیل یہ ہے، کہ جس سال مولٰنا کا نام عربی کالج میں مولانا
مملوک علی نے شریک کرایا تھا اور حکم دیا تھا کہ اقلیدس خود دیکھ لو، اور حساب کی مشق کرلو، تو
جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے

"چند روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحب (مولٰنا نانوتوی) سب معمولی مقالے دیکھ چکے
اور حساب پورا کرلیا ازبسکہ یہ واقعہ نہایت تعجب خیز تھا، طلبہ نے پوچھ پاچھ شروع
کی، یہ کب عاری تھے ہر بات کا جواب باصواب تھا۔" ص۲۵ سوانح قدیم

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال سے پہلے ان علوم کی درسی تعلیم کا موقعہ مولانا نانوتوی کو کالج
میں نہ ملا تھا، ورنہ "ازبسکہ یہ واقعہ نہایت تعجب خیز" کیوں ہوتا، اور طلبہ اپنی حیرت کے ازالہ کے
لئے پوچھ پاچھ سے کیوں کام لیتے۔

بہرحال عربی کالج سے مولانا نانوتوی کے تعلیمی تعلق کا مسئلہ اگرچہ مختلف غیر تحقیقی بیانوں کی
وجہ سے کچھ زیادہ ژولیدہ اور الجھا ہوا نظر آتا ہے، مگر گرد وپیش کے تمام واقعات و حالات کو
سامنے رکھتے ہوئے اسی نتیجہ تک پہنچنا پڑتا ہے، کہ گو مولانا نانوتوی نے عربی کالج دہلی
کے صدر شعبہ مشرقی مولٰنا مملوک علی صاحب سے تعلیم پائی، لیکن آپ کی یہ تعلیم عربی کالج کے
نظام اور نصاب کے تحت نہیں ہوئی، بلکہ صاحب فرائد الدہر جو مولانا مملوک علی صاحب کے
دیکھنے والوں میں ہیں اور ان کی یہ کتاب مولانا مملوک علی کی زندگی ہی میں لکھی گئی ہے، اسی

کتاب کے حوالہ سے غالباً یہ فقرہ نقل کرچکا ہوں کہ مولانا مملوک علی صاحب

"سوائے درس دہی طلبائے مدرسہ (عربی کالج) کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں، تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلبا ہیں نصف شب تک منقسم ہیں۔"

اس بنیاد پر بھی ماننا چاہئے کہ مولانا نانوتوی کی تعلیم کا تعلق بھی "گھر پر" والی تعلیم سے تھا، پہلی کتاب جو مولانا مملوک علی صاحب سے سیدنا الامام الکبیر النانوتوی نے شروع کی، جیساکہ مصنف امام نے لکھا ہے کافیہ تھی، اس کا پتہ نہ چل سکا کہ مولانا نانوتوی تنہا پڑھتے تھے، یا آپ کے ساتھ دوسرے بھی شریک تھے، ظاہر حال کا اقتضا یہی ہے کہ غالباً شروع میں آپ کے درس کی نوعیت انفرادی تھی، مولانا نانوتوی مولانا مملوک علی کے گھر ہی پر مقیم تھے، جس وقت بھی موقعہ ملتا ہوگا، آپ کو پڑھا دیا کرتے تھے، ہاں ایک سال بعد یعنی ۱۲۶۱ھ میں جب قطب گنگوہ حضرت مولانا رشید احمد قدس اللہ سرہ بھی مولانا مملوک علی کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو دونوں بزرگوں کی رفاقت کا وہ تاریخی سلسلہ شروع ہوا، جس کا رشتہ ابد سے بندھا ہوا تھا، گویا ازل کی تقدیر ۱۲۶۱ھ ہجری میں عالم تدبیر میں جلوہ فرما ہوئی۔

دلّی میں دونوں حضرات کی تعلیمی مدت

یہ عجیب بات ہے کہ قطب گنگوہی آئے بھی دلی ایک سال بعد جس وقت تشریف لائے تھے، تو جیساکہ صاحب تذکرۃ الرشید نے لکھا ہے کہ

"اس وقت آپ (قطب گنگوہی) ہدایۃ النحو پڑھتے تھے"۔ (ص ۲۶ تذکرۃ الرشید ج ۱)

جس کا مطلب یہی ہوا کہ کافیہ پڑھنے والے طالب العلم کے لحاظ سے ایک درجہ نیچے تھے، سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ ہمدرسی کا تعلق دونوں میں پھر کیسے پیدا ہوا، جہاں تک قرائن و قیاس سے معلوم ہوتا ہے، وجہ اس کی شاید یہ ہو کہ گو نصابی کتاب ہدایۃ النحو کے لحاظ

سے قطب گنگوہی ایک درجہ نیچے تھے ۔ لیکن عمران کی اس وقت جب دلّی آپ کے قدوم فرمائی سے رونق اندوز ہوئی، صاحب تذکرۃ الرشید کے بیان کے مطابق سترہ سال کی تھی، برعکس اس کے مولٰنا نانوتوی جب دلی پہنچے ہیں اس وقت عمر کے لحاظ سے بارہ تیرہ کے درمیان میں تھے، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی بنا پر لکھا ہے کہ

"جب آپ کی (مولٰنا نانوتوی کی) عمر تیرہ برس کی تھی واسطے تحصیل علم ظاہری کے دہلی تشریف لے گئے" (ص۹ سوانح مخطوطہ)

یوں بھی سن ولادت کے حساب سے دونوں بزرگوں میں چار سال کا تفاوت تھا ہی، قطب گنگوہی کی ولادت ۱۲۴۴ھ میں، اور حضرت نانوتوی کی ۱۲۴۸ھ میں ہوئی، نیز صاحب تذکرۃ الرشید کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قطب گنگوہی جب ہدایۃ النحو پڑھتے ہوئے دلّی آئے، تو کچھ دنوں تک پنجاب کے ایک بزرگ قاضی احمد الدین جو جہلم کے رہنے والے تھے، ان ہی سے پڑھتے رہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے دونوں بزرگوں کی نصابی کتابوں میں تفاوت کا جو قصہ تھا، یہ قصہ غالباً مولوی احمد الدین صاحب ہی کے حلقہ درس میں ختم ہو گیا! عمر بھی حضرت قطب گنگوہی کی کافی تھی، آگے بڑھ جانے میں دشواری نہ ہوئی؛ اور گو ہمارے پاس کوئی بیّن صریح شہادت تو نہیں ہے لیکن مذکورہ بالا معلومات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قطب گنگوہی نے جس وقت مولانا مملوک العلی ہی کے پاس پڑھنے کا آخری فیصلہ فرما لیا، اور مولٰنا مملوک العلی نے پڑھانا منظور فرما لیا تو بقول صاحب تذکرۃ الرشید

"قابل استاد کا قاعدہ ہے کہ ذکی طالب العلم کو ڈھونڈھتا ہے اور سمجھ دار طالب العلم کا دستور ہے کہ قابل استاد کی ٹوہ لگاتا ہے۔ اس لئے ہر دو جانب سے دلی راحت کے سامان پیدا ہو گئے"

اسی کے بعد ان کے الفاظ ہیں کہ

مولنا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہا چند روز کے بعد
ایسے ہم سبق رہے کہ آخرت میں بھی ساتھ نہ چھوڑا " (صـ۲۵ تذکرہ)

اگرچہ "چند روز کے بعد" کے الفاظ کچھ مبہم سے ہیں، لیکن بظاہر اس کا مطلب وہی ہے کہ دلی آنے کے بعد دونوں کی نصابی کتابوں میں جو تفاوت تھا، وہ مولوی احمد الدین کے یہاں ختم ہوگیا، اور مولنا مملوک علی صاحب کے پاس الدنیا والآخرت کے ان دونوں ازلی رفیقوں نے ایک ساتھ پڑھنا شروع کیا اور کتابیں جب ختم ہوئیں تو دونوں بزرگوں کی ایک ساتھ ختم ہوئیں، اور اسی سے حضرت نانوتوی کے ایام تعلیم کی مدت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ صاحب تذکرۃ الرشید (جن کی کتاب قطب گنگوہی کے فلذۃ الکبد مولنا حکیم مسعود احمد مرحوم کی نظر سے گذرنے کی وجہ سے ان امور میں کافی استناد کی مستحق ہے۔) اسی کتاب میں یہ لکھتے ہوئے کہ

"اس وقت جب آپ کی (یعنی قطب گنگوہ) کی عمر تخمیناً اکیس سال تھی، آپ کا زمانہ طالب العلمی ختم ہولیا، اور آپ نے اپنے وطن مالوف کی طرف مراجعت فرمائی "

آگے بیان کیا ہے کہ

"دہلی میں بزمانہ طالب العلمی جتنا بھی آپ کو (قطب گنگوہ کو) قیام کرنا پڑا، اس کی مدت بمشکل چار سال ہوتی ہے " صـ۳۵

ہمیں جب یہ معلوم ہے کہ مولنا نانوتوی نے قطب گنگوہی سے ایک سال پہلے مولانا مملوک العلی سے پڑھنا شروع کیا تھا، تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوا کہ دلی میں مولانا نانوتوی کی تعلیمی مدت ایک سال زائد یعنی پانچ سال تھی، مگر مشکل یہ ہے کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ مولنا نانوتوی

"سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے " صـ۹

اور جیسا کہ ان ہی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ تیرہ سال کی عمر میں حضرت نانوتوی دلی تشریف

لائے تھے، تو اس حساب سے آپ کی تعلیمی مدت بھی چار سال ہی قرار پاتی ہے، لیکن جہانتک میرا خیال ہے تیرہ سال کی عمر کا دعویٰ دلی پہنچنے کے وقت جوانھوں نے کیا ہے، خود اسی میں کامل احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے، لیکن اگر یہ مانا جائے کہ اس وقت تیرہ سے کم اور بارہ سے مولٰنا نانوتوی کی عمر متجاوز تھی، اور مولٰنا گنگوہی کے ساتھ تعلیم سے جب فارغ ہوئے تو اس وقت آپ کی عمر سترہ اور اٹھارہ کے درمیان تھی، تو پانچ سال والی بات درست ہو جاتی ہے، اس قسم کی باتوں میں حزم و احتیاط سے کام نہ لینے کا چونکہ عام رواج ہے، اس لئے سوانح مخطوطہ کے مصنف چنداں قابل الزام نہیں ہو سکتے، آخر حضرت نانوتوی ہی کے متعلق ان کے تلمیذ رشید مولٰنا منصور علی مراد آبادی ثم حیدر آبادی جیسے بزرگ کے بیان میں ہم یہ پاتے ہیں، یعنی انھوں نے لکھا ہی کہ ان کے استاد مولٰنا نانوتوی

"بارہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔" (مذہب منصور)

اس کے لحاظ سے خود سوچئے کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کیا بے پروائی یا لاپروائی کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی تعلیمی زندگی جو دلی میں گذری اس کی مدت کم وبیش پانچ اور چھ سال کے درمیان تھی، اگرچہ مسئلہ معمولی تھا، لیکن اس قسم کی باتوں نے یعنی مولانا گنگوہی ایک سال بعد اور وہ بھی حضرت نانوتوی کی نصابی کتاب سے ایک درجہ نیچے کی کتاب پڑھتے ہوئے دلی تشریف لائے، لیکن علم سے فارغ دونوں ساتھ ہوئے، مسئلہ کو کافی پیچیدہ کر دیا تھا، سلجھانے کی ممکنہ کوشش میرا فرض تھا۔

دلی کی تعلیمی زندگی کے سوانح و واقعات حضرت مولٰنا مملوک العلی سے پڑھنے کے سوا دلی کی تعلیمی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے متعلق اگرچہ معلومات کی بضاعت حد سے زیادہ مزجات ہے یہ ایک کافی بڑی مدت ہے، طالب علمی کا زمانہ ہے، دلی سیاسی و علمی ہستیوں کے اجڑ جانے کے باوجود ہر طرح طرح کے فن کاروں اور باکمالوں کو اپنے آغوش میں سمیٹے ہوئے تھی،

لال قلعہ کا چہرہ کام کے لحاظ سے اگرچہ صفر بن کر زرد پڑچکا تھا، لیکن اس کے نام کے ساتھ بھی مرکز تعلق ہونے کی بچی کھچی کیفیت باقی تھی، سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کے نام نہاد شاہی دربار سے ذوق وغالب جیسے شعرا اس وقت تک وابستہ تھے، ان ہی میں مؤمن، شیفتہ، نصیر، صہبائی تھے جن کی نواسنجیوں سے اجڑی دلی کے کھنڈر میں داد وتحسین کی صدائیں بلند ہورہی تھیں، ان مسیحا نفس اطباء سے دلی ابھی خالی نہیں ہوئی تھی، جن کے نام سے بھی بیماروں کے قلوب اب بھی قوت حاصل کرتے ہیں، بڑے بڑے خوشنویس، پہلوان، پھکیت، تیراک، بقیۃ السلف کی شکلوں میں اب بھی غریب دلی کے دامن کو تھامے اپنے برے بھلے دن اسی مجمع الکمالات قدیم مرکز کے کھنڈروں میں گذار رہے تھے، خطباء تھے، بلغاء تھے، وعاظ تھے، مشاعروں کی محفلیں جمتی رہتی تھیں، وعظ کی مجالس قائم ہوتی تھیں، دنگلوں میں اپنے کمالات اور ہنر کو دکھانے والے دکھا رہے تھے۔

یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نانوتوی جیسی ہمہ گیر ہستی کمالات کے ان شعبوں سے دلچسپی نہ رکھتی ہو لیکن کیا کیجئے کہ بیان کرنے والوں نے اس سلسلہ میں کوئی قابل ذکر چیز ایسی نہیں چھوڑی ہے جو آپ کی سوانح عمری میں قابل اندراج ہو، حد تو یہ ہے کہ علم اور دین جو سیدنا الامام الکبیر کی فطرت و جبلت کے جوہری عناصر ہیں، ان سے بھی تعلق رکھنے والے واقعات کا تذکرہ جیسا کہ چاہئے نہیں کیا گیا ہے، تاہم غنیمت ہے کہ ان دونوں شعبوں کے متعلق دوسرے واقعات کے ذیل میں خبریں مل گئی ہیں، مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ کے قاعدے کے تحت ان ہی بکھری ہوئی منتشر باتوں کو ایک خاص ترتیب سے پیش کردیتا ہوں۔

سب سے پہلی بات تو وہی ہے کہ "علم کی بکری" کا ظریفانہ خطاب اپنے استاد شیخ مہتاب علی سے دیوبند میں جو آپ کو عطا ہوا تھا۔ قیام دہلی کے ابتدائی دنوں میں اس خطاب کے آثار ولوازم کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا پر ابھی کافی اثر قائم تھا، صرف ونحو جو اس زمانہ میں آپ کے تدریسی علوم تھے، ان کے متعلق علاوہ ان خانگی مباحثوں کے جن کا ذکر

مصنف امام کے حوالہ سے گذر چکا، یعنی مولٰنا مملوک علی کے دولت خانہ پر خصوصیت کے ساتھ جمعہ کی شب میں جس میں چھٹی ہوتی تھی، صیغوں اور ترکیبوں کے پوچھنے اور مشق کا سلسلہ جاری رہتا تھا، لیکن بات گھر کی ان خانگی مجلسوں ہی تک محدود نہ تھی، دلی کے طبقۂ علماء کی ممتاز ہستیوں میں ایک بزرگ مولٰنا نوازش علی صاحب بھی تھے، حدیث میں حضرت مولٰنا شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، اور دوسرے علوم وفنون کی کتابیں دلّی کے اچھے اچھے مولویوں سے پڑھی تھیں، آثار الصنادید میں سرسید احمد خاں نے ان کا بھی مستقل تذکرہ درج کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دلّی کی ممتاز ہستیوں میں مولوی نوازش علی صاحب کا بھی شمار تھا، منجملہ دوسری باتوں کے ان کی خصوصیات کا اظہار سید صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ

> از بسکہ طبیعت ہدایت وارشاد کی طرف مائل ہے، اور ساکنین شہر شاہجہان آباد اکثر بہ شوق اہتداء واسترشاد وعظ کہنے کے واسطے اپنے اپنے گھر میں ان کو تکلیف دیتے ہیں، خلق وحلم میں یگانہ روزگار ہیں اور قناعت وتوکل میں شہرہ آفاق ہیں۔" (ص۲۷ آثار حصہ سوم)

سید صاحب کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دلّی کے عام باشندوں پر مولوی نوازش علی صاحب کا خاص اثر تھا[1]، اتفاق کی بات جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ ان ہی مولوی

---

[1] حیات جاوید میں، مولانا حالی نے لکھا ہے کہ (۲۹) سال کی عمر میں سرسید فتحپور سے بدل کر جب دلی آئے تو پڑھنے کا شوق اس عمر میں بیدار ہوا اور ان ہی مولوی نوازش علی صاحب سے پچھلی پڑھی ہوئی کتابوں کو پھر پڑھا، اور جب رہتک ان کا تبادلہ ہوا تو مولوی نوازش علی صاحب کو اپنے ساتھ لے چلنے پر مصر ہوئے، مولوی صاحب نے کہا کہ میرے ساتھ طالب العلموں کی ایک جماعت ہے، ان کے کھانے کا نظم وہاں کیا ہوگا، باوجودیکہ سید صاحب کی تنخواہ اس زمانہ میں معمولی تھی، لیکن علم کے شوق میں انھوں نے وعدہ کر لیا کہ جتنے طالب العلم آپ کے ساتھ رہتک چلیں گے سب کا کھانا میرے ذمہ ہوگا، اس وعدے پر مولوی صاحب ساتھ چلنے پر راضی ہو گئے اور سید صاحب نے وعدہ پورا کیا، یہ بھی لکھا ہے کہ مولوی نوازش علی صاحب نے شروع میں جب رہتک جانے سے انکار کیا تو سرسید نے کہا کہ میں بھی رہتک نہ جاؤں گا، خواہ میری ترقی رک ہی کیوں نہ جائے ۱۲ ص۳۶ ج ۱، ص۴۱ ، ص۱۵۲ ج ۲

نوازش علی صاحب کی مسجد کے پاس وہ مکان تھا، جس میں مولنا مملوک العلی صاحب اس زمانہ میں قیام فرماتے تھے، جہاں مولنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو دلی تشریف لانے کے بعد مولنا مملوک العلی کے ساتھ رہنا پڑا تھا، قرب واتصال کی وجہ سے مولنا اسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ مولوی نوازش علی صاحب کی اس مسجد میں

"طالب علموں کا مجمع تھا"

بہ ظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے جیسا کہ سرسید نے لکھا ہے مولنا نوازش علی صاحب کا واعظ شہر ہونے کی حیثیت سے شہر دہلی کے عوام وخواص پر کافی اثر تھا "خلق وحلم" میں بقول سرسید یگانہ روزگار تھے، پڑھنے کے لئے باہر سے دلی جو لوگ آتے تھے، مولانا نوازش علی کے "خلق وحلم" سے مستفید ہونے کا کافی موقعہ مل گیا تھا، مختلف گھروں میں اس زمانہ کے دستور کے مطابق طالب العلموں کی جاگیر مولوی نوازش علی صاحب کی کوششوں سے میسر آجاتی تھی، اوران ہی طالب العلموں کے قیام کا نظم مولوی صاحب نے اپنی مسجد اور مسجد کے متعلقہ حجروں میں کر رکھا ہوگا، افسوس ہے کہ اس مسجد کی وسعت اور اس کے حجروں کی صحیح تعداد وکیفیت کا علم نہ ہوسکا، لیکن قرائن وقیاس کا اقتضاء یہی ہے کہ اس مسجد میں طالب العلموں کی کافی تعداد رہتی تھی،

جیسا کہ قاعدہ ہے طلبہ عام طور پر نووارد طالب العلم کو اپنی قابلیت ولیاقت سے مرعوب کرنے کی عموماً کوشش کرتے ہیں، خصوصاً شہری طالب العلموں کے مجمع میں جب کوئی قصباتی طالب علم بے چارہ گھر جائے تو پھر اس بے چارے کی جو درگت بنتی ہے، اس سے وہی واقف ہوسکتے ہیں، جن پر یہ گذری ہو۔

سیدنا الامام الکبیر قصباتی آبادی نانوتہ سے شروع شروع میں دلی تشریف لائے تھے عمر بھی کم تھی، مولوی نوازش علی کی مسجد میں رہنے والے شہر دلی کے مختلف تدریسی حلقوں میں

تعلیم پانے والوں کے لئے اظہار قابلیت کا گویا مغتنم موقع پیش ہوگیا، مصنف امام جو خود اس واقعہ کے شاہد ہیں؛ اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بحث و مباحثہ کی طرح مسجد کے ان طالب العلموں نے مولانا سے ڈالی، اپنے دل میں وہ سوچے ہوئے تھے ایک قصباتی طالب العلم کا معاملہ ہے، لیکن ان غریبوں کو کیا معلوم تھا کہ "بکریوں کے گلے میں شیر کا بچہ شریک ہوگیا ہے" حضرت والا کی اجتبائی شان سے واقف ہونے کی وجہ ہی کیا ہوسکتی ہے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"پوچھ پاچھ اور بحث شروع ہوئی" ص۲۵

ایسا معلوم ہوتا ہے، اس پوچھ پاچھ بحث و مباحثہ کی ابتداء مسجد کے طالب العلموں کی طرف سے ہوئی، جب تک وہ اپنی کہتے رہے، مولانا خاموشی کے ساتھ ان کی باتیں سنتے رہے، جب انکی باتیں ختم ہوگئیں، وہ منتظر تھے کہ ان شہری طالب العلموں کے عالمانہ سوالوں کے جواب میں یہ غریب قصباتی نووارد، کم سن طالب العلم کیا کہہ سکے گا، مگر جیسا کہ مصنف امام کا بیان ہے۔

"مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم) کی باری آئی، سب پر غالب آئے" ص۲۵

افسوس ہے کہ مصنف امام نے اس موقعہ پر حد سے زیادہ اجمال سے کام لیا، نہ یہ بتایا کہ گفتگو کس علم کے کن مسائل پر ہوئی تھی، اور غلبہ کی یہ صورت ابتداء ہی میں پیش آئی، یا رد و قدح کے بعد آخر میں اپنی مغلوبیت اور مولانا کے غالب آنے کا اقرار ان طالب العلموں کو کرنا پڑا، بظاہر حالات کا اقتضا یہی ہے کہ دوسری صورت ہی پیش آئی ہوگی۔

شہر اور وہ بھی دلی جیسے مرکزی شہر کے طالب العلموں کے مجمع میں قصبہ سے آنے والے تازہ تازہ نووارد طالب علم کے غالب آنے کا یہ قصہ مصنف امام کی کتاب میں میری نظر سے جس وقت گذرا، تو اچانک وہ مشہور تمثیلی حکایت یاد آگئی، جس کا ذکر مولانا معنوی نے اپنی مثنوی میں کیا ہے، حاصل جس کا یہ ہے کہ بکریوں کے گلے میں کسی طرح سے شیر کا ایک بچہ گھل مل گیا، ان ہی کے ساتھ رہنے سہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیر کے بچہ نے بھی بکریوں کی عادتیں اختیار کرلیں، ان ہی کی طرح گھاس چرنے لگا، پتے چبانے لگا، لیکن ایک دن جب تالاب کے کنارے بکریوں کے ساتھ شیر کا یہی بچہ پانی

پی رہا تھا، پانی میں اپنی صورت کے عکس پر نظر پڑی، ساتھ ہی ساتھ بکریوں کی صورتوں کے عکس بھی پانی میں جھلک رہے تھے، شیر کے بچہ کو محسوس ہوا کہ اس کی صورت و شکل، اس کا خط و خال بکریوں سے بالکل مختلف ہے، خصوصیتوں کے اسی اختلاف نے شیر کے بچے میں اچانک اس شعور کو بیدار کر دیا کہ وہ بکری نہیں شیر ہے، معاً اسی کے ساتھ ساری شیرانہ صفات کا احساس اس کے اندر جاگ اٹھا اور بکریوں پر جا پڑا، اسے پھاڑا، اسے نوچا، اور ان کی قطار سے نکل کر جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔

مولٰنا نوازش علی کی مسجد کے "مجمع طلبہ" کے سامنے آج جو صورت پیش آئی ہے، اس میں بھی "شعوری انقلاب" کی فجائی صورت کی جھلک مجھے نظر آتی ہے،

مطلب یہ ہے کہ پہلے سے بھی لوگ مانتے چلے آئے ہیں اور آج بھی یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ نسل انسانی میں پیدا ہونے والوں میں اکثریت تو زیادہ تر ان ہی لوگوں کی ہوتی ہے، جن کے لئے یہی غنیمت ہوتا ہے کہ دوسروں کی سوچی سمجھی، سلجھائی ہوئی باتوں کو وہ سمجھ لیں، طلب علم کی راہ پر چلنے والوں میں بھی زیادہ تعداد اسی قسم کے افراد کی ہوتی ہے، ان میں شوقین سے شوقین طالب العلم کا سب سے بڑا کمال اور انتہائی سعی یہ ہوتی ہے کہ دوسروں نے اپنی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اس کا مطالعہ کریں اور ممکنہ حد تک اس کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کریں۔

لیکن ان ہی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہوتے ہیں جن میں دوسروں کے اگلے ہوئے لقموں کو نگلنے کی نہیں بلکہ خود اپنی غذا خود تیار کرنے کی قدرتی صلاحیت اور فطری ملکہ ہوتا ہے، وہ زیادہ تر خود سوچتے ہیں، اور اپنی راہ خود نکالتے ہیں، پہلے زمانہ میں ان استثنائی فطرتوں کی اس جبلی خصوصیت کی تعبیر "عبقریت" کے لفظ سے کرتے تھے، اور آج کل اسی قسم کے افراد کو "جینس" کہتے ہیں

عرض کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کا وجود باجود اجتبائی خصوصیتوں کا حامل تھا، جن کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر ان سے نکل رہی تھیں "عبقریت" اور "خود فکری" ان کی اس اجتبائی

شان کالازمہ اور قدرتی اقتضا تھا ،

مگر جیسے کہ شیر کا بچہ بکریوں اور بھیڑوں کے گلّے میں شریک ہو کر کچھ دن اپنے فطری اقتضاء کے برخلاف گھاس چرنے اور پتے کھانے لگا تھا، کچھ اسی قسم کے حالات میں مولنٰنا کو بھی زندگی کے ابتدائی دنوں میں رہنا پڑا، شروع میں ان کی سمجھ میں بھی یہی آیا کہ حصول علم کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ ہم سے پہلے جو کچھ لوگوں نے سوچا سمجھا لکھا پڑھا ہے، اس کو پڑھا اور سمجھا جائے ۔ علم کے اس بچۂ شیر کو ظریف استاد نے "علم کی بکری" کا خطاب کتب بینی کے اس غیر معمولی شوق کی بنیاد پر دے دیا تھا۔ نانوتہ، دیوبند سہارنپور وغیرہ کی طالب العلمانہ زندگی میں یہ غیر طبعی مشغلہ ان کا جاری رہا، مگر دتی تشریف لانے کے بعد مسجد نوازش علی کے مجمع طلبہ میں غالب آنے کا واقعہ گویا سمجھئے کہ پانی کا وہ عکس تھا جس نے شیر کے بچہ پر یہ واضح کر دیا کہ وہ "بکری" نہیں "شیر" ہے۔

طلبہ کے اس مجمع میں کن کن کتابوں کے پڑھنے والے اور دتی کے کن کن اساتذہ کے تلامذہ شریک تھے، جن کے سامنے سیدنا الامام الکبیر پر دتی آنے کے بعد پہلی دفعہ اپنی "عبقریت" کی زندہ شہادت پیش ہوئی، تاہم چونکہ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب آپ کافیہ جیسی کتاب پڑھ رہے تھے، کافیہ جیسی کتاب پڑھنے والے طالب العلم سے بحث کرنے والے طالب العلموں کے متعلق ہمیں یہ ماننا چاہئے کہ ان کی علمی حیثیت بھی لگ بھگ مولنٰنا ہی کے قریب ہوگی، مگر پھر بھی صورت حال کی یہ خصوصیتیں یعنی ایک طرف تنہا ایک کمسن طالب العلم، دوسری طرف طلبہ کا مجمع، ایک طرف شہر دلی کے تدریسی حلقوں میں تعلیم پانے والے لوگ اور دوسری طرف ابھی ابھی ایک قصبہ سے نیا نیا آنے والا متعلم، ان خصوصیتوں کا اقتضا یہی ہے کہ مولنٰنا کے سامنے کسی نہ کسی شکل میں وہ "آئینہ" اسی وقت آگیا تھا، جس نے آپ پر یہ واضح کیا ہوگا کہ محض کتابوں کے پڑھنے سے اگر علمی کمال حاصل ہو سکتا ہے تو صرف اتنی بات سے کتابوں کے پڑھنے والے طلبہ کے اس مجمع پر ان کو غلبہ نہ ہوتا؛

لیکن قصہ اگر بحث و مباحثہ کی اسی ایک مجلس پر ختم ہو جاتا، تو مولنٰنا پر اپنی حقیقت

ممکن تھا کہ پھر مبہم ہو کر رہ جاتی۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ کے مجمع پر غلبہ پانے کا یہ قصہ طالب العلموں کے دوسرے حلقوں تک بھی بہ تدریج پہنچا، اور علمی زور آزماؤں کی طرف سے چیلنج پر چیلنج آنے لگے، کمسنی کا زمانہ تھا، امنگوں سے قلب مبارک معمور تھا، پیچھے ہٹ جانے کی ظاہر ہے وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی، اور یہیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مسجد نوازش علی کے مجمع طلبہ کے "پوچھ پاچھ بحث" کے قصہ کو بیان کر کے اسی کے بعد مصنف امام رقم طراز ہیں کہ

"اور جب گفتگو ہوتی اس میں مولوی صاحب کو غلبہ ہوتا" ص۲

اس میں شک نہیں الفاظ حد سے زیادہ مجمل ہیں لیکن ان کے اس فقرے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ "بحث و مباحثہ" کا یہ سلسلہ اسی پہلی مجلس تک محدود ہو کر نہیں رہ گیا تھا، مگر یہ بات کہ اس مجلس کے بعد گفتگو جب جب ہوئی تو وہ کہاں کہاں ہوئی۔ مسجد نوازش علی ہی میں ہوئی یا دوسرے مقامات میں بھی ہوئی، نیز کن کن زمانوں میں ہوئی، ان سوالوں کے جواب سے مصنف امام نے تعرض نہیں کیا ہے، اور کوئی دوسرا ذریعہ بھی ہمارے پاس ایسا نہیں ہے جس سے مدد مل سکتی ہو، لیکن مصنف امام کا یہ فقرہ جب عام ہے تو ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ دلی تشریف لانے کے بعد مسجد نوازش علی میں مناظرہ کی اس پہلی مجلس میں طلبہ کے مجمع پر غالب آنے کے بعد بحث و مباحثہ کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہا اور مصنف امام کی شہادت ہے کہ ہمیشہ غلبہ الامام الکبیر کو حاصل ہوتا رہا۔

بلکہ اسی کے بعد مصنف امام نے آگے جو یہ بیان کیا ہے کہ

"ہم میں جو کوئی مغلوب ہوتا، مولوی صاحب سے مدد چاہتا یا مولوی صاحب اس کی خود مدد کرتے"

اس سے تو اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ براہ راست فریق بن کر مناظروں اور مباحثوں میں شرکت کے سوا ایسے طالب العلموں کی جو بے چارے کچھ کمزور ہوتے، لیکن بحث و جدال میں پھنس جاتے

تھے، ان کی وکالت کا فرض بھی دلی میں مولٰنا انجام دے رہے تھے، جس کی دو صورتیں ہوتی تھیں، یعنی کبھی تو اس قسم کے طلبہ کی استدعا اور درخواست پر امداد فرمائی جاتی تھی، اور کبھی خود کسی غریب کی علمی بے کسی کو دیکھ کر امداد کا جذبہ مولٰنا میں خود پیدا ہو جاتا، اور اس غریب کی طرف آپ دست اعانت دراز فرماتے تھے۔

کچھ بھی ہو، خود فریق بن کر مناظرے کی مجلسوں میں شریک ہونا یا دوسرے بحث و مباحثہ کرنے والے طالب العلموں کی اعانت و امداد کا یہ قصہ میرے نزدیک سیدنا الامام الکبیر کے ایام طالب العلمی کی پوری مدت یا پانچ سال سے اگر تعلق نہیں رکھتا تو اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ پانچ سال کی تعلیمی مدت جو دلی میں آپ کی گذری اس مدت کے ایک بڑے حصہ سے اس کا تعلق ضرور رہے۔

گویا ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ ابتداء تو بحث و مباحثہ کے اس قصہ کی اس وقت ہوئی جب آپ کافیہ پڑھ رہے تھے، اور جیسے جیسے تعلیم میں آپ ترقی کر رہے تھے علمی مقابلوں میں مسلسل غالب آنے کا تجربہ آپ کی "عبقریت" کو نمایاں کرتا چلا جا رہا تھا، بالآخر ان ہی دوامی تجربات کا نتیجہ یہ ہوا، جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"پھر تو مولوی صاحب ایسے چلے کہ کسی کو ساتھ ہونے کی گنجائش نہ رہی۔" ص۲۵

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ نہ صرف خود ان پر بلکہ دوسروں پر واضح ہو گیا کہ شیر کا بچہ غلطی سے بکریوں کے گلے میں شریک ہو گیا ہے، شیر کے بچہ پر شیر ہونے کا راز جب تک منکشف نہ ہوا ہو، اس وقت تک ممکن ہے کہ بکریوں کو دیکھ کر کچھ دن گھاس اور پتوں ہی پر دن گذار رہا ہو، لیکن شیر کا بچہ، شیر کا بچہ ہے، بکری کا بچہ نہیں ہے، اس حقیقت کی بے نقابی کے بعد اس کے بکریوں کی غذا اور خوراک پر پڑے رہنے کی خود سوچئے کہ کیا وجہ ہو سکتی تھی،

اور اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ علم کی بکری کے خطاب کا جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس میں

اور حضرت مولانا تھانوی کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل کیا گیا تھا کہ

"مولانا محمد قاسم نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں، بلکہ پڑھنے کے زمانہ میں بھی بہت شوق و شغف سے نہیں پڑھا تھا" (قصص ص ۲۹ ۱۳)

ان دونوں فقروں یا بیانوں میں حقیقی اختلاف یا تناقض نہیں ہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دلی آنے سے پہلے دوسروں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمی کمال کے حصول کا ذریعہ کتب بینی ہے، یہی مولانا خیال فرماتے رہے، ہمت تو بچپن ہی سے آپ کی بلند تھی، اپنے فطری حوصلہ کے مطابق ایسے زمانہ میں جب عموماً بچوں میں کتابوں کے مطالعہ کا ذوق پیدا نہیں ہوتا، سیدنا الامام الکبیر کتابوں کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے، مکتب کے استاد نے ان کے اسی حال کو دیکھ کر "علم کی بکری" کا خطاب عطا کیا تھا، لیکن دلی آنے کے بعد کتابوں کے پڑھنے والے شروح اور حاشیوں کے چاٹنے والے طلبہ کی حقیقت ان پر مسلسل واضح ہوتی چلی جاتی تھی۔ دلی کے ان تجربات نے آپ کے قلب مبارک میں "کتب بینی" کے جذبہ کو اگر مضمحل کر دیا ہو، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔

ہمارے تعلیمی نظام کا اس زمانے میں عام دستور یہ تھا کہ مثلاً فلسفہ پڑھاتے ہوئے بتایا تو یہ جاتا تھا کہ کائنات کے حقائق و واقعات کے سمجھنے کی عقلی کوشش کا نام فلسفہ ہے، مگر کیا یہ جاتا تھا کہ سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں سال پہلے ان ہی عام حقائق کے متعلق جن پر کائنات مشتمل ہے کسی سوچنے والے مثلاً ارسطو یا افلاطون یا فیثاغورس وغیرہ نے جو کچھ کہہ دیا تھا، اسی کو ایک واقعہ ٹھہرا لیا گیا، قدرتی حقائق سے توجہ ہٹ گئی، اور پچھلے لوگوں کی بتائی ہوئی باتوں کو ہی "حقائق" کی حیثیت عطا کر دی گئی، بجائے کائنات کے اب ان ہی باتوں کو سمجھ لینا ہی فلسفہ کی تعلیم کا آخری نقطہ عروج تھا، اور یہ حال بھی باقی رہتا تو غنیمت تھا، لیکن جیسے جیسے زمانہ آگے کی طرف بڑھتا رہا، اصلی سوچنے والوں کی تعبیروں کی جگہ ان لوگوں کی کتابیں نصاب میں شریک ہوتی رہیں، جنھوں نے اپنی پوری زندگی میں عالم کی کسی چھوٹی بڑی حقیقت کے متعلق خود کچھ سوچنے سمجھنے

کی زحمت غلطی سے بھی کبھی گوارا نہ کی تھی، یہی مذاق بڑھتے بڑھتے اس زمانہ میں جب کہ سیدنا الامام الکبیر دلی میں تعلیم پا رہے تھے، اس نقطہ تک ترقی کر کے پہنچ گیا تھا، کہ عہد عالمگیری بلکہ اس کے بعد کے چند سیٹ بھر قاضیوں کی ایسی کتابیں پڑھائی جا رہی تھیں جن میں بجائے حقائق و واقعات کے زیادہ زور "فقرہ تراشی" کی صنعت خاص پر دیا گیا ہے، فلسفہ اور منطق کے سنے سنائے مسائل کو معمے یا چیستاں کا قالب ان کتابوں میں عطا کیا گیا ہے، ان معماتی فقروں کے لئے شرح بھی چیستانی زبان ہی میں لکھی جاتی تھی، اسی لئے شرح کے لئے شرح یا حاشیہ کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی تھی، بلکہ بسا اوقات حاشیہ کیلئے بھی حاشیہ، اور حاشیہ در حاشیہ کے لئے حاشیہ کا غیر متناہی سلسلہ جاری رہتا تھا، ان لفظی گورکھ دھندوں میں پھنسنے والے یا پھنسا دیئے جانے والے طالب العلموں کو باوجود فلسفہ پڑھنے کے اس کی ہوا بھی نہیں لگتی تھی کہ انھوں نے اسی دنیا یا اسی عالم کے متعلق اپنی نہیں دوسروں ہی کی سوچی ہوئی باتیں پڑھی ہیں۔

مگر یہ واقعہ ہے کہ متون و شروح و حواشی کے طوفانی چکروں میں تہ و بالا ہونے والے طالب العلموں کی حالت حد سے زیادہ قابل رحم ہو جاتی تھی، بے چارے اپنے وقت اپنی محنت کا سب کچھ ان ہی کتابی معموں کے حل کرنے میں لگا دیتے تھے، لیکن حقیقت غریبوں کی گرفت میں کیا آتی، سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی بڑی تعداد لفظی پہیلیوں کے سمجھنے سے بھی معذور ہی رہتی تھی، لیکن غریب کیا کرتے ان کے زمانہ میں معراج کمال ہی یہ تھا کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی سوچی ہوئی باتوں کو نہیں بلکہ بنائی اور صرف بنائی ہوئی عبارتوں کو سمجھ لیا جائے، اور سمجھ کر دوسروں کو سمجھا دیا جائے۔ ان طالب العلموں سے بحث و مباحثہ کے قصوں نے سیدنا الامام الکبیر کو ان کتابوں سے افسردہ خاطر بنا دیا اور اس نتیجے تک تو بسا اوقات اول میں نہیں، تو بالآخر عموماً ذہین آدمی پہنچ جاتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ ایک منفی کیفیت ہوتی ہے جو کچھ رکھنے والوں کے قلوب پر طاری ہوتی ہے، شروح و حواشی کے اس طومار میں کچھ نہیں مل سکتا، اس سے زیادہ قنوطی کیفیت اور کسی نتیجہ کو پیدا نہیں کر سکتی، مگر اسی سلبی کیفیت کی مد مقابل ایجابی کیفیت یعنی پھر کچھ ملنے کی صحیح

صورت کیا ہے ؟ اس سوال کا واقعی جواب ہر شخص کے سامنے نہیں آسکتا، اتنا اندازہ تو ممکن ہے کہ دوسروں کو بھی ہو کہ دوسرے سوچنے والوں کی سوچی ہوئی باتوں کا حجاب سامنے سے اٹھا کر براہ راست حقائق و واقعات کو اپنے سامنے لایا جائے، اس میں شک نہیں کہ راہ کی بڑی منزل اس شخص کی بھی کٹ جاتی ہے جو یہاں تک پہنچ گیا ہو، مگر اس کیفیت سے صحیح معنوں میں مستفید وہی ہوسکتا ہے جو "جبلت فائقہ" سے سرفراز ہو، اور "عبقریت" کی خداداد نعمت کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوا ہو۔

سیدنا الامام الکبیر کا حال اس باب میں کیا تھا، اس کی شہادت تو گذر ہی چکی، کہ کچھ ہی دن بعد لوگوں نے پالیا کہ ان کے ساتھ ہونے یا چلنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے، لیکن یہ تو اجمالی بیان مصنف امام کا تھا، آگے اسی کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ سلم، میبذی جیسی منطق و فلسفہ کی متوسط کتابوں کو نہیں بلکہ وہ ارقام فرماتے ہیں، اور اپنی آنکھوں دیکھی بات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

"معقول کی مشکل کتابیں میر زاہد، قاضی، صدرا، شمس بازغہ ایسا پڑھا کرتے تھے جیسے حافظ منزل سناتا ہے۔" ص۲۸

حکیم الامت تھانوی نے خود تو نہیں دیکھا تھا، لیکن دیکھنے والوں سے یہ سنا تھا، سیدنا الامام الکبیر کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"صدرا، شمس بازغہ کا کبھی ترجمہ نہیں کیا، نہ مطالعہ کیا، ایسا پڑھتے تھے، جیسے تلاوت ہورہی ہے۔" (قصص الاکابر ص۲۹ الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۷ھ)

اس میں شک نہیں کہ "چنانکہ افتد دانی" کی منزل سے براہ راست جو نہ گذرا ہو، اور میر زاہد، صدرا، شمس بازغہ جیسی کتابوں کی خصوصیتوں سے واقف ہو، اس کے لئے تو مصنف امام یا مرشد تھانوی کی یہ شہادتیں موجب حیرت ہوں گی۔

عام طور پر دستور کے مطابق روزانہ ان کتابوں کا درس صفحہ آدھ صفحہ سے زیادہ نہیں ہوتا، بلکہ معقولات کی تعلیم و تدریس میں جہاں غیر معمولی غلو اور استغراق سے کام لیا جاتا ہے، وہاں کم از کم میر زاہد

کے متعلق تو میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ دو دو تین تین سطروں سے زیادہ ایک دن کا سبق متجاوز نہیں ہوتا تھا، مگر ان ہی کتابوں کو قرآن کی منزل کی طرح فراٹا بھرتے ہوئے استاد کو سناتے چلا جانا، اس کے وہی مطلب ہو سکتے ہیں، جو نہیں جانتے ہیں، اور سیدنا الامام الکبیر کی عبقری خصوصیتوں، جبلی ملکات فائقہ سے ناواقف ہیں وہ شاید بے ساختہ یہی کہہ بیٹھیں گے کہ ایسی صورت میں ان کی تلاوت لفظی تلاوت سے آگے نہ بڑھتی ہوگی، یعنی معنی مطلب سمجھے بغیر صرف الفاظ کا اعادہ کرتے ہوں گے مصنف امام نے اپنی اس شہادت کو ادا کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا، اس وقت بھی یہ شبہ کیا گیا تھا، ان کا بیان ہے کہ قرآنی منزل کی طرح معقولات کی ان درسی کتابوں کو سناتے ہوئے دیکھ کر

"والد مرحوم (مولٰنا مملوک العلی) کے بعض شاگردوں نے کہا بھی کہ حضرت یہ تو سمجھتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔" ص۲۵

جواب میں انھوں نے لکھا ہے کہ مولٰنا مملوک العلی صاحب نے ان لوگوں سے کہا کہ

"میرے سامنے طالب العلم بے سمجھے چل نہیں سکتا" ص۲۵

مولانا مملوک العلی کو اس کا اندازہ کس ذریعہ سے ہوتا تھا، مصنف امام نے اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر اس کا جواب یہ دیا ہے کہ

"واقعی ان کے (مولانا مملوک العلی کے) سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا، وہ طرز عبارت سے سمجھ لیتے تھے کہ یہ (طالب العلم) مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں۔" ص۲۵

جس کا مطلب بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سمجھی ہوئی عبارت اور بے سمجھی عبارت کے پڑھنے میں جو فرق سننے والے کو محسوس ہوتا ہے، خصوصًا مولانا مملوک العلی صاحب جیسے کہنہ مشق، پرانے ہزاروں کو پڑھائی ہوئی استاد کیلئے یہ مسئلہ یقینًا چنداں دشوار نہ تھا، اسی کے ساتھ ایک اور نکتہ کی طرف مصنف امام ہی نے اشارہ کیا ہے، یعنی انھوں نے لکھا کہ جس وقت سیدنا الامام الکبیر ان کتابوں کو استاذ کے سامنے مذکورہ بالا نوعیت کے ساتھ گذار رہے تھے، تو عربی عبارت کا ترجمہ

اردو زبان میں جیساکہ اس زمانہ میں قاعدہ ہے اور پہلے بھی تھا، نہیں کرتے تھے، مگر اسی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ مولانا قاسم

"کہیں کہیں کوئی لفظ فرماتے جاتے تھے" ص۲۸

یعنی سوائے ترجمہ کے استاذ پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ عبارت کا مطلب میں نے سمجھ لیا ہے حسب ضرورت بیچ بیچ میں لفظ دو لفظ کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیتے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبارت کی ساری پیچیدگیوں کا حل اسی لفظ دو لفظ کے اضافے میں پوشیدہ تھا، اور استاذ کو مطمئن کر دیتا تھا کہ جو کچھ پڑھا جا رہا ہے سمجھ بوجھ کر پڑھا جا رہا ہے۔

بجائے خود درس کا یہ شاید اچھوتا اور نرالا طریقہ تھا، جس کی نظیر کم از کم میری معلومات کی حد تک نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ بعد، نیز اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت حکیم الامت تھانوی کے ان الفاظ سے کہ مولانا محمد قاسم نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں، ان سے بعضوں کو جو یہ مغالطہ ہوا کہ نظامیہ نصاب کی تکمیل مولانا نے نہیں فرمائی تھی اس کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے، درس نظامیہ کا مایۂ ناز عنصر معقولات کی یہی کتابیں ہیں، زواہد اور صدرا و شمس بازغہ کے بعد خود بتائیے کہ یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے کہ "معقولات کی کل نصابی کتابیں مولانا نے نہیں پڑھی تھیں" ہاں ان کتابوں کے پڑھنے کا مذکورہ بالا طریقہ یقیناً عجیب و غریب تھا جس طریقہ سے مولانا ان کو پڑھتے تھے، حکیم الامت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی درسی کتابوں کے "مطالعہ" کے بھی پابند نہ تھے، جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ نہ سبق پڑھنے سے پہلے جیساکہ دستور ہے اپنے سبق کو دیکھ کر استاذ کے پاس آتے تھے اور شاید پڑھنے کے بعد بھی اس سبق کو دہرانے کے عادی نہ تھے، مطالعہ سے بے پروائی بڑھتے بڑھتے کس حد تک پہنچ گئی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے جس کا ذکر مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں کیا گیا ہے حاصل جس کا یہ ہے کہ مفتی صدرالدین خانصاحب نے صدرا جیسی کتاب میں مولانا محمد قاسم کا امتحان لینا چاہا، باوجود اس علم کے کہ صدرا میں امتحان ہوگا، مطالعہ کی زحمت مولانا نے پھر بھی برداشت نہ کی، امتحان میں مفتی صاحب

نے کسی عبارت کا مطلب دریافت کیا، مولانا حبیب الرحمٰن فرماتے تھے کہ مولانا محمد قاسم نے یہ جگہ کتاب کی کبھی دیکھی بھی نہ تھی ۱۹۶ آگے قصہ جو کچھ ہوا، اس کا ذکر اپنے مقام پر کیا جائے گا۔

بہر حال قطعی طور پر کچھ کہنا دشوار ہے، لیکن اِدھر اُدھر بکھری ہوئی منتشر معلومات کو جمع کرنے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ کتابیوں یا کتاب پڑھنے والے طلبہ کی طرف سے توافسردگی کی ابتداء ان مناظروں اور مباحثوں سے سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک میں ہوئی جو وقتاً فوقتاً مولانا نوازش علی مرحوم کی مسجد میں رہنے والے طالب العلموں یا دلی کے دوسرے طالب العلموں سے ہوتے رہے پھر جیسے جیسے تعلیمی ترقیوں کے زینے طے ہوتے جاتے تھے اور بجائے چھوٹی کتابوں کے بڑی کتابیں جن کے ناموں سے اس عہد کے اہل علم مرعوب تھے، جب خود ان کتابوں کے پڑھنے کی نوبت آئی تو خود اپنی ہی جیسے انسانوں کی ساختہ و پراختہ کتابوں سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسن ظن کا پارہ کچھ نیچے ہی اترتا چلا گیا، اور کتابوں سے بے تعلقی کے جو قصے آپ کے متعلق نقل کئے جاتے ہیں جہاں تک میرا خیال ہے، ان کی بنیاد شاید آپ کی ان ہی تجربی مایوسیوں پر قائم ہے، اور حضرت حکیم الامت تھانوی کی طرف قصص الاکابر میں یہ لطیفہ جو منسوب کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما کا ذکر کرتے ہوئے حکیم الامت نے فرمایا کہ

"یہ حضرات جب دلی میں پڑھتے تھے تو آپس میں مزاحاً ایک دوسرے سے کہتے کہ میاں کیا بات ہے کہ ہم ان بڈھوں سے کسی بات میں کم نہیں، بلکہ ہمارا علم تو تازہ ہے، اور ان بڈھوں کا علم پرانا ہو گیا، پھر ہم ذہین بھی ان سے زیادہ ہیں، مگر پھر بھی جو ان کی قدر ہے ہماری نہیں ہے، ان کے سامنے ہم کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، یہ کیا بات ہے، دوسرے صاحب کہتے کہ میاں ذرا ان بڈھوں کو کھسکنے دو، بس پھر تو ہم ہونگے اور تم ہو گے۔"

(قصص الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۰ھ [۳۲])

آگے جامع ملفوظات نے حکیم الامت رح کی طرف عربی زبان کا یہ فقرہ بھی منسوب کیا ہے، یعنی اس لطیفہ کا تذکرہ کرنے کے بعد مولانا تھانوی نے فرمایا کہ

وقد كان كما تفرّسا رضی الله تعالیٰ عنہما	اور واقعہ بھی وہی ہو کر رہا جیسا کہ ان دونوں بزرگوں نے تاڑ لیا تھا۔

نہیں کہا جاسکتا کہ مذکورہ بالا مزاحی مکالمہ دونوں حضرات میں جو ہوا تھا' اس میں کون سائل اور کون مجیب تھا' لیکن سوال وجواب کے مجموعہ سے بطور قدر مشترک کے اتنی بات بہرحال سمجھ میں آتی ہے کہ خواہ یہ گفتگو باہم مزاح ومذاق ہی کے پیرائے میں ہوئی ہو' لیکن کتابی طلبہ اور جن کتابوں کو اس زمانے میں طلبہ پڑھتے تھے ان کے ساتھ ساتھ شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنے عہد کے علماء یا کم ازکم دلی میں اس وقت علم وفضل کی مسندوں پر جو جلوہ گر تھے ان کے متعلق بھی عقیدت کے احساسات دھیمے پڑتے جاتے تھے اور گو بظاہر گونہ عُجب' خود پسندی پر یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں' لیکن راستہ کے چلنے والے جانتے ہیں کہ علم صحیح کی یافت تک پہنچنے سے پہلے راہ گیروں کو اس قسم کی منزلوں سے بھی درمیان میں قدرتاً گذرنا پڑتا ہی ہے' تباہی اس کے لئے ہے' جو بجائے گذر جانے کے راہ کی ان ہی منزلوں پر ٹھہر جائے جو ٹھہرنے کے لئے نہیں بلکہ صرف اس لئے سامنے لائی جاتی ہیں کہ گذرنے والے ان سے گذر جائیں' تعجب ان کو ہوتا ہے جن کو چلنے کی توفیق ہی میسر نہ ہوئی' ورنہ چلنے والوں نے تو ہمیشہ اسی موقعہ پر "کاش کردے وگذشتے" کی آرزو ظاہر کی ہے' وہ مسکین بے چارہ کیا گذرے گا' جو چلا ہی نہیں اور چلے بغیر بیٹھے بیٹھے طنز وطعن کے تیر چلنے والوں پر چلاتا رہتا ہے' جس گذرنے والے کا یہ حال ہو' گذرنے کے بعد جو کہتا ہو' حکیم الامت ہی راوی ہیں۔

"لوگ جان نہ گئے ہوتے تو ایسا گم ہوتا کہ کوئی بھی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا" (قصص ص۱۳۰)

یا اسی مطلب کو امیر شاہ خانصاحب ان الفاظ میں ادا کیا کرتے تھے' یعنی سیدنا الامام الکبیر فرماتے کہ

"اگر مولویت کی یہ قید نہ ہوتی تو قاسم کی خاک تک کا بھی پتہ نہ چلتا' جانوروں کا بھی گھونسلا ہوتا ہے میرے لئے تو یہ بھی نہ ہوتا اور کوئی میری ہوا تک نہ پاتا" (ارواح ص۱۶۱)

اور بڑی بڑی تنخواہوں پر بلانے والوں کو جو یہ جواب کہلا بھیجتا'

"مجھے صاحب کمال سمجھ کر بلاتے ہیں اور میں اپنے اندر کوئی کمال نہیں پاتا" (ارواح ص۱۶)

اور ہمیشہ یہی حال مکالمے کے دوسرے رکن کا تھا، حکیم الامت ہی فرمایا کرتے تھے کہ

"مولانا گنگوہی نے ایک جگہ قسم کھائی کہ مجھ میں کوئی کمال نہیں ہے" قصص ص۲۹

(الہادی ربیع الثانی ۵۷ھ)

ذرا "قسم" کے لفظ پر غور کیجئے، اور سوچئے کہ مولانا گنگوہی جیسی فقیہ النفس والفطرت ہستی اسلام کے قانون یمین (قسم) کو اپنی بے کمالی کی شہادت میں استعمال کرتی ہے، یقیناً یہ کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی۔[له]

خیر یہ قصہ تو بعد کا ہے، بدگمانوں میں بدگمانی کا زہر شاید پھوٹ نہ پڑے، اس لئے ضمناً یہاں بھی اس کا ذکر کر دیا گیا، ورنہ اس وقت تو یہ بیان کر رہا تھا کہ "کتاب کی بکری" کے خطاب سے جسکی علمی زندگی دیوبند کے مہتابی مکتب میں شروع ہوئی تھی، آگے علم ہی کی راہ میں کن انقلابی منزلوں سے اسکو گذرنا پڑا، پہلے کتابیوں، یا کتاب کے کیڑے بن کر طالب العلمی کرنے والے طالب العلموں سے اس کے اندر ترشی پیدا ہوئی، پھر وہ ان کتابوں سے بھی گونہ مایوس ہوا، جن میں خدا کی کتاب اور خدا کے رسول کی کتابوں سے بھی زیادہ اور بہت زیادہ دینے والے اپنا وقت دے رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بتدریج اپنے عہد کے اہل علم وفضل کا وزن بھی اس کے دل سے کچھ نکلا سا چلا جاتا تھا، یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ شاید نکل چکا تھا۔

ایام طلب وتعلیم کی متعلقہ روایتوں میں ہم اس قسم کے قصے جو پاتے ہیں، مثلاً حکیم الامت کا بیان ہے کہ

له بیرونی آمیزشوں سے پاک رکھتے ہوئے قرآن کا پڑھنے والا اس کتاب کی پہلی آیت الحمد للہ رب العلمین ہی کی روشنی میں وہی پاتا ہے جس کا اعلان مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قسم کھا کر فرما رہے تھے، باقی قرآن کے ساتھ جو اپنی حسی معلومات پر بھی بھروسہ کرتے ہیں ان کے لئے حکیم الامت کی یہ توجیہ تشفی بخش ہو سکتی ہے کہ ہر حصل کمال کا قاعدہ ہے کہ جو کمالات ابھی اسے حاصل نہیں ہوئے ہیں انکے مقابلہ میں کمالات حاصلہ کی کوئی قیمت نہیں پاتا جیسے لکھ پتی کے مقابلہ میں چند پیسوں والا اپنے پیسوں کو مال نہیں سمجھتا ۱۲

"مولانا محمد قاسم صاحب فرماتے تھے کہ حدیث پڑھنے کے وقت میں یہی سوچا
کرتا تھا کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں فرمائی"
(قصص ص۲۹ الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۰ھ)

جس کا مطلب میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ جب آپ حدیث پڑھنے لگے، تو عام طور پر حدیث کے شروح و حواشی میں جن باتوں سے بحث کی جاتی ہے، بجائے ان کے اسلامی احکام و قوانین کی روح اور بنیاد کے دریافت کا نیا شوق اور ولولہ آپ میں پیدا ہو گیا تھا، جس میں نہ ان کو ان کتابوں سے مدد مل سکتی تھی جن کا عموماً اس زمانے کے مدرسوں میں رواج تھا، اور نہ ان اساتذہ سے اس باب میں وہ چنداں مستفید ہو سکتے تھے جو نہ اس طرزِ فکر کے عادی تھے اور نہ اپنے درس میں دین کے اس پہلو پر اس زمانہ میں کوئی بحث کرتا تھا، اور جو حال آپ کا اللہ کے رسول کی حدیثوں اور حدیث کی کتابوں کے متعلق ہو گیا تھا، کچھ یہی کیفیت خود اللہ کی کتاب کے متعلق بھی ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی، حضرت حکیم الامت ہی اس خبر کے راوی ہیں کہ

"مولانا محمد قاسم فرمایا کرتے تھے کہ قرآن مجید کے الفاظ میں ہی غور کرنا چاہئے تو مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے" (قصص ص۳۰ الہادی ماہ جمادی الاولیٰ ۵۰ھ)

ذاتی تجربہ اور پختہ کاری کی یہ ایسی بات ہے جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ان لوگوں کو شاید نہیں ہو سکتا جو قرآن کے قطعی الدلالۃ قطعی الثبوت نصوص اور آیتوں کے حکم و اسرار کو ان تخمینی اور ظنی احتمالات کی روشنی میں سمجھنے یا سمجھانے کے عادی ہیں، جن کا ذکر تفسیر کی عام کتابوں میں کیا جاتا ہے، غیر مشکوک کے ساتھ جب مشکوک مقدمات کے معانی کو بھی ملا دیا جائے تو خود سوچئے کہ غیر مشکوک غیر مشکوک کب رہ جاتا ہے؟

بہر حال میرے نزدیک سیدنا الامام الکبیر کے مذکورہ بالا بیان کا مآل اور حاصل بھی یہی ہے کہ اللہ کے رسول کی حدیثوں کے اسرار و حکم سمجھنے میں عام طور پر شروح و حواشی سے مستغنی ہو گئے تھے، کچھ یہی حال ان پر خود اللہ کی کتاب کے متعلق بھی طاری ہو گیا تھا، وہ اپنے اور اپنے خدا کے درمیان

اسرار و حکم قرآن کے سمجھنے کے لئے کسی دوسرے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے، بلکہ ان علوم قرآن کا سب سے آسان طریقہ آپ کے نزدیک یہی تھا کہ بجائے دوسروں کے، براہ راست حق تعالیٰ کے الفاظ ہی میں غور و فکر کیا جائے، اس طریقہ سے ان کا احساس و تجربہ یہ تھا کہ قرآن کا مقصد واضح اور صاف ہو جاتا ہے، ان کے طریقۂ فکر کی ان خصوصیتوں پر تفصیلی بحث تو آئندہ آئے گی، اس وقت اجمالاً ان امور کا ذکر جیسا کہ میں نے عرض کیا صرف اس لئے کیا گیا کہ درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے اپنی تعلیمی زندگی میں وہ جس مقام تک پہنچے اس کا نقشہ ترتیب کے ساتھ لوگوں کے سامنے آجائے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس حد تک میں اپنے کام سے فارغ ہو چکا ہوں، گویا سیدنا الامام الکبیر کی تعلیمی زندگی کے متعلق اب تک صرف اسی سوال کا کہ آپ کس طرح پڑھتے رہے اور پڑھنے کے اس زمانہ میں فکر و نظر کی کن ارتقائی منزلوں سے آپ گذرتے رہے جواب دیا گیا ہے، باقی یہ باتیں کہ کن کن علوم و فنون کی کتابیں اس عرصہ میں آپ پڑھتے رہے اور کن کن استادوں سے پڑھتے رہے، اگرچہ ان کے متعلق بھی گذشتہ اوراق میں کچھ نہ کچھ چیزوں کا، خواہ ضمناً ہی، تھوڑا بہت ذکر آتا رہا ہے، اور جہاں تک میرا خیال ہے، طالب العلم خصوصاً ایسے عبقری الفطرت طالب العلم جیسے حضرت والا تھے، اس قسم کے طلبہ کے متعلق جوہری اور اصلی سوال یہی ہوتا ہے کہ وہ کس طرح پڑھتے رہے، نتیجہ کی نوعیت کلیۃً نہیں تو عموماً اسی طرزِ عمل کی نوعیت کے تابع ہوتی ہے، کتابوں اور استاذوں کا سوال "طبائع فائقہ" کے لئے میرے نزدیک چنداں اہمیت نہیں رکھتا، بقول شخصے

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے

جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

دراصل یہی وجہ ہوئی کہ زیادہ تر اس سلسلہ میں میری توجہ حضرت والا کی تعلیمی زندگی کے اسی سوال پر مرکوز رہی، لیکن آپ کی سوانح عمری جب لکھی جا رہی ہے تو ضرورت ہے کہ اہمیت ہو یا نہ ہو، مگر ان سوالوں پر بحث کی جائے۔

کتابوں کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ معقولات کے سلسلہ میں صدرا، شمس بازغہ، میرزاہد کا

ذکر تو صراحۃً مصنف امام نے فرمایا ہے، درس نظامیہ کے معقولاتی حصہ کی آخری اور یہ چوٹی کی کتابیں ہیں، ان کتابوں کے پڑھنے والوں کے متعلق یہی توقع کی جاتی ہے کہ جن کتابوں کا درجہ تعلیمی ان سے فروتر ہے، کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ نہ پڑھی گئی ہوں، یہ صحیح ہے جیسا کہ آپ سن چکے کہ ایک زمانہ ایام طلب ہی کے دنوں میں ایسا بھی آیا جب اپنے ہی جیسے انسانوں کی بنائی ہوئی کتابوں کے ساتھ حسن ظن کہئے یا مرعوبیت کی وہ کیفیت آپ میں باقی نہیں رہی تھی جو عموماً اس زمانہ کے اہل علم کے قلوب میں پائی جاتی تھی، لیکن اس حال تک آپ اچانک نہیں پہنچے تھے، بلکہ ان ہی معقولات کی کتابوں کے متعلق آپ ہی کا ایک وہ حال بھی تھا، جس کا اندازہ اس قصہ سے ہوتا ہے جس کا ذکر مولوی عاشق الٰہی مرحوم نے تذکرۃ الرشید میں فرمایا ہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ درس نظامیہ کے نصاب میں جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں ملامحب اللہ بہاری کے منطقی یا معقولاتی متن سلم العلوم کی ایک نہیں بلکہ متعدد شرحیں داخل ہیں اور باضابطہ لزوماً طلبہ کو پڑھائی جاتی ہیں، ملا حسن اور قاضی مبارک کی شروح سے سلم کے تصورات اور مولوی حمداللہ سندیلوی کی شرح کے ذریعہ سے سلم کے تصدیقات پڑھائے جاتے تھے، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سلم العلوم کے براہ راست متن کے پڑھنے کی ضرورت قدرتاً باقی نہیں رہتی، مگر معقولات کی اسی غیر ضروری کتاب کے متعلق مولوی عاشق الٰہی صاحب کی بیان کردہ اس روایت کو سنئے انھوں نے لکھا ہے۔

"اس کا (یعنی اس قصے کا) تذکرہ خود حضرت امام ربانی (مولانا گنگوہیؒ) نے بارہا فرمایا کہ جب میں اور مولوی محمد قاسم صاحب دہلی میں استاذ (مولٰنا مملوک العلی) سے پڑھتے تھے، ہمارا ارادہ سلم شروع کرنے کا ہوا لیکن مولانا (مملوک العلی صاحب) کو فرصت نہ تھی، اسلئے انکار فرماتے رہے، بالآخر میں نے عرض کیا کہ حضرت ہفتہ میں دو بار صرف پیر اور جمعرات (یا جمعہ) کو پڑھا دیا کیجئے"

مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ بڑی آرزو منت سے یہ التجا (یعنی ہفتہ میں دو دن درس کی التجا) چونکہ منظور

ہوئی تھی اس لئے

"اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی" صلا تذکرۃ الرشید ج ا

ظاہر ہے کہ یہ "قدر" صرف حضرت گنگوہی تک محدود نہ تھی جمع متکلم "ہمیں" کا لفظ بھی یہی بتا رہا ہے کہ مولٰنا گنگوہی اس قدردانی میں تنہا نہ تھے۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ تین تین دفعہ جو متن اپنی شرح کے ساتھ پڑھایا جا رہا ہو، متن کی اس کتاب تک کو جو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو، اور روزنہ سہی ہفتہ میں دو بار سہی، درس کے دنوں میں موقعہ نہ ہو تو جمعہ تعطیل ہی کے دن سہی، مگر بہرحال اس غیر ضروری متن کو جو پڑھ کر رہا ہو، طلب علم کے ایام میں اس حال سے بھی جو گذر چکا ہو، اس کے متعلق یہ کون سوچ سکتا ہے کہ نصاب کی کوئی کتاب اس کے پڑھنے سے رہ گئی ہوگی۔

پس واقعہ وہی ہے جس کی طرف مصنف امام نے اجمالاً اشارہ فرمایا ہے، یعنی ایک موقعہ پر یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ کتابوں کے پڑھنے میں جو حال مولٰنا نانوتوی کا تھا، یہی حال مولٰنا رشید احمد صاحب گنگوہی کا بھی تھا، یہ اطلاع دیتے ہیں کہ دونوں بزرگوں میں

"اسی زمانہ سے دوستی اور "ہم سبقی" رہی۔" صـ۳

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ "ہم سبقی" کا جو رشتہ دونوں بزرگوں میں قائم ہوا، آخر وقت تک باقی رہا، اسی بنیاد پر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ان دونوں ہم سبقوں میں سے ایک یعنی مولانا گنگوہی کے متعلق مولوی عاشق الٰہی مرحوم نے جو یہ لکھا ہے کہ

"صحاح ستہ کے علاوہ معقول میں منطق و فلسفہ، ادب و ہیئت و ریاضی اور منقول میں تفسیر و اصول و فقہ و معانی وغیرہا اکثر کتابیں آپ نے مولٰنا الشیخ مملوک العلی صاحب سے پڑھیں۔"

بجنسہ یہی روداد دوسرے "ہم سبق" یعنی مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے تعلیمی نصاب کی ہے۔

اس بنیاد پر یہ سمجھنا چاہیئے کہ درس نظامیہ کے عام اور متداول علوم کی کتابیں دونوں حضرات

کی مولنا مملوک العلی صاحب کے یہاں پوری ہوئیں۔

مصنف امام نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولنا مملوک العلی صاحب نے مولانا محمد قاسم کا نام عربک کالج میں لکھوادیا تھا، تفصیلاً جس پر بحث کرچکا ہوں، اسی سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا مملوک العلی صاحب نے عربک کالج

"کے مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے (مولوی محمد قاسم) کے حال سے متعرض نہ ہوجیو میں ان کو پڑھالوں گا، اور فرمایا کہ تم (یعنی مولوی محمد قاسم کو خطاب کر کے کہا تھا کہ) اقلیدس خود دیکھ لو، اور قواعد حساب کی مشق کرلو" ص۲۵

اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ جدید طریقہ سے اقلیدس یا حساب کی جو تعلیم عربی کالج میں ہوتی تھی، مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے لئے ان کے استاذ نے باضابطہ کالج کے کلاس میں شریک ہوکر اس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی، جس کی وجہ وہی ہوسکتی ہے کہ قدیم طریقہ سے عربی زبان میں ان چیزوں کی تعلیم مولنا مملوک العلی صاحب سے وہ پاچکے تھے، صرف دیکھ لینا اور حساب کی مشق کرلینا کافی تھا۔

بہرحال حدیث کے سوا جہاں تک لوگوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، سیدنا الامام الکبیر نے دلی میں جو کچھ بھی پڑھا، مولنا مملوک العلی صاحب ہی سے پڑھا، مگر ہفتم سبقی" کے جس دوامی رشتہ کا ذکر مصنف امام نے کیا ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے مولوی عاشق الہی مرحوم کی دی ہوئی اس خبر پر اگر غور کیا جائے، یعنی علاوہ مولنا مملوک العلی صاحب کے جن سے وہ بھی لکھتے ہیں کہ مولنا رشید احمد صاحب نے حدیث کے سوا اکثر کتابیں پڑھیں، وہ اطلاع دیتے ہیں کہ دلی میں مولنا گنگوہی نے

"باقی کتابوں میں کلاً یا جزءً" آپ کو دیگر علماء سے تلمذ رہا، انہیں علماء آخر میں مولانا مفتی صدرالدین صاحب اور قاضی احمد الدین پنجابی ہیں رحمہم اللہ وطاب ثراہم" ص۳۵ ج ا تذکرہ

شاید پہلے ہی کہیں عرض کرچکا ہوں کہ قاضی احمد الدین پنجابی سے تو مولانا رشید احمد گنگوہی دلی

پہنچکر اس وقت تک پڑھتے رہے، جب تک "ہم سبقی" کا یہ رشتہ مولٰنا نانوتوی کے ساتھ قائم نہیں ہوا تھا، اس لئے مولوی احمد الدین نے بھی مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ پڑھا ہو، اس کا تو احتمال پیدا نہیں ہوتا، لیکن مفتی صدر الدین رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت گنگوہی کا علمی استفادہ جب یقینی ہے، اور جہاں تک قرائن کا اقتضاء ہے، دونوں حضرات کی "ہم سبقی" کے رشتہ کے بعد مفتی صاحب سے مولٰنا گنگوہی نے استفادہ فرمایا ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ دوسرے "ہم سبق" نے اس استفادہ سے گریز کی راہ کیوں اختیار کی ہو گی، خصوصاً مفتی صاحب پر منقولیت سے زیادہ معقولیت کا غلبہ تھا، جس میں چاہئے تو یہی کہ مولٰنا گنگوہی سے زیادہ مولانا نانوتوی کے لئے نسبتاً زیادہ کشش تھی۔

اس قسم کے واقعات مثلاً مولوی عاشق الٰہی مرحوم نے تذکرۃ الرشید میں نقل کیا ہے کہ

"غدر کے بعد حضرت (مولٰنا گنگوہی) کو دہلی تشریف لانے کا اتفاق ہوا، تو مفتی صدر الدین صاحب سے ملنے تشریف لے گئے، مفتی صاحب نہایت ہی شفقت و محبت سے ملے اور سب حالات پوچھنے لگے"

ان ہی حالات میں سب سے اہم حال جسے مفتی صاحب اس وقت دریافت فرما رہے تھے، یہ تھا،

"میاں قاسم کیا کرتے ہیں ؟"

حضرت گنگوہی نے جواب میں اطلاع دی کہ

"مطبع میں تصحیح کرتے ہیں آٹھ یا دس روپے تنخواہ ہے"

لکھا ہے کہ اس عجیب و غریب خبر کو سن کر مفتی صاحب سناٹے میں آگئے، مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"ہاتھ پر ہاتھ مار کر فرمانے لگے، قاسم ایسا سستا قاسم ایسا سستا"

اور آخر میں فرمانے لگے، کہ

"فقیر ہو گئے فقیر ہو گئے" ص۳۲ تذکرۃ الرشید

غالباً خود مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کی ہوئی یہ روایت ہے، جسے مولوی عاشق الٰہی صاحب نے نقل فرمایا ہے، اس مکالمہ میں بھی مفتی صاحب نے جن الفاظ میں سیدنا الامام الکبیر کا ذکر سوز و درد کے جس خاص طریقہ سے فرمایا ہے، اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ "ہم سبقی" کا ذکر مصنف امام نے اجمالاً کیا ہے، اس کی تفصیل میں وہ سارے اسباق شریک ہیں، جنھیں ہم سبقی کی ابتداء سے آخر وقت تک دونوں حضرات پڑھتے رہے۔

بہرحال حدیث کے سوا عام علوم و فنون اور ان کی کتابوں کا یہ تذکرہ تھا، باقی رہا علم حدیث، سو مصنف امام اگرچہ یہ فرماتے ہیں کہ

"آخر حدیث جناب شاہ عبدالغنی مرحوم کی خدمت میں پڑھی" ص۲

بظاہر اس سے سمجھنے والے یہی سمجھ سکتے ہیں کہ حدیث کی کل کتابیں دونوں حضرات نے حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں، خصوصاً مولوی عاشق الٰہی مرحوم نے مولانا گنگوہی کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ

"صحاح ستہ قریب قریب کل حرفاً حرفاً حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا" ص۳۵

"ہم سبقی" کے دوامی تعلق کی بنیاد پر سیدنا الامام الکبیر کے متعلق بھی اسی کو اگر واقعہ مان لیں تو حالات کا اقتضاء بھی بظاہر یہی ہے۔

لیکن مصنف امام کے سوا قاسمی سوانح و حالات کے بیان کرنے والوں نے "حدیث" کے متعلق کچھ تفصیل بھی بیان کی ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض ناگزیر اسباب جن کا باوجود تلاش کے ابتک مجھے پتہ نہ چل سکا کہ صحاح ستہ کی (۶) کتابوں میں سے ایک اہم کتاب سنن ابوداؤد حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نہ پڑھ سکے، گویا یہی ایک کتاب ایسی ملتی ہے جس کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ہم سبقی کا یہ قصہ کسی وجہ سے باقی نہ رہا۔ علالت یا کوئی اتفاقی خانگی حادثہ، یا کیا رکاوٹ پیش آئی، عرض کر چکا ہوں کہ اس کا پتہ تو نہ چل سکا، لیکن صحاح ستہ میں

سنن ابو داؤد مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ عبد الغنی سے نہیں پڑھی، اس کی شہادت تو ان کے براہ راست شاگرد مولانا منصور علی خان الحیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "مذہب منصور" میں دی ہے، شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ کا اور نیز یہ کہ وہ ہجرت کر کے دلّی سے مدینہ چلے گئے تھے، ان باتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد مولٰنا منصور علی خان صاحب فرماتے ہیں کہ وہ

"مولٰنا مرحوم (مولٰنا قاسم) کے استاد حدیث تھے، سوائے ابو داؤد کے صحیحین (بخاری و مسلم) و سنن ثلٰثہ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) ان ہی سے پڑھے تھے۔" ص۱۸۱

باقی ابو داؤد مولٰنا محمد قاسم صاحب نے کن صاحب سے پڑھی، مولانا منصور العلی خاں فرماتے ہیں کہ

"اور ابو داؤد جو باقی تھی، اس کو اپنی شہرت کے زمانہ میں بغل میں دبا کر جناب مولوی احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کی خدمت میں جاکر پڑھ لیا۔" ص۱۸۲

اور یہی تفصیل ہے اس اجمالی خبر کی جو سوانح مخطوطہ کے مصنف نے ان الفاظ میں دی ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب نے

"حدیث شریف حضرت شاہ عبد الغنی صاحب، قدس اللہ سرہ العزیز دہلوی، اور مولانا احمد علی صاحب مرحوم سہارنپوری سے پڑھی۔" ص۹

کچھ بھی ہو، اتنی بات یقینی ہے، کہ علم حدیث میں علاوہ شاہ عبد الغنی مہاجر مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کے سیدنا الامام الکبیر کو مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری سے بھی تلمذ اور شاگردی کا تعلق تھا۔

باقی مولٰنا منصور العلی خاں مرحوم نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ اپنی شہرت کے زمانہ میں ابو داؤد بغل میں دبا کر مولٰنا احمد علی صاحب کی خدمت میں مولٰنا محمد قاسم صاحب حاضر ہوا کرتے تھے، اور دنیا کیا کہے گی، اس کا خیال کئے بغیر ایک ایسی ہستی کو استاذ بنانے میں حجاب مانع نہ ہوا جس سے گونہ علمی معاصرت کا تعلق آپ رکھتے تھے، تو اگر ایک طرف از خود رفتگی اور شکستگی کے آثار اس واقعہ میں چمک رہے ہیں، جس کی طرف حکیم صاحب مرحوم و مغفور نے اشارہ کیا ہے، تو دوسری طرف یہ بھی سمجھ میں آتا ہے، کہ حدیث کے سلسلے میں اتصال و تصحیح سند کی قیمت آپ کی نظر

میں کتنی تھی، واقعہ یہ ہے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کسی وجہ سے ابو داؤد کے پڑھنے کا موقعہ مولانا شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو نہ مل سکا تھا، جاننے والے جانتے ہیں کہ صحاح کی چھ کتابوں میں سے پانچ کتابیں جو پڑھ چکا ہو، حدیثوں کے مکرر ہونے کی وجہ سے صرف ایک کتاب کا مسئلہ عام طلبہ کے لئے بھی چنداں اہمیت اپنے اندر نہیں رکھتا، پھر جس فطرت فائقہ سے مولانا سرفراز تھے ان کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مطالب و معانی کے سمجھنے کے لئے مولانا احمد علی صاحب سے تلمذ کا تعلق آپ نے پیدا کیا تھا، اب میں کیا کہوں، وہی بے جا خوش اعتقادی کی تہمت سے پھر ڈرتا ہوں، مگر لوگوں نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے، انھیں کہاں تک چھپاؤں، اکابر دیوبند کے حالات کی متداول و مشہور کتابوں میں آپ کو یہ روایت ملیگی کہ جن دنوں سیدنا الامام الکبیر دلّی میں پڑھ رہے تھے، جامع مسجد کے پاس دارالبقاء مدرسہ کی جو عمارت تھی، اس میں ایک مجذوب حافظ عبدالقادر نامی رہتے تھے، مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کے بعض مکاشفات کا جن کا مولانا نے خود مشاہدہ فرمایا تھا ذکر کیا کرتے تھے، خصوصاً غدر کی عام خوں ریزی سے مہینہ سوا مہینہ پہلے مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ میں حافظ عبدالقادر کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا، کہ اچانک پیچھے مڑے اور مڑ کر مجھ سے پوچھنے لگے کہ کون ہے قدرت اللہ ہے؟

مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ حضرت "رشید احمد" ہے، اسکے بعد مولانا گنگوہی کا بیان ہے کہ حافظ صاحب الٹے پاؤں پیچھے ہٹے اور کہتے جاتے تھے کہ ہٹوہ، ہٹوہ، پھر اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے بولنے لگے کہ

"یہ میرے گولی لگی، یہ میرے گولی لگی"

اور یہی کہتے ہوئے بھاگ گئے، مولانا فرماتے تھے کہ اسی کے مہینہ سوا مہینہ بعد غدر کا ہنگامہ شروع ہوا، اور حافظ عبدالقادر مجذوب بے چارے کو گولی لگی، اسی سے شہید ہو گئے، یہ بھی فرماتے تھے کہ "گولی سینہ ہی میں لگی" (ارواح ص۳۱۵)

جس سے معلوم ہوا کہ حافظ عبدالقادر شہید کے جذب صحیح کے "معترف مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ

علیہ بھی تھے، اب سنئے قصہ ان ہی مجذوب حافظ صاحب کا ارواح ثلثہ میں اجزاء کی کمی وبیشی کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر دو جگہ پر کیا گیا ہے، ایک میں حضرت مولانا گنگوہی کے حوالہ سے قصہ درج ہے اور دوسری جگہ مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند کی زبانی روایت نقل کی گئی ہے، دونوں روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ ایام طالب العلمی میں ایک دن مولانا محمد قاسم دلی کے کسی کوچہ سے گذر رہے تھے کہ ان ہی حافظ عبدالقادر مجذوب سے راستہ میں مڈبھیڑ ہو گئی، مولانا کے ہاتھ میں اس وقت بخاری شریف کا نسخہ تھا، (غالباً بخاری اس زمانہ میں پڑھ رہے تھے) حافظ صاحب نے بخاری کا یہ نسخہ آپ سے چھین لیا اور لے کر آگے بڑھ گئے، مولانا اس خیال سے کہ خدا جانے کتاب کو کہاں ڈالدیں گے، آپ بھی ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے، راستہ میں بھڑبھونجہ کی ایک دوکان ملی، حافظ صاحب اسی دکان پر چڑھ گئے اور بھڑبھونجہ کی بھٹی پر بیٹھ کر بخاری شریف کی ورق گردانی شروع کر دی، اوراق کو الٹتے جاتے تھے اور زبان سے مِن مِن مِن مِن کہتے جاتے تھے،

مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کی روایت میں ہے کہ مجذوب صاحب نے پوچھا تھا کہ یہ کون سی کتاب تیرے ہاتھ میں ہے، جواب دیا گیا بخاری شریف، تب لیکر وہ حرکتیں شروع کیں، بہر حال مولانا کھڑے کھڑے ان کی حرکتوں کو دیکھتے رہے، آخر میں حافظ صاحب نے کتاب بند کی، اور واپس کرتے ہوئے مولانا کو خطاب کر کے فرمایا۔

"جا تو بڑا عالم ہے"

ممکن ہے کہ مستقبل کی پیشگوئی حافظ صاحب کے اس کشفی بیان کو قرار دیا جائے، لیکن میرا ذاتی احساس یہی ہے کہ حضرت والا کی "علمی عبقریت" قوت سے فعل کے رنگ میں جو آچکی تھی، یہ اسی واقعہ کی تعبیر ہے، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے درسیات کی تکمیل نہیں کی تھی، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے خود سیدنا الامام الکبیر "معلومات" اور "علم" ان دونوں کے فرق کو ان الفاظ میں بیان کیا کرتے تھے کہ

"کسی کے مبصرات (یعنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیزوں کا ذخیرہ) زیادہ ہو، اور

سب چیزوں کو دیکھا ہو، مگر ہے وہ چوندھا، اور کسی کا ابصار (دیکھنے کی قوت) زائد ہو، گو اس نے تھوڑی چیزوں کو دیکھا ہو، لیکن خوب حقیقت تک پہنچا ہو"۔

(قصص منہ ۳ الہادی صفر ۵۱ھ)

میرا خیال بھی ہے کہ بخاری پڑھنے کے زمانہ میں مجذوب حافظ صاحب نے "بڑا عالم" ہونے کی خبر جو دی تھی، اس سے معلومات کی گرد آوری والا علم مراد نہیں ہے، بلکہ علم کا ملکہ فائقہ آپ کی فطرت میں جو ودیعت تھا، اسی کے ظہور و بروز کی یہ اطلاع ہے۔

ظاہر ہے کہ بخاری شریف کے پڑھنے کے زمانہ میں "بڑے عالم" ہو جانے کی اطلاع کشفی راہ سے جسے مل چکی تھی، اسی کے متعلق اگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ صرف اتصال و تصحیح سند کی غرض سے ابوداؤد اس نے پڑھی تھی، تو اس کو بے جا عقیدت مندی ٹھہرانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

اسی کے ساتھ اس روایت کو بھی اگر ملا دیجئے، جس کا ارواح ثلاثہ میں مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے، حاصل جس کا یہ ہے کہ پنجلاسہ (پنجاب) میں ایک بزرگ راؤ عبدالرحمٰن خاں نامی تھے، کشفی حالت ان کی بھی غیر معمولی تھی، دردزہ کے لئے تعویذ لینے کے لئے کوئی آتا تو تعویذ کے ساتھ کہہ دیا کرتے تھے کہ لڑکا ہوگا، یا لڑکی بعضوں نے پوچھا بھی کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو جاتا ہے، تو بولے کہ کیا کروں، پیدا ہونے والے بچے کی صورت سامنے آجاتی ہے، بہر حال اکابر دیوبند خصوصاً شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ سے ان کے بڑے تعلقات تھے، خود سیدنا الامام الکبیر ان سے ملنے کے لئے پنجلاسہ جایا کرتے تھے، پہلے حج کے سفر کے موقعہ پر بھی حاضر ہوئے اور راؤ صاحب سے مولٰنا نے عرض کیا کہ میرے لئے دعا فرمائیے، یہ سن کر راؤ صاحب نے فرمایا کہ:

"بھائی تمہارے لئے کیا دعا کروں، میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں دونوں جہان کے بادشاہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے بخاری شریف پڑھتے ہوئے دیکھا ہے"۔ (صفہ ۱۹۳ ارواح)

کیا اس کے بعد بھی یہی سمجھا جائے کہ مطلب فہمی کے لئے ان کو استاذ کی ضرورت باقی تھی ؟
بلکہ اسی کے ساتھ آپ ان آثار اور ان علامتوں کو بھی شریک کر لیجئے جو بیعت ہونے کے بعد ذکر و شغل کے سلسلہ میں ابتدائی مشغولیت کے وقت آپ کے سامنے پیش آئے تھے، جن کا تذکرہ علاوہ دوسروں کے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ بھی یہ کہتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ

"اس زمانہ میں مولانا (محمد قاسم رح) محض نو آموز طالب العلم تھے"

یہاں یہ کہا جاتا ہے جیسا کہ حکیم الامت تھانوی نے بھی ذکر کیا ہے کہ "بیعت اور ذکر و شغل کی تعلیم کے بعد قاعدہ تھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لوگ ان حالات کا تذکرہ کرتے جو ذکر و شغل کے وقت ان کے سامنے پیش آتے تھے، مگر خلاف دستور مولانا محمد قاسم نے اپنے کسی حال کا ذکر حاجی صاحب سے نہیں کیا، آخر ایک دن خود ہی دریافت فرمایا کہ" آپ کچھ نہیں کہتے " اپنے پیر کے اس استفسار پر حضرت تھانوی کا بیان ہے

"مولانا (محمد قاسم) رونے لگے"

پھر بڑے یاس انگیز الفاظ میں فرمانے لگے کہ اپنا حال کیا بیان کروں'

"جہاں تسبیح لے کر بیٹھا، بس ایک مصیبت ہوتی ہے' اس قدر گرانی کہ جیسے سو سو من کے پتھر کسی نے رکھدیئے، زبان و قلب سب بستہ ہو جاتے ہیں"

حضرت امیر شاہ خاں صاحب سے فقیر نے سنا تھا کہ زبان معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ ہو گئی' مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے'

بہر حال اب یہی سننے کی بات ہے، اپنے جس حال سے سیدنا الامام الکبیر میں حد سے زیادہ مایوسی اپنے متعلق پیدا ہو گئی تھی، راہ و رسم منزل سے جو آگاہ تھا، یعنی آپ کے شیخ عارف نے سن کر حکیم الامت کا بیان ہے

"بے ساختہ فرمانے لگے کہ مبارک ہو"

جانتے ہیں یہ عجیب و غریب کیفیت موجب تبریک و تہنیت کیوں بن گئی' مجھ سے براہ راست

حضرت امیر شاہ خاں صاحب فرماتے تھے کہ حاجی صاحب نے فرمایا کہ

"مولنا حق تعالیٰ کے اسم علیم کے ساتھ آپ کو خصوصی نسبت ہے، اور اسی نسبت خصوصی کے یہ آثار ہیں جن کا تجربہ اور مشاہدہ آپ کو کرایا جا رہا ہے"

پھر اس دعویٰ کی دلیل میں حضرت حاجی صاحب نے یاد دلایا نزول وحی کی اس کیفیت کو جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہوئی تھی، جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ غیر معمولی وزن آپ میں پیدا ہو جاتا، اونٹ کی پشت پر ہوتے تو اونٹ بیٹھ جاتا (سوائے قصواء آپ کی خصوصی اونٹنی کے) زید بن ثابت کاتب وحی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تو وہ واقعہ مشہور ہی ہے کہ ان کے زانو پر سر رکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما تھے کہ عین اسی حال میں وحی نازل ہونے لگی، زید کا بیان ہے کہ اتنا غیر معمولی وزن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں اس وقت پیدا ہو گیا کہ گویا میرا زانو چور چور ہو جائیگا، مجھے ایسا محسوس ہونے لگا، اور یہ قصہ تو بخاری شریف کے شروع ہی میں ہے کہ سردیوں کے سخت ترین موسم میں بھی وحی جب نازل ہوتی، تو جبین انور پسینہ سے شرابور ہو جاتی تھی!

الغرض شدت وگرانی کی جو کیفیت نزول وحی کے وقت پیدا ہوتی تھی، اسی کیفیت کو پیش کر کے شیخ عارف نے سمجھایا کہ یہ علمی نسبت کا زور ہے، اور جیسا کہ حکیم الامت سے اس موقعہ پر نقل کیا گیا ہے کہ حاجی صاحب نے مولانا محمد قاسم کو خطاب کر کے فرمایا کہ

"یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے، اور یہ وہ ثقل ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا"

جس کی تشریح حاجی صاحب ہی کے حوالے سے انھوں نے یہ کی ہے کہ

"تم سے (یعنی مولنا محمد قاسم سے) حق تعالیٰ کو وہ کام لینا ہے جو نبیوں سے لیا جاتا ہے جا کر دین کی خدمت کرو، ذکر و شغل کا اہتمام چھوڑ دو"

نبیوں کا جو کام سیدنا الامام الکبیر سے لیا گیا اسے تو دنیا دیکھ رہی ہے، اس وقت میرے سامنے یہ واقعہ نہیں بلکہ فقط یہ بتانا ہے کہ یہ سارے واقعات جن کا ذکر منتشر طور پر لوگ کرتے ہیں،

درحقیقت وہ ایک ہی کلی حقیقت کے مختلف جزئیات یا اس کے ظہور کی مختلف تعینی شکلیں ہیں۔[1]

[1] میرا مطلب یہ ہے کہ خلاف عادت اگر کوئی ایک واقعہ ہو تو شک و شبہ کی گونہ اس میں گنجائش بھی پیدا ہو سکتی ہے، اسی لئے بجائے درایت کے ایسے مواقع میں صرف روایت پر نظر رکھی جاتی ہے اور اسی کی قوت وضعف کے ساتھ اعتماد و عدم اعتماد کی کیفیت وابستہ ہوتی ہے، مگر میں پوچھتا ہوں کہ مسیح علیہ السلام کے متعلق مثلاً اس قسم کے واقعات منسوب کئے جاتے ہیں کہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی سوال و جواب کرنے لگے، مٹی سے پرندے کا ڈھانچہ بناتے پھونک دیتے وہ اڑ جاتا، مُردوں کو زندہ کرتے، اندھوں کو بینا، کوڑھی کو تندرست بنا دیتے، بظاہر دیکھنے میں یہ الگ الگ واقعات نظر آتے ہیں، لیکن جب یہ سوچا جاتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی روح کا جس قالب سے ناسوتی تعلق قائم ہوا تھا اس میں بجائے ماں باپ کے صرف ماں کی طرف کا حصہ شریک تھا، اور بشر کی شکل اختیار کر کے جس فرشتہ نے آپ کی والدہ کے حوالہ اس کو کیا تھا، وہ دراصل بشر نہیں بلکہ ملک یعنی فرشتہ تھا، تو کھلی ہوئی بات ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ان لوگوں پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا، جن کی روح کا تعلق ایسے مادی قالب سے قائم ہوتا ہے جس میں ماں کی طرف سے بھی اور باپ کی طرف سے بھی کثیف مادی عناصر شریک ہوتے ہیں، اسی لئے عام طور پر ان لوگوں کی روح بتدریج برسوں میں بیداری کی منزلوں کو طے کر کے ہوش و حواس کو حاصل کرتی ہے، لیکن مسیح علیہ السلام کی روح پاک پر والدہ محترمہ کے عنصری حجاب کے غلاف کے سوا اور کچھ نہ تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی ان میں ہوش و حواس ادراک و احساس کی قوتیں بیدار ہو گئیں، اور روحانیت کے اسی غلبہ کا اثر تھا کہ ان کی تاثیری قوت سے بے جان چیزوں میں کلی یا جزئی جان پیدا ہو جاتی تھی، مٹی کے ڈھانچوں یا مردہ لاشوں میں تو کلی جان پیدا ہوتی تھی اور جس کی آنکھ اپنی زندگی کھو بیٹھتی تھی، یا جس کا جسم زندگی کی قوت سے محروم ہو کر بگڑ جاتا تھا، اُن میں جزئی زندگی پیدا ہو جاتی تھی، یعنی کوڑھ کا ازالہ ہو جاتا تھا، اور میں تو کہتا ہوں کہ ماں باپ سے پیدا ہونے والے انسانوں کی طبعی عمر پر یہی وجہ ہے کہ حضرت مسیح کی عمر طبعی کا قیاس کرنا قطعاً ایک غیر عقلی فیصلہ ہے، لطیف روح کا کثیف مادی قالب سے تعلق جو پیدا ہوتا ہے، یقیناً وہ اتنا استوار نہیں ہو سکتا، جو قوت اور استواری اس تعلق میں ہوتی ہے، جو لطیف روح کا لطیف قالب سے ہو، شیر و شکر میں جو تعلق پیدا ہو جاتا ہے، کیا یہی تعلق آپ پتھر کے ٹکڑوں اور دودھ میں پیدا کر سکتے ہیں، لوگوں کو مسیح علیہ السلام کی درازی زندگی پر تعجب ہوتا ہے۔ حالانکہ یہی تعجب کرنے والے جبرئیل و اسرافیل اور اسی قسم کے لامحدود فرشتوں کے لئے ان سے بھی زیادہ طویل زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔

بہر حال جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے مختلف خلاف امور کو آپ ایک کلی ضابطہ کے نیچے مندرج پا رہے ہیں، مجھے تو سیدنا الامام الکبیر کی زندگی کے علمی پہلو کا رنگ بھی کچھ اسی طرح کا نظر آتا ہے کہ "ایک ہی حقیقت" کے ظہور کی یہ مختلف شکلیں ہیں، یا چند خوابوں کی یہ واحد تعبیر ہے ۱۲

بہر حال سیدنا الامام الکبیر کی طالب العلمانہ زندگی اور جن باطنی و ذہنی انقلابات سے میرے خیال میں آپ اس عرصہ میں گذرتے رہے، ان کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہی ہے، عام طور پر آپ کے ازلی و ابدی رفیق مولٰنا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ طلب علم کے ان دنوں میں آپ کے ساتھ ساتھ رہے، لیکن اگر مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی اس خبر کو پیش نظر رکھا جائے، یعنی مولانا گنگوہی کے متعلق وہ خبر دیتے ہیں کہ

"جبکہ آپ کی (مولٰنا گنگوہی کی) عمر شریف تخمیناً اکیس سال کی تھی، آپ کا زمانہ طالب العلمی ختم ہو لیا، اور آپ نے اپنے وطن کی جانب مراجعت فرمائی" (ص ۳۵/۱ تذکرہ

مولانا گنگوہیؒ کی ولادت باسعادت ۱۲۴۴ھ میں ہوئی، اسلئے اپنی عمر کے اکیسویں سال میں آپ ۱۲۶۵ھ میں پہنچے ہونگے، لہذا مولانا عاشق الٰہی کی اس اطلاع کی بنیاد پر ہمیں یہ ماننا چاہیے کہ دلی سے مولانا گنگوہی کی واپسی ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں ہو گئی، اب اسی کے ساتھ ہمارے مصنف امام کے اس بیان کو پیش نظر رکھیے، سیدنا الامام الکبیر کی تعلیمی زندگی کے اختتام کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھ کر کہ

"کتابیں معمولی تمام کر چکے تھے، حدیث شریف شاہ عبدالغنی صاحب کی خدمت میں پوری کی" ص ۲۹

آگے فرماتے ہیں کہ

"اُس عرصہ میں والد مرحوم (مولانا مملوک العلی صاحب) کا گیارہویں ذی الحجہ ۱۲۶۶ھ کو بمرض یرقان قبل السابع انتقال ہو گیا" ص ۲۹

مصنف امام کے بیان میں "اس عرصے میں" کے جو الفاظ ہیں، ان سے قطعی طور پر تو یہ نہیں معلوم ہوتا ہی لیکن خیال یہی گذرتا ہے کہ ۱۲۶۶ھ یعنی مولانا مملوک علی کی وفات تک سیدنا الامام الکبیر کی طالب العلمانہ زندگی کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں شاید جاری تھا۔

میرا خیال ہے کہ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے ابوداؤد غالباً مولانا گنگوہی کی واپسی کے بعد آپ نے پڑھی ہے، کیونکہ مصنف امام نے مذکورہ بالا اطلاع سے پہلے ان الفاظ میں کہ

"پھر مولوی صاحب نے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی کچھ مزدوری کر لی" ص ۲۹

یہ خبر دی ہے کہ ۱۲۶۷ھ سے پہلے مطبع احمدی سے سیدنا الامام الکبیر کا تعلق قائم ہو گیا تھا، اور شاید یہی تعلق مولٰنا احمد علی صاحب سے پڑھنے کا سبب ہوا، یا پڑھنے کے تعلق سے مولانا احمد علی صاحب کے مطبع احمدی سے آپ کا رشتہ قائم ہوا، مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کی جدائی کا یہی زمانہ ہے، جس میں حضرت گنگوہی تو گنگوہ تشریف لے گئے، لیکن مولٰنا نانوتوی دلّی ہی میں مقیم رہے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۲۶۷ھ میں یعنی جس سال مولانا مملوک علی صاحب کا انتقال ہوا، اس وقت بھی سیدنا الامام الکبیر کی عمر انیس سال سے متجاوز نہ ہوئی تھی، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام درسی کتابوں کا مروجہ نصاب جب ختم ہو گیا تو اپنے خورد و نوش کا بار کسی دوسرے پر ڈالنا مولانا کو گوارا نہ ہوا، اور حسب تقاضائے حمیت طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ بجائے کما کر کچھ بھیجنے کے گھر سے کوئی امداد طلب کی جائے، مصنف امام نے مطبع احمدی کے ساتھ آپ کے جس تعلق کا ذکر فرمایا ہے، غالباً اس کی وجہ یہی تھی، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ آجکل کے طلبہ جیسے ٹیوشن وغیرہ کر کے اپنی ذاتی ضرورتوں کے لئے کچھ کما لیا کرتے ہیں، اپنی طالب العلمی کے آخر زمانہ میں سیدنا الامام الکبیر نے بھی ایک ذریعۂ آمدنی اختیار فرما لیا تھا، مصنف امام نے اسی لئے اس کی تعبیر بھی "مزدوری" کے لفظ سے فرمائی ہے۔

لہ عام طور پر "مطبع احمدی" مولانا احمد علی صاحب کے مطبع کا نام ہے، صحاح ستہ اور مشکوۃ الغرض حدیث کی درسی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں اس مطبع نے اس وقت جبکہ طباعت کا رواج شروع شروع میں ہندوستان میں ہوا، بڑا کام کیا ہے غدر سے دو سال پہلے یعنی ۱۲۷۵ھ میں مشکوٰۃ شریف مطبع احمدی دلّی کی طبع شدہ فقیر کے پاس ہے، جس پر مشکوۃ کی مختلف شرحوں سے بہترین معلومات کا انتخاب کر کے حاشیہ چڑھایا گیا ہے، مگر غدر کے بعد یہ مطبع بھی دستبرد زمانہ کا شکار ہوا، شاید غدر کے بعد اسی "مطبع احمدی" کے نام سے حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے بعض بزرگوں نے دلی میں مطبع جاری کیا، جس میں مولوی ظہیر الدین صاحب عرف سید احمد کا نام ان کتابوں اور رسالوں پر پایا جاتا ہے جو اس مطبع میں چھپی ہیں، زیادہ تر یہ شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادوں کی کتابیں ہیں، مولوی ظہیر الدین صاحب اپنے آپ کو نبیرۂ مولوی سید ناصر الدین نواسہ شاہ رفیع الدین بتاتے ہیں اور لکھا ہے کہ چالیس سال سے شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت کے بعد شاہ عبد العزیز کا مدرسہ کہنہ ویران پڑا تھا، اسی مدرسہ کہنہ کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے مطبع احمدی جاری کیا گیا ہے۔ (فیوض الحرمین کا حاشیہ)

بہرحال میرے نزدیک سیدنا الامام الکبیر کا تعلق جس مطبع احمدی سے تھا، وہ مولانا احمد علی صاحب والا مطبع تھا، نہ کہ یہ دوسرا مطبع احمدی ۱۲

کچھ بھی ہو، اپنے استاذ کے عین حیات تک کم ازکم میرا احساس یہی ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں سیدنا الامام الکبیر کی طالب العلمانہ زندگی کا سلسلہ باقی رہا، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے استاذ کی وفات تک قیام بھی آپ کا ان ہی کے ساتھ رہا، کیونکہ مصنف امام نے اپنے والد مولانا (مولانا مملوک العلی) کی وفات کی مذکورہ بالا اطلاع کے بعد یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"بعد انتقال مولانا والد مرحوم کے احقر اپنے مکان ملوک بین جو چیلوں کے کوچہ میں تھا جا رہا مولوی صاحب (مولانا محمد قاسم صاحب) بھی میرے پاس آ رہے" ۲۹

بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔

ان سعیکم لشتی کا چورا ہہ

لیکن آپ کے استاذ مرحوم کا جب انتقال ہو گیا، تو اب کیا کرنا چاہئے؟ یہ سوال جیسے علم سے فارغ ہونے والوں کے سامنے عموماً آتا ہے، آپ کے سامنے بھی آیا، طالب العلمانہ زندگی میں حصول امتیاز کی ضمانت خصوصاً اس زمانہ میں تو امتحانات کے نتائج ہی کے ساتھ وابستہ ہے، اور آئندہ زندگی کی راہوں کی ہمواری میں ان ہی امتحانی نتائج سے لوگوں کو مدد ملتی ہے، اگر سیدنا الامام الکبیر نے تعلیم تو بیشک کالج کے استاذ یعنی مولانا مملوک العلی صاحب سے پائی، اور اس کالج میں امتحانات کا طریقہ بھی جاری تھا، مگر عرض کر چکا ہوں کہ میرے نزدیک مولنا مملوک علی سے آپ کی تعلیم کی نوعیت خانگی تعلیم کی تھی، خانگی تعلیم کی صورت میں امتحان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسی لئے آپ کی تعلیمی زندگی کی اس طویل مدت یعنی چھ سات سال کے زمانہ میں بجز دو امتحانوں کے کسی امتحان کا تذکرہ آپ کے سوانح نگاروں نے نہیں کیا ہے، یعنی ایک تو اسی امتحان کا ذکر مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں کیا گیا ہے، جس کا جزئی تذکرہ شاید پہلے بھی گذرا ہے، پورا قصہ یہ ہے، مولانا حبیب الرحمن فرماتے تھے کہ

"علوم عربیہ کے ممتحن مفتی صدر الدین صاحب ہوئے، اور مولانا (محمد قاسم) کا صدرا کا امتحان ان کے پاس گیا، انھوں نے کوئی جگہ پڑھوائی، مولانا کے ذہن میں اسکا مطلب نہ تھا، کیونکہ وہ جگہ کبھی دیکھی بھالی نہ تھی تو اس پر تقریر کی، اور خود جان رہے تھے

کہ کتاب کا یہ مقصد نہیں ہے، مفتی صاحب نے اس پر اعتراض کئے تو مولانا نے مفتی صاحب کو ان ہی تقریروں میں الجھا لیا، لیکن اس پر غور کرتے رہے کہ مطلب کیا ہے بالآخر اک دم ذہن میں عبارت کا صحیح مطلب آگیا تو فرمایا کہ مفتی صاحب آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں، انھوں نے فرمایا کہ "یہ بات" فرمایا کہ لاحول ولاقوۃ اس بات کا جواب تو یہ ہے میں کچھ اور سمجھ رہا تھا، مفتی صاحب نے کہا کہ ہاں! یہی تو پوچھنا تھا" صفحہ ۱۹۶ ارواح ثلاثہ

صحیح طور پر یہ کہنا دشوار ہے کہ اس امتحان کی نوعیت کیا تھی، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن طلبہ کو مولنا مملوک العلی صاحب خانگی طور پر پڑھایا کرتے تھے، کبھی کبھی ان کو بھی شہر کے علماء کے سامنے اس لئے پیش کر دیا کرتے تھے کہ ان کی قابلیت کو جانچیں، خود تقریری امتحان، یعنی کتاب کو سامنے رکھ کر طالب العلم سے پوچھ گچھ کا طریقہ بھی یہی بتاتا ہے کہ اس امتحان کی نوعیت بھی خانگی امتحان ہی کی تھی، ورنہ دلی کالج کے ذریعہ سے امتحان کی جس قسم کا رواج اس ملک میں ہوا تھا اور وہی رواج آج تک یونیورسٹیوں کی درسگاہوں میں جاری ہے، اس میں تو طالب العلم کو کتاب کی ہوا سے بھی پرہیز ضروری ہے، بجائے تقریری کے عموماً تحریری طور پر سرکاری امتحانات لئے جاتے ہیں، مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب "دلی کالج" سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ اس میں زبانی یا تقریری امتحان کا بھی رواج تھا۔

بہر حال اس امتحان میں بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایسی کوئی بات ظاہر نہ ہوئی، جس سے کسی امتیاز کا استحقاق آپ کو حاصل ہوتا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ اپنی تیزی طبع سے مولنا ناکام ہونے کی رسوائی سے بچ گئے، پوری تعلیمی زندگی میں ایک امتحان تو آپ کا یہی ہوا، اور دوسرا امتحان وہی ہے جس میں شریک ہونے کا ارادہ استاذ یعنی مولنا مملوک العلی صاحب کے مشورے سے کر لیا گیا تھا، مگر مصنف امام کے حوالہ سے گذر چکا کہ

"جب امتحان سالانہ کے دن ہوئے مولوی صاحب امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔"

پہلے بھی اس قصہ کا ذکر آچکا ہے، یہاں مجھے یہی کہنا ہے کہ لے دے کر ان ہی دو امتحانوں کا انتساب سیدنا الامام الکبیر کی طرف کیا گیا ہے جن میں ثانی الذکر امتحان میں تو شرکت ہی کا موقعہ نہ ملا، اور اول الذکر تقریری امتحان میں آپ دیکھ چکے کہ ناکامی سے بچ گئے، یہی مغتنم انجام اس کا ہوا۔

بس امتحان کی راہ سے تو گو اپنے ہم عصر طلبہ میں نمایاں ہونے کے مواقع آپ کے سامنے نہ آئے، لیکن اسی کے ساتھ جب ہم سوچتے ہیں کہ دلی آنے کے ساتھ ہی مولانا نوازش علی کی مسجد کے طلبہ سے بحث و مباحثہ میں نہ صرف اسی مسجد کے طلبہ کو بلکہ گذر چکا کہ باہر بھی لوگوں میں آپ کا چرچا پھیلنے لگا اور جیسا کہ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا، کہ مصنف امام نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ کے ساتھ علمی زور آزمائیوں کا یہ قصہ کافی دراز تھا، اور صرف یہی نہیں، بلکہ مولانا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الرشید میں یہ اطلاع جو دی ہے یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ

"یہ طالب العلمی کا سارا زمانہ گنگوہی و نانوتوی آفتاب و ماہتاب کا قریب قریب یک جا اور یک جہتی کے ساتھ گذرا"

آگے وہی فرماتے ہیں کہ

"کبھی کسی مسئلہ میں دونوں حضرات کی باہم بحث بھی ہو جاتی تھی، اور گھنٹوں تک رہا کرتی تھی، ان دونوں مشہور طالب العلموں کا مباحثہ کچھ ایسا نہ ہوتا تھا کہ جس کو دلچسپی کی نظر سے نہ دیکھا جاتا"

پھر دلچسپی کے ساتھ دونوں کے مباحثوں کے دیکھنے والوں میں علاوہ عام طلبہ کے، وہی راوی ہیں کہ

"اساتذہ بڑے شوق اور تعجب سے اس بحث کو سنتے اور سرتا پا کان ہو کر اس جانب متوجہ ہو جاتے تھے"

مولانا عاشق الٰہی نے اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

"کبھی لوگوں کے ٹھٹ لگ جاتے اور عام و خاص کا مجمع ہو جایا کرتا تھا"

الدنیادالآخرۃ کے ان دونوں رفیقوں کے باہمی بحث ومباحثہ کی اہمیت کا اظہار مولانا جیسے محتاط اہل قلم کے ان الفاظ سے جو کچھ ہورہا ہے وہ تو بجائے خود ہے آگے یہ فرماتے ہوئے کہ

"جانبین سے وہ نکتہ سنجیاں، باریک بینیاں ہوتی تھیں کہ باید وشاید"

وہی ایک واقعہ کی خبر ان الفاظ میں دیتے ہیں کہ

"ایک بار ایک استاذ نے دونوں کی گفتگو سن کر یوں فیصلہ فرمایا کہ قاسم ذہین آدمی ہے، اپنی قابلیت سے قابو میں نہیں آتا، ورنہ اس مسئلہ میں رشید احمد حق پر ہے"

واللہ اعلم یہ مسئلہ کون سا تھا اور یہ استاذ صاحب کون تھے، جنھوں نے یہ فیصلہ فرمایا، خود ان کے ذاتی رجحانات کیا تھے جب تک یہ باتیں معلوم نہ ہوں، اب یہ فیصلہ کون کرسکتا ہے کہ استاذ صاحب کا یہ فیصلہ کیسا تھا، بہر حال میری غرض تو مولانا عاشق الٰہی کی اس تحریری شہادت نقل کرنے سے یہ ہے، کہ گو امتحانات کی راہ سے سیدنا الامام الکبیر کو اپنے ہم چشموں اور ہم عصروں میں ممتاز اور نمایاں ہونے کے مواقع نہ مل سکے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ "مشک کی خوشبو پھیل رہی ہے اور پھیلتی چلی جارہی ہے" امتحان نہ سہی لیکن شروع ہی سے آپ کی غیر معمولی ذکاوت وذہانت کا چرچا لوگوں میں ہونے لگا، اور اس سے زیادہ اور کیا چاہا جاتا ہے کہ خود استاذ اپنے شاگرد کی غیر معمولی ذکاوت کا بھرے مجمعوں میں اقرار کرتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ گو امتحان بھی طلبہ کی اندرونی صلاحیتوں کے جانچنے کا ایک عام اور اچھا ذریعہ ہے، لیکن ہمارے قدیم نظام تعلیم میں بجائے امتحان کے، پڑھانے والے اساتذہ کے تاثرات جو اپنے طلبہ کے متعلق وہ رکھتے تھے ان ہی کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی، میرے نزدیک تو استاذ کا یہ ارشاد کہ

"قاسم ذہین آدمی ہے اپنی ذہانت سے قابو میں نہیں آتا"

ہزارہا امتحانوں کے نتائج سے زیادہ قیمتی اور طالب العلم کی استعداد وصلاحیت کے لئے بہترین وثیقہ ہے، اور مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تو اس موقعہ پر استاذ کا نام نہیں بتایا، بظاہر طرز گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مفتی صدرالدین صاحب مرحوم کے یہ الفاظ ہوں، وہی مفتی صدرالدین جنھوں نے مولانا گنگوہی سے یہ سن کر کہ کسی مطبع میں تصحیح کا مولانا محمد قاسم کرتے ہیں، اور آٹھ یا دس روپے تنخواہ پاتے

ہیں، فرمایا تھا کہ

"قاسم ایسا سستا قاسم ایسا سستا"

واللہ اعلم بالصواب۔ یہ میرا ایک قیاس ہے اور اس پر مبنی ہے کہ مفتی صدرالدین صاحب سے جیسے مولانا گنگوہی نے کچھ کتابیں پڑھی تھیں، اسی طرح مولانا محمد قاسم کو بھی مان لیا جائے کہ مفتی صاحب سے مستفید ہوئے تھے، لیکن اس سے بھی زیادہ اہم و محکم آپ کے "الاستاذ" مولانا مملوک العلی کے وہ الفاظ ہیں، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے جنھیں نقل کیا ہے، یعنی لکھا ہے کہ مولانا مملوک العلی صاحب سے یہ بات معتبر ذرائع سے ان تک پہنچی ہے کہ مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اشارہ کر کے کبھی فرماتے کہ

"مولٰنا محمد اسمٰعیل شہید کو لوگ یاد کرتے ہیں، مگر جو زندہ رہے گا ہمارے اسمٰعیل کو بھی دیکھ لے گا" ص ۹

دلی یا ہندوستان کے دارالخلافہ کے سرکاری و غیر سرکاری حلقے کی سب سے بڑی تدریسی و تعلیمی ہستی کی طرف سے سرزمین ہند کے علمی و دینی مستقبل کے متعلق یہ توقع یا پیشگوئی، معمولی توقع یا پیشگوئی نہ تھی، یہ یا اسی قسم کے دوسرے اعترافات کی بنیاد پر یہ خیال کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سیدنا الامام الکبیر حکومت کی کسی موزون و مناسب خدمت کے حاصل کرنے کا ارادہ اگر فرماتے تو معمولی جدوجہد سے بآسانی وہ کامیاب ہو سکتے تھے، شاید یہ خیال صرف خیال نہیں قرار پا سکتا، ہم دیکھ رہے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کے ان ہی استاذ محترم مولٰنا مملوک العلی کے حلقۂ درس سے تعلیم پا کر فارغ ہونے والوں کی جماعت میں ایک طرف شیخ ضیاء الدین صاحب ایل۔ ایل ڈی جیسے نظر آتے ہیں، جو اسی دلی کالج کی معلمی سے ترقی کرتے ہوئے اکسٹرا اسسٹنٹ تک سرکاری خدمات کے سلسلہ میں پہنچے، اور وقت کے حکام کی خوشنودیوں کو حاصل کر کے ہندوستان ہی میں ایل ایل ڈی کی آنریری ڈگری حاصل کی، اور بجائے شیخ ضیاء الدین کے شمس العلماء ڈاکٹر شیخ ضیاء الدین کے نام سے مشہور ہو کر مرے[1]۔ تو دوسری طرف ان ہی مولٰنا مملوک علی

---

[1] آج تو ان مرحوم شمس العلماء ڈاکٹر شیخ ضیاء الدین ایل ایل ڈی کے نام سے بھی شاید کوئی واقف نہ ہوگا، اپنی کتاب دارالحکومت دہلی میں مولوی بشیر الدین صاحب نے لکھا ہے کہ "منشی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد اور یہ (یعنی ڈاکٹر ضیاء الدین ایل ایل ڈی)، دلی کالج کے نامی گرامی طلبہ میں تھے، ایک ساتھ پڑھے اور سب کے سب شمس العلماء بن کر چکے" آگے وہی لکھتے ہیں کہ ضیاء الدین اور نذیر احمد اپنے علمی تبحر کی وجہ سے ایل ایل ڈی بھی ہوئے (باقی صفحہ ۲۶۸ پر)

کے ایک شاگرد مولوی سمیع اللہ[لہ] صاحب کو ہم پاتے ہیں، کہ منصفی کا امتحان دے کر منصف ہوتے ہیں، پھر ہائی کورٹ کے وکیل بنائے جاتے ہیں، اور بالآخر لارڈ بروک گورنر جنرل اور وائسرائے ہند کی نگاہوں میں اتنی عزت حاصل کرتے ہیں کہ مصر کے مشن میں لاٹ صاحب مولوی صاحب کو اپنے ساتھ مصر لے جاتے ہیں اور حسن خدمت کے صلہ میں سی، ایم، جی کے خطاب کا غیر معمولی اعزاز حاصل کر کے سارے ہندوستان میں امتیاز کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۲۶۷) اسی کتاب میں لکھا ہے کہ مولوی یعنی ڈاکٹر ضیاء الدین مولوی مملوک علی صاحب نانوتوی مشہور عالم کے شاگرد تھے، دیکھو کتاب مذکور ص۱۰۹ دلچسپ کہئے یا دل دوز سانحہ، اسی موقعہ پر یہ بھی درج کیا ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے والد کا نام داروغہ خدا بخش تھا، غدر کے زمانہ میں انگریزوں کی حمایت میں انھوں نے جاسوسی کا کام انجام دیا تھا، انعام میں زمین بھی انکو ملی تھی، مگر انگریزی فوج دلی میں جب داخل ہوئی تو انگریزی فوج کے سپاہی کی گولی سے بیچارے کا کام تمام ہوا ۱۲

لہ مولوی سمیع اللہ بھی موجودہ نسل میں تقریباً نسیاً منسیا ہو چکے ہیں بجز خاص لوگوں کے مشکل ہی سے ان کا جاننے والا ہندوستان میں رہ گیا ہوگا، مولوی بشیر الدین ہی نے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ مولوی سمیع اللہ صاحب نے بھی مولوی مملوک العلی صاحب مشہور و معروف عالم و فاضل سے تعلیم پائی ص۵۳ یہ بھی لکھا ہے کہ موجودہ ایم۔ اے۔ او کالج یعنی جس نے ترقی کر کے اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی، وہی جب اسکول کی صورت میں علیگڈھ میں قائم ہوا تھا تو اس کے بانی یہی سمیع اللہ خاں تھے اور سر سید نے بھی اس کام میں ان کا ساتھ دیا تھا مولوی سمیع اللہ علیگڈھ میں سب جج تھے، علیگڈھ میں اس اسکول کے قائم ہونے کی وجہ بھی یہی ہوئی آخر میں سید صاحب اور مولوی صاحب میں ان بن ہوگئی، اور آخر وقت تک دونوں میں تنی ہی رہی، مولوی سمیع اللہ صاحب کا ذکر خیر مفتی جمال الدین افغانی نے بھی اپنے عربی اور فارسی رسائل اور لکچروں میں کیا ہے، مولوی صاحب نے وہی کام جسے داروغہ خدا بخش نے دلی میں انجام دیا تھا۔ لارڈ نارتھ بروک کے اشارے سے مصر میں انجام دیا۔ ان ہی رسالوں میں مفتی صاحب مرحوم نے علیگڈھ کو "بوم کدہ" اور علیگڈھ تحریک کے چلانے والوں کو "انگھوریان[عہ] ہند" کے خطاب سے سرفراز کیا ہے۔ مولوی سمیع اللہ کے صاحبزادے حیدر آباد میں چیف جسٹس کے عہدے پر ممتاز تھے، نواب سرور جنگ کے داماد تھے ان کو بھی سر بلند جنگ کا خطاب مرحوم میر محبوب علی خاں حضور نظام حیدر آباد سے ملا تھا، کہتے ہیں کہ سرور جنگ و سر بلند جنگ کے یہ دونوں خطاب ان لوگوں کی درخواست پر مرحوم نظام نے دیا تھا، انگریز جب ان خطابوں کو دیکھتے تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے کہ برطانوی حکومت کی طرف سے "سر" کا خطاب ان لوگوں کو ملا ہے ۱۲

عہ انگھوری بے تمیز اور ایسے بے حس کو کہتے ہیں جو پاکی ناپاکی میں امتیاز نہ رکھتا ہو، اور خلط ملط کرے استعمال کرے ۱۲

اور ایک شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین' یا مولوی سمیع اللہ صاحب ہی کیا سچی بات تو یہ ہے کہ " دلّی عربک کالج" کے استاذ ہونے کی وجہ سے مولانا مملوک العلی صاحب سے پڑھنے اور مستفید ہونے کے مواقع جن جن لوگوں کو میسر آئے اور فارغ ہونے کے بعد نئی قائم شدہ حکومت کی مشینری میں شریک ہو کر عروج و ارتقاء کی بلندیوں تک جو پہنچے ان کو آج گن گر کون بتا سکتا ہے' اپنی کتاب دارالحکومت دہلی میں مولوی بشیر الدین صاحب نے مولٰنا مملوک العلی کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

"تمام ہندوستان آپ کے فیض سے مملو ہے" ص ۵۸۴/۲۶

اپنی ذاتی واقفیت یہ درج کی ہے کہ

"آپ کے (یعنی مولوی مملوک العلی کے) ہزاروں شاگرد صاحب ثروت و اقتدار تھے" ص ۵۸۴/۲۶

لیکن علم کے جس "دیوان" سے نکل نکل کر ثروت و اقتدار کے وسیع صحراء کی طرف ہزار ہا ہزار کی تعداد میں لوگ بھاگے جا رہے تھے' ذرا پلٹئے اور دیکھئے دلّی میں چیلوں کا ایک کوچہ ہے' اسی کوچہ میں مولانا مملوک العلی کا ذاتی خریدا ہوا مملوکہ مکان تھا جس کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے چیلوں کے کوچہ کے اسی مکان کے کوٹھے پر چڑھ جائیے' دیکھئے ہمارے مصنف امام کے قلم کی کھینچی ہوئی تصویر ہے' یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"کوٹھے پر ایک جھلنگا پڑا ہوا تھا" ص ۲۹

اور ٹھیک ان ہی دنوں میں جب اپنی اپنی صلاحیت اور اپنی اپنی لیاقت کے حساب سے اسی "دلّی" میں مولانا مملوک العلی کے مذکورہ "دیوان علم" میں پڑھنے والے اپنی اپنی کوٹھیوں اور بنگلوں میں براج رہے تھے' ان ہی پڑھنے والوں کا ایک ساتھی اور رفیق' آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکلے چلے آتے ہیں' جب کوچہ چیلان کے کوٹھے کے اس جھلنگے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے مصنف امام فرماتے ہیں کہ

"اسی پر (اسی جھلنگے پر) پڑے رہتے تھے" ص ۲۹

کون پڑے رہتے تھے؟ سمجھا آپ نے' یہ ہمارے سیدنا الامام الکبیر حضرت مولٰنا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ہے' اور کیا صرف جھلنگے پر پڑے رہنے کی حد تک درد کی یہ داستان'

یارسوائیوں کا یہ سامان ختم ہو جاتا ہے، آگے اپنی چشم دید شہادت مصنف امام ہی نے جو پیش کی ہے، میں اسے نقل کرنا چاہتا ہوں اور نہیں نقل کرسکتا، انگلیاں تھرا رہی ہیں، بینائی پر اندھیرا چھایا چلا جاتا ہے، ارقام فرماتے ہیں

"روٹی کبھی پکوا لیتے تھے، اور کئی کئی وقت تک اسی کو کھا لیتے تھے۔" ص۲۹

اللہ اللہ ان ہی مولانا مملوک العلی سے علم سیکھ کر اسی دلی میں کتنے ہیں، جو حکومت وقت کے حکام وولاۃ کی میزوں پر ڈٹ رکھا ہے ہیں، ہندوستان کے میدان کو اپنی اولوالعزمیوں کے لئے تنگ پاکر ان ہی میں بعض ہیں جو لارڈ نارتھ بروک کی ہمرکابی میں سمندر پھاند کر مصر تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن ان ہی کا ہم درس، چیلوں کے کوچہ میں پڑا ہوا ہے، جھلنگے پر پڑا ہوا ہے اور کئی کئی دن کی پکی ہوئی روٹیوں، خشک روٹیوں سے زیادہ جسم کے تعلق کو جان کے ساتھ باقی رکھنے کے لئے جس کے پاس اور کچھ نہیں ہے یہ میں مبالغہ نہیں کر رہا ہوں، یہ ارقام فرمانے کے بعد کہ

"میرے پاس آدمی روٹی پکانے والا نوکر تھا، اس کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جب مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کھانا کھاویں سالن دے دیا کرو۔" ص۲۹

مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مگر بدقت کبھی اس کے (باورچی کے) اصرار پر لے لیتے تھے۔" ص۲۹

"بدقت کبھی" لے لینے کی اس خبر کے بعد ہی فرماتے ہیں، اور فرماتے کیا ہیں، اپنی آنکھوں دیکھی گواہی پیش کرتے ہیں کہ

"ورنہ وہی روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑ رہتے۔" ص۲۹

کامل ایک صدی تو ابھی پوری نہیں ہوئی ہے، لیکن قریب ہے کہ پوری ہو جائے، ہر سال جس کے طفیل میں دارالعلوم دیوبند کے مطبخ سے گرم گرم تنوری روٹیاں ہزاروں کی تعداد میں سالن کے ساتھ دونوں وقت مسلسل طلبہ میں تقسیم ہو رہی ہیں، قدرت کا یہ کیا عجیب کرشمہ ہے کہ آج دہی چیلوں کے کوچے میں روکھے سوکھے ٹکڑے چبا رہا ہے، کون جانتا تھا کہ ان ہی خشک ٹکڑوں کے اندر سرزمین ہند کے ہزارہا

ہزار علماء کی روزیاں، بلکہ انصاف سے اگر کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ بیس کروڑ مسلمانوں کی دینی فیروزیاں مستور تھیں۔

بہر حال مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر سے سات سال پہلے ۱۸۵۰ء سے حضرت والا پر اپنے رفقاء درس، اور ہمدرس ساتھیوں کے برخلاف یہ عجیب و غریب حال طاری ہوا، اس وقت حساب سے آپ کی عمر بمشکل (۱۹) سال ہوگی، پوری بیس بہاریں بھی ابھی اس پر نہ گذری تھیں عین شباب کا عالم تھا، جیسے آپ ہی کے دوسرے ہم استاذوں کے سامنے "ثروت و اقتدار" کا وسیع صحرا پھیلا ہوا تھا، یقیناً اس وسیع میدان میں اپنے گھوڑے کو اگر وہ کدانا چاہتے تو اس سے آپ کو کوئی روک نہیں سکتا تھا، بلکہ جن خداداد ملکات، اور فطری کمالات سے سرفراز تھے، ان کو دیکھتے ہوئے یہ بے جا توقع نہ تھی کہ ساتھیوں سے آپ ہی کے عزم اور ارادے کا گھوڑا آگے بڑھ جاتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وفات سے پہلے استاذ مرحوم نے سرکاری امتحان میں شریک ہونے کا مشورہ جو آپ کو دیا تھا، شاید اس مشورے کی بنیاد اسی پر قائم ہو کہ اس میدان میں اترنے والوں کیلئے "سرکاری سند" اجازت نامہ کی حیثیت رکھتی تھی، مگر عرض کر چکا ہوں کہ باوجود تیار ہونے کے عین وقت پر امتحان کی شرکت کا ارادہ آپ نے فسخ فرما دیا۔ اسی زمانہ میں استاذ مرحوم کی وفات بھی ہوگئی، شاید ان ہی کا کچھ خیال حضرت والا کے فطری میلانات کے ابھار اور ظہور میں بظاہر مانع تھا، ان کی وفات کے بعد یہ دباؤ بھی اٹھ گیا، اچانک اسی کے بعد چیلوں کے کوچے کے اس مکان میں آپ کو کوٹھے پر پڑے ہوئے جھلنگے پر ہم پاتے ہیں، جہاں کئی کئی دن کی پکی ہوئی روٹیوں کے خشک روکھے سوکھے ٹکڑوں کے سوا اپنے "نفس" کو آپ کچھ نہیں دیتے۔

ہندوستان کا مشہور سیاسی ہنگامہ جس کا مشہور نام غدر ہے، اس سے چند سال پیشتر سیدنا الامام الکبیر پر اس حال کا طاری ہونا، اور جیسا کہ مشہور ہے کہ ہندوستان کے اس سیاسی بھونچال میں حضرت والا کی عملی شرکت بھی ثابت ہے، جس کا ذکر اپنے محل پر آئے گا، نیز آپ کے کچھ بعد بھی بلکہ زندگی میں بھی اس قسم کی باتیں آپ کی طرف منسوب کرنے والے جو عموماً منسوب کیا کرتے تھے

مثلاً امیر شاہ خاں مرحوم نے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں نقل کیا گیا ہے کہ رامپور منھاران ضلع سہارنپور جہاں مولانا محمد طیب کی سسرال ہے، وہاں کے بعض باشندوں نے مولانا نانوتوی کی زندگی ہی میں

"حکومت میں یہ درخواست پیش کی کہ مولنا محمد قاسم صاحب نے دیوبند میں ایک مدرسہ گورنمنٹ کے مقابلہ میں کھولا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ سرحد کے لوگوں سے تعلقات پیدا کئے جائیں تاکہ گورنمنٹ سے جہاد آسان ہو جائے، یہ مدرسہ خفیہ طور پر طلبہ کو قواعد جنگ کی بھی تعلیم دیتا ہے اور ہندوستان پر چڑھائی کرانے کے لئے کابل کو تیار کر رہا ہے۔" ص۱۷۸

یہ اور اسی قسم کی دوسری معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر یہ سوچا جائے کہ ہندوستان جن روح فرسا جاں گسل حالات سے اس وقت گذر رہا تھا، علی الخصوص مسلمانوں پر اس ملک میں جو تاریخی افتاد پڑی تھی، شاید ہی کوئی دن طلوع ہوتا ہوگا، جس میں برصغیر کا کوئی علاقہ یا کوئی صوبہ مسلمانوں کے قبضے سے نکل نکل کر دوسروں کے ہاتھ میں مسلسل نہ چلا جا رہا تھا، آج سلطان شہید ٹیپو شہید ہوئے، کل سراج الدولہ والی بنگال و بہار مارا گیا، اور جنوبی ہند میں ارکاٹ کے نوابوں کی نوابی ختم ہو رہی ہے تو شمالی ہند میں اودھ کی سرکار کے الحاق کا اعلان ہو رہا ہے، جو تخت پر تھے وہ پھانسی کے تختوں پر چڑھائے جا رہے تھے، کاخ سے خاک پر گرنے کا نہ ٹوٹنے والا حادثہ تھا، جو گھر گھر میں برپا تھا، لال قلعہ تک محدود نام نہاد مغلی حکومت کے متعلق اگرچہ ۱۸۲۶ء میں لارڈ امہرسٹ نے اعلان کر دیا تھا کہ

"ہماری گورنمنٹ اب کچھ تیموریہ خاندان کی تابع نہیں ہے، بلکہ خود ہندوستان کی بادشاہ ہے۔"[۱]

لیکن اس زبانی اعلان نے ابھی کاغذی لباس اختیار نہیں کیا تھا، مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک ۱۸۵۶ء جس میں ہمارے مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کو اس عجیب و غریب حال میں پایا تھا، اسی ۱۸۵۶ء میں لارڈ ڈلہوزی نے کمیٹی قائم کر کے لال قلعہ والی مغلی حکومت کے متعلق یہ طے کرتے ہوئے کہ

"بادشاہ (بہادر شاہ مرحوم) کی وفات کے بعد مرزا فخر و برائے نام بادشاہ ہیں۔"

لال قلعہ سے بھی تیمور کی اولاد کا رشتہ ہمیشہ کیلئے اس فیصلہ کے ذریعہ منقطع کر دیا گیا کہ مرزا فخرو برائے نام

---

[۱] رسالہ اسباب بغاوت ہند مصنفہ سرسید احمد خاں ص۱۸ ضمیمہ حیات جاوید

بادشاہ قلعہ کو چھوڑ دیں گے، اور

"قطب میں جا کر رہیں گے" (دارالحکومت دہلی ص۹۴)

اس کمیٹی میں بادشاہ اور کمیٹی دونوں فریق کے نمائندے شریک تھے، ایک رکن اس کے مرزا فخرو بھی تھے، بابر کے معذور مجبور وارث بہادر شاہ نے کمیٹی کے اس فیصلہ پر اپنی مہر اور دستخط ثبت کر کے شاہ جہاں کے قلعہ کو کمپنی کے حوالہ کر دیا۔

آج تو ان واقعات کا ذکر ہم تاریخی افسانے کی شکل میں کرتے ہیں، لیکن جس وقت لال قلعہ سے بھی بدر ہونے کے اس فیصلہ کا علم مسلمانوں کو ہوا ہوگا، کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس وقت ان پر کیا گذری ہوگی؟

ایک طرف سیاسی انقلابوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ادھر جاری تھا، مستقبل کا ہر انقلاب مسلمانوں کو مسلمانوں کی تاریخ کو اس ملک میں ماضی بناتا چلا جاتا تھا، اور دوسری طرف مذہبی اور دینی دائرے میں جو کچھ ہو رہا تھا، سرسید جیسے محتاط اہل قلم تک کا یہ بیان ہے کہ

"سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ (کمپنی بہادر) علانیہ جبر، مذہب بدلنے پر نہیں کریگی، بلکہ خفیہ تدبیریں کر کر مثل نابود کر دینے علم عربی و سنسکرت کے، اور مفلس و محتاج کر دینے ملک کے اور لوگوں کو جو ان کا مذہب ہے اس کے مسائل سے ناواقف کر کر"

لوگوں کو مرتد بنانے میں حکومت کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہے، ۱۸۳۷ء میں قحط کا شکار ہندوستان ہوا تو سرسید نے لکھا ہے کہ

"قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کئے گئے وہ تمام اضلاع مغربی و شمالی میں ارادۃً گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اسی طرح پر مفلس اور محتاج کر کر اپنے مذہب میں لے آئیں گے"

یہ بھی انھوں نے لکھا ہے کہ

"سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے"

گورنمنٹ سے پادری صاحبان تنخواہ پاتے ہیں ''

اور صرف حکومت ہی نہیں، بلکہ یورپین حکام کے متعلق سرسید ہی کا بیان ہے کہ

''پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں، اور ہر طرح ان کے مددگار اور معاون ہیں ''

نیز یورپین حکام اسی سلسلے میں اور کیا کیا کرتے تھے، منجملہ اس کے یہ عام طریقہ بھی ان لوگوں نے اختیار کر رکھا تھا کہ

''اپنے ملازموں کو (جو ان کی ماتحتی میں کام کرتے تھے) حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی میں آکر پادری صاحب کا وعظ سنو، اور ایسا ہی ہوتا تھا (یعنی لوگ تعمیل حکم کرتے تھے)''

اور قصہ صرف اسی پر ختم نہیں تھا، مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذاہب اور مذہبی پیشواؤں پر حد سے زیادہ دل آزار، موذی، اعتراضات سے بھری ہوئی کتابوں سے اس ملک کو بھر دیا گیا تھا، سرسید کا بیان ہے کہ شہروں، قصبوں، دیہاتوں میں ان ہی زہریلی کتابوں کو لے کر پادری گشت کرتے تھے، اور ان کتابوں کے مضامین کو علانیہ کوچہ و بازار میں دہراتے اور بقول سرسید

''کوئی شخص حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا''

لیکن جہاں روک ٹوک کا اندیشہ ہوتا سرسید نے لکھا ہے کہ ان علاقوں میں

''یہ رواج نکلا کہ پادری صاحبوں کے ساتھ تھانے کا ایک چپراسی جانے لگا ''

سرسید کی شہادت ہے کہ

''پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا، نہیں کرتے تھے، بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو، اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے، جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور تکلیف پہنچتی تھی ''

(صـ۲۷ اسباب بغاوت ہند)

اور مشنری اسکولوں اور کالجوں کا جو جال ملک میں پھیلایا جا رہا تھا، سرسید اس کے راوی ہیں کہ

"بڑے بڑے عالی قدر حکام متعہد ان اسکولوں میں جانے اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے ۔"

اور ان کالجوں میں کیا سکھایا جاتا تھا، اور امتحانی سوالوں کی نوعیت کیا ہوتی تھی، وہی لکھتے ہیں کہ،

"طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے، پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون؟ تمہارا نجات دینے والا کون؟"

یہ تو سوالات کی نوعیت ہوتی، اور کامیابی کا معیار کیا تھا، ان ہی کا بیان ہے کہ

"وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے، اس پر ان کو انعام ملتا تھا ۔"

الغرض یہ اور اسی قسم کی بے شمار علانیہ اور خفیہ، براہ راست اور بالواسطہ کارروائیوں کا ایک سلسلہ اس ملک کے طول و عرض میں جاری تھا، حتیٰ کہ آخر میں "مخفی ارادہ" اور "پوشیدہ نیت" کا راز پادری ایڈمنڈ کی اس گشتی چٹھی سے طشت از بام ہوگیا، جو تقریباً ہندوستان کے ہر اس شخص کے نام جاری ہوئی تھی جو حکومت کا متوسل تھا، یا ملک میں کسی قسم کا امتیاز رکھتا تھا، یہ ایک مشہور تاریخی چٹھی ہے، جس کی ابتدا ہی ان الفاظ سے ہوئی تھی کہ

"وہ وقت آگیا ہے کہ اس مضمون پر سرگرمی کے ساتھ غور کیا جائے کہ سب لوگوں کو ایک ہی مذہب اختیار کرنا چاہئے یا نہیں ۔"

یہ بڑی کافی لمبی چوڑی چٹھی ہے، جس کا پورا ترجمہ مولانا حالی نے سرسید کی سوانحعمری کے آخر میں بطور ضمیمہ کے شریک کر دیا ہے، اگرچہ بعد کو یہ اعلان کیا گیا کہ اس کا تعلق حکومت سے نہیں، لیکن سرسید کا بیان ہے کہ

"ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا، پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی، سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آگیا، اب جتنے سرکاری نوکر ہیں، اول ان کو کرسٹان ہونا پڑے گا، اور پھر تمام رعیت کو"

سرسید نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"سب لوگ بیشک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں، آپس میں ہندوستانی لوگ اہل کاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چٹھی آئی، اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بسبب لالچ نوکری کے کرسٹان ہوگئے"

آخر میں وہی لکھتے ہیں کہ

"یہاں تک ہندوستانی اہل کاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ مارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آجائے گی، کیا تم سرکار کے نوکر نہیں ہو" ص۳۲

خلاصہ یہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی دنیا بھی لٹ رہی تھی اور لٹتی چلی جارہی تھی، اور دین بھی ان کا اچانک ایسے مہیب نرغے میں گھر گیا تھا، جس کے نتائج کو دیکھ دیکھ کر بقول سرسید آنکھوں میں اندھیرا چھا چلا جاتا تھا، اور پاؤں تلے کی مٹی نکلی چلی جاتی تھی، ایسی صورت میں ذہن اگر ادھر منتقل ہو، کہ چھلو کے کوچے والے مکان میں دنیا اور دنیا کی چیزوں سے بے تعلق ہو کر جھلنگے پر جو پڑا ہوا تھا، وہ ملک وملت کے ان ہی حالات سے متاثر تھا، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے، اس قسم کے قومی حوادث میں یہ واقعہ ہے، کہ بڑی مصیبت ان ہی لوگوں کے لئے ہوتی ہے، جن کے سینے میں حساس ونازک دل بھی ہو، اور اس حساس ونازک دل کے ساتھ دماغ بھی ان کے سامنے دلی بیچینیوں کے ازالہ کیلئے طرح طرح کی مشوروں اور تجویزوں کے پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

ہمارے مصنف امام نے ان ہی ایام کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقعہ پر جو یہ خبر دی ہے، کہ

"جس زمانہ میں مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) میرے مکان میں رہتے تھے، مولوی صاحب کی صورت پر جذب کی حالت برستی تھی" ص۳

"جذب کی حالت" سے حضرت والا کے جس حال کی تعبیر وہ کر رہے ہیں، آگے اس کی تشریح جن الفاظ میں کی گئی ہے بیساختہ اس کو دیکھ کر دماغ میں مشہور عنائی شعر

یہ کیسے بال بکھرے ہیں، یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

چکر کھانے لگا، بلکہ سچ پوچھئے تو سر چکرانے لگا، تباہ ہم ہو رہے تھے، ہم مٹ رہے تھے، یا مٹائے جا رہے تھے، اور سنئے، مصنف امام کی زبانی سنئے وہ فرماتے ہیں کہ آج جنھیں ہم سیدنا الامام الکبیر کے نام سے موسوم کر رہے تھے ان ہی پر یہ حال طاری تھا کہ

"بال سر کے بڑھ گئے تھے نہ دھونا، نہ کنگھی، نہ تیل، نہ کترے، نہ درست کئے"۔ صد۳

آخر میں فرماتے ہیں،

"عجیب صورت تھی"۔ صد۳

آگے اسی کے بعد وہی راوی ہیں کہ

"جوئیں بھی بہت ہو گئی تھیں" صد۳

اور اسی کے ساتھ یہ اطلاع بھی اسی زمانے کے متعلق وہ دیتے ہیں کہ

"باوجود خوش مزاجی اور ظرافت کے ترش رو، اور مغموم جیسی صورت رہتے"۔ صد۳

میں کیا مصنف امام کی ان چشم دید شہادتوں کو جو بھی پڑھے گا، اور اس کے ساتھ پھر سوچے گا کہ یہ امور تھا ان کے جن شیوخ نے حضرت والا کے متعلق حکومت میں جو سراغ رسانی کی تھی، اور جیسا کہ امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ اس سراغ رسانی سے حکومت بھی کافی متاثر ہوئی، ان کی روایت کے الفاظ ہیں کہ

"حکومت کے یہاں سے تفتیش حالات کے لئے احکام جاری ہوئے، اور تفتیش کے مراکز گنگوہ، نانوتہ، رامپور جلال آباد قرار پائے، اور ان کا صدر مقام دیوبند بنایا گیا، حکام نے دورے کئے"۔ صد۱

یہ بھی ان کا بیان ہے کہ حکومت قائمہ کا کوئی افسر نانوتہ پہنچ کر حضرت سے براہ راست ملا بھی، حضرت والا اس وقت مسجد میں تھے، حاکم نے کہلا بھیجا کہ آپ سے ملنے کے لئے میں کیا مسجد میں

داخل ہو سکتا ہوں، لکھا ہے کہ مولانا مرحوم نے آنے کی اجازت دیتے ہوئے صرف یہ فرمایا کہ "اگر اندر آنا چاہتے ہیں تو جوتے اتار کر آئیں" بہر حال وہ آیا اور جوتے اتار کر آیا، بیان کیا جاتا ہے کہ ملنے کے ساتھ ہی وہ حضرت والا کی شکل و صورت ہی سے اتنا مرعوب اور غیر معمولی طور پر متاثر ہوا کہ سامنے بیٹھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی، کھڑے کھڑے ادب کے ساتھ کچھ باتیں دریافت کیں اور چلا گیا، اور جاکر اس نے رپورٹ کردی کہ اس قسم کی ہستیوں پر غدر و فساد کا الزام لگانے والے خود مفسد ہیں، اور جو سراغ رسانی کی گئی ہے، صرف شرارت پر اس کی بنیاد قائم ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اس افسر نے اسی قسم کی رپورٹ کی ہو، اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت والا کی کارروائیوں کو "غدر و فساد" سے تعبیر کرنا، خود غداروں اور مفسدوں کی عیاری بلکہ غداری تھی، جو چور تھے وہ کوتوال ہی کو چور ٹھہرا کر ڈانٹ رہے تھے، اور کوئی شبہ نہیں کہ سراغ رسانی کرنے والوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا تھا، اس کی بنیاد یقیناً بجائے کسی خیر کے صرف شرارت ہی پر قائم تھی، لیکن بایں ہمہ حضرت والا کی زندگی اور آپ کی خدمات سے جو واقف ہیں وہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اپنی رپورٹ میں افسر نے حقیقت سے پردہ اٹھایا تھا، یا حقیقت ہی پردہ بن کر اس کی سمجھ پر پڑ گئی تھی[1]۔

---

[1] خود اسی قصہ میں امیر شاہ خاں صاحب مرحوم کی طرف یہ روایت بھی منسوب کی گئی ہے کہ اس واقعہ کے بعد یعنی سرکاری افسر کی ملاقات اور رپورٹ کے بعد حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ میں اکثر دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں اور اپنی ردار مبارک میں مجھے ڈھانپ کر کبھی اندر لاتے ہیں اور کبھی باہر لیجاتے ہیں، اسی سلسلہ میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ اکثر اوقات یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ردار مبارک میں آپ کو لپٹے رہتے ہیں اور الگ کرنا نہیں چاہتے۔ عالم واقعہ کی اس کشفی آگاہی کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایسے نازک ترین حالات سے اس زمانہ میں مولانا نانوتوی گذر رہے تھے کہ براہ راست نبوت کبریٰ کی طرف سے آپ کی حفاظت و نگرانی کا انتظام کیا گیا تھا، بیچارہ مسکین سرکاری افسر کے بس کی بات تھی کہ عالمین کی رحمت کی چادر میں جسے پناہ دی گئی تھی اسکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے، ۵۷ء کے ہنگامہ میں حضرت والا کی عملی شرکت کا تفصیلی ذکر اپنے محل پر انشاء اللہ آئندہ کیا جائیگا، اس وقت یہی معلوم ہو گا کہ باوجود شدید کد و کاوش کے سیدنا الامام الکبیر کی گرفتاری میں حکومت کامیاب ہو سکی، ظاہر ہے کہ اتنی محفوظ پشتبانی جسے میسر آگئی ہو، اس پر ہاتھ ڈالنے کی گنجائش ہی کیا باقی رہی تھی، افسوس ہے کہ وقت کے تقاضوں اور مصالح کا خیال کرکے سیدنا الامام الکبیر کے (باقی اگلے صفحہ پر)

بہرحال حضرت والا کے سیاسی رجحانات اور اس راہ میں آپ کے عملی اقدامات وخدمات کا وہی انکار کرسکتا ہے، جس کے دل ودماغ پر اسی قسم کا پردہ پڑا ہوا ہو، جیسے اس سرکاری افسر پر پڑگیا تھا، لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ طلب علم کی زندگی سے فارغ ہونے کے بعد اچانک آپ کے تغیر حال کی جو دردناک داستان مصنف امام نے سنائی ہے، کیا اس کے پیچھے صرف آپ کے سیاسی احساسات ہی پوشیدہ تھے ؟

(بقیہ صفحہ ۲۷۸) سیاسی رجحانات وخدمات پر عموماً پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی، لیکن یہی بات یعنی دیوبند کے مدرسہ کے قائم کرنے کی غرض کیا تھی، کسی دوسرے سے نہیں بلکہ براہ راست خاکسار نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے ایک خاص موقعہ پر یہ سنا ہے کہ ۵۷ء کی جدوجہد میں ناکام ہونے کے بعد حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو جو قائم کیا تو تعلیم سے زیادہ ان کی غرض کچھ اور بھی، صحیح الفاظ تو مجھے یاد نہ رہے لیکن حاصل اسکا بھی قریب قریب ہی تھا، جس کا ذکر رامپور والے "جاسوسی نامہ" میں کیا گیا ہے، اور یہ روایت تو شاید دیوبندی حلقہ میں تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، خاکسار نے بھی مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم سے سنا تھا کہ صوبجات متحدہ کے گورنر لارڈ میکڈانلڈ جنھوں نے اردو ہندی کا قصہ اس علاقہ میں کھڑا کیا، یہی میکڈانلڈ ایک دفعہ شملہ جاتے ہوئے دیوبند کے اسٹیشن سے گذر رہا تھا، اشاف میں گورنر صاحب کے ایک مسلمان افسر بھی تھے، ان سے اسٹیشن کا نام پوچھا اور یہ معلوم کرکے کہ یہی "دیوبند" ہے مسلمان افسر بیان کرتے تھے کہ چہرہ میکڈانلڈ کا متغیر ہوگیا اور غصہ میں بولنے لگا کہ ساری شرارتوں کا مرکز یہی مقام ہے، اسی وقت اس نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں دیوبند اور اس کے مدرسہ کا معائنہ میں خود کروں گا، تاریخ معائنہ کی مقرر بھی ہوگئی اور مدرسہ والوں کے پاس باضابطہ سرکاری اطلاع بھی پہنچ گئی اندرونی طور پر میکڈانلڈ کے فاسد ارادے کا علم بھی مدرسہ والوں کو مختلف ذرائع سے ہو رہا تھا، مولانا حبیب الرحمن صاحب بیان کرتے تھے کہ مدرسہ کے لئے وہ بڑا نازک وقت تھا، ہم لوگ اس زمانہ میں جوان تھے، سیدھے حضرت گنگوہی کی خدمت میں گنگوہ پہنچے اور لاٹ صاحب کی نیت سے مولانا کو مطلع کیا یہ مشہور ہے مولانا حبیب الرحمن بھی فرماتے تھے کہ حضرت والا مراقب ہوگئے، پھر سر اٹھاکر جوش کے عالم میں یہ فقرہ حضرت کی زبان پر جاری ہوا کہ "نہ لاٹ آئے نہ لٹھوری" حکم دیا کہ اطمینان کے ساتھ جاؤ مدرسہ کا کام کرو. لاٹ صاحب کے آنے کی تاریخ کے کچھ دن باقی ہی تھے کہ اچانک دیوبند اور اطراف دیوبند میں کالرا کی وبا پھوٹ پڑی، لاٹ صاحب نے ارادہ ملتوی کردیا، اسی کے بعد ان کی مدت بھی ختم ہوگئی جس کا مطلب یہی ہوا حکومت بھی، مدرسہ کے اس پہلو سے ناواقف یا کم ازکم مطمئن نہ تھی جس کا ذکر رامپور کے ہیزم کشوں نے حکومت تک پہنچایا تھا، بہرحال مجھے یہ کہنا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے سیاسی میلانات کا قصہ ایسا قصہ نہیں ہے جس کی تحقیق کے لئے نکتہ آفرینیوں کی ضرورت ہو، آخر خود سوچنا چاہئے کہ "بٹن" جیسی معمولی چیز کو عمر بھر جس نے صرف اس لئے استعمال نہیں فرمایا کہ یہ نصاریٰ یعنی انگریزوں کی لائی ہوئی چیز ہے (دیکھو ارواح ص۱۸۶) خود انگریزوں اور انگریزوں کی حکومت کے متعلق اس کا کیا حال ہوگا۔ ۱۲

جس زمانے سے ہم گذر رہے ہیں، چونکہ عموماً سیاسی خدمات ہی کو غیر معمولی اہمیت مختلف اسباب و وجوہ سے حاصل ہو گئی ہے، شاید ان لوگوں کا جن کے قلوب میں حضرت والا کی عظمت ہے، یہ خواہش ہو کہ آپ کی زندگی میں بھی سب سے زیادہ اسی پہلو کو نمایاں کیا جائے جس کا سیاست سے تعلق ہو، دیکھا جا رہا ہے کہ اس سلسلہ میں رائی کو پربت بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو لوگ اس سے بھی نہیں چوک رہے ہیں، لیکن میرے نزدیک اس قسم کی سیرت نگاری، سیرت نگاری نہیں بلکہ ایک قسم کی وقتی قصیدہ خوانی سے زیادہ وہ اور کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ سوچا جائے تو ایک طرح سے یہ علمی خیانت اور فنی بددیانتی بھی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ وقت کے تقاضوں نے سیاسی خدمات میں خواہ کتنی بھی اہمیت پیدا کر دی ہو، لیکن موسمی بادل جب پھٹ جائیں گے اور واقعات کو واقعات ہی کے رنگ میں سوچنے کا ماحول جب پیدا ہو گا، تو دنیا پر خود ہی یہ واضح ہو جائے گا کہ سیاسی ہنگامہ آرائیاں اور اس راہ کی قربانیاں خواہ جیسی کچھ بھی ہوں ان کی بذات خود کوئی قیمت نہیں ہے، کام کس لئے کیا گیا اور قربانیاں کس نصب العین کے لئے پیش کی گئیں، دیکھنے کی اصل چیز وہی ہوتی ہے، آخر میں پوچھتا ہوں کہ خدمات اور قربانیوں کی حد تک سید الشہداء حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور غریب ابوجہل میں انصاف سے بتائیے کیا فرق ہے، سید الشہداء اگر سید الشہداء (العیاذ باللہ) صرف اس لئے قرار پائے کہ اپنی جان عزیز کی قربانی انھوں نے پیش کی تھی، تو جان کی حد تک بنایا جائے مسکین ابوجہل نے بھی کیا کمی کی تھی، مگر اپنی تمام قربانیوں کے باوجود ابوجہل ابوجہل ہی رہا جس کی وجہ اس کے سوا اور کیا تھی کہ جس لئے اس نے قربانی پیش کی تھی وہ مقصد غلط تھا۔

خیر یہ قصہ تو بجائے خود بڑا طویل ہے، میرے لئے اس موقعہ پر صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ جن حالات سے ہندوستان کے مسلمان اس زمانہ میں گذر رہے تھے اور ان کی حکومت کا پایۂ تخت شہر دلی جن سیاسی ہچکولوں سے تہ و بالا ہو رہا تھا، اسی دلی میں رہتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کا دل تو خیر آپ ہی کا دل تھا، معمولی ادنیٰ درجہ کے مسلمان کا بھی ان حالات سے متاثر نہ ہونا یقیناً ناممکن تھا، مسلمانوں کا حکمران خاندان ان ہی مسلمانوں کے بنائے ہوئے قلعہ سے

نکلا جا رہا تھا، اس خبر سے کونسا مسلمان ہوگا جس کا کلیجہ سینہ سے نہ نکل پڑا ہو، یہ صحیح ہے جیسا کہ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ حوادث و مصائب کے برداشت کیلئے جن اعصابی قوتوں اور جسمانی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، سیدنا الامام الکبیر کو پیدا کرنیوالے نے ان سے بھی مالا مال کر کے آپ کو پیدا کیا تھا۔

ہمارے مصنف امام کی یہ شہادت آپ کے ایام طفولیت کی گذر چکی ہے کہ قصبہ نانوتہ میں آپ کا گھر ایسی جگہ تھا، جس میں پہنچنے کے لئے ایک بڑی طویل گلی سے گذرنا پڑتا تھا، مصنف امام نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ بڑی وحشتناک جگہ تھی، وہاں آسیب بھی مشہور تھا، مگر بایں ہمہ وہی فرماتے ہیں کہ

"راتوں کو بہت بہت دیر سے بے تکلف گھر جاتے اور کچھ خوف نہ کرتے" ص۲۷

اور یہ قصہ تو بچپن کا ہے، وفات سے کچھ دن پیشتر آخری حج میں جب حضرت والا مکہ معظمہ سے واپس ہوئے اور جہاز پر سوار ہونے کے لئے جدہ کی بندرگاہ سے کشتی پر روانہ ہوئے تو کشتی میں دوسروں کے ساتھ آپ کے تلمیذ عزیز مولانا منصور علی خاں صاحب حیدر آبادی مرحوم بھی تھے، یہی مولانا منصور علی خاں راوی ہیں کہ کشتی جب ساحل سمندر سے جہاز تک پہنچنے کے لئے کھلی، تو

"اس قدر تیز و تند ہوا چلنے لگی کہ کشتیاں ادھر ادھر قریب غرق ہونے کے جھک جاتی تھیں"

مولانا منصور علی خاں کا بیان ہے کہ کشتی پر جو لوگ سوار تھے،

"ہر ایک کا رنگ زرد ہو جاتا تھا"

مگر کشتی کے جھکولوں سے جن لوگوں کے چہرے زرد پڑ جاتے تھے، ان ہی میں مولوی منصور علی خاں صاحب مرحوم اپنے استاذ (سیدنا الامام الکبیر) کو دیکھ رہے تھے، فرماتے ہیں کہ

"مگر مولانا مرحوم اپنے حال پر رہے" (مذہب منصور ص۱۸۲)

ابتداء و انتہاء کی ان شہادتوں کے ساتھ زندگی کی درمیانی منزل کی یہ شہادت بھی مصنف امام کی زبانی سن لیجئے، غدر کے ہنگامہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھنے کے بعد کہ

"اس طوفان بے تمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے"

وہی یہ گواہی دیتے ہیں کہ

ہم نے کبھی مولانا کو گھبراتے ہوئے نہ دیکھا، خبروں کا اس وقت چرچا تھا، جھوٹی سچی ہزاروں گپ شپ اڑا کرتی تھیں، مگر مولوی صاحب اپنے معمولی کام بدستور انجام فرماتے تھے۔" ص۱۸۱

یہ اور اس قسم کی بیسیوں شہادتیں جن کا ذکر اپنے اپنے محل پر انشاء اللہ تعالیٰ اس کتاب میں بھی کیا جائیگا، ان کو دیکھتے ہوئے "جذباتیت" یا "مغلوب الحالی" کی اس کیفیت کے انتساب کی آپ کی طرف کوئی جرأت نہیں کرسکتا، جس میں اعصابی ضعف کے مریضوں کو عموماً مبتلا پایا گیا ہے، ہوتے تو ہیں یہ بے چارے جسمانی اور مادی بیماری کے شکار، لیکن اس بیماری کے آثار کا ظہور وقتی محرکات کے زیر اثر ان پر جب ہوتا ہے، تو ان کی مذبوحی حرکات کو روحانی کیفیات کا ثمرہ قرار دیا جاتا ہے، جیساکہ میں نے عرض کیا سیدنا الامام الکبیر کے متعلق تو اس کا اندیشہ بھی بد اندیشوں کے سوا کسی متوازن فکر و عقل رکھنے والے کو نہیں ہوسکتا۔

لیکن جسمانی نظام اور اعصابی استحکام کی گواہیاں دینے والوں ہی سے اسی کے ساتھ اس قسم کے مشاہدات کی روایتیں بھی جب ہم سنتے ہیں، مثلاً وہی مولانا منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی مرحوم جنھوں نے بحر عرب کے طوفانی تلاطم میں سیدنا الامام الکبیر کو اپنے حال پر قائم و دائم پایا تھا وہی یہ لکھتے ہوئے کہ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت والا کے قلبی تعلق کا کیا حال تھا راوی ہیں کہ

"اسم گرامی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا سن کر لرزہ بدن پر پڑجاتا تھا اور چہرہ کا رنگ متغیر ہوجاتا تھا، اور ایک عجیب حالت نمایاں ہوتی تھی، جو معرض بیان میں نہیں آسکتی۔" ص۱۸۱

اور اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ "قالب" آپ کا خواہ جتنا بھی آہنی ہو، لیکن اسی آہنی قالب میں قلب مبارک کا جو آبگینہ محفوظ تھا، وہ کتنا رقیق و لطیف، کتنا نازک و حساس تھا، ایسی صورت میں اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ان زبوں حالیوں سے آپ کو جتنا بھی متاثر تسلیم کیا جائے یقیناً اسکی گنجائش ہے، لیکن صرف ان ہی "سیاسی عوامل و مؤثرات" کے ساتھ آپ کے ان حالات کو وابستہ

کردیا، جن کا ذکر مصنف امام نے فرمایا ہے، میرے نزدیک نہ صرف واقعات ہی سے چشم پوشی کا نتیجہ ہوسکتا ہے، بلکہ جہاں تک خاکسار کا ناقص خیال ہے اس قسم کا دعویٰ شاید حضرت والا کے شایانِ شان بھی نہیں ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اور کسی کے متعلق سوچا جائے یا نہ سوچا جائے، لیکن محمدی اداؤں پر مرمٹنا اور نبوت کبریٰ ہی کے نقوش پا کی خاک بن کر فنا ہو جانا یہی لے دے کر جسکی زندگی کا سارا سرمایہ اور کل پونجی ہو، حیرت ہوتی ہے کہ لوگ "حراء" سے پہلے اس کو "بدر" میں کیوں ڈھونڈتے ہیں، بلاشبہ وہ "بدر" کے میدان میں بھی اترا، اس کو "احد" کے تجربات سے بھی گذرنا پڑا، آئندہ ان واقعات کی تفصیل آپ کے سامنے بھی آئیگی، لیکن "بدر" و "احد" کے قصوں ہیں آپ ہی بتائیں کہ ان حالات کو کیسے بھلا دیا جائے جو عشق و سرمستی کے اسی سلسلے ہیں اسی کے ساتھ اس وقت پیش آئے، جب "بدر" و "احد" سے پہلے حرائی تجربات و مشاہدات سے اس کو گذرنا پڑا تھا، یا کہیے تو کہہ سکتے ہیں کہ اپنی اجتبائی شان وخصوصیت کی بنیاد پر حراء کے ان تجربات و مشاہدات سے اس کو گذارا گیا تھا۔

بلاشبہ آج یہ دیکھا جارہا ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ کب تک دکھانے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا کہ دماغوں کو جگا دینے کے بعد جاگنے والوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جو سوئے ہوئے ہیں ان کے جگانے کا کام شروع کردیں، لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ دماغ کی بیداری کو جسد کے اس قدوسی مضغہ یا "لاہوتی جوہر" کی بیداری سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس کے ساتھ سارے جسدی نظام کی بیداری وابستہ ہے "اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ" کے الفاظ میں نبوت کی زبان ہیں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور یہ اتنی کھلی ہوئی بات ہے کہ جس کا جی چاہے ایسی ہستیوں کو پا سکتا ہے جن کے دماغ بیدار اور حد سے زیادہ بیدار ہیں، لیکن عین اسی دماغی بیداری کے ساتھ یہ دیکھا جاتا ہے کہ قلب یا دل ان کا سینے میں سویا ہوا ہے، بلکہ دیکھنے والوں کو بسا اوقات محسوس ہوتا ہے کہ مرا ہوا ہے، سلجھنے کے ساتھ ساتھ الجھنے اور الجھ پڑنے کے حوادث کا عام تجربہ عصر جدید کے اصلاحی اقدامات و مساعی ہیں آئے دن جو ہوتا رہتا ہے، دنیا کو یہ کیسے سمجھایا جائے کہ یہ سارے خمیازے اسی غفلت اور لاپروائی کے ہیں جو عام طور پر "قلب" اور "دل"

کی جانب سے اس زمانہ میں اختیار کی گئی ہے، بیدار دماغ صرف دماغوں کو بیدار کر سکتا ہے، لیکن جن کے دل خود سوئے ہوں، آپ غلط امید باندھ رہے ہیں کہ وہی دلوں کو جگانے میں کامیاب ہوں گے، جس کے بگڑ جانے سے انسانیت کے طبیب اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا جب یہ فیصلہ ہو کہ سب کچھ بگڑ جاتا ہے تو اس کی سدھار سے بے پروا ہو کر سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ بجائے بگاڑ کے سدھار کی توقع کیوں کرتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ دیوبند یا دیوبندی تحریک کی امامت و قیادت کے لئے جس ذات گرامی کا انتخاب قدرت کی طرف سے ہوا تھا، بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت کی دوسری عام تحریکوں کے مقابلہ میں اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی کہ عمل کے میدان میں اترنے یا اتارنے سے پہلے جہاں دماغی بیداری کے اسباب اس کے لئے فراہم کئے گئے وہیں قدرت ہی کی طرف سے یہ بات تھی کہ دل کے جگانے کی جو قدرتی راہیں ہیں، ان کی اہمیت اس پر شروع ہی میں واضح کر دی گئی تھی۔

واقعہ یہ ہے اپنے تمہیدی بیان میں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں کہ اس زمانہ کی غیر معمولی بیدار دل ہستی سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت میں حاضری اور حاضری ہی نہیں بلکہ محبت و شفقت خاص کی سعادت اندوزی کا موقعہ سیدنا الامام الکبیر کو اسی زمانہ میں میسر آ چکا تھا جب طفولیت کی منزلوں سے آپ کی زندگی نانوتہ میں گذر رہی تھی، نانوتہ سے جب دماغی بیداری کے لئے آپ دلی کی تعلیم گاہ مملوکی میں شریک ہوئے، تو واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحب قبلہ کے ساتھ اس زمانہ میں بھی آپ کے تعلقات قائم تھے مولانا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ

"یگانگت اور ارتباط قلبی کے باعث، حضرت مولانا قاسم العلوم نے وطن سے دہلی آتے جاتے، تھانہ بھون کی حاضری اور اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کی زیارت کو معمول بنا رکھا تھا۔"

آمدورفت کے سلسلہ نیاز اندوزیوں کے ان مواقع کے سوا مولوی عاشق الٰہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

"اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ) بھی جب دہلی تشریف لاتے، تو حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے پاس قیام فرماتے، اور استاذ الکل (مولانا مملوک العلی) کے رشید شاگرد (سیدنا الامام الکبیر) بھی زیارت سے بہرہ یاب ہوتے"

خلاصہ یہی ہے کہ دلی سے نانوتہ، نانوتہ سے دلی جاتے ہوئے بھی حضرت حاجی صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضری کے مسلسل مواقع آپ کو ملتے رہے، اور یوں بھی جب کبھی حاجی صاحب دلی تشریف لاتے تو قدرتی تائیدہی کی اس کو ایک شکل سمجھنا چاہئے کہ دہلی جہاں عرض کرچکا ہوں، شاہی خانوادے کے بھی بعض ارکان تک حاجی صاحب سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے اسی دلی میں بجائے کسی اور جگہ فروکش ہونے کے اسی گھر کو قیام گاہ بنانے کا شرف بخشا جاتا تھا، جہاں سیدنا الامام الکبیر کو حاجی صاحب کے ساتھ تعلقات کے تروتازہ کرنے کا موقعہ بآسانی مل جاتا تھا۔

اور گو باضابطہ حلقہ بگوشی کا باطنی رشتہ حاجی صاحب قبلہ کے ساتھ آپ کا قائم نہیں ہوا تھا، اور ساری توجہ بہ ظاہر ان ہی علوم کی طرف مبذول تھی، جن سے فکر و نظر کی قوت کے چمکانے اور بڑھانے میں مدد ملتی ہے، لیکن مجھے تو اس میں بھی آپ کی اجتبائی شان ہی کی شعاعیں نظر آتی ہیں کہ مدرسہ کی طالب العلمی کے ان دنوں میں جب ملائیت کا نشہ طالب العلموں پر چڑھایا جاتا ہے، تجربہ اور مشاہدہ گواہ ہے کہ نشہ کی اس حالت میں عموماً علمی اور فکری کاروبار کے سوا طلبہ کے دلوں میں کسی دوسری چیز کی عظمت و اہمیت مشکل ہی سے باقی رہتی ہے، خام عمری کہئے یا خام عقلی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ان کی کتابوں میں ہے، اور مدرسہ میں جو کچھ ان کو پڑھایا جاتا ہے، وہی ان کے نزدیک اس زمانہ میں سب کچھ ہوتا ہے، خصوصاً عقلی علوم کے ساتھ ساتھ دینی کتابوں کے پڑھنے والوں میں یہ خیال اگر قائم ہوجائے کہ سارا دین یہی ہے، تو جن حالات سے

ملامتیت کی یہ زندگی گذرتی ہے' ان کے لحاظ سے اس پر تعجب بھی نہ کرنا چاہئے' جو کچھ ائمہ نے سمجھا ہے صحابہ سے منقول ہے پیغمبر نے فرمایا ہے اور خالق کائنات نے جن باتوں سے بذریعہ وحی آگاہی بخشی ہے' جو ان ساری چیزوں کو پڑھ رہا ہو' آپ خود خیال کیجئے کہ دین کے لئے مزید کسی اور چیز کی ضرورت کا احساس اس کے دل میں اگر باقی نہ رہے تو مدرسوں کے "بند گنبد" کی تعلیم کا اثر اور ہو ہی کیا سکتا ہے عموماً چونکنے والے چونکے بھی ہیں' تو اس "گنبد" سے باہر نکلنے کے بعد ہی چونکے ہیں' اور تو اور وقت کے قطب ارشاد' حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت والا کے ساتھ اسی ملوکی تعلیم گاہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے' خود ان ہی کے متعلق اسی موقعہ پر مولوی عاشق الٰہی نے اس مشہور دلچسپ لطیفہ کا ذکر کیا ہے کہ مولٰنا مملوک العلی سے مولانا گنگوہی اور سیدنا الامام الکبیر دین کی کوئی کتاب نہیں بلکہ منطق کے مشہور متن سلم العلوم کو پڑھ رہے تھے' اسی عرصے میں حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ مولٰنا مملوک العلی صاحب سے ملنے کے لئے تشریف فرما ہوئے' ابھی قریب بھی نہیں پہنچے تھے کہ مولٰنا مملوک العلی صاحب کی نظر حاجی صاحب پر پڑی' دیکھنے کے ساتھ ہی پڑھنے والے طلبہ کو خطاب کر کے مولانا مملوک العلی صاحب نے فرمایا' لو بھائی! کتاب اٹھاؤ' حاجی صاحب آرہے ہیں۔

مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ اس وقت مولٰنا گنگوہی نے صرف یہی نہیں کہ حاجی صاحب کو دیکھا نہیں تھا' بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرسری واقفیت بھی نہیں رکھتے تھے' استاذ کی زبانی عین ایسے وقت میں جس وقت جوش میں سبق ہو رہا تھا' یہ فقرہ کہ "بھائی کتاب اٹھاؤ" مولٰنا گنگوہی پر حد سے زیادہ گراں اور شاق گذرا' جس ہیئت کذائی کے ساتھ حاجی صاحب اس وقت آئے تھے' یعنی نیلی لنگی کندھے پر پڑی ہوئی تھی' نہ جبہ نہ خرقہ' نہ عمامہ' شاید اس صورت کذائی کا بھی تو اثر ہوگا کہ جھنجلا کر مولٰنا گنگوہی چپکے چپکے اپنے ساتھی سیدنا الامام الکبیر سے فرمانے لگے (مولوی عاشق الٰہی نے یہی الفاظ نقل کئے ہیں) کہ

"بھئی یہ اچھا حاجی آیا ہمارا سبق ہی گیا"۔

اس ذہنیت کی ٹھیک ٹھیک صحیح ترجمانی مولانا گنگوہی کے اس فقرے سے ہو رہی ہے، جو مدرسہ کی طالب العلمانہ زندگی پیدا کر دیتی ہے، یہ سچ ہے کہ اس وقت مولانا گنگوہی کی عمر سترہ اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہوگی، لیکن قابلیت کے لحاظ سے ترقی کر کے اس منزل تک وہ پہنچ چکے تھے جس میں سلم کے پیچیدہ مسائل کے سمجھنے کا استحقاق طالب العلم کو حاصل ہو جاتا ہے، مگر جس قسم کی زندگی اس وقت وہ گذار رہے تھے اس کا لازمی نہ سہی تاہم ایسا نتیجہ ضرور ہے جس کا مشاہدہ عربی مدارس کے طلبہ کی اکثریت میں آج بھی کیا جا سکتا ہے، اسی لئے اس پر مجھے تعجب نہ ہوا، ہاں حیرت کی بات وہ ہے جس کا ذکر اسی کے بعد مولوی عاشق الٰہی صاحب نے کیا ہے کہ مولانا گنگوہی جس وقت یہ فرما رہے تھے کہ "اچھا حاجی آیا ہمارا سبق ہی گیا" ٹھیک اسی وقت ان کے رفیق درس جو عمر میں حالانکہ ان سے چھوٹے تھے یعنی سیدنا الامام الکبیر مولانا گنگوہی سے فرما رہے تھے:

"بابا ایسا مت کہو یہ بزرگ ہیں، اور ایسے ایسے ہیں"

مولوی عاشق الٰہی نے غالباً براہ راست خود مولانا گنگوہی سے اس قصہ کو سنا تھا، یا سننے والوں سے نقل کیا ہے، بہرحال اس قصہ کا تذکرہ خود مولانا گنگوہی فرمایا کرتے تھے اور آخر میں فرماتے کہ

"ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہمیں مونڈیں گے"

خیال کرنے کی بات ہے، اپنے عہد میں "قلوب" کا جو طبیب اعظم قرار دیا گیا اور دیدۂ باطن نے "قطب ارشاد" کی لاہوتی بلندیوں پر جس کے جھنڈے کو لہراتا ہوا پایا، اپنی طالب العلمی کے دنوں میں خود ان ہی کا اعتراف ہے کہ اس راہ کے راہ بر سے وہ بے خبر تھے۔ "اجنبائیت" کے سوا آخر اس کی توجیہ اور کیا کی جائیگی کہ ان ہی کے دوسرے رفیق ٹھیک طالب العلمی کی اسی زندگی میں یہی نہیں کہ خود ہی اس سے باخبر تھے، بلکہ دوسروں کو بھی اس کی خبر دے رہے تھے۔ اس وقت "ایسا نہ کہو" کا جو مشورہ دیا گیا اس سے تو شاید مخبری کی ابتداء ہوئی، ورنہ جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس اللہ سرہ سے چونکہ خلوت وجلوت کی شرکت تھی"

اس لئے ان ہی کا بیان ہے کہ مولانا محمد قاسم اور مولانا گنگوہی کے درمیان حضرت حاجی صاحب قبلہ کے متعلق

"خصوصیت کا ذکر ہوتا، بلکہ اس کی کوشش (مولانا محمد قاسم کی طرف سے) تھی کہ حضرت مولانا (گنگوہی) بھی اس مقدس ہاتھ پر بیعت ہوں" صا۴

اور یہ مخبری کیا صرف ایک مولانا گنگوہی کی ذات تک محدود تھی، مولانا عاشق الٰہی کی روایت اور شہادت ہے کہ

"حضرت مولٰنا قاسم العلوم اپنے ہم جماعت طلبہ میں اعلیٰ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات علمیہ وعملیہ کا تذکرہ فرماتے اور خوارق وکرامات کے اظہار وبیان سے آستانہ امدادیہ کی طرف ترغیب دیتے تھے"

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ خاص تعلقات کی بنیاد پر کسی ایک دوسے نہیں بلکہ جو بھی آپ کے ساتھ دینی تعلیم اور ان فنون کے حاصل کرنے میں مشغول تھے، جن سے دماغوں کے جگانے کا کام اس زمانہ میں لیا جاتا تھا، عموماً اپنے علم کے ان ساتھیوں کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کا طالب العلمی ہی کے زمانے سے نوعمری ہی کے دنوں میں یہ نقطۂ نظر تھا کہ قلبی بیداری کے بغیر صرف دماغی جاگ اور عقلی ارتقا ان نتائج کے پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جن کی جائز توقع دینی وملی خدمات میں مشغول ہونے والوں سے کی جاسکتی ہے، آپ کا یہ فیصلہ جو شاید آپ کی سرشت کا جبلی اقتضاء تھا، ممکن ہے کہ واضح شعور اس نقطۂ نظر کا نوعمری کے ان دنوں میں نمایاں نہ ہوا ہو، اور اپنے رفقاء درس کو آستانہ امدادیہ کے ساتھ وابستگی پر جو آپ ابھارا کرتے تھے خود آپ کو اس کا اندازہ نہ ہو کہ اس کی ہدایت آپ کیوں فرما رہے ہیں لیکن تھا یہ آپ کے اسی فطری رجحان کا زور، کم از کم میرا ذاتی خیال تو یہی ہے

بلکہ غور کیجئے تو حضرت والا کی یہ اجتبائی نظرت قرآن حکیم کے اس تربیتی اصول کی غیر شعوری طور پر اقتداء کر رہی تھی جس میں تعلیم کے ساتھ تزکیہ کو لازم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چارگانہ فرائض میں شمار کیا گیا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ایک آیت میں تو تزکیہ کو تعلیم سے مقدم لایا گیا ہے اور ایک جگہ مؤخر جس سے اس

مقصود کی طرف راہنمائی کرنی مقصود ہے کہ تعلیم سے مقدم تزکیہ اس طرح علمی استعداد پیدا کرائے جانیکا ذریعہ ہے جس سے علم میں استقامت پیدا ہو جائے ذہن میں کسی قسم کی کجی اور زیغ باقی نہ رہے اور جس سے فہم میں مطلوبہ استواری اور ہمواری جڑ پکڑ جائے۔ اور تعلیم سے مؤخر تزکیہ قرب حق کی استعداد پیدا کرائے جانے کا ذریعہ ہے تاکہ راہ سلوک آسان ہو جائے، اس میں کجراہی راہ نہ پائے، اور اخلاق انسانی اخلاق ربانی سے متخلق ہو جائیں۔ حاصل یہ کہ مقدم تزکیہ قوت علمیہ کی تکمیل کا ضامن ہے اور مؤخر تزکیہ قوۃ عملیہ کی تکمیل کا ضمانت دار ہے اور انہی دو قوتوں پر انسانی سیادۃ کا مدار ہے، پس حضرت والا اپنی اجتبائی شان سے ابتداء عمر ہی میں دونوں قسم کے تزکیوں کی طرف فطری رجحان رکھتے تھے۔ آپ ایک طرف علمی قوۃ بڑھانے میں اساتذہ کے واسطہ سے تزکیۂ فہم کے لئے زانوئے ادب تہ کئے ہوئے تھے، اور ایک طرف اخلاقی قوۃ کی قدر و قیمت کے پیش نظر اس مربی اخلاق ہستی کی جو چند دن بعد آپ کے اخلاق کی مربی بننے والی تھی توقیر کرنے اور اپنے رفقاء درس سے توقیر کرانے میں پیش پیش تھے۔ محمد طیب)

سچ پوچھئے تو اسی کے اندر چاہا جائے تو حضرت والا کی زندگی کے ایک خاص پہلو کے راز کو بھی ڈھونڈھا اور پایا جا سکتا ہے؛

مقصد یہ ہے کہ گو کلی دعویٰ تو مشکل ہے، لیکن عام طور پر ان بزرگوں کے متعلق جو گفتار اور قال کی راہوں کو طے کرنے کے بعد رقت و حال کی منزلوں میں داخل ہوئے ہیں، صاف لفظوں میں یوں کہئے کہ ملّا بننے کے بعد جن بزرگوں کو فقیر بنتے دیکھا گیا ہے، یعنی دماغ کے بعد دل کو جگانے میں جو کامیاب ہوئے ہیں ان کی زندگی کی یہ گردشی حرکت عموماً کسی دلچسپ، غیر معمولی انقلابی حادثے کی صورت میں وقوع پذیر ہوئی ہے، کافی کشمکش، رستا خیز، شکست و ریخت کے بعد ہی دیکھا گیا ہے کہ ڈالنے والوں نے اس سلسلہ میں اپنی سپر ڈالی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جو جتنے بڑے تھے ان کی زندگی کا یہ انقلابی حادثہ بھی پایا گیا ہے کہ اسی قدر بڑا تھا، دل دوز اور دلکش پیرایوں میں چڑھنے والوں کے گرنے کی ان دردناک داستانوں کو بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے، اور آج بھی پچھلوں کی محفلوں میں اگلوں کے یہ قصے سرمایۂ نشاط اور پیغام حیات بنے ہوئے ہیں، حال و قال والوں کی باہمی آویزش کی یہ سرگذشت آتی

دراز و طویل ہے کہ ایک مستقل کتاب ہی اس سے تیار ہو سکتی ہے،

دور کیوں جائیے خود ہمارے سیدنا الامام الکبیر ہی کے رفیق الاولی والآخرہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو صورت پیش آئی ہے اس کے دیکھنے والے نہیں، تو دیکھنے والوں سے سننے والے تو شاید آج بھی موجود ہوں گے، وہی حضرت گنگوہی جن کے مقابلہ میں مخالفتوں کا طوفان عظیم سرزمین ہند میں جب بلند ہوا، ملک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بدانديشیوں کی آگ بھڑکانے والوں نے بھڑکا رکھی تھی، ثابت[۱] کرنے والے آپ کی تحریروں اور تقریروں سے جو جی میں آرہا تھا ثابت کرنے میں اپنے سارے مولویانہ کرتبوں کو خرچ کر رہے تھے، کتابوں کا انبار لگا دیا گیا تھا، تحقیر و اہانت، بلکہ سب و شتم تک کا کوئی دقیقہ ان کتابوں میں اٹھا نہ رکھا گیا تھا، مگر حضرت والا کو خود تو توجہ اس کی طرف کیا ہوتی مولانا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ آپ کے عقیدت مندوں نے چاہا کہ ان تحریروں کے مقابلہ میں وہ بھی کچھ لکھیں مولوی سراج احمد صاحب نے آپ کے رجحان طبع کا خیال کر کے ایک دفعہ کہا کہ صاف لفظوں میں آپ اجازت نہیں دیتے تو کچھ ایسے کلمات ہی فرما دیجئے جن سے اجازت کا اشارہ ہم لوگوں کو مل جائے، الغرض اصرار پر لوگ اصرار کر رہے تھے کہ جواب میں کچھ لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے، مگر سب کے جواب میں مولانا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ حضرت گنگوہی فرمایا کرتے کہ

"میاں کیا دھرا ہے، ان قصوں میں ان کی تحریر کا جواب لکھنے سے کوئی نفع نہیں تضیع اوقات ہے" (ص۶۸ تذکرۃ الرشید ج ۲)

ایک حال حضرت امام ربانی کا یہ تھا، جس وقت قطب ارشاد کے باطنی منصب پر آپ سرفراز تھے

[۱] ایک مطلب تو کسی عبارت یا فقرے کا وہ ہوتا ہی جو واقعی اسکے بولنے والے یا لکھنے والے کی مراد ہوتی ہے، غریب عوام الناس کے نزدیک تو مطلب اور معنے کا ترجمہ یہی ہے لیکن "ملائیت" یا "مولویت" کے دائرہ میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پہلے ایک مقصد طے کر لیا جائے اور جس عبارت یا فقرے سے چاہا جاتا ہے اسی خود تراشیدہ مطلب کو کھینچکر دکھا دیا جاتا ہے، بولنے والا اور لکھنے والا حیران ہو جاتا ہے، اس غریب کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی، یہ "مولویانہ بازی گری" کا ایک طلسمی گر ہے، اسی کرتب کا ناچ ثابت کرتا ہے کہ حضرت گنگوہی کے ساتھ بھی چال چلی گئی اور آپ کی بعض عبارتوں اور فقروں سے ایسے عجیب و غریب مطالب نکال نکال کر دکھائے گئے کہ شاید کوئی کٹر کافر بھی کسی ادنیٰ درجہ کے مسلمان کی طرف بھی اسکے انتساب کو عقلاً جائز نہیں قرار دے سکتا مگر اسلام و ایمان کے مدعیوں کی سینہ زوریاں مصر تھیں کہ العیاذ باللہ مولانا گنگوہی کا یہی عقیدہ ہے ۱۲

مگر آخر میں جن کا حال یہ تھا، وہی مولانا گنگوہی جب مدرسہ دہلی سے عالم بن کر شروع شروع میں اپنے وطن مالوف گنگوہ تشریف لائے تھے، تو حد سے زیادہ ایک جزئی معمولی مسئلہ میں تھانہ بھون کے ایک عالم مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف پیدا ہو گیا، دونوں طرف سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا، تفصیلی قصہ تو اس کا تذکرۃ الرشید میں پڑھئے؛ میں صرف یہ سنانا چاہتا ہوں کہ مخالفتوں کا طوفان بھی جس کے ارادے میں جنبش پیدا نہیں کر سکتا تھا، مولویانہ مناظرے اور مباحثہ میں صرف اپنے ہی لئے نہیں دوسروں کیلئے بھی تضیع اوقات کے سوا جس کے آگے اور کچھ باقی نہ رہا تھا، پہاڑ بھی اس سلسلہ میں ان کے سامنے آکر رائی بن جاتا تھا، ان ہی پر ایک زمانہ میں یہ کیفیت بھی طاری تھی، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الرشید میں تفصیلی تذکرہ اس کا کیا ہے، حاصل یہ ہے کہ دلی کے مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو کر مولانا گنگوہی جب وطن واپس ہوئے، اتفاقاً ایک معمولی مسئلہ میں تھانہ بھون کے مشہور عالم مولانا شیخ محمد تھانوی سے حضرت والا کا اختلاف ہو گیا، پھر کیا تھا، طرفین سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا، مولانا شیخ محمد صاحب کو یہ بات حد سے زیادہ ناگوار گذر رہی تھی کہ ایک تازہ وارد، نوجوان مجھ پر نکتہ چینی کر رہا ہے، بات بڑھتی ہی چلی گئی، نوبت بایں جا رسید کہ تحریر سے کام دیکھا کہ نہیں چل رہا ہے تو تھانے کے بوڑھے عالم کو چت کرنے کے لئے گنگوہ کا نوجوان عالم براہ راست تھانہ بھون پہنچ گیا، تھانہ کا یہ سفر کس شان کے ساتھ کیا گیا تھا، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ اچانک گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر روانہ ہو گئے، سواری کا بھی انتظام نہ کیا، پیادہ پا ہی چل پڑے، اور سیدھے تھانہ پہونچ گئے، جس وقت وہاں پہونچے تھے ظہر کا وقت تھا نماز کے خیال سے تھانہ بھون کی اسی تاریخی مسجد میں جس میں ہجرت سے پہلے آن کے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ قیام فرماتے تھے، تشریف لے گئے، نماز ہو چکی تھی، حاجی صاحب تلاوت میں مشغول تھے، متعدد بار حاجی صاحب سے ملاقات ہو چکی تھی، سامنے دیکھ کر سلام کے لئے حاضر ہوئے دیکھ کر حاجی صاحب نے پوچھا یہ آپ تھانہ بھون کہاں؟ علم کے جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ جواب میں کہا کہ مولانا شیخ محمد صاحب سے زبانی مناظرہ کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، اب یہ تقدیری بات

تھی، کہ آئے تھے آگ لینے کے لئے، اپنی علمی فضیلت کا سکہ جمانے کے لئے کہ اچانک حاجی صاحب قبلہ کی زبان مبارک سے یہ سن کر کہ

"ہاہا ایسا ارادہ نہ کرنا میاں! وہ ہمارے بزرگ ہیں، بڑے ہیں" (ص۳۴ ج ۱)

ایسا معلوم ہوا کہ نہ علم کا ادعا باقی تھا، اور نہ مناظرے کا ارادہ، ایک فقرے نے سب کو جلا کر بھسم کر دیا، آئے تھے کہ تھانہ بھون کے شیخ کو چت کریں گے، مگر دیکھا گیا کہ اسی تھانہ کے ایک دوسرے شیخ کے قدموں پر گرے ہوئے ہیں، اسی کے بعد مفت کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے لیکن شاید آپ کی مولویت ہی کا اقتضاء تھا کہ صاف صاف لفظوں میں اپنے پیر حاجی صاحب سے مولٰنا گنگوہی نے فرما دیا تھا کہ

"مجھ سے ذکر و شغل اور محنت و مجاہدہ کچھ نہیں ہو سکتا اور نہ رات کو اٹھایا جائے" ص۳۴ ج ۱

مگر ہوا کیا؟ اس سوال کا جواب خود ہی دیا کرتے کہ

"پھر تو مرمٹا" (ص۳۴)

بہرحال جو صورت حال حضرت مولٰنا گنگوہی کے ساتھ پیش آئی ہے، جہاں تک فقیر کی محدود معلومات ہیں عام طور پر دوسرے علماء کو بھی اس راہ میں قدم رکھتے ہوئے کچھ اسی قسم کے قصے پیش آئے ہیں، ابتداء میں وہ بھڑکے ہیں، بدکے ہیں، ہچکچائے اور کسمسائے ہیں، گرے بھی ہیں، تو کافی کشمکش کے بعد گرے ہیں، اسی لئے ان کی زندگی کا یہ "مرحلہ" دلچسپ ہو گیا ہے، عموماً بعد کو خود بھی اور دوسرے بھی اس کا ذکر کرتے رہے ہیں۔

لیکن خلاف دستور سیدنا الامام الکبیر بھی حالانکہ مدرسہ ہی کی راہ سے خانقاہ کی طرف یا ظاہر سے گذرنے کے بعد باطن کی طرف آئے تھے، لیکن اتنی سہولت اور خاموشی کے ساتھ آئے کہ نہ اُس زمانہ میں کسی کو یہ محسوس ہوا کہ کوئی انقلابی قدم آپ نے اٹھایا ہے، اور نہ بعد والوں کو اس کی طرف توجہ ہوئی، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کب مرید ہوئے کہاں مرید ہوئے، کس طرح مرید ہوئے، کن حالات اور واقعات کے بعد مرید ہوئے، ان میں سے کسی ایک سوال کو

بھی آپ کے حالات کے بیان کرنے والوں نے نہیں چھیڑا ہے،
سوانح مخطوطہ میں صرف یہ لکھ کر کہ

"علم باطنی کی تحصیل حضرت فخر المشائخ مرکز خواص و عوام منبع برکات قدسیہ، مظہر فیوضات مرضیہ، جناب حاجی امداد اللہ فاروقی تھانوی سلمہ اللہ تعالیٰ سے فرمائی" ص۹

سوانح نگار صاحب آگے بڑھ گئے، خود ہمارے مصنف امام نے بھی اس کا تذکرہ کرکے کہ ان کے والد مرحوم مولنا مملوک العلی دلّی سے نانوتہ وطن آتے جاتے تھانہ بھون میں حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی قیام فرمایا کرتے تھے، صرف ان الفاظ پر قناعت کی ہے کہ

"غرضکہ یہ آنا جانا اور ملاقاتیں ان صاحبوں کی خدمت میں حصول نیاز کا سبب ظاہراً ہوئیں، ورنہ جو لکھا تھا وہ ہر طرح ہونا تھا" ص۳۲

اور سچ تو یہ ہے کہ مولوی اگر فقیری اختیار کرے، تو یہ واقعہ مستحق ہے کہ اس کا چرچا کیا جائے، اور اگر فقیر نے فقیری اختیار کی تو ظاہر ہے کہ اس کا بھلا کوئی کیا ذکر کرے، چڑھنے والوں کے گرنے کو لوگ محسوس کرسکتے ہیں، مگر جو بیچارا خود ہی گرا ہوا ہو وہ گرے گا کیا اور کسی کی توجہ اس کے گرنے پر آخر کیوں ہو، حد تو یہ ہے کہ اس سلسلہ میں تاریخ تک معلوم نہیں، صرف مولوی عاشق الٰہی صاحب نے اپنی کتاب تذکرۃ الرشید میں اور وہ بھی حاشیہ میں اتنی بات لکھی ہے، حضرت مولنا گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ

"مولوی محمد قاسم نے اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کی تعریفیں کر کر کے ہمیں مرید کرایا، اور بعد میں اعلیٰ حضرت سے اصرار و کوشش کرکے مولوی محمد قاسم صاحب کو ہم نے مرید بنوایا" ص$\frac{۴۶}{۱}$ تذکرۃ الرشید

اور اسی سے مولوی عاشق الٰہی صاحب نے نتیجہ نکالا ہے کہ حاجی صاحب سے پہلے مولنا گنگوہی مرید ہوئے اور آپ کے بعد مولنا محمد قاسم صاحب حاجی صاحب کے باضابطہ حلقہ ارادت و بیعت میں داخل ہوئے اسی سلسلے میں مولنا عاشق الٰہی صاحب نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ

"مولنا النانوتوی کو اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کے ہاتھ پر بیعت کرانے کی کوشش کا ثواب بھی حضرت گنگوہی کو حاصل ہوا" (ص$\frac{۴۶}{۱}$ حاشیہ تذکرۃ الرشید)

یہ ایک روایت ہے، اور ثقہ قابل اعتبار راوی کی روایت ہے، بعد کو بھی کسی نے مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی اس روایت پر چونکہ تنقید نہیں کی ہے اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ واقعہ کچھ اسی شکل میں پیش آیا' گویا "چشمہ" کا سراغ جس نے لگایا تھا' باوجود پیاس کے اس وقت تک اپنے تلاش کئے ہوئے پانی کو اس نے استعمال کرنا مناسب نہ خیال کیا' جب تک کہ دوست کو نہ دیکھ لیا کہ وہ سیراب ہو چکا ہے،

اس موقعہ پر ان صحابیوں کا قصہ قدرۃً یاد آجاتا ہے، جو زخمی ہو کر پیاس کے مارے تڑپ رہے تھے اور پانی پلانے والا ان میں سے جس کے آگے پانی کا پیالہ لیکر پہنچتا تو وہ دوسروں کی طرف اشارہ کر دیتا کہ پہلے ان کو پلالو تب مجھے پلانا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا مرید ہی بن کر جو پیدا ہوا ہو، خود حضرت حاجی صاحب کا بیان جس کے متعلق حد تواتر تک پہنچا ہوا ہو، قصص الاکابر میں حضرت تھانوی کی طرف بھی اس بیان کی روایت منسوب کی گئی ہے، فرمایا کرتے تھے؛

"حضرت حاجی صاحب یوں فرمایا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کو جو اصطلاحی عالم نہیں ہوتے، ایک لسان (زبان) عطا کرتے ہیں' چنانچہ حضرت شمس تبریزی کو مولٰنا رومی لسان عطا ہوئے تھے جنھوں نے شمس تبریزی کے علوم کو کھول کھول کر بیان فرما دیا' اسی طرح مجھکو مولوی محمد قاسم لسان عطا ہوئے ہیں"

(ص۔ الہادی ماہ ذی الحجہ ۵۶ھ)

حضرت قبلہ حاجی صاحب کی اس خود اعترافی شہادت کے بعد بھی کیا اسکی ضرورت رہتی ہے کہ مزید اس دعویٰ کے ثبوت میں کسی اور چیز کا اضافہ کیا جائے، گذشتہ اوراق میں کسی موقعہ پر عرض کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کے ایام طفولیت میں نانوتہ پہونچ کر حضرت حاجی صاحب اپنی عنایات خصوصی کا حضرت والا کے ساتھ اظہار کرتے ہوئے، جب جلد بندی کا طریقہ آپ کو سکھا رہے تھے، آسمان اسی وقت دیکھ رہا تھا کہ کسی مرحوم امت کے

بکھرے ہوئے منتشر افراد کی شیرازہ بندی کا کام تاریخ کے کسی نازک دور میں اس بچے سے لیا جائیگا اسی تعبیر کا یہ خواب تھا، جو خواب میں نہیں بلکہ بیداری میں دکھایا جا رہا تھا،

اسی لئے یہ واقعہ کہ رسمی بیعت کا موقعہ سیدنا الامام الکبیر کو مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ملا، مولٰنا عاشق الٰہی کی اس روایت پر مجھے تعجب بھی نہ ہوا اور شاید اس پیش قدمی کے دوسرے وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی ہو جیسا کہ مولٰنا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ سیدنا الامام الکبیر سے خلوت و جلوت کی صحبتوں میں حاجی صاحب قبلہ کی تعریفیں بھی سنا کرتے تھے، اور مولٰنا ان کو حاجی صاحب سے بیعت کرنے پر آمادہ بھی فرمایا کرتے تھے، ملاقاتیں بھی ایک دفعہ نہیں متعدد بار مولٰنا گنگوہی کی حضرت حاجی صاحب سے ہو چکی تھیں، بعض کرامتوں کے مشاہدہ کا موقعہ بھی مل چکا تھا، لیکن بایں ہمہ بقول مولوی عاشق الٰہی

"الحق گو حضرت مولٰنا (گنگوہی) اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کی زیارت کر چکے تھے، مگر چونکہ شیخ الہند، حضرت حاجی شاہ عبد الغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت امام ربانی (مولٰنا گنگوہی) نے صحاح بھی پڑھی تھی، اور علم شریعت کا تکملہ کیا تھا، آپ کو حاضری کا بھی اس گھربار دربار میں زیادہ اتفاق ہوتا رہا، اس لئے آپ کا دل بیعت کے لئے بھی ادھر ہی جھکتا رہا اور یوں ہی راضی ہوتا تھا کہ طریقت میں بھی اسی شفیق استاذ کا دامن پکڑا جائے جس کے جامع بین الشریعت والطریقت ہوئے میں شبہہ نہیں" ص۴۲

یہ بھی انہیں کے الفاظ ہیں کہ

"خوارق عادات اور کشف و کرامات کے دیکھنے سننے سے حضرت مولٰنا (گنگوہی) کی عقیدت اور محبت اور ارادت اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) کے ساتھ بڑھتی گئی، مگر آپ کے متجسس قلب، اور مبصر و نقاد نظر نے فارغ التحصیل ہونے اور شریعت و علم دین کے تکملہ تک کوئی فیصلہ نہ کیا کہ کہاں جانا، اور کس کی غلامی اختیار کرنی چاہئے" ص۴۲ تذکرہ

خلاصہ یہ ہے کہ تقدیر ازلی تو بہرحال وہی تھی جو پیش آئی لیکن اس قسم کے بیانات سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ بیعت کے مسئلہ میں یکسوئی کی کیفیت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ میں زمانہ تک پیدا نہ ہوئی، حالانکہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کی زبان بنا کر قدرت نے جسے پیدا کیا تھا، اس کی رفاقت کے ساتھ ساتھ مولانا گنگوہی کی فطری صلاحیتوں کا اندازہ دیکھنے کے بعد حاجی صاحب نے جب بیعت کرلیا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نانوتوی کے ساتھ وہ بھی حاجی صاحب کے ان مریدوں میں شریک ہو چکے تھے جنھیں پیر ہی اپنی مراد بنا لیا کرتا ہے، مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ خود مولانا گنگوہی بعد کو بیان کیا کرتے تھے کہ سلم والے سبق کے قصہ میں پہلی دفعہ حاجی صاحب کی زیارت کا شرف مجھے حاصل ہوا، تو اس کے بعد

"ہم دونوں (مولانا نانوتوی و مولانا گنگوہی) کا حال دریافت فرمایا کرتے اور یوں کہا کرتے تھے کہ سارے طالب العلموں میں (مولانا مملوک العلی) کے وہ دو طالبعلم (مولانا گنگوہی و مولانا نانوتوی) ہوشیار معلوم ہوتے ہیں" ص۱۲ تذکرہ

دلچسپ قصہ اس سلسلہ کا یہ ہے کہ تقدیری نوشتہ کے ظہور کا وقت جب اتنا قریب ہوگیا یعنی بیعت سے دو تین دن پہلے جب مولانا شیخ محمد تھانوی سے مناظرہ کے ارادے سے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مولانا گنگوہی تھانہ تشریف لا کر حاجی صاحب سے ملے اور ان کے منع کرنے سے مناظرہ کا ارادہ ترک کردیا، اس کے بعد بیعت کا خیال آیا، یا شاید اس خیال کو بھی اپنے ساتھ لائے تھے، بہرحال کہنا یہ ہے کہ جب بیعت کا ارادہ حاجی صاحب کی خدمت میں ظاہر فرمایا تو (اب راز و نیاز کے دائرے کی یہ باتیں ہیں، آتش عشق کو تیز کرنے کے لئے عموماً ایسا کیا جاتا ہے گو بظاہر یہ بات ہونے والی ہی تھی) حاجی صاحب نے شروع میں انکار کرکے مولانا کو گونہ مایوس فرمادیا۔ اس کی خبر جب مولانا شیخ محمد صاحب کو ملی، تو سننے کی بات ہے کہ مولانا گنگوہی کو اس پر آمادہ کرنے لگے کہ میاں! لاؤ طریقت کا راستہ میں تمہیں طے کرادوں گا، مولانا کی کم سنی کا زمانہ تھا، جن سے مناظرہ کرنے آئے تھے، وہی ان کو اپنا مرید بنانا چاہتے تھے، بڑوں کی صحبت اٹھائے ہوئے مولانا شیخ محمد صاحب بھی

تھے، مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ کئی دن اسی کشمکش میں گذر گئے، ایک دن حاجی صاحب کے رفیق طریق حضرت حافظ ضامن صاحب شہید کے استفسار پر بلبلا کر فرمانے لگے کہ کیا کروں،

"جدھر دل کا میلان ہے (یعنی حاجی صاحب) وہ قبول نہیں کرتے اور دوسرے (مولانا شیخ محمد صاحب) اپنی طرف کھینچتے ہیں عجب قصہ[1] ہے" ص ۴۸

آخر حضرت شہید نے بظاہر سفارشی بننے کا فرض انجام دیا، اور جس پر اور جسکی تربیت و تعلیم پر مرشدنا مولانا گنگوہی کے لئے مقدر ہو چکا تھا، آخر اسی کی غلامی میں داخل ہوگئے۔ رحمۃ اللہ علیہم وطاب ثراہم،

بات ذرا طویل ہوگئی، لیکن دلچسپ تھی، اور اسی کے ساتھ مولانا عاشق الٰہی کی روایت سے ممکن ہے بعضوں کو حیرت ہوتی، اس لئے ان قصوں کو مختصراً دہرانا پڑا، ورنہ کہنا تو صرف یہ تھا کہ حضرت حاجی صاحب قبلہ اور ان کے وفادار خادم ہمارے سیدنا الامام الکبیر کے ابتدا ہی سے تعلقات کی نوعیت وہی تھی جو پیر و مرید کے درمیان ہوتی ہے،

خواہ ظاہری اور رسمی بیعت کی نوبت نہ آئی ہو، اسی کا نتیجہ ہے کہ اشارۃً کنایۃً کسی طرح سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حاجی صاحب کے علاوہ سیدنا الامام الکبیر نے اپنی پوری زندگی میں ظاہراً یا باطناً ایک لمحہ کے لئے بھی اس سلسلہ میں کسی اور کی طرف کبھی کسی زمانہ میں کسی قسم کی ہلکی سی بھی توجہ کی ہو، حالانکہ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی محدث و مہاجر رحمۃ اللہ علیہ جیسے مولانا گنگوہی کے استاذ حدیث تھے، گذر چکا کہ سیدنا الامام الکبیر کو بھی حدیث میں آپ ہی سے شرف تلمذ حاصل تھا، اور ان کے سوا بھی اس وقت تک دلی آخر اتنی اجڑی دلی تو نہ تھی، کہ وہ ادل کی ساری دکانیں اٹھ گئی ہوں، مگر مولانا تھانوی کی شہادت گذر چکی کہ سیدنا الامام الکبیر کو قدرت نے حاجی صاحب قبلہ کے لئے زبان ولسان بنا کر پیدا کیا تھا، یہ خود ان کے مرشد و

---

[1] اپنے جن ذہنی تاثرات کا اشارہ مولانا گنگوہی نے ان الفاظ سے کیا ہے مجھے تو اس میں بھی حضرت حاجی صاحب کے باطنی تصرف کی نشانیاں نظر آتی ہیں خیال کرنے کی بات ہے کہ جیسے جیت کر کے آئے تھے وہی آپکو پچھاڑنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے اور بجائے انکار و استنکاف کے بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ کچھ کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ہاہا ایسا نہ کرنا وہ تو بڑے پیر ہیں" حاجی صاحب کے ان الفاظ نے سب کچھ کو میٹ کر رکھ دیا جو گنگوہ سے آپ کے ساتھ آیا تھا اور مدرسہ کی تعلیم نے آپ کے اندر جسے کچھ دن کے لئے داخل کر دیا تھا ۱۲

شیخ کا بیان تھا، گویا وہ مفطور و مخلوق ہی ہوئے تھے، حاجی صاحب قبلہ کے مرید بن کر، ایسی صورت میں رسمی بیعت کا قصہ کچھ دنوں اگر ملتوی رہا تو اس پر تعجب کیوں کیجئے، بلکہ مولانا عاشق الٰہی صاحب کے بیان کا یہ جز، کہ مولانا گنگوہی کی کوشش سے یہ رسمی منزل بھی پوری ہوئی، اس سے تو میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ شاید "ظاہری بیعت" کی ضرورت ہی سیدنا الامام کے لئے فطری اور جبلی تعلقات و روابط کی بنیاد پر نہیں سمجھی جاتی تھی، لیکن مولانا گنگوہی نے اصرار فرمایا ہوگا کہ جب اکابر سلف سے دست بیعت کا طریقہ موروثی طور پر منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، تو اس رسم کو بھی آخر کیوں ترک کیا جائے، حضرت گنگوہی کی جس کوشش کا مولوی صاحب نے تذکرہ کیا ہے، کم از کم میرا ذہن تو اس مسئلہ میں اسی طرف جاتا ہے، والعلم عند اللہ

بہر حال رسمی بیعت یا ہاتھ پکڑنے کی یہ ظاہری رسم کب ادا ہوئی، صحیح تاریخ اس کی باوجود تلاش کے مجھے اب تک نہیں مل سکی، لے دے کر تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر مولوی عاشق الٰہی کی مذکورۂ بالا شہادت سے اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی کے مرید ہونے کے بعد سیدنا الامام الکبیر کو باضابطہ طریقہ سے حضرت قبلہ حاجی صاحب نے اپنے حلقہ بیعت و ارادت میں داخل فرمایا اور جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا، بظاہر مولوی عاشق الٰہی صاحب کی اس خبر کے مشتبہ ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، البتہ ایک چیز اس سلسلہ میں کچھ ضرور کھٹکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں پر ذکر کرنا چاہئے تھا گذر چکا کہ ہمارے مصنف امام نے وہاں پر تو سیدنا الامام الکبیر کی بیعت کا تذکرہ اجمالی الفاظ میں کیا ہے، لیکن اس موقعہ پر جہاں لکھا ہے کہ حضرت شاہ عبد الغنی مجددی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے دونوں صاحب (مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی) حدیث پڑھا کرتے تھے مصنف امام ہی کے قلم مبارک سے ایک فقرہ یہ بھی نکل پڑا ہے کہ

"اور اسی زمانہ میں دونوں صاحبوں نے جناب حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ، سے بیعت کی، اور سلوک شروع کیا" ص۲۵

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ طلب حدیث ہی کے زمانہ میں دونوں صاحبوں کو حاجی صاحب

رحمۃ اللہ علیہ سے باضابطہ بیعت ہی کا نہیں، بلکہ سلوک باطنی کی تربیت و تعلیم پانے کا شرف حاصل ہو چکا تھا، آگے پیچھے اس فقرے کے جو باتیں لکھی گئی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس وقت تک مولٰنا مملوک العلی دونوں حضرات کے استاذ فنون بھی زندہ تھے، مصنف امام کے اس بیان کو اور اس کے سابقہ ولاحقہ مضامین کو دیکھتے ہوئے دل میں بعض عجیب قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں خصوصاً مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کے متعلق مولوی عاشق الٰہی صاحب نے جن تفصیلات کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے جن سے سمجھ میں آتا ہے کہ عام علوم و فنون اور علم حدیث وغیرہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد گنگوہ میں آکر جب مولٰنا گنگوہی نے قیام اختیار فرمایا اور کچھ درس و تدریس نوشت و خواند کے مولویانہ کاروبار میں مشغول ہو چکے تھے، تب وہی مولانا شیخ محمد تھانوی کے مناظرہ کا قصہ پیش آیا اور مناظرے کے حیلہ سے تقدیر تھانہ بھون آپ کو حاجی صاحب کے قدموں تک پہونچا دیتی ہے،

مگر مصنف امام کے فحوی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب العلمی کا زمانہ دونوں بزرگوں کا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ حاجی صاحب سے دونوں مرید ہو گئے اور سلوک میں بھی لگ گئے، بظاہر ان دونوں روایتوں میں تطبیق آسان نہیں ہے، اور بجائے تطبیق کے ترجیح کا طریقہ اگر اختیار کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ہمارے مصنف امام کی روایت ہر لحاظ سے مولوی عاشق الٰہی صاحب کی روایت کے مقابلہ میں ترجیح کی زیادہ مستحق ہے، اگرچہ تذکرۃ الرشید کے دیباچہ میں مولوی عاشق الٰہی نے اسی کتاب کے سلسلہ میں جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"جو کچھ ہو سکا تھا اس کو دیوبند و سہارنپور و گنگوہ حاضر ہو کر اپنے حضرات کی خدمت میں پیش کرایا" صہ دیباچہ

نیز اسی کے ساتھ اس کا بھی اظہار کیا ہے کہ حضرت گنگوہی کے خلف رشید مولٰنا حکیم مسعود احمد صاحب مرحوم کی خدمت میں بھی یہ اوراق مدیر نے پیش کئے" اگر اس کا مطلب یہی ہے کہ ان کی کتاب ان بزرگوں کی نظر سے گذرنے کے بعد طبع ہوئی ہے تو تذکرۃ الرشید کی روایتوں میں بھی کافی قوت پیدا ہو جاتی ہے، علاوہ اس کے شائع ہونے کے بعد بھی جہانتک میں جانتا ہوں اس کتاب کے بیانات پر کسی سمت سے

تنقیدی صدا چونکہ نہیں اٹھی، اس لئے یہ بھی مشکل ہے کہ مولوی عاشق الٰہی صاحب کی تفصیلات میں شک اندازی کی جائے، پس مناسب یہی ہے کہ تطبیق کا طریقہ اختیار کرکے تاویل و توجیہ کی کوئی راہ نکالی جائے جس کی جہانتک میرا خیال ہے کافی گنجائش ہے، لیکن اس مسئلہ کا زیادہ تر تعلق حضرت مولنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعہ بیعت سے ہے، نیز غیر ضروری طوالت کا بھی خوف ہے، اس لئے تاویل و توجیہ کے اس کام کو پڑھنے والوں کے ذاتی مذاق کے سپرد کرکے جو کچھ مجھے یہاں عرض کرنا ہے، اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں،

کہنا یہ ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خواہ جو صورت بھی پیش آئی ہو، لیکن اپنے مصنف امام کی مذکورہ روایت اور اس کے سابقہ ولاحقہ فقروں کی روشنی میں بہر حال اتنی بات تو ماننی ہی پڑتی کہ مولنا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں کم ازکم سیدنا الامام الکبیر ضرور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صرف حلقہ ارادت ہی میں شریک نہیں ہو چکے تھے، بلکہ مصنف امام کے الفاظ کا اقتضا یہی ہے کہ باطنی سیر و سلوک کے مشاغل میں بھی حاجی صاحب قبلہ نے آپ کو لگا دیا تھا،

بلکہ سیدنا الامام الکبیر کے متعلق غالباً کسی موقعہ پر یہ بات جو شاید گذر بھی چکی ہے اور عام طور پر مشہور بھی ہے کہ ذکر و شغل کی تعلیم شروع شروع میں حاجی صاحب قبلہ سے پانے کے بعد جیسے دوسرے لوگ حاجی صاحب کی خدمت میں ذکر و شغل کے آثار کا تذکرہ کیا کرتے تھے، سیدنا الامام الکبیر نے چند دنوں تک کسی قسم کی کوئی بات اس سلسلہ میں اپنے مرشد کے آگے بیان نہیں کی، اور حاجی صاحب کے دریافت فرمانے پر کہ "آپ کچھ نہیں کہتے" مولنا تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ جواب میں حضرت نانوتوی آب دیدہ ہو کر حاجی صاحب سے عرض کرنے لگے کہ

"حضرت حالات و ثمرات تو بڑے لوگوں کو ہوتے ہیں، مجھ سے تو جتنا کام حضرت نے فرمایا ہے وہ بھی نہیں ہوتا۔"

اور اپنی اس عجیب و غریب کیفیت کا جو ذکر شروع کرتے ہوئے آپ پر طاری ہوئی تھی ان الفاظ میں اظہار فرمایا کہ

"جہاں تسبیح لے کر بیٹھا' بس ایک مصیبت ہوتی ہے، اس قدر گرانی کہ جیسے سو سو من کے پتھر کسی نے رکھدیئے ہوں' زبان و قلب سب بستہ ہوجاتے ہیں"

یہ بھی حضرت تھانوی ہی کی روایت میں ہے کہ روتے ہوئے بے ساختہ آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے کہ

حضرت کے کامل یا شفیق ہونے میں شبہ نہیں لیکن؟

تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبر کامل ؛ کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

میں ہی بدقسمت ہوں' ایسا ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے زبان کو جکڑ دیا ہو" (قصص الاکابر الہادی ماہ ربیع الاول ۵۳ھ)

آپ کی اس کیفیت کو سننے کے بعد وہی بات حاجی صاحب نے فرمائی تھی، جسے پہلے بھی کہیں بیان کرچکا ہوں کہ بشارت دیتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کی تسلی حاجی صاحب نے ان الفاظ میں کردی کہ

"مبارک ہو، یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے' اور یہ وہ ثقل ہے' جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا"

مسئلہ کے لحاظ سے اس کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا شاید اسے عرض کرچکا ہوں' یہاں اس کے ذکر سے یہ غرض ہے کہ حضرت تھانوی نے اس قصہ کو بیان کرکے یہ بھی فرمایا کہ

"اس زمانہ میں (یعنی جب یہ حال طاری ہوا تھا) مولانا (نانوتوی) محض نوآموز طالب العلم تھے اس وقت یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ، یہ اس قدر بڑے عالم ہونے والے ہیں"

جس سے مصنف امام کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ طالب العلمی کے زمانہ میں ہی ذکر و شغل سیر و سلوک میں مرید کرنے کے بعد حاجی صاحب قبلہ نے آپ کو لگا دیا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک وقتی حال تھا' مرشد کی توجہ سے جیسا کہ معلوم ہے اس کا ازالہ ہوگیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، ترتیب کے ساتھ تو کسی نے اس کو بیان نہیں کیا ہے، لیکن سوانح مخطوطہ کے مصنف نے سیدنا الامام الکبیر کی باطنی صلاحیتوں اور جن خدا داد نعمتوں کو لیکر آپ پیدا ہوئے تھے

مسلسل جس کی تعبیر اپنی اصطلاح میں "اجتبائیت" سے کرتا چلا آرہا ہوں، ان ہی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"طریقت میں آپ کو وہ قابلیت حاصل تھی کہ شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہی آنِ واحد میں وہ مقامات سلوک طے ہوگئے، جو اکثر سالکوں کو سالہا سال کی محنت شاقہ میں بھی وصول نہیں ہوئی"۔

اسی کے بعد یہ بھی ان ہی کا بیان ہے، کہ

"شیخ نے جب آپ کو اس فن کے قابل پایا تو فرمایا کہ تم کو کسی ریاضت کی حاجت نہیں"

اگر روایت صحیح ہے، تو نہیں کہا جا سکتا کہ ذکر کے وقت شروع میں ثقل و گرانی کی جو کیفیت آپ کو محسوس ہوئی تھی، اس کو دیکھ کر شیخ نے یہ فرمایا کہ "تمکو کسی ریاضت کی ضرورت نہیں" یا بیعت لینے کے ساتھ ہی یہ کہدیا تھا، بظاہر پہلی ہی بات دل کو زیادہ لگتی ہے، کیونکہ شیخ کی روشن ضمیری کے باوجود بھی ایسے شیوخ کو جن کے ہاتھ پر بکثرت لوگ بیعت کر رہے ہوں، کسی خاص مرید کی خصوصی صلاحیتوں کا اندازہ عموماً کچھ اسی قسم کے امتیازی آثار و حالات سے ہوتا ہے، خصوصاً ایسا مرید جو بقول مولٰنا تھانوی ابھی نوآموز طالب العلم کی حیثیت سے بظاہر آگے نہ بڑھا ہو،

بہرحال میرا خیال یہی ہے کہ ثقل و گرانی والی حالت کے اظہار ہی کے بعد غالباً حضرت حاجی صاحب نے اجازت دے دی کہ صوفیانہ ریاضتوں کی آپ کو ضرورت نہیں ہے، مگر ہوا کیا! شیخ کی طرف سے بار ہلکا کیا جا رہا ہے، سنئے، سوانح مخطوطہ کے مصنف کی شہادت وہی لکھتے ہیں

"مگر با ایں ہمہ شان عبودیت آپ پر (مولٰنا نانوتوی پر) ایسی غالب تھی کہ آپ مدت تک شغل بارہ تسبیح، حبس دم ذکر اَرّہ وغیرہ میں مشغول رہے"۔

اور کیسی مشغولیت؟ تصور بھی آج جس کا دشوار ہے، ان کا بیان ہے کہ

"چھ چھ سات سات گھنٹے برابر ذکر ارّہ اور حبس دم کرتے تھے"۔

آگے یہ لکھ کر کہ

"جس وقت آپ اس شغل کو کرتے، صرف ایک تہ بند بدن پر رکھتے تھے"
وہی راوی ہیں کہ

"وہ تہ بند عرق بدن (پسینے) سے ایسا تر ہوجاتا تھا کہ بعد الفراغ اس کو بدن سے علیحدہ کرکے اور نچوڑ کر خشک کرتے تھے" ص۱۵ مخطوطہ

اب ایک طرف ان معلومات کو اپنے سامنے رکھ لیجئے، اور پھر چلے آیئے، اسی کوچہ چیلان کے کو — پر جس پر مصنف امام نے خبر دی تھی کہ سیدنا الامام الکبیر جو بقول ان کے فطرتاً خوش مزاج، اور ظرافت پسند تھے، اچانک افسردہ غم زدہ چہرے کے ساتھ جھلنگے پر پڑے ہوئے ہیں، کئی کئی دن کی پکی ہوئی روٹیوں کے خشک ٹکڑوں کے سوا کسی قسم کی کوئی دوسری غذا استعمال نہیں فرماتے، بال بڑھے ہوئے ہیں جن میں بقول ان ہی کے۔ جوئیں بھی پڑ گئی تھیں، گویا تن بدن کی کوئی خبر اس زمانے میں معلوم ہوتا تھا آپ کو نہیں ہے، میں نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں اور مسلمانوں کی حکومت پر جو کچھ اس زمانہ میں گذر رہا تھا، اس سے اور حضرت والا کے سیاسی رجحانات اور آئندہ ان ہی رجحانات کے مطابق آپ کے اقدامات و خدمات کا تھوڑا بہت علم بھی جو رکھتے ہیں، ان کو آپ کے ان فجائی تغیرات میں ملک کے سیاسی تغیرات و انقلابات کی جھلک نظر آئے تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہئے، میں نے کہا تھا کہ حضرت والا تو خیر حضرت والا ہی تھے وہ حالات ہی ایسے تھے کہ مشکل ہی سے مسلمانوں میں کوئی ہوگا جو کم و بیش ان سے متاثر نہ تھا، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی یاد دلانا چاہتا تھا کہ مصنف امام نے جس زمانہ کے متعلق یہ روداد سنائی ہے، یہی وہ زمانہ ہے، جب "بدر" سے پہلے قدرت کی طرف سے سیدنا الامام الکبیر کے لئے "حرائی تجربات" سے گذرنے کے مواقع آسان کئے گئے تھے، اور جہاں تک میرا خیال ہے سوانح مخطوطہ کے مصنف نے جن ریاضات ہائلہ کا ذکر اس سلسلے میں کیا ہے، ان کا تعلق زیادہ تر اسی زمانہ سے ہے، ہمارے مصنف امام نے اسی موقعہ پر جہاں کوچہ چیلان والے مکان کے مذکورہ بالا امور کا تذکرہ کیا ہے، وہیں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا وہی مملوکہ مکان جہاں اپنے والد مرحوم مولنا مملوک العلی کی وفات کے بعد وہ آگئے تھے

کچھ دن تو وہ سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ رہے، لکھا ہے کہ

"ایک سال کے قریب بعد انتقال والد مرحوم احقر دہلی رہا" ص۲۹

لیکن اسی کے بعد جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے کہ

"پھر اجمیر نوکری کے سبب دہلی چھوٹی اور مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) سے جدائی پیش آئی" ص۲۹

غالباً اسکول کے ہیڈ مولوی یا ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات ہو کر مصنف امام کو اجمیر جانا پڑا، آگے وہی یہ خبر بھی دیتے ہیں کہ

"جب احقر اجمیر گیا، مولوی صاحب اسی مکان (کوچہ چیلان والے) میں رہتے تھے، اور بعض ایک دو آدمی اور تھے" ص۳۰

یہ کون لوگ تھے اس کا پتہ تو نہ چلا، بس اتنا معلوم ہوا کہ مصنف امام کے چلے جانے کے بعد بھی اس مکان میں کچھ دنوں بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ حضرت والا کو رہنا پڑا، اور حراء بنانے یا حرائی تجربات کے لئے قدرت نے جس مقام کا انتخاب کیا تھا، ابھی غیروں سے خالی نہیں ہوا تھا، واللہ اعلم پھر کیا صورت پیش آئی، مصنف امام نے صرف یہ خبر اجمالی الفاظ میں دی ہے کہ وہی ایک دو آدمی جو آپ کے ساتھ اس مکان میں مقیم تھے،

"اتفاق سے سب متفرق ہو گئے" ص۳۰

اتفاق سے تفرق کا یہ نتیجہ اگرچہ بظاہر تو اتفاقی واقعہ تھا، لیکن بعد کو اس "تفرق" سے بندے اور بندے کے مالک کے درمیان وفاق کی جو صورت پیش آئی، اس کو دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ اتفاق سے نہیں، بلکہ توفیق کی غیبی قوتوں کے اتفاق نے اس صورت حال کو شاید قصداً پیدا کیا تھا مصنف امام ہی راوی ہیں کہ جب یہ ایک دو آدمی بھی متفرق ہو گئے تو

"اور مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) تنہا رہ گئے" ص۳۰

پھر کیا ہوا اور کیا ہوتا رہا، میں کیا کروں، ذہن اچانک دلی کے اس کوچہ چیلان سے وادی غیر ذی زرع کے اس پہاڑ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کے غار کو تیرہ سو سال پہلے آقا کے لئے خالی کرایا گیا تھا،

اللھم صل علیہ وسلم وبارک :

مصنف امام ہی کے الفاظ سنئے "جو سب کے متفرق" ہونے کے بعد اتفاقات کہئے یا وفاقات کی جو صورتیں اس تنہا مکان میں پیش آئیں وہی رقمطراز ہیں کہ

"مکان مقفل رہتا تھا" صـ۳

بظاہر دن کو بھی مقفل رہتا تھا اور رات کو بھی مقفل ہی رہتا تھا۔ مگر باہر سے جو مکان دیکھنے والوں کو مقفل نظر آتا تھا، دن کو تو نہیں، لیکن جب دن ختم ہو جاتا اور رات اپنی تاریکی کے پردے میں دنیا کو چھپا لیتی تھی، اس وقت جیسا کہ مصنف امام ہی کا بیان ہے کہ

"رات کو مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کواڑ اتار کر اندر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے" صـ۳

شاید یہ اسی لئے کیا جاتا تھا کہ آنے والے راہ گیروں پر بھی اثر قائم رہے کہ کوئی اس مکان میں نہیں ہے۔ اور تنہائی میں خلل انداز نہ ہو۔ اور اسی کواڑ چڑھائے ہوئے مقفل مکان میں تن تنہا ساری رات گذرتی تھی یا گذاری جاتی تھی، پھر بقول مصنف امام

"اور صبح کو کواڑ اتار کر باہر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے" صـ۳

اس مقفل مکان میں تنہا، شب باشی، وشب گذاری کی یہ عجیب وغریب صورت حال کبتک پیش آتی رہی، صحیح طور پر تو اس کا بتانا دشوار ہے۔ لیکن مصنف امام نے آگے جو یہ ارقام فرمایا ہے

"چند ماہ اسی ہو کے مکان میں گذر گئے" صـ۳

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند روز نہیں، بلکہ چند مہینوں سے کم اس کی مدت نہ تھی؛ شاید "ہو" کے اسی مکان کا وہ مشہور واقعہ ہے، جس کا ذکر خاکسار سے براہ راست حضرت مولنا حبیب الرحمن العثمانی سابق مہتمم دارالعلوم بھی فرمایا کرتے تھے، اور مولنا الطیب الحمید سلمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ الاسلام مولنا سید حسین احمد مدنی مدظلہ العالی کے حوالہ سے اپنے گرامی نامہ میں اس کی توثیق فرماتے ہوئے کہ دلی ہی کے قیام کے زمانہ میں یہ واقعہ کہا جاتا ہے پیش آیا :

"حضرت (نانوتویؒ) اپنے بند حجرے میں ذکر میں مشغول تھے تو ہر ضرب کے ساتھ دھماکہ کی آواز بھی آتی تھی، لوگ مشوش ہوئے کہ یہ کیا قصہ ہے۔ حجرے کے کواڑ اتارنے گئے کیونکہ اندر سے زنجیر بند تھی، اندر جاکے دیکھا تو حضرت کے برابر ایک سانپ ہے، اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں تو وہ بھی اپنا سر زمین پر دے مارتا ہے، حضرت گردن اٹھاتے ہیں، تو وہ بھی سر اٹھا کر کھڑا ہوتا ہے، اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں، تو وہ بھی زور سے زمین پر سر ٹپکتا ہے، یہ دھماکہ اسی کا تھا، لوگوں نے اسے مارا، مار کر باہر لائے، لیکن حضرت کو کچھ خبر نہیں ہوئی۔" (مکتوب الحفید السعید مورخہ ۳ ذیقعدہ ۱۳۶۸ھ)

آگے مولنا طیب صاحب نے یہ اضافہ بھی فرمایا ہے کہ

"یہ واقعہ میں نے حضرت امیر شاہ خاں صاحب اور دوسرے متعدد بزرگوں سے سنا ہے۔"

اگر یہ سچ ہے جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ ریاضات و مجاہدات کو حضرت قبلہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا الامام الکبیر کے لئے غیر ضروری قرار دیا تھا تو معمولی نہیں بلکہ مذکورہ بالا شہادتوں سے "ھو" کے اس مکان میں حضرت والا کے جس غیر معمولی زہرہ گداز، دل دہلانے والے مجاہدات اور اس راہ کی غیر معمولی کوششوں اور محنتوں کا پتہ چلتا ہے، اُن کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ "الاحسان" یعنی بندے کو اپنے رب کا حضور دوام حاصل ہو جائے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے، کہ جو ہر چیز کو محیط ہے، ہر ایک کے ساتھ ہے وہی اول بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی وہی ہے اور باطن بھی وہی ہے، اسی کا رُخ (وجہ) سامنے رہتا ہے، جدھر بھی مڑا جائے جس ذات اقدس و اعلیٰ کی نشاندہی اسی قسم کی ملتی جلتی علامتوں کے ساتھ قرآنی بینات میں فرمائی گئی ہے، اُن ہی کو اپنا وجدانی شعور بنا لینا، اور جو واقعہ ہے اسی کے مطابق علم و دانش کا ہو جانا بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے پیرو مرشد کی تجویز یہی ہوئی کہ ریاضتوں کی ضرورت نہیں، اور ہے بھی یہی بات کہ مہبط وحی ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم جن پر یہ قرآنی حقائق براہ راست منکشف ہوئے تھے، ان پر جس حد تک اعتماد بڑھتا چلا جائے گا خود بخود ان حقائق کی گرفت بھی سخت سے

سخت تر ہوتی چلی جائے گی، علم کے عام معمولی ذرائع بینائی و شنوائی وغیرہ سے حاصل شدہ معلومات پر اعتماد کا راز اسی اعتمادی میں تو پوشیدہ ہے جو اپنے اندر ہم علم کے ان عام اور معمولی ذرائع کے متعلق رکھتے ہیں۔ پھر علم کا وہ غیر مشتبہ قطعی اور یقینی ذریعہ جس کا نام وحی و نبوت ہے، اس کے انکشافی حقائق اور اس راہ سے حاصل شدہ معلومات پر اس شخص کی اعتمادی کیفیت کا حال خود ہی سوچنا چاہئے کہ کیا ہو سکتا ہے جس کے اندر علم کے تمام ذرائع و وسائل میں سب سے زیادہ بھروسہ اور سب سے زیادہ اعتماد کی کیفیت نبوت و وحی کے متعلق پیدا ہو گئی ہو، سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کے تلمیذ رشید مولانا منصور علی خاں حیدرآبادی کی یہ چشم دید گواہی آپ سن چکے ہیں کہ

"اسم گرامی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا سن کر لرزہ بدن پر پڑ جاتا تھا اور چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا، اور ایک عجیب حالت نمایاں ہوتی تھی جو معرض بیان میں نہیں آسکتی"۔ ص۱۸۱

اور جہاں تک تجربہ سے معلوم ہوا ہے، نیز حضرت نانوتوی کے حالات جو سننے میں آئے ہیں، ان سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ بعض لوگ نبوت کے ساتھ غیر معمولی گرویدگی کی اس دولت کبریٰ اور نعمت عظمیٰ سے فطرتاً سرفراز ہوتے ہیں۔

بہر حال حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "ریاضت" و "مجاہدہ" کی مشقتوں کو آپ کے لئے غیر ضروری اسی "احسانی کیفیت" کے سلسلے میں اگر قرار دیا ہو، تو آپ کے جبلّی اقتضاؤں کے متعلق اس کے سوا کوئی دوسری تجویز آپ کے لئے شاید مناسب بھی نہیں ہو سکتی تھی!

مگر مجاہدات و ریاضات کا ایک اور مقصد بھی ہوتا ہے "شناخت" جو عربی کے لفظ "معرفت" کا فارسی ترجمہ ہے، اردو میں جس کا ترجمہ ہم "پہچاننا" کرتے ہیں، جو علم کی نہیں، بلکہ کسی جانی ہوئی چیز کے ساتھ دانش کے تعلق کی تعبیر ہے، "میں آپ کو پہچانتا ہوں" اس فقرے سے مخاطب کو بولنے والا یہی باور کراتا ہے کہ علم تو پہلے سے آپ کا حاصل تھا، وہی جانی ہوئی بات پھر میرے سامنے پیش آئی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ نبوت کی راہ سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان ہی معلومات کے ساتھ شناخت و معرفت یا پہچاننے کی نسبت قائم کرنے کے لئے بھی۔ مجاہدات و ریاضات سے کام لیا جاتا ہے، اور نبی کی بتائی ہوئی باتوں اور جن راہوں سے غیبی تجربات اُن کو ہوتے ہیں، اُن کا مشاہدہ اُن کی کوشش اور اُنکے ظرف و

گنجائش کے مطابق ان لوگوں کو کرایا جاتا ہے جو ان مجاہدات و ریاضات کی محنتوں کو برداشت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اپنے اپنے حوصلہ اور اپنی اپنی ہمت کی بات ہوتی ہے۔ اسی لئے ہر کسی سے نہ اس کا مطالبہ کیا گیا ہے اور اُن کے متعلق نہ کوئی مسئول ہوگا اور نہ اُن کے ترک پر سرزنش کی دین میں دھمکی دی گئی ہے؛

سیدنا الامام الکبیر کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں، اُن کے بچپن کے ساتھی یعنی ہمارے مصنف امام کی شہادتیں گذر چکی ہیں، کہ

"مولوی صاحب جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے، ہر کھیل میں خواہ ہوشیاری کا ہو یا محنت کا سب سے اول اور غالب رہتے تھے" ص۲۷

یہ بھی اُن کی اطلاع ہے کہ

"ہر کھیل میں جو مرتبہ کمال ہوتا تھا، وہاں تک اس کو پہنچا کر چھوڑتے" ص۲۷

"کمال کا جو مرتبہ ہوتا" اس مرتبہ تک "ہر کھیل" کو پہنچانے کا جذبہ جس پر جبلّۃً غالب اور مستولی تھا، اسی شخص کے متعلق یہ سوال کہ پیر و مرشد کے غیر ضروری قرار دینے کے باوجود اتنے شدید مجاہدات و ریاضات کی مشقتوں میں اپنے آپ کو اسی نے کیوں مبتلا کیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ حضرت والا کا یہ فطری رجحان تھا، شیخ نے تو صرف غیر ضروری ٹھہرایا تھا، لیکن ان ریاضتوں اور مجاہدوں سے اگر وہ منع بھی کر دیتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت اُن کا طرز عمل کیا ہوتا، لیکن غیر ضروری قرار دینے میں گنجائش باقی تھی، خود جب مصر ہوئے ہوں گے، تو "معرفت و شناخت" کے نتیجے تک پہنچنے کے لئے جو طریقے مقرر ہیں، شیخ نے اُن کی تعلیم سے سرفراز فرمایا اور جیسا کہ آپ دیکھ چکے کتنی قوت کے ساتھ اس "غیر ضروری" فرض کو آپ نے انجام دیا؛

اس راہ سے جو قطعاً ناآشنا ہے، وہ کیا بتا سکتا ہے کہ "جذب کی حالت برتی تھی" ان الفاظ سے مصنف امام نے آپ کی زندگی کی جس منزل کی تعبیر کی ہے، اور خبر دی ہے کہ بال سر کے بڑھ گئے تھے، نہ دھونا، نہ کنگھی، نہ تیل نہ کترے، نہ درست کئے، الغرض ان ہی کے الفاظ میں حضرت والا کی "تو عجب صورت" بن گئی تھی، اکثر ساکت رہتے تھے" اور "باوجود خوش مزاجی اور ظرافت کے ترش رو اور مغموم جیسی صورت رہتے"۔

غیبی اور نادیدہ منازل کے جو سالک ہیں وہی اس سلسلہ کی راہ ورسم کی صحیح خبریں دے سکتے ہیں اور ان آثار و کیفیات کی واقعی توجیہ کے جائز حقدار وہی ہیں، ہم جیسے بے بہروں، تہی دستان قسمت کیلئے زیادہ سی زیادہ گنجائش اس سلسلہ میں اگر کچھ پیدا ہوتی ہے تو یہی کہ مصنف امام کی مذکورہ بالا شہادتوں سے شاید ذہن ان واقعات کی طرف منتقل ہو جائے جن کا ذکر ہم صحاح کی ان روایتوں میں پاتے ہیں خو آغاز بعثت کے سلسلے میں محدثین اور ارباب سیر کی کتابوں میں ملتی ہیں، مابالعرض کے حالات کے سمجھنے میں مابالذات کے واقعات سے اگر روشنی ملے، یا غلام کی زندگی میں آقا کے ساتھ انتساب کی برکتیں محسوس ہوں تو اس پر تعجب کیوں کیجئے۔

واقعہ یہ ہے کہ مصنف امام نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو پڑھ کر اگر یہ یاد آجائے اور شاید اس کو یاد ہی آنا چاہئے کہ سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی حرائی عہد میں جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے:

حبب الیہ الخلاء	تنہائی (کی زندگی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے محبوب بنادی گئی تھی۔

کا حال طاری ہوا تھا۔

ابن اسحاق امام المغازی نے جس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

فلم یکن شئ احب الیہ ان یخلو وحدہ (سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۱۵۲ ج ۱ بررد ض الانف)	پس اس سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی بات پسند نہ تھی کہ اکیلے تنہا رہیں۔

بلکہ حرا والی روایت میں تحنث کے متعلق

ھو تعبد اللیالی ذوات العدد	

کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں، اور محدثین بے چارے پریشان ہیں کہ یہ الفاظ اصل روایت کے ہیں، یا راوی نے تشریحاً ان کو روایت میں شریک کر دیا ہے، یعنی مدرج ہیں، پھر حیران ہیں کہ اللیالی (راتوں) کا تذکرہ یہاں کیوں کیا گیا ہے، بلکہ قرآن میں بھی اربعین موسوی یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چلے کے سلسلے میں بجائے دن کے راتوں ہی کا نام کیوں لیا گیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے سوالوں کو چاہا جائے تو شاید مصنف امام کے بیان کی روشنی میں ان کو کچھ سمجھا جا سکتا ہے، یا کم از کم اس کا تو بہر حال پتہ چلتا ہے، کہ

اس سلسلے میں دن سے زیادہ راتوں کو کسی قسم کی خاص اہمیت حاصل ہے، آخر سوچنے والوں کو یہ سوچنا چاہئے کہ کوچہ چیلان کا یہ "ہو" کا مکان جو دن کو مقفل رہتا تھا اور راتوں ہی میں کواڑ اتار کر داخل ہونے والا "ھو" کے اس مکان میں کیوں داخل ہوتا تھا۔ حالانکہ چاہتے تو دن کو بھی اسی ترکیب سے اس مکان میں داخل ہو کر خلوت پسندی کے تقاضے کی تکمیل کر سکتے تھے؛

آغاز بعثت کی ان ہی روایتوں میں ہمیں جب یہ پڑھایا جاتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جس میں دیکھا گیا کہ

حزن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حزنا شدیدا (زرقانی بحوالہ ابن سعد)	مغموم ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ مغموم۔

اور کیسا غم و حزن! بخاری میں جس کا اثر بتایا گیا ہے کہ

غدا منہ مرارا کی یتردی من رؤس شواھق الجبال	بارہا آپ نے صبح کی کہ اپنے آپ کو (شدۃ حزن کے سبب) پہاڑوں کی چوٹیوں سے گرا دیں۔

تو مصنف امام نے جن حالات کا ذکر اپنے بیان میں کیا ہے، ان کی ان روایتوں کی طرف اگر ذہن منتقل ہو جائے تو اس ذہنی انتقال کے اسباب کیا یہاں موجود نہیں ہیں؟

بلکہ سچ تو یہ ہے، کہ اسی سلسلہ کی روایتوں میں ہم جہاں جبرئیل علیہ السلام کے متعلق

فغطنی	دبایا اور بھینچا مجھے جبرئیلؑ نے

کا لفظ بخاری میں پاتے ہیں، وہیں محدثین ہی کی زبانی اسی موقعہ پر "فغتّنی" کا تلفظ بھی سنتے ہیں، جس کی شرح کرتے ہوئے علامہ زرقانی نے لکھا ہے کہ

ھو حبس النفس	سانس روکنے کی یہ تعبیر ہے؛

اور ابوداؤد طیالسی کی روایت میں

فاخذ بحلقی	پس پکڑ لیا جبرئیل نے میرے حلق کو

لہ طبری اور ابن اسحاق میں اس لفظ کا یہی تلفظ پایا جاتا ہے۔ دیکھو زرقانی صفحہ ۲۱۱/ج ۱ ۱۲۔

کا تشریحی اضافہ راوی نے کیا ہے،

نیز حافظ ابو نعیم نے دلائل النبوۃ میں عبد اللہ بن شداد کے حوالہ سے اسی سلسلہ میں جو روایت نقل کی ہے، اس میں،

فغمنی	پس گھونٹ دی میری سانس

کا لفظ جو ملتا ہے جن سے "غط" کی اس کیفیت کی تشریح ہوتی ہے، جس کا ذکر بخاری وغیرہ میں ہے میں پوچھتا ہوں کہ جس کے سامنے صحاح کی یہ روائتیں ہیں اور "حبب الیہ الخلاء" (محبوب کر دی گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلوت پسندی) بخاری کی اس خبر کی ان تشریحوں کو جنھوں نے پڑھا ہے، مثلاً

ای الخلوۃ التی یکون فیھا فراغ القلب والانقطاع عن الخلق فھی تفرغ القلب عن اشغال الدنیا لدوام ذکر اللہ تعالیٰ فیصفو و تنشرق علیہ انوار المعرفۃ۔ (السیرۃ الحلبیہ)	یعنی وہ خلوۃ جس میں فراغ قلب اور مخلوق سے انقطاع و یکسوئی حاصل ہو تو وہ قلب کی فراغت ہے اشغال دنیا سے ذکر اللہ کے دوام کے لئے تو (اس حالت میں) قلب صاف اور منور ہو جاتا ہے اور اس پر انوار معرفۃ چمکنے لگتے ہیں۔

اور صاحب قاموس علامہ فیروز آبادی نے اپنی مقبول و مشہور کتاب "سفر السعادۃ" میں حرائی "تحنث" کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ گو دوسرے خیالات بھی اس کی تشریح میں ظاہر کئے گئے ہیں لیکن مختلف آثار و قرآنی دلائل و شواہد کی بنیاد پر سب سے زیادہ صحیح خیال ان ہی بزرگوں کا معلوم ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ

کان تعبدہ بالذکر	"ذکر" کی شکل میں رسول اللہ حرائی عبادت کرتے تھے۔

کچھ بھی ہو، یہ تو وہ مواد ہے جو حدیث و سیر کی کتابوں سے اخذ کر کے آپ کے سامنے رکھدیا گیا ہے۔ اگر کسی وفادار مخلص و راستباز امتی کے لئے اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی زندگی کے نمونوں کا پیش کرنا بے ادبی اور گستاخی نہ ہو، تو میں پوچھتا ہوں کہ "ھو" کے مکان میں سیدنا الامام الکبیر کو جن حالات میں مصنف امام نے پایا تھا، اور اُن کے اجمیر شریف لے جانے کے بعد اسی "ھو کے مکان" میں آپ کی آمد و رفت کا

کا سلسلہ جس خاص طریقہ سے جاری رہا، اور آپ کے جن مشاغل کا ذکر سوانح مخطوطہ کے مصنف نے کیا ہے اُن میں کوئی بات بھی ایسی ہے جس کے متعلق اس قسم کی حرف گیریوں کی گنجائش پیدا ہوسکتی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کا نمونہ نہیں پایا جاتا، انتہا یہ ہے کہ "حبس دم" کا شغل جس کے متعلق بعض لوگوں کی طرف کتابوں میں یہ منسوب کیا گیا ہے کہ اسے "جوگیہ ہند" سے صوفیوں نے یکسوئی کی کیفیت پیدا کرنے کیلئے حاصل کیا ہے آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کی اصل بھی نبوت کی زندگی میں محدثین ہی کے بیان کے مطابق یہیں پائی جاتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ منجملہ دوسری خصوصیتوں کے اسلام کی بڑی خصوصیت یہی سمجھی جاتی ہے، کہ انسانیت کے لئے وہ کوئی نیا پیغام نہیں ہے، بلکہ جو کچھ اگلوں کو دیا گیا تھا، اسی کو اغلاط و تحریفات کی آلودگیوں سے پاک کر کے تر و تازہ شکل میں النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے آخری دفعہ دنیا کے سپرد کیا گیا ہے، اس قسم کے ارشادات، مثلاً

لیھدیکم سنن الذین من قبلکم	تاکہ تمہیں ان بزرگوں کے راستہ پر چلائے جو تم سے پہلے گذر چکے

یا۔

اولئك الذین ھدی ھم اللہ فبھداھم اقتدہ	یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت بخشی پس ان ہی لوگوں کے راستہ کو اختیار کر۔

وغیرہ میں بار بار خود قرآن ہی اسلام کی اس خصوصیت پر تنبیہ کرتا چلا گیا ہے، مُصدقاً لما بین یدیہ ہونا، ادیان سابقہ پر مہیمن و محیط ہونا خود قرآن ہی کی جب یہ ایک نمایاں اور ممتاز صفت ہے، تو مسلمانوں کے اندر ایسی چیزوں کو دیکھ کر جو غیر قوموں میں بھی پائی جاتی ہیں سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ لوگوں کو اچنبھا کیوں ہوتا ہے؟

اگر ایسا نہ ہوتا تو بیشک یہ تعجب کی بات ہوتی، اور مسلمانوں سے یہ پوچھا جا سکتا تھا کہ اپنے پیغمبر کی نبوت کو نبوت جامعہ اور اپنے رسول کی رسالت کو رسالت کاملہ آخر کس بنیاد پر قرار دیتے ہیں،

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کے دعوے کی دلیل کیا ہے؟ ساری خوبیاں جو دنیا کی قوموں میں بکھری ہوئی ہیں، اگر اسلام میں

سمٹی اور کھپی ہوئی نہ ہوتیں، تو شاعری کے سوا اس قوم کا دعویٰ کچھ اور بھی باقی رہتا ہے۔

ان میں کچھ لوگ الفاظ سے بھڑکتے ہیں، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے منجملہ دیگر مشاغل کے "ذکرارہ" کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ قہقہہ لگاکر پوچھتے ہیں کہ یہ "ذکرارہ" کیا چیز ہے؟ حالانکہ ذکر کے ایک خاص طرز کی تعبیر کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے، بلندی و پستی یا جہر و سر ان دونوں کیفیتوں کے درمیان والی آواز میں ذکر کرنے کو ہندوستان میں غالباً "ذکرارہ" کے نام سے لوگوں نے موسوم کر رکھا تھا، جیسے آرہ چلانے والے اطمینان کے ساتھ آرہ سے کسی کا کام انجام دیتے ہیں۔ لیکن موٹی سے موٹی شہتیر دیکھا جاتا ہے کہ دو ٹکڑے ہو کر رہ گئی، کچھ اسی قسم کی مشابہت کی بنیاد پر یہ نام ذکر کے اس خاص طریقہ کا رکھ دیا گیا تھا، مانتا ہوں کہ نام بیشک عربی نہیں ہندی یا فارسی ہے، لیکن آپ نام کو کیوں دیکھتے ہیں، کام کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ

ولا تجھر بصلاتك و لا تخافت بھا وابتغ بین ذلك سبیلا	اپنی نماز میں نہ زور سے پڑھو نہ آہستہ پڑھو (بلکہ) اُن دونوں کے درمیان کا راستہ اختیار کرو۔

جو قرآنی حکم ہے، یا قرآن ہی میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ

واذکر ربك فی نفسك ودون الجھر من القول بالغدو والاصال۔	رات دن اپنے رب کی یاد اپنے دل میں اور ہلکی آواز سے کرو۔

آخر جس کام کا مطالبہ ان آیتوں میں کیا گیا ہے، وہی کام کیا اس نام سے انجام نہیں دیا جاتا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے نماز، روزہ، بانگ (اذان) درود وغیرہ بیسیوں نام شرعی بلکہ خالص عباداتی مطالبات کے رکھ لئے ہیں، انتہا یہ ہے کہ خدا اور پیغمبر وغیرہ تک کے ناموں اور لفظوں کے استعمال سے ان میں کوئی نہیں ہچکچاتا، اور کسی کا دھیان ان غیر عربی الفاظ سے ادھر نہیں جاتا کہ مسلمانوں میں ان ناموں سے جو عبادتیں مروج ہیں یا جو خیالات پھیلے ہوئے ہیں وہ غیر عربی یعنی عجمی اقوام سے چرائے گئے ہیں، لیکن ادھر بے چارے صوفیوں کے مشاغل اور ان کے اوراد و وظائف، طور اور طریقوں کا ذکر چھڑا، پھر دیکھئے کہ فیلالوجی کے ماہرین اپنی آستینیں چڑھا لیتے ہیں، فلاں طریقہ یونانیوں سے اور فلاں رومانیوں

سے لیا گیا، صوفیوں نے فلاں مشغلہ بدھ بھکشوؤں سے سیکھا اور فلاں طریقۂ کار ان کا ہندو جوگیوں یا عیسائی راہبوں کے طرزِ عمل سے ماخوذ ہے، غوغائیوں کی مجلسیں ان ہی غلغلوں سے گونج اٹھتی ہیں اور ہر ایک اپنی جدید تحقیق کی داد لینے کے لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھینگا مشتی میں مصروف ہے۔

حالانکہ الفاظ سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو مشکل ہی سے حضرات صوفیہ کے مشاغل یا عملی طریقوں میں کوئی ایسی چیز مل سکتی ہے جس کی اصل نبوت کبریٰ کے نمونوں میں نہ پائی جاتی ہو، آ ذکر ہی کو دیکھئے قرآن میں رات کے ذکر کے ساتھ اسم ذات کے ذکر کا ہی حکم دیا گیا ہے، اور اس کی کوئی خاص شکل مقرر نہیں کی گئی ہے، بلکہ قیاماً و قعوداً و علی جنوبہم ان تمام حالات کے ذکر کو سراہا گیا ہے، پھر قرآن کے اسی اطلاق سے استفادہ کرتے ہوئے ذکر کے جن خاص طریقوں کو بزرگوں نے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز پایا، اسی کو اختیار کر کے پوچھنے والوں کو وہی طریقے بتاتے رہے تو بتایا جائے کہ خلاف ورزی کا الزام آخر ان پر کس راہ سے لگایا جاتا ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ شق صدر و وحی و معراج و معجزات وغیرہ بیسیوں چیزیں جو نبوت کی طرف منسوب ہیں اُن کا سراغ خود بتائیے کہ ان نمونوں کے سوا جو صوفیوں کی زندگی میں پائے جاتے ہیں، کیا کسی اور ذریعہ سے ممکن ہے؟ آج تو مثلاً لطائف سے شق صدر کو، الہام و کشف سے وحی کو، سیر و سلوک اور اس کے مشاہدات سے معراج کو، کراماتوں سے معجزات کو ہم کچھ نہ کچھ سمجھ بھی لیتے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ آسمان و زمین ہی کا فرق دونوں سلسلوں میں کیوں نہ ہو، تاہم کچھ تو ان چیزوں کی نوعیت کا پتہ صوفیہ کی زندگی کے ان نمونوں سے چلتا ہے، ایک شکی آدمی چاہے تو ان امور کا کچھ نہ کچھ اندازہ اپنے ذاتی تجربات سے کر سکتا ہے، کیونکہ بند اگر ہوا ہے تو صرف نبوت کا دروازہ بند ہوا ہے اور اب وہ کسی کے لئے رہتی دنیا تک کبھی کھولا نہیں جا سکتا، لیکن غیب سے رشتہ قائم کرنے کی صوفیانہ راہیں نہ پہلے بند تھیں نہ اب بند ہیں نہ آئندہ بند ہوں گی اپنی اپنی صلاحیت و مناسبت کے مطابق کسی نہ کسی شکل میں ان چیزوں کے تجربہ کا موقعہ ہر کاسب اور کوشش کرنے والے کے لئے ہر زمانہ میں باقی ہے اور اس کو باقی رکھا گیا ہے۔

موضوع سے، اس میں شک نہیں، کہ تھوڑی دیر کے لئے مجھے ہٹنا پڑا، لیکن زمانہ کی ستم ظریفیوں کو کیا

کیجئے، ہم سے بیش تر سوانح نگاروں نے جن چیزوں کا ذکر آپ کی سوانح عمریوں میں کیا ہے، ان کو اپنے زمانہ کے مذاق کی رعایت کرتے ہوئے چھوڑ دینا بددیانتی اور خباثت محسوس ہوئی اور ذکر کرنے کے بعد ان زیر لب مسکراہٹوں کا خیال ستانے لگا، جو علم کے جھوٹے مدعیوں میں آج کل کا جہل پیدا کر رہا ہے موضوع سے غیر متعلق یہ چند سطریں، جہل و تمسخر کی ان مسکراہٹوں کو تھوڑی دیر کے لئے فکر و سنجیدگی کے تیوروں سے ہی بدل دینے میں اگر کامیاب ہو گئیں تو میں خیال کروں گا کہ نہ میرا وقت ضائع ہوا، اور نہ پڑھنے والوں کو اپنے وقت کی بربادی کا افسوس ہوگا۔

بہرحال مولانا مملوک العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات جس زمانہ میں ہوئی یعنی ۱۸۵۱ء میں سیدنا الامام الکبیر کو جن حالات اور کیفیات میں ہم پاتے ہیں، عرض کر چکا ہوں کہ اسی سال لارڈ ڈلہوزی کی قائم کردہ کمیٹی نے فیصلہ کر دیا تھا کہ بہادر شاہ کے بعد لال قلعہ سے مسلمانوں کی حکومت اور بادشاہ کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا، یہ آخری کیل جب مسلمانوں کی قسمت کے تابوت میں ٹھونک دی گئی، تو واقعہ کی یہ صورت ہی ایسی تھی کہ جو جہاں ہوگا یقیناً تلملا اٹھا ہوگا، پھر دلّی ہی میں جس کے سامنے یہ واقعہ اور اس سے پیشتر مصیبت بالائے مصیبت کے دوسرے واقعات مسلسل پیش آتے چلے جا رہے تھے ان سے اس دردمند دل کا متاثر ہونا جو سیدنا الامام الکبیر کے سینے میں تھا، یقیناً موجب حیرت و استعجاب نہیں ہو سکتا۔

آخر مسلمانوں کے سیاسی حالات کے متعلق جس کی حسّی ذکاوت کا یہ حال ہو (جیسا کہ تذکرۃ الرشید میں مولٰنا عاشق الٰہی صاحب نے نقل کیا ہے) کہ مناسک حج و زیارت سے فارغ ہو کر جس وقت ہندی حاجیوں کا وہ قافلہ جس میں سیدنا الامام الکبیر اور مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہا بھی شریک تھے، واپسی کے لئے ہر طرح سے تیار ہو چکا تھا، صرف سوار ہونے میں دیر تھی کہ

"عین اسی دن پلونا کے فتح ہونے اور روس کے قبضہ میں آجانے کی وحشت ناک خبر مکہ پہنچی"۔

پھر جانتے ہیں، کیا ہوا؟ شکست ہوئی تھی مسلمانوں کو پلونا کے میدان جنگ میں، مگر پلونا سے

ہزاروں میل دور مکہ میں حاجیوں کا یہ قافلہ جو وطن جانے کی مسرتوں میں مشغول تھا، مولوی عاشق الٰہی کا بیان ہے، کہ اس خبر نے،

"قصد سفر ملتوی کرنے پر مجبور کیا" (ص۲۴۱ ج ۱ تذکرۃ الرشید)

اور گو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصرار اور تسلی دینے کے بعد التوار کا یہ ارادہ چند دنوں کے بعد فسخ ہوا لیکن جس کی وجہ سے سفر کا ارادہ ملتوی کیا گیا تھا اس پر کیا گذری، اور تو کچھ ہم نہیں جانتے مولوی عاشق الٰہی نے اسی موقعہ پر یہ خبر دی ہے کہ

"البتہ مولٰنا محمد قاسم صاحب کو علالت لاحق ہوئی جو بظاہر خفیف محسوس ہونے کی وجہ سے سفر کی مزاحم یا رفقار کو پریشان بنانے والی تو نہ ہوئی، مگر آہستہ آہستہ بڑھ کر وہی بیماری مرض الموت بنی" (ص $\frac{۲۴۲}{17}$ تذکرۃ الرشید)

ہائے مرحوم میر کا شعر،

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

اسی لئے حضرت والا کے سیاسی تاثرات کا کلیۃً نہ میں نے انکار کیا ہے، اور نہ انکار کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر آتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ واقعات ہی کی بنیاد پر یہ کہنا چاہتا تھا کہ اسی زمانے میں چونکہ حضرت والا کے متعلق باطنی مجاہدات، اور قلبی ریاضتوں میں بھی مشغول و منہمک ہونے کی خبریں دینے والوں نے دی ہیں، اس لئے صرف "سیاسی تاثر" سے اس عہد کے حالات و کیفیات جذبات و واردات کی توجیہ درست نہ ہوگی، اس راہ میں بسط کے ساتھ قبض کی کیفیتیں بھی سالک پر پیش آتی ہیں، کہتے ہیں کہ بدو وحی کے بعد فترۃ کا جو نمونہ نبوت کبریٰ کے اندر پایا جاتا ہے، اسی کی یہ پرچھائیاں اور سائے ہیں جو اللہ والوں کی زندگی میں نظر آتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب

اس میں کوئی شک نہیں کہ ذکر و فکر کے ان باطنی مشاغل کا سلسلہ آخر وقت تک سیدنا الامام الکبیر کی زندگی میں جاری رہا، ان کے شاگردوں کے آخری طبقہ کے ایک رکن مولٰنا منصور علی خان

حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ جن کو حضرت والا سے تلمذ کا شرف اس زمانے میں ملا جس کے بعد ہی آپ کی وفات خود ان کے سامنے ہوئی، انھوں نے دیکھا تھا، جیسا کہ خود ہی لکھتے ہیں کہ

"یاد الٰہی سے کسی وقت غافل نہ تھے، ہمہ تن ذکر بن گئے تھے" ص۱۹۶ مذہب منصور

اللہ اللہ جس کا حال یہ ہو جیسا کہ مولٰنا منصور علی خاں ہی نے بیان کیا ہے کہ "ہر لقمہ خواہ کھانے کا ہو، یا میوہ یا شیرینی کا بسم اللہ ضرور کہا کرتے" ص۱۹۱ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نام اور اسم کے ساتھ گرویدگی کی یہ کیفیت ہو تو نام والے کے ساتھ اس کے قلبی تعلق کی کیا کیفیت ہو گی، لیکن جہانتک واقعات کا اقتضا ہے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس راہ میں آپ کی مشغولیت عروج و شباب کے انتہائی نقطہ تک اسی زمانہ میں پہونچ گئی تھی جس زمانہ میں کوچہ چیلان کے "ھو" والے مکان میں آپ کو کامل یکسوئی کا موقعہ میسر آیا تھا، اور اس راہ کے آخری نتائج آپ کے سامنے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجاہدہ اور ریاضت کے ان ہی ایام میں آ چکے تھے، وقت کے مسلم عند الکل قطب، اور اس راستہ کے مشہور ماہر سیدنا حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی یہ شہادت کہ

"مولٰنا محمد قاسم کو کم سنی ہی میں ولایت ہو گئی" (کمالات رحمانی ص۱۶)

جس کا ذکر شاید پہلے بھی کہیں کر چکا ہوں خود اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔

"مقام ولایت" سے کمسنی ہی میں سرفرازی کا شاید یہ نتیجہ ہے، کہ باوجود شدید اخفار حال کے اس کے آثار و ثمرات کے تجربہ و مشاہدہ کا موقعہ کمسنی کے بعد والی زندگی کی ہر منزل میں لوگوں کو ملتا رہا، بقول مصنف سوانح مخطوطہ

"مولٰنا مرحوم سے رات دن، کھلی کرامتیں سرزد ہوتی تھیں"

حالانکہ وہی یہ بھی اسی کے بعد لکھتے ہیں کہ

"اپنی خاکساری کی وجہ سے ان کو ایسا چھپاتے تھے جیسے پانی کنوؤں کی تہ میں، اور ہرگز اس کے اظہار کو پسند نہ فرماتے تھے" ص۱۲

میں نے کسی کتاب میں تو نہیں پڑھا ہے، لیکن اکابر دیوبند سے کہہ سکتا ہوں کہ مختلف طریقوں سے یہ خبر

مجھ تک پہنچی ہے، کہ یہی ۱۸۵۷ء جس کے چند ہی سال بعد غدر کا ہنگامہ ہوا، آئندہ اس میں آپ کی عملی شرکت کے واقعات بیان کئے جائیں گے، اسی سلسلہ میں کہتے ہیں کہ آپ کے سر میں گولی لگی، سر پکڑ کر بیٹھ گئے عمامہ سر پر بندھا ہوا تھا، لوگ دوڑے، مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ تھی کہ کسی قسم کا کوئی اثر گولی کا نہ عمامہ میں محسوس ہوا اور نہ سر مبارک میں، ہمارے مصنف امام نے بھی اشارۃً اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"گولی کا نشان تک نہ ملا، حالانکہ خون سے کپڑے تر تھے" ص۳۷

اسی طرح پور قاضی کے شیعوں کی مجلس کا وہ واقعہ جس میں کہا جاتا ہے کہ شیعوں کی طرف سے مطالبہ ہوا تھا کہ سرورِ کائنات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بحالت بیداری ہمیں کرا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ سنوا دیجئے کہ جو کچھ تم (یعنی مولانا نانوتوی) کہتے ہو سچ ہے، تو ہم لوگ سنی ہو جائیں گے۔ ارواح ثلثہ میں ہے کہ جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ

"تم سب اس پر پختہ رہو، تو میں بیداری میں زیارت کرانے کے لئے تیار ہوں" ص۲۰۱

حضرت والا کے ایام شباب اور جوانی کے جوش ہی کا اسے نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ مخالفوں سے مباحثہ و مناظرہ و مقابلہ کی پھر کسی مجلس و محفل میں نہ آپ کی طرف سے اس قسم کے دعاوی جہاں تک میں جانتا ہوں پیش ہوئے، اور نہ بجائے عام علمی طریقوں کے اس سلسلہ میں کسی غیر معمولی باطنی قوت سے کام لیتے ہوئے آپ کو کبھی پایا گیا۔[1]

---

[1] صرف ایک سماعی روایت اس سلسلہ میں مجھ تک پہنچی ہے پورے طور پر یاد نہ رہا کہ خود حضرت شیخ الہندؒ نے بیان کیا تھا یا بالالکسی نے سنایا تھا اور وہ یہ ہے کہ مناظرے کی کسی مجلس میں فریق مخالف نے تقدیر کے مسئلہ کو چھیڑ دیا، سیدنا الامام الکبیر نے اس وقت ایک ایسی تقریر اس مسئلہ کے متعلق فرمائی کہ ساری الجھنیں جو اس میں پیدا ہوتی ہیں ایک ایک کر کے معلوم ہوتا تھا کہ سلجھتی چلی جا رہی ہیں، مجلس میں حضرت شیخ الہند اور آپ کے دوسرے رفقاء بھی شریک تھے اس میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ آج تو حضرت نے ایسی تقریر کی جو کبھی سننے میں نہیں آئی، خیال آتا ہے کہ بعضوں نے اسی وقت نوٹ بھی کر لیا، مسئلہ کے متعلق پوری مجلس مطمئن نظر آتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہ رہا، مجلس کے برخاست ہونے کے بعد جب یہی حضرات جنکی حیثیت اس وقت طلبہ کی تھی فرودگاہ پر واپس آئے اور چاہا کہ ذہن نشین کرنے کے لئے تقریر کا اعادہ کریں، تو نظر آیا کہ کچھ الجھنیں پھر بھی باقی ہی رہ گئی ہیں۔ رد و کد کے بعد اپنے سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ تقریر جس وقت ہو رہی تھی کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا، مگر وہاں سے واپسی کے بعد کچھ خدشے بدستور کھٹک رہے ہیں۔ تب سیدنا الامام الکبیر نے مسکرا کر فرمایا کہ کبھی مخاطب کے فہم کے مطابق تقریر کی جاتی ہے اور کبھی ضرورۃً مخاطب کی سمجھ ہی کو اپنی تقریر کے مطابق بنا لیا جاتا ہے۔ شاید اسی قسم کے الفاظ تھے حاصل جس کا یہی سمجھا گیا کہ باطنی تصرف سے اس وقت کام لیتے ہوئے لوگوں کے دل و دماغ ہی کو ایسا بنا لیا گیا کہ اس وقت ان سے جو کچھ کہا جاتا وہ ہی مان لیتے۔

اور صرف بحث و مباحثہ کی مجلسوں اور محفلوں ہی میں نہیں، بلکہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ اپنی زندگی کے اس پہلو کو حتی الوسع حضرت والا پوشیدہ رکھنے کی بلیغ کوشش فرماتے تھے انھوں نے اسی کے ساتھ جو یہ لکھا ہے کہ "رات دن کرامتیں سرزد ہوتی رہتی تھیں" شاید اس سے اشارہ اسی قسم کے واقعات کی طرف ہے، جن سے صرف وہی لوگ واقف ہو سکتے تھے جو صبح و شام حضرت والا کی خدمت میں حاضری کا شرف رکھتے تھے مثلاً مولٰنا منصور علی خاں صاحب نے بیان کیا ہے کہ آخری حج جس میں ہمرکابی کی سعادت ان کو بھی میسر آئی تھی، واپسی میں جب آپ بیمار ہوئے لکھا ہے کہ

"جہاز میں ایسے بیمار ہو گئے کہ اٹھنے بیٹھنے کی بالکل طاقت نہ رہی، بار بار استفراغ ہوتا تھا، یہ خادم (مولٰنا منصور علی خاں) اٹھا کر بٹھاتا، اور سلفچی میں استفراغ کراتا تھا، صرف صفرا ہی نکلتا تھا، کلی کرا کر پھر لٹا دیتا تھا، دن رات میں کسی وقت اسقدر سکون نہ تھا کہ اچھی طرح خواب راحت ہو، ذرا دیر ہوئی کہ استفراغ کا تقاضا ہوا۔"

مگر وہی مریض جس میں نشست و برخواست کی قوت باقی نہ رہی تھی، اور غثیان کے دورے دم لینے کی بھی جسے فرصت نہیں دے رہے تھے، بقول مولٰنا منصور علی خاں

"ہر وقت لیٹے ہی رہتے تھے۔"

لیکن اسی کے ساتھ جہاز کے اس پورے سفر میں اس کا مشاہدہ بھی شب و روز کے پانچوں وقتوں میں کیا کرتے تھے کہ

"جب نماز کا وقت آتا وہ استفراغ موقوف ہو جاتا، اور بیٹھ کر اطمینان سے نماز پڑھتے۔"

مگر جوں ہی کہ اطمینان کے ساتھ نماز ادا ہو جاتی، وہی بیان کرتے ہیں کہ

"نماز کے بعد پھر وہی دورہ پے در پے شروع ہو جاتا۔" (مذہب منصور ص ۱۸۵)

یا اسی قسم کے ایک دوسرے واقعہ کا ذکر مولانا منصور علی خاں صاحب نے بایں الفاظ فرمایا ہے، کہ

"عید الاضحیٰ میں مولٰنا (نانوتوی) کا دستور تھا کہ سالم گائے کی قربانی کیا کرتے، صبح کے وقت میں حاضر تھا، منشی محمد یٰسین صاحب مولٰنا صاحب کے ماموں زاد بھائی تشریف

لائے اور عرض کیا کہ گائے کی قیمت سات روپئے ٹھہر گئی ہے ۔"
لکھتے ہیں کہ یہ سن کر حضرت والا نے فرمایا کہ "اچھا" منشی محمد یٰسین صاحب اس کے بعد چلے گئے، مولٰنا منصور علی خاں کہتے ہیں کہ ان کے جانے کے بعد

"ایک گھنٹہ میں ایک مسافر آدمی، جو غریب مسکین معلوم ہوتا تھا آیا اور مصافحہ کر کے بیٹھ کر جیب میں سے کچھ روپے نکال کر مولٰنا صاحب کی نذر کئے ۔"

اب آگے سنئے ۔ یہ مولوی منصور علی خاں کی چشم دید شہادت ہے وہ فرماتے ہیں کہ

"مولٰنا صاحب (مولٰنا نانوتوی) وہ روپئے مجھ کو دیئے کہ منشی محمد یٰسین کو دے دو ۔"

روپئے مولوی صاحب نے لے لئے لے کر اُن کو گنا، کہتے ہیں،

"کہ میں نے دیکھا تو سات ہی روپے تھے، حیران رہ گیا کہ خداوندا یہ کیا اسرار اور راز دنیا ز ہے ۔"

ظاہر ہے کہ بساط قرب کے حاشیہ نشینوں کے سوا اس قسم کی جزئیات سے آگاہی کی عوام کے لئے مشکل ہی کیا تھی، اور سوانح مخطوطہ کے مصنف بھی چونکہ ان ہی خوش نصیبوں میں تھے، جنھیں قرب نزدیکی کی یہ نعمت میسر تھی، معلوم ہوتا ہے کہ صبح و شام، رات، دن اس نوعیت کی چیزوں کے مشاہدہ و تجربہ کے مواقع ملتے رہتے تھے، ورنہ عمومیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کی وہی بات صحیح ہے کہ کنوئیں کی تہ میں پانی چھپا رہتا ہے حضرت والا اپنی "ولایت" کے آثار و ثمرات کو چھپاتے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گرد و پیش میں رہنے والوں کے سامنے بھی کوئی بات کسی شدید ضرورت ہی کے وقت ظاہر ہو جاتی تھی، مولوی منصور علی خاں صاحب ہی نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اپنی ذاتی مصیبتوں، اپنے اقربا کی تکلیفوں کے ازالہ میں باطنی قوت سے کام لینے کی نظیریں جس کی زندگی میں نہیں ملتیں یا بہت کم ملتی ہیں، اپنے رفیق الدنیا والآخرۃ حضرت مولٰنا گنگوہی کی گرفتاری اور جیل و حبس کی سزا میں بھی جسے راضی برضا پایا گیا تھا، اسی کے متعلق سنئے مولٰنا منصور علی خاں کسی دوسرے سے سنی ہوئی نہیں، اپنی چشم دید روئت کی یہ روایت سناتے ہیں۔

"ایک بار (نانوتہ واپس ہوتے ہوئے) سفر میں میں بھی ہمراہِ رکاب تھا، واپسی میں جب

نانوتہ ایک میل رہا مولانا صاحب کا حجام نانوتہ سے آتا ہوا ملا' دریافت فرمایا تو عرض کیا کہ میں آپ ہی کے پاس جاتا تھا' فرمایا کیوں ؟"

اب یہی سننے کی بات ہے، حجام قصہ سنانے لگا کہ

"تھانہ دار نانوتہ نے ایک عورت کے بھگانے کا جرم مجھ پر لگا کر چالان کا حکم دیا ہے، میں بالکل بے خطا ہوں، خدا کے واسطے مجھے بچایئے"۔

اللہ اللہ جس کے سامنے خدا جانے کتنے بڑے بڑے امیر، اور کتنے علماء وفضلاء، اعزہ واقرباء غدر کے زمانہ میں چالان کئے گئے، اور پھانسی یا عبور دریائے شور کی سزاؤں کے مستحق قرار دئے گئے، خود اس پر بھی جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا' وارنٹ حکومت کی طرف سے جاری ہوا' اور برسوں جاری رہا' لیکن ان سارے واقعات میں ایک عامی مسلمان کی طرح جو اول سے آخر تک دم بخود ہو کر دیکھتا رہا' آج اسی کے سامنے اس کے گاؤں کا حجام کھڑا ہے' اور کہتا ہے کہ

"میں بالکل بے خطا ہوں' خدا کے واسطے مجھے بچایئے"

مولانا منصور علی خاں ہی کی زبانی سنئے' کہ ایک ایسے ساکن بحر محیط میں حجام کے اس طرز بیان نے کس قسم کا تلاطم پیدا کر دیا۔ وہی رقمطراز ہیں کہ

"جس وقت مسجد نانوتہ پہونچے، بیٹھتے ہی' مجھ سے فرمایا کہ منشی محمد یٰسین کو بلا لاؤ"

جانتے ہیں نانوتہ کی مسجد میں بیٹھ کر' گھر جانے سے بھی بیشتر اپنے خاص کارپرداز منشی محمد یٰسین کی طلبی کس کام کے لئے ہوتی ہے ؟ مولوی منصور علی خاں صاحب یہ بیان کر کے کہ حسب ارشاد منشی محمد یٰسین صاحب کو میں بلا کر لے آیا' وہ حضرت والا کے سامنے کھڑے تھے، اور مولوی منصور علیخاں صاحب کے کان میں جلال وہیبت میں ملی ہوئی آواز آرہی تھی خود وہی فرماتے ہیں کہ

"ان سے (منشی محمد یٰسین سے) عجب شان جلالی سے فرمایا کہ اس غریب (حجام) کو تھانہ دار نے بے قصور پکڑا ہے' تم اس سے (تھانہ دار سے) کہدو کہ یہ (حجام) ہمارا آدمی ہے اس کو چھوڑ دو' ورنہ تم کبھی نہ بچو گے"۔

اور بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی، اسی کے ساتھ سنایہ گیا کہ خلاف دستور یہ بھی فرما رہے ہیں کہ

"اس کے (حجام کے) ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالوگے تو تمہارے ہاتھ میں بھی ہتھکڑی پڑے گی" ص۱۵۰

منشی محمد لیسین مرحوم اس رنگ کو دیکھ کر دنگ ہو کر رہ گئے، الٹے پاؤں تھانہ دار صاحب کے پاس پہونچے، اور بقول مولٰنا منصور علی خاں مرحوم،

"تھانہ دار کے پاس جاکر مولٰنا صاحب کا ارشاد ہو بہو کہلا یا"

مگر تھانہ دار اپنا ہاتھ کاٹ چکا تھا، تھانہ کے روزنامچہ میں مجرم پر جرم کا الزام عائد کرکے اپنے اختیار تمیزی کی قوت ختم کرچکا تھا، گھبرا کر منشی محمد لیسین صاحب سے تھانہ دار نے کہا کہ

"اب کیا ہوسکتا ہے روزنامچہ میں اس کا (حجام) کا نام لکھدیا گیا ہے"۔

تھانہ دار بے چارا خیال کرتا تھا کہ مولٰنا کا حکم اس کے اختیاری حدود تک محدود ہے، مگر منشی محمد لیسین صاحب کو دیکھا کہ پھر واپس چلے آرہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں، کہ حضرت کا حکم ہے کہ تھانیدار

"جاکر کہدو، کہ اس کا نام روزنامچے سے نکال دو"۔

مغلی نہیں، بلکہ برطانوی طرز حکومت کے تھانہ میں یہ تصرف کہ روزنامچہ میں درج ہونے کے بعد مجرم کا نام کاٹ دیا جائے ظاہر ہے کہ خود جرم اور بدترین جرم تھا، تھانہ دار سخت حیران تھا، منشی محمد لیسین صاحب نے جب روزنامچہ سے نام کاٹ دینے کی فرمائش مولٰنا کی طرف سے پیش کی تو تھانہ دار نے کہا کہ

"نام لکھا ہوا کاٹنا بڑا جرم ہے"

اور بات پوری بھی کرنے نہ پایا تھا کہ عالم سراسیمگی میں منشی محمد لیسین صاحب سے کہا کہ

"چلو میں بھی مولٰنا صاحب کے پاس تمہارے ساتھ چلتا ہوں"

ہانپتے کانپتے، حالت اضطراب میں حضرت والا کے پاس مسجد ہی میں تھانہ دار حاضر ہوا، اور بے کسی کے ساتھ جیسا کہ مولٰنا منصور علی خاں نے لکھا ہے حضرت کی خدمت میں عرض کر رہا تھا کہ

"حضرت نام نکالنا بڑا جرم ہے"

اور کیسا جرم؟ اسی نے بیان کیا کہ

"اگر نام اس کار (حجام) کا نکالا میری نوکری جاتی رہیگی"

ظاہر ہے جاج شیٹ قائم کرنے کے بعد اس قسم کے مجرمانہ تصرف کا یہی نتیجہ تصرف کرنے والے کے سامنے قانوناً آسکتا تھا، اس سے حضرت والا بھی ناواقف نہ تھے، مگر آج رنگ ہی دوسرا تھا، تھانہ دار تو یہ عرض کررہا تھا کہ اس جرم کے بعد میری نوکری جاتی رہے گی، لیکن تھانہ داروں یا سرکاری ملازموں کے عزل ونصب کا اختیار جن ہاتھوں میں لوگوں کو نظر آتا ہے، کیا واقعی یہ اختیار ان ہی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے، آج قوانین عالم کا ایک شارح اس کی شرح اپنے ان الفاظ میں تھانہ دار کے آگے کررہا تھا، کہ

"اس کار (حجام) کا نام (روزنامچہ) کاٹ دو، تمہاری نوکری نہیں جائے گی"

کسی ادنیٰ چپراسی یا گاؤں کے چوکیدار کے تقرر یا برطرفی کا اختیار بھی بظاہر جس کے ہاتھ میں نظر نہیں آتا تھا وہ پولیس کے ایک افسر کو اطمینان دلا رہا ہے کہ نوکری نہیں جائے گی، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس افسر ہی کی نہیں بلکہ حکومت کی مطلق "نوکری" بھی صرف اس کی منشا کی تابع ہے، مولانا منصور علی خاں صاحب بھی موجود تھے اس وقت ان کے جو احساسات تھے ان کا اظہار، ان الفاظ میں فرمایا ہو کہ

"اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ مولٰنا صاحب فرمارہے ہیں ایسا ہی ہوگا"

واللہ اعلم ان کو کیا معلوم ہورہا تھا، آگے اسی کے بعد وہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ

"جس نے وہ حالت دیکھی ہے، اس کے یقین میں (یعنی جو کچھ کہا جارہا ہے یہی ہوکر رہیگا)

ذرا بھی شک نہیں تھا"

کیا فکنت[1] بصرہ الذی یبصر بہ وسمعہ الذی یسمع بہ ویدہ التی یبطش بہا ورجلہ التی

---

[1] بخاری وغیرہ کے الفاظ ہیں کہ بندہ جب اپنے خالق کا محبوب بن جاتا ہے تو ارشاد ربانی ہے کہ میں اسکی بینائی ہوجاتا ہوں جس سے دیکھتا ہے اس کی شنوائی ہوجاتا ہوں جس سے سنتا ہے، اسکے ہاتھ ہوجاتا ہوں جن سے پکڑتا ہے، اس کے پاؤں ہوجاتا ہوں جن سے چلتا ہے، قرآن میں "راضیۃ" کے عمل کا صلہ "مرضیۃ" جو فرمایا گیا ہے شاید اسی کی یہ شرح ہے ۱۲

یمشی بھا کا راز ان کے سامنے بے پردہ ہوگیا تھا' کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کیا حالت تھی کہ جس کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا' نظر آرہا تھا کہ اسی کے کہنے اور صرف کہنے سے سب کچھ ہوجائے گا اور جو کچھ کہا جا رہا تھا یہ حال تو دیکھنے والوں کا اس کے واقع ہونے سے پہلے کا تھا' پھر ہوا کیا؟ تھانہ دار تھانہ واپس آیا' دم بخود تھا قلم ہاتھ میں تھا' اور باضابطہ سرکاری روزنامچہ سے مجرم کے لکھے ہوئے نام کو کاٹ رہا تھا' یہ سوچتے ہوئے کاٹ رہا تھا کہ اپنی برطرفی کے کاغذ پر خود ہی دستخط کر رہا ہوں' مگر جیسا کہ مولٰنا منصور علی خاں کی چشم دید شہادت ہے کہ

"اس حجام کو اس نے چھوڑ دیا اور برابر تھانہ دار (تھانہ دار) ہی رہا" ص۱۷۰

کیا دلچسپ تماشہ تھا' وہی جسے رامپور میں دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ نواب کلب علی خاں مرحوم کے وزیر عثمان خاں اور ان کے سکریٹری سے اس درخواست کے جواب میں کہ نواب صاحب حضرت والا کی زیارت کے بے حد آرزو مند ہیں' کمال استغنا رسے یہ کہہ رہا ہو کہ

"نواب صاحب ہی تو میری ملاقات کے مشتاق ہیں' میں تو ان کی زیارت کا مشتاق نہیں ہوں' اگر ان کو اشتیاق ہے تو خود مجھ سے ملنے آئیں' ان کے پیروں میں تو منہدی لگی ہوئی نہیں ہے" (ارواح ص۱۹۹)

اور مرحوم نواب محمود علی خاں والی ریاست چھتاری کو یہ جانتے ہوئے کہ وہ مخلص عقیدت مندوں میں ہیں' محض اس لئے کہ لاکھ مخلص ہوں مگر ہیں تو امیر آدمی بقول امیر شاہ خاں صاحب مولٰنا (نانوتوی) ان سے بھی کبھی نہیں ملے' ہوتا یہ تھا کہ

"اگر حضرت (نانوتوی) نے علیگڈھ آنے کی خبر سنکر وہ (نواب چھتاری) علیگڈھ آئے تو مولٰنا جھٹ خورجہ تشریف لے گئے' اور جو خورجہ گئے' تو حضرت میرٹھ آئے" ص۱۹۹

اور وقت کے ملک التجار شیخ عبدالکریم رئیس لال کرتی (میرٹھ) کی پیش کی ہوئی روپے کی تھیلی کو واقعی جوتیوں میں ڈلوا کر ٹھوکر لگانے کا جو عادی ہو (دیکھو ارواح ص۲۰۰) وہی نانوتے کے ایک دہقانی حجام کے لئے آج زمین کے قلابے آسمان سے ملا رہا ہے' اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بس میں جو کچھ بھی ہے'

سب کچھ کر گذرنے کے لئے تیار ہے، اور یہ خاص ادا آپ کی کچھ اسی غریب نانوتوی حجام ہی کے ساتھ مختص نہ تھی بلکہ ہر گرے پڑے کے لئے اٹھنا ہی آپ کی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت تھی، آپ کی زندگی کا یہ ایک مستقل پہلو ہے، موقعہ پر انشاء اللہ اس کا تذکرہ کیا جائے گا۔ اور مثالی نمونہ میں اسی وقت انشاء اللہ پیش ہوں گی۔

اس وقت تو ذکر اس کا ہو رہا تھا کہ ولایت خاصہ کے جس مقام سے کم سنی میں آپ سرفراز ہو چکے تھے، اس کے آثار و ثمرات کا ظہور اگر ہونا بھی تھا، تو اسی قسم کے ناپرساؤں، درماندوں کے لئے ہونا تھا، وہی پوچھے جاتے تھے، جنھیں کوئی نہیں پوچھتا تھا، وہی بڑے بن جاتے تھے جو عام نگاہوں میں چھوٹے سمجھے جاتے تھے، اور اس سلسلہ میں بھی آپ کی شفقت خاص کے زیادہ مستحق دینی علوم کے وہ طلبہ تھے، جنھیں نئی قائم ہونے والی حکومت مسلط نے حکومت ہی کی حدود سے باہر نہیں کر دیا تھا، بلکہ اسی نوزائیدہ حکومت کے مخفی حکیمانہ طرز عمل نے خود اپنی قوم مسلمانوں کا بھی راندہ، اور دُر دُرایا دُھتکارا ہوا طبقہ ان کو بنا دیا تھا، مگر جو کہیں نہیں چلے جاتے تھے، دربار قاسمی میں وہی محبوبیت کے مرکز وحید بنے ہوئے تھے، اور سچ پوچھئے تو دار العلوم دیوبند کہیے، یا ہندوستان کے طول و عرض میں آپ سے وابستہ علماء و طلباء کی عمومیت جو تقریباً ایک صدی سے دینی خدمات کے ذیل میں علم آموزی کیساتھ غریب الدیار طلبہ اور عام بیکسوں کی مشفقانہ راہنمائی دستگیری اور ہر قسم کی مادی و روحانی اعانتوں میں مشغول ہے، درحقیقت اسی غریب نواز تجلی کا کھلا ہوا مظہر ہے۔ ان کی اسی روشنی سے خاکِ ہند کے ذرات جگمگا رہے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس قاسمی روشنی سے کب تک ان کی درخشانی اور تابانی اپنا کام کرتی رہے گی۔

اسی محبوبیت کا نتیجہ ہے کہ باوجود اخفاء و ستر کی انتہائی کوششوں کے ضرورت پڑ جاتی تھی، تو باطنی تصرفات کی ان خداداد قوتوں سے ان ہی غریب طالبعلموں کی کبھی کبھی امداد فرمادی جاتی تھی، خود ہمارے ان ہی مولٰنا منصور علی خاں صاحب کی ایک دلچسپ داستان کتابوں میں پائی جاتی ہے، راوی بھی اسکے حضرت والا کے خلف رشید حافظ محمد احمد مرحوم مہتمم دار العلوم دیوبند میں

مفصل داستان تو ارواح ثلاثہ میں پڑھئے، حاصل یہ ہے کہ" درہنگام نوجوانی چنانچہ افتددانی" کے شکار کسی طرح سے اسی زمانہ میں حکیم صاحب یعنی مولٰنا منصور علی خاں صاحب بھی ہوگئے تھے، جب سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، حالت روز بروز بد سے بدتر ہونے لگی، استاد نے افتاد کا اندازہ کرلیا' پہلے تو کچھ عقلی تدبیروں سے کام لیا گیا' اور آخر میں جیسا کہ حافظ صاحب مرحوم سے بعد کو مولٰنا منصور علی خاں نے خود بھی بیان کیا کہ مغرب کی نماز کے بعد حکم دیا گیا کہ چھتہ کی مسجد میں حاضر ہوں' صلوٰۃ الاوابین سے فارغ ہو کر مولوی صاحب کہتے تھے کہ میرا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر میری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی سے اس طرح رگڑا' جیسے بان بٹے جاتے ہیں' آگے مولٰنا منصور علی خاں کے بجنسہٖ الفاظ یہ نقل کئے گئے ہیں کہ

" خدا کی قسم میں نے بالکل عیاناً دیکھا کہ میں عرش کے نیچے ہوں' اور ہر چہار طرف سے نور اور روشنی نے میرا احاطہ کرلیا ہے' گویا میں دربار الٰہی میں حاضر ہوں' میں اس وقت لرزاں اور ترساں تھا کہ ساری عمر مجھ پر یہ کیفیت اور یہ خوف طاری نہ ہوا تھا' میں پسینہ پسینہ ہوگیا اور بالکل خودی سے گزر گیا" (ارواح ص۲۰۱)

فرماتے تھے کہ میں تو اس حال میں مستغرق تھا اور حضرت والا برابر میری ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی پھیر رہے تھے، جب ہتھیلی پھیرنے کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو مولٰنا منصور علی خاں کا بیان ہے کہ" مکاشفہ کی جو حالت ان پر طاری ہوئی تھی وہ حالت جاتی رہی' اور حکم دیا گیا کہ جاؤ' پھر کیا ہوا! خود کہا کرتے تھے۔ دو دن بعد پوچھا گیا تھا بولے کہ جس کے لئے اتنی بے کلی اور بے چینی تھی اس کے تصور کی بھی قلب میں گنجائش باقی نہ رہی فرمایا گیا کہ

" اللہ کا شکر کرو" ص۲۰۱۔

اور یہ روایت تو بالواسطہ ہم تک پہونچی ہے، اپنی کتاب" مذہب منصور" میں مولٰنا منصور علی نے اپنی" آپ بیتی" حکایت خود بھی درج کی ہے، واللہ اعلم یہ واقعہ اس" چنانکہ افتددانی" سے پہلے کا ہے یا بعد کا، بہر حال قصہ یہ ہے، لکھا ہے کہ

"ایک دفعہ میں نے مولانا صاحب (حضرت نانوتوی) سے بر سبیل تذکرہ شکایت کی کہ مجھکو کبھی رونا نہیں آتا"

شاید یہ ان کی پٹھانیت کا اقتضاء تھا، بہرحال شکایت سن لی گئی، کہتے ہیں کہ

"اسی دن دوپہر کو جب سو کر اٹھا، اس قدر رویا کہ ہرچند چاہتا تھا کہ موقوف کروں مگر آنسو نہیں تھمتے تھے اور کوئی وجہ رونے کی بھی معلوم نہیں ہوتی تھی" ص۱۸۱

پھر خود ہی ان کو خیال آیا کہ

"آج میں نے مولانا صاحب سے شکایت کی تھی یہ اسی کا ثمرہ ہے"

اور گو آنسو مولانا منصور علی خان کے بظاہر تھم ہی گئے ہوں گے، اگر سچ پوچھئے تو جیسا کہ انکے جاننے والے جانتے ہیں کہ ساری عمر اس کے بعد ان کی روتے ہی کٹی، سوز و گداز کے سوا شاید وہ اور کچھ باقی نہیں رہے تھے۔ آہن موم ہو گیا، اور موم ہی بن کر زندگی کی آخری سانسیں پوری کیں، فرحمہ اللہ ونصر اللہ ضریحہ۔ ان کی کتاب "مذہب منصور" جو بظاہر علم کلام کی کتاب ہے لیکن اپنے قلب کی اس کیفیت کو وہ چھپا نہیں سکے ہیں؛

اور اس قسم کی باتیں تو کتابوں میں اِدھر اُدھر مل جاتی ہیں، ورنہ دینی علوم کے ان طلبہ کے ساتھ دستگیریوں کے جو قصے حلقہ دیوبند کے خواص و عوام میں مشہور اور زبان زد ہیں، ان کا تو شمار مشکل ہے، خود حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنی گذری ہوئی بیان فرمایا کرتے تھے کہ تعلیم سے جب فارغ ہوا، تو میرا تقرر حضرت الاستاذ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت کے لئے فرما دیا، غالباً مدرس پنجم کا عہدہ ابتداءً آپ کے لئے تجویز ہوا، تنخواہ شاید پندرہ روپئے ماہوار مقرر ہوئی، فرماتے تھے کہ اس تقرر کی خبر جب مجھے ہوئی تو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں، جو بھی لوگوں میں کچھ بھرم ہے وہ بھی کھل جائے گا یہ سوچ کر سخت پریشان ہوا، کوئی تدبیر روپوشی کے سوا اس رسوائی سے بچنے کے لئے سمجھ میں نہ آئی، گھر والوں کو بھی خبر دیئے بغیر روپوش ہو گیا۔ حضرت الاستاذ کو میری روپوشی کی خبر ہوئی، تلاش میں لوگ لگا دیئے گئے، کب تک روپوشی نبھتی آخر دس پندرہ دن بعد خدمت والا میں لا کر حاضر کر دیئے گئے،

پوچھنے لگے کیوں میاں محمود! یہ تم نے کیا کیا، حضرت شیخ الہند کا بیان تھا تب آبدیدہ ہو کر عرض کرنے لگے
کہ حضرت! آپ کی باتیں مجھے بھلی معلوم ہوتی ہیں، سنتا ہوں تو لذت ملتی ہے، اس لئے محض نام نہاد طور
پر پڑھنے کا حیلہ کر کے حلقۂ درس میں آکر بیٹھ جایا کرتا تھا، لیکن پڑھنے کی نیت سے میں نے پڑھا کب مجھے
اسی لئے آیا ہی کیا ہے جو دوسروں کو پڑھاؤں (اب الفاظ تو بعینہ یاد نہیں ہے لیکن مفہوم یہی تھا
اور الفاظ بھی اکثر و بیشتر ممکن ہیں یہی ہوں) سیدنا الامام الکبیر کی دوربیں نگاہ قدسی جسے سرزمین ہند کا
شیخ الکل دیکھ رہی تھی، اس کی زبان سے ان الفاظ کو سنکر مسکرا کر فرمانے لگے، آؤ! محمود سامنے آؤ!
پھر جیسے گھوڑے کو تھپکیاں دی جاتی ہیں، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی پشت مبارک پر سیدنا
الامام الکبیر نے چند تھپکیاں دیتے ہوئے فرمایا کہ

"جاؤ! جاکر پڑھاؤ"

شاید یہ بھی فرمایا کہ تمہیں تو بہت کچھ پڑھانا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ توجہ بالید کی سنت کا احیاء
اس طریقہ سے نہیں کیا جا رہا تھا، بہرحال وہ دن تھا اور اس کے بعد اس زمانہ کو بھی اس ظلوم وجہول
نے دیکھا جب پڑھانے میں رسوا ہو جانے کے خوف سے روپوش ہو جانے والے مولانا محمود الحسن
طاب ثراہ کو اس حال میں پایا کہ خاتم الفقہاء والمحدثین الامام الکشمیری، اور شیخ مدنی جیسے اکابر
علماء طلبہ کے حلقے میں استفادہ کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں اور شیخ الہندی کی مسند پر ہند کے شیخ
اعظم جلوہ فرما ہیں، یاد آتا ہے کہ اسی قصہ کو دہراتے ہوئے ایک دفعہ حضرت شیخ الہند فرمانے لگے

"بھائی یہی چند کانے کترے لوگ حضرت کے بعد رہ گئے جن سے خدا کام لے رہا ہے"

اپنے ساتھ اپنے دوسرے چند رفقاء درس کا بھی اس سلسلہ میں ذکر فرما رہے تھے ان ہی کی طرف
"کانے کترے" کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا تھا۔

کوئی جمع کرنا چاہے تو طلبہ علم کی دستگیریوں اور چشتی بانیوں کے غیر معمولی مظاہر کا کافی ذخیرہ
جمع کر سکتا ہے، اگرچہ روز بروز اب ان کے جاننے والوں کی تعداد گھٹ رہی ہے، اس سلسلہ
میں بے ساختہ اس قصے کا خیال آرہا ہے جسے مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم سے تو خاکسار نے سنا ہی تھا

مگر حافظہ اگر غلطی نہیں کر رہا ہے، تو کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ براہ راست خود حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو بیان فرمایا تھا، اور فقیر سن رہا تھا مطلب یہ ہے کہ دینی علوم کے طلبہ کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کی امدادی کرامتوں کی یوں تو مجسم شہادت خود دار العلوم دیوبند اور اس کا عریض وطویل نظام ہے ہی، لیکن ان کرامتوں کا تعلق تو زندگی کے ناسوتی دور سے ہے، جن کا سلسلہ بحمد اللہ اس وقت تک جاری ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ کب تک قاسمی فیوض وبرکات کا یہ سلسلہ جاری رہے گا، لیکن ناسوتی زندگی کے ختم ہونے کے بعد بھی دینی علوم کے طلبہ کے ساتھ آپ کے شغف کا یہی حال ہے، اس کا اندازہ اس روایت سے ہو سکتا ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ کچھ دن ہوئے ایک خستہ حال، شکستہ بال آدمی میرے پاس آیا، اور کہنے لگا کہ میں آپ کے دورۂ حدیث کے حلقہ میں شریک ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سننا چاہتا ہوں، لیکن چونکہ میری علمی صلاحیت ایسی نہیں ہے کہ امتحان میں شریک ہو سکوں، اس لئے امتحان کی شرط میرے لئے نہ لگائی جائے، اسی کیساتھ یہ بھی اس نے کہا کہ اپنے قیام وطعام کے مصارف بھی میں برداشت نہیں کر سکتا، مدرسہ کی طرف سے اس کا نظم فرما دیا جائے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی! مدرسہ کا قانون تو یہی ہے کہ وظیفہ پانے والے طلبہ کے لئے امتحان کی شرکت ناگزیر ہے، تم امتحان میں بھی شریک ہونا نہیں چاہتے، اور مدرسہ سے امداد کے بھی خواہاں ہو، آخر اس کا امکان ہی کیا ہے، مگر قابل رحم طالب العلم برابر اصرار کئے جا رہا تھا کہ میرے لئے تو کوئی استثنائی صورت نکالنی ہی پڑے گی، حضرت حیران تھے، دیکھ کر اس کو رحم بھی آتا تھا لیکن مدرسہ کے قانون کی مجبوری تھی، کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی، اس وقت تو طالب العلم کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا گیا کہ اچھا جاؤ، دیکھا جائیگا، حضرت شیخ الہند جب مدرسہ تشریف لائے، تو ڈاک میں دوسرے منی آرڈروں کے ساتھ ایک منی آرڈر جو غالباً بھوپال سے کسی صاحب کا بھیجا ہوا تھا، شاید پانچ روپیہ کا منی آرڈر تھا اور کوپن میں لکھا ہوا تھا کہ ایک سال تک پانچ روپیہ کا یہ وظیفہ

ماہ بماہ بھیجا جائے گا، کسی ایسے طالب العلم کو دیا جائے، جو قانوناً مدرسہ کی امداد کا مستحق نہ ہو
کو پن کی اس عبارت کے ساتھ ہی جیسا کہ چاہئے تھا، حضرت شیخ الہند کا خیال اسی قابل رحم
طالب العلم کی طرف منتقل ہو گیا، اسی وقت یاد فرمایا گیا، اور بشارت سنائی گئی کہ لو تمہارے
طعام کا نظم اللہ میاں کی طرف سے ہو گیا، وظیفہ جاری کر دیا گیا، اور اس کی جو آرزو تھی، دورہ
میں شریک ہو کر حدیث سن لی، تعلیمی مدت کے اختتام پر وہ مدرسہ سے چلا گیا، حضرت شیخ الہند
فرماتے تھے کہ چند سال گذر گئے، پھر اس طالب العلم کی کوئی خبر نہ ملی، بلکہ اس کا خیال بھی دماغ
سے نکل گیا، اچانک کئی سال بعد دیکھتا ہوں کہ وہی طالب العلم آیا ہوا ہے، تعارف کرایا
کہ وہی طالب العلم ہوں جو قانوناً مدرسہ کی امداد کا مستحق نہ تھا، حضرت نے پوچھا کہ اس عرصے
میں تم کہاں رہے، یہی قصہ اب سننے کا ہے جو اس نے بیان کیا، کہنے لگا کہ حضرت سے
رخصت ہو کر غالباً وہ پنجاب کی طرف کسی علاقہ میں چلا گیا، اور کسی قصبہ کی مسجد میں لوگوں نے
ان کو امام کی جگہ دے دی، قصبہ والے ان سے کافی مانوس ہو گئے، اور اچھی گذر بسر ہونے لگی
اسی عرصہ میں کوئی مولوی صاحب گشت کرتے ہوئے اس قصبہ میں بھی آدھمکے، وعظ و تقریر
کا سلسلہ شروع کیا، لوگ ان کے کچھ معتقد ہوئے، انھوں نے دریافت کیا کہ یہاں کی مسجد کا
امام کون ہے، کہا گیا کہ دیوبند کے پڑھے ہوئے ایک مولوی صاحب ہیں، دیوبند کا نام سننا
تھا کہ واعظ مولنا صاحب آگ بگولا ہو گئے، اور فتوے دے دیا کہ اس عرصے میں جتنی نمازیں
اس دیوبندی کے پیچھے تم لوگوں نے پڑھی ہیں، وہ سرے سے ادا ہی نہیں ہوئیں، اور جیسا کہ
دستور ہے، دیوبندی یہ ہیں، وہ ہیں، یہ کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں، اسلام کے دشمن ہیں رسول اللہ صلے
اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

قصباتی مسلمان بے چارے سخت حیران ہوئے کہ مفت میں اس مولوی پر روپے بھی برباد
ہوئے اور نمازیں بھی برباد ہوئیں، ایک وفد اس غریب دیوبندی امام کے پاس پہونچا۔
اور مستدعی ہوا کہ مولنا واعظ صاحب جو ہمارے قصبہ میں آئے ہیں، ان کے جو الزامات ہیں

یا تو ان کا جواب دیجئے ورنہ پھر بتایئے کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ کیا کریں' جان بھی غریب کی خطرے میں آگئی اور نوکری دوکری کا قصہ تو ختم شدہ ہی معلوم ہونے لگا چونکہ علمی مواد بھی ان کا معمولی تھا' خوف زدہ ہوئے کہ خدا جانے یہ واعظ مولنا صاحب کس پائے کے عالم ہیں منطق و فلسفہ بگھاریں گے۔ اور میں غریب اپنا سیدھا سادہ ملا ہوں' ان سے بازی لے بھی جا سکتا ہوں یا نہیں' تاہم چارہ کار اسکے سوا اور کیا تھا' کہ مناظرہ کا وعدہ ڈرتے ڈرتے کر لیا' تاریخ اور محل و مقام سب کا مسئلہ طے ہو گیا واعظ مولنا صاحب بڑا زبردست عمامہ طویلہ و عریضہ سر پر لپیٹے ہوئے کتابوں کے پشتارے کے ساتھ مجلس میں اپنے حواریوں کے ساتھ جلوہ فرما ہوئے، ادھر یہ غریب دیوبندی امام منحنی و ضعیف مسکین شکل مسکین آواز' خوف زدہ' لرزاں و ترساں بھی اللہ اللہ کرتے ہوئے سامنے آیا' سننے کی بات یہی ہے جو اس کے بعد اس دیوبندی امام مولوی نے مشاہدہ کے بعد بیان کی' کہتے تھے کہ مولنا واعظ صاحب کے سامنے میں بھی بیٹھ گیا' ابھی گفتگو شروع نہیں ہوئی تھی کہ اچانک اپنے بازو میں مجھے محسوس ہوا کہ ایک شخص اور جسے میں نہیں پہچانتا تھا وہ بھی آکر بیٹھ گیا ہے' اور مجھ سے وہ اجنبی اچانک نمودار ہونے والی شخصیت کہتی ہے کہ ہاں! گفتگو شروع کرو، اور پھر گز نہ ڈرو، دل میں غیر معمولی قوت اس سے پیدا ہوئی، اس کے بعد کیا ہوا' دیوبندی امام صاحب کا بیان ہے کہ میری زبان سے کچھ فقرے نکل رہے تھے اور اس طور پر نکل رہے تھے' کہ میں خود نہیں جانتا تھا کہ کیا کہہ رہا ہوں' جس کا جواب مولنا واعظ صاحب نے ابتدا میں تو دیا' لیکن سوال و جواب کا سلسلہ ابھی زیادہ دراز بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دفعہ مولنا واعظ صاحب کو دیکھتا ہوں کہ اٹھ کھڑے ہوئے میرے قدموں پر سر ڈالے ہوئے رو رہے ہیں' پگڑی بکھری ہوئی ہے، اور کہتے جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اتنے بڑے عالم ہیں' للہ معاف کیجئے۔ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں یہی صحیح اور درست ہے' میں ہی غلطی پر تھا؛

یہ منظر ہی ایسا تھا کہ مجمع دم بخود تھا، کیا سوچ کر آیا تھا اور کیا دیکھ رہا تھا۔ دیوبندی امام صاحب نے کہا کہ اچانک نمودار ہونے والی شخصیت میری نظر سے اس کے بعد اوجھل ہو گئی' اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ کون تھے اور یہ قصہ کیا تھا؛

قصہ تو ختم ہوگیا۔ قصبہ کے مسلمان جو پہلے ہی سے دیوبندی امام صاحب کے معتقد تھے ان کی عقیدتمندیوں میں اس واقعہ نے چار چاند لگا دیئے، اور پہلے سے بھی زیادہ راحت و آرام میں دیوبندی امام صاحب کے اضافہ ہوگیا۔

حضرت شیخ الہند فرماتے تھے، میں نے ان مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ اچانک نمودار ہوکر غائب ہوجانے والی شخصیت کا حلیہ کیا تھا، حلیہ جو بیان کیا فرماتے تھے کہ سنتا جاتا تھا اور حضرت الاستاذ کا ایک ایک خال و خط نظر کے سامنے آتا چلا جارہا تھا، جب وہ بیان ختم کرچکے تو میں نے ان سے کہا کہ یہ تو حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جو تمہاری امداد کے لئے[1] حق تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوئے۔

[1] جو نہیں جانتے ہیں وہ تو خیر جاہل ہیں لیکن جان کر بھی علماء دیوبند کے متعلق بہتان تراشیوں اور تہمت بافیوں کی خدمت جو انجام دے رہے ہیں ان کو اپنے اعمال کا محاسبہ اسی کے سامنے دینا ہوگا جس کے سامنے نہ منطق ان کی چلے گی اور نہ مولویانہ پیترے کام آئیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وفات یافتہ بزرگوں کی روحوں سے امداد کے مسئلہ میں علماء دیوبند کا خیال بھی وہی ہے جو عام اہل السنت والجماعت کا ہے، آخر جب ملائکہ جیسی روحانی ہستیوں سے خود قرآن ہی میں ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی امداد کراتے ہیں، صحیح حدیثوں میں ہے کہ واقعہ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تخفیف صلوات کے مسئلہ میں امداد ملی، اور دوسرے انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں بشارتیں ملیں، تو اسی قسم کی ارواح طیبہ سے کسی مصیبت زدہ مومن کی امداد کا کام قدرت اگر لے تو قرآن کی کس آیت یا کس حدیث سے اس کی تردید ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ آدمی کو عام طور پر جو امداد بھی مل رہی ہے، حق تعالیٰ اپنی مخلوقات ہی سے تو یہ امدادیں پہنچا رہے ہیں، روشنی آفتاب سے ملتی ہے، دودھ ہمیں گائے اور بھینس سے ملتا ہے، یہ تو ایک واقعہ ہے بھلا یہ بھی انکار کرنے کی کوئی چیز ہوسکتی ہے، ہاں! سوال یہ ہے کہ ان چیزوں کے امدادی پہلوؤں سے استفادہ یا ان کے نقصان رساں پہلوؤں سے بچنے کی قدرتی راہ کیا ہے، مشرک قوموں کا طریقہ کار یہ ہے کہ بجائے امداد پہنچانے والی حقیقی قوت کے امداد کے ان ذرائع اور وسائط ہی کو پوجنے لگتی ہیں، مثلاً روشنی کے لئے آفتاب کو پوجتی ہیں یا زہر سے بچنے کے لئے سانپ کو پوجتی ہیں اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نفع ہو یا نقصان خواہ بلا واسطہ پہونچے یا بالواسطہ ہر حال میں سب کو اسی کی طرف سے سمجھتے ہیں، جو ان ذرائع اور وسائط سے نفع اور نقصان کی صورتوں کو پیدا کررہا ہے۔ ہم دودھ کے لئے بھینس یا گائے کو نہیں پوجتے بلکہ اس کو پوجتے ہیں، اس سے مانگتے ہیں جو گوشت کی ان تھیلیوں میں دودھ پیدا کرتا ہے بس۔ بزرگوں کی ارواح سے مدد لینے کے ہم منکر نہیں ہیں بلکہ اس امداد کے لئے بزرگوں کی یا ان کی قبروں کی ان کے آثار کی عبادت کو شرک یقین کرتے ہیں۔ موحد اور مشرک کے نقطۂ نظر میں یہی جوہری فرق ہے (بقیہ صفحہ آئندہ)

خلاصہ یہ ہے کہ کچھ اسی قسم کے گرے پڑے، نا پرسان حال غم خواروں کی غم خواریوں، دل افگاروں کی دلدازیوں کے سلسلے میں اب معلوم ہوتا ہے کہ اضطراراً ولایت کے ان آثار و ثمرات کا ظہور آپ سے اتفاقاً ہو جاتا تھا، اگرچہ اس میں بھی کوشش اسی کی کی جاتی تھی کہ ان مصیبت زدوں کا کام بھی نکل جائے، لیکن ان کو اس کا پتہ نہ چلے کہ کام نکالنے والے نے کسی غیر معمولی قوت سے کام لیا ہے۔ دہی خورجہ کے حاجی محمد اسحٰق بے چارے جو ذاکر و شاغل اور پابند صوم و صلوٰۃ سیدھے سادے مسلمان تھے اچانک ایک دماغی عارضہ میں مبتلا ہوئے، امیر شاہ خاں صاحب نے بیان کیا ہے کہ خود حاجی صاحب مرحوم کہتے تھے کہ

"ایک سخت عذاب میں مبتلا ہوں، جب کوئی گاڑی نکلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے اوپر چل رہی ہے۔ جب بیلوں کے سانٹا مارا جاتا ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے لگتا ہے، جب کتوں میں آپس میں لڑائی ہوتی ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے کو کاٹتے ہیں، جب چکی چلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ گیہوں کے بدلہ میں میں ہی پس رہا ہوں، لڑکے بھاگتے ہیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر دوڑ رہے ہیں۔"

آخر میں کہتے ہیں کہ

"میں سخت تکلیف میں مبتلا ہوں اور باہر نہیں نکل سکتا، اور نہ چکی کی آواز سن سکتا ہوں۔"

(بقیہ صفحہ ۳۳۴) سیدنا الامام الکبیر کی اس روحانی امداد کا قصہ تو شنیدہ ہے، لیکن اسی سلسلہ کی وہ روایت جس کا ذکر پہلے بھی شاید ہو چکا ہے، یعنی ان شکر رنجیوں کے سلسلے میں جو مولٰنا احمد حسن امروہی اور مولٰنا فخر الحسن گنگوہی کے درمیان کسی وجہ سے ہو گئی تھیں اور حضرت شیخ الہند بھی کچھ دلچسپی اس قصہ میں لینے لگے تھے یہ اطلاع مولانا رفیع الدین نے دی کہ "ابھی ابھی مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جسد عنصری کے ساتھ میرے پاس تشریف لائے تھے اور فرمایا کہ محمود حسن سے کہہ دو کہ اس جھگڑے میں وہ نہ پڑے ص۱۵۵ ارواح ثلاثہ۔ یہ تو ایسی روایت ہے جو ارواح ثلاثہ والے مجموعہ میں چھپ کر عام علماء دیوبند کی نظروں سے گذر چکی ہے، یہ روایت دار العلوم کے مہتمم مولٰنا حبیب الرحمٰن مرحوم کی طرف منسوب کی گئی ہے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر سے گذری ہوئی ہے اس پر مولٰنا کا حاشیہ بھی ہے جس میں جسد عنصری سے روح کی نمود کی توجیہ فرمائی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ اس میں کیا صورت پیش آتی ہے۔ دیکھو ص۱۵۵ ارواح ثلاثہ

حالت یہ ہوگئی تھی، کہ جماعت کے لئے مسجد آنا جانا بھی ان کے لئے دشوار ہوگیا تھا، کان میں روئی کے روئے ٹھونس کر گھر ہی میں پڑے رہتے تھے، امیر شاہ خاں کے حاجی اسحاق دوست بھی تھے سیدنا الامام الکبیر سے بیعت کا شرف بھی ان کو حاصل تھا ان کا حال سن کر خاں صاحب نے فرمایا کہ مناسب ہے کہ اپنے پیر و مرشد (مولٰنا نانوتوی) کو اپنے حال سے آگاہ کرو، جو حالات گذر رہے تھے، لکھکر امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ حاجی صاحب نے کئے، انھوں نے اپنے سفارشی خط کے ساتھ حضرت والا کی خدمت میں بھیجدیئے۔ اس زمانہ میں حضرت کا قیام دلّی ہی میں تھا، جواب میں امیر شاہ خاں کو حضرت کی طرف سے ہدایت ہوئی کہ حاجی اسحاق کو میرے پاس یہیں (دہلی) بھیجدو، حسب الحکم حاضر ہوئے، پھر جیسا کہ خاں صاحب کا بیان ہے کہ

"مولٰنا (نانوتوی) نے کچھ نہیں کیا، صرف اوراد و اشغال کے اوقات بدل دئے"

اور وقت کی صرف اسی ہلکی سی تبدیلی کا نتیجہ یہ دیکھا گیا کہ حاجی اسحاق مرحوم:

"دوسرے ہی دن اچھے ہوگئے"۔

جو کچھ کیا گیا اس کو دیکھ کر بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اوقات کی تبدیلی ازالہ مرض کا سبب بن گئی، لیکن جس قسم کی بیماری میں حاجی صاحب مرحوم مبتلا تھے، کیا اس سے صحت یاب ہونے کے لئے اوراد و اشغال کے اوقات کا بدل جانا کافی تھا، اس راہ کے ایک "محرم اسرار" سے سنئے، اس قصے کے تحت میں حضرت تھانوی نے ارقام فرمایا ہے کہ

"احقر کا وجدان یہ ہے کہ مولٰنا (نانوتوی) نے تصرف فرمایا ہے، اور اخفار تصرف کے لئے اوراد و اشغال کے اوقات بدلے ہیں" ص ۱۷۹

مرشد تھانوی سے تھوڑا بہت قریبی تعلق جو رکھتے ہیں، یا کم از کم "تربیت السالک" کے نام سے حضرت والا کے مراسلات و مکاتبات کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے، جن لوگوں کی نظر سے وہ کتاب گذر چکی ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کے نفسیاتی یا اعصابی عوارض میں مبتلا ہونے والوں کی کتنی بڑی تعداد کے علاج کرنے کا موقعہ آپ کو ملا تھا، اسی لئے ان کے اس فیصلہ کو ایک حاذق و تجربہ کار

نفسیاتی طبیب کا وجدانی فیصلہ یقین کرنا چاہئے (اور یوں بھی ظاہر ہے کہ اگر اس معالجہ کے سلسلہ میں محض تبدیلیٔ اوقات و اشغال کافی تھی تو خط کے ذریعہ یہ تدبیر لکھکر بھیجی جا سکتی تھی، دہلی طلب کرکے پاس بلانے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے صاف واضح ہے کہ انھیں توجہ و تصرف کے لئے طلب کیا گیا تھا، اور یہی توجہ و تصرف حسب بیان مرشد تھانوی ان کا حقیقی علاج تھا، لیکن اخفا و تستر کے لئے اوسے تبدیلیٔ اوقات کی طرف منسوب فرما دیا گیا۔

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں ؎ مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

اگرچہ اپنے ان مختصر الفاظ میں حضرت تھانوی نے بھی سیدنا الامام الکبیر کے شیوہ ستر و اخفا کی طرف اشارہ فرمایا ہے، لیکن پھر بھی گو نہ اس کی حیثیت ایک قیاسی نتیجہ ہی کی ہو سکتی ہے، اگرچہ قیاسی نتیجہ بھی حضرت تھانوی کے ذاتی مشاہدات و تجربات ہی پر مبنی ہے، لیکن اس "فہمیدہ" نتیجہ سے زیادہ دلچسپ "دیدہ شہادت" مشہور صاحب علم و دیں امیر نواب مصطفیٰ[1] خاں شیفتہ نور اللہ ضریحہ کی ہے

[1] اجڑی دلی کے جھلملاتے ہوئے چراغوں میں ایک روشن چراغ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کا وجود بھی تھا، بڑے امیر باپ کے صاحبزادے تھے، جہانگیر آباد کا علاقہ وراثت میں اپنے والد نواب اعظم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں مظفر جنگ مرحوم سے نواب مصطفیٰ خاں کو ملا تھا، اور حکومت انگریزی سے ہوڈل بلول کی جاگیر کے معاوضہ میں پنشن بھی ملتی تھی، ۱۸۵۷ء سے پہلے بڑے کروفر سے دلی میں زندگی گذار رہے تھے، والد نے انکی تعلیم پر خاص توجہ کی تھی، ابتدائی تعلیم میانجی مالا مال سے پائی تھی جو دلی میں معلم الصبیانی میں اپنے وقت کے امام سمجھے جاتے تھے، پھر اعلیٰ علوم و فنون کی تعلیم عربی زبان میں مختلف علماء سے حاصل کی تجوید و قراءۃ کی بھی مشق کی تھی، ۱۲۵۵ھ میں حج و زیارت کی سعادت سے بھی بہرہ اندوز ہوئے، اسی سفر میں انکا جہاز چٹان سے ٹکرا کر دریا برد ہو گیا، لیکن حق تعالیٰ نے نواب صاحب کو بچا لیا، حرمین کی حاضری کے زمانہ میں وہاں کے محدثین اور علماء سے بھی مستفید ہوئے تھے، جن میں ایک شیخ ان کے شیخ عابد سندھی بھی ہیں، واپسی پر عربی و فارسی زبان میں اپنا سفرنامہ بھی مرتب کیا تھا مگر اب نہیں ملتا۔ کتاب الحکومت دلی میں مولوی بشیر احمد نے لکھا ہے کہ شروع میں شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت طریقت نواب صاحب نے کی تھی اور ان کے بعد مولانا غلام علی نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشینوں شاہ احمد سعید و ابو سعید سے بھی مستفید ہوتے رہے۔ یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ نماز باجماعت کے علاوہ تین بجے شب سے اٹھ کر تہجد، ذکر و اشغال میں مشغول رہتے اور صبح کی نماز کے بعد بھی اشراق تک ان ہی مشاغل میں وقت صرف ہوتا، اشراق کے بعد دنیا کے کاروبار کی نگرانی کرتے تھے، گھوڑوں کا شوق آخر عمر تک رہا، لکھا ہے کہ ان کا اصطبل گھوڑوں سے بھرا رہتا تھا، بہرحال نواب صاحب کی (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

جس کا ذکر امیر شاہ خاں مرحوم فرمایا کرتے تھے، کتاب ارواح ثلاثہ میں ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم عنفوان شباب میں بعض شبابی لغزشوں کے شکار ہو گئے تھے لیکن آخر میں مہاجر مدنی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ جو سیدنا الامام الکبیر کے استاذ حدیث تھے، ان کی نظر عنایت نے نواب صاحب کو امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ کمالات کے ان بلند مدارج تک پہونچا دیا تھا کہ مولانا رفیع الدین جیسے اہل کمال کو بھی شاہ عبدالغنی صاحب حکم دیتے تھے کہ

"نواب صاحب (مصطفیٰ خاںؒ) کے پاس جاکر استفادہ کیا کرو"

اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے کہ

"تم ان کی ریاست کو نہ دیکھو! بلکہ ان کے قلب کو دیکھو" ص ۲۷۶

(بقیہ صفحہ ۲۸) زندگی اول سے آخر تک ایک دیندار مسلمان رئیس کی زندگی معلوم ہوتی ہے، لیکن کچھ تو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا جو نقشہ اس زمانہ میں قائم ہو گیا تھا اور کچھ شباب کے تقاضوں کا نتیجہ شاید یہ تھا جسے امیر شاہ خاں صاحب نے بیان کیا ہے، یعنی ایک شاہد بازاری رحموا نامی سے ان کا تعلق تھا، مگر حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ نے نواب صاحب مرحوم کو ہلاکت کے اس گڑھے سے نکال لیا۔ امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ توبہ کی ندامت نواب صاحب پر جب طاری ہوئی تو لوہے کی زنجیروں میں اپنے آپ کو بندھوا کر حکم دیا کہ گھسیٹتے ہوئے لوگ شاہ صاحب کی خدمت میں انکو لے جائیں یہی کیا گیا، شاہ صاحب نے زنجیریں اتروائیں اور پھر ایسا سنبھلے کہ بڑے بڑوں کے لئے ان کی دینی زندگی محل رشک بن گئی۔ غدر کی طوفان بدتمیزی کے شکار یہ بھی ہوئے ایک طرف جہانگیر آباد ان کے دار الریاست کو اطراف کے جاٹوں نے لوٹ کھسوٹ کر برباد کیا اور دوسری طرف انگریزی حکومت کی طرف سے بغاوت کا الزام بھی عائد ہوا کچھ دن جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی، لکھا ہے کہ غدر کے زمانہ میں ایک دفعہ پیادہ پا نواب صاحب جا رہے تھے، دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ آنکھوں سے آنسو جاری، ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے کہتے جاتے تھے تیری شان کریمی کے قربان اتنی ہی سزا دی، ورنہ میں تو اس سے بہت زیادہ کا مستحق تھا۔ امیر شاہ خاں صاحب نے نواب صاحب کی لغزش کے تذکرہ میں ایک بات یہ بھی بیان کی ہے کہ وہی بازاری عورت جس کا ذکر گذرا اس سے کہ ہارم کے نواب نے تعلق پیدا کرنا چاہا، مگر وہ راضی نہ ہوتی تھی، آخر میں سوا لاکھ، دیکھ نواب لوہارو کی طرف سے صرف ایک شب کا معاوضہ پیش ہوا، مگر پھر بھی وہ راضی نہ ہوئی اور بولی کہ یہ میری قیمت نہیں بلکہ نواب مصطفیٰ خاں کی آبرو کی قیمت نواب لوہارو دینا چاہتا ہے مگر وہ اتنے ارزاں نہیں ہیں (ارواح ص ۲۷۶) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر جو مصیبت آئی تھی اس کے اسباب کیا تھے، یہ تھا مسلمانوں کا رنگ کہ سوا سوا لاکھ روپے ایک ایک رات کیلئے مالزادیوں کی نذر ہوتے تھے، اور نواب مصطفیٰ خاں جیسے پاکباز امیر کی پاکبازی کا دامن بھی اس آلودگی سے پاک نہ تھا۔ اخیر خدا کا فضل ہوا، امیر شاہ خاں ہی کی روایت ہے کہ مولانا شاہ عبدالغنی کے خلیفہ اول تھے شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ کا معیار جتنا بلند تھا اس کے لحاظ سے یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے لیکن قتل کرنے کے لئے پیغمبر کو ڈھونڈھنے والا جب فاروق اعظم بن سکتا ہے تو نواب مصطفیٰ خاں جو کچھ بھی ہوئے اس پر تعجب کیوں کیجئے؟

مولنٰنا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے جو واقف ہیں اس کتاب میں بھی مختلف حیثیتوں سے ان کا تذکرہ گذر چکا ہے، ان کی جلالت قدر کے لئے یہی کافی ہے کہ دار العلوم دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولنٰنا عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ ان ہی کے مرید اور خلیفہ خاص تھے. بہرحال کہنا یہ ہے کہ ان ہی نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کا ذاتی تجربہ سیدنا الامام الکبیر کے متعلق امیر شاہ خاں بایں الفاظ نقل کیا کرتے تھے کہ

"نواب مصطفیٰ خاں کی یہ عادت تھی کہ ہمارے اکابر (خانوادہ ولی اللّٰہی) میں سے جب کوئی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو فوراً مراقب ہو کر ان کی نسبت کی ٹوہ میں لگ جاتے تھے، ایک مرتبہ حضرت نانوتوی ان سے ملنے تشریف لے گئے، اور نواب صاحب حسب عادت مراقب ہوئے. سر اٹھایا تو ایک صاحب (موجان نامی) سے خطاب فرمایا کہ میں نے بڑے بڑے لوگ دیکھے لیکن مولنٰنا کی نسبت کا تو کہیں پتہ ہی نہیں ہے" ص ۲۷۷

"بڑے بڑے لوگ دیکھے" نواب صاحب کے ان الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان بڑوں کی باطنی نسبت کا پتہ بآسانی چلا لیتے تھے لیکن سیدنا الامام الکبیر نے اخفائی قوتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے، اس موقعہ پر کام لیا کہ نواب صاحب جیسی ہستی بھی اس کا ٹوہ نہ لگا سکی، عوام سے اخفاء وستر کا مسئلہ دشوار نہیں ہے، لیکن بقول شخصے دائی سے بھی پیٹ کے چھپانے میں کامیاب ہونا بجائے خود میرے نزدیک مستقل کرامت اور بڑا کمال ہے۔

اسی طرح مصلحۃً اخفاء کمال کی کوشش کبھی کبھی ضرورۃً ترک بھی ہو جاتی تھی یا کوشش کی شدت کم ہو جاتی تھی، میرٹھ کا ایک قصہ مشہور ہی ہے، ہمارے مصنف امام نے اس کا تذکرہ کیا ہے اور ارواح ثلاثہ میں بھی یہ روایت مولنٰنا حبیب الرحمٰن مرحوم سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کی طرف منسوب کی گئی ہے، حاصل یہ ہے کہ مثنوی رومی کا درس شروع فرما دیا تھا، حلقہ درس میں اتفاقاً ایک دن ایک صاحب حال و نسبت آدمی بھی شریک ہو گئے، مثنوی شریف سے

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، خاص ذوق حضرت والا کو تھا، بڑے اونچے اونچے مضامین حقائق ونکات اس درس میں بیان ہوتے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مصنف امام بھی غالباً اس درس میں شریک رہتے تھے لکھتے ہیں کہ

دو چار شعر ہوتے اور عجیب و غریب مضمون بیان ہوتے" ص۳۵

بہر حال جیسا کہ مصنف امام کا بیان ہے صاحب نسبت بزرگ کو خیال گذرا کہ شاید یہ اثر تبحر علمی کا ہے، اور چاہا کہ باطنی کیفیتوں کا لذت شناس بھی اگر ایسے آدمی کو بنا دیا جائے تو یہ اس کے مستحق ہیں، اسی خیال سے انھوں نے کہا کہ آپ مجھ سے کبھی خلوت میں ملیں تو مناسب ہے مگر سیدنا الامام الکبیر نے اپنے مشاغل کی کثرت کا ذکر کر کے ان کو ٹالنا چاہا فرمایا کہ آپ خود تشریف لائیے ایک دن وہ صاحب نسبت بزرگ ایسے وقت میں آئے کہ حضرت والا درس دے رہے تھے۔ جب وہ حلقہ میں پہونچے تو درس بند کر دیا وہ بھی بیٹھ گئے، اور حضرت بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے مصنف امام نے لکھا ہے کہ مولانا نانوتوی اس وقت کبھی آنکھوں کو کھلی رکھتے کبھی قدرے بند فرماتے زیادہ وقت نہیں گذرا کہ یہ دیکھا جا رہا تھا کہ صاحب حال و نسبت والے صاحب کی حالت یہ ہوگئی کہ گر گر پڑتے، پھر سنبھلتے، کچھ دیر یوں ہی معاملہ ہوتا رہا پھر کیا ہوا، مصنف امام کے الفاظ ہیں کہ

"وہ نسبت و حال والے صاحب اٹھ کر نیچی نگاہ کئے چلے گئے" ص۱

بعد کو لکھا کہ "معذرت کی" شاید اسی "معذرت" کی تفصیل مولانا حبیب الرحمن نے یہ بیان کی ہے کہ حال و نسبت والے وہی صاحب عرض کر رہے تھے کہ

"مولانا مجھے خبر نہ تھی کہ آپ میں یہ جوہر بھی علی الوجہ الاتم موجود ہے" ص۱۹۵ ارواح

ہمارے مصنف امام نے جنکی شاید یہ چشم دید روایت ہے، اس قصے کو درج کرنے کے بعد ارقام فرمایا کہ

"مولانا (نانوتوی) کے کسر نفسی نے ان کے کمال کو ظاہر ہونے نہ دیا" ص۳۶

اور آخر میں انھوں نے اپنی رائے ان الفاظ میں درج کی ہے کہ

"اور جو کچھ بھی ظاہر ہوا میرے گمان میں بامر اللہ تھا، ہرگز اپنی طرف سے اظہار کسی امر کا

نہ فرماتے تھے " ص۳۶

اور یہی وہ بات ہے جس کا دعویٰ شروع ہی سے کرتا چلا آرہا ہوں ؎

بہرحال میں بیان یہ کر رہا تھا کہ مولنا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد کوچہ چیلان والے مکان کے کوٹھے پر جن حالات میں سیدنا الامام الکبیر کو پایا گیا تھا، اور خالی ہو جانے کے بعد "ہو" کے اسی مکان میں آپ کی آمد و رفت خاص طریقہ سے جو جاری رہی، یہی وہ زمانہ معلوم ہوتا ہے جس میں ذہنی و دماغی علوم سے فارغ ہونے کے بعد قلب و روح سے تعلق رکھنے والے تجربات و مشاہدات میں آپ مستغرق ہوئے، اور آپ کی فطری صلاحیت و استعداد نے بہت جلد اس راہ کے نتائج و ثمرات کی یافت میں آپ کو کامیابی عطا فرمادی اور حقیقی اقتضار آپ کی فطرت کا اگرچہ وہی تھا، جسے مختلف بزرگوں کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں یعنی فرمایا کرتے تھے کہ

"ایسا گم ہوتا کہ کوئی بھی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا" ص۲ الہادی ۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۰ھ

لیکن حالات و واقعات ہی ایسے تھے کہ آپ کو بھی دنیا کے سامنے آنا پڑا، اور دنیا بھی آپ کے سامنے آئی لیکن اس میں بھی کوشش آپ کی جہانتک معلوم ہوتا ہے یہی رہتی تھی کہ جاننے والے اگر جانیں بھی تو صرف یہی جانیں کہ مسلمانوں کے مذہبی علوم کے مولوی ہونے کے سوا آپ اور کچھ نہیں ہیں اسی سلسلہ میں امیر شاہ خاں صاحب مرحوم ایک قصہ بھی سنایا کرتے تھے، قصہ تو طویل ہے، ارواح ثلاثہ میں تفصیل کو پڑھ لیجئے. خلاصہ یہ ہے کہ خورجہ میں ایک دفعہ کسی نے ایک خوش گلو آدمی کو مجلس مبارک میں لاکر چاہا کہ حافظ کی مشہور غزل

غلام نرگس مست تو تاجدارانند

کے مطلع والی سنوائیں، حضرت کو اس ارادے کا علم اس وقت ہوا جب خوش گلو آدمی نے شعر الاپنا شروع کیا؟ مگر ایک ہی مصرعہ تک بات پہونچی تھی کہ بے چارا گھبرا کر رک گیا اور سیدنا الامام الکبیر کی طرف خطاب کر کے کہنے لگا کہ

"آپ تو مجھے پڑھنے ہی نہیں دیتے "۔ ص۱۵۱

چونکہ خواہش بھی یہی تھی، کہا بھی گیا کہ بس ختم کرو، معلوم ہوا تمہاری آواز اچھی ہے، مجلس جب برخاست ہوئی، توجن صاحب نے گانے کی تحریک کی تھی، نام ان کا عبداللہ خاں تھا گلاوٹھی کے رہنے والے تھے ان ہی سے دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر فرما رہے ہیں اور چین بجبیں ہوکر فرما رہے ہیں کہ

"میرا ایما معلوم کئے بغیر ایسی فرمائش کی "

اور آخر میں مولوی عبداللہ سے کہنے لگے کہ

"میں جس طرح صوفیوں میں بدنام ہوں، اسی طرح مولویت کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے اس لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے" ص۱۷۶

جس کا مطلب جیسا کہ ظاہر ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ظہور میں بھی بجائے صوفیوں کے رعایت زیادہ تر آپ اپنے اسی پہلو کی فرماتے تھے، جس کا نام آپ نے "علم کا دھبہ" رکھ چھوڑا تھا، اس موقعہ پر امیر شاہ خاں نے حضرت والا کے ان الفاظ کو بھی دہرایا ہے کہ ان ہی مولوی عبداللہ سے یہ بھی کہا کہ

"اگر مولویت کی قید نہ ہوتی، تو قاسم کی خاک تک کا بھی پتہ نہ چلتا، جانوروں کے گھونسلا بھی ہوتا ہے، میرے لئے یہ بھی نہ ہوتا، اور کوئی میری ہوا تک نہ پاتا" ص۱۷۶

لیکن چھپانے والے نے لاکھ چھپانے کی کوشش کی ہو، مگر ہر چھپی ڈھنکی بات کا جو جاننے والا ہو وہ اس کے چھپنے پر راضی بھی تو ہو؟ مولٰنا منصور علی خاں حیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ اوی ہیں، اس ناسوتی زندگی، اور رخاکی قالب سے انقطاع کی آخری گھڑیوں میں وہ بھی موجود تھے، ان کے کانوں کی سنی ہوئی یہ گواہی ہے کہ

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۲۹۱)

لہ امیر شاہ خاں کہتے ہیں کہ بعد کو ان ہی گانے والے خوش گلو صاحب سے پوچھا گیا کہ آخر تم کو محسوس کیا ہوا، جواب میں کہا کہ بھائی جب گانے میں آگے بڑھنے کا ارادہ کرتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زبان پر میرے کسی نے انگلی رکھدی اور اسے ایسا دبا دیا کہ آگے چل ہی نہیں سکتا ۱۲

(ص۱۷۶ ارواح ثلاثہ)

"دو بجے[1] کے بعد پاس انفاس کی آواز اس زور سے آنے لگی کہ باہر دروازے کے بھی

میں لے سنی" صفحہ ۱۹ (مذہب منصور)

جیسا کہ معلوم ہے "پاس انفاس" (سلطان الاذکار[2]) ذکر اللہ کا ایک طریقہ خاص ہے، جو کام چھپا چھپا کر دبک دبک کر کیا جاتا تھا، مگر جس نہ ٹلنے والی گھڑی، اور ناگزیر ساعت کے لئے یہ کیا جاتا تھا، جس وقت وہ سامنے آگئی تو سنانے والے نے سننے والے کانوں کو سنوا دیا کہ آج جو دنیا سے جا رہا ہے، دنیا میں وہ کس لئے آیا تھا، اور کیا کر کے جا رہا ہے،

پہلے بھی متعدد حوالوں سے نقل کر چکا ہوں، خلوت و جلوت کے رفیق، بچپن اور جوانی کے ساتھی ہمارے مصنف امام نے بھی اسی واقعہ کی شہادت ان الفاظ میں جو نقل کی ہے کہ

"مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) نے ریاضتیں ایسی کی ہیں کہ کوئی کیا کرے گا" ص۳۵

پھر خود ہی اجمالی الفاظ میں اس کی تفصیل کرتے ہیں کہ

"اشغال دشوار، جیسے حبس (دم) اور ستہ پایہ مدت تک کئے ہیں" ص۳۵

یہ ذکر کے بعض خاص طریقہ کی اصطلاحی تعبیر ہے، آگے وہی لکھتے ہیں کہ

"بارہ تسبیح، اور ذکر ارہ کا دوام تھا" ص۳۵

آج یہی "دوام" کام آ رہا تھا، ورنہ جس وقت سب کچھ بھلا دیا جاتا ہے، ہوش و حواس کی بھی خبر نہیں رہتی، اور آئندہ معلوم بھی ہوگا کہ تقریباً ڈھائی دن ناسوتی زندگی کے بے ہوشی میں گذرے تھے لیکن باقی اگر رہ گیا تھا، تو ساری عمر کی محنت کا وہی ثمرہ جسے دوسروں کے ساتھ مولنا منصور علی خاں مرحوم دروازے پر سن رہے تھے، ایسے وقت اور ایسی حالت میں ذکر کا جاری رہنا

---

[1] حالانکہ آئندہ جیسا کہ تفصیلاً معلوم ہوگا آپ کی وفات بھی قریب قریب دو بجے کے ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آواز عین حالت نزع میں آ رہی تھی اور اتنی زور سے آ رہی تھی کہ باہر دروازے پر جو تھے وہ سن رہے تھے ۱۲

[2] حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے اپنے بزرگوں سے سنا کہ حضرت والا پر سلطان الاذکار کا اس درجہ غلبہ ہو گیا تھا کہ پاس بیٹھنے والوں کو بدن کے عضو عضو سے ذکر اللہ کی آواز آتی تھی، اسی ذکر کا غلبہ وفات کے وقت بھی ہوا ہے، پاس انفاس کے ذکر میں آواز نہیں ہوتی کہ دوسروں کو اس کا احساس ہو شاید مولنا منصور علی خاں صاحب رحمہ اللہ کو اصطلاحی نام بیان کرنے میں کچھ سہو ہوا ہے ۱۲ محمد طیب غفرلہٗ

بجز خرق عادت کے اور کیا ہو سکتا ہے، اپنی زندگی کے اس پہلو کو آپ نے خود کھولا نہیں تھا بلکہ کھولنے والے نے کھول دیا تھا کہ دوسروں نے زیادہ سے زیادہ جسے لڑکوں کا پڑھانے والا یا وعظ کہنے والا، کچھ کتابیں لکھنے والا ملّا یا مولوی سمجھ رکھا تھا، درحقیقت اپنے مالک کا کتنا راستباز، بلکہ سچ کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ کتنا بڑا عشق باز محرم راز اور وفادار بندہ تھا۔

اور یہ باتیں جنکا ذکر اب تک کیا گیا، ان کا تعلق بجائے علم کے اگر آپ غور کریں گے، تو زیادہ تر عمل سے نظر آئیگا، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ خرق عوائد یا عام اصطلاح میں "کرامت" کے لفظ سے جس کی تعبیر کی جاتی ہے، بضرورت اس کا ظہور اگر ہوا بھی، تو اس کا تعلق کسی عمل اور کام سے تھا، لیکن قرآنی نصوص واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ (ڈرو اللہ سے اور تمہیں سکھانے لگے گا) یا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا (ڈرو اللہ سے ـ اللہ تم کو فرقان عطا کرے گا) یعنی حق و باطل، خطا و ثواب میں امتیاز کا سلیقہ تقویٰ کی زندگی بسر کرنے والوں کو عطا کیا جاتا ہے، یا ارشاد ہوا ہے کہ المحسنین (احسان کا طریقہ دین میں اختیار کرتے ہیں) ان کو حکم یعنی وہی فرقانی ملکہ حق کو باطل سے جدا کرنے کا سلیقہ ارزانی فرمایا جاتا ہے اور علم عطا کیا جاتا ہے[۱]۔ الغرض مدرسہ کے بعد کوچہ چیلاں کے "ھو" والے مکان کی محنتوں یا دربار الٰہی کے دوام حضور کے سلسلے میں کیا کچھ ملا۔ اس کا حال تو یہ ہے کہ نہ جاننے والے تو شاید وہی سمجھتے ہوں جیسے میرٹھ کے صاحبدل بزرگ نے تجربہ سے پہلے خیال کیا تھا، کہ

"یہ اثر تبحر علمی کا ہے" ص۱۶

مگر جو حضرت والا کے صحیح حالات اور زندگی کے مشاغل سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ "تبحر علمی" کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان سے آپ کا تعلق کیا تھا، ابتداء میں اس کا کچھ تذکرہ کر چکا ہوں حضرت تھانوی کی شہادت نقل کر چکا ہوں کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں"۔ الہادی ماہ جمادی الثانی ص۵

---

[۱] سورہ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا ہے فلما بلغ اشدہ اٰتیناہ حکما وعلما وکذلک نجزی المحسنین (جب وہ قوت کی آخری حد تک پہونچے تو میں نے ان کو (یعنی یوسف کو) حکم اور علم عطا کیا اور یوں ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ہم محسنین کو (یعنی احسانی زندگی بسر کرنے والوں کو) اسی قرآنی کلیہ کی طرف مذکورہ بالا الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔

اور یوں بھی "تبحر علمی" والوں کی کتابوں اور باتوں کا مقابلہ سیدنا الامام الکبیر کی کتابوں اور باتوں سے کرکے شاید ایک عامی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ قاسمی نظریات و افکار کا سرچشمہ وہ نہیں ہے جہاں سے "تبحر علمی" والے چیزوں کو حاصل کرتے ہیں، ہمارے مصنف امام جنھوں نے آخر عمر میں حضرت والا سے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، حدیث کی بعض کتابیں پڑھی بھی تھیں، وہی آپ کے علمی پہلو کا تذکرہ کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں۔

"آمد معانی اور مضامین کی ایسی تھی یوں فرماتے تھے کہ بعضے بار حیران ہوجاتا ہوں کہ کیا کیا بیان کروں"۔ ص ۳۵

مولنا حبیب الرحمن مرحوم کے حوالہ سے ارواح ثلاثہ میں بھی قریب قریب اسی کے ان کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ

"مولنا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اکثر تقریر فرماتے ہوئے بیچ میں چند ایک منٹ سکوت فرماتے، اور ایک دم رک جاتے تھے، اس پر عرض کیا گیا کہ حضرت مسلسل تقریر فرماتے ہوئے آپ کیوں رک جاتے ہیں، فرمایا کہ ایک ہی مضمون کے بیسیوں پیرائے اور عنوان ذہن میں اک دم آتے ہیں، تو طبیعت رک جاتی ہے، اور میں اس پر غور کرنے لگتا ہوں کہ کس کو لوں، اور کس کو چھوڑوں[1]"۔ ص ۱۹۶

[1] عرفاء و حکماء اسلام کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ مختلف علوم اور علم کے مختلف اور متعدد پہلوؤں کی طرف بیکدم التفات و توجہ کرنا روح کا خاصہ ہے، نفس آن واحد میں متعدد امور کی طرف اکدم التفات و توجہ نہیں کرسکتا۔ اس کا التفات تدریجی اور یکے بعد دیگرے ترتیب کے ساتھ ہوتا ہے، حضرت والا کا ایک ہی علم کے متعدد پہلوؤں اور مختلف علوم کی طرف بیکدم ملتفت ہونا اور ان کے ذہن مبارک میں ان علمی گوشوں کا آن واحد میں اس طرح جمع ہوجانا کہ ان میں انتخاب کرنے کیلئے تأمل کی ضرورت پڑے یقیناً روحانیت ہی کا اعلیٰ مقام ہے، تبحر علمی یا عام عادی التفات و تفکر کی صورت نہیں۔ اسی کی تائید میں یہ واقعہ بھی ذہن نشین کرلینا چاہئے جس کو میں نے حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی استاذ دارالعلوم سے سنا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جب استاذ رحمۃ اللہ علیہ (حضرت نانوتویؒ) سے کوئی بات پوچھی جاتی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس مسئلہ کے تمام دلائل کم ہاتھ جوڑے ہوئے حضرت کے سامنے آکھڑے ہوئے ہیں اور وہ ان میں انتخاب کرکرکے مخاطب کو افادہ فرما رہے ہیں یعنی انتخاب دلائل میں تو دیر لگتی تھی مگر دلائل کے بیکدم جمع ہوجانے اور آکھڑے ہونے میں کوئی تاخیر نہ ہوتی تھی۔ محمد طیب غفرلہٗ

ان ہی کے حوالہ سے اسی کتاب میں یہ روایت بھی درج کی گئی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر سے ایک دفعہ یہ عرض کیا گیا کہ

"جب آپ سے کوئی کسی بات کا سوال کرتا ہے، تو آپ برجستہ فرما دیتے ہیں کہ اس کے تین جواب ہیں، یا پانچ جواب ہیں"

پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ

آپ نے کیا پہلے سے سوالوں کے جوابات سوچ کر ان کی فہرست لگا رکھی ہے یا آپ سوچ کر آتے ہیں؟

جواب میں ارشاد ہوا تھا کہ

"نہیں بلا اختیار میری زبان سے یوں ہی نکل جاتا ہے، اور اتنے ہی جواب دیکر میری طبیعت رک جاتی ہے" ص ۱۹۵

فکر و نظر، تعقل و ذہانت کے زور سے پیدا ہونے والے نتیجے اور علم و دانش، فرقان و امتیاز کے جو سوتے تقوی کی راہوں سے مومن کے اندر پھوٹ پڑتے ہیں، کچھ اسی قسم کے خصوصی آثار سے دونوں کے باہمی فرق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اگرچہ اس قسم کی تجربی حقیقتوں کا عام کلیہ وہی "من لم یذق لم یدر" کی عربی ضرب المثل ہی ہو سکتی ہے، یعنی جس نے چکھا نہیں وہ ان سے واقف بھی نہیں ہو سکتا،

کور مادرزاد کو کیسے سمجھایا جا سکتا ہے کہ رنگ کیا چیز ہے، یا روشنی کس حقیقت کی تعبیر ہے، آخر آپ ہی بتائیے ارواح ثلاثہ میں ہمارے مصنف امام حضرت مولنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ بیان جو منسوب کیا گیا ہے، کہ چھتہ کی مسجد میں کچھ لوگ جمع تھے، اسی مجمع میں ایک دن فرمانے لگے

"بھائی! آج تو صبح کی نماز میں ہم مر جاتے، بس کچھ ہی کسر رہ گئی"

لوگ حیرت سے پوچھنے لگے کہ آخر کیا حادثہ پیش آیا، سننے کی بات یہی ہے، جواب میں فرماتے تھے

"آج صبح میں سورۂ مزمل پڑھ رہا تھا، کہ اچانک علوم کا اتنا عظیم الشان دریا میرے قلب کے اوپر گذرا کہ میں تحمل نہ کر سکا، اور قریب تھا کہ میری روح پرواز کر جائے"

کہتے تھے کہ وہ تو خیر گذری کہ

"وہ دریا جیسا کہ ایک دم آیا تھا، ویسا ہی نکلا چلا گیا، اس لئے میں بچ گیا"

کہتے تھے کہ علوم کا یہ دریا جو اچانک چڑھتا ہوا ان کے قلب پر سے گذر گیا۔ یہ کیا تھا، خود ہی اس کی تشریح بھی ان ہی سے بایں الفاظ اسی کتاب میں پائی جاتی ہے،

"نماز کے بعد میں نے غور کیا کہ یہ کیا معاملہ تھا، تو منکشف ہوا کہ حضرت مولانا نانوتوی ان ساعتوں میں میری طرف میرٹھ میں متوجہ ہوئے تھے، یہ ان کی توجہ کا اثر ہے، کہ علوم کے دریا دوسروں کے قلوب پر موجیں مارنے لگیں اور تحمل دشوار ہو جائے" ص۲۰۱

خود ہی بتائیے کہ فکری و دماغی علوم والے بھلا اس کا کیا مطلب سمجھ سکتے ہیں، کہاں میرٹھ اور کہاں چھتہ کی مسجد میرٹھ سے دیوبند تک کا مکانی فاصلہ درمیان میں حائل نہ ہوا، اور توجہ دینے والا اپنے علوم کا دباؤ دوسرے قبول کرنے والے قلب پر ڈال رہا تھا، مجھ جیسے بے بصیرتوں کی سمجھ میں اسکی توجیہ بھلا کیا آئے وہ کیا بتائے کہ یہ دریا کیا تھا، کس راہ سے آیا اور کس راہ سے گذر گیا!

ہاں! جس کے دل کے اندر سے یہ دریا گذرا تھا ان ہی کے حوالہ سے اسی کے بعد یہ الفاظ بھی نقل کئے گئے ہیں، حضرت نانوتوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ

"اس کے قلب کی وسعت کا کیا حال ہوگا، جس میں وہ علوم سمائے ہوئے ہیں، اور وہ کس طرح ان علوم کا تحمل کئے ہوئے ہوگا" ص۲۰۱ ارواح

حالانکہ خود مولانا محمد یعقوب صاحب کے علوم کا سرچشمہ بھی جہاں تک ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے، تقویٰ کی زندگی ہی تھا، اسی لئے میرٹھ کی دی ہوئی توجہ کے اثر کو دیوبند کی مسجد میں ان کے قلب نے محسوس کر لیا، کھلی ہوئی بات ہے کہ جس کی آنکھ میں بینائی ہوگی وہی تو روشنی کو محسوس کر سکتا ہے، ورنہ اندھوں کے لئے روشنی کا وجود و عدم دونوں برابر ہے، بہر حال کچھ بھی ہو تھے وہ بھی مرد اسی راہ کے، خود چکھے ہوئے تھے، اسی لئے جانتے تھے، اور اس کی قدر پہچانتے تھے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے مصنف امام کے تلمیذ رشید ہیں، اسی سلسلہ کا ایک قصہ نقل بھی کیا کرتے

تھے۔ حاصل یہ ہے کہ مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ یعنی مصنف امام نے ایک نیا مضمون بیان کیا، سننے والوں میں سے کسی نے کہا کہ اس مضمون کو تو مولانا محمد قاسم نے بھی ایک دفعہ بیان کیا تھا، یہ سن کر مصنف امام نے فرمایا

"جہاں سے ہم کہتے ہیں، وہاں ہی سے وہ (مولانا محمد قاسم) بھی فرماتے تھے۔"

جس کا مطلب وہی ہوا کہ سرچشمہ دونوں حضرات کے علوم کا وہی تھا، جو تقویٰ کی زندگی سے فطرت میں پھوٹ پڑتا ہے، مگر اسی کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ

"مگر اتنا فرق ہے کہ ان کے لئے سمندر کے برابر کھلتا تھا، اور ہمارے لئے سوئی کے ناکے کے برابر کھلتا ہے" ص۲۹ الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۱ھ

سمندر اور سوئی کا ناکہ یہ دونوں چیزیں تو ہماری دیکھی بھالی ہیں، لیکن ان مثالوں سے باطن کی جن کیفیتوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، تجربے کے بغیر خاک کسی کی سمجھ میں کچھ آسکتا ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ باطن کی راہ میں پہلا قدم رکھتے ہوئے جسے ثقل کی وہ کیفیت محسوس ہوئی ہو، جسے سن کر مرشد (حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ) نے مبارک باد دیتے ہوئے یہ بشارت سنائی، پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے یعنی

"یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے اور یہ وہ ثقل ہے جو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا" (ملفوظات حضرت تھانوی، الہادی ماہ ربیع الاول ۵۱ھ)

تو کوچہ چیلان کے "ھو" کے مکان کے مشاغل و مشاہد کے بعد کمسنی ہی میں "ولایت کبریٰ کی دولت سے سرفراز ہو کر ہی جب نکلے، تو اس وقت علمی جہت میں ان کے لاہوتی فتوحات کا کیا حال ہوگا۔

حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ وصیت سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے ان ہی فتوحاتی علوم و معارف کے متعلق جو نقل کی گئی ہے، یعنی آخری دفعہ سفر حج سے واپسی کے موقعہ پر حضرت نانوتوی کے رفقاء خاص سے حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا تھا،

"مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کرو، اور غنیمت جانو" ص۳۴

راوی اس کے ہمارے مصنف امام ہیں، اور یہ جاننے والے کی شہادت جاننے والے کے متعلق یا پانے والے کی شہادت پانے والے کے متعلق ہے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا جس حد تک سیدنا الامام الکبیر کی تحریر و تقریر کے محفوظ کرنے میں لوگ کامیاب ہوئے ہیں، ان کو دیکھ کر انصاف سے اگر کام لیا جائے تو نا آشنائے راہ عامی آدمی بھی یہ پہچان سکتا ہے کہ ان کتابوں کے مضامین کی نوعیت قطعاً ان کتابوں سے الگ ہے جنھیں فکر و نظر والوں نے لکھا ہے، اتنا بہرحال اس کو تسلیم ہی کرنا پڑیگا کہ مغزی اور دماغی بخارات کی نہ یہ شکل ہوئی ہے نہ یہ صورت، ان کا رنگ ہی اور ہے، اور اس کی نکہت و خوشبو ہی دوسری ہے،

خود ہمارے مصنف امام جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اسی راہ کے آدمی تھے، اور اس کو چھپاتے بھی نہ تھے ابھی ان کا قول نقل کر چکا ہوں کہ "جہاں سے ہم کہتے ہیں' وہاں ہی سے یہ بھی فرماتے تھے، بایں ہمہ متعدد مقامات پر ان کے قلم سے اضطراراً اس قسم کے فقرے نکل پڑے ہیں، مثلاً سوانح قدیم میں ایک موقعہ پر سیدنا الامام الکبیر کے ان علمی فتوحات و معارف کا تذکرہ فرماتے ہوئے جو قلم بند نہ ہو سکیں بڑے کرب اور بے چینی کے ساتھ ارقام فرماتے ہیں کہ

"کیا کیجئے جو باتیں رہ گئیں اب سوائے افسوس کے اور کیا ہو سکتا ہے" ص۳۰

اسی کے بعد ان کے الفاظ ہیں

"جو تحریریں نا تمام رہ گئیں، اب بھلا کون ان کو تمام کر سکتا ہے، اور جن میں کچھ نقصان ہو گیا ان کی تکمیل کی کیا صورت ہو سکتی ہے"۔ ص۳۰

اپنے آپ کو خاک میں ملانے کی فطری آرزو جو سیدنا الامام الکبیر کی تھی، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی ان ہی کی قلم پُر غم سے یہ لختہائے جگر نکل کر سطح کاغذ پر پھیل گئے ہیں اس آرزو کے الفاظ کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ

"اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا، جو کمالات تھے، وہ کس قدر تھے، کیا اس میں سے ظاہر ہوئے"۔ ص۳۱

آخر میں اسی کے بعد فرماتے ہیں۔

"آخر سب کو خاک ہی میں ملا دیا، اپنا کہنا کر دکھلا دیا" ص ۳۱

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ظاہر و باطن، دماغ و دل، مدرسہ اور خانقاہ کے اکتسابی کمالات و فضائل سیدنا الامام الکبیر کی خداداد فطری صلاحیتوں، اور جبلی ملکات کے ساتھ اس عہد میں جس خاص طریقہ سے ایک شخصی وجود میں سمٹ کر جمع ہو گئے تھے، ان کو دیکھتے ہوئے بلا خوف تردد یہ کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم اپنے عہد میں اس عجیب و غریب "جامعیت" کی وہ اپنی آپ نظیر تھے خود ان کے پیر و مرشد جو اس زمانہ کے ہندی علماء کے گویا تقریباً شیخ الکل تھے، جب وہی یہ فرمایا کرتے تھے، جیسا کہ ہمارے مصنف امام نے یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"خود احقر (مصنف امام) سے حاجی صاحبؒ نے ارشاد فرمایا تھا' اول حج میں جب حاضر خدمت ہوا تھا"

ان کی یہ شہادت اپنی کتاب میں سیدنا الامام الکبیر کے متعلق درج کی ہے کہ حضرت والا کا نام لے کر حاجی صاحبؒ نے کہا کہ

"ایسے لوگ کبھی پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے، اب مدتوں سے نہیں ہوتے" ص ۱۱

اکابر دیوبند کے تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ کی طرف یہ الفاظ قصص الاکابر میں جو منسوب کئے گئے ہیں، یعنی فرماتے تھے

"اگر ان حضرات کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کر دیا جائے اور بتلایا نہ جاوے تو دیکھنے والے رازی و غزالی کے زمانہ کی بتلادیں گے" ص ۳۱ الہادی ماہ جمادی الاولی

اس میں شک نہیں کہ نام تو حضرت تھانوی نے نہیں لیا ہے، لیکن سچ پوچھئے تو یہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت ہی کی گویا تفسیر ہے۔ اور گو ذکر کرتے ہوئے کچھ ڈر بھی معلوم ہوتا ہے لیکن آدمی اپنے تجربہ اور مشاہدے کا کیا کرے، حضرت شیخ الہند مولنا محمود حسنؒ فرمایا کرتے تھے، کہ

"میں نے اس کا التزام کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تصانیف دیکھ کر حضرت نانوتوی کے درس میں حاضر ہوتا اور وہ باتیں پوچھتا جو حضرت شاہ صاحب کے کتب میں مشکل ہوتی تھیں"۔

اس التزام اور دریافت کا نتیجہ کیا نکلا، شیخ الہند جیسی ذمہ دار ہستی کے الفاظ اس کے متعلق یہ ہیں کہ

"شاہ صاحب کی کتاب میں جو انتہائی جواب ہوتا تھا
حضرت نانوتوی اول ہی دفعہ میں فرمادیا کرتے تھے"

اور یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی، جو ایک دو دفعہ پیش آئی ہو، اسی بیان کے آخر میں شیخ الہند ہی کے یہ الفاظ بھی درج ہیں کہ

"بارہا اس کا تجربہ کیا" (ارواح ثلاثہ ص۱۷۱)

دینی علوم کے فتوحات، وانکشافات کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس موعودہ ربانی ہدایت کے ثمرات تھے، جس کا وعدہ قرآن میں مجاہدات وریاضات کرنے والوں کو دیا گیا ہے، وہی مجاہدات وریاضت جنھوں نے حضرت والا کو "مجسم تقویٰ" بنا کر رکھدیا تھا، لیکن اس زمانہ کے نصاب میں دینی علوم کے سوا جن فنون کی تعلیم و تعلم کا رواج تھا، سیدنا الامام الکبیر سے پڑھنے والے اور سننے والے ہی بیان کرتے ہیں، کہ دوسروں سے پڑھنے کے بعد جب قاسمی حلقہ میں شریک ہوئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا انھوں نے اب تک اس فن کے متعلق کچھ پڑھا ہی نہیں تھا، یاد پڑتا ہے، خاکسار جب بجنور (اپنی نوجوانی) کے عہد میں حاضر ہوا تھا، اور سیدنا الامام الکبیر سے براہ راست تلمذ کا شرف رکھنے والی ایک ہستی مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری طاب ثراہ کی قدم بوسی کی سعادت حاصل ہوئی تھی، تو اس وقت ان ہی سے یہ بات سنی تھی کہ مختلف علماء عصر سے منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھنے کے بعد وہ سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، کہتے تھے کہ جو بات بھی یہاں سننے میں آتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبھی نہیں سنی تھی، ہمارے مصنف امام نے بھی آپ کے تدریسی مشاغل کا تذکرہ ان الفاظ میں کرنے کے بعد کہ

"سب کتابیں (نصاب مروجہ) کی بے تکلف پڑھاتے تھے" ص۳۹

قریب قریب حکیم صاحب مرحوم ہی کی شہادت کے مطابق اپنی گواہی ان الفاظ میں درج کی ہے

" اس طرح کے مضامین بیان فرماتے تھے کہ نہ کسی نے سنے، اور نہ سمجھے" ص۳۹

آخر میں وہی لکھتے ہیں کہ

عجائب و غرائب تحقیقات ہر فن میں بیان فرماتے" ص۳۹

اور اسی کا نتیجہ تھا جیسا کہ مصنف امام ہی نے بیان کیا ہے۔

"جو شخص طباع ہو، اور پہلے سے اصل کتاب سمجھا ہوا ہو تب مولوی صاحب کی بات سمجھ سکتا تھا[1]" ص۴۰

انتہا تو یہ ہے کہ اقلیدس جس کے متعلق گذر چکا کہ بغیر استاد کی مدد کے ایام طالب العلمی میں بطور خود سیدنا الامام الکبیر نے مطالعہ فرما لیا تھا، اور اسی زمانہ میں ماسٹر رام چندر نے مولوی ذکاء اللہ مرحوم کو اقلیدس کے چند مشکل سوالات جیسا کہ کہا جاتا ہے سکھا کر کہا کہ مولوی محمد قاسم سے ان کا حل دریافت کرو، جواب میں حل تو حل، شاید لکھ چکا ہوں کہ الٹ کر مولوی ذکاء اللہ کو ایسے چند پیچیدہ سوالات میں آپ نے الجھا دیا کہ بقول مولنا حبیب الرحمن مولوی ذکاء اللہ جواب میں عاجز ہو کر رہ گئے تھے، اسی اقلیدس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ کسی انگریز نے "شکل مثلث" کے

[1] میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنا کہ منطق و فلسفہ وغیرہ کی بڑی بڑی کتابوں کی تدریس کے موقعہ پر جب طالب علم صفحہ ڈیڑھ صفحہ کی عبارت پڑھ لیتا تو حضرت والا کی عادت تھی کہ اس ساری عبارت کا مطلب چند لفظوں میں بیان کر کے فرماتے کہ بس ان کا مطلب یہ ہے اب تم قاسم کی سنو۔ اور پھر اس علم و فن سے متعلق مکنون علوم و فنون کا دریا بہہ پڑتا اسی قسم کے ایک موقعہ کا واقعہ بزرگوں سے سننے میں آیا کہ جب حضرت والا نے حسب عادہ فرمایا کہ اب تم قاسم کی سنو تو مولانا عبد العلی صاحبؒ نے (جو بعد میں مدرسہ عبد الرب میں دہلی کے محدث ہوئے) عرض کیا کہ نہیں ہم قاسم کی نہیں سنتے ہیں تو کتاب کا مطلب اس کی عبارت سے سمجھا دیا جائے، سننے میں آیا کہ اس کے بعد سے حضرت والا اُن کی بہت رعایت فرمانے لگے اور جب وہ کتاب کا مطلب اور عبارت کتاب سے اس کی تطبیق پوری طرح سمجھ جاتے تب حضرت اپنے علوم و مضامین کی تقریر شروع فرماتے ۱۲ (محمد طیب عفی عنہ)

متعلق ایک اہم سوال پیدا کرکے اشتہار دیا تھا کہ اس سوال کو جو حل کردے گا ڈیڑھ لاکھ روپے بطور انعام کے اس کی خدمت میں میں پیش کروں گا' ایک صاحب جو اس زمانہ میں مظفر نگر میں منصف تھے اور فن اقلیدس سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے، انھوں نے کوشش کرکے اپنے نزدیک حل پیدا کیا. اور اس حل کو بعض اہل نظر کے سامنے پیش کرکے یہ اطمینان بھی حاصل کرچکے تھے کہ انعام کا جائز استحقاق ان کو حاصل ہوچکا ہے۔ کہتے ہیں کہ اپنے اس "حل" کو اشتہار دینے والے انگریز کے پاس بھیجنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ بدقسمتی کہیے یا خوش قسمتی کہ مظفر نگر کے اسٹیشن پر سیدنا الامام الکبیر سے اتفاقاً منصف صاحب کی ملاقات ہوگئی، باتوں باتوں میں اپنے اس سرمایہ ناز حل کا بھی منصف صاحب نے تذکرہ کیا۔ اسکے متعلق جو مضمون انھوں نے لکھا تھا' جو شاید ان کے ساتھ ساتھ ہی رہتا تھا' وہ بھی مولنا کو سنایا۔ جب مضمون ختم ہوگیا تو راوی کا بیان ہے کہ مضمون اور ان کے حل کی تعریف کرتے ہوئے آخر میں سیدنا الامام الکبیر نے یہ فرمایا کہ

"آپکی دلیل کا فلاں مقدمہ نظری ہے، حالانکہ اقلیدس کے تمام دلائل کی انتہا بدیہی مقدمات پر ہوتی ہے" (ارواح ثلاثہ ص۱۹۴)

چونکہ منصف صاحب خود صاحب فن تھے، دکھتی ہوئی رگ ان کی پکڑلی گئی تھی، پھر خود ہی اپنے "حل" کے اعلان کی ہمت ان کو نہ ہوئی! اور عقلی و ذہنی علوم ہی کی حد تک نہیں، تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ دستور اس زمانہ کا یہی تھا کہ فارغ التحصیل ہوجانے کے بعد بھی عربی زبان میں اپنے مطلب کو ادا کرنے کی قدرت عموماً طلبہ میں پیدا نہ ہوتی تھی، اور سیدنا الامام الکبیر کی کوئی یادگار بجز اس عربی قصیدے کے نہیں ہے جو سلطان عبدالحمید کے نام لکھا گیا' اور آپ کی تصنیفات کے سلسلہ میں انشاء اللہ اسکا مستقل تذکرہ کیا جائے گا، بس اس قصیدے کے سوا میں نہیں جانتا کہ عربی زبان میں آپ کی نثر یا نظم کا نمونہ پایا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمانہ کے دستور کے مطابق آپکو بھی عربی زبان میں تحریر و تقریر کی مشق کا موقعہ نہ ملا تھا، مگر ہمارے مصنف امام نے بیان فرمایا ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب مدرسہ سے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے، غالباً بائیس تئیس سال سے زیادہ حضرت والا کی

عمر نہ ہوگی، کہ

"مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری (محشی وناشر بخاری شریف) نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کے پانچ چھ سیپارے آخر کے جو باقی تھے، مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کے سپرد کیا"۔ ص۲۹

مصنف امام ہی کا بیان ہے کہ اس کی خبر جب دلّی کے علمی حلقوں میں پہونچی، تو

"اس زمانہ میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کے کمال سے آگاہ نہ تھے، جناب مولوی احمد علی صاحب کو بطور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا، کہ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کیا" ص۲۹

"نئے آدمی" سے مطلب وہی تھا کہ ایک نو آموز آدمی جس کی عمر بھی ابھی زیادہ نہیں ہے، اس کے سپرد ایسی اہم ذمہ داری کا کام کیسے کر دیا گیا، علاوہ نو عمری کے دوسرا قصہ بھی تھا، جسکی طرف مصنف امام نے اشارہ کیا ہے، یعنی بخاری شریف کے ان آخری چھ پاروں میں عموماً امام بخاری نے بعض الناس کے الفاظ سے سمجھا جاتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر چوٹیں کی ہیں، مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے، علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا جو اول سے آخر تک مولانا احمد علی صاحب کے حاشیہ میں التزام ہے، اور اس جگہ پر امام بخاری نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کئے ہیں"۔ ص۳۰

وہی لکھتے ہیں اور بالکل درست لکھتے ہیں کہ

"ان کے (امام بخاری کے ان اعتراضوں کے) جواب لکھنے معلوم ہے کہ کتنے مشکل ہیں" ص۳۰

مگر مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں کے اعتراض و تنقید کی پروانہ کی، اور سیدنا الامام الکبیر نے ان کی تعمیل ارشاد کو سعادت خیال فرماتے ہوئے بخاری کے ان آخری چھ پاروں کی تصحیح کے ساتھ حاشیہ نگاری کی خدمت بھی انجام دی۔

مولانا احمد علی صاحب حضرت والا کے کام کو دیکھکر جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے، فرمانے لگے کہ

میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں" ص۳

اور اپنے دعویٰ کے ثبوت میں مصنف امام کا بیان ہے کہ

"مولوی صاحب (مولٰنا نانوتوی) کا تحشیہ ان کو اعتراض کرنے والوں کو دکھلایا" ص۳

اور بقول مصنف امام

"جب لوگوں نے جانا" ص۳

کہ کام مولٰنا احمد علی صاحب نے اسی شخص کے سپرد کیا تھا، جو اس خدمت کا صحیح معنوں میں سزاوار تھا، ظاہر ہے کہ بخاری کا جو حصہ حضرت والا کو حاشیہ نگاری کیلئے سپرد کیا گیا تھا اس میں چونکہ امام بخاری کے مناقشوں کا جواب دینا تھا، اور یہ کام وہی انجام دے سکتا تھا، جو ہر قسم کے مطالب و مقاصد کو عربی زبان میں ادا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو، جس کا اندازہ اصل حاشیہ کے دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے، مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے" ص۳

انشاء اللہ اپنے مقام پر اس حاشیہ کے بعض نمونے بھی پیش کئے جائیں گے، اس وقت تو صرف یہ دکھانا ہے کہ علاوہ دینی علوم کے عقلیات وادبیات میں بھی حضرت والا کا جو رنگ تھا، اس کا کچھ اندازہ ناظرین کو ہو جائے۔ آ۔ ر گو اور تو کسی سے سننے میں یہ بات نہیں آئی، اور (دیوبند کے علمی حلقوں میں اس کا چرچا پایا جاتا ہے) لیکن دلی کے ایک صاحب جن کا نام سید جمال الدین تھا، جن کی شخصیت باوجود تلاش وجستجو کے فقیر کے لئے کچھ نامعلوم ہی سی رہی، تاہم سیدنا الامام الکبیر کے مطبوعہ خطوط کا ایک مختصر مجموعہ بنام "جمال قاسمی" جو عام طور پر ملتا ہے اور ان ہی دہلوی سید صاحب کے نام یہ خطوط ہیں، ان میں خطاب ان الفاظ سے حضرت نانوتوی نے ان کو کیا ہے مثلاً ایک خط کا سرنامہ ہے۔

"مخدوم ومطاع نیازمندان حامی دین، سلالہ خاندان نبوت جناب مولوی سید

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب "مولوی" بھی تھے، اور "شاہ" کا لفظ جو ان کے نام کے آخر میں بڑھایا گیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ طبقہ صوفیہ سے بھی ان کا تعلق تھا، کم از کم ان الفاظ سے یہ فیصلہ تو بہرحال ہمیں کرنا ہی چاہئے کہ ان کی روایت کسی عامی آدمی کی روایت نہیں ہوسکتی، بہرحال کہنا یہ ہے کہ ان ہی خطوط کے شروع میں بطور دیباچہ اور تعارف چند سطریں سید صاحب نے لکھی ہیں، ان ہی میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ سیدنا الامام الکبیر سے ان کی خط وکتابت رہتی تھی، یہ خبر دیتے ہیں، کہ۔

"نئو رسائل، ھندسہ، ہیئت، فلاحت طبعی، جبر و مقابلہ، جر ثقیل وغیرہا علوم میں ایک ایک ورق لکھنے کی فرمائش کی"

اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کی یہ فرمائش سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں ان کی طرف سے بار بار پیش ہوتی رہی، اس کے جواب میں بجائے یہ لکھنے کے کہ ان علوم سے ہمارا کیا تعلق وہی بیان کرتے ہیں کہ حضرت کی طرف سے صرف اس پر اصرار ہوتا رہا کہ

"ہر رسالہ کی ایک ایک ورق کی قید نہ لگائیے کیونکہ میں قلم کے ہاتھ سے لاچار ہوں"[۲]

پھر یہی دہلوی سید صاحب فرماتے ہیں، کہ حضرت کے اسی اصرار کی وجہ سے جس کے متعلق ان کا بیان ہے، کہ

"بار بار تقریبًا مہینے بھر تک مولوی صاحب مرحوم (حضرت نانوتوی) اصرار کئے گئے"

یہ دیکھ کر کہ ایک ورق کی قید سے آزادی کے بعد کتاب کی ضخامت غیر معمولی طور پر بڑھ جائیگی افسوس ہے کہ اس عجیب وغریب کتاب کے لکھوانے کا جو عزم ان میں پیدا ہوا تھا، وہ فسخ ہوگیا سید جمال الدین لکھتے ہیں کہ

"فقیر نے اس سبب سے کہ یہ یادگار ضرور کم از کم ایک سو جزو سے بڑھ جائے گی تو بوجہ اپنی بے سروسامانی کے چھپنے سے رہ جاوے گی قلم کے اختیار کی رخصت نہ دی"

اس سے اور کچھ نہیں تو اتنی بات بہرحال معلوم ہوتی ہے کہ سید جمال الدین صاحب کو ذاتی تجربہ اور ان کے تعلقات کی جو نوعیت حضرت والا سے تھی، اس کی بنیاد پر کم از کم ان کا خیال یہی تھا کہ ان مختلف علوم و فنون پر آپ کا جو رسالہ بھی ہوگا، وہ ایک جزو سے کم نہ ہوگا، جس زمانہ کی یہ بات ہے، مسلمانوں کی معاشی زبوں حالیاں ابتری کی اس آخری حد تک دلی میں پہونچ گئی تھیں کہ، ایک شریف گھرانے کے آدمی نے اس حیرت انگیز تاریخی کتاب کے لکھوانے کے خیال کو دماغ سے اس لئے نکال دیا کہ اپنی بے سروسامانی کو دیکھتے ہوئے سوجزو کی کتاب کے بھی چھپوانے کی ہمت نہیں کرسکتا، بے چارے نے آخر میں خود ہی لکھا ہے کہ:

"اس باعث (یعنی کتاب کی ضخامت اور اپنی بے سروسامانی کی وجہ سے) یہ کام ناتمام رہا"

واللہ اعلم اس اجمالی روایت کے پس پردہ اور بھی کس قسم کی تفصیلات تھیں، اور ان صدگانہ علوم و فنون کی فہرست میں کس کس علم اور کس کس فن کو جگہ دی گئی تھی، صحیح طور پر اس کا پتہ چلانا اب دشوار ہے، لیکن جن علوم کا نام لیا گیا ہے آپ دیکھ رہے ہیں، کہ ان میں کوئی علم بھی ایسا ہے، جسے دینی یا کم از کم نیم مذہبی علم بھی ہم کہہ سکتے ہیں، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تعلیم کے جس نصاب کی تکمیل سیدنا الامام الکبیر نے کی تھی، اس نصاب میں ان علوم کی کوئی کتاب شریک نہ تھی، پھر ان علوم پر کتابوں کے لکھنے پر آمادہ ہو جانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ اپنے ذاتی ذوق سے ان علوم میں اتنا درک سیدنا الامام الکبیر نے پیدا فرما لیا تھا کہ ان میں سے ہر علم پر کتاب تک لکھنے کی صلاحیت اپنے اندر آپ محسوس فرماتے تھے، باقی ان خالص غیر دینی علوم کے ساتھ اتنی غیر معمولی مناسبت کی بنیاد کیا تھی؟ غیر معمولی عقیدت مندیوں کے باوجود اس دعوی کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا" کہ تقوی کی زندگی" کا فرقانی نتیجہ یا مجاہدات کے قرآنی وعدے سے اس کی توجیہ کردوں، اس موقعہ پر حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ملفوظ کا خیال آتا ہے، قصص الاکابر میں بھی یہ ملفوظ پایا جاتا ہے لکھا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے علمی کمالات کا تذکرہ فرماتے ہوئے، حضرت تھانوی نے ایک دن فرمایا کہ

"مولانا محمد قاسم (میں وہبیت کے ساتھ ذکاوت بھی غالب تھی"

اور اپنے اس ذاتی احساس یا خیال کا ذکر کرنے کے بعد اسی ملفوظہ میں ہے کہ حکیم الامت نے آخر میں یہ بھی کہا تھا کہ

"مگر یہ ایسی بات ہے کہ اس سے ہمارے مجمع (حلقہ دیوبند) کا کوئی آدمی کم ہی اتفاق کرے گا" ص۲۵ الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۸ھ

سچ تو یہ ہے کہ "وہبیت" کے مقابلہ میں "ذکاوت" کے غلبہ کا خیال حضرت تھانوی کی طرف اس ملفوظ میں جو منسوب کیا گیا ہے جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جن معارف وحقائق کی جلوہ گاہ سیدنا الامام الکبیر کا قلب مبارک تھا، ان کے متعلق شاید حضرت تھانوی کا خیال تھا کہ آپ کی غیر معمولی ذہانت وفطانت کو سمجھنا چاہئے کہ اس میں زیادہ دخل تھا۔

اگر واقعی حضرت تھانوی کا منشاء مبارک یہی ہے تو اس سے اتفاق کرنے والے دیوبند کے علمی حلقوں میں مشکل ہی سے مل سکتے ہیں۔ خود فقیر کے لئے بھی "غلبہ" کا یہ دعویٰ جو حضرت تھانوی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، کچھ گراں ہی ہے، اگرچہ گرانی کے اس احساس کا جائز مستحق اپنے آپ کو اتنا نہیں سمجھتا، لیکن اپنے احساس کو بھی چھپا نہیں سکتا۔

کچھ بھی ہو، سیدنا الامام الکبیر کے علوم وافکار پر وہبیت کا غلبہ ہو، یا ذکاوت وذہانت کو ان میں زیادہ دخل ہو، جب بڑوں کی مجلس کا یہ اختلافی مسئلہ بن چکا ہے، تو ہمارے لئے خاموشی ہی اولیٰ ہے، تاہم پھر بھی حد سے گذرا ہوا غلو، اور افراط وتفریط کی اطرائی ہی شکل ہوگی، کہ جر ثقیل اور فلاحت طبعی، جبر ومقابلہ ہندسہ وغیرہ علوم میں بھی بجائے خداداد ذہانت ذکاوت کے الہام وکشف ہی سے ان کے تعلق کو محدود ومنحصر کر دیا جائے؛ ہاں قدیم فلسفہ والے "قوت قدسیہ"[۱] سے فکری قوت کی غیر معمولی درجہ کی

[۱] مطلب یہ ہے کہ جانے ہوئے معلومات کی مدد سے مجہولات اور انجانی باتوں کے جاننے کا سلیقہ تو فطرت انسانی کی عام بات ہے، اور یا بند معقولات یا ناطق ہونا منطق والوں نے اسی کو انسانی فطرت کا فصل قرار دیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ معلومات سے مجہولات کی طرف منتقلی کی یہ کیفیت ہر شخص میں برابر کے درجہ کی نہیں ہوتی، بعضوں کی ذہنی حرکت اس سلسلہ میں اتنی سست ہوتی ہے کہ ان کی دماغی حالت حیوانوں سے بمشکل ہی ممتاز ہوتی ہے، لیکن اسی کے مقابلہ میں بعضوں میں یہی کیفیت اتنی قوی ہوتی ہے کہ جن نامعلوم اور مجہول نتائج تک دوسرے گھنٹوں میں پہونچتے ہیں، وہ ان ہی نتیجوں تک منٹوں بلکہ بسا اوقات اس سے بھی کم مدت میں پہونچ جاتے ہیں، بلکہ عموماً مجہول نتائج تک ان کا ذہن دفعۃً پہونچنے کا عادی ہوتا ہے، مبادی سے مطالب اور مطالب سے مبادی تک دفعۃً منتقل ہونے کی اسی ذہنی خصوصیت کو فلسفہ کی اصطلاح میں "حدس" کہتے ہیں، حدسی قوت کے انتہائی مرتبہ کا نام ان کے نزدیک "قوت قدسیہ" ہے۔

تعبیر جو کرتے ہیں، اور نہ جاننے کی وجہ سے یہ مالی خولیا پکا لیا ہے کہ الہام وکشف بلکہ العیاذ باللہ وحی ونبوت کی راہ سے جن چیزوں کی یافت کا دعویٰ جو کیا جاتا ہے وہ اسی "قوت قدسیہ" ہی کے دقائلیم اللہ) کرشمے ہیں، تو اس لحاظ سے اس کے ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ "تقویٰ و" مجاہدہ" کے نتائج و آثار کے سوا، فطرۃً سیدنا الامام الکبیر "اسما" قوت قدسیہ" سے بھی سرفراز تھے اور یہ بھی "الخلاق العلام" ہی کی داد کی ایک شکل ہے،

بات بہت طویل ہوگئی اور ہوتی چلی جارہی ہے، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ غالب آپ یہ چاہے کوئی جہت ہو، لیکن جو کچھ اب تک آپ کے سامنے پیش کیا جاچکا ہے اس کو دیکھ کر بہر حال یہ تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ جس طرح ظاہری علم اور اس کے لوازم و آثار سے آپ آراستہ تھے، قدرت نے ایسے مواقع آپ کے لئے پیدا کئے، اور ایسے رجحانات آپ میں ڈالے گئے کہ باطنی اور معنوی کمالات سے بھی اپنی استعداد و جبلت کے مطابق آپ کو کافی اور غیر معمولی حصہ ارزانی ہوا، عملاً و علماً ان باطنی کمالات کے شواہد و بینات آپ سے تجلی ریز تھے، اور وہی مستقبل کا سوال پھر سامنے آتا ہے کہ کمالات کی اس ہر جہتی دولت کے ساتھ کدھر جاتے ہیں، اور اس عزیز قیمتی سرمایہ کو کس کام میں لگاتے ہیں، اپنے تعلیمی رفقا اور مدرسہ کے ساتھیوں کو اس زمانہ کے طلائی و نقرئی چراگاہوں میں چرتا ہوا چھوڑ کر مدرسہ سے نکلنے کے بعد بصد شان استغنا مسکراتے ہوئے جو آگے نکل گیا تھا بھلا "ھو" کے مرکان سے مربوط ہونے کے بعد اسی کے متعلق اب ان قصوں کے تصور کی کیا گنجائش باقی تھی، جن کے امکانات کا ذکر کرنے والوں نے اپنی کتابوں میں تذکرہ کیا ہے، پہلے بھی اس سلسلہ کی بعض چیزیں گذر چکی ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہمارے مصنف امام نے ایک موقعہ پر اپنی کتاب میں یہ ارقام فرمایا کہ

"ملک و مال کے جھگڑے اگر (حضرت نانوتوی اپنے) سر رکھتے تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی کہیں کے ڈپٹی کلکٹر، یا صدر الصدور ہوتے" ص۲۱

اس بات کی جو شہادت ادا کی ہے کہ ڈپٹی کلکٹری، یا صدر الصدوری، جو اس زمانہ میں ستم دیدہ مسلمانوں کے دنیاوی اوج و اقبال کا ذروہ کمال اور آخری نقطۂ عروج تھا، نئی قائم شدہ برطانوی حکومت میں ان

عہدوں تک پہونچنے کے کھلے ہوئے امکانات حضرت والا کے لئے موجود تھے، یا امکان سے بھی آگے بڑھ کر ارواح ثلاثہ میں امیر شاہ خاں صاحب کے حوالہ سے یہ اطلاع جو درج کی گئی ہے کہ

"بھوپال سے (غالباً نواب صدیق حسن خاں صاحب کی طرف سے) مولانا (نانوتوی) کی طلبی آئی اور پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی" (ارواح ص۱۶۷)

ظاہر کے بعد باطن کے کمالات سے معمور اور ان ہی کمالات سے سرشار و مخمور ہونے کے بعد ان چھچھورے جذبات اور پست رجحانات کا تو احتمال ہی باقی نہ رہا تھا۔

یقول امیر شاہ خاں مرحوم براہ راست خاکسار نے ان سے یہ بات سنی تھی کہ حافظ کے شعر

غلام نرگس مست تو تاجدار انند

کے متعلق ایک دفعہ سیدنا الامام الکبیر فرمانے لگے کہ "تیری نرگس مست کے غلام بادشاہ ہیں" مطلب اس شعر کا عام طور سے جو سمجھا جاتا ہے، اس سے زیادہ دل آویز پہلو اسی مصرعہ کے مطلب کا یہ ہو سکتا ہے کہ وہی تاجدار اور بادشاہ ہیں، جو تیری نرگس مست کے غلام ہیں، شاید اپنے احساس اور وجدان ہی کو حافظ کے اس مصرعہ کی طرف منسوب فرمایا جا رہا تھا، جس کی یافت و شہود کا یہ رنگ ہو کر کسی کی نرگس مست کی غلامی ہی میں اسے بادشاہی منحصر نظر آ رہی ہو اس کی نگاہوں میں درہم و دینار کی عبدیت و غلامی سے پیدا ہونے والی بادشاہی کی خود ہی سوچنا چاہئے کہ کیا قدر و قیمت باقی رہ گئی

پس وہ اونچے ہو چکے تھے اور بہت زیادہ اونچے، اتنے اونچے کہ اتنی بلندیوں تک رسائی اس عہد میں اگر ان کی ذات کے ساتھ محدود ہو کر نہ رہ گئی ہو، تو اتنا بہرحال ماننا ہی پڑتا ہے کہ کم ہی ہونگے جنھیں ان بلندیوں کا ذاتی تجربہ اس زمانہ میں حاصل ہوا ہوگا، لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے "ھو" والے مکان کی جس چوکھٹ اور درگاہ تک پہونچنے میں وہ کامیاب ہوئے تھے، اس کے نہ طول ہی کی کوئی انتہا ہے اور نہ عرض کی اور عمق بھی جس کی انتہا ہے، قرآن میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ جنت سے نکلنے کی خواہش یا آرزو جنتیوں میں نہ پیدا ہو گی یعنی قرآنی الفاظ لا یبغون عنها کا جو ترجمہ ہے دوسرے لفظوں میں مطلب جس کا یہ ہے کہ اکتا جانے کی کیفیت بہشتی زندگی میں بہشت کے رہنے والے

اپنے اندرکسی زمانہ میں محسوس نہ کریں گے، کیوں نہ محسوس کریں گے' اسی کی طرف اشارہ اس واقعہ کا ذکر کرکے غالباً قرآن میں کیا گیا ہے کہ کلمات رب جن کے تکوینی مظاہر کے مجموعہ کا نام جنت ہے رب کے ان کلمات کی نہ حد ہے نہ انتہا' سمندروں کے پانی کو بھی روشنائی بنا کر ان کلمات کو کوئی لکھنا چاہے تو پانی سمندروں کے خشک ہوجائیں گے، رب کے ان کلمات کی لامحدودیت پھر بھی باقی ہی رہے گی۔

بہرحال میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اپنے دل کی بات کس طرح ادا کروں' وہ ادا بھی ہو گی یا نہ ہوگی' تاہم کوشش کرتا ہوں' لغزش کی معافی سب سے پہلے اس سے چاہتا ہوں جس کے سامنے اپنی لغزشوں میں آدمی حقیقۃً ذمہ دار ہے، اور ان سے بھی اغماض و چشم پوشی کا خواستگار ہوں جن تک اپنی تعبیری قوت کے ضعف کی وجہ سے شاید صحیح مطلب پہونچانے میں ناکام رہوں' مقصد یہ ہے کہ پھل سے درخت کو پہچانئے' یا درخت سے پھل کو شناخت کرنے کی کوشش کیجئے، الغرض لمّی طور پر دیکھا جائے یا انّی طور پر سوچا جائے، قرآن نے انسانی وجود کو خالق تعالیٰ جل مجدہ کی خلافت کی نمائش گاہ جو قرار دیا ہے' اور فرمایا گیا ہے کہ پیدا کرنے والے کے دونوں ہاتھوں کی کاریگری کا انسان نمونہ ہے، اس میں روح بھی اپنی رب نے پھونکی ہے، جس کا مطلب سمجھانے والوں نے یہی سمجھایا ہے کہ جمال و جلال دونوں قسم کی صفات کے ساتھ حق تعالیٰ نے اپنی ذات کا نمائندہ آدمی کو بنایا ہے تخلیقی و ارتقائی کمالات کا مظہر اتم قدیم و جدید افکار میں انسان کو جو ٹھہرایا گیا ہے، اس کا یہی مطلب ہے، اور آدم کو خدا نے اپنی صورت پر بنایا' قدیم کتابی روایات' اور اسلام کی جدید روایات کے اس فقرے کا حاصل بھی کہتے ہیں کہ یہی ہے، یہی انسان کا ماعلیہ یا وہ قالب یا سانچہ ہے جس پر وہ پیدا ہوا ہے' لیکن اسی کے ساتھ قرآن ہی نے اعلان کیا ہے کہ دینے والے نے دوسروں کو جو کچھ بھی دیا ہے بمد ہبہ و عطیہ دیا ہے، الا ایک الانسان جس نے ان سارے کمالات کو جن کا ذکر کیا گیا' بمد امانت قبول کیا ہے' امانت ہی نے اس پر یہ ذمہ داری عائد کی کہ بجائے اپنی خواہش اور اپنے ارادے کے اس امانتی سرمایہ میں اس کی مرضی اور اس کے

حکم کا پابند رہے، جس کی طرف سے بمدامانت یہ سرمایہ اس کے سپرد ہوا ہے، ماعلیہ یعنی جس قالب پر وہ پیدا ہوا ہے اس کے مقابلہ میں انسانی وجود کی پیدائش کی غرض لیعبدون (تاکہ وہ عبادت کرے) قرار دے کر قرآن میں مالہ یعنی جس مصلحت کے لئے آدمی پیدا کیا گیا ہے، بجائے خلافت کے عبدیت اور بندگی جو ٹھہرائی ہے یہی ماعلیہ اور مالہ کی کش مکش ہے، جس میں انسانی فطرت مبتلا ہے، جس سانچے اور قالب پر وہ پیدا ہوا ہے، اور جو اس کا ماعلیہ ہے اقتضا اسی کا یہ ہوتا ہے کہ خدائی شانیں اس سے ظاہر ہوں، سب اس کی تعریف کریں، اس کی حمد کا گیت گائیں، سب کا وہ محمود بنا رہے، بلکہ آگے بڑھ کر یہ بھی کہ سب اسی کے آگے جھکے رہیں، سب کا یہ معبود بنا رہے اس قسم کے الوان نفسیات انسانی کے اسی ماعلیہ کے آثار اور اسی کی لہریں ہیں، جو اس کے اندر رہ رہ کر اٹھتی رہتی ہیں، لیکن جب اسی کے مقابلہ میں مالہ اور اس مقصد وغایت کے اقتضاؤں کا زور بندھتا ہے جس مقصد وغایت کے لئے پیدا کرنے والے نے انسان کو پیدا کیا ہے تب وہی جو سب کچھ بنا چلا جا رہا تھا یا چاہتا تھا کہ سب کچھ بن جائے، دیکھا جاتا ہے کہ کچھ بھی باقی نہ رہے، اسی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، اور اپنے قدموں پر جو چاہتا تھا کہ سب کو جھکائے، نظر آتا ہے کہ وہی اب جھکا ہوا ہے، گڑگڑا رہا ہے، اور ہوش وتمیز کے آغاز سے اس وقت تک جب تک احساسات ساتھ دیتے ہیں دن کے چوبیس[۲۴] گھنٹوں میں غریب انسان اپنے "مالہ وماعلیہ" کی ان ہی کش مکشوں میں غلطاں پیچاں رہتا ہے، وہی نہیں، جنھوں نے نہیں مانا ہے، بلکہ

یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ	اے میری قوم اللہ کی بندگی کر، تمہارے لئے اس کے سوا کوئی معبود دوسرا نہیں ہے۔

کے آسمانی پیغام کا اعادہ آغاز انسانیت سے آخر وقت تک پیدا کرنے والے کی طرف سے بنی آدم کی آبادیوں میں جو مسلسل کرتے رہے ہیں اللہ کے ان برگزیدوں، خالق کائنات کے ان رسولوں کے ماننے والوں، اور ان کے اسی اتفاقی واجماعی پیغام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرنے والوں میں، اگرچہ یہی جانا بھی جاتا ہے

اور یہی مانا بھی جاتا ہے، کہ خواہ کسی قالب کسی سانچے یا تقویم پر آدمی پیدا کیا گیا ہو، اس کا ماعلیہ چاہے کچھ ہی ہو لیکن مطالبہ اور مواخذہ دار و گیر، پوچھ گچھ کا بالکلیہ تعلق انسانی وجود کے قدرتی مالہ عبدیت و بندگی ہی سے ہم پوچھے جائیں گے۔ اور جزا پائیں یا سزا اپنے اسی مقصد حیات ہی کی بنیاد پر پائیں گے۔

لیکن ان میں بھی ان کو نصیبوں، سیاہ بختوں کے سوا جو خدا کا نام لے کر اپنی خودی کے لئے خدائی خوراکوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آ رہے ہیں، ان ہی خوراکوں کی بھیک ممبروں اور پنڈالوں کی بلندیوں سے مانگنے میں نہیں شرماتے، مسجد کی محرابوں میں بھی اسی اذوقہ کا ذوق ان پر مسلط رہتا ہے، اور خانقاہوں کے تاریک حجروں میں بھی اسی کو ڈھونڈھتے ہیں، وہ اپنی خودی کو ممدوح بنانے کے لئے خدا کی حمد کا ترانہ گاتے ہیں، اور خدا کی عبادت کی دعوت اس لئے دیتے ہیں تا کہ ان کی خودی کو معبودیت کا سرور حاصل ہو، خود پوجے جائیں، اس لئے خدا کی پوجا کا چرچا کرتے پھرتے ہیں، ان غریبوں کو تو تبلی السرائر کے دن والی فقد قیل کی ان ہتھوڑیوں ہی کے سپرد کیجئے۔ جو ان کی اندرونی آلائشوں کو باہر نکال کر رکھدیں گی اور وہ سب اگلوا لیا جائے گا۔ جو کچھ انھوں نے نگلا تھا لیکن ان کے سوا بھی ان باطنی آلائشوں سے پاک رکھنے میں جن کی سرگرمیاں امتیاز کی نظروں سے دیکھی گئی ہیں، اور خود اپنے نزدیک بھی تزکیہ، تصفیہ کی کوششوں میں اپنی توانائیوں کو جو صرف کرتے رہے ہیں، یہی بات تو یہی ہے کہ نفسیات انسانی کا قرآنی آئینہ

بل الانسان علی نفسه بصیرة ولو القی معاذیره	بلکہ انسان اپنی اندرونی بات خود جانتا ہے گو وہ دوسروں کے سامنے اپنے اعذار پیش کرتا ہے

ان کے سامنے نمایاں کر سکتا ہے کہ وہ کس حد تک اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے، یا پھر لا تخفی منکم خافیہ نہ چھپی رہے گی تم سے کوئی چھپی بات اکی منزل میں آدمی جب داخل ہوگا، اس وقت کامیابی اور ناکامی کا راز کھل کر سامنے آجائے گا۔

تاہم دن کی روشنی اگر بتا سکتی ہے کہ افق پر آفتاب نمایاں ہو چکا ہے، اور دھویں کو دیکھ کر پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ وہاں آگ ہے، اور اس راہ سے بھی حقیقت کا سراغ کسی نہ کسی حد تک اگر لگایا جا سکتا ہے تو میں آپ کے سامنے واقعات و شواہد کی ایک فہرست پیش کرتا ہوں، ان کو دیکھئے اور سوچئے، میں

خیال کرتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کا قدم آئندہ مستقبل میں جس رخ کی طرف آخر وقت تک مسلسل بڑھتا ہی چلا گیا، شاید اس کا کچھ اندازہ ان ہی واقعات وشواہد کی روشنی میں بآسانی کسی غیر معمولی حسن ظن کا سہارا لئے بغیر انشاء اللہ لگایا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ مستقبل کا یہ سوال آپ کی زندگی کی جس منزل پر پہونچ کر اٹھایا گیا تھا اس وقت عام دستور اور رواج کے مطابق آپ ایک باضابطہ سند یافتہ عالم ہونے کے ساتھ ان کمالات و خصوصیات کو بھی حاصل کر چکے تھے، جن کے حاصل کرنے والوں کو صوفی اور درویش صاحب دل سالک وغیرہ اصطلاحی القاب و خطاب کا مستحق سمجھا جاتا ہے دلی کے وہی سید جمال الدین صاحب جنہوں نے سو رسالے سو مختلف علوم وفنون میں ارقام فرمانے کی فرمائش آپ سے کی تھی، اپنے شائع کردہ مکاتیب کے دیباچہ میں حضرت والا کے اسم مبارک کو درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"مولوی حافظ حاجی، محمد قاسم صاحب صدیقی، نانوتوی حنفی چشتی مرحوم زمانہ کے امام حدیث ہونے کے سوا تصوف میں صوفی صافی" ص۲ جمال قاسمی

یوں بھی اس زمانہ کی پرانی تحریروں میں لوگ مولنا کے ساتھ "شاہ" کے لفظ کا اضافہ اسم گرامی میں جو کرنے لگے تھے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ دونوں پہلوؤں کی جامعیت کا اعتراف ان الفاظ سے کیا جاتا تھا، آخر جن علمی و عملی مشاغل میں آپ کی زندگی گذر رہی تھی، ان کو دیکھ کر دیکھنے والے آپ کو جو کچھ سمجھنے اور کہنے لگے تھے اس کے سوا اور کیا سمجھتے اور کیا کہتے خطاب و القاب کے مذکورہ عام رواجی الفاظ کے لئے جو کچھ چاہیئے تھا، کون سی بات باقی رہی تھی جو آپ میں نہ پائی جاتی تھی؛ مگر مدرسہ میں پڑھائے جانے والے علوم جن کو پڑھ کر فارغ ہونے والے مولوی اور مولینا وغیرہ کے ناموں سے موسوم ہوتے ہیں، ان علوم کی حد تک تو کبھی کبھی سننے والوں نے اس قسم کے فقرے آپ کی زبان مبارک سے سن بھی لئے ہیں، پہلے بھی کسی موقعہ پر اس کا ذکر آچکا ہے، یعنی فرماتے کہ

"مولویت کا دھبہ مجھ پر لگا ہوا ہے" ص۱۷۶ ارواح

لیکن اس "دھبہ" اور "داغ" کی پروا بھی عملاً کس حد تک کی جاتی تھی اس کا اندازہ اسی واقعہ سے

ہوسکتا ہے، جس کے متعلق یہ فقرہ زبان مبارک پر جاری ہوا تھا' عرض کرچکا ہوں کہ بغیر مزامیر و
ساز کے ایک غیر پیشہ ور خوش گلو آدمی خوزجہ کے رہنے والے رن مست خاں ... مولوی عبداللہ صاحب
گلاوٹھی والے کے اشارہ چشم سے حافظ کی غزل کا مطلع

غلام نرگس مست تو تاجدار انند

الاپنے لگے تھے۔ حضرت والا کو یہ بات ناگوار گذری' اور ناگواری کی توجیہ فرماتے ہوئے "مولویت
کے اس دھبہ کا ذکر اتفاقاً فرمادیا گیا تھا۔

اس قسم کا سادہ غنا اگرچہ مولویوں کے عام طبقہ میں بھی چنداں محل شناعت و ملامت نہیں ہے، لیکن
مولویوں میں ایک گروہ گانے کی اس سادہ ترین شکل کو بھی جائز نہیں سمجھتا' جہاں تک میرا خیال
ہے' اسی طبقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے اپنی مولویت کے "دھبہ" کا یہاں تذکرہ فرمایا
تھا' واللہ اعلم بالصواب۔ ہے تو ایک جزئی واقعہ لیکن بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ علماء کا
جس مسئلہ میں اختلاف ہو' خواہ دلائل کے لحاظ سے اس اختلاف کی نوعیت جیسی کچھ بھی ہو،
لیکن شاید آپ کا یہ دینی مذاق تھا کہ اختلاف کی صورت میں اسی پہلو کو اختیار فرماتے تھے جس سے احتیاط
کے تقاضوں کی بھی تکمیل ہوتی ہو' اور یہ الزام بھی عائد نہ ہو، کہ علماء کے فتویٰ کا احترام نہ کیا گیا؛

آخر میں پوچھتا ہوں کہ غنا کی مذکورہ بالا سادہ ترین شکل کو علماء کا جو طبقہ ناجائز نہیں سمجھتا' وہ زیادہ
سے زیادہ اگر کچھ ثابت کرسکتا ہے تو غایت مافی الباب اس سے زیادہ تو کوئی بات ثابت نہیں ہوسکتی
کہ شریعت کی رو سے اس قسم کا "گانا" جائز ہے' مباح ہے' یعنی اس کے سننے والوں کو گنہگار نہیں
قرار دیا جاسکتا' لیکن اس قسم کے گانے کا سننا شرعاً فرض ہے، یا واجب' یا فرض و واجب نہ سہی'
مستحب تک اس قسم کے گانے کو بھی شرعی دلائل کی بنیاد پر ثابت کرنا ناممکن ہے، برخلاف اس کے
مطلق گانا خواہ کسی شکل میں ہو، علماء کا جو طبقہ اس کو ناجائز قرار دینے کا فتویٰ دیتا ہے، دلائل و
براہین کے لحاظ سے ان کے فتویٰ کی نوعیت کچھ ہی ہو مگر ان کے اس فتویٰ کی بنیاد پر اس گانے
کے سننے والے شرعاً جرم کے مجرم بھی قرار پاتے ہیں' اور اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ علماء کے

اس فتوی کی انھوں نے پروا نہ کی لیکن نہ سننے والوں کو آپ کیا کہہ سکتے ہیں، یقیناً ان پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ سماع کی مذکورہ بالا شکل کے جواز و اباحت کا جن علماء نے فتوی دیا ہے، تم نے ان علماء کے فتوی کو بے وقعت ٹھہرا کر ٹھکرا دیا، کیونکہ جواز و اباحت کے فتوی کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ فعل کے ہر دو پہلو پر عمل کرنے کا اختیار ہے۔ پس جس نے سنا اس نے بھی اسی فتوی پر عمل کیا اور جس نے نہ سنا، یقیناً اس نے بھی اباحت و جواز ہی کے اس فتوے کی تعمیل کی سعادت حاصل کی، اسی کے ساتھ احتیاط کے تقاضے کی تکمیل کا ثواب بھی نہ سننے ہی کی صورت میں محفوظ رہتا ہے۔

بہر حال جیسا کہ میں نے عرض کیا، گانے کا یہ قصہ اگرچہ ہے تو ایک اتفاقی اور جزئی واقعہ لیکن مولویت کے جس "ذھبہ" کی رعایت کا ذکر اس موقعہ پر فرمایا گیا ہے۔ اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ علاوہ احتیاط کے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ چاہتے تھے کہ مولویوں کے احترام کے منافی کوئی فعل آپ سے سرزد نہ ہو، لیکن اس ذوق اور رجحان میں کارفرما جذبہ کیا اس علمی رشتہ کا خیال تھا، جو مولویوں کی برادری سے آپ رکھتے تھے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جماعتی عصبیت کا کیا یہ نتیجہ اور ثمرہ تھا؟ سرسری نظر سے اسی کا خطرہ دلوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر آپ کو اسی سلسلہ کا ایک اور واقعہ سناتا ہوں، عجب واقعہ جس وقت پہلی دفعہ اس واقعہ کا علم مجھے ہوا، تو تھوڑی دیر تک کچھ متحیر سا ہو کر رہ گیا، لیکن یہ تحیر اسی عام مغالطہ کا نتیجہ تھا کہ پاکوں کے کام کو ہم جیسے ناپاک لوگ اپنے کام سے ناپتے اور اسی پر قیاس کر کے اس کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ حضرت والا کی منجملہ بہت سی خصوصیتوں کے ایک بڑی مشہور خصوصیت آپ کی نرم مزاجی اور حد سے زیادہ مروت تھی، انشاء اللہ اپنے موقعہ پر ان کے تفصیلی نمونے بھی آپ کے سامنے آئیں گے، یہاں اجمالی اندازہ کے لئے اتنی بات کافی ہو سکتی ہے کہ فرض و واجب تو نہیں لیکن اس قسم کی نمازیں جیسے چاشت و اشراق وغیرہ نفلی نمازوں کا حال ہے بالاتفاق تقریباً تواتر کے رنگ میں لوگوں سے یہ روایتیں نقل کی جاتی ہیں کہ دوسروں کے خیال سے آپ

ان نفلی نمازوں کو بھی ترک فرمادیا کرتے تھے، حالانکہ آپ کے شبانہ یوم کے مشاغل میں یہ نمازیں شریک تھیں اس کے راویوں میں حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں؛ اور امیر شاہ خاں کی طرف یہ روایت جو منسوب کی گئی ہے، اگر صحیح ہے، یعنی یہ کہتے ہوئے کہ

"حضرت نانوتوی کو حرام کے طعام سے جیسے نفرت تھی، ویسے ہی، اس کا احساس بھی بہت جلد کرتے تھے"

لیکن اسی کے ساتھ اپنی فطری مروت اور نرم مزاجی کی وجہ سے کسی کی خاطر شکنی بھی آپ کے لئے ناقابل برداشت تھی، پھر جانتے ہیں ان دو متضاد کیفیتوں میں تطبیق کی عملی صورت کیا اختیار فرمائی جاتی تھی، مذکورہ بالا تمہید کے بعد خان صاحب بیان کیا کرتے تھے کہ ــ

"مگر دعوت بوجہ دلداری، ہر ایک کی منظور فرمالیتے تھے"

اور اس "دلداری" کے سلسلے میں جیسا کہ چاہئے تھا بعض اوقات ناجائز یا مشتبہ آمدنی رکھنے والوں کی دعوتوں میں شریک ہونے پر آپ کو مجبور ہونا پڑتا تھا۔ شریک بھی ہوتے تھے اور دعوت کرنے والے کی تسلی کے لئے کچھ تناول بھی فرمالیتے تھے، لیکن گھر پہونچ کر خان صاحب کی شہادت ہے کہ

"قے کرتے تھے" ص۱۷۱

اب ایک طرف آپ حضرت والا کی اس فطری خصوصیت کو پیش نظر رکھئے، اور اسی کے ساتھ جیسا کہ معلوم اور دستور ہے، طریقت کے شیوخ اور بیعت کے پیروں کے ساتھ لوگوں کے تعلقات کی کیا نوعیت ہوتی ہے، پھر جو تعلق حضرت والا کو اپنے محبوب شیخ طریقت سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تھا، شاید وہ اپنی آپ نظیر تھا، غیر معمولی احترام و عظمت سے لبریز الفاظ بے ساختہ اپنی کتابوں میں حاجی صاحب قبلہ کے متعلق جو نکل آتے ہیں، وہ آج بھی ہر ایک کے سامنے ہیں، خیر بجائے خود یہ ایک الگ مسئلہ ہے، مستقل باب ہی انشاء اللہ اس کے لئے منعقد کیا جائے گا، یہاں صرف حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان

کردہ یہ روایت مقصد کے لئے کافی ہوگی ؛ قصص الاکابر میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے عطا فرمودہ مسودہ کو مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نقل کر رہے تھے

"اس میں (یعنی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارقام فرمودہ مسودہ میں) ایک لفظ سہواً غلط لکھا گیا تھا"

غلط بھی تھا، اور سہواً لکھا گیا تھا، نقل کرنے والے سے زیادہ سہو سے لکھی ہوئی اس غلطی کی تصحیح کا جائز استحقاق اور کسے حاصل تھا، لیکن سہواً یہ غلطی جس کے قلم سے نکلی تھی وہ ان کے پیر و مرشد سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ کا قلم مبارک تھا، جانتے ہیں کہ سہواً لکھی ہوئی اس غلطی کے ساتھ نقل کرنے والے فاضل کو باوجود جاننے کے تصحیح کی جرأت نہ ہوسکی مولانا تھانوی فرماتے تھے کہ

"مولانا (محمد قاسم) نے صحیح نہیں کیا، ادب کی وجہ سے"

پھر کیا کیا ان ہی کا بیان ہے کہ

"بلکہ وہاں جگہ چھوڑ دی"

اور اسی شکل میں یہ نقل کیا ہوا مبیضہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں پیش فرمادیا گیا (اور چھوٹے ہوئے لفظ کے بارہ میں عرض کیا کہ حضرت یہ لفظ سمجھ میں نہیں آیا حضرت حاجی صاحب نے لفظ دیکھ فرمایا کہ او ہو بھائی یہ املا کی غلطی رہ گئی اور یہ کہہ کر اس لفظ کو (محمد طیب عفی عنہ نقلاً عن الشیخ مولانا حبیب الرحمٰن العثمانی رح)

"حضرت حاجی صاحب نے درست فرمادیا" (الہادی ماہ جمادی الاولیٰ ۵۰ھ)

مگر اب سنئے اس واقعہ کو جس نے مجھے تھوڑی دیر کے لئے متحیر بنا دیا تھا، اس کے راوی بھی حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہی ہیں، براہ راست حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے سن کر اس واقعہ کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے، قصص الاکابر میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ پائی جاتی ہے، حکیم الامت رح نے فرمایا کہ

"حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ مولوی محمد قاسم صاحب سے جو کچھ میں نے

"تقریراً یا تحریراً کہا انھوں نے ہمیشہ خوشی سے قبول کیا۔"

بیسیوں سال کے تعلقات میں خوشی کے ساتھ ہمیشہ قبول کرنے کی اس شہادت کے بعد حاجی صاحب نے فرمایا کہ

"مگر ایک دفعہ ایسا کورا جواب دیا کہ میں دیکھتا رہ گیا"

ساری زندگی میں صرف ایک دفعہ کورے جواب کی جو صورت پیش آئی اسی کا تذکرہ اس وقت میرا مقصود ہے یہ کورا جواب جس فرمائش کے مقابلہ میں دیا گیا وہی سننے کا واقعہ ہے، حاجی صاحب نے فرمایا کہ ہوا یہ تھا کہ

"نواب محمد علی[1] صاحب رئیس ٹونک نے بعد معزولی مکہ معظمہ میں حرم شریف میں بخاری شریف کا ختم کرانا چاہا"

[1] ریاست ٹونک کے بانی نواب امیر خاں مرحوم کے پوتے کا نام محمد علی خاں تھا، سنا جاتا ہے کہ جسمانی کمالات کے ساتھ علوم دینی سے بھی بہرہ یاب تھے، گدی پر بیٹھنے کے بعد دماغ میں آزادی کی ہوا سمائی، ٹونک کی ایک گمنام مختصر سی سرحدی ریاست لاوا نامی سے ٹونک والوں کی کش مکش برسوں سے جاری تھی، لیکن انگریزوں کے دباؤ کی وجہ سے قلع قمع کرنے کا فیصلہ آسان نہ تھا، محمد علی خاں مرحوم سے یہی غلطی سرزد ہوئی، اپنی فوجی طاقت سے لاوا کی ریاست کو انھوں نے تہ و بالا کر دیا، بہت سے آدمی مارے گئے، انگریزوں کی طرف سے پوچھ گچھ ہوئی، جس کے منتظر ہی بیٹھے تھے، کہتے ہیں کہ جواب اعلان جنگ کے ساتھ انگریزوں کو بھی نواب بے چارے نے دیا۔ ٹونک کا انگریزی فوج نے محاصرہ کر لیا۔ نواب کے سوا ریاست کے دوسرے ارباب بست و کشاد ناعاقبت اندیشی کے اس فیصلہ سے جو نواب صاحب نے اعلان جنگ کی صورت میں کیا تھا، ناراض تھے، نواب نے اپنے فوجی اور سول حکام کو بلا کر مقابلہ کا حکم دیا۔ جواب دیا گیا کہ آپ کی فوج انگریزوں سے لڑنے کو تیار نہیں ہے، ہکا بکا ہو کر رہ گئے، اور انگریزوں کے حوالہ اپنے آپ کو کر دیا۔ انگریزوں نے صرف اتنی سزا پر اکتفا کیا کہ گدی سے ان کو اتار دیا۔ اور کچھ ماہوار ریاست سے جاری کر کے حکم دیا کہ زندگی کے باقی دن بنارس میں گذاریں۔ معزولی کے بعد نواب نے بحالی کی کوششوں میں وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے، لیکن کامیابی نہ ہوئی، ان ہی کوششوں کے سلسلے میں غالباً یہ کوشش بھی تھی جس کی طرف حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بیان میں اشارہ کیا ہے، تاہم دینی علوم سے چونکہ نواب صاحب کو مناسبت تھی اس لئے لغت حدیث میں مجمع البحار اور بخاری کی فارسی شرح وغیرہ بھی ان کے مصارف سے اسی زمانہ میں شائع ہوئی، اور بنارس میں اسلامی علوم و فنون کے مخطوطات و مطبوعات کا ایک نادر ذخیرہ فراہم ہوا، جو ان کی وفات کے بعد ٹونک منتقل ہوا، پہلے تو اس کتب خانہ کا نظم ان کے چھوٹے صاحبزادے عبدالرحیم خاں مرحوم کی نگرانی میں بہت اچھا اور معقول تھا، اب اس کتب خانہ پر کیا گذری واللہ

اپنی اس آرزو کو نواب صاحب مرحوم نے حضرت حاجی صاحب قبلہ تک پہونچایا، انھوں نے لکھوا دیا کہ اس کا نظم کر دیا جائے گا' اس کے بعد بخاری پڑھنے کی صلاحیت. رکھنے والے دوسرے حضرات سے جہاں حضرت حاجی صاحب نے اس وعدہ کی تکمیل کی فرمائش کی، اسی سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ جو اتفاقاً اس زمانہ میں مکہ معظمہ ہی میں تھے، یہ کہا کہ

"میں وعدہ کر چکا ہوں آپ بھی ختم میں شریک ہو جائیں"

حضرت نانوتوی کی جن خصوصیات کا اجمالی تذکرہ کر چکا ہوں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچئے مشتبہ اور ناجائز آمدنی رکھنے والے مسلمانوں کی دل شکنی بھی جو برداشت نہیں کر سکتا تھا، "قے" کی مصیبت کا خرید لینا اس سے زیادہ آسان جس کے لئے تھا وہی آج کسی معمولی آدمی سے نہیں بلکہ اپنے اسی پیر و مرشد سے جس کے تحریری و تقریری احکام کی تعمیل ہی میں پیر و مرشد ہی کی شہادت کے مطابق ساری زندگی بسر ہوئی تھی' اسی سے یہ عرض کرتا ہے، کہ

"حضرت میں نے بخاری اس لئے نہیں پڑھی تھی" (ص۲۵ الہادی صفر ۵۰ھ)

انکار و عدم تعمیل کی یہ عجیب و غریب شکل جس میں ہزاروں اقرار کی روح پوشیدہ تھی' اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلے دنیا کے سب سے بڑے مطاع صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بہ مقام حدیبیہ ایک سراپا اطاعت اور مجسم فرماں پذیری کی طرف سے اس وقت پیش ہوئی تھی، جب حکم دیا گیا تھا کہ "رسول اللہ" کا لفظ میرے نام "محمد" کے بعد جو لکھا گیا ہے، اسے مٹا دو، لیکن سب سے بڑے مطاع کے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر کے کر یہ ثابت کیا تھا کہ اس سے بڑا اقرار کرنے والا کوئی نہیں ہے، کچھ اسی سنت کا احیاء و اعادہ ایک امتی مطیع کی طرف سے اپنے مرشد مطاع کے آگے کیا جا رہا تھا' عدم تعمیل کے قالب میں تعمیل حکم کی روح جس دل آویز طریقہ سے اس وقت پیش کی گئی تھی کہ جس کے حکم کی تعمیل سے انکار کیا گیا تھا' وہی اس کو رے جواب کے متعلق یہ فرماتے ہوئے کہ "میں تو دیکھتا رہ گیا" آخر میں حضرت تھانوی سے انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ

"میرے اوپر اس کا بڑا اثر ہوا"

آخر اس کا اثر نہ ہوتا تو کس کا ہوتا، پیری و مریدی تعلیم و تربیت، سیر و سلوک، کے ان سارے قصوں کا مطلب ہی اس کے سوا کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا سب سے اونچا رہے، بلندی صرف اللہ ہی کے کلمہ کی ہو، انکار کی شکل میں جس اقرار کی روح آج جلوہ گر ہوئی تھی، اس سے بہتر نمونہ اس سلسلے میں اور کیا پیش ہو سکتا تھا کہ والی ریاست کی دولت کی پروا تو کیا کی جاتی، جو خود ان کا والی، آقا اور مالک تھا، اپنے آپ کو اس کے حکم کی تعمیل سے بھی اس لئے قاصر، و معذور بتایا جا رہا تھا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی عزت و وقار کا سوال دامن کش ہے:

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ بقول اپنے مولویت کے جس "دھبہ" کا نمود، و ظہور دانستہ یا نادانستہ طور پر سیدنا الامام الکبیر سے ہو جاتا تھا، اس کے متعلق طبقاتی حمیت، یا جماعتی جنبہ داری کے جذبہ کا خیال بڑا پست خیال ہوگا، انکار کی شکل میں اقرار کے جس واقعہ کا ابھی ذکر کیا گیا، اس کو سامنے رکھتے ہوئے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ علماء کے احترام و عظمت کا سوال آپ کے سامنے آ بھی جاتا تھا، تو اس کا تعلق خود علماء سے نہیں بلکہ اس علم سے تھا، جس کی عزت و وقار کے مقابلہ میں آپ نے اس حکم کی تعمیل سے بھی اپنے آپ کو معذور ظاہر کیا، جسکی تعمیل ہی میں ساری عمر گذری تھی، اور زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ناز وہی سعادت تھی جو اس حکم کی تعمیل میں میسر آ جاتی تھی، اور کچھ اسی قسم کی دینی غیرت دینی علوم کی حمیت ہی کا شاید وہ اضطراری تقاضا تھا، جو ریاست رامپور میں ظاہر ہوا تھا،

قصہ تو بہت طویل ہے، ارواح ثلاثہ میں مولوی حمید الدین سنبھلی مرحوم کے حوالہ سے بھی بروایت مولنا حبیب الرحمٰن یہ قصہ نقل کیا گیا ہے، نیز حضرت تھانوی کے ملفوظات قصص الاکابر میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے، حاصل یہ ہے، کہ کسی صاحب سے ملنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر ایک دفعہ رامپور[1] تشریف لے گئے، رامپور شمالی ہند میں اس وقت مغلی تہذیب و تمدن کا لکھنؤ کے ختم ہو جانے

[1] حضرت تھانوی کے بیان میں رامپور کے ساتھ "افغانان" کا لاحقہ بھی شریک ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضلع سہارنپور کے نواح میں بھی رامپور نامی جو قصبہ ہے، جیسے امتیاز کے لئے اس کا ذکر کرتے ہوئے لوگ "رامپور منہاران" کہتے ہیں اسی طرح اس علاقہ میں ریاست رامپور کی راجدھانی کو "رامپور افغانان" لوگ کہا کرتے تھے ۱۲

کے بعد آخری ملجا ردبادی تھا، مغل دربار منجملہ دوسری چیزوں کے مولویوں کے اس خاص طبقہ کو خاص اہمیت حاصل تھی، جن کا نام اس عہد میں "معقولی" تھا، گرے پڑے، ٹوٹے پھوٹے ان ہی معقولیوں کے لئے رامپور کے سوا شمالی ہند میں کوئی جائے پناہ نہ تھی، خصوصاً مرحوم نواب کلب علی خاں نے مغل دربار کے لوازم و آثار کی حفاظت میں اپنے بس سے زیادہ اولوالعزمی کا اظہار چونکہ کیا تھا، اس لئے ان کے دور میں معقولی علماء کے امام الائمہ مولانا عبدالحق خیرآبادی تک رامپور ہی پہنچ گئے، کہتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کے استاذ مولانا مملوک العلی صاحب نے اقلیدس کا جو ترجمہ اردو زبان میں کیا تھا، اس پر

"مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی نے رکیک الفاظ میں اعتراض کئے تھے" ص ۱۹۹

اس اعتراض کی خبریں سیدنا الامام الکبیر تک بھی پہونچتی رہتی تھیں، نیز اسی زمانہ میں "تحذیرالناس" نامی رسالہ کے بعض دعاوی کی وجہ سے بعض مولویوں کی طرف سے خود سیدنا الامام الکبیر پر طعن و تشنیع کا سلسلہ جاری تھا، الغرض کچھ تو ان واقعات کی وجہ سے اور کچھ اس لئے کہ "معقولیت" کا مطلب ہی اس زمانہ میں یہ تھا کہ آدمی بجائے آدمی کے مرغ بلند بانگ بن جائے، اور اپنی بانگ کے مقابلہ میں کسی دوسرے مرغ کی بانگ اس کے لئے ناقابل برداشت بن جائے، رامپور اس قسم کے بانگ دینے والے مرغوں سے اس زمانہ میں بھرا ہوا تھا، سیدنا الامام الکبیر نے حالانکہ ان ہی وجوہ سے چاہا کہ آپ کی تشریف آوری کی خبر مشہور نہ ہو، لیکن مشک کی خوشبو کو عطار بھی تو چھپانے کے باوجود چھپا نہیں سکتا، خبر پھیل ہی کر رہی، مولویوں اور ان کے عقیدت مند تلامذہ میں ہلچل مچ گئی، خود حضرت والا سے کچھ کہنے سننے کی جرأت تو کوئی نہ کر سکا، البتہ آپ کے ساتھ بعض طلبہ بھی تھے، ان کے ساتھ چھیڑ خانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، ارواح ثلاثہ میں ہے کہ ایک دفعہ جب آپ کے طالب العلم (مولانا احمد حسن امروہی) کو کسی نے چھیڑا، تو حضرت والا نے جھنجھلا کر اس طالب العلم سے کہا کہ

"اگر یہ (احمد حسن) عاجز ہوئے تو میں ان کی مدد کروں گا، اور اگر تم عاجز ہوئے تو تمہارے استاد تمہاری مدد کریں گے، پھر یہ کیوں نہ ہو کہ تم اپنے استاد کو لے آؤ، اور میری

ان سے گفتگو ہو جائے"۔ (ص۱۹۵ ارواح)

بات مناظرہ اور مباحثہ والی تو اسی پر ختم ہو گئی، لیکن اسی کے بعد لوگوں نے وعظ گوئی پر حضرت والا سے اصرار کیا راضی ہو گئے، واللہ اعلم بالصواب مولوی حمید الدین سنبھلی[1] جیسے ثقہ راوی کی طرف یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ

"شب کو مجلس وعظ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، شہر کے امراء و رؤسا، علماء، عمائد شہر، طلبہ غرض کہ ہر طبقہ کے لوگ بھر گئے تھے، اور لوگوں کا ایک میلہ سا لگ گیا تھا"

آخر وہی کہتے تھے کہ

"بس اس دن شاید بچے اور عورتیں گھروں میں رہ گئی ہوں گی، ورنہ کل شہر مجلس وعظ میں آ گیا تھا"۔

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ

"شہر کے تمام مشاہیر علماء سوائے مولوی عبد الحق خیر آبادی کے اس وعظ میں موجود تھے" ص۱۹۶

گویا یوں سمجھئے کہ سارا شہر ہی امنڈ آیا تھا، اس دن کی تقریر کے متعلق منشی حمید الدین یہ بھی بیان کرتے تھے کہ

"ایک غیر معمولی جلال اور جوش کی شان سے (وعظ) بیان فرمایا"۔

اس غیر معمولی جلال اور جوش کی شان کے واقعی اسباب کیا تھے صحیح علم تو اس کا علام الغیوب ہی کو ہے، لیکن منشی حمید الدین کا تاثر جیسا کہ وہی کہتے تھے یہ تھا کہ رامپور

"کے طلبہ نے مولوی احمد حسن (امروہی) سے چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی"

[1] مخدوم و محترم مفتی عبد اللطیف صاحب سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ و مسلم یونیورسٹی جنھوں نے مولوی حمید الدین مرحوم کو دیکھا تھا، اور ان کی صحبتوں میں کافی وقت مفتی صاحب کا گذرا ہے، وہی مولوی حمید الدین کا ذکر غیر معمولی الفاظ میں کیا کرتے تھے، ان کی عقل کی، ذہن کی، فہم و فراست، سیرت و کردار کی تعریف بھی کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان سے غیر معمولی طور پر متاثر ہیں ۱۲

"یہ جوش کی شان اسی وقت سے پیدا ہوئی تھی" ص۱۹۹

بہرحال اسباب و مؤثرات کچھ ہی ہوں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گو حسب دستور آغاز تقریر کا تو قرآن ہی کی ایک آیت سے فرمایا گیا[1] لیکن قرآنی الفاظ ہی سے "معقولات" کہئے، یا "فلسفہ مغلیہ" کے سارے سرمایہ ناز مسائل کے متعلق صحیح صحیح نتائج نکال نکال کر دکھایا اور سنایا جارہا تھا کہ قرآن میں یہ باتیں مل سکتی ہیں، بے چارے معقولی مولویوں کو تو اس کا سان و گمان بھی نہ تھا، سننے والے بہوت و حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیا سنایا جارہا ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا، اس وقت جلال اور جوش کا ایک رنگ تھا، سب کچھ سنانے کے بعد منشی حمیدالدین کا بیان تو یہ ہے کہ آخر میں سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے کہ

"لوگ گھر میں بیٹھکر اعتراض کرتے ہیں، اگر کچھ حوصلہ ہے، تو میدان میں آجائیں"

وہی یہ بھی کہتے ہیں کہ خاتمہ اس علمی تحدی یا چیلنج کا ان الفاظ پر ہوا تھا کہ

"مگر ہرگز اس کی توقع لے کر نہ آئیں، کہ وہ قاسم سے عہدہ برآ ہوسکیں گے۔"

فقرہ تو فقرہ، جہاں تک میرا خیال ہے اس نوعیت کا خطرہ بھی، حضرت والا کے دل و دماغ میں کبھی نہ گذرا ہوگا، مگر آج ہی کہا گیا، یا کہلوایا گیا تھا، دوسری شق ہی میرے نزدیک اس لئے قابل ترجیح ہے کہ معاً اسی کے بعد منشی حمیدالدین نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے بھی سنا یعنی جن لوگوں کو چیلنج دیا گیا تھا، ان ہی کو سنا کر فرمارہے تھے کہ

"میں کچھ نہیں ہوں، مگر جن کی جوتیاں میں نے سیدھی کی ہیں، وہ سب کچھ تھے"

ظاہر ہے کہ علماء و فضلاء، معقولات کے جبابرہ اصحاب جدل و مکابرہ سے بھری ہوئی رامپور کی

---

[1] تقریر کے عنوان کے لئے جس آیت کا انتخاب فرمایا گیا تھا وہ سورۂ واقعہ کی ابتدائی آیتیں تھیں، منشی حمیدالدین کا بیان ہے کہ اجزاء لایتجزیٰ، قیام قیامت، حدوث عالم وغیرہ جیسے معقولات کے اہم مسائل پر اسی آیت کے الفاظ کی روشنی میں بحث فرماتے جاتے تھے، حضرت تھانوی نے دوسرے سنکر عربی زبان میں ان خیالات کو قلم بند فرمادیا تھا صدرا مطبوعہ مطبع مجتبائی کے حاشیہ پر آپ کی قلم بند کی ہوئی تقریر چھاپ بھی دی گئی ہے، حصہ دوم میں سیدنا الامام الکبیر کے علمی نظریات وافکار پر بحث کرنیکا موقعہ اگر میسر آیا، تو انشاء اللہ اسمیں اس تقریر کا خلاصہ بھی درج کردیا جائیگا۔

اس مجلس میں "میں کچھ نہیں ہوں" کے اعتراف و اقرار میں جس نے اپنی اہانت نہیں محسوس کی یقیناً عوام و خواص کے اس بھرے میلے میں جو یہ کہہ سکتا تھا، سابق الذکر فقرے کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ اس نے خود نہیں کہا تھا، بلکہ کہلانے والے نے کہلوا دیا تھا، تو آخر خود سوچئے کہ دونوں قولوں میں تطبیق کی صورت ہی کیا ہوسکتی ہے، خصوصاً کسر نفسی کی بنیاد پر غلط بیانی سے کام لینے کی عام عادت کا جس کے متعلق کبھی تجربہ نہ ہوا ہو، اور یہ روایت تو منشی حمید الدین سنبھلی مرحوم کی ہے، لیکن اسی قصے کے بعض اجزا حضرت تھانوی کے ملفوظات طیبہ میں جو پائے جاتے ہیں، جن میں ایک جزء یہ بھی ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر نے اسی موقعہ پر اس کا اعلان بھی فرمایا تھا کہ

"معقول کے تمام مسائل کو نفیاً یا اثباتاً قرآن شریف سے نکال سکتا ہوں"[1] قصص ص۲ الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۰ھ

افسوس ہے کہ منشی حمید الدین کے بیان میں یہ جزء نہیں پایا جاتا، لیکن ظاہر ہے کہ عدم ذکر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کی تقریر میں یہ جزء شریک نہ تھا، کچھ بھی ہو، حضرت تھانوی کی روایت کے ان الفاظ کے بعد میرا احساس تو یہ ہے کہ تحدی اور چیلنج کے رنگ میں پیش کرنے والوں نے رامپور والی تقریر کے خاتمہ کو جو پیش کیا ہے، شاید اس رنگ میں خود بیان کرنے والوں کی ذاتی خواہشیں بھی شریک ہوگئی ہیں، ورنہ ان الفاظ کی روشنی میں تحدی سے زیادہ مجھے تو مشورے کا رنگ غالب نظر آتا ہے، مطلب یہ ہے کہ "معقولات" کے نام سے جن علوم کی تعلیم ہمارے قدیم عربی مدارس میں ہوتی تھی، بظاہر تو یہی کہا جاتا تھا کہ منطق اور منطق کے بعد اور منطق کے ساتھ فلسفہ کی کتابیں معقولات کے نام سے

[1] میں نے اس واقعہ کے سلسلہ میں حاجی امیر شاہ خاں صاحب سے یہ جزء بھی سنا ہے کہ اس وعظ میں حضرت نے خطبۂ ماثورہ کے بعد آیت کریمہ اذا وقعت الواقعۃ لیس لوقعتہا کاذبۃ الی قولہ فکانت ھباءً منبثا تک تلاوت فرمائی۔ اور فلسفہ کے تمام معرکۃ الآرا اور مایۂ ناز مسائل کی ردّ و قدح اسی آیت کے الفاظ سے فرمایا۔ جزء لایتجزی کا ابطال اذا رجت الارض رجاً و بست الجبال بساً سے فرماکر قیامت کا اثبات فرمایا۔ گویا اس چیلنج میں صرف اسی کی تحدی نہ تھی کہ میں معقول کے تمام مسائل کو نفیاً یا اثباتاً قرآن سے نکال سکتا ہوں بلکہ بہت سے مشہور اہم اور معرکۃ الآرا مسائل کو نکال کر دکھلا بھی دیا جس سے سامعین ورطۂ حیرت میں غرق تھے۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ لوگوں کا عالم کاَنَّ علیٰ رؤسہم الطیر کا تھا۔ (محمد طیب غفرلہ)

پڑھائی جاتی ہیں، اور یہ بھی درست ہے کہ فلسفہ کی تعریف کرتے ہوئے شروع میں طالب العلموں کو یہی باور کرایا جاتا تھا کہ انسانی پرواز کی حد تک کائنات کے واقعی حالات کی صحیح جستجو سے جو معلومات حاصل ہو چکی ہیں، فلسفہ کے نام سے ان ہی معلومات کی تعلیم طلبہ کو دی جائے گی۔ فلسفہ کی ابتدائی کتابوں میں اس میں شک نہیں کہ صحیح یا غلط ترجموں کے ذریعہ سے اس سلسلہ میں مسلمانوں تک غیر قوموں کی معلومات جو پہونچی تھیں، طالب العلموں کو وہی بتائی بھی جاتی تھیں، لیکن ان معلومات کا ذخیرہ بس اس قدر ہے کہ ابہری کی ہدایت الحکمت وغیرہ جیسی کتابوں کے چند اوراق میں وہ ختم ہو جاتا ہے۔ چاہئے تو یہی تھا کہ فلسفہ پڑھانے کی ضرورت بھی تھی تو ان کے لئے یہ چند اوراق کافی تھے لیکن دس بیس ورق کے ان مختصر رسالوں سے لوگوں کا جی ظاہر ہے کہ کیسے بھر سکتا تھا، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی کائنات کی جگہ خود انسانوں کی بنائی ہوئی کتابوں نے لے لی، پھر فلسفہ کی ان ہی کتابوں کے فقرے اور ان کے الفاظ کو ایک قسم کی مستقل ہستی قرار دیتے ہوئے ان ہی کے معانی و مطالب تک رسائی کی کوشش اور اس کوشش سے پیدا ہونے والے نکات و اسرار کی تعلیم فلسفہ کے نام سے ہماری مدارس میں ہونے لگی، بجائے کائناتی فلسفہ کے اسی کتابی فلسفہ کا نام "معقولات" رکھدیا گیا تھا، ایسی کتابیں جن کی تصنیف کرنے والوں کی انشائی قوت خواہ کمزور تھی، یا قصداً انھوں نے بیان کا پیچیدہ اور ژولیدہ طریقہ اختیار کیا تھا، ان کو اس عجیب و غریب کتابی فلسفہ کے عروج کے زمانہ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی، میں مبالغہ نہیں کروں گا اگر یہ کہوں کہ اس قسم کی بعض کتابوں کے ایک ایک لفظ کے متعلق لکھنے والوں نے سیکڑوں صفحات سیاہ کر دیئے۔ یوں کتابی فلسفہ کا ایک طومار پچھلی چند صدیوں میں تیار ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ "فلسفہ" کے نام سے اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے والوں کو کائنات کے واقعی موجودات

لـه مثلاً میر زاہد کی شرح قطبیہ کے ایک فقرہ میں بعد تحقق الموصوف کا جو جزء ہے اس کے ایک لفظ "بعد" کے متعلق لٹریچر کو دیکھئے، یا حمد اللہ میں وجود رابطی کی تعبیر میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کی متعلقہ موشگافیوں کو ملاحظہ فرمائیے، الی غیر ذلک من الخرافات ۱۲

اوران کے واقعی حالات کی تحقیق و تلاش سے دلچسپی پیدا ہونے کی وجہ ہی کیا ہوسکتی تھی، ان غریبوں کی بحث کا موضوع تو بس اس قلم چلانے والے مصنف کی عبارت بن گئی تھی جو اتفاقاً اس سے پہلے پیدا ہو کر کاغذ پر سیاہیوں کو پھیلا کر چلا گیا تھا، تاہم اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ کتابی، اور عبارتی فلسفہ ہی اگر رد و قدح سوال و جواب کی کثرت مشق سے ایک قسم کی باریک بینی، یا بال کی کھال نکالنے کی صلاحیت لوگوں میں اس تعلیم سے ضرور پیدا ہو جاتی تھی، عملی زندگی میں شریک ہونے کے بعد ان کی یہ ذہنی مشق عوام سے ان کو ممتاز کر دیتی تھی، اور اسی پر ان کی مولویت کی دیوار کی بنیاد قائم تھی

ظاہر ہے کہ کائنات، اور کائنات کے قدرتی نظام سے جب تعلق ہی باقی نہ رہا اور بات صرف کتابوں کی عبارتوں، عبارتوں کے الفاظ و حروف ہی تک محدود ہو کر رہ گئی، اور جو ذہنی لچک اس کتابی فلسفہ کے مباحث سے پیدا ہوتی تھی، اسی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا تھا، تو انسانوں کی بنائی ہوئی کتابوں، اور ان کی عبارتوں سے خدا کی کتاب اس کی زیادہ مستحق تھی کہ اس کے الفاظ اور فقروں پر غور و خوض کیا جائے، اور غور و خوض کے اسی مشغلہ سے ذہنی نشو و نما، فکری ارتقاء کا کام لیا جائے،

الغرض آدمیوں کی ساختہ پرداختہ کتابوں سے ہٹا کر اللہ کی کتاب کی طرف معقولی مولویوں کی توجہ کے رخ کو پھیر دینا، ایک کھلا ہوا نیک مشورہ ہو سکتا تھا، خیال بھی گذرتا ہے کہ شاید سیدنا الامام الکبیر نے رامپور کے مولویوں کو ممکن ہے حضرت تھانوی کے روایت کردہ الفاظ میں یہی مشورہ دیا ہو، خود حضرت تھانوی اس مجلس میں شریک نہ تھے، کسی دوسرے سے سنکر روایت کرتے تھے نہیں کہا جا سکتا کہ اسی کے ساتھ اور کیا فرمایا گیا تھا، سننے والوں نے صرف اپنے مذاق کے مطابق جو باتیں تھیں ان ہی کو چن لیا، بہر کیف سیدنا الامام الکبیر نے تحدی کے رنگ میں پیش کیا ہو، یا مشورے کی صورت میں یا دونوں باتیں آپ کے پیش نظر ہوں، ان کی نیت کیا تھی اب اسے کون بتا سکتا ہے، لیکن آپ کا رامپور کی اس مجلس میں یہ دعویٰ کہ "معقول کے تمام مسائل کو نفیاً و اثباتاً قرآن شریف سے نکال سکتا ہوں" میری سمجھ میں تو اس سے یہی آتا ہے

کہ معقولی مولویوں کو متوجہ کرتے ہوئے، آپ یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ جو کام معقولات کی کتابوں سے تم لوگ لے رہے ہو یعنی معقول کی ان کتابوں کی سطر سطر پر جیسے جھونپڑے ڈال ڈال کر پڑ جاتے ہو، اور ان کے مختلف پہلوؤں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے نتیجے نکالتے ہو، چاہو، تو یہی کام قرآن سے بھی لے سکتے ہو، اور خود تم میں اس کا سلیقہ نہ ہو، تو ہم تمکو اس کا طریقہ بتا کر دکھا سکتے ہیں، بیچ میں "نفیاً و اثباتاً" کے الفاظ سے مقصد یہ تھا کہ ہر حال میں یہ سمجھنا کہ قرآن سے ان مسائل کی تائید ہی ہوگی، جو معقولات کی کتابوں میں پڑھائے جاتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ممکن ہے کبھی تائید بھی ہو، اور کبھی قرآنی نتائج ان سے مختلف بھی ہوں، لیکن یہ دوسری بات ہے، باقی ان کتابوں سے دقت پسندی، احتمال آفرینی، وغیرہ کی مشق کا کام جو لیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ مقصد تو قرآن کے ذریعہ سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، پھر سب سے بڑی دولت تو اس راہ سے یہ ملے گی، کہ بجائے مخلوقات کے خالق کے کلام کے سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت پیدا ہوگی!۔

شاید پھر غیر ضروری طوالت کی جھنجھٹوں میں مبتلا ہو گیا لیکن عربی مدارس میں "معقولات" کے نام سے جن کتابوں کے پڑھانے کا دستور چلا آرہا ہے اور اب تک یہ دستور عمومی طور پر ختم نہیں ہوا ہے، ان کے متعلق بڑے کام کی بات کی طرف حضرت والا کے کلام سے جس نکتہ کی طرف ذہن منتقل ہوا، جی نہ مانا کہ اجمال سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھ جاؤں، میرا تو خیال ہے کہ واقعی غور و فکر، محنت و کاوش کی جو مقدار اور جو وقت معقولات کی ان کتابوں کی عبارتوں کے سمجھنے میں خرچ کیا جاتا ہے اور اب بھی خرچ کرنے والے بے دردی کے ساتھ اسی مشغلہ میں ان کو صرف کر رہے ہیں، اگر بجائے ان کے اللہ کی کتاب کے ساتھ بھی تعلق پیدا کر لیا جائے۔ تو سیدنا الامام الکبیر کے اس تجربہ کی یعنی

"قرآن مجید کے الفاظ میں ہی غور کرنا چاہئے تو مطلب بالکل صاف ہے"۔ تصفیہ صفحہ ۳
الہادی جمادی الاول ۵۷ھ

حضرت حکیم الامت تھانوی کے حوالہ سے جس کا پہلے بھی کسی موقعہ پر ذکر کر چکا ہوں، اس تجربہ کی لوگوں

کو تصدیق کرنی پڑے گی، اور علم کا نیا باب ان پر کھل جائے گا، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاذ مولٰنا محمد یعقوب یعنی ہمارے مصنف امام کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"ہر وقت کتابیں دیکھا کرتے تھے"

اسی کے ساتھ یہ بھی جو فرمایا کرتے تھے کہ

"مولٰنا محمد قاسم صاحب تو کتاب سے کچھ کہتے ہی نہ تھے اس فہم خداداد سے کہتے تھے جس کی نسبت وارد ہے کہ من یرد اللہ بہ خیرا یُفَقِّھْہُ فی الدِّین" [1] ص ۲۹ الہادی

ظاہر ہے کہ "کتاب سے کچھ کہتے ہی نہ تھے" اس میں کتاب کے لفظ سے یقیناً وہی کتابیں مراد ہیں جو آدمیوں کی بنائی ہوئی ہیں، ورنہ "الدین" کی فقہ اور سمجھ کی بنیاد جس "الکتاب" پر قائم ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ سیدنا الامام الکبیر جو کچھ بھی کہتے تھے، اسی "الکتاب" ہی سے اخذ و استنباط کر کے کہتے تھے، ان کی تحریری یادگاریں موجود ہیں، شہادت کے لئے وہی کافی ہیں، ہاں یہ سچ ہے کہ خالق کی اس "الکتاب" کو پکڑ لینے کے بعد مخلوق (انسانوں) کی بنائی ہوئی کتابوں سے حاصل کر کے کچھ کہنے کی ضرورت ان کو باقی نہیں رہی تھی، اور رامپور کی اس مجلس میں آپ کا مذکورہ بالا دعویٰ بھی اسی خداداد نعمت ہی پر مبنی تھا جو "اشتغال بالقرآن" کے صلہ میں آپ کو عطا ہوئی تھی۔

اسی کے ساتھ ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی اپنی اس طوالت سے مقصود تھا، مقصد ہے یہ کہ معقول کے تمام مسائل کو قرآن شریف سے نکالنے کا یہ مطلب لینا کہ معقول سے حضرت والا کی مراد وہ علوم ہیں، جو "فلسفہ" کے عام عنوان کے نیچے درج سمجھے جاتے ہیں جن میں طبیعیات و ریاضیات و ما بعد الطبیعیات اور ان میں ہر ایک کی فنی شاخوں میں جن چیزوں سے بحث کی جاتی ہے، اور ان کے متعلق مسائل و نظریات ان میں پائے جاتے ہیں، ان سب کے متعلق آپ دعویٰ پیش کر رہے تھے کہ قرآن سے نکال کر دکھا سکتا ہوں،

---

[1] بھلائی کا ارادہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے متعلق فرماتے ہیں تو اس کو دین سمجھا دیتے ہیں ۱۲

ممکن ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے آپ کے دعویٰ کا یہ مطلب عوام کے لئے خوش کن و خوش گوار ہو لیکن قرآن کی طرف اس قسم کی باتوں کا انتساب کہ اقلیدس کی ساری شکلیں قرآنی عبارتوں سے نکالی جا سکتی ہیں، ستاروں اور سیاروں کی تعداد، ان کی مقدار و رفتار، از قبیل حیوانات و نباتات، معدنیات و جمادات عناصر و بسائط کی خصوصیات و آثار ان ساری چیزوں سے قرآن میں بحث کی گئی ہے، میرے نزدیک جنون میں مبتلا ہونے سے پہلے قرآن کے متعلق اس قسم کے دعویٰ کی جرأت کوئی مشکل ہی سے کر سکتا ہے، ایسی باتیں وہی کہتے یا کہہ سکتے ہیں جنھوں نے سمجھا ہی نہیں ہے کہ قرآن کا موضوع کیا ہے[۱]، اور کس مقصد و غایت کے لئے نازل کرنے والے نے اپنا یہ کلام نازل فرما کر بندوں کے سپرد کیا ہے[۲]۔

---

[۱] حصہ دوم میں سیدنا الامام الکبیر کے علمی نظریات پر جب بحث کی جائیگی، وہیں القرآن العظیم کا جو تعلق قرآن ہی کی "سورہ فاتحہ" سے حضرت والا کے نزدیک ہے اس تعلق کی تفصیلی شرح پیش کی جائے گی، یہاں اجمالاً صرف اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ سورۂ فاتحہ میں بندوں کی طرف سے یہ درخواست بارگاہ ربانی میں جو پیش ہوئی ہے کہ اس صراط مستقیم (سیدھی راہ) کی ہدایت فرمائی جائے جس پر چلنے والے حق تعالیٰ کے انعام کے مستحق ہو جاتے ہیں، اور مقربین حق کے ساتھ معیت و رفاقت کا تعلق ان ہی بندوں کا قائم ہو جاتا ہے، سورۂ فاتحہ کی اسی درخواست کے جواب کا نام "القرآن العظیم" ہے الم سے والناس کی سورہ تک علاوہ سورہ فاتحہ کے اللہ کی اس کتاب میں جو کچھ ہے اسی سوال کے جواب کے مختلف پہلوؤں سے اس کا تعلق ہے، بس قرآن میں جو کچھ بھی ڈھونڈھنا ہے وہ اسی موضوع کے متعلق ڈھونڈھنا ہے ۱۲

[۲] حقیقتاً اس قسم کی فلسفیانہ موشگافیوں کی تفصیلات کو قرآن میں تلاش کرنا جن کی چند مثالیں متن میں پیش کی گئی ہیں) قرآن کے موضوع کے منافی ہی نہیں بلکہ اس کے رفیع المرتبت موضوع کی توہین بھی ہے۔ کیونکہ قرآن کا حقیقی موضوع ہدایت انسانی اور اس کے متعلقات سے بحث کرنا ہے، مادی کائنات کے مواد و اشکال اور عناصر و افلاک کی تفصیلات پیش کرنا نہیں، لیکن اصولی طور پر مادی علوم و فنون کے اصلی مبانی اور بنیادی نقطوں کو قرآن کی بلیغ تعبیرات سے اخذ کرنا اور اسے تکوینی عجائبات کے اصول کا کسی حد تک ماخذ قرار دینا نہ مصنف دام مجدہٗ کے متن و حاشیہ کے منافی ہے اور نہ ہی قرآن حکیم کے موضوع کے برخلاف ہے۔ کیونکہ جو مفکر علماء تکوینی اور مادیاتی امور قرآن سے استنباطی طور پر اخذ کرتے ہیں وہ یقیناً انہیں قرآن کا موضوع سمجھ کر نہیں بلکہ ضمنی اور استطرادی طور پر بطور لطائف و نکات ہی بیان کرتے ہیں۔ اندریں صورت ان کی حجت

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اس لئے حضرت والا کے لفظ "معقول" سے مراد بجائے فلسفہ کے خاکسار کے نزدیک وہی کتابی اور عبارتی الٹ پھیر کی باتیں ہیں، جن ہیں "معقولات" کے نام سے اس زمانہ کے معقولی مولوی

(حاشیہ بسلسلہ صفحہ ۳۷۸) یہ ہو سکتی ہے کہ قرآن کے پیغام عام نے انسانوں کو مادیات سے منقطع کرکے روحانیات کے راستہ پر نہیں ڈالا بلکہ اس مادی کائنات کے عناصر وقوی سے استفادہ کو قائم رکھتے ہوئے تکمیل روحانیات کا سبق دیا ہے جس سے یہ سارے مادی منافع قرآنی مقاصد کیلئے وسائل وذرائع کی حیثیت میں آجاتے ہیں اور اس طرح وہ قرآنی موضوع کے وسائل میں شامل ہو کر اس سے کلیتہً بے تعلق نہیں رہ جاتے۔ اس صورت میں اگر قرآنی موضوع ومقصد کے ضمن میں محض ایک وسیلہ کی حیثیت سے ان مادی اور تکوینی امور کی طرف بھی نظم قرآنی سے کچھ اشارے نکل آئیں اور ان کے بنیادی اصول کسی حد تک قرآنی تعبیرات سے مستنبط ہو جائیں تو اس سے نہ قرآن کے رفیع المنزلت موضوع پر کوئی برا اثر پڑتا ہے اور نہ خود قرآن کے ہدایت نامہ ہونے پر کوئی حرف آسکتا ہے، بلکہ مقاصد کے ضمن میں وسائل کی طرف لطیف اشارے اس کی جامعیت کے حق میں تو سونے پر سہاگہ کا مصداق ہوں گے، اور اس کے مقاصد ووسائل کے باہمی فرق مراتب پر ایک حکیمانہ شہادۃ ثابت ہونگے جو اس کی معجزانہ فصاحت کلام اور بلاغت بیان کی ایک بے نظیر مثال ہوگی۔

علماء سلف اور عرفاء ملت نے استنباط کی ایسی مثالوں کا نقش قدم چھوڑا ہے، جس سے یہ نوع امت کیلئے کوئی محدث اور انوکھی نوع نہیں رہتی، مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی نے قرآن کے حروف مقطعات سے اقوام عالم کے عروج وزوال کی تاریخیں بقید وقت اخذ کرکے ان کے قواعد استخراج تک وضع کر دیئے ہیں گو آج ان کا جاننے پہچاننے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ ابن خلکان کی نقل کے مطابق سلطان صلاح الدین زنگی کے حلب اور قلعہ شہبا ختم کرلینے پر وقت کے ایک مبصر عالم قاضی محی الدین نے ایک قصیدہ بائیہ لکھا جس میں حلب وشہبار کی فتح کو جو ماہ صفر میں ہوئی تھی فتح قدس کا پیش خیمہ بتلایا اور اس کے وقت تک کی تعیین کے ساتھ قصیدہ میں پیشین گوئی کردی۔ کہا

وَفَتْحُكَ الْقِلْعَةَ الشَّهْبَاءَ فِي صَفَرٍ ... مُبَشِّرٌ بِفُتُوحِ الْقُدْسِ فِي رَجَبٍ

یہ آپکا قلعہ شہبار کو ماہ صفر میں فتح کرلینا ... بشارت دے رہا ہے کہ قدس شریف بھی رجب میں فتح ہو جائیگا

قاضی صاحب سے اس خبر اور تعیین ماہ کی دلیل پوچھی گئی تو فرمایا کہ میں نے یہ ساختہ آیۃ کریمہ۔ الم غُلبت الروم فی ادنی الارض کی تفسیر سے لیا ہے جو تفسیر ابن برجان نے کی ہے جس کی وفات اس واقعہ سے بہت پہلے ہو چکی تھی، وجہ استدلال کی تفصیل ان کی تفسیر میں موجود ہے۔ ابن کمال نے سلطان سلیم کے ہاتھ پر فتح مصر کی پیشگوئی کی اور آیۃ کریمہ ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثہا عبادی الصّٰلحون سے اسے اخذ کرکے دکھلا دیا۔ جیسا کہ تفسیر روح المعانی کے مقدمہ میں ان واقعات کا تذکرہ موجود ہے، ظاہر ہے کہ ان حضرات نے قرآن کو کوئی تاریخی یا افسانوی کتاب سمجھ کر یہ اقتباسات (بقیہ آیندہ)

الجھے ہوئے تھے۔ گو اسی کے ساتھ چند مسائل فلسفہ مابعد الطبیعیات اور مابعد الطبیعیات کی ایک خاص شاخ فن امور عامہ کے بھی کتابی معقولات کے لپیٹ میں معقولیوں کے حلقہائے درس میں زیر

(حاشیہ سلسلہ صفحہ ۳۷۹)

نہیں لئے بلکہ اس کے موضوع ہدایت کو بجائے خود محفوظ رکھ کر لطائف کے طرز پر اس کے بلیغ ترین نظم سے استنباط کئے جو نہ قواعد شرعیہ کے خلاف تھے نہ قواعد عربیہ کے، اس پر اگر یہ استنباطات مذکورہ کے ماہر و مبصر یہ کہدیں کہ قرآن کے نظم میں اقوام عالم کے عروج و زوال اور فتح و شکست کی تاریخ کے وقائع بھی موجود ہیں جو وجدان صحیحہ کے تحت اس سے اخذ کئے جا سکتے ہیں تو انہیں اس بصیرت کے بعد اس دعویٰ سے کون روک سکتا ہے؟ اس سے جہاں قرآنی نظم کی اعجازی بلاغت نمایاں ہوتی ہے وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ایسے استنباط و اقتباسات اس کے بغیر ممکن بھی نہ تھے کہ قرآن کے اعجازی نظم میں ان کے لئے کچھ گنجائش اور مظان بھی موجود ہوں جن سے یہ اخذ و استنباط ممکن ہو گو وہ ضمنی ہوں اور مقصود نہ ہوں، جیسے خود قرآن نے فن شعر و شاعری کی ہجو کرتے ہوئے اسے پیغمبر سے دور ہی دور بتلایا ہے، مگر اس پر بھی نظم قرآنی میں متعدد آیتیں شعری بحروں پر منطبق ہوتی ہیں جو درحقیقت فن عروض و قافیہ کا اساسی موضوع ہے۔ اس پر ایک کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ قرآنی نظم فن عروض و قافیہ کی اساس و مبنا سے خالی نہیں ہے گو تفصیلی اشکال کا بیان اس کی شان سے فروتر ہے جس سے وہ بالاتر ہے۔ حضرات صحابہ سے تکوینی امور کے بارہ میں سوالات کئے جاتے۔ اور قرآن سے جواب مانگا جاتا اور وہ یہ جواب نہیں دیتے تھے کہ قرآن کا موضوع ہدایت ہے اس میں ایسے امور کی گنجائش نہیں بلکہ لطائف کے طور پر قرآن ہی سے اخذ کر کے تکوینیات کے سلسلہ کے جوابات دیتے تھے ہرقل (قیصر روم) نے امیر معاویہؓ کے پاس ایک مکتوب بھیجا جس میں تکوین کے سلسلہ کے کئی پیچیدہ سوالات کا جواب قرآن سے مانگا گیا تھا، مثلاً وہ چار چیزیں کیا ہیں جو ذی روح ہیں مگر نہ باپ کی پیٹھ میں رہیں نہ ماں کے پیٹ میں؟ یا وہ کونسی قبر ہے جو صاحب قبر سمیت چلتی پھرتی رہی؟ یا وہ کونسا قطعۂ زمین ہے جس پر صرف ایک ہی دفعہ سورج نے طلوع کیا ہو؟ یا شیٔ اور لاشیٔ کیا ہے؟ یا وہ کونسا درخت ہے جو بلا پانی کے اگا اور بڑھ گیا وغیرہ وغیرہ۔ امیر معاویہؓ نے یہ سوالات ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجدیئے جنھوں نے قرآن سے انکے جوابات استخراج کر کے قیصر روم کے پاس بھجوا دیئے۔ پس اس قسم کے تکوینی حقائق سامنے رکھکر نیز دیکھتے ہوئے کہ قرآن نے تکوین اور مادیات کے عجائبات پر بھی گہری روشنی ڈالی ہے اس نے ارض و سماء کی تخلیق پہاڑوں اور دریاؤں کی خلقت، چاند سورج اور ثوابت و سیارات کے حرکت و سکون لیل و نہار کے لوٹ پھیر، ہواؤں اور بادلوں کی آمد و رفت، عناصر و افلاک کے آثار و کیفیات، جماد و نبات۔ حیوان و انسان اور جن و ملک کے افعال و خواص اور عالم انسانی کے اندرونی و بیرونی عوارض و احوال، غرض انفس و آفاق کے تکوینی عجائبات پر روشنی ڈال کر بنی آدم کو تفکر و تدبر کا حکم دیا اور ان مصنوعات الٰہیہ سے صانع حقیقی کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر ملاحظہ کیجئے)

بحث آجاتے تھے، بس زیادہ سے زیادہ مطلب آپ کے اس دعوی کا یہی ہو سکتا ہے کہ چند فنی مسائل جو معقولیوں کا سرمایہ امتیاز ہیں ان کو بھی قرآن سے نفیاً یا اثباتاً نکال کر دکھلایا جاسکتا ہے

(حاشیہ بسلسلہ صفحہ ۳۸۰)

ذات و صفات شئون و افعال اور کمالات و تصرفات کا تعارف کرایا ہے، اگر قرآن کے انہی بلیغ بیانات کی اعجازی تعبیرات اور انداز بیان کے جلی و خفی گوشوں سے کسی کا ذہن صافی ان مادیات اور فلکیات کے تکوینی اصول کی طرف منتقل ہو جائے اور وہ انہیں انہی آیات کی گہرائیوں سے اخذ کر کے کہہ ڈالے کہ قرآن میں فنون مادیہ کے اساسی اصول و مہات بھی موجود ہیں جو نفیاً یا اثباتاً قرآن سے ثابت کئے جاسکتے ہیں تو ضرورت نہیں ہے کہ اس کے قول کو کسی تاویل کیساتھ قبول کیا جائے جبکہ نظم قرآنی کے تکوینی حصہ میں اس کی گنجائشیں مل سکتی ہیں۔

نیز حدیث نبوی جہاں تشریع کے مسائل کی تفصیلات پر مشتمل ہے وہیں کتنے ہی ایسے تکوینی امور اور مادی حقائق کا ذخیرہ بھی اس میں کافی بھرا ہوا ہے جس سے کسی عقیدہ یا عبرت کا تعلق ہو ظاہر ہے کہ اگر حدیث نبوی قرآن کا بیان اور اس کی شرح ہے (اور بلاشبہ ہے) تو اس کا منطقی نتیجہ اس کے سوا کیا نکل سکتا ہے کہ حدیث کی یہ تمام تکوینی تشریحات قرآن کے مسائل ہیں اور ان مسائل کے ماخذ قرآنی نظم میں قطعاً موجود ہیں۔ بلکہ اس سے یہ اصول نکل آتا ہے کہ قرآن کی شرح و بیان کے سلسلہ میں استخراجی مسائل اسی کے مسائل اور اسی کے اعجازی متن کا بیان کہلائیں گے جن کو اس کی تعبیرات سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ورنہ شرعیات کے بھی تو بہت سے مسائل استنباطی ہیں کیا محض استنباطی ہونے کی وجہ سے ان کو مخالف قرآن باور کر لیا جائے گا؟ ہرگز نہیں چنانچہ تشریعیات کے سلسلہ میں بھی تمام امہات مسائل سارے کے سارے قرآن کی عبارت میں مذکور نہیں جو باتفاق علماء اجزاء و اعضاء دین اور مقاصد شریعت ہیں انہیں بھی تو فقہاء امت نے اپنی فراست و اجتہاد کے ذریعہ ہی قرآن کی عبارت و دلالت اور اشارت و اقتضاء سے اخذ کیا ہے خواہ اس میں فقہی مسائل ہوں یا فتاوائے صحابہ اور حدیثی استنباطات جس سے قرآن ان کے حق میں ماخذ ثابت ہوتا ہے، اگر قرآن میں ان کے مظان موجود نہ ہوتے تو محض اجتہاد کی کیا پیش چل سکتی تھی۔ اور کس طرح انہیں محض بے قرینہ اور بے دلیل استنباط سے قرآن کے سر تھوپ دیا جاتا اور اگر ایسا کیا بھی جاتا تو امت اسے قبول ہی کب کرتی۔؟ اس لئے ناگزیر طریقہ پر ان استخراجی مسائل کو بالواسطہ قرآنی ہی مسائل کہا جائے گا نہ کہ منافی قرآن ورنہ دین کا ایک عظیم حصہ بے بنیاد ہو جائے گا۔ اس لئے علماء امت کے استخراج کو جبکہ وہ قواعد شرعیہ و عربیہ کے خلاف نہ ہو معتبر مان کر بالواسطہ قرآن ہی سے مربوط کیا جائیگا خواہ وہ تشریعی مسائل ہوں یا تکوینی۔ چنانچہ اسی فراست اخذ و استنباط کے جوش میں بعض اوقات فقہاء ملت و حکماء امت نے یہاں تک دعوے کر دیئے ہیں کہ وہ فقہ کا ہر ہر جزوی مسئلہ قرآن سے ثابت کر سکتے ہیں۔ امام شافعی نے ایک دن حرم مکہ میں بیت اللہ کی دیوار سے کمر لگائے ہوئے جوش علم میں فرمایا کہ آج جو شخص مجھ سے کوئی مسئلہ پوچھے گا میں اسے قرآن سے جواب دوں گا۔ کسی نے کہا کہ حرم میں قتل زنبور کا مسئلہ (جو مذہب شافعی ہے) قرآن میں کہاں ہے؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ فرمائیے)

اور سب سے بڑا اشارہ آپ کے اس دعویٰ میں کم از کم مجھے یہی ملا کہ جو ذہنی و فکری فائدہ معقولاتی کتابوں کے ردّ و قدح سوال و جواب نیز ان کی عبارتی ژولیدگیوں کے سلجھانے سے حاصل ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے

(حاشیہ بسلسلہ صفحہ ۳۸۱)

تو اسی وقت انھوں نے اس مسئلہ کا ربط قرآن سے واضح کر دیا جس کی تفصیل اپنے موقعہ پر موجود ہے۔ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسی بڑھیا نے کہا کہ کیا آپ واشمہ و مستوشمہ (بدن کو گودنے اور گدوانے والی) پر لعنت کرتے ہیں یہ کتاب اللہ میں کہاں ہے؟ فرمایا کاش تو قرآن پڑھتی ہوتی تو تجھے یہ مسئلہ قرآن میں مل جاتا اور اس کے بعد اس مسئلہ کا ربط قرآن سے دکھلا دیا۔ یا جیسا کہ صاحب سوانح حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے جمعہ فی القریٰ کی تمام فقہی شرائط کو قرآنی نظم سے استنباط کر کے دکھلایا ہے جو منکرین فقہ کے لئے فقہ کے قرآن سے ماخوذ ہونے کی ایک اعلیٰ ترین مثال اور دلیل ہے۔ حتیٰ کہ اس قسم کے استنباطی مسائل کو قرآن کی طرف رجوع کرنے اور قرآن کو ان کا ماخذ بتلانے کے لئے مستقل اصول اور مختلف طریقے علماء امت نے ذکر کئے ہیں جن سے ایسے اخذ کردہ مسائل کا رابطہ قرآن سے واضح کیا جاتا ہے۔ جو نہ صرف علماء امت کے ہمہ گیر فکر و بصیرۃ ہی کا بے مثال نمونہ ہے بلکہ قرآن کی محیر العقول جامعیت اور ہمہ گیری کا بھی اعلیٰ ترین شاہد عدل ہے۔

پس اگر اسی طرح قرآن حکیم کے اعجازی نظم میں ضمنی طور پر تکوینیات کیلئے بھی لطیف اشارے اور مضبوط ماخذ موجود ہوں اور مفکر علماء عربیت و شریعت کے قواعد میں محدود ہو کر ان مسائل کو اس سے اخذ و استنباط کر لیں تو اس میں قرآن جیسے سرچشمۂ سخاوت کا کیا نقصان ہے؟ بلکہ اس سے جہاں اس کی ہمہ گیری اور معجزانہ بلاغۃ بیانی نمایاں ہوگی وہیں اس سے مستفید ہونے والے پیرؤوں کی بالغ نظری اور دقت فہم و فراست بھی واشگاف ہو جائے گی جو بالآخر اسی کا اعجاز کہلائے گی۔ اس لئے تشریع کی طرح تکوین کے استخراجی مسائل بھی قرآنی ہی مسائل کہے جائیں گے جو اس کے موضوع کے خلاف نہ ہوں گے جبکہ دونوں قسم کے مسائل (تکوینیات اور تشریعیات) میں مقصد و وسیلہ کا فرق قائم رہیگا جو استنباط میں حارج نہ ہوگا۔ بہر حال مصنف دام مجدہٗ نے مادی و ریاضی فنون کی جزئیات اور فنی تفصیلات کو قرآن کے موضوع کے خلاف ٹھہرا کر قرآن کے حق میں ان کے ماخذ ہونے کا انکار کیا ہے جس کا عام مفکرین اثبات نہیں کرتے لیکن مادیات کے بنیادی نقطوں اور اصول و مبانی کے قرآن سے ماخوذ ہو سکنے سے کوئی انکار نہیں کیا جس کا بہت سے مفکرین امۃ اثبات کر رہے ہیں۔ پس مصنف دام مجدہٗ نے قرآن سے ان تکوینی امور کے استنباط کی مطلقاً نفی نہیں کی بلکہ نفی خاص کی ہے جو فنی تفاصیل و جزئیات کی حد تک ہے۔ پس جو حضرات اس اخذ و استنباط کو مانتے ہیں وہ اجمال و اصول کا استنباط ہے اور مصنف ممدوح جس استنباط کا انکار کر رہے ہیں وہ فنی تفصیلات و جزئیات کا استنباط ہے اس لئے ماننے والے جسے مان رہے ہیں نہ ماننے والے اسکی نفی نہیں کرتے اور نہ ماننے والے جسے رد کر رہے ہیں ماننے والے اسے ثابت نہیں کرتے اس لئے سلف و خلف میں کوئی تعارض باقی نہیں رہا جو متن کی بعض موہم عبارات سے پیدا ہوتا تھا۔ (محمد طیب غفرلہٗ)

اس فائدے کو بھی قرآنی آیتوں میں غور و فکر کرنے سے چاہا جائے تو حاصل کیا جا سکتا ہے، اب جو کچھ بھی خیال کیا جائے، اپنے ان ہی احساسات کہئے، یا وسوسوں کے زیر اثر اس طول بیانی کی مجھے ضرورت محسوس ہوئی، ورنہ کہنا تو صرف یہ تھا کہ "دھبہ" کے نام سے جس اثر کو علم کے تعلق کی بنیاد پر اپنی طرف سیدنا الامام الکبیر منسوب کرتے تھے اس "دھبے" یا "داغ" کی اضطراری نمائش اور غیر اختیاری ظہور ساری زندگی میں کبھی اگر ہوا ہی ہے تو وہ بھی چند گنے چنے مواقع ہیں، محرک بھی اس کی عموماً وہی دینی و علمی غیرت بن جاتی تھی، جسے آپ شاید دبا نہیں سکتے تھے۔ رامپور کی اس تاریخی مجلس میں بھی زبان مبارک پر کچھ الفاظ اگر جاری ہوئے تو آپ دیکھ چکے ہیں، کہ نکلنے کی حد تک تو وہ فقرے بہر حال نکل ہی پڑے لیکن معاً اسی کے ساتھ "میں کچھ نہیں ہوں سو اس بار کو جو ان الفاظ سے قدرۃً آپ کے قلب نازک پر پڑ گیا تھا" ہلکا کرنا چاہتے تھے، اور اختیار کا دامن جس جذبہ کی بدولت ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، اسی کی طرف ان الفاظ میں چاہے توجیہ کہئے یا معذرت پیش فرما رہے تھے کہ "مگر میں نے جن کی جوتیاں سیدھی کی ہیں وہ سب کچھ تھے"

مراد آپ کی خانوادہ ولی اللّٰہی کے علماء سے تھی جن سے آپ نے تعلیم پائی تھی،

(اور احقر کے علم کے مطابق جو بزرگوں سے سنا ہے اشارہ اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی طرف تھا، جن کی تربیت کی بدولت علم لدنی کا یہ ذخیرہ انھیں ملا تھا اور اسی بنا پر حضرت حاجی صاحب انھیں اپنی لسان سے تعبیر فرماتے تھے اور تشبیہ دیا کرتے تھے کہ جیسے شمس تبریز کو عارف رومی زبان بنا کر دیئے گئے تھے ایسے ہی مجھے مولانا محمد قاسم زبان بنا کر دیئے گئے ہیں) (محمد طیب غفرلہٗ)

عرض کر چکا ہوں کہ آپ کے استاذ مولانا مملوک العلی صاحب نے اقلیدس کا ترجمہ اردو میں جو کیا تھا اس ترجمہ پر مولانا عبد الحق صاحب کی طرف سے مشہور کیا گیا تھا کہ رکیک الفاظ میں تنقید کی گئی ہے، اگر یہ واقعہ ہوا بھی تھا، تو اس کی حیثیت سمجھنا چاہئے کہ قریبی محرک کی تھی، ورنہ مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا فضل حق خیر آبادی (جو مولانا عبد الحق خیر آبادی کے والد ماجد تھے) ان

دونوں بزرگوں میں باوجود ہمدرس ہونے کے مسئلہ امتناع نظیر پر علمی زور آزمائیوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور آخر میں بات بہت دور تک پہنچ گئی، اسی کے بعد ولی اللہی خاندان کے دینی علماء اور خیرآبادی کے معقولاتی مولویوں کے درمیان اختلاف کی خلیج بہت زیادہ وسیع ہوگئی، تقریر و تحریر میں علمی حدود سے تجاوز کرکے سب و شتم پر لوگ اتر آئے۔

مسلمانوں کا قومی مزاج نقطہ اعتدال سے منحرف ہوتے ہوئے بدترین اخلاقی زبوں حالیوں کا شکار تھا، معمولی پھنسی بھی سرطان و خنازیر کی شکل اختیار کرلیتی تھی، ناگفتہ بہ قصے پیش آئے، خدا کا شکر ہے کہ اب ان کے آثار تقریبًا مٹ چکے ہیں، اس خوابیدہ فتنہ کا جگانا میرے خیال میں خود ایک فتنہ ہوگا، اسی لئے خاکسار نے شاید مقدمہ میں بھی ان قصوں کو جگہ نہیں دی ہے، اور یہاں بھی ان اجمالی اشاروں کے سوا تفصیل میں فائدے سے زیادہ مضرت ہی کا احتمال ہے، حالانکہ رامپور میں اپنے افتاد طبع کے برخلاف حسب غیر معمولی برہمی، جلال و جوش کا ظہور سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ہوا صحیح طور پر اس کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو ولی اللہی اور خیرآبادی ہندوستان کے ان دونوں تعلیمی و تدریسی خانوادے کے حریفانہ تعلقات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں[1]!

[1] جیسا کہ میں نے عرض کیا فتنہ کی ابتدا مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا فضل حق خیرآبادی کی نوک جھونک سے ہوئی، مولانا فضل حق کا دعویٰ تھا کہ رسول اللہ کو پیدا کرنے کے بعد اب رسول اللہ کی نظیر یعنی جن صفات سے آپ موصوف تھے، ان ہی صفات رکھنے والی دوسری ہستی کو خدا پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، اسکی قدرت ہی سے یہ بات خارج ہوگئی ہے، مولانا شہید فرماتے تھے کہ رسول اللہ جیسی ہستی یہ تو صحیح ہے نہ پہلے پیدا ہوئی اور نہ آئندہ کبھی پیدا ہوگی لیکن آپ کی نظیر یعنی آپ کی جیسی ہستی کے پیدا کرنے پر خدا العیاذ باللہ، قادر بھی نہ رہا یہ خدا کی ذات کے ساتھ بڑی جرأت ہے، منطقی زور کے زور سے چونکہ سب کچھ ثابت کیا جا سکتا ہے، مولنا شہید کی اس سیدھی سادی بات کو مولنا فضل حق صاحب نے اپنی منطقی زور آزمائیوں کی جولانگاہ بنالیا۔ دونوں طرف سے موٹی موٹی کتابیں شائع ہوئیں، لیکن ٹھیک ان ہی دنوں میں جب دلی مولویانہ پیتروں کی دنگل بنی ہوئی تھی، یہ بھی دیکھا گیا کہ مولنا اسمٰعیل دلّی سے نکلے اور پنجاب کے مسلمانوں کو ظلم و ستم کے پنجوں سے نکالنے کی کوششوں میں شہید ہونے کا ایمانی مقام بالاکوٹ کے پہاڑ کے نیچے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے، اور اسی کے بعد جب غدر کے نام سے ہندوستان میں ہنگامہ برپا ہوا تو دیکھا گیا کہ قلم کو توڑ کر کاغذ پھاڑ کر، مولنا فضل حق فوجی کمان ہندوستان کے ان باشندوں کی اپنے

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

خلاصہ یہ ہے کہ محرکات خواہ کچھ ہی ہوں لیکن ایک تو وہی رامپور والی مجلس کے قصے ہیں، اور دو ایک جگہ خانگی مجلسوں میں جہاں تک میری تلاش و جستجو کا تعلق ہے، علم کے اس غریب "دھبے" کو بھی نمایاں ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا، اور ساری عمر جس جد و جہد، کد و کاوش میں گذری، اس کا اندازہ آپ کو ان بکھرے ہوئے واقعات و سوانح سے ہو سکتا ہے، جو ادھر اُدھر مختلف بیانوں کے ذیل میں بحمد اللہ محفوظ رہ گئے ہیں، سب کا استیعاب تو مشکل ہے لیکن نتیجے تک پہونچنے کے لئے شاید اتنی چیزیں بھی کافی ہو سکتی ہیں جو اب آپ کے سامنے رکھی جاتی ہیں، اس سلسلہ میں پہلی بات تو وہی ہے جس کا عموماً لوگوں نے تذکرہ کیا ہے، میں اپنے مصنف امام کی کتاب سے اسے نقل کرتا ہوں، انھوں نے سیدنا الامام الکبیر کی خصوصی عادات، والتزامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"مسئلہ کبھی نہ بتلاتے، حوالہ کسی پر فرماتے" ص۱۳

"کبھی" کے لفظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے، کہ آپ کی یہ دوامی عادت تھی، حضرت حکیم الامت کے

بقیہ حاشیہ ص۳۸۳ ہاتھوں میں لئے ہوئے ہیں جو باہر سے آئے ہوئے انگریزوں کی حکومت کا جوا اپنی گردن سے اتار لینے پر تل گئے تھے، اس مہم کی ناکامی کے بعد دوسروں کے ساتھ مولانا فضل حق بھی گرفتار ہوئے مقدمہ چلا، تو اترکیشا بیان کیا جاتا ہے کہ بغاوت کا جو جرم ان پر عائد کیا گیا تھا، اگر اس جرم کا انکار کر دیتے، تو رہائی مل جاتی، لیکن جو واقعہ تھا، اسی کو بیان کرتے رہے۔ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی، انڈمان جلا وطن کر دیئے گئے، وہیں وفات بھی ہوئی کہتے ہیں کہ قرآن مجید بھی انڈمان ہی میں زبانی یاد کیا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے میں نے اجمالاً اشارہ بھی کیا ہے کہ حدیث کی تعلیم مولانا فضل حق نے مولانا اسمٰعیل کے ساتھ ایک ہی حلقہ میں شاہ ولی اللہ کے منجھلے صاحبزادے مترجم قرآن مولانا شاہ عبد القادر صاحب سے پائی تھی جو مولانا اسمٰعیل کے حقیقی چچا تھے، خیرآباد کے تدریسی سلسلے سے تعلق رکھنے والوں سے تو نہیں لیکن دیوبندی حلقہ کے علماء میں اس قسم کے متعدد قصے منقول ہیں کہ جب مولانا فضل حق کو خبر ملی کہ مولانا اسمٰعیل شہید ہو گئے تو جواب میں ان کے جو کتاب لکھ رہے تھے اسی وقت اس کا لکھنا بند کر دیا، حکیم الامت تھانوی بھی اس کے راویوں میں ہیں، اسی طرح کہتے ہیں کہ ایک شخص مولانا فضل حق کے پاس اس نیت سے پہنچا کر چھیڑ کر مولانا شہید کو کچھ برا بھلا ان سے کہلواؤں مولانا فضل حق کو کسی طرح اس کا پتہ چل گیا سخت غضب ناک ہوئے اور اسی وقت گھر سے نکلوا دیا۔ بہرحال ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علی سرر متقابلین کی آیت کے صادق ہونے کی صورت ہوئی، کچھ ایسے موقعے بھائیوں میں بھی پیش آجاتے ہیں۔ ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رؤف رحیم ۱۲

ملفوظات میں بھی ہے کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب فتویٰ نہیں دیتے تھے" (الہادی ربیع الثانی ۵۰ھ)

لیکن مطلب اس کا بظاہر یہی ہے کہ عام عادت حضرت والا کی یہی تھی، اور زیادہ تر تعلق اس کا ان سوالات سے معلوم ہوتا ہے جو زبانی لوگ حوادث یومیہ کے متعلق پوچھا کرتے ہیں، ورنہ تحریراً اگرچہ وہ بھی بطور ندرت زیادہ تر کسی اہم اصولی سوال، یا جس میں اندیشہ ہوتا کہ مسلمانوں کو لوگ فتنہ میں مبتلا کر دیں گے اور آپ کی تحریر اس فتنہ کے دبانے میں مدو معاون ثابت ہوگی، اس قسم کے سوالوں کے متعلق آپ کی تحریریں موجود ہیں، اگرچہ ان تحریروں میں بھی جواب کے ساتھ ساتھ اس قسم کے فقرے بھی قلم مبارک سے نکلتے جاتے تھے مثلاً ایک مکتوب گرامی جس میں بعض اہم سوالوں کا جواب دیا گیا ہے، آخر میں بے ساختہ "مگر" کے ساتھ

"نہ قاضیم، نہ فقیہم، نہ مفتیم، نہ امام" (فیوض قاسمیہ)

کا مصرعہ بھی اسی کے ساتھ قلم پر آگیا ہے۔ اور اسی کے بعد یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ

"اگر دیگراں ہم صفیر شوند فبہا، ورنہ کالائے زبوں برلیش خاوند، ایں دفتر بے معنی را بر سر من زنند وہر چہ مناسب وقت دانند وموافق اشارات علماء ربانی کہ از اتباع قرآن و حدیث دور نیفگند اختیار فرمایند"

اور اس عادت کے خلاف بطور "ندرت" سوال کے جواب دینے کے بعد جو صورت حال پیش آئی ہے وہ اس مقصد کے لئے جس کے پیش نظر ان چیزوں کا میں تذکرہ کروں گا، بڑا اثر انگیز، اور عبرت خیز ہے اس قصے کے راوی حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ ہیں، فرماتے تھے کہ

مولانا محمد قاسم صاحب میرٹھ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے عشاء کے وقت ایک مسئلہ پوچھا"

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کوئی ایسے مولوی صاحب جو سوال کا جواب دے سکتے ہوں، وہاں موجود نہ ہوں گے اور سوال میں ٹالنے کی گنجائش نہ تھی، مجبوراً جیسا کہ حکیم الامت فرماتے ہیں،

"آپ نے (مولانا نانوتوی نے) اس کا (اس سوال کا) جواب دیا"

اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، وہی سننے کے قابل ہے، سوالوں کے جواب اور فتویٰ نہ دینے کی عادت سے وہ نتیجہ کہیں زیادہ قیمتی ہے، جو قدرت کی طرف سے اس واقعہ کے اتفاقاً پیش آجانے کی وجہ سے پیدا ہوا، حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ جواب تو آپ نے دیدیا۔ لیکن سائل جب چلا گیا، تو سیدنا الامام الکبیر کے

ایک شاگرد نے عرض کیا کہ مجھے یہ مسئلہ یوں یاد ہے .....؛

شاگرد نے استاذ کے سامنے اپنے علم کا اظہار کیا، استاذی اور شاگردی کے تعلقات کے نفسیات کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہی اندازہ کر سکتے ہیں، کہ شاگرد کی اس قسم کی جرأت استاذ میں کس کیفیت کو پیدا کرتی ہے، لیکن سنئے یہاں کیا اثر ہوا، حضرت تھانوی کا بیان ہے کہ

"آپ نے (مولانا نانوتوی نے) فرمایا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔"

اور کیا بات صرف اسی پر ختم ہوگئی، یا اس کے بعد صرف یہ ارادہ کر لیا گیا کہ پوچھنے والے تک کسی طرح مسئلہ کی صحیح صورت پہنچا دی جائے گی۔ حضرت تھانوی ہی راوی ہیں، شاگرد کے بیان کی توثیق کرنے کے بعد وہی کہتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"مستفتی (فتویٰ پوچھنے والے) کو تلاش کرنا شروع کیا"

عشاء کے وقت سوال پوچھا گیا تھا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد شاگرد نے اپنے علم کو گوش گذار کیا تھا، پوچھنے والے صاحب مسجد سے جا چکے تھے، رات کافی گذر چکی تھی، تلاش پر اصرار جب زیادہ بڑھا تو

"لوگوں نے عرض کیا کہ رات زیادہ ہوگئی ہے، اب آرام فرمائیے ہم صبح ہونے پر اس کو بتا دیں گے۔"

لیکن فہمائش عرض و معروض اس سلسلے میں جو کچھ کئے گئے سب بیکار ثابت ہوئے، اور بقول حضرت تھانوی

"آپ نے قبول نہ فرمایا"

پھر کیا ہوا؟ کیا اسی شاگرد یا کسی اور کو پوچھنے والے کے گھر بھیجا گیا' سنئے مولانا تھانوی خبر دیتے ہیں کہ بہ نفس نفیس خود سیدنا الامام الکبیر اٹھے' اور رات کی اسی تاریکی میں۔

"اس کے (پوچھنے والے کے) مکان پر تشریف لے گئے' گھر میں سے اس کو بلایا"

غریب پریشان ہو کر باہر نکل آیا کہ آخر کیا افتاد پیش آئی کہ اس بھیگی' سونی رات میں حضرت والا نے اس کے گھر تک قدم رنجہ فرمانے کی زحمت برداشت کی' مگر وہ بھی سن رہا تھا' آسمان سن رہا تھا زمین سن رہی تھی' کہ ہندوستان جس کے علم و فضل تقویٰ و طہارت' ذہن و ذکاوت کے چرچوں سے گونج رہا تھا' وہی اس غریب عامی مسلمان کے سامنے کھڑا ہو کر یہ کہہ رہا تھا کہ

"ہم نے اس وقت مسئلہ غلط بتلا دیا تھا' تمہارے آنے کے بعد ایک شخص نے صحیح مسئلہ ہم کو بتلایا' اور وہ اس طرح ہے"

حقیقت تو یہ ہے' کہ باہر کی اس غلطی سے جو قدرت ہی کی طرف سے صادر کرائی گئی تھی' اندر کی صحت کے متعلق جتنی صحیح اور سچی روشنی میسر آرہی ہے' شاید یہ بات صحیح مسئلہ بتانے کی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتی تھی'

بہر حال عام عادت والتزام پر اس قسم کے نادر استثنائی واقعہ کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا اور واقعہ وہی ہے' جو مصنف امام نے فرمایا ہے' کہ آپ فتویٰ نہیں دیتے تھے حضرت تھانوی اور ان کے سوا بھی دوسرے بزرگوں کی شہادتوں کے سوا ایک خط ہے جو "فیوض قاسمیہ" کے مجموعہ میں شریک ہے۔ خورجہ کے مشہور عالم و مصنف و طبیب مولانا نصر اللہ خاں مرحوم کے نام یہ خط ہے کہ انھوں نے یزید کے کفر و ایمان کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کی رائے دریافت کی تھی' اسی کے جوابی مکتوب میں یہ فرماتے ہوئے کہ

"میں حیران ہوں' نہ میں ایسا عالم' نہ ایسا محقق' مجھکو آپ نے کیوں اس کام کے لئے تجویز کیا"

آگے اپنے متعلق خود ہی یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

"مجھکو تو کبھی فتوای لکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا"

یہی نہیں کہ خود فتویٰ دینے سے پرہیز ہی فرماتے تھے، بلکہ مصنف امام کے ان الفاظ سے یعنی

"فتویٰ پر نام لکھنا اور مہر کرنا تو درکنار" ص۱۳

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کے دیئے ہوئے فتووں پر تصدیقی دستخط اور مہر ثبت کرنا، علماء کا جو عام دستور اور طریقہ ہے اس سے بھی احتراز فرماتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فتوے وافتاء سے پرہیز و گریز کی عادت حضرت والا کی عام مسلمانوں میں مشہور بھی تھی، اپنے ایک مکتوب میں خود ہی ارقام فرماتے ہیں کہ

"از فتویٰ و استفتاء احتراز من مشہور ست" (فیوض قاسمیہ ص۲۹)

اسی موقعہ پر جہاں اس شہرت کا ذکر آپ نے فرمایا، کبھی کبھی بعض اصولی یا فروعی مسائل کے متعلق اپنے پوچھنے والوں کو جواب جو دے دیا ہے، اس کی وجہ بھی ان الفاظ میں ظاہر کر دی گئی ہے کہ

"من بغرض دعاء ایں کار کردہ ام"

اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے ان ہی خطوط میں اپنے نیازمندوں کو بے جھجک اس قسم کی باتوں کے لکھنے کا جو عموماً عادی ہو، مثلاً بھوپال جو اس زمانہ میں ہندوستان کے مولویوں کی چند خاص امیدگاہوں میں ایک بڑی اہم امیدگاہ تھی، اسی ریاست کے وزیر اعظم مولوی جمال الدین مرحوم کے پوتے جن کا نام مولوی ابوالقاسم تھا، ان ہی کے ایک علمی سوال کا جواب دیتے ہوئے پہلے تو کتابوں سے اپنی بے تعلقی کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ

"آں مخدوم را خود معلوم ست ہیچو سپاہی کہ آلۂ ضرب بدست ندارد، و عالمے کہ کتابے در بغلش نبود، بکارے نیاید۔"

آگے ارقام فرماتے ہیں کہ

"خصوصاً کسے کہ از علم ہم جز نام بدست نیاوردہ"

اور اس میں تو غنیمت ہے کہ نام ہی کی حد تک سہی، لیکن علم کی طرف انتساب کو قبول تو فرمایا گیا ہے، حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ آج تقریباً ایک صدی سے ہندوستان میں علم دین کا چرچا جس کے دم قدم سے قائم ہے، وہی اپنے ایک عقیدتمند کو انتہائی بے تکلفی کے ساتھ سادہ الفاظ میں اطلاع دیتا ہے اپنے قلم سے تحریر کرتا ہے، یہ خط اردو میں ہے اسی میں فرماتے ہیں

آپ جانتے ہیں کہ میں خود ذی علم نہیں ہوں" (فیوض قاسمیہ ص[۶])

ان ہی خطوط میں ایک خط میر محمد صادق مرحوم کے نام فارسی زبان میں ہے اس میں میر صاحب کو مخاطب کر کے ارقام فرمایا گیا ہے کہ

" میدانی وہمہ می دانند نہ سفینہ بہ گنجینہ آوردہ ام ونہ مکتوبات سفینہ را درسینہ سپردہ" ص[۲۴]

اسی طرح اپنے ایک معاصر عالم یعنی وہی خورجہ والے مشہور عالم وطبیب مولنا نصر اللہ خاں کے نام جو مکتوب اردو زبان میں لکھا گیا ہے، اس میں بھی یہی اطلاع دی جاتی ہے کہ

" نہ میرے پاس اس کام (فتوی نویسی) کا سامان، نہ کتابیں، نہ متقدمین ومتاخرین کی بیاضیں" (فیوض ص[۳۱])

اس قسم کے اعترافات کا ایک ذخیرہ آپ کے مرقومات ومکتوبات میں پایا جاتا ہے۔ اندازہ کرنے کے لئے یہ مثالیں کافی ہیں، ایک طرف ان نمونوں کو رکھئے، اور ان کے مقابلہ میں سوچئے کہ خود تو اعتراف کی جرءت کون کر سکتا ہے، میں نے تو دیکھا ہے کہ دوسرے بھی کسی کے متعلق اگر اس کا محسوس ہوا کہ مولوی صاحب کے علم کی وقعت اس کے دل میں نہیں ہے تو اس غریب کے مردود وملعون ہونے کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے، خود بھی علم کے غرور میں بھرے ہوئے ہیں اور چاہتے بھی ہیں کہ انکے غرور یا فریب کا دوسرا بھی شکار رہے، جو ہتھکنڈے اس سلسلہ میں استعمال کرنے والے استعمال کرتے ہیں، بہ نسبت دوسروں کے خود استعمال کرنے والوں ہی کو اس کا زیادہ علم ہو سکتا ہے، زبردستی دوسروں پر اپنے علم وفضل کا سکہ قائم کرنے کے لئے کرنے والے جو کچھ کرتے رہے ہیں، یا آج بھی کرتے ہیں، ان کے لئے یہ کتنے عبرت آموز اسباق ہیں، جو سیدنا الامام الکبیر اسی علمی گروہ کی عبرت پذیری کے لئے چھوڑ کر گئے ہیں، سننے میں آیا ہے اور

اہل علم ہی کے بعض مشہور ہستیوں کے متعلق یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ جس کتاب کا صرف نام سنا ہوا تھا، خود کتاب دیکھی بھی نہیں تھی، لیکن دوسروں پر علمی رعب قائم کرنے کے لئے جعلی عبارت بنا کر اسی کتاب کی طرف منسوب کر کر کے لوگوں کو وہی مولوی صاحب سنایا کرتے تھے، مگر جھوٹے علم کا یہ جھوٹا اثر تھا، اس کے مقابلہ میں علم صادق کے آثار کو ملاحظہ فرمائیے، کہ زبانی ہی نہیں، تحریروں میں بھی بار بار اس کو دہرایا جا رہا ہے کہ کتابوں کا ذخیرہ میرے پاس نہیں ہے، عوام کے سامنے بھی اس اقرار میں کسی قسم کی کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی، اور خواص کے آگے بھی اس کا اعتراف دل میں اس خیال کو آنے نہیں دیتا کہ اپنے معاصر مولوی پر اس اعتراف کا کیا اثر پڑے گا؟ اور کچھ قصہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا ہے، ان ہی خطوط جن میں بعض علمی سوالات کے جواب حضرت والا نے پوچھنے والوں کو دیئے ہیں، ان میں ایک خاص مکتوب جو حکیم ضیاء الدین صاحب مرحوم رامپوری کے نام ہے، اس میں ارقام فرمایا جاتا ہے کہ

"مصلحت دید من آن ست کہ جواب احقر را بخدمت مولنا رشید احمد صاحب فرستادہ از ملاحظہ شان گذرانند"۔

کچھ بھی ہو، مولنا گنگوہی سے حضرت والا کے تعلقات کی نوعیت جو کچھ بھی رہی ہو، تاہم آپ کے ایک رفیق درس، اور ہم چشم و ہم عصر عالم ہونے کی حیثیت بھی رکھتے تھے، اپنے دیئے ہوئے جواب کی توثیق کے لئے مکتوب الیہ کو اس کی ہدایت فرمائی کہ مولنا گنگوہی کو بھی میری تحریر دکھا دیجائے اور صرف "دکھا دی جائے" یہی نہیں آگے اسی مکتوب میں یہ بھی ہے کہ

"جواب و سوال دیگر از دست مبارک اوشان نویسانند روانہ کنند"

جس کا مطلب میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ بجائے اپنے جواب کے مشورہ یہ دیا گیا کہ مولنا گنگوہی جو جواب تحریر فرمائیں وہی مستفتی کے پاس روانہ کیا جائے[1]۔

[1] یہ وہی مکتوب ہے جس میں وزیر بھوپال مولوی جمال الدین صاحب کے پوتے مولوی ابوالقاسم کے سوالوں کے جوابات دیئے گئے ہیں، سوالات حکیم ضیاء الدین کے توسط سے حضرت والا تک پہونچے تھے، حکیم صاحب کے اصرار سے جوابات تو لکھ دیئے گئے لیکن اپنی مصلحت دید یہ بتائی گئی کہ بجائے میرے مولانا گنگوہی سے جواب لکھوا کر بھیجنا زیادہ مناسب ہوگا"[12]

اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تو خیر آپ کے رفیق درس وبیعت اور دوست تھے۔ مولانا محمد یعقوب
رحمۃ اللہ علیہ یعنی ہمارے مصنف امام حالانکہ حضرت والا کے شاگرد بھی ہیں، مولانا نصر اللہ خورجوی
والے مکتوب میں اپنی علمی بے سروسامانی وہیچمدانی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارقام فرمایا گیا ہے

"اس پر مولانا محمد یعقوب صاحب آج کل اپنے وطن کو گئے ہوئے ہیں، پھر ایسے
مسائل کا جواب لکھے تو کون لکھے" ص ۳۱

یعنی صحیح علمی جواب کے لئے بجائے اپنے یہ اقرار کیا گیا ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب ہی زیادہ
موزوں ومناسب ہیں، بلکہ اسی کے بعد آپ کے الفاظ

"ہاں! اپنی سمجھ اور خیال کی بات کہئے تو لکھ دوں"

بتایئے کہ اس کا حاصل بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ صحیح علمی جواب کے لئے تو اپنے شاگرد و مستفید
کو زیادہ موزوں قرار دیا جا رہا ہے۔ البتہ بدرجہ مجبوری چونکہ وہ اس وقت موجود نہ تھے۔ خود
جواب نویسی کی گویا جرأت یہ باور کراتے ہوئے کی گئی کہ میرے یہ کچھ ذاتی خیالات ہیں۔ اور
اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ فتویٰ وافتاء سے پرہیز کی عام عادت کے برخلاف کبھی کبھی کچھ چیزیں
جو ارقام فرما دی گئی ہیں منجملہ دوسرے اسباب کے ایک سبب اس کا یہ بھی تھا کہ جب کوئی دوسرا
جواب دینے والا وقت پر میسر نہ آتا تب خود ہی قلم اٹھا لیتے، خصوصاً ایسے مسائل میں جن کے
جواب کی تاخیر میں کسی وقتی فتنہ کا اندیشہ ہوتا، اور "افتاء" یا فتویٰ نویسی کے متعلق تو کتابوں کا
عذر بھی حیلہ بن سکتا ہے، لیکن ہم تو دیکھتے ہیں کہ "امامت" جس کے لئے نہ شامی کے مطالعہ
کی ضرورت ہے اور نہ بحر الرائق اور عالمگیری کے ورق گردانیوں کی مشقت اٹھانی پڑتی ہے
بلکہ ہر نمازی جن سورتوں سے اپنی انفرادی نماز میں پڑھتا ہے ان ہی سورتوں سے نماز پڑھا بھی
سکتا ہے، عام مسلمانوں کی جماعت میں "مولوی" کا وجود استحقاق امامت کیلئے کافی سمجھا جاتا
ہے، عوام بھی یہی سمجھتے ہیں اور خود مولوی صاحبوں کا عام احساس بھی ہے کہ ان کا یہ قدرتی حق
ہے کسی وجہ سے ان کے اس "حق" سے لاپروائی کسی مسجد میں کبھی اختیار کی گئی ہے تو زبان کو نہ بھی

لیکن پیشانی کی شکنوں سے ناگواری کے آثار عموماً مترشح ہوتے ہوئے پائے گئے ہیں، لیکن جس کی بدولت ہندوستان کے طول وعرض میں بلا مبالغہ لاکھوں ائمہ پھیل گئے، خود اس کا حال اسی امامت کے متعلق بھی یہ تھا، مصنف امام کی شہادت ہے کہ

"اول امامت سے بھی گھبراتے تھے" [ص۳۱]

جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ دوسروں کو بہ فرما کر کہ امامت نہیں کرتا، دامن نہیں چھڑاتے تھے، بلکہ سیدنا الامام الکبیر کے مزاج شناسوں کا خیال بھی تھا کہ خود اپنے نزدیک بھی امامت کا مستحق اپنے آپ کو نہیں سمجھتے تھے، "گھبرانے" کا لفظ مصنف امام نے جو استعمال کیا ہے، میری سمجھ میں اس سے تو یہی بات آتی ہے، باقی دوسروں سے کیا فرمایا کرتے تھے، اس کے متعلق ایک دلچسپ ظریفانہ لطیفہ حکیم الامت تھانوی نقل فرمایا کرتے تھے، قصص الاکابر میں ہے کہ

"مولانا محمد قاسم فرمایا کرتے تھے کہ دعوت کا کھانا، اور جماعت کی نماز ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں اپنے اوپر کچھ بوجھ نہیں پڑتا۔"

فرماتے کہ

"دعوت کے کھانے کی کچھ فکر نہیں ہوتی کہ کہاں سے آیا ہے"

یہ تو پہلی چیز ہوئی، دوسری چیز اسی سلسلہ کی فرماتے کہ

"اسی طرح جماعت میں اللہ اکبر کہہ کر کھڑے ہوگئے، اب کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوگا سب بار امام کے ذمہ" [۱]

اور یہی میرا مطلب تھا معلوم ہوتا ہے کہ جب لوگ امام بننے پر زیادہ اصرار فرماتے تو اسی قسم کے لطیفوں میں آپ ٹال دیا کرتے تھے، اور اصلی وجہ وہی تھی جس کی طرف "گھبرانے" کے لفظ سے مصنف امام نے اشارہ فرمایا ہے۔

[۱] مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم فقیر کے جد امجد جن کو میں نے خود نہیں دیکھا تھا بہار کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے، عربی زبان میں چند کتابوں کے مصنف بھی تھے ان کے متعلق بھی سنا ہے کہ امامت سے گریز کرتے ہوئے عوام سے فرمایا کرتے کہ یہاں تسبیح کے تمام دانوں کے اندر ایک ہی تاگا پہنایا جاتا ہے لیکن تسبیح کے امام میں بجائے ایک کے دو تاگے ڈالے جاتے ہیں، بھلا اس دوہری مصیبت کو کون اپنے سر لے ۱۲

اسی ملفوظ کے آخر میں ہے کہ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ

"پھر تبسم کرکے (سیدنا الامام الکبیر نے) فرمایا کہ تیسری چیز بدشوق طالب علم کے لئے جماعت کا سبق ہے، کہ پڑھیں نہ، اور کتابیں ختم ہو جائیں" (قصص الہادی ماہ جمادی الاولی ۵۱ھ)

بظاہر ظرافت کے موقعہ کا ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے، لیکن تعلیم کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کے جو اساسی نظریات و کلیات تھے، میرے نزدیک ان میں ایک اہم اصولی بات یہ بھی ہے۔ جماعتی یا مدرسی تعلیم جس کا رواج زیادہ تر پچھلے دنوں سے زیادہ ترقی پذیر ہوا ہے، اور پرانے اساتذہ انفرادی درس جو دیا کرتے تھے، قدیم طریقہ تعلیم پر یہی رنگ زیادہ غالب تھا، الغرض تعلیم کے ان دو مختلف النوعیت طریقوں کے متعلق حضرت والا کے جو خاص خیالات ہیں ان کا تفصیلی ذکر جہاں آئے گا، اسی موقعہ پر اس اجمال کی تفصیل بھی انشاء اللہ کی جائے گی۔

یہاں تو صرف یہ عرض کر رہا تھا کہ "امامت" کے متعلق خود ذاتی احساس حضرت والا کا کیا تھا اور عذر کرتے ہوئے دوسروں کو کیا فرمایا کرتے تھے۔

لیکن جیسے باوجود پرہیز و گریز کے کبھی کبھی افتاء یا سوالوں کے جواب دینے پر آپ کو مجبور ہونا پڑتا تھا، مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ "امامت" کے متعلق بھی آپ کے انکار کی شدت آخر زمانہ میں کچھ نرمی سے بدل گئی تھی، خود مذکورہ بالا شہادت میں "اول" کا لفظ بھی یہی بتا رہا ہے، نیز آگے وہی یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ

"آخر کو اتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھا دیتے تھے" ص ۲۱

وطن سے مراد نانوتہ ہے، یہ نانوتہ کی خوش قسمتی ہے جو حضرت والا کے بزرگوں کا مسکن تھا، رشتے کے ان بزرگوں کی بات کو آخر کب تک ٹال سکتے تھے۔ سپر اندازی پر معلوم ہوتا ہے کہ نانوتہ کی اسی خصوصیت نے غالباً مجبور کر دیا تھا، واللہ اعلم بالصواب نانوتہ سے باہر بھی اس التزام سے ہٹنے کی کوئی صورت کبھی پیش آئی یا نہیں۔ اس وقت تک تلاش کے باوجود کوئی شہادت مجھے نہیں مل سکی ہے، یعنی نانوتہ کے سوا کسی اور جگہ بھی اپنی امامت میں نماز پڑھنے کا موقعہ لوگوں کو دیا گیا یا نہیں۔

اس کا پتہ نہیں چلا ہے، مصنف امام کے کلام کا نحوی تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ غالباً نانوتہ ہی کی حد تک یہ بات محدود رہی۔[1]

[1] جہاں تک امامت صلوٰۃ کے التزام کا تعلق ہے وہ بلا شبہ چند دن کے لئے نانوتہ تک محدود ہے لیکن احیاناً واتفاقاً کہیں کہیں گھر کر اور مجبور ہو کر امامت کرنے کے واقعات نانوتہ کے علاوہ دوسرے مقامات میں بھی پیش آئے ہیں منجملہ ان کے ایک واقعہ یہ ہے جو مجھ سے حاجی امیر شاہ خاں صاحب مرحوم نے بیان فرمایا کہ مسجد چھتہ (دیوبند) میں امامت کے فرائض حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب انجام دیا کرتے تھے اتفاقاً ایک روز مولانا کو فجر کی نماز میں آنے میں دیر ہوئی اور مقررہ وقت سے کچھ زیادہ وقت گذر گیا، تو سب کے اصرار پر حضرت والا نے امامت کرائی اور پہلی رکعت میں سورۂ حاقہ پڑھی جس میں قیامت کے ہولناک حالات کا ذکر ہے۔ امیر شاہ خاں صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ جب تک حضرت قراءۃ کرتے رہے ہر شخص کے سامنے یہ عیاں تھا کہ میدان محشر قائم ہے۔ حساب کتاب شروع ہے، نامۂ اعمال ہاتھوں میں دیئے جا رہے ہیں اور میدان قیامت برپا ہے گویا جو جو مضامین سورۂ حاقہ میں وارد ہوئے ہیں وہ سب کے سب عیاناً متمثل ہو کر سب کے سامنے تھے، امامت ہی کا دوسرا واقعہ جناب موصوف ہی سے یہ سنا کہ حضرت جیسے امتیازی صورتوں (امامت و افتاء وغیرہ) سے گھبراتے تھے ایسے ہی امراء سے بھی بہت کتراتے تھے اور کسی طرح کسی امیر کو ملاقات کا موقعہ نہیں آنے دیتے تھے، خورجہ کے ایک رئیس سو سے تمنا میں تھے کہ میرے گھر پر ایک دفعہ حضرت والا آ جائیں مگر وہ کامیاب نہ ہوتے۔ اتفاق سے جنگ روم و روس چھڑ گئی اور حضرت نے ترکوں کی اعانت کے لئے چندہ کی تحریک شروع کی جو اس زمانہ میں سلطانی چندہ کے نام سے معروف ہوئی۔ ان رئیس صاحب کے لئے یہ زریں موقعہ ہاتھ لگ گیا انھوں نے کہلایا کہ اگر حضرت والا ان کے گھر پر تشریف لا کر وعظ فرما دیں تو وہ سلطانی چندہ میں دس ہزار روپئے دیں گے۔ حضرت نے منظور فرما لیا اور ان کے یہاں وعظ فرمایا۔ انھوں نے حسب وعدہ دس ہزار روپیہ پیش کیا، ختم مجلس پر حضرت اٹھے تو مجمع بھی اٹھا اور لوگوں میں حضرت کی مہمانی کے بارہ میں کہا سنی اور رد و کد ہونے لگی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ حضرت کو میں اپنے گھر لیجا کر مہمان بناؤں، لوگ تو اس جھگڑے اور بحث میں سرگرداں تھے اور حضرت اسی ہجوم میں آہستہ سے نکلکر روانہ ہو گئے، مغرب کا وقت آ چکا تھا، اذان ہونے والی تھی، حضرت والا نہر کے کنارے ایک غیر معروف مسجد میں پہنچے۔ وہاں اتفاق سے امام مسجد موجود نہ تھا، لوگوں میں تشویش ہوئی کہ نماز کون پڑھائے، ہر ایک دوسرے پر ٹالتا تھا: چند ایک نے حضرت سے کہا کہ بھائی تم ہی نماز پڑھا دو، یہ لوگ حضرت کو پہچانتے نہ تھے، مگر حضرت عذر فرماتے رہے، جب کوئی بھی امامت کے لئے تیار نہ ہوا تو لوگوں نے حضرت کو یہ کہکر زبردستی امامت کے مصلے پر ڈھکیل دیا کہ بندہ خدا تو مسلمان تو ہے کیا تجھے دو چار سورتیں بھی قرآن شریف کی یاد نہیں جو امامت سے اتنا گھبرا رہا ہے۔ حضرت نے اب مجبور ہو کر امامت کرائی۔ مگر عجیب اتفاق یہ پیش آیا کہ پہلی رکعت میں تو قل اعوذ برب الناس پڑھ گئے اور دوسری میں قل اعوذ برب الفلق۔ ختم نماز پر اس مسجد کے ان پڑھ نمازیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں کہ یہ عجیب آدمی ہے جس نے قرآن ہی الٹا پڑھ دیا۔ حضرت نے فرمایا بھائی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

مولویت کے لوازم و آثار میں ایک وعظ گوئی کا پیشہ بھی ہے، جیسے افتاء و امامت کی توقع علوم دینی کے علماء سے لوگ کرتے ہیں، یا خود علماء ہی ان امور کا حقدار اپنے آپ کو سمجھتے ہیں، یہی حال وعظ و تلقین تذکیر و خطابت کا بھی ہے، اس میں شک نہیں کہ بہ نسبت افتاء اور امامت کے آخر زندگی میں تقریر و بیان سیدنا الامام الکبیر کی زندگی کی ایک خصوصیت بن گئی تھی، صوبجات متحدہ خصوصاً جو آبادیاں اس صوبہ کی روھیلکھنڈ میں مشہور و معروف ہیں، شاید ہی کوئی شہر بلکہ ممتاز قصبہ ایسا ہوگا جس کے باشندوں کو حضرت والا کی تقریر کے سننے کا موقعہ نہ ملا ہو، خصوصاً سہارنپور، میرٹھ، دیوبند، خورجہ، رامپور، شاہجہانپور، رڑکی وغیرہ میں سننے والوں کو خطابت و بیان کے جس ملکۂ فائقہ کے مسلسل تجربات ہوئے ان ہی کی بنیاد پر ارباب علم و بصیرت میں مشہور ہو گیا تھا کہ

"مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح القدس کی تقریر ہو رہی ہے"[۱]

لیکن خطابت و تقریر کے اس میدان میں خود اترے تھے، یا اتارنے والوں نے اصرار کر کے مسلمانوں کو حضرت والا کے بیانی کمالات سے مستفید ہونے کا موقعہ عطا کیا تھا؟ سب سے پہلی شہادت تو اس سلسلہ میں خود مصنف امام کی ہے کہ

(ص ۳۹۵ کا باقی حاشیہ ملاحظہ فرمائیے) میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ میں امامت کے لائق نہیں ہوں، لوگوں نے کہا کیوں کیا پتہ تھا کہ تو قرآن بھی سیدھا پڑھنا نہیں جانتا، حضرت نے اس پر یہ فرمایا کہ مولویوں سے یہ سنا ہے کہ نماز اس طرح بھی ہو جاتی ہے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اس پر لوگوں نے تند لہجوں میں کہا کہ چوری اور سرزوری۔ ایک تو نماز الٹی پڑھا دی اور اوپر سے مولویوں کو بدنام بھی کرے ہے، یہاں یہ جھگڑا چل ہی رہا تھا کہ حضرت کو ڈھونڈتی ہوئی ایک جماعت ادھر آنکلی اور دیکھا کہ حضرت جاہلوں میں گھرے ہوئے ہیں، تب انھوں نے لوگوں کو بتلایا کہ تم کس کے ساتھ یہ معاملہ کر رہے ہو، یہ تو مولانا محمد قاسم صاحب ہیں اس پر لوگ نادم ہوئے اور عجز و نیاز سے معافی کے خواستگار ہوئے۔ بہرحال دونوں واقعات سے کہیں کہیں مجبور ہو کر امامت کرنا ثابت ہوتا ہے"

"محمد طیب"

متعلقہ صفحہ ہذا [۱] یہ فقرہ اپنے عم محترم حضرت الاستاذ مولانا سید ابوالنصر الحافظ الحاج رحمۃ اللہ علیہ سے فقیر نے براہ راست متعدد بار سنا ہے، وہ اپنے والد یعنی فقیر کے جد امجد مولانا محمد احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے عموماً اس فقرے کو نقل کیا کرتے تھے ۱۲

"وعظ بھی نہ کہتے تھے" ص۱۳

مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں حضرت والا کا یہی طرز عمل تھا، میر شاہ خاں صاحب کے حوالہ سے بھی ارواح میں نقل کیا ہے کہ

"مولانا نانوتوی وعظ نہ کہتے تھے" ص۱۶۱

پھر اس طرز عمل میں تبدیلی کس راہ سے ہوئی؟ مصنف امام نے اس کی تاریخ یہ بیان کی ہے، کہ حضرت شاہ اسحٰق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ جلیل، عالم باعمل حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ جنھیں سیدنا الامام الکبیر غیر معمولی احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور اپنے اکابر میں ان کو شمار کرتے تھے[۱]، ان ہی

"مولانا مظفر حسین مرحوم کاندہلوی نے اول وعظ کہلوایا" ص۳۱

واللہ اعلم یہ پہلا تاریخی وعظ کہاں کہا گیا؛ بظاہر کاندھلہ ہی میں شاید یہ وعظ ہوا ہو، مصنف امام ہی نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ آپ کے اس پہلے تاریخی وعظ میں

"خود (مولانا مظفر حسین نے) بھی بیٹھ کر سنا" ص۳۱

اور یہ بھی لکھا ہے کہ

"اور بہت خوش ہوئے" ص۳۱،

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ دنیا کو خطابت و بیان کے اس غیر معمولی نمونہ سے استفادہ کا موقعہ جو ملا مولانا

---

[۱] اس موقعہ پر مصنف امام نے مولانا مظفر حسینؒ کا ذکر غیر معمولی الفاظ میں فرمایا ہے اپنی چشم دید شہادت درج کی ہے کہ اتباع سنت میں نہ ایسا دیکھا نہ سنا، تقویٰ کا حال یہ تھا کہ مشتبہ لقمے کو معدہ قبول نہ کرتا تھا، پیادہ پا سات حج سے سرفراز ہوئے۔ مدینہ منورہ میں دفن ہونے کی آرزو تھی ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء یعنی فتنہ غدر کے سات سال بعد ان کی یہ آرزو پوری ہوئی، مدینہ میں انتقال ہوا، عقد بیوگان کی ترویج میں غیر معمولی کوشش مولانا نے کی صرف نحو کے بغیر عورتوں کو قرآن کا ترجمہ بھی پڑھایا کرتے تھے، قصباتی زبان طرز وضع کی وجہ سے متعدد مواقع میں بعض دلچسپ قصے پیش آئے راستہ میں ایک دن ایک مسافر جو بار بار کہتا تھا کہ مولانا مظفر حسین کاندھلے والے بڑے زبردست عالم اور ولی اللہ ہیں۔ آپ فرماتے کہ نہیں بھائی صرف نماز بس وہ پڑھ لیتا ہے، مسافر غصہ میں الجھ الجھ پڑتا آخر کسی دوسرے آنے والے نے راز فاش کیا کہ ارے یہی تو مولانا مظفر حسین ہیں، ایک ہندو آپ کے عملی حالات سے سفر ہی کے زمانہ میں اپنے خاندان سمیت مسلمان ہو گیا، ارواح وغیرہ میں انکے غیر معمولی حالات درج ہیں ۱۲

منظفر حسین کے ہی دوسرے حسنات اور نیکیوں میں ایک بڑی نیکی یہ بھی تھی،
ایسا آدمی جو عمر میں بھی بڑا ہو، اور اس کے علم و فضل سے بیان کرنے والے کا دل و دماغ متاثر بھی ہو، تجربہ بتاتا ہے کہ یوں ہی اس کے سامنے تقریر و بیان کی ہمت پست ہو جاتی ہے خصوصاً پہلی تقریر کے سننے والوں میں مولٰنا مظفر حسین مرحوم کی شرکت اور وعظ کی کامیابی پر اظہار مسرت میرے نزدیک تو اس کی دلیل ہے کہ فطرۃً آپ خطیب تھے۔

لیکن شاید اپنے اس جبلی کمال کا علم خود آپ کو بھی نہ تھا، خدا جزائے خیر دے مولٰنا مظفر حسین کو کہ لاہوتی علوم کے ایک بحر رواں کا دہانہ گویا ان ہی کی توجہ و برکت سے دنیا کے لئے کھل گیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مظفر حسین کے ارشاد کی تعمیل کے بعد پھر وعظ سے انکار پر اصرار باقی نہ رہا، یہ خبر دیتے ہوئے کہ پہلے مولانا نانوتوی وعظ نہیں کہتے تھے امیر شاہ خاں صاحب کہا کرتے تھے کہ

"کوئی بہت اصرار کرتا تو کہہ دیتے تھے" ص۱۷۰

جس سے معلوم ہوا کہ وعظ گوئی کو اپنا پیشہ تو آپ نے کسی زمانہ میں بھی نہیں بنایا، ہاں! مولٰنا مظفر حسین کے حکم کی تعمیل کے بعد اسی قسم کا اصرار جیسا کہ مولٰنا نے کیا تھا کوئی کرتا، تو بیان کر دیا کرتے تھے،

لیکن ظاہر ہے کہ اصرار کرنے والوں کی دنیا میں کمی کیا تھی، جب بے چارے عام مولویوں کو بھی اصرار کرنے والوں کا یہ گروہ نہیں چھوڑتا اور بولنے پر مجبور ہی کر دیتا ہے، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ ان ہی اصرار کرنے والوں کے سلوک کی نوعیت کیا ہوگی۔ جن جن شہروں یا آبادیوں میں حضرت والا کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ یا اتفاقاً کسی ضرورت سے جہاں قدم رنجہ فرمایا گیا ہے، مشکل ہی سے ان میں کوئی جگہ ایسی ہوگی، جہاں ان اصرار کرنے والوں نے تقریر کرنے پر مجبور نہ کیا ہو۔

آپ اپنی تقریروں میں "مؤید بروح القدس" تھے اس کا اندازہ شاہجہانپور کے میلہ خدا شناسی میں اس وقت ہوا جب ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسرے ادیان و مذاہب کے ہزارہا ہزار افراد کو

دیکھا گیا تھا کہ بیان کرنے والا اپنے محبوب پیغمبر (فداہ ابی و امی) کے "خلق عظیم" کو بیان کر رہا ہے سارے مجمع کو خطاب کر کے آخر میں جس وقت یہ فرمایا جا رہا تھا کہ "انصاف سے کوئی صاحب تبلائیں تو سہی اس قسم کے اخلاق کا کوئی اور شخص ہوا ہے تو دیکھا گیا کہ سننے والوں پر

"ایک کیفیت تھی، ہر کوئی ہمہ تن گوش ہو کے مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی جانب تک رہا تھا، کسی کی آنکھوں میں سنتے ہیں آنسو، کسی کی آنکھوں میں حیرت"۔

اور یہ حال عوام ہی کا نہ تھا، اسی میلہ کی روئداد میں ہے کہ

"پادریوں کی یہ حالت تھی کہ ششدر، بے حس و حرکت" (روئداد میلہ خدا شناسی[۲۷])

بنے ہوئے تھے، اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ ان ہی پادریوں میں ایک پادری غالباً جس کا نام اینک صاحب تھا شاہ جہاں پور سے بریلی پہنچکر ایک صاحب کے آگے سیدنا الامام الکبیر کی تقریر کی دل دوزیوں کا ذکر ان الفاظ میں کرنے لگا کہ ۔

اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص (سیدنا الامام الکبیر) کی تقریر پر ایمان لے آتے" ص[۴۴]

اسی میلہ کی تقریر سننے والوں میں سے ایک نیک دل ہندو نے اپنے احساس کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ

"ایسی تقریریں بیان کیں کہ پادریوں کو جواب نہ آیا کوئی اوتار ہوں تو ہوں" ص[۴۴]

لیکن یہ احساسات تو دوسروں کے تھے، خود حضرت والا کا اپنے وعظ و تقریر کے متعلق کیا خیال تھا حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے راوی ہیں، یعنی اس تمہیدی کلیہ کو بیان کر کے کہ

"حضرت مولانا محمد قاسم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ وعظ کہنا دو شخصوں کا کام ہے۔

ایک محقق کا، اور ایک بے حیا کا"

اس کے بعد حکیم الامۃ یہ روایت کیا کرتے تھے کہ

"اور اپنی نسبت (حضرت نانوتوی) فرماتے تھے کہ میں بے حیا ہوں، اس لئے وعظ کہہ لیتا ہوں"

(قصص ص[۱۳] الہادی جمادی الثانی ۵۷ھ)

بھری مجلسوں میں اس قسم کے اعترافات بھی خواہ بطور کسر نفسی ہی کیوں نہ ہوں، آسان نہیں ہیں لیکن حضرت تھانوی سیدنا الامام الکبیر کے دیکھنے والوں میں تھے، ان کی فطرت اور جبلی خصوصیات سے واقف تھے، اسی لئے مذکورہ بالا فقرے کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

"یہ تو آسان ہے کہ اظہار تواضع کے لئے ہر واعظ زبان سے یہ کہدے، مگر فرق یہ ہے کہ وہ بناوٹ سے ہوگا اور مولٰنا (نانوتوی) بے بناوٹ کہتے تھے"

مطلب یہ تھا کہ کمال کسی رنگ میں ہو اپنی طرف اس کے انتساب کو سیدنا الامام الکبیر کی فطرت برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی، آگے اسی کے بعد حضرت تھانوی کی طرف یہ بات جو منسوب کیگئی ہے کہ

"کیونکہ ان کو (سیدنا الامام الکبیر) کو کمالات یقیہ کا نبع معلوم تھا، اس کے سامنے اپنے کمالات ہیچ نظر آتے تھے"

بہر حال اپنے تقریری کمال کے متعلق یہ احساس تو سیدنا الامام الکبیر کا تھا، لیکن دوسرے آپ کی تقریروں سے غیر معمولی طور پر کیوں متاثر ہوتے تھے اس کا سراغ بھی حضرت والاہی کے ایک حکیمانہ نکتہ کی روشنی میں لگایا جاسکتا ہے، امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے ارواح میں یہ نقل کرتے ہوئے کہ

"ایک مرتبہ کسی نے (وعظ پر) اصرار کیا"

شاید اس وقت طبیعت آمادہ نہ تھی، یا کیا وجہ ہوئی۔ بہر حال کہنا یہ ہے، کہ اصرار کرنے والے صاحب سے خاں صاحب کا بیان ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے یہ فرماتے ہوئے کہ:

"وعظ ہمارا کام نہیں اور نہ ہمارا وعظ کچھ مؤثر ہو سکتا ہے"

آگے یہ ارشاد فرمایا کہ

"وعظ کام تھا، مولٰنا اسمٰعیل شہید صاحب کا اور ان ہی کا وعظ مؤثر بھی تھا"

پھر آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو سمجھایا کہ تقریر و بیان کی ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ بطور فن کے بعض لوگ خطابت کی مشق کرنے میں موجودہ اصطلاح میں گویا یوں سمجھئے کہ آرٹ کی حیثیت سے اس کو سیکھتے ہیں۔ اور جن لوازم و ضروریات کی حاجت اس فن کے حاصل کرنے میں ہوتی ہے

ان کو وہ حاصل کرتے ہیں، ان لوگوں کا بیان بیان تو ہوتا ہے اور شاعری، موسیقی، ظرافت، قصہ خوانی وغیرہ چیزوں سے لوگ عموماً متاثر ہوتے ہیں، اسی طرح اس نوعیت کے مصنوعی بیانات اور تقریروں کا بھی لوگوں پر اثر پڑتا ہے، گویا ان وعظوں کی حقیقت قریب قریب وہی ہوتی ہے، جو آج کل کے تماشا گھروں میں اداکاروں کی ہوتی ہے کہ جمالیاتی اثر پذیری کا جو فطری عاطفہ آدمی کے اندر پوشیدہ ہے تھوڑی دیر کے لئے وہ متحرک ہو جاتا ہے، وقتی لذت لوگوں کو مل جاتی ہے، لیکن یہ لذت بھی وقت کے ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور ساری سنی ہوئی باتیں سننے والوں کے لئے مجلس سے اٹھنے کے بعد کچھ ان سنی سی بن کر رہ جاتی ہیں اور اس قسم کی تقریروں کے عدم تاثیر کا مطلب یہی ہے کہ ان سے سننے والوں کے اندر کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں ہوتا، اور سننے والوں میں اپنا کوئی دیرپا اثر ایسی تقریریں نہیں چھوڑتیں۔ برخلاف اس کے تقریر ہی کا ایک اور رنگ بھی ہے۔ سیدنا الامام الکبیر نے مثالوں سے اس کو سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ انسانی فطری تقاضوں، بھوک پیاس یا قضاء حاجت وغیرہ کی جو حالت ہے کسی خاص نصب العین کی افادیت کے متعلق اسی قسم کی کیفیت بیان کرنے والوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً آدم کی اولاد کی گمراہی ان کی غیر آئینی زندگی کے دردناک عواقب اور انجام کا تصور ان کو تڑپا دیتا ہے اور انسانیت کی بہی خواہی کا جذبہ ان پر کچھ اس طریقہ سے مسلط ہو جاتا ہے کہ جیسے فطری تقاضوں کا حال یہ ہوتا ہے، کہ

"اس وقت تک بے چینی رہتی ہے جب تک ان سے وہ فراغت نہ حاصل کرلے"

اور بقول سیدنا الامام الکبیر

"اگر (فطری تقاضوں میں مبتلا انسان) کسی سے باتوں میں بھی مشغول ہوتا ہے یا کسی ضروری کام میں لگا ہوتا ہے تو اس وقت بھی قلب میں (مثلاً) پاخانہ پیشاب ہی کا تقاضا ہوتا ہے، اور طبیعت اس کی اسی طرف متوجہ ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جلد سے جلد اس کام سے فراغت پاکر قضاء حاجت کے لئے جاؤں"۔

بہرحال فطرت کے ان ہی ناگزیر وجدانی تقاضوں کا ذکر کر کے سیدنا الامام الکبیر نے وعظ پر اصرار

کرنے والے صاحب سے کہا کہ

"کم از کم اتنا تقاضائے ہدایت تو ضرور ہونا چاہیئے"

فرمایا کہ

"اگر اتنا بھی نہ ہو، تو نہ واعظ وعظ کا اہل ہے اور نہ اس کا وعظ مؤثر ہو سکتا ہے"

آگے امیر شاہ خاں صاحب کے بیان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا نے تقاضائے ہدایت کی اس شرط سے اپنے آپ کو بھی اور اپنے جیسے دوسرے مولویوں کو بھی محروم قرار دیتے ہوئے اصرار کرنے والے صاحب کے سامنے تقریر نہ کرنے کا عذر پیش کیا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت والا تقریر کے لئے اپنی طبیعت کو موزوں نہیں پا رہے تھے شاید ہدایت سے زیادہ کسی دوسرے مسئلہ کی طرف توجہ منعطف ہو، بہرحال آخر میں جیسا کہ امیر شاہ خاں مرحوم کی اسی روایت میں ہے کہ پھر پلٹ کر حضرت مولنا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرنے لگے کہ

"ہاں یہ تقاضا دوسروں کی راہ نمائی وہدایت کا، مولوی اسمٰعیل صاحب کے دل میں پورے طور پر موجود تھا، اور جب تک وہ ہدایت نہ کر لیتے چین نہ آتا تھا" صلا

اگرچہ کوئی خاص اشارہ خاں صاحب مرحوم کی روایت کے الفاظ سے نہیں ملتا، لیکن بجائے دوسروں کے ابتداء میں بھی مولنا اسمٰعیل شہید ہی کا اس موقعہ پر تذکرہ فرمانا، اور آخر میں بھی پھر ان ہی کا حوالہ دینا اس کی میرا ذہن خطابت و تقریر ہی کی افادیت و تاثیر بخشی کے ایک خاص پہلو کی طرف منتقل ہو رہا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیرؒ نے غالباً اسی پہلو کی طرف اشارہ کیا ہوگا، لیکن راوی کے ذہن میں شاید اس کی چنداں اہمیت نہ تھی، اس لئے ممکن ہے کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ جیسے وعظ و بیان کے متعلق جہاں یہ نکتے ظاہر کئے گئے، کہ بعض لوگ فطرتاً بے جھجک اور غیر مرعوب دل و دماغ کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں بطور طبیعت کے اسی کیفیت کی تعبیر حضرت والا نے "بے حیائی" کے لفظ سے کی ہے۔ بہرحال اسی قسم کے لوگ بطور آرٹ اور فن کے تقریر کا پیشہ

اختیار کر لیتے ہیں، اسی طرح جن لوگوں کے قلوب پر وجدانی تقاضوں کی طرح کسی نصب العین کے اظہار واشاعت کا شدید تقاضا جب مسلط ہو جاتا ہے، اور یہی تقاضا ان کو تقریر کرنے پر آمادہ کرتا ہے، اس حالت میں بات چونکہ ان کے دل سے نکلتی ہے اس لئے دلوں پر اس کی چوٹ پڑتی ہے، سننے والے اسی قسم کی تقریروں سے حقیقی معنوں میں متاثر ہوتے ہیں، قوموں اور امتوں میں فکری و عملی انقلاب اسی نوعیت کی تقریروں سے رونما ہوا ہے، جیسے ہندوستان کے پژمردہ وافسردہ بلکہ کہنے کو کہہ سکتے ہیں بصورت زندہ درحقیقت مردہ قلوب رکھنے والے مسلمانوں میں اچانک بیداری کی لہر حضرت مولنا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں سے کسی زمانے میں جو دوڑ گئی تھی اور پشاور سے چاٹگام تک کی زمین ہلنے لگی تھی، سرفروشی اور جان بازی کے شوق میں مسلمان اپنے اپنے گھروں سے شمشیر بکف نکل پڑے تھے، تو یہ انقلابی رنگ پیشہ ورانہ مصنوعی خطابت کے زور سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ راز وہی تھا کہ پہلے آگ خود کہنے والے کے دل میں لگی، اور اپنے دل کی اسی آگ کو زبان کی راہ سے وہ دوسروں کے دلوں میں منتقل کرتا چلا جا رہا تھا، جہاں تقریر و بیان کے متعلق ان دو اصولی باتوں کی طرف حضرت والا نے اشارہ فرمایا ہے، وہیں بار بار مولنا اسمٰعیل شہید کا ذکر اس موقعہ پر خصوصیت کے ساتھ جو فرمایا گیا ہے، حالانکہ خود ولی اللہی خاندان میں حضرت شہید کے علاوہ حضرت مولنا شاہ عبد العزیز اپنے وقت کے بہترین خطیبوں میں شمار ہوتے تھے، ان کی ہفتہ واری تقریروں کا تذکرہ اب بھی لوگ کرتے ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ جس دن شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا وعظ ہوتا تھا، گویا تمام دلی آپ پر سمٹ کر جمع ہو جاتی تھی، اور دور دور سے لوگ صرف آپ کی مجلس وعظ میں شریک ہونے کیلئے دلی آیا کرتے تھے۔ ...

کچھ بھی ہو حضرت شہید ہی کو تقریری میدان کے مثالی وجود کی حیثیت سے پیش کرنے ہی سے یہ بات میری سمجھ میں آتی ہے کہ شاید حضرت والا نے ادھر اشارہ کیا ہو، کہ ایسے مسائل جن کے متعلق دلی جوش و خروش کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً وہی کام جو حضرت شہید کے پیش نظر تھا یعنی مسلمانان ہند کو پنجاب کے مظلوم و ستم دیدہ مسلمانوں کی نجات و خلاصی کے لئے آپ آمادہ کرنا چاہتے تھے،

اور اسی نصب العین کے تحت پہلے بھیس بدل کر براہ راست پنجاب کا دورہ آپ نے بنفس نفیس خود کیا، جس سے غرض وہی تھی کہ سنی سنائی باتوں سے خود آپ ہی کا قلب اتنا متاثر نہیں ہوسکتا تھا جتنا مسلمانان پنجاب کے حال زار کے عینی مشاہدہ سے اثر پذیر ہوا۔ یوں اپنے دل میں پہلے خود آگ لگالی گئی، اور اسی جلے بھنے ہوئے دل کو لئے ہوئے وہ دتی سے نکلے اور حضرت سید شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی امارت میں ہندوستان کے شہروں، قصبوں، دیہاتوں کا دورہ شروع کردیا، جو آگ آپ کے سینے میں لگی ہوئی تھی اس کی چنگاریاں اڑ اڑ کر دوسروں کے متاع صبر و سکون کو جلانے لگیں اور جہاں کچھ نہیں ہوسکتا تھا، دیکھا گیا کہ اسی ہندوستان کے مردہ دل مسلمانوں میں ایک ایسی طوفانی ہل چل پیدا ہوگئی کہ مقادیر کی مجبوریاں اگر نہ پیش آجاتیں تو بالاکوٹ کے دامن میں جو ایمانی تحریک دفن ہوگئی، شاید مسلمانوں کے کھوئے ہوئے سیاسی اقتدار کی واپسی کا سبب بن جاتی، ولکن ما قدر اللہ فسوف یکون لایسئل عما یفعل وھم یسألون۔

اس قسم کے وقتی جوش و خروش کے پیدا کرنے کا کام تو تقریروں سے لیا جاسکتا ہے لیکن بجائے وقتی کام کے دوامی نتائج کے لئے دیکھا گیا ہے کہ وعظ و بیان والی کوششیں عموماً دیرپا ثابت نہیں ہوتی ہیں۔ جب تک واعظ صاحب کے مواعظ کا سلسلہ جاری رہتا ہے، لوگوں میں محسوس ہوتا ہے کہ بیداری پیدا ہوگئی۔ غریب واعظ مطمئن ہوکر چلا جاتا ہے، کچھ دن بھی نہیں گذرنے پاتے کہ جاگنے والے پھر سو رہتے ہیں، گویا ان کی حیثیت کھینچے ہوئے ربر کی ہوتی ہے، کھینچنے والے کے ہاتھ سے چھوٹا نہیں کہ پھر اپنی اصلی حالت پر وہ واپس ہوجاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا امیر شاہ خاں صاحب کی روایت کے خود الفاظ سے تقریر و بیان کی اس خصوصیت کا اشارہ مجھے نہیں ملا ہے، لیکن مولنا شہید کے ذکر اور ان کے کام کی جو نوعیت تھی اُس سے بے ساختہ میرا ذہن بیانی کوششوں کی اس خصوصیت کی طرف منتقل ہوگیا، گو اسی روایت کے آخر میں سیدنا الامام الکبیر کی طرف ایک فقرہ یہ بھی جو منسوب کیا گیا ہے یعنی حضرت شہید کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ

"چنانچہ وہ ایک ایک دن میں بیس بیس جگہ وعظ کہتے تھے " صفحہ ۱۶۱

" چنانچہ "کے اس لفظ سے جو ربط اول وآخر کے مقدمات میں پیدا کیا گیا ہے، کچھ عجیب سا ہے اسی لئے میرا خیال ہے کہ روایت میں کچھ الفاظ غالباً چھوٹ گئے ہیں، میرا ذہن جس مسئلہ کی طرف منتقل ہوا ہے اگر مان لیا جائے کہ حضرت والا نے اس کی طرف اشارہ فرمایا تھا، تو بے ربطی کا ازالہ ہو جاتا ہے، اور یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وقتی جوش و خروش ہی پیدا کرنا، چونکہ مقصود تھا، اس لئے کسی ایک جگہ زیادہ دن قیام کر کے کام نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ آگ لگانے والا جیسے آگ لگاتا چلا جاتا ہے، اسی طرح ایک ایک دن میں بیس بیس مقامات پر تقریر فرما کر حضرت شہید مسلمانوں کو " جہاد " پر آمادہ فرماتے تھے اور وعظ و تقریر کے سلسلہ میں یہ ایک بڑے پتہ کی بات ہے۔

اس موقعہ پر شاید ضرورت سے زیادہ مجھے کچھ کہنا پڑا، لیکن جو کچھ عرض کیا گیا، اس کے پڑھنے کے ...... لئے شاید ایک دو منٹ کافی ہو سکتے ہیں، لیکن بات اگر لوگوں کی سمجھ میں آجائے تو مسلمانوں کی دینی زندگی کی تنظیم جدید کے سلسلے میں وعظ و تقریر سے کام لیتے ہوئے جو حضرات یہ باور کئے ہوئے ہیں کہ دینی زندگی کے اس رنگ میں دوام و استمرار صرف وقتی ہل چل، جوش و خروش سے قائم ہو جائے گا، شاید اُن کے عزیز اوقات ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائیں گے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دوام و استمرار کی اس کیفیت کے لئے وہی دستور قدیم جس کا عہد نبوت میں "صحبت" نام تھا، اور نبوت کے پچھلے نمائندوں میں ارادت و بیعت وغیرہ ناموں سے وہ موسوم ہوا، یہی نسخہ پہلے بھی کارگر ہوا تھا، اور اب بھی اگر کامیابی حاصل ہو گی، تو اسی سے ہو گی، لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولہا،

خیر مجھے پھر اپنے اصل کام کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، عرض یہ کر رہا تھا کہ جیسے افتاء و امامت سے سیدنا الامام الکبیر پرہیز فرماتے تھے، یہی رجحان آپ کا شروع میں وعظ و تقریر کے متعلق بھی تھا، لیکن خارجی اثرات اور وقت کے اہم تقاضوں نے مجبور کیا اور اپنے طبعی اقتضاء کے خلاف اس میدان میں بھی آپ کو اترنا ہی پڑا، اگرچہ بجائے کسی کمال کے اپنے بیانی کمالات کو یہی سمجھتے رہے

کہ شرم و حیا کے کمالات سے محرومی کا یہ نتیجہ ہے۔ یہی خود بھی سمجھتے تھے اور اعلانیہ بھری مجلسوں میں لوگوں کے سامنے بقول حضرت تھانوی بغیر کسی تصنع کے اپنی اس بے کمالی کا اظہار کیا کرتے تھے اور تقریر کی وہ قسم جس کا منشا مقرر کی بے حیائی ہو' اس کے مقابلہ میں تقریر ہی کی دوسری قسم کے مقرروں کو آپ "محقق" کے نام سے موسوم کرتے تھے، حضرت والا کا خود اپنے متعلق جو خیال بھی ہو، لیکن جب میں یہ سوچتا ہوں، ریاست رامپور والی تقریر اور اس مجلس کو سوچتا ہوں جس کا ذکر کرتے ہوئے کسی موقعہ پر میں نقل کر چکا ہوں کہ

"شہر کے امرار، رؤسار، علمار، عمائد شہر، طلبار غرضکہ ہر طبقہ کے لوگ بھر گئے تھے"

اور یہ کہ

"تمام مشاہیر علمار سوائے مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی کے اس وعظ میں موجود تھے مگر بولنے کی جرأت کسی کو نہ ہوئی" (ارواح ص ۱۹۹)

تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ "محقق والی تقریر" کے نام سے آخر تقریر و بیان کی کس قسم کو موسوم کیا جائے، غیر مسلم تک جن تقریروں کو سن سن کر کہتے ہیں کہ تقریروں ہی کی بنا پر اگر آدمی مسلمان ہو سکتا تھا تو میں مسلمان ہو جاتا، یا "اوتار" تک تسلیم کرنے کے لئے جس کی تقریریں لوگوں کو آمادہ کر دیتی ہوں، بتایا جائے کہ وہ تحقیقی تقریر" کے سوا وہ اور کیا ہو سکتی ہے۔[۱]

---

[۱] امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے ارواح میں یہ قصہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ حضرت نانوتوی کی مجلس وعظ میں ایک دفعہ مشہور معقولی عالم مولنا احمد حسن بھی شریک تھے غالباً یہ امروہی نہیں بلکہ مولانا احمد حسن کانپوری مرحوم ہیں، جو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ مثنوی معنوی پر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں کو اپنے الفاظ میں مولنا کانپوری ہی نے ڈھالا اور بڑی آب و تاب کے ساتھ مطبع نامی کانپور سے مثنوی کا یہ نسخہ شائع ہوا، بہرحال کہنا یہ ہے کہ مولنا احمد حسن کو دیکھ کر حضرت نانوتوی کی توجہ اسلام کے ان مسائل کی طرف ہو گئی، جن میں قدیم عقلیات کی بنیاد پر اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت مولنا کی زبان سے عجیب و غریب عقلی نکات و حقائق ادا ہو رہے تھے کہ مولنا احمد حسن جو علمار دیوبند سے حسن ظن نہیں رکھتے تھے بے ساختہ کہنے لگے کہ اللہ اکبر یہ باتیں کسی انسانی دماغ کی نہیں ہو سکتیں یہ تو خدا ہی کی باتیں ہیں پھر اپنی اثر پذیری کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا کہ مجھ پر تو یہ اثر ہوا کہ میری خودی مٹ رہی ہے ۱۲ ص ۱۸۴ ارواح

لیکن خود تقریر کرنے والا اپنی ان ہی تقریروں کو اپنی بے کمالی کی دلیل خود بھی سمجھتا رہا اور دوسروں کو بھی بغیر کسی تصنع کے یہی سمجھاتا رہا۔ سوال یہی ہے کہ آخر یہ قصہ کیا تھا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ بھنک بھی مقرر صاحب کو اس کی لگ جاتی ہے کہ کسی نے ان کی تقریر یا ان کے وعظ کو پسند نہ کیا، یا ستائش و مدح کے الفاظ سے اپنی زبان کو تر کرنے کی سعادت غریب سننے والا حاصل نہ کر سکا، تو ساری شقاوتوں اور بدبختیوں کا مرجع واعظ صاحب کے نزدیک بن جاتا ہے، عام حال دنیا کا یہی ہے، مگر اسی دنیا میں پیدا کرنے والے نے اسے بھی پیدا کیا تھا، جسے اپنے ہر کمال کے نیچے بے کمالی جھانکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

اللہ اللہ فیاض ازل کی طرف سے جس کی سرفرازیوں کا یہ حال ہو، شاید کہیں پہلے بھی ذکر آچکا ہو کہ جس وقت تقریر کرنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر کھڑے ہوتے اور بیان شروع ہو جاتا تو دیکھا جاتا تھا کہ بیچ بیچ میں کبھی خاموش ہو جاتے ہیں، رکنے کے بعد پھر آگے بڑھتے ہیں۔ جب اس کی وجہ دریافت کی گئی، تو فرمایا کہ

"ایک ہی مضمون کے بیسیوں پیرائے اور عنوان ذہن میں ایک دم آتے ہیں، تو طبیعت رک جاتی ہے اور میں اس پر غور کرنے لگتا ہوں کہ کس کو لوں اور کس کو چھوڑ دوں" ص۱۹۶ ارواح

لیکن باوجود اس کے وہ یہی کہتا رہا کہ

"میں بے حیا ہوں اس لئے وعظ کہہ لیتا ہوں"۔

اس میں شک نہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کے تقریری مجاہدات کے چرچوں سے جیسے ہندوستان تقریباً نصف صدی سے زیادہ مدت سے اب بھی گونج رہا ہے، اسی طرح آپ کی تحریری خدمات کا بھی کافی ذخیرہ بحمداللہ محفوظ ہے، لیکن جو روداد حضرت والا کی وعظ گوئی کی لوگوں نے بیان کی ہے، کچھ ایسا ہی رنگ آپ کے تصنیفی کاروبار کا بھی معلوم ہوتا ہے، مصنف امام نے اپنی کتاب میں ایک موقعہ پر حضرت والا کے مصنفات کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

"اگرچہ مجموعہ ان کا کثیر ہے" ص۲۲

یہ خبر جو دی ہے کہ

"مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) نے اس عرصہ میں چند تحریرات کیں۔ بعضی جواب کسی سوال
کے بعض فرمائش کسی دوست کے بعض اتفاقیہ"۔

اس سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے، پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں، تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں آپ کی خدمات کی نوعیت وہ نہیں ہے جو پیشہ ور مصنفین کی ہوتی ہے، بلکہ وہی بات کہ کسی نے تحریراً کچھ پوچھا خصوصاً ایسی بات جس کا تعلق اسلام کے اصول سے ہوتا، تو کبھی کبھی آپ نے ان ہی سوالات کے جواب میں کچھ ارقام فرمادیا۔ یا بعضوں نے کسی خاص مسئلہ پر لکھنے کی خصوصی فرمائش کی، اصرار سے مجبور ہو گئے اور قلم ہاتھ میں لے لیا، اور اتفاقاً ایسا بھی ہوا ہے کہ لکھ کر اپنے خیالات کے اظہار کی ضرورت محسوس ہوئی، مثلاً شاہ جہاں پور کے میلہ کے متعلق تحریریں یارڑکی والے مناظرے کے سلسلے میں مشہور کتاب "قبلہ نما" وغیرہ کا یہی حال ہے؛

کچھ بھی ہو مستقلاً تصنیف کا ارادہ کر کے جہاں تک میری معلومات ہیں، کوئی خاص کتاب آپ نے نہیں لکھی[1]۔

آپ کے تحریری مآثر کے متعلق مصنف امام نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے اسی کتاب میں یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"جو تحریریں ناتمام رہ گئیں، اب بھلا کون اُن کو تمام کرسکتا ہے اور
جن میں کچھ نقصان ہو گیا، ان کی تکمیل کی کیا صورت ہوسکتی ہے"۔ ص۱۵

کتابوں کے نقص اور ناتمام رہ جانے کی وجہ بھی وہی ہے کہ مصنف بننے کے لئے آپ نے تحریر کے میدان میں قدم ہی نہیں رکھا، وقتی محرکات اور بیرونی دباؤ سے متاثر ہو کر وقت پر جو کچھ لکھا گیا، لکھدیا پھر اس کی تکمیل کا خیال نہ آیا؛

[1] ردّ شیعہ کے سلسلہ میں ہدیۃ الشیعہ لکھتے وقت چونکہ وراثت نبوی کی بحث سامنے آئی جو موت سے متعلق ہے تو آپ نے حیات نبوی اور نفی وراثت نبوی پر ایک مستقل رسالہ آبحیات تحریر فرمایا۔
اسی طرح تصنیف کی صورت سے تقریر دلپذیر تصنیف فرمانی شروع کی جو درمیان ہی میں رہ گئی، جیسا کہ مجھ سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا۔ "محمد طیب"

بہر حال ناقص اور غیر مکمل حالت میں بچا کچا جو کچھ بھی تحریری سرمایہ امت کے ہاتھوں میں رہ گیا ہے، اس سرمایہ کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ تو انشاء اللہ اس وقت ہو گا، جب آپ کے خصوصی نظریات کی ترتیب و تدوین کا بحول اللہ و قوتہ وہ ارادہ پورا ہو، جو کیا گیا ہے، خیال یہی ہے کہ سوانح سے فارغ ہونے کے بعد دوسری مستقل جلد اس کے لئے لکھی جائے۔ اسی حصہ میں آپ کی تصنیفات کی تعداد اور جن جن مسائل اور عنوانوں پر یہ رسالے یا کتابیں ارقام فرمائی گئی ہیں سب کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے گا۔

اس وقت تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کا شمار بھی اردو زبان کے ابتدائی مصنفوں میں کیا جاتا ہے۔ آج بھی تجارتی کتب خانوں کی فہرست میں ایک مستقل عنوان تصنیفات مولانا محمد قاسم نانوتوی، کا لوگوں کو عموماً نظر آتا ہے، لیکن خود لکھنے والے نے یہ جو کچھ بھی لکھا ہے، مصنف امام کی شہادت آپ سن چکے کہ مصنف بننے یا لکھنے کے لئے اور لکھنے والوں کی جماعت میں شریک ہونے کے لئے کبھی نہیں لکھا۔

دوسروں کی شہادت سے زیادہ تو خود ان ہی کتابوں میں مختلف طریقوں سے اپنے احساسات کا اظہار حضرت والا نے جن الفاظ میں فرمایا ہے، ان کو دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ کسر نفسی اور مصنوعی تواضع کا رسمی طریقہ یہ قطعاً نہیں ہو سکتا۔ آب حیات میں اپنی ہیچ مدانی بے سروسامانی، پریشانی وغیرہ جیسی چیزوں کا دیباچہ میں تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"نہ اپنے گھر میں کوئی عالم جو بوجہ قدر دانی علم کی طرف لگائے"۔

اشارہ شاید اپنے والد صاحب مرحوم کے عام مذاق کی طرف ہے، آگے فرماتے ہیں

"نہ اپنے دل میں شوق جو تحصیل علم میں مزہ آئے اور اس کام سے دل نہ گھبرائے"۔

اور آخر میں وہی بات جسے پہلے بھی نقل کر چکا ہوں کہ

"نہ گھر میں کوئی کتاب جو یہ بات ہو کہ جب جی چاہا اٹھایا، دیکھ لیا"۔

اسی طرح اسی "ہیچ مدانی" کا اعادہ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ

"میدانی دہمہ می دانند، نہ سفینہ بہ گنجینہ آوردہ ام نہ مکتوبات سفینہ را بہ سینہ سپردہ"
پہلے بھی کہیں افادۂ استفسار کے سلسلے میں اس اعلان کا کہ ہمارے پاس کتابیں نہیں ہیں، ذکر آچکا ہے۔
حیرت ہوتی ہے ایک حال یہ ہے کہ "کتابیات" یعنی اپنی تصنیف کے ماخذوں کی طویل فہرست دئیے بغیر دلوں کو چین ہی نہیں آتا، اشارۃً کنایۃً لفظ دو لفظ کی حد تک بھی جس کتاب سے استفادہ کیا جاتا ہے، تو فہرست کو طویل کرنے کے لئے عام قاعدہ ہے کہ اس کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے، مصنف کے مطالعہ کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ اس کے اظہار کا ذریعہ کتابیات کے اسی ضمیمہ کو ٹھہرالیا گیا ہے، عام مذاق بھی ہے لیکن اسی کے مقابلہ میں خاص مذاق ایک مصنف ہی کا یہ بھی تھا کہ اپنی کتابی بے نوائیوں کے ساتھ ساتھ بغیر کسی جھجک کے یہ بھی لوگوں کو باور کراتا چلا جاتا ہے کہ

"ذخیرہ ام ہمیں خیالات پراگندہ من اند"

اور کیسے خیالات پراگندہ خود فرماتے ہیں کہ گو کچھ لوگ اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں لیکن

"دیگراں آں را از جملۂ مضامین شعریہ می بینند"

سیدنا الامام الکبیر کے الہامی معارف و علوم سے جن لوگوں کو مناسبت نہیں ہے کبھی کبھی ان کی طرف سے اس قسم کے خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں، اپنے نزدیک وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ حضرت والا کے "علوم مخصوصہ" کے متعلق شاید یہ کوئی نیا نکتہ ان کے ذہن میں آیا ہے مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ سخن ناشناسوں کی اس ظالمانہ تنقید کی تاریخ نئی نہیں ہے، حضرت والا کی زندگی ہی میں اس قسم کی سرگوشیوں کی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہو چکی تھی جن سے خود حضرت والا بھی واقف تھے۔ لیکن ان شپرہ چشموں کے اس گروہ کو اس کے رد عمل میں چشمۂ آفتاب، کی طرف سے کیا غیظ و غضب رنج و ملال کی گرم و تیز و تند شعاعوں کا کبھی تجربہ ہوا! سچ تو یہ ہے کہ جب مذکورہ بالا الفاظ کے بعد والے اس فقرے کا خیال آجاتا ہے، یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ میرے پراگندہ خیالات جن کے سوا اور کوئی وہ سرا سرمایہ میرے پاس نہیں ہے۔ بعض لوگ جن کو شعر و شاعری کی باتیں یا شاعرانہ خیالات قرار دیتے ہیں، آپ نے ان صاحب کو خطاب کرتے ہوئے جن کے سوال کے جواب میں یہ مضمون لکھا ہے، یہ ارقام فرمایا کہ

"اگر پسند خاطر خدام والامقام افتادہ فہو المراد ورنہ کالائے زبوں بریش خاوند'
نامۂ سیاہِ خود بازخواہم گرفت"   (فیوض قاسمیہ صفحہ ۲۴)

اس میں شک نہیں جیسا کہ پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ بطور کسر نفسی کے اس قسم کے الفاظ دوسروں کی تحریروں میں مل سکتے ہیں، عام طور پر اس کو لوگ تصنع پر محمول کرتے ہیں، لیکن حضرت والا کی کتابوں میں اس قسم کی چیزوں کا ذکر کیا ہی گیا ہے کچھ ایسے سیدھے سادے بے ساختہ انداز میں کہ بناوٹ کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا، دیباچہ یا خاتمہ ہی میں نہیں، بسا اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ لکھتے چلے جارہے ہیں، لکھتے لکھتے پھر اپنی نایافت کا شعور بیدار ہوتا ہے اور قلم سے اسی قسم کے الفاظ کتاب کے درمیانی مقامات میں نکل پڑتے ہیں، حضرت والا کی تصنیفات میں ایک "فائق تصنیف" آب حیات بھی ہے اس کے دیباچہ میں تو خیر جو کچھ لکھا ہے وہ لکھا ہی ہے۔ لیکن اسی کتاب کے صفحہ ۲۲۲ میں ایک موقعہ پر پھر خیال آگیا، ارقام فرماتے ہیں۔

"اپنے حال کو کون نہیں جانتا، نہ ذہن ہے، نہ فہم ہے، نہ محنت، نہ مشقت، نہ فرصت ہے، نہ فراغت، نہ علم در سفینہ، نہ علم در سینہ" صفحہ ۲۲۲

اپنے حال کا خود اپنے آپ کو واقف قرار دے کر اپنی تہی دامانیوں کا برملا، صرف اظہار نہیں بلکہ اس کو بھی موقعہ موقعہ سے تصنیفات کی ابتدا میں بھی، انتہا میں بھی بیچ میں بھی درج کرتے چلے جانا، اپنے اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر سوچنا چاہئے کہ کیا یہ کوئی معمولی واقعہ ہے۔

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ حضرت والا نے کتابیں بھی لکھی ہیں، اور آپ کے مقالات و مضامین بھی فارسی اردو اور قدرے عربی زبان میں پائے جاتے ہیں، لیکن بجائے خود ان میں سے ہر ایک اپنے نظریات فائقہ کے لحاظ سے کچھ بھی ہو، لکھنے والے نے ان کو بے کمالی ہی کے اظہار کا ذریعہ بنانا چاہا، جہاں بھی موقعہ ملا ہے اس پہلو کو نمایاں کرنے کی مصنوعی نہیں بلکہ واقعی کوشش کی گئی ہے۔ شاید تصنیف و تالیف کی دنیا کا یہ واقعہ اپنی آپ ہی نظیر ہے۔

اور جیسے ان کتابی سفینوں میں اتفاقاً سیدنا الامام الکبیر کے بعض الہامی علوم اور ذہنی افکار

و خیالات محفوظ ہو جانے کا نظم قدرت کی طرف سے ہوا، خود تو وہ کچھ لکھنا نہ چاہتے تھے، لیکن حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر بہر حال ان کو لکھنا ہی پڑا، میرا خیال ہے کہ تقریباً یہی حال ان زندہ ہستیوں کا بھی ہے جو حضرت والا کے بعد آپ کے علوم کے امین و محافظ یعنی آپ کے شاگردوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دیوبندی سلسلے کے مدارس اور تعلیم گاہوں کا طویل الذیل سلسلہ آج ہندوستان کے شمال و جنوب مغرب و مشرق میں جو پھیلا ہوا ہے، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سب کی انتہا بالواسطہ یا بلا واسطہ سیدنا الامام الکبیر کے وجود باجود ہی پر ہوتی ہے، ان مدارس کا خیال ہی کوئی حضرت والا کے تصور کے بغیر نہیں کر سکتا، تقریباً ایک صدی سے اسلامی علوم کے درس و تدریس کا طوفان اس ملک میں جو امڈا ہوا ہے، سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ ابتدائی سرچشمہ اس کا آپ ہی کی ذات مبارک ہے۔

لیکن کیا کیجئے کہ اسی ذات ستودہ صفات کے متعلق تاریخ ہی کی شہادت یہ بھی ہے، کسی بیرونی گواہ کی نہیں صاحب البیت حضرت والا کے حفید رشید و سعید حضرت مولانا محمد طیب صاحب اپنے ایک مقالہ میں ارقام فرماتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر نے۔

"نہ دار العلوم کے احاطہ میں بیٹھ کر کبھی پڑھایا نہ اس کے
انتظامات کے سلسلہ میں رسمی طور پر کبھی کوئی عہدہ قبول کیا"

پھر اسی کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہ بظاہر دار العلوم دیوبند کے انتظامی قصوں سے حضرت والا تعلق نہیں رکھتے تھے مولانا طیب نے لکھا ہے کہ

"احاطہ مدرسہ میں بیٹھ کر مدرسوں کی طرح کبھی درس بھی نہیں دیا" (صـ۱۳ مقالہ سیدنا الامام الکبیر کی سیاسی خدمات)

صرف یہی نہیں بلکہ جہاں تک میری تلاش و جستجو کا تعلق ہے، فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب تک دلی میں حضرت والا کا قیام رہا نہیں جانتا کہ وہاں کسی کو آپ سے پڑھنے کا موقعہ کبھی ملا اور ہمارے مصنف امام نے حضرت والا کی دوسری خصوصیتوں کے ساتھ ایک خصوصیت اپنی

کتاب میں جو یہ بیان کی ہے کہ

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) سے پڑھنا نہایت ہی دشوار تھا" ص۲

دشواری کی وجہ خود ہی یہ بیان فرمائی ہے کہ

"جو شخص طباع ہو، اور پہلے سے اصل کتاب کو سمجھا ہوا ہو،
تب مولوی صاحب کی بات سمجھ سکتا تھا" ص۲

جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسے عمیق اور گہرے مضامین بیان کرنے لگتے تھے کہ عربی کے عام طلبہ کی سمجھ سے آپ کی باتیں بہت زیادہ بلند و برتر ہوتی تھیں، حالانکہ اسی کے ساتھ مصنف امام ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"ہر چند مولوی صاحب نہایت ہندی کی چندی کر کر بیان فرماتے مگر مشکل بات مشکل ہی ہوتی ہے" ص۲

وہی یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"آمد معانی اور مضامین کی ایسی بھی یوں فرماتے تھے کہ بعضی بار حیران ہو جاتا ہوں کہ کیا کیا بیان کروں" ص۳۵

آپ کے درس کے متعلق خبر دیتے ہیں کہ

"اور اکثر تقریر طویل کے سبب کہیں سے کہیں نکل جاتے" ص۳۵

مصنف امام (یعنی حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ) کی زبانی اسی سلسلہ میں ان کے ایک ذاتی تجربہ کا تذکرہ مولانا حبیب الرحمن فرمایا کرتے تھے، ارواح ثلثہ میں بھی یہ قصہ موجود ہے۔ مولانا حبیب الرحمن مرحوم فرماتے تھے کہ

"مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے خود سنا، فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی مسئلہ کے متعلق کچھ سوال کیا، اس وقت حضرت مولانا چھتے کی مسجد کے چھپر والے حجرہ میں تھے، اور کوئی خاص کیفیت طاری تھی، مولانا نے اس مسئلہ پر تقریر شروع کی، لیکن اس تقریر میں لفظ بھی غیر

مانوس تھے اور معانی بھی غیر مانوس، جن کو میں قطعاً نہ سمجھ سکا، میں نے عرض کیا کہ کچھ نازل ہو کر تقریر فرمائیے میں قطعاً نہیں سمجھا، پھر دوبارہ تقریر فرمائی جو اس سے کچھ نازل تھی، جس کے لفظ مانوس تھے، مگر معانی قطعاً بلند، اور غیر مانوس جن کو میں نہ سمجھا، تیسری دفعہ میں نے پھر کہا کہ میں نہیں سمجھا، کچھ اور نازل ہو کر فرمائیے، پھر اس سے اتر کر اور نازل تقریر فرمائی، جو کچھ قریب الفہم آگئی تھی، مگر پھر بھی نہ سمجھا اور میں نے عرض کیا کہ میں نہیں سمجھا، تو فرمایا کہ مولانا پھر کسی دوسرے وقت پوچھئے گا۔" ص۱۹۷

ظاہر ہے کہ مولانا محمد یعقوب جیسے ذہین و فطین، عالم متبحر جن کے مطالعہ کے ذوق کا حال حضرت تھانوی نے یہ بیان کیا ہے کہ ہر فن کا ان کو شوق تھا، خود ان ہی کا لطیفہ حضرت تھانوی نقل کرتے تھے کہ طلبہ کو خطاب کر کے فرماتے

"میاں اگر گالیوں کی کتاب بھی ہو تو اس کو بھی دیکھ لینا چاہئے، اور کچھ نہیں تو دو چار گالیاں ہی یاد ہو جائیں گی' (قصص ص۱۶ حسن العزیز)

اور یہی غیر معمولی حال ان کی ذکاوت و ذہانت کا بھی تھا، حضرت تھانوی ہی فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد یعقوب کی حسّی ذکاوت کی یہ کیفیت تھی کہ

"کوئی گھنٹہ دو گھنٹہ چادر اوڑھ لے تو اس کو سونگھ کر بتا دیتے کہ مرد نے اوڑھی ہے یا عورت نے" قصص ص۲۰ حسن العزیز)

بہر حال مذکورہ بالا شہادتوں کی روشنی میں بآسانی یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر سے پڑھنا آسان نہ تھا، وہی کتاب حضرت والا سے پڑھنے والے پڑھ سکتے تھے جس کے مطالب کو پہلے سے وہ سمجھے ہوئے ہوں، مصنف امام کی اس خبر کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ پڑھی ہوئی کتابوں ہی کو لوگ آپ سے پڑھ سکتے تھے، دوسرے لفظوں میں حاصل اس کا یہی ہوا کہ طالب العلم دوسرے اساتذہ سے پڑھ کر فارغ التحصیل ہو چکنے کے بعد حضرت والا کی باتوں کے سمجھنے کے لائق ہوتا تھا اور وہ بھی بایں شرط کہ بذات خود وہ "طباع" بھی ہو اور

طباعیت بھی کیسی کہ بسا اوقات مولانا محمد یعقوب صاحب جیسے طباع آدمی بھی حضرت والا کی باتوں کے سمجھنے سے اپنے آپ کو معذور پاتے تھے۔

اور یہ جو میں نے کہا کہ زمانہ دراز تک خصوصاً جب تک دلی میں حضرت والا کا قیام رہا، آپ کے حلقۂ تلمذ میں شریک ہونے والے لوگ نظر نہیں آتے تو اس کی وجہ غالباً یہی تھی، غور کرنے کی بات ہے کہ مسلمانوں کے اس عہد انحطاط و ضعف میں اچھے دل و دماغ کے ساتھ پیدا ہونیوالوں کی تعداد ہی کیا ہوگی، اور جو تھوڑے بہت گنے چنے افراد ہوں گے بھی تو اُن کے لئے یقیناً یہ آسان نہ تھا کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد پھر پڑھی ہوئی کتابوں کو دوبارہ پڑھنے کی ہمت رکھتے ہوں، مسلمانوں پر معاش کے دروازے تقریباً بند تھے، بڑے بڑے شریف گھرانوں کو اس کا انتظار رہتا تھا کہ لڑکے جوان ہولیں، تو کسی طرح معاشی تگ ودو میں ان کو مشغول کر کے روزی روزی حاصل کی جائے، ایسی صورت میں اتنی فرصت کا تخیل بھی دشوار تھا کہ ایک دفعہ پڑھ لینے کے بعد پھر ان ہی کتابوں کو مزید معلومات کے حاصل کرنے کے لئے پڑھا جائے۔

رہا یہ سوال کہ حضرت والا کے درس کی جو خصوصیت مصنف امام نے بیان کی ہے، آیا یہ کسی ارادی فیصلہ کا نتیجہ تھا؛ یا حضرت والا اس میں مجبور و مضطر تھے، عام طور پر شاید یہی خیال کیا جاتا ہے کہ آپ کی غیر معمولی ذہانت و بلند نظری کا یہ شاید کوئی اضطراری نتیجہ تھا، ممکن ہے کہ واقعہ یہی ہو، مصنف امام نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"ہر چند کہ مولوی صاحب ہندی کی چندی کر کر بیان فرماتے" صـ۴۱

اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ کم از کم مصنف امام کے نزدیک کسی ارادی فیصلہ کا نہیں بلکہ آپ کی مشکل پسند فطرت کا یہ اثر تھا کہ عامیانہ دل و دماغ والوں کے لئے آپ کی باتیں کچھ ناقابل فہم سی بن کر رہ جاتی تھیں" مگر مشکل بات مشکل ہی ہوتی ہے" ان الفاظ سے ان کا اشارہ اسی طرف ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ میرے پاس کچھ ایسی معلومات بھی ہیں، کسی کتاب میں میں نے نہیں پڑھا ہے، لیکن علماء دیوبند کے حلقہ میں اس قصہ کا عموماً لوگ تذکرہ کرتے رہتے ہیں کہ دلی کے مشہور مدرسہ

عبد الرب کے صدر مولٰنا عبد العلی مرحوم و مغفور کو سیدنا الامام الکبیر سے پڑھنے کا موقعہ ملا، کتاب کا نام یاد نہیں رہا، غالباً حمد اللہ یا شمس بازغہ مولوی عبد العلی صاحب کی حضرت والا کے یہاں شروع ہوئی، بیان کیا جاتا ہے کہ مولوی عبد العلی صاحب نے کتاب کی عبارت پڑھنی شروع کی اور حضرت والا کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کتاب کی پھسپھسی بے مغز باتوں سے کافی گرانی محسوس فرما رہے ہیں، جوں توں کر کے عبارت پڑھنے کا مرحلہ پورا ہوا، اس کے بعد سیدنا الامام الکبیر کو دیکھا گیا کہ جھنجھلا کر فرما رہے ہیں کہ تم نے جو کچھ پڑھا یہ تو واضح ہے، اب تم قاسم کی سنو! یہ فرماتے ہوئے مسئلہ متعلقہ پر تقریر کا سلسلہ شروع ہوا، شروع ہوا اور بڑھنے لگا، مولوی عبد العلی بے چارے جواب تک دوسرے اساتذہ سے درس کے سلسلہ میں اس بات کے عادی تھے کہ عبارت کتاب کی ختم ہوئی، ترجمہ کرایا گیا اور ترجمہ کے ساتھ ساتھ بیچ بیچ میں بعض ایسے تشریحی الفاظ استاد بڑھاتا چلا گیا جن سے کتاب کا مطلب ذہن نشین ہو جاتا تھا[1]، لیکن یہاں تو رنگ ہی دوسرا نظر آیا، نہ کتاب کی عبارت ہی درست کرائی گئی، نہ ترجمہ کرایا گیا، اور نہ مصنف کا مطلب سمجھایا گیا، بلکہ نئے سرے سے ایک نیا قصہ شروع کر دیا گیا کہتے ہیں کہ دو تین روز تک تو مبہوت ہوئے درس کے اس طریقہ کو وہ برداشت کرتے رہے، ایک

---

[1] ہندوستان کے قدیم درس کا عام طریقہ یہی تھا، البتہ خیر آباد کے منطقی و فلسفی اساتذہ نے نیا طریقہ یہ جاری کیا تھا کہ طالب العلم جب عبارت ختم کر لیتا، تو ترجمہ سے پہلے اس مسئلہ کے متعلق ایک جامع مانع تقریر کر دیا کرتے تھے، اور اس کے بعد طالب العلم خود ترجمہ کر لیا کرتا تھا، کتابی عبارت پر اپنی زبانی تقریروں کے منطبق کرنے کے مسئلہ کو اہمیت نہیں دیتے تھے، پچھلے دنوں جب نظامیہ درس اپنی سکرات کی حالت میں دم توڑ رہا تھا، پہلے عام طریقہ درس کا رواج مولانا لطف اللہ علیگڈھی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں آخر وقت تک جاری تھا، اور خیر آبادی درس والے اپنے اساتذہ کے طریقہ کو زندہ رکھے ہوئے تھے اور اب تو دونوں ختم ہو گئے، درس کے ان دونوں طریقوں میں افادیت کے لحاظ سے قابل ترجیح کون سا طریقہ تھا، اس زمانہ میں اس پر کافی بحثیں ہوئی تھیں، لیکن اب تو یہ بحثیں کرنے والے رہے نہ اس سے دلچسپی لینے والے۔ فتلك مساكنهم لم تسكن من بعدهم الا قليلا و تلك الايام نداولها بين الناس ۱۲

دن حضرت والا نے جب حسب معمول فرمایا کہ اب تم قاسم کی سنو تو مولنا عبد العلی نے جھنجھلا کر کہا کہ میں قاسم کی سننا نہیں چاہتا مجھے تو عبارت سے کتاب کا مطلب سمجھا دیجئے۔ اس پر حضرت مسکرا دیئے مگر کچھ زیادہ دھیان نہیں دیا اور سبق حسب معمول چلتا رہا۔ آخر کار مولانا عبد العلی کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ صورت حال یہی رہی کہ جو کتاب شروع کی گئی میرے لئے اس کا پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں برابر ہو جائے گا، یہی سوچ کر دبے پاؤں انھوں نے گھر کی راہ لی، وقت پر جب سبق پڑھنے کے لئے نہ آئے، تو حضرت نے دریافت کیا، معلوم ہوا کہ وہ گھر چلدیئے۔ سنا ہے کہ ان کا وطن عبد اللہ پور نامی گاؤں[۱] میں تھا جو ضلع میرٹھ میں ہے سیدنا الامام الکبیر کو ان کے چلے جانے کا سخت صدمہ ہوا، اور طے کر لیا کہ عبد اللہ پور پہنچکر اپنے روٹھے ہوئے طالب العلم کو مناؤں گا، آخر یہی ہوا حضرت عبد اللہ پور تشریف لے گئے، مولوی عبد العلی صاحب کے گھر پہونچے، حضرت کی تشریف آوری کی خبر سنکر مولوی عبد العلی صاحب عرق انفعال میں غرق ہو گئے شاید روپوش ہو گئے۔ اصرار کے بعد سامنے آئے، دریافت فرمایا گیا کہ بھائی تم چلے کیوں آئے۔ آخر اس وقت کھل کر ان کو عرض کرنا پڑا کہ

"حضرت میں تو آپ سے کتاب پڑھنے گیا تھا، لیکن بجائے کتاب کے آپ کے یہاں تو قاسم کی سنی پڑتی ہے"

یہ سن کر کہا جاتا ہے کہ حضرت والا مسکرانے لگے اور فرمایا کہ

"بھائی عبد العلی چلو اب تمہیں میں کتاب بھی سمجھا دوں گا"

اور اس کے بعد ان کے سبق میں یہ طرز عمل اختیار فرمایا کہ حضرت والا پہلے کتاب کا مطلب عبارت سے سمجھا کر فرماتے کہ سمجھ گئے؟ جب وہ اقرار کر لیتے تب وہ فرماتے کہ "اب قاسم کی سنو اور یوں اپنے ایک روٹھے ہوئے شاگرد کو منا لیا گیا۔ اسی کے ساتھ اس روایت کو بھی ملا لیجئے، جو ارواح میں مولنا حبیب الرحمن مرحوم کے حوالہ سے درج ہے۔ یہ فرماتے ہوئے کہ

"حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے چند دن اقلیدس کا درس بھی دیا ہے"

---

[۱] دیوبندی روایات میں ایک مشہور روایت یہ چلی آرہی ہے کہ اسی عبد اللہ پور نامی گاؤں میں سیدنا الامام الکبیر نے جمعہ کی نماز ادا فرمائی تھی، مسئلۃ الجمعۃ فی القری کے سلسلے میں یہ تحقیق طلب بات ہے کہ عبد اللہ پور کی آبادی اس زمانہ میں کیا تھی ۱۲

شاید اس زمانہ میں قیام چھتہ کی مسجد کے حجرے میں تھا، بہرحال مولنٰنا حبیب الرحمن کہا کرتے تھے کہ
"چھتہ میں جب اقلیدس پڑھاتے تھے، اور شکل کھینچنے کی ضرورت پڑتی تھی تو وہیں چٹائی کا
کونہ اٹھاکر اور زمین میں انگلی سے شکل کھینچکر سمجھا دیتے تھے نہ پرکار تھی نہ اوزار تھے" (ارواح ۱۹۴)
یہی سوچنے کی بات ہے کہ اقلیدس جیسے مشکل فن کو پرکار اور اوزار کے بغیر صرف زمین پر لکیریں کھینچکر
جو سمجھا دینے کی قدرت رکھتا ہو، بلکہ بقول مولانا حبیب الرحمن جو اقلیدس کی ان ہی شکلوں کو سمجھادیتا
ہو، اور یہی کیا، جو علم طلبہ کو نہیں بلکہ مطلق عوام کو بھی بڑے بڑے جلسوں، شاہ جہانپور کے میلوں
تک میں مذہب کے لطیف حقائق کے ذہن نشین کرانے میں دیکھا جا رہا ہو کہ کامیاب ہو رہا ہے، اپنے
تو اپنے غیر تک جس کی تقریروں سے اطمینان کی خنکی اپنے اندر پاتے ہوں اسی کے متعلق جب یہ
سنایا جاتا ہے کہ پہلے سے کتابوں کے پڑھے ہوئے اہل علم ہی اس کے درسی افادات کو سمجھ سکتے
تھے، ورنہ عام طلبہ کیلئے ان کا درس غیر مفید تھا، تو آپ ہی خیال کیجئے کہ ہم اس کو اضطراری یا جبلی
خصوصیتوں کا نتیجہ کیسے قرار دیسکتے ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ دقیقہ سنجیوں، اور نکتہ آفرینیوں پر فطرۃً حضرت والا مجبول ومخلوق تھے
سیدھی سادی چیزوں سے بھی ان کا دل اور ان کا دماغ حیرت انگیز اور گہرے نتائج نکالنے کا
عادی تھا، مگر جہانتک میرا ذاتی خیال ہے اپنے ارادات وافکار کی تعبیر وتحبیر کا بھی کافی حسن
سلیقہ قدرت کی طرف سے آپ میں ودیعت کیا گیا تھا، جس کا پتہ آپ کے تحریری آثار اور
کتابی باقیات صالحات سے بھی چلتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ سنگین سے سنگین حقیقتوں کو اپنی بعض
کتابوں میں آپ نے موم بنا کر دکھا دیا ہے، جس کا جی چاہے، "حجۃ الاسلام" اور "تقریر دلپذیر"
کو پڑھ کر خاکسار کے خیال کی انشاء اللہ توثیق کر سکتا ہے،

مگر پتھر کو موم بنانے کے ساتھ مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موم کو پتھر بنانے کی ضرورت
اگر کسی مصلحت کے تحت محسوس ہوتی تھی تو شاید اس کا ملکہ بھی حضرت والا کو ارزانی ہوا تھا
وہ "سنگ را موم کردن" ہی نہیں بلکہ "موم را سنگ کردن" کے کرتب سے واقف تھے۔ اپنی بعض

کتابوں میں اس طرزِ عمل کا اظہار بھی فرمایا گیا ہے، جس کی ایک اچھی مثال آپ کی کتاب "آبحیات" ہے اب خواہ کسی کو مجھ سے اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن اپنی معلومات اور غور و فکر کی رہنمائی میں اسی نتیجہ تک پہونچا ہوں، کہ زمانہ دراز تک لوگوں کو حضرت کے تدریسی کمالات سے استفادہ کی طرف متوجہ ہونے کا موقعہ اسی لئے اگر نہ ملا، کہ آپ کی درسی تقریریں ان کے لئے برتر از فہم و تعقل تھیں، تو اس میں اضطرار سے زیادہ دخل مجھے تو آپ کے ارادی فیصلہ ہی کا نظر آتا ہے، آخر علم کے لوازم امامت و خطابت، افتاء وغیرہ سے جیسا کہ سب مانتے ہیں، حضرت والا کا احتراز ارادی احتراز تھا، تو اسی سلسلے میں کیوں نہ سمجھا جائے کہ درس و تدریس کے مشغلہ سے بھی قصداً پرہیز و گریز کے لئے آپ نے ایسا رنگ اپنی تقریر کا اختیار فرمایا کہ پڑھنے والے ہی آپ کے حلقہ درس سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

کچھ بھی ہو، اضطرار کا نتیجہ خیال کیا جائے یا اختیار کا، مگر یہ واقعہ ہے کہ مدت تک علم کے جس "دھبّے" کے مٹانے کا فیصلہ آپ نے فرمالیا تھا، جہاں اس راہ میں دوسری چیزوں سے بے تعلق رہنے کی کوشش بلیغ فرماتے رہے، لیکن حالات سے مجبور ہو کر کسی نہ کسی رنگ میں ان ہی چیزوں سے آپ کو حصہ لینا پڑا، کچھ یہی حال آپ کا درس و تدریس میں بھی نظر آتا ہے۔

دلّی میں جب تک رہے، کوئی شہادت اس کی نہیں ملتی کہ وہاں آپ کے تلمذ کا فخر کسی کو حاصل ہوا، البتہ جب غدر کے بعد دلّی کا قصہ ختم ہو گیا، اور تصحیح کتب کا کام میرٹھ میں جب آپ کرنے لگے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے درسی استفادے کی کوشش کی، لیکن میرٹھ کے اس درس میں بھی جہاں تک میں جانتا ہوں کچھ اسی قسم کی کتابیں تھیں، مثلاً مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب نے میرٹھ میں مثنوی مولنا روم پڑھانا شروع کی" ص۳۵

اور پڑھانے کی نوعیت کیا تھی، وہی لکھتے ہیں کہ

"دو چار شعر ہوتے اور عجیب و غریب مضمون بیان ہوتے" ص۳۵

ان ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بجائے مثنوی کے کبھی حدیث کی کوئی کتاب بھی شروع کرا دی

جاتی تھی، مصنف امام نے اطلاع دی ہے کہ

"اس وقت میں ایک جماعت نے مسلم پڑھی ص۳۹"

جماعت میں کس قسم کے لوگ شریک تھے؟ اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، مصنف امام اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ

"احقر بھی اس میں شریک تھا" ص۳۹

ظاہر ہے کہ مولٰنا محمد یعقوب جیسے متبحر علما جس درس میں شریک ہوں گے، اس درس کے حلقہ میں عام طلبہ کے لئے گنجائش ہی کیا پیدا ہو سکتی تھی،

دلی کے غدر کے بعد بقول مصنف امام

"سوائے وطن (نانوتہ) اور کوئی جگہ جانے کی نہ تھی، کبھی وطن کبھی دیوبند رہتے" ص۲۹

بے کاری کے ان ایام میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ درس کا مشغلہ نانوتہ میں شروع فرمایا گیا تھا، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اسی وقت میں (یعنی بے کاری کے اس زمانہ میں) احقر نے حضرت سے بخاری قدرے پڑھی" ص۲۹

الغرض دیوبند کا دارالعلوم باضابطہ طور پر جب تک قائم نہ ہوا، یوں ہی بطور تفنن طبع کے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے اصرار پر حضرت والا نے مذکورہ بالا نوعیت کی چند کتابوں کا درس ان لوگوں کو دیا ہے جو خود عالم و فاضل تھے، ہاں! جب دیوبند کا مدرسہ قائم ہوگیا۔ اور جماعت بندی کا طریقہ مدرسہ میں نافذ ہوا، اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کے قلب مبارک میں ایک نئی ضرورت کا احساس پیدا ہوا، وہ ضرورت کیا تھی؟ کسی موقعہ پر حضرت والا کا یہ لطیفہ فقیر نقل کر چکا ہے، راوی اس کے مرشد تھانوی ہیں۔ یعنی فرمایا کرتے تھے کہ چند چیزیں ایسی ہیں جن میں بوجھ نہیں پڑتا، اور کام نکل جاتا ہے، پھر اسی سلسلہ میں دعوت کے کھانے اور جماعت کی نماز کے ساتھ ارشاد ہوتا کہ

"بدشوق طالب علم کے لئے جماعت کا سبق کہ پڑھیں نہ، اور کتابیں ختم ہو جاویں" (قصص ص)

شاید اسی ظریفانہ فقرے کی سنجیدہ اور متین شرح وہ تھی جس کا ذکر مولانا شبیر احمد مرحوم فرمایا کرتے تھے،

براہ راست خاکسار نے مولنا عثمانی سے یہ بات سنی ہے کہ حضرت مولنا نانوتوی یہ فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ کی اجتماعی تعلیم سے علم کی کمیت اور مقدار میں اضافہ ہوتا ہے، یعنی اہل علم کی تعداد کا بڑھانا اگر مقصود ہو تو اس کی علمی تدبیر یہی ہے کہ اجتماعی درس کو رواج دیا جائے لیکن نقصان کا پہلو درس کے اس اجتماعی طریقہ میں یہ ہے کہ علم کی کیفیت روز بروز گھٹنے لگتی ہے، بایں معنی کہ طلبہ کی استعداد انحطاط وضعف کا شکار ہو جاتی ہے گویا مقدار تو مولویوں کی مدرسوں کے ذریعہ بڑھ جاتی ہے لیکن بالغ استعداد اور غیر معمولی قابلیت ولیاقت رکھنے والے افراد کی پیدائش میں اجتماعی درس کی وجہ سے کمی ہو جاتی ہے۔

سیدنا الامام الکبیر کا یہ علمی نظریہ تعلیمی سلسلے میں ایک ایسا تجربی نظریہ ہے جس کی تائید مشاہدات سے ہو رہی ہے، حضرت والا کے حفید سعید مولانا محمد طیب صاحب نے جو مقالہ آپ کی سیاسی زندگی کے متعلق لکھا ہے، اس میں بھی ایک موقعہ پر یہ فرماتے ہوئے کہ

"یہ ایک فطری امر ہے کہ شخصی تقوی سے جماعتیں بنی ہیں، لیکن جماعتی گھٹ جوڑ سے افراد تیار نہیں ہوتے، یعنی فرد اس طرح کبھی صالح ومتقی نہیں بن سکتا کہ کوئی جماعت باہمی مشورے سے اس کے متقی ہو جانے کے بارہ میں رزولیوشن پاس کردے، یا اس کے لئے تقوی وطہارت کا کوئی رسمی پروگرام بنا کر اس پر باقاعدہ ضابطہ میں اسے چلائے، بلکہ صرف اسی طرح بن سکتا ہے کہ وہ توحید مطلب کے ساتھ ایک مربی کا رنگ قبول کرے، اور اس کے چلے ہوئے راستہ پر اسی کی نگرانی ورہنمائی میں چل کر منزل مقصود تک جا پہونچے۔"

آخر میں لکھتے ہیں کہ

یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی تربیتی احاطہ میں جماعتی افکار وخیالات یا شورائی

طرز عمل کا تربیت میں دخل ہوا، اور شخصی تربیت باقی نہ رہی، جب ہی وہ احاطہ بھی بے عمل یا بے روح بن گیا"

بہرحال اس عام تجربی حقیقت کا اظہار فرمانے کے بعد مولانا طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی یہ اطلاع دی ہے کہ

حضرت (سیدنا الامام الکبیر) کو جہاں علم کی ترویج اور اسلام کی اشاعت و تبلیغ عام منظور تھی وہیں اپنے مخصوص جذبات و دواعی، اور مخصوص رنگ اخلاق و عمل سے تربیت دیکر ایک خاص جماعت بھی بنانی تھی اسی لئے ایک طرف تو تعلیمی ادارہ قائم فرمایا (یعنی دارالعلوم دیوبند) جس کے اصول اساسی میں عمومیت اور طریق عمل میں ہمہ گیری و وسعت رکھی، اس کے لئے شورائی حلقہ تجویز فرمایا، اور اس کے احاطہ میں اہل علم و فضل کی ایک جماعت لاکر بٹھا دی۔

اسی کے بعد وہی ارقام فرماتے ہیں کہ

اور دوسری طرف تربیت خاص کی حد تک اپنی ذات گرامی کو مرکز بنایا، مخصوص طالب اور افراد اپنے لئے چھانٹ لئے، تربیت کی جگہ بھی تعلیمی احاطہ سے الگ رکھی، چھتہ کی مسجد کا حجرہ اپنے لئے مختص فرمایا، اور ان مستعد طالبوں کو سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھ کر انھیں اپنے رنگ میں رنگا" (مقالہ مخطوطہ ص۱۵)

جس ضرورت کے احساس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا، وہ یہی ضرورت تھی، اور "بمدرسہ نمی رفت ولے بردندش" والی مشہور ضرب المثل کا تعلق اگرچہ اس طفل سے تھا، جو پڑھنا نہیں چاہتا تھا، لیکن بہرحال بے چارے کو لوگ مدرسہ لے گئے تھے لیکن تاریخ ہی میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ پڑھنے والا نہیں بلکہ پڑھانے والا پڑھانا نہیں چاہتا تھا، اور گو "اصطلاحی مدرسہ" میں پڑھانے کے لئے وہ پھر بھی داخل نہ ہوا لیکن ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ بننا جس مدرسہ کے لئے مقدر تھا، اسی کے پڑوس کی مسجد کے ایک حجرے میں درس دینے پر مجبور ہونا پڑا، یہ قصبہ دیوبند کی مشہور تاریخی مسجد چھتہ والی مسجد تھی، جس کے

ایک حجرے کو حضرت والا کی قیام گاہ ہونے کا شرف حاصل ہوا، مولٰنا محمد طیب صاحب اپنی سیاسی مقالہ میں اسی حجرے کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"حضرت کی درسگاہ اور تربیت گاہ، اور جائے قیام چھتہ کی مسجد کا ایک حجرہ تھا جو اب تک محفوظ ہے۔" ص۳۱

آگے اسی کے بعد وہی رقمطراز ہیں کہ

اسی میں روز و شب گذارتے تھے۔ اور اسی میں علمی افاضہ، اور باطنی توجہات کا بازار گرم تھا، شاگرد اپنے لئے مخصوص منتخب فرمائے تھے"

مولانا محمد طیب صاحب کے قلم پر بے ساختہ اس موقعہ پر یہ فقرہ بھی آگیا ہے کہ

"بلکہ منجانب اللہ ان ...... (سیدنا الامام الکبیر) کے لئے مخصوص کر دئے گئے تھے۔"

سچ پوچھئے تو جہاں تک خاکسار کا خیال ہے واقعہ کی حقیقی صورت حال بھی کچھ یہی معلوم ہوتی ہے، اجتبائی رنگ والوں کے ساتھ "اللطیف الرحیم" کے الطاف خفیہ کا ظہور ان ہی شکلوں میں ہوتا ہے،

"بہرحال مولانا طیب صاحب نے ان ہی چیدہ و برگزیدہ معدودے چند طلبہ کی خصوصیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

"بجائے خود ذکی مستعد طالب حق، اور علم دین میں فنائیت کے جذبات رکھتے تھے"

ان میں سے چند کے نام کی تصریح بھی مولانا نے فرمائی ہے، لکھتے ہیں کہ

جیسے حضرت اقدس شیخ الہند مولٰنا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث دار العلوم دیوبند، حضرت اقدس مولانا احمد حسن محدث امروہوی، حضرت اقدس مولٰنا عبد العلی صاحب محدث دہلوی، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محی الدین مراد آبادی قاضی ریاست بھوپال، مولٰنا عبد الحق صاحب پور قاضوی وغیرہ وغیرہ"

لیکن وغیرہ وغیرہ" کے الفاظ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے تلامذہ کا دائرہ وسیع تھا جہاں تک میں جانتا ہوں، مذکورہ بالا بزرگوں کے سوا، بمشکل مولانا حکیم عبد الرحیم بجنوری، مولٰنا

حکیم منصور علی خاں صاحب مرادآبادی ثم حیدرآبادی کے ناموں کا اضافہ اس فہرست میں کیا جاسکتا ہے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ جہاں علمی کاروبار کے دوسرے مظاہر سے حضرت والا اپنے آپ کو الگ رکھنا چاہتے تھے، اسی طرح درس وتدریس کے متعلق طریقہ عمل بھی ایسا اختیار فرمایا تھا کہ عام طلبہ میں آپ سے استفادے کی ہمت ہی نہیں پیدا ہوتی تھی، اور اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کسی نے پڑھنے کی درخواست پیش بھی کی، تو بجائے اپنے دوسروں کی طرف اس کو متوجہ فرمادیتے، "قاسم العلوم" کے نام سے حضرت کے چند "مقالات" کہئے یا مطبوعہ خطوط کا ایک مجموعہ کسی زمانہ میں شائع ہوا تھا، جواب نہیں ملتا ان ہی خطوط میں ایک خط کوئی صاحب مولوی فدا حسین نامی کے نام بھی ہے، صحیح طور پر تو پتہ چل نہ سکا کہ یہ کہاں کے رہنے والے تھے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ کے قرب وجوار میں کہیں ان کا وطن تھا، ان کو جواب دیتے ہوئے ان مجتہدی الفاظ کے بعد کہ

جامع کمالات مولوی فدا حسین صاحب زاداللہ فی کمالہ۔ کمترین انام سراپا گناہ محمد قاسم پس از عرض سلام مسنون می طرازد، امروز ششم رمضان شریف روز چہارشنبہ نامہ آن شفیق بہ نشان میرٹھ رقم فرمودہ بودند، دریں قصبہ نانوتہ کہ مسقط الراس ایں نابکار است رسید، وممنون گردانید

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نامۂ فیض شمامہ اس زمانہ میں ارقام فرمایا گیا ہے، جب ہنگامہ غدر کے ساکن ہونے کے بعد میرٹھ میں حضرت والا کا قیام تھا، عرض کرچکا ہوں کہ قیام میرٹھ سے پہلے جب تک دہلی وغیرہ میں تھے، قطعاً کوئی شہادت اس کی نہیں ملتی کہ کسی کو آپ نے کوئی کتاب پڑھائی ہو، ہاں میرٹھ میں قیام کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ خاص خاص نوعیت کے علوم کی بعض کتابوں کا درس بھی کبھی دینے لگے تھے مگر سنئے مولوی فدا حسین صاحب نے حضرت والا سے حدیث پڑھنے کی آرزو اسی زمانہ میں ظاہر کی تھی، جواب میں ان کو ارقام فرماتے ہیں کہ

"شوق علم حدیث مبارکباد، مگر ایں قدر، مسافت طویلہ قطع کردن، آں ہم پیش ایں ہیچمدان، رسیدن، قرین مصلحت نیست"۔

اور قصہ صرف اسی مشورہ پر ختم نہیں ہوا ہے، آگے فرماتے ہیں کہ

"عالم آباد ست، غالباً در جوار اوشاں بسیارے از اہل کمال باشند"

مطلب وہی ہے کہ دنیا مولویوں سے بھری پڑی ہے، پھر سارے جہاں کے مولویوں کو چھوڑ کر آپ خواہ مخواہ اتنی طویل مسافت کے سفر کی زحمت کیوں برداشت کریں، اسی کے بعد یہ بھی مشورہ ان کو دیا گیا ہے کہ

"ورنہ کلکتہ بہ نسبت دہلی و اطراف آں از انجا نزدیک باشد"

شاید مولوی فدا حسین نے عرض کیا ہو گا کہ حضرت خود اگر نہ پڑھائیں، تو حدیث پڑھنے کے لئے کیا دتی چلا آؤں؟ مگر بے چارے کو دلی کی طرف بھی رخ کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اور دتی پر کلکتہ کو ترجیح دی گئی، اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ مولوی فدا حسین کا وطن غالباً کلکتہ کے قرب و جوار میں تھا خواہ بنگال میں ہو یا بہار میں۔ بہر حال علاوہ قرب مکانی کے کلکتہ کے مشورے میں حقیقی راز یہ پوشیدہ تھا، جس کا ذکر اسی کے بعد ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ

"بخدمت مخدوم العلماء، مطلع الفضلاء، حضرت استاذی مولوی احمد علی صاحب باید شتافت"

یہ وہی مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جو بعد کو محدث سہارنپوری کے نام سے مشہور ہوئے اور صحاح ستہ خصوصاً بخاری شریف کے تحشیہ و تصحیح کے ساتھ ساتھ درس حدیث کا باضابطہ حلقہ سہارنپور میں قائم کر کے علم و دین کی جو خدمات جلیلہ انھوں نے انجام دین ان کی وجہ سے وقت کے گویا وہ امام اور مرجع الانام قرار پائے لیکن یہ ساری باتیں بعد کی ہیں، جس زمانہ میں مولوی فدا حسین کو سیدنا الامام الکبیر نے یہ مشورہ دیا تھا، اس وقت وہ میرٹھ کے مشہور خانوادہ تجار لال کرتی والوں کی طرف سے چمڑے کے کاروبار میں وکالت کا کام کلکتہ میں انجام دیتے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی مشاغل کے ساتھ ساتھ کلکتہ ہی میں درس حدیث کا بھی سلسلہ مولانا احمد علی صاحب نے شروع کر دیا تھا، اسی لئے مولوی فدا حسین کو ان کی طرف متوجہ فرمایا گیا، یہ سچ ہے اور میں پہلے

بہی کہیں ذکر کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے سنن ابوداؤد کا وہ حصہ جو حضرت شاہ عبدالغنی سے نہ پڑھ سکے تھے، اس حصہ کی تکمیل مولانا احمد علی صاحب سے فرمائی گئی تھی، اور بقول مولانا منصور علی خاں مرحوم حیدر آبادی کہ

"ایسے نکات حدیث وقت درس کے (سیدنا الامام الکبیر نے) بیان کئے کہ مولانا احمد علی صاحب مرحوم مجمع عام طلبہ فارغ التحصیل کے رو برو ان توجیہات مولٰنا مرحوم کو بیان فرما کر مولانا صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی بڑی تعریف کیا کرتے" (ص ۱۸۲ مذہب منصور)

لیکن بایں ہمہ ان ہی مولوی فدا حسین صاحب کو مولانا احمد علی سے کلکتہ پہونچکر پڑھنے کا مشورہ جن الفاظ پر ختم کیا گیا ہے میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو ان کو پڑھ کر نکل پڑے، حضرت والا نے لکھا تھا۔

"کہ بہر طور کفش برداری اوشاں (مولٰنا احمد علی صاحب) ازمنت تہی برسر احقر در حق اوشاں بہتر ست"

اسی کے ساتھ اسی خط میں سیدنا الامام الکبیر نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی فدا حسین حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے، اور وطن واپس لوٹنے کے بعد پھر حدیث پڑھنے کے لئے حاضری کی اجازت طلب کی تھی، بہرحال خط کے الفاظ آگے یہ ہیں کہ

"بااین ہمہ حال، مشغولیٔ احقر خود دیدہ رفتہ اند"

پھر اپنی مشغولیت کی کچھ تشریح بھی ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے کہ

"از ہر سقدم کار مطبع ست"

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ خط اس زمانے میں ارقام فرمایا گیا ہے جب آپ میرٹھ میں مقیم تھے اور منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کا کام انجام دیتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ ہمارے مصنف امام نے میرٹھ کے مطبع کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے حالانکہ لکھا ہے کہ

"منشی ممتاز علی صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ قائم کیا اور مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کو پرانی دوستی کے سبب بلالیا، وہی تصحیح کی خدمت تھی، یہ کام برائے نام تھا

مقصود ان کا مولوی صاحب کو اپنے پاس رکھنا تھا" صہ ۲۱

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود منشی ممتاز علی صاحب مالک مطبع کی جانب سے کسی قسم کا کوئی قدغن آپ کے کام کے متعلق نہ تھا، بلکہ حضرت والا کے قیام ہی کو کافی معاوضہ وہ خیال کرتے تھے۔ یہ منشی صاحب کی شرافت، اور علمی قدردانی تھی، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں۔ خود حضرت والا کے اندر اپنی ذمہ داری کا احساس کتنا زندہ اور کتنا بیدار تھا، کہ سارے کاموں پر خود فرماتے ہیں مطبع کا کام مقدم ہے اور گو کتابوں میں ذکر نہیں کیا گیا ہے، لیکن بہ تواتر دیوبندی حلقہ کے علماء میں جو یہ مشہور ہے کہ سیدنا الامام الکبیر مطبع میں تصحیح کا کام جب کیا کرتے تھے، تو کام کا جو مقررہ وقت تھا، اگر ٹھیک اس وقت تک کسی وجہ سے پہونچنے میں تاخیر ہو جاتی، خواہ منٹ دو منٹ ہی کی تاخیر کیوں نہ ہو، تو اس کو فوراً نوٹ کر لیتے، درمیان میں یا آخر میں بھی اسی قسم کا عذر پیش آجاتا، تو بھی یہی کرتے، اور مہینہ جب ختم ہوتا، تو مہینہ بھر کے ان منٹوں کی میزان دی جاتی، اور تنخواہ کو گھنٹوں کے حساب پر بٹھا کر اتنی تنخواہ یا معاوضہ کے کٹوانے پر اصرار فرمایا جاتا تھا، آخر جب خود فرماتے ہیں کہ "از ہمہ مقدم کار مطبع ست" تو آپ کے اس طرز عمل سے کیوں تعجب کیا جائے۔

خیر یہ تو ایک ذیلی بات تھی، ذکر تھا مولوی فدا حسین کے خط کا، مطبع کے کام کا جو وقت مقرر ہے اس میں یہ فرماتے ہوئے کہ گنجائش پڑھانے کی کیا نکل سکتی ہے؛ آگے حضرت نے لکھا ہے کہ

"باز دراں وقت قلیل کہ باقی ماند"

جس سے معلوم ہوا کہ زیادہ وقت دن کا مطبع کی تصحیحی خدمت ہی میں گذر جاتا تھا، اور دوسرے کاموں کے لئے بہت کم وقت بچتا تھا، پھر جیسا کہ خود ہی ارقام فرمایا گیا ہے کہ قلیل وقت میں بھی

"پارۂ بہر اشغال خود تجویز کردنی ست"

یعنی ذاتی ضرورتوں کے لئے بھی اسی "وقت قلیل" میں گنجائش نکالنی پڑتی ہے، آخر میں ہے کہ

"آنچہ باقی ماند بہر اسباق قدریاں ہم کافی نیست"

اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ میرٹھ پہونچنے کے بعد گو درس و تدریس کا کچھ سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا،

مگر خود ہی فرماتے ہیں کہ کافی وقت اس کام کیلئے نہیں بچتا' پس قدیمان (یعنی پہلے سے جو لوگ پڑھ رہے ہیں) جب ان ہی کو کافی وقت نہیں ملتا تو جدید سبق کی گنجائش کیسے نکال سکتا ہوں'
یہ تحریری یادداشت جو گوناگوں معلومات پر مشتمل ہے۔ اس وقت اس کے پیش کرنے کی غرض یہی ہے کہ پڑھنے والے بے چارے پڑھنا بھی چاہتے تھے، تو ان کو آسانی کے ساتھ اس کا موقع نہیں ملتا تھا' اور مختلف معذوریوں کو پیش کر کے جواب دیدیا جاتا تھا'
البتہ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے، بظاہر وہ حیرت انگیز ہے، تفصیلی طور پر اس قصے کا ذکر مرحوم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی علیہ الرحمۃ والغفران صدر الصدور حکومت آصفیہ مرے لے کر عموماً کیا کرتے تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ خاکسار کے سامنے نواب صاحب مرحوم نے اس واقعہ کا اعادہ کتنی دفعہ فرمایا ہوگا' خلاصہ جس کا یہ ہے کہ علیگڈھ جس کے ضلع میں نواب صاحب کی راج دہانی حبیب گنج واقع ہے، اسی علیگڈھ میں جب وہ کول کے نام سے مشہور تھا! ایک رئیس مولوی اسماعیل صاحب نامی تھے جن کو حدیث پڑھنے کا شوق ہوا' لیکن ریاست کے کاروبار کی مشغولیت اس کا موقع نہیں دیتی تھی کہ گھر سے باہر نکل کر اپنے شوق کو پورا کریں' نواب صاحب فرماتے تھے کہ مولوی اسماعیل صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم کی خدمت میں معروضہ پیش کیا کہ کسی عالم کو جو حضرت کے نزدیک قابل اعتماد ہوں' علیگڈھ بھیجدیا جائے تاکہ ان سے میں حدیث پڑھوں' جواب میں مولانا نے ارقام فرمایا کہ اور کسی عالم کو اپنے کاموں سے فرصت کہاں ہے جو آپ کے پاس جانے پر راضی ہو سکتے ہوں' البتہ ایک بیکار آدمی خود یہ فقیر ہے، حکم ہو، تو بندہ ہی حاضر ہو کر آپ کی خدمت کی سعادت حاصل کرے۔
مولوی اسماعیل بے چارے کے لئے یہ نوید' نوید جان افزا تھا کہ خود حضرت نانوتوی پڑھانے پر آمادہ ہو گئے ہیں' بدل و جان تشریف آوری کی تمنا انھوں نے ظاہر کی' کہتے تھے کہ صرف ان کو پڑھانے کے لئے علیگڈھ میں مولانا نے قیام فرمایا اور مولوی اسماعیل جو کتابیں پڑھنا چاہتے تھے، ان کو پڑھا کر آپ علیگڈھ سے تشریف لے گئے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر اسی کے ساتھ دل چسپ کہئے، یا دل دوز معاوضہ کی کمی و بیشی کا بھی ذکر فرمایا کرتے تھے، حاشیہ میں جس کی تفصیل پڑھ لی جائے۔ اور سچ پوچھئے تو زیادہ تر اس قصہ کا اعادہ نواب صاحب اسی آخری جزء کی وجہ سے کیا کرتے تھے، لیکن جیسا کہ حاشیہ میں فقیر نے عرض کیا' اس واقعہ کے ادراک ہونے کا واقعی استحقاق جس ہستی کو اس زمانے میں حاصل ہے یعنی مولنا محمد طیب کے نزدیک قصہ کا یہی جزء محل کلام اور موجب اشتباہ ہے۔

ورنہ سیدنا الامام الکبیر کا علیگڈھ تشریف لے جانا' اور کچھ دن کے لئے وہاں پڑھانا اس کا اجمالی ذکر تو قاسم العلوم والے مجموعے کے ایک خط میں حضرت والا نے خود فرمایا ہے، مکتوب دہم جو مولنا فخر الحسن گنگوہی مرحوم کے نام موسوم ہے' اس میں مولنا فخر الحسن کو کول کے متعلق یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

---

[1] شروانی صاحب نور اللہ ضریحہٗ کے بیان کا مرکزی جزء یہ تھا کہ تنخواہ کا مسئلہ جب پیش ہوا تو مولوی اسمٰعیل نے دست بستہ عرض کیا کہ حضرت والا جو کچھ فرمائیں گے، وہی رقم خدمت میں پیش کی جائے گی، جواب میں حکم ہوا کہ جب تک میں تمہارے یہاں رہوں' ماہوار پندرہ روپے مجھے دے دیا کرنا تاکہ گھر بھیجدوں' اس قلیل رقم کو سن کر مولوی اسماعیل شرمندہ تھے لیکن بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ یہ مسئلہ بجائے تمہارے فیصلہ کے میری رائے کا تابع رہے گا' اسی لئے خاموش ہو گئے' کئی مہینے حسب وعدہ پندرہ کی رقم پیش کرتے رہے' اسی عرصہ میں ایک دن مولوی اسمٰعیل جب پڑھنے کے لئے حاضر ہوئے تو مولانا نے فرمایا کہ میاں اسمٰعیل جو رقم اب تک تم دیتے تھے' اس پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آگئی ہے، وہ خوش ہوئے کہ شاید کچھ اضافہ کی منظوری عطا فرمائی جائے گی' لیکن جب ان سے مولانا یہ فرمانے لگے کہ بھائی' پندرہ جو تم دیتے تھے' ان میں دس تو میں اپنے گھر کے لوگوں کو دیا کرتا تھا' اور پانچ روپے' غالباً والدہ کی خدمت میں پیش کرتا تھا۔ کل خط آیا ہے کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا ہے اس لئے اس پانچ کی ضرورت اب باقی نہ رہی آئندہ بجائے پندرہ کے دس ہی روپے' دیا کرنا' مولوی اسمٰعیل ششدر و حیران تھے کہتے جاتے تھے کہ حضرت ہم پر کوئی بار نہیں لیکن ادھر سے اصرار تھا کہ غیر ضروری روپئے کا بار اپنے سر بلا وجہ کیوں لوں۔ آخر بات دس ہی روپئے والی طے ہو گئی' فقیر کے سوا خدا ہی جانتا ہے شروانی صاحب سے اس قصہ کے سننے والوں کی تعداد کتنی ہوگی۔ گو مولانا طیب صاحب جو صاحب البیت ہیں' اور اس قصے کو براہ راست نواب صدر یار جنگ سے انھوں نے بھی سنا ہے یہی خاکسار فرماتے تھے کہ اس قصے کے آخری جزء کے متعلق خیال گذرتا ہے کہ نواب صاحب کو کچھ اشتباہ ہو گیا تھا' مختلف وجوہ سے فرماتے تھے کہ اس جزء کی صحت میں مجھے کلام ہے' مثلاً یہی کہ تصحیح کے سوا مولانا نے درس و تدریس کا کبھی معاوضہ نہیں لیا' اس پر تمام اکابر دیوبند کا اتفاق ہے۔

"دراوائل عشرہ ماہ گذشتہ پس از ردوکد بسیار انجام کار رفتن کول تا اختتام بخاری و صحیح مسلم قرار یافتہ بود"

جس سے معلوم ہوا کہ کول جانے کا مسئلہ پیش آیا تھا، اور مقصد حدیث کی دونوں کتابیں بخاری و مسلم کا پڑھانا تھا، آگے یہ ارقام فرما کر کہ اس ماہ کے اوائل عشرہ میں گو کول پہونچنے کا موقعہ نل کا اور کسی وجہ سے نانوتہ، نانوتہ سے دیوبند میں قیام پر مجبور رہنا پڑا، پھر عید کی پندرھویں یا سولھویں تاریخ میں تقسیم انعام کا جو جلسہ دیوبند میں تھا، اس میں تقسیم انعام کی رسم انجام دے کر حضرت والا نے لکھا ہے کہ میں میرٹھ پہونچا، اور ایک شب وہاں گذار کر خورجہ میں دو راتیں گذاریں، آخر میں ہے کہ

"امروز روز یازدہم است غالباً کہ دریں جا رسیدہ ام"

یعنی گیارہ دن ہوئے کہ "دریں جا" پہونچنے کی خبر دی گئی ہے۔ مراد "دریں جا" سے کیا ہے، اس کا پتہ اسی مکتوب کے خاتمہ کی عبارت سے ہوتا ہے، خط کے آخر میں مولٰنا فخر الحسن صاحب گنگوہی سے یہ دریافت فرماتے ہوئے کہ

"غالباً بہ تقریب نکاح مولوی محمود حسن تا دیوبند قدم رنجہ فرمائید"

خاتمہ کے لفظ ہیں کہ

"افسوس کہ کول از راہ بہ یک سو افتادہ ست" ص۱۹

جس سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے عقد کی تاریخ اسی زمانہ میں مقرر ہو چکی تھی، اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مولوی فخر الحسن صاحب اس زمانہ میں کسی ایسی جگہ تھے، جہاں سے دیوبند جاتے ہوئے علیگڈھ (کول) راستے میں نہیں پڑتا تھا، غالباً مولوی فخر الحسن صاحب اس زمانہ میں نگینہ کے عربی مدرسہ میں مدرس تھے، ظاہر ہے کہ نگینہ سے دیوبند جانے والوں کے لئے "کول یک سو افتادہ ست" کے سوا اور صورت بھی کیا تھی، بہرحال خاتمہ کے ان ہی الفاظ سے کہ کول از راہ بہ یک سو افتادہ ست" یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مولوی فخر الحسن صاحب کے نام یہ خط کول (علیگڈھ) ہی سے لکھا گیا ہے، اگرچہ مولوی اسماعیل صاحب کا نام اس خط میں نہیں لیا گیا ہے، لیکن یقیناً یہ اسی

زمانہ کی بات ہے کہ آپ مولوی اسمٰعیل کو پڑھانے کے لئے کول کچھ دنوں کے لئے تشریف فرما ہوئے تھے
حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ ایک طرف غریب مولوی فدا حسین صاحب جیسے کتنے تشنہ کامان علم کو دوسروں کے گھروں کا راستہ بتا دیا جاتا تھا، لیکن ان ہی کے مقابلہ میں ایک غیر معمولی بلند قسمت آدمی مولوی اسمٰعیل بھی تھے کہ کنواں ان ہی کے آنگن میں ابلنے لگا۔ واللہ اعلم بالصواب، مولوی اسمٰعیل کی اس قابل رشک خوش قسمتی کے ظاہری اسباب کیا تھے، سننے میں آیا ہے کہ مولوی اسمٰعیل پر غیر مقلدیت کا غیر معمولی اثر تھا، اس سلسلے میں ان کی طرف بعض ناگفتہ بہ باتیں بھی منسوب ہیں، ممکن ہے کہ ان کے اسی مرض نے طبیب کے دل کو تڑپا دیا ہو، اور بجائے اس کے کہ بیمار طبیب کے گھر آتا، طبیب ہی بے چین ہو کر مریض کے گھر پہنچ گیا، خدا ہی جانتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر سے بھی بخاری اور مسلم پڑھ لینے کے بعد مولوی اسمٰعیل صاحب مرحوم پر یہ راز واضح ہوا یا نہیں کہ صحیحین کی حدیثوں سے بھی بجائے تردید کے زیادہ تر حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیصلوں کی تائید ہی ہوتی ہے۔ اگر سیدنا الامام الکبیر سے براہ راست پڑھنے کے بعد بھی ان کی سمجھ میں یہ علمی راز نہ آیا، تو ظاہر ہے کہ ان بے چاروں کے دل سے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بلا وجہ مخالفت کے جذبہ کو نکالنے میں اور کون کامیاب ہو سکتا تھا، انك لا تهدی من احببت ولكن الله يهدی من يشاء

بہرحال کچھ بھی ہو، میرا خیال تو یہی ہے کہ بجائے خود یہ واقعہ یعنی بڑے بڑے امیروں اور والیان ملک تک کی آرزوئے ملاقات کو جس نے آرزو سے آگے بڑھنے کا موقعہ نہ دیا، اسی کے متعلق یہ واقعہ کتنا حیرت انگیز ہے کہ پڑھنے کی انفرادی خواہش مولوی اسمٰعیل کی طرف سے پیش کی گئی، اور سارے مشاغل کو ترک کر کے بخاری و مسلم جیسی بڑی کتابوں کو ختم کرا دینے کا عزم کر کے کول پہونچ جانا، اور پڑھا کر واپس ہونا، وارستگئ مزاج کا یہ کتنا عجیب و غریب نمونہ ہے، افسوس ہے کہ اس قصہ کا تفصیلی تذکرہ حضرت والا کے حالات بیان کرنے والوں کی روایتوں میں نہیں ملا۔ صرف شروانی صاحب مرحوم اور مذکورہ بالا مکتوب کے سوا اس سلسلے میں دوسرے ذرائع سے کوئی بات معلوم نہ ہو سکی ورنہ آپ کی تدریسی زندگی کا یہ بڑا عبرت انگیز، سبق آموز قصہ تھا، اپنے قائم کئے ہوئے دار العلوم کو

ایک دن کے لئے بھی جس نے اپنے تدریسی کمالات کے اظہار کے لئے استعمال نہ کیا ہو، آپ دیکھ رہے ہیں ضرورت کے احساس نے ایک ایسے کام کے کرنے پر اس کو آمادہ کرلیا، جس کا تصور بھی ہم شاید ان لوگوں کے متعلق نہیں کر سکتے جو مدرسی کی راہوں سے اپنی خودی کو نمایاں کرنے کی کوششوں میں مشغول رہتے ہیں، بیشک ایسوں کے لئے اس قسم کی خانگی نوعیت کی تدریس شاید ناقابل برداشت ہو، لیکن جو پڑھاتا ہی اس لئے ہو تاکہ لوگ مجھے مدرس، اور استاذ نہ سمجھیں، وہی یہ کرسکتا تھا اور اسی نے یہ کرکے دکھا بھی دیا، سچ تو یہ ہے کہ اپنے شاگردوں کی کفش برداری، واقعی کفش برداری کی ہمت اپنے اندر جو رکھتا تھا، جیسا کہ ارواح ثلاثہ میں محدث امروہوی مولانا احمد حسن کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ

"جس (طالب العلم اور شاگرد) کے اندر تواضع (سیدنا الامام الکبیر) دیکھتے تھے
تو اس کے جوتے اٹھالیا کرتے تھے" ص ۲۰۶ ارواح

اس کی تدریس کے اتفاقی مشغلہ کو ارباب عمائم وطیالسہ کے عام تدریسی مشاغل پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہوگا، یہ صحیح ہے جیسا کہ مسلسل عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ ضرورت محسوس فرمانے کے بعد آخر زندگی میں حضرت والا نے بعض لوگوں سے اس قسم کے تعلقات ضرور قائم کئے جو بظاہر دیکھنے والوں کو استادی اور شاگردی کے تعلقات نظر آتے تھے۔

لیکن استاد ہی جن شاگردوں کی جوتیاں اٹھاتا ہو، اور اس سے بھی زیادہ زہرہ گداز حضرت والا کا وہ فقرہ ہے جو ان ہی شاگردوں میں سے ایک شاگرد مولانا فخر الحسن گنگوہی مرحوم کے موسومہ ایک خط میں پایا جاتا ہے، خط کیا ایک علمی موضوع پر مقالہ ہے، قاسم العلوم کے مجموعہ خطوط میں اس کا نمبر دسواں ہے، بہر حال اسی خط کی تمہیدی عبارت ختم کرتے ہوئے اپنے شاگرد مولوی فخر الحسن صاحب کو خطاب کرکے یہ ارقام فرمایا کہ مقصود اس مضمون کے لکھنے سے یہ ہے کہ

"زیر قلم کشیدہ نزد آں عزیز رسانم شاید بدعاے یاد م کنند"

اور اسی کے بعد سیدنا الامام الکبیر کے خامہ عبدیت شمامہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل پڑے ہیں کہ

"اے عزیز! دست ایں افتادہ باید گرفت بارگناہانم ندانم کجا برد"

اس پر مزید اضافہ میں اور کیا کروں، اسی سے سمجھا جاتا ہے کہ ان شاگردوں کا استاذ خود اپنے آپکو کیا سمجھتا تھا، اور یہ حال تو استاد کا تھا، خود ان شاگردوں کی شاگردی کے متعلق جو نہیں جانتے ہیں، وہ خواہ کچھ ہی سمجھتے ہوں لیکن مصنف امام کے حوالہ سے نقل کرچکا ہوں کہ حضرت والا کے دروس اور بیانوں سے مستفید ہونے کے لئے علاوہ "طباع" ہونے کے یہ شرط بھی تھی کہ طالب العلم پہلے سے کتاب کو سمجھے اور پڑھے ہوئے ہو، اور میں دیکھتا ہوں کہ جن بزرگوں کی حضرت نانوتویؒ کے مخصوص تلامذہ ہونے کی حیثیت سے شہرت ہوئی، ان میں اکثروں کا حال یہی ہے، مصنف امام سے بڑھ کر شہادت اس مسئلہ میں اور کس کی ہوسکتی ہے، اپنی مرتبہ سوانح عمری کے آخر میں یہ لکھ کر کہ

"جناب مولوی صاحب سے بہت سے لوگوں کو نسبت شاگردی ہے" ص۲۴

پھر شاگردی کی ان ہی نسبت رکھنے والوں میں سے بعضوں کے نام کی تصریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"عمدہ ان میں سے ایک مولوی محمود حسن صاحب فرزند کلاں مولوی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی ہیں"۔ ص۲۴

مگر اسی کے ساتھ ان ہی عمدۃ التلامذہ کے متعلق وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ

"اکثر کتابیں مدرسہ دیوبند میں پڑھیں" ص۲۴

لیجئے یہ حال تو عمدۃ التلامذہ کا تھا، حضرت شیخ الہند کے بعد مصنف امام نے مولانا فخر الحسن گنگوہی کا نام لیا ہے، مگر ان کے متعلق وہ یہی فرماتے ہیں کہ

"انھوں نے بھی مدرسہ دیوبند میں تحصیل کی ہے، اور اول مولوی رشید احمد صاحب سے تحصیل کی تھی"۔ ص۲۴

جس کے معنی یہی ہوئے کہ پہلے ہی سے یہ لوگ پڑھے پڑھائے تھے، پڑھنے کے بعد پھر حضرت والا کی خدمت میں اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کو پڑھتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ نصابی کتابوں کی تخصیص بھی نہ تھی، ارواح ثلاثہ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ

علیہ کے حوالہ سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ

"حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آب حیات (حضرت مولانا نانوتوی کی تصنیف) وغیرہ حضرت (سیدنا الامام الکبیر) سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے" ص۱۹۷

"وغیرہ" کا لفظ روایت میں جو ہے، اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ سبقاً سبقاً پڑھنے کا یہ قصہ کچھ آب حیات ہی کی حد تک محدود نہ تھا، اگرچہ اسی کے ساتھ نصابی کتابوں کے پڑھنے کا ذکر بھی بعض لوگوں نے کیا ہے۔ مثلاً مصنف امام نے ارقام فرمایا ہے کہ حدیث مولانا محمود حسن صاحب نے سیدنا الامام الکبیر سے پڑھی تھی، یا مولانا منصور علی خاں صاحب حیدر آبادی مرحوم ذکھاہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے

مجھکو ملّا جلال اول سے آخر تک پڑھایا" ص۱۸۶ مذہب منصور

ان ہی کا بیان یہ بھی ہے کہ ملا جلال کے پڑھنے کا موقعہ ان کو اس زمانہ میں ملا جب حضرت والا کا قیام نانوتہ میں تھا اور اس زمانہ میں علاوہ ان کے

"مولوی محی الدین احمد خاں صاحب مرادآبادی اور مولوی عبد العلی صاحب میرٹھی اور مولوی رحیم اللہ بجنوری حاضر تھے، میں ان کے اسباق کی بھی سماعت کرتا تھا"

مولانا منصور علی خاں صاحب نے اپنے جن تین رفقاء کا ذکر فرمایا ہے، ان میں سے تیسرے صاحب یعنی حضرت مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری کی قدم بوسی اور لقاء کی سعادت فقیر کو بھی میسر آئی ہے، مجھے یاد آتا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "رامپور کے علمی حلقوں میں درس نظامیہ کی تکمیل کرنے کے بعد وہ سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، واللہ اعلم ان بزرگوں کو کن کن کتابوں کے پڑھنے کا موقعہ حضرت والا سے ملا، ایک روایت مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری ہی کے متعلق بعض تحریری وثائق میں نظر سے گذری جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح بخاری کے درس میں بھی وہ شریک تھے۔[۱]

---

[۱] سیدنا الامام الکبیر کے حفید ثانی مولانا قاری محمد طاہر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کی قلمی یادداشت میں خاکسار کو یہ روایت ملی ہے، قاری صاحب نے لکھا ہے کہ براہ راست حکیم رحیم اللہ صاحب نے بجنور میں اس واقعہ کا ان سے تذکرہ کیا تھا کہ جب مولانا محمد قاسم قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا تو صحیح بخاری کا درس دیا کرتے تھے میں بھی اس میں شریک ہو گیا (بقیہ آئندہ صفحہ)

بہر حال کہنے کی حد تک تو یہی کہا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا حضرات سیدنا الامام الکبیر کے شاگرد تھے، اور حضرت والا ان بزرگوں کے استاد تھے۔ دوسرے ہی نہیں، خود حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا دستور بھی تھا کہ سیدنا الامام الکبیر کا ذکر ہمیشہ التزاماً استاذ[۱] علیہ الرحمۃ کے لفظ سے فرماتے بارہا خاکسار نے ان سے یہی تعبیر سنی ہے لیکن جہاں تک واقعات کی شہادت ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاگردی اور استاذی کے عام تعلقات کے مقابلہ میں سیدنا الامام الکبیر سے ان بزرگوں کے تعلق کی نوعیت نرالی تھی۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جہاں یہ فرمایا کرتے، اور دوسرے بھی یہی سمجھتے[۵۲] تھے کہ سیدنا الامام الکبیر سے گویا ان کو عشق تھا، میرا حافظہ اگر غلطی نہیں کر رہا ہے تو شاید براہ راست شیخ الہند ہی سے یہ بات فقیر نے سنی ہے کہ ابتداء میں دار العلوم دیوبند میں میرا تقرر مدرسی کی خدمت کے لئے ہوا، اور اس کی خبر مجھے ملی تو میں روپوش ہو گیا، حضرت الاستاذ کو جب اس کی خبر ہوئی تو تلاش کر کے حاضر کیا گیا، پوچھا گیا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۴) ایک دن اتفاقاً مجھے وضو نہ تھا اور سبق میں جا کر بیٹھ گیا، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ حضرت ہاتھ سے منع فرما رہے ہیں، پھر بلا کر یوں فرمایا کہ

"میاں صحیح بخاری میں تو ایسا نہ چاہئے کہ بلا وضو بھی آدمی بیٹھ جائے"

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہذا) [۱] سلف کا عام طریقہ شیخ کو استاذ کے لفظ سے تعبیر کرنے کا تھا غالباً اسی عنوان پر حضرت شیخ الہند نے جو حضرت والا کو استاد سے تعبیر کیا ہے، ورنہ جہاں شیخ الہند کے علوم ظاہری کی تکمیل حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ نے فرمائی وہیں کمالات باطنی کی تکمیل بھی حضرت ہی نے فرمائی ہے چنانچہ میں نے اپنے متعدد اکابر سے سنا ہے کہ شیخ الہند کا رنگ باطن اور انداز اخلاق و کمالات بعینہ اپنے استاذ جیسا تھا لیکن حضرت نانوتوی تواضعاً متوسلین کی تکمیل فرما کر انہیں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منتقل فرما دیا کرتے تھے کہ اجازت ان سے لیلو شاید اسی انداز پر حضرت شیخ الہند کو بھی گنگوہ کی طرف منتقل فرمایا ہے۔ بسا اوقات فتاوی میں بھی یہ صورت اختیار فرمائی ہے، کہ فتویٰ خود مرتب فرمایا۔ اپنے دستخط کے بجائے اسے بھیجدیا حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کہ ان کی طرف سے جانا چاہئے، غرض کمال تواضع سے طبیعت ثانیہ یہ بنالی تھی کہ ہر موقع پر کام میں سب سے آگے رہنے کے باوجود نمود کے موقع پر خود سے پیچھے رہنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ اس قسم کا واقعہ متن میں پہلے گذر بھی چکا ہے، نیز افتاء و تدریس و وعظ سب میں یہی رنگ طبیعت نمایاں تھا اور یہی رنگ دائرہ طریقت میں بھی متوسلین کے ساتھ استعمال فرمایا گیا ہے۔ (محمد طیب غفرلہ)

[۵۲] ارواح میں امیر شاہ خاں مرحوم کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ مولانا محمد قاسم کے خدام آپ کے عاشق تھے (ارواح ص۲۰۲)

بھائی یہ تم روپوش کیوں ہو گئے، شیخ الہند فرماتے تھے کہ تب آبدیدہ ہو کر میں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کی خدمت میں فقیر تحصیل علم کے لئے کب حاضر ہوتا تھا، مجھے تو آپ کی باتوں میں صرف مزہ ملتا تھا، بس اسی مزے کے لئے حاضر ہوتا تھا، پڑھنے کے لئے پڑھتا تو مجھے کچھ آتا جاتا، ایسی صورت میں دوسروں کو بھلا کیا میں پڑھا سکتا ہوں، فرماتے تھے کہ میری باتوں کو سنکر حضرت نے مجھے قریب بلایا اور کمر کو تھپک کر ارشاد فرمایا کہ

"جاؤ! جا کر پڑھاؤ"

شاید یہ بھی فرمایا کہ تم تو بہت پڑھاؤ گے، حضرت شیخ الہند کہتے تھے کہ اسی توجہ کا نتیجہ ہے کہ "ہم جیسے کانوں کتروں[۵۲] سے کچھ کام بن آیا" اسی کے ساتھ حضرت شیخ الہند ہی کے اس بیان کو ملائیے جس کا ذکر ارواح میں کیا گیا ہے، حاصل جس کا یہی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے قلبی تعلق کا حال ان کے ساتھ یہ تھا کہ "دن میں دس بار بھی حاضر ہو کر سلام کرتا، تو مجھے دیکھ کر ہر مرتبہ اتنے ہی خوش ہوتے تھے جتنا کہ ماں باپ کو اس اکلوتے بچے کے ملنے سے غیر معمولی خوشی ہو سکتی ہے جو کسی وجہ سے حبس دوام کی سزا پا کر ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا گیا ہو، اور وہی لڑکا جس کے ملنے سے زندگی بھر کے لئے ماں باپ مایوس ہو چکے ہوں قید سے چھوٹ کر ان کے پاس حاضر ہو جائے۔ ارواح [ص ۱۸۱]

[۵۱] بعض روایات کے مطابق یہ واقعہ کافیہ پڑھانے کے زمانہ کا ہے یعنی مدرسی پر مامور ہونے کے بعد پڑھانا شروع کر دیا تھا، اور ابتدائی کتب مثل میزان منشعب وغیرہا کا درس دیتے رہے لیکن کافیہ شروع ہونے پر جب خود یہ اندازہ کیا کہ وہ چل نہ سکے گی تو اسے شروع کرائے بغیر پڑھانا چھوڑ کر روپوش ہو گئے اس پر حضرت والا نے بلوا کر وہ جملے ارشاد فرمائے جو متن میں مذکور ہوئے ہیں۔ . . . . (محمد طیب غفرلہ)

[۵۲] کانوں کتروں کے الفاظ اب تک معلوم ہوتا ہے کہ حافظہ میں تازہ ہیں، شیخ الہند نے کچھ عجیب انداز میں یہ بات فرمائی تھی توجہ کی شاید یہ وہی قسم ہے جس کی تعبیر شیخ محی الدین بن عربی توجہ بالید سے اپنی کتابوں میں کرتے ہیں مشہور صحابی حضرت جریر بن عبداللہ البجلی گھوڑے کی پشت پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی توجہ بالید ہی کی بدولت میخ کی طرح جم جاتے تھے حالانکہ اس سے پہلے گھوڑے کی پیٹھ پر ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوء حفظ کی شکایت جب کی تو ان کو بھی توجہ بالید ہی سے سرفراز فرمایا گیا جس کا ذکر بخاری وغیرہ میں ہے۔ ۱۲

خود سیدنا الامام الکبیر نے "قاسم العلوم" کے اسی نامۂ دہم میں جو مولٰنا فخر الحسن گنگوہی کے نام ہے خط کے آخر میں یہ لکھ کر کہ "مرا یکے از مشتاقان دیدار خود دانند" اپنے قلم سے ارقام فرمایا ہے کہ

"من ندانم از طرف شما و مولوی احمد حسن و مولوی محمود حسن
بدلم چہ نہادہ اند اکثر موکشاں بکار پردازئ شما می کشند" (مکتوب دہم ص۱۹)

امیر شاہ خاں مرحوم کا قول جو حاشیہ میں میں نے درج کیا ہے، جب وہ اس کو بیان کیا کرتے تھے تو سیدنا الامام الکبیر کے ان عشاق کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ فارسی کا یہ شعر بھی پڑھتے کہ

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خنداں ست بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالاں ست

سیدنا الامام الکبیر کے تلامذہ اور شاگردوں کے نام سے جو موسوم و مشہور ہوئے بلا شبہ ان میں تقریباً ہر ایک کا حال یہی تھا کسی موقعہ پر مولانا منصور علی خاں حیدر آبادی مرحوم کا قول نقل کر چکا ہوں حضرت والا کے ساتھ ان کے قلبی رابطہ کی جو کیفیت تھی اسے ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ

" ان کی سی نزاکت اور دلبری کسی معشوق میں بھی نہ دیکھی، ان کا ذرا التفات اگرچہ جلالی ہو، دافع بلیات تھا، وہ سرتاپا اکسیر اور کندن تھے اور ان کا لطف اور التفات جمالی مفرح القلوب اور کفایۂ منصوری تھا" ص۱۹۵

مگر اسی کے ساتھ آپ دیکھ رہے ہیں اپنے ان ہی نیازمندوں کے متعلق خود سیدنا الامام الکبیر کے باطنی احساسات کا پارہ کہاں تک چڑھا ہوا تھا ان ہی کے الفاظ میں "موکشاں (بال پکڑے) ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تم لوگوں کا کام ہم سے لیا جاتا ہے۔ یہ سوال کہ دار العلوم کی وسیع درسگاہوں کی طرف خود بڑھانے کی نیت سے نظر اٹھا کر بھی جس نے مدت العمر نہیں دیکھا وہی شخص صرف ایک شخص کو پڑھانے ہی کے لئے کول (علیگڈھ) صرف جانے ہی پر نہیں بلکہ کافی مدت تک وہیں قیام کرنے پر کیوں آمادہ ہوا۔ یا جو خود لکھے پڑھے تھے، بجائے خود عالم و فاضل ہو چکے تھے، ان کو دوبارہ پڑھانے اور سکھانے پر آپ کیوں آمادہ ہو گئے، بلا شبہہ اگر آپ کے پڑھانے کی نوعیت

وہی ہوتی، جو عام ارباب درس وتدریس کے کام کی ہوتی ہے، تو اس وقت یہ سوال معمہ بن سکتا تھا، لیکن اس معمہ کو بآسانی ہم اسی کلی اصول" کے تحت جب حل کر سکتے ہیں یعنی علم سے تعلق رکھنے والے جتنے کام بھی آپ سے لئے گئے، جیسے سب میں آپ کے قصد وارادہ کو دخل نہ تھا، جو کمالات بھی وہبی اور اکتسابی راہوں سے آپ کو ارزانی ہوئے تھے، بجائے نمایاں کرنے کے خود تو سب کو دبانا ہی چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ کھونا بھی چاہتے تھے لیکن کمالات کا بخشنے والا ان سے کام لینا ہی چاہتا تھا، یہی صورت آپ کے درس وتدریس کے قصے کی بھی نظر آتی ہے آپ دیکھ رہے ہیں، بولنے کی حد تک تو لوگ یہاں بھی استاد اور شاگرد، درس وتدریس، کتابیں اور اسباق وغیرہ کے الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں لیکن اجمال سے ہٹ کر جب تفصیلات کی حدود میں ہم داخل ہوتے ہیں، تو قدم قدم پر ایسی شہادتیں مسلسل ملتی چلی جاتی ہیں، جن کی روشنی میں اس تعلق کی صحیح تعبیر وہی درست معلوم ہوتی ہے جو عام طور پر تدریسی وتعلیمی حلقوں کے اساتذہ وتلامذہ میں پائی جاتی ہے، اور نہ اس کی تشریح ان روابط سے ہم کر سکتے ہیں، جو عام پیروں اور مریدوں میں ہوا کرتے ہیں، جھلک کچھ اگر نظر آتی ہے، تو شاید اسی نسبت کی جسے قرآنی آیت

يتلوا عليهم اياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة	جو (پیغمبر) ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد باطلہ واخلاق ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی (کی باتیں) سکھلاتے ہیں

نے تیرہ سو سال پہلے اسی خادم کے مخدوم صلوات اللہ علیہ وسلامہ اور ان کے صحبت یافتوں کے درمیان پیدا کر دیا تھا، ہم اصطلاحی معنوں میں صحابۂ کرام کو جیسے رسول اللہ کے شاگرد ٹھہرا سکتے ہیں، اور نہ مرید لیکن باوجود اس کے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ شاگرد اور مرید ہونے کا جو کچھ بھی مطلب ہو سکتا ہے اس کے لحاظ سے دنیا نے نہ ان صحابیوں کے جیسے شاگردوں کو دیکھا تھا اور نہ مریدوں کو کہتا چلا آرہا ہوں کہ ہر رنگ میں اپنے آقا کا جو غلام جس حد تک وفا شعار ہوگا، اسی حد تک سمجھا جاتا ہے کہ اس کی غلامی پختہ ہے، پھر عہد غلامی باندھ کر جینے کا بھی اُن

مرنے کا بھی جو فیصلہ کر چکا تھا، کیوں تعجب کیجئے اگر زندگی کے اس پہلو میں بھی جس حد تک بھی ہو آقا ہی کا رنگ اس کے اندر سے بھی منعکس ہو رہا تھا۔

بات بہت طویل ہو جائے گی، ورنہ سیدنا الامام الکبیر کی حیات طیبہ کا رخ کافی تفصیل و تفسیر کا طالب تھا، جن لوگوں کا انتخاب اپنی خاص صحبت و رفاقت کے لئے آپ نے فرمایا تھا ایک طرف جہاں قرآن کی آئتیں سنا سنا کر باتوں باتوں میں ان ہی کے متعلق ایسے علمی اسرار فاش ہوتے رہتے تھے کہ سننے والوں میں اس کی لذت آخر وقت تک باقی رہتی تھی، اور جب موقعہ ملتا حضرت والا سے ان سنے ہوئے حقائق کا تذکرہ مزے لے لے کر کیا کرتے تھے[۱]۔ اسی طرح الحکمت کی تعلیم کا ذریعہ حدیث کی کتابوں کو بنایا جاتا تھا، آپ سن چکے کہ اس معاملہ میں اتنے حریص تھے کہ مولوی اسمٰعیل کی طلبی پر خود ان کے گھر کول میں جا کر قیام فرمایا، حسی نزاکتوں کا حال اس باب میں یہ تھا کہ مولانا رحیم اللہ بجنوری چاہتے تھے کہ حدیث کے حلقہ میں بغیر وضوء کے بیٹھ جائیں، لیکن حکمت کے علم کے لئے اتنی مسامحت بھی ناقابل برداشت بن جاتی تھی، پھر ان ہی لوگوں کے متعلق ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اپنی بڑائی سے جو دست بردار ہو جاتے تھے جہاں ان کی جوتیاں

---

[۱] مولانا منصور علی خاں حیدر آبادی مرحوم اپنی کتاب "مذہب منصور" میں حضرت والا کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے بیساختہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ مشہور قرآنی آیت لایستوی القاعدون (یعنی جہاد کی خدمت سے بیٹھنے والے ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے، جو اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں) تفسیروں میں لکھا ہے کہ نابینا صحابی ابن ام مکتوم نے آکر عرض کیا کہ میں تو مجبور ہوں گویا ان کو افسوس ہوا کہ اگر یہ قدرتی عذر نہ ہوتا تو ہم بھی جہاد کی فضیلت حاصل کر سکتے تھے اس پر غیر اولی الضرر کے الفاظ پھر نازل ہوئے مطلب یہ تھا کہ قدرتی عذر والوں کا درجہ کم نہ ہوگا، اس پر اعتراض تھا کہ اللہ میاں نے پہلے ہی ان الفاظ کو کیوں نازل نہ فرمایا۔ سیدنا الامام الکبیر اسی کے متعلق فرماتے تھے کہ قرآن میں القاعدون (جہاد سے بیٹھنے والوں) کا لفظ تھا اور المقعدون (جو جہاد سے بٹھا دئے گئے ہوں) یہ لفظ قرآن میں جب نہ تھا تو اسی سے سمجھ لینا چاہئے تھا کہ حکم صرف ان لوگوں کی حد تک محدود ہے جو جہاد سے خود بیٹھ گئے ہوں، باقی قدرت ہی نے جن کو معذور کر کے بٹھا دیا ہو، وہ اس کے نیچے داخل ہی نہ تھے۔ لیکن قرآن کا اشارہ کافی نہ ہوا تو اللہ میاں نے اجمال کی خود تفصیل کر دی ۔

اٹھائی جاتی تھیں، وہیں محدث امروہوی یہ بھی فرماتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کا یہ قاعدہ بھی تھا کہ

جس طالب العلم کے اندر تکبر دیکھتے تھے اس سے کبھی کبھی جوتے اٹھوایا کرتے تھے" ص۲۰۶

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ خود اپنی بیتی کا بیان کرتے تھے تفصیل آپ کو ارواح ثلاثہ میں ملے گی واقعہ یہ تھا کہ محدث امروہوی جو امروہہ کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے، اور ناز و نعمت میں پلے ہوئے تھے، حضرت والا کی خدمت میں جب حاضر ہوئے تو کہتے تھے میں نے دیکھا کہ ایک جولاہہ نے حضرت سے دعوت قبول کرنے کی فرمائش کر کے عرض کیا کہ فقیر کے غریب خانہ کو رونق بخشی جائے اس زمانہ میں مسلمانان ہند کی ذہنیت شرافت و رذالت کی گھناؤنی گندگیوں سے اس حد تک مأوف ہو چکی تھی، کہ غریب جولاہہ کے گھر جا کر کھانا کھانے کی درخواست کی منظوری سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جس وقت صادر ہوئی، تو مولانا احمد حسن کا بیان ہے کہ

"مجھکو اتنا ناگوار ہوا کہ جیسے کسی نے گولی مار دی"

مگر تلاوت آیات و تعلیم حکمت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے تزکیہ کا کام بھی سیدنا الامام الکبیر کے سپرد ہوا تھا، اسی وقت سے مولانا احمد حسن کے اندر اترنے والی اس گولی کی طرف سے فکر پیدا ہوئی، فراست ایمانی نے حضرت والا نے مولانا امروہوی کے اس تاثر کو بھانپ لیا کہتے تھے کہ اس دن کے بعد سے قاعدہ ہی حضرت نے مقرر کر لیا کہ دعوت کرنے والوں سے یہ شرط بھی کرلتے کہ مولوی احمد حسن کو بھی میں ساتھ لاؤنگا پھر خدا ہی جانتا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کو کس کس کے گھر جانا پڑا، اور بقول ان ہی کے

"جب بالکل میرے قلب سے ناگواری نکل گئی تب مولانا نے میری دعوت کی شرط کو ترک کر دیا" ص۲۰۷

اور یوں دل میں ان کے جو گولی اتر گئی تھی اس کو نکال کر تزکیہ کے فرض کو انجام تک حضرت والا نے پہونچایا، اور تزکیہ کا یہ قصہ صرف مولنا احمد حسن ہی تک محدود نہ تھا، کسی موقعہ پر صاحبزادہ والا تبار مولنا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم کے حوالہ سے مولنا منصور علی خاں صاحب مرحوم کے صوری ابتلاء و افتتان کے حادثہ کا ذکر کر چکا ہوں، اس موقعہ پر بھی جو کچھ کیا گیا تھا، وہ تزکیہ ہی کی تو ایک عملی شکل تھی؟

مولانا احمد حسن امروہوی رحمۃ اللہ علیہ جن کے متعلق حضرت تھانوی یہ روایت نقل کیا کرتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر فرماتے تھے کہ مولوی احمد حسن کے دل و دماغ، ذکاوت و ذہانت کو میری طبیعت سے خاص مناسبت ہے، فرماتے کہ ذہین و فطین تو ممکن ہے لوگ ان سے بھی زیادہ ہوں لیکن سونے کی مقدار تھوڑی ہی کیوں نہ ہو، سونے کے ڈھیر سے جو مناسبت اس کو ہوگی، وہ چاندی کو نہیں ہوسکتی، خواہ چاندی کی تعداد زیادہ ہی کیوں نہ ہو (قصص ماہ جمادی ۱۳۵۰ھ)

بہر حال ان ہی باطنی مناسبتوں کی وجہ سے مشہور ہے کہ حضرت سیدنا الامام کے قلب مبارک میں ان کی خاص جگہ تھی، اور بقول مرشد تھانوی سید ہونے کی خصوصیت کو بھی اس میں دخل تھا، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے تزکیہ کے فرض کا جب مطالبہ ہوتا، تو اس مطالبہ کی تکمیل میں کبھی ان کی رو و رعایت نہیں کی گئی، دعوت والی گولی کا قصہ تو آپ سن ہی چکے، مولٰنا احمد حسن صاحب ہی اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے، عرض کر چکا ہوں کہ مولٰنا احمد حسن کی پرورش ناز و نعمت کے ماحول میں ہوئی تھی، وہ خود بھی کہا کرتے تھے کہ "میں بڑا خوش لباس تھا" اب سنئے اسی "خوش لباسی" کے جذبہ کا حشر ارواح میں ان ہی کا یہ بیان درج کیا گیا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں کسی نے گاڑھے کا ایک تھان پیش کیا، قبول کر لیا گیا، اور درزی کو بلا کر حکم دیا گیا کہ ایک انگرکھا تو میرا اس سے تیار کر دو، اور اسی کے ساتھ ان کو (یعنی مولٰنا احمد حسن) کو بلا کر درزی سے فرمائش کی گئی، کہ دوسرا انگرکھا ان کے لئے اسی کپڑے سے نکالو، کپڑا کافی تھا، درزی دونوں انگرکھے سی کر لے آیا۔ مولوی احمد حسن صاحب کے حوالہ گاڑھے کا وہی انگرکھا یہ ہدایت کرتے ہوئے کیا گیا کہ اسے تم پہنو، "خوش لباسی" کے جذبہ کی خوراک گاڑھے کے اس انگرکھے کی شکل میں مہیا کی گئی تھی، مولانا احمد حسن صاحب نے لینے کی حد تک تو لے لیا۔ مگر بجائے پہننے کے اس کو صندوق کے حوالہ کیا، کہتے تھے جب اس انگرکھے کو پہن کر حضرت کی خدمت میں حاضر نہ ہوا، تو وجہ پوچھی گئی، کوئی وقتی عذر پیش کر دیا گیا، مگر یہ فرمائش اتفاقی تو تھی نہیں جو ان حیلوں حوالوں سے ٹل جاتی۔ مولٰنا احمد حسن فرماتے تھے کہ

"مولانا روز دریافت فرماتے کہ بھائی، تم نے اس کو پہنا نہیں آخر جب میں سمجھ گیا کہ مولانا مانیں گے نہیں تو مجبوراً میں نے اس کو پہنا" (ارواح ص ۲۰۱)

اور اس قسم کے قصوں کی حضرت والا کی زندگی میں کیا کمی ہے، افسوس ہے کہ لوگوں نے قلم بند نہیں کیا ورنہ تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم و تزکیہ کے دھارے ایک ساتھ جو بہ رہے تھے، ان کے بہترین عملی نمونے یہ واقعات ہو سکتے تھے۔

تاہم میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں غالباً اس کے سمجھنے کے لئے یہی چند مثالیں کافی ہو سکتی ہیں، آخر آپ ہی سے میں پوچھتا ہوں، مولانا احمد حسن امروہوی کی طرف یہ روایت جو ارواح میں منسوب کی گئی ہے کہ شاہ جہاں پور والے مشہور میلہ کی معرکۃ الآرا تقریر سیدنا الامام الکبیر نے جو کی تھی، شہر شاہ جہاں پور کے باشندوں نے جب اس کی غیر معمولی تعریفیں سنیں، تو میلہ سے حضرت والا جب شاہ جہاں پور تشریف لائے، شہر کے معززین کا ایک گروہ حاضر ہوا اور اصرار کرنے لگا کہ ہم لوگ اس تقریر کے سننے سے چونکہ محروم رہے، اس لئے وہی تقریر یہاں بھی فرمائی جائے۔ حضرت والا نے ان لوگوں کے غیر معمولی اصرار کو دیکھ کر فرمایا کہ اس تقریر کو آپ لوگ اگر سننا چاہتے ہیں تو ان سے (اشارہ مولوی احمد حسن امروہوی) سے سن لیجئے۔ کہتے تھے کہ میں تو یہ سنکر کچھ ششدر سا ہو کر رہ گیا کیونکہ حضرت والا کی تقریر کا اعادہ خصوصاً جب میں نے اس غرض سے سنی بھی نہ تھی، مجھے کچھ ناممکن سا نظر آیا۔ لیکن سیدنا الامام الکبیر کا حکم تھا، کھڑے ہو گئے، کچھ تمہیدی فقرات کے بعد ان کا بیان ہے کہ تقریر کا اعادہ میں نے شروع کیا۔

"پھر مجھے خبر نہ رہی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں"

لیکن جب تقریر ختم ہوئی تو میلے میں سیدنا الامام الکبیر کی براہ راست تقریر سننے والوں نے شہادت دی کہ

من و عن وہی تقریر تھی جو مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمائی تھی" ص ۱۰۸[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

یہ واقعہ، یا خود سیدنا الاستاذ مولٰنا شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کی تدریسی زندگی کے آغاز کا قصہ ابھی کچھ دیر پہلے جو سنا گیا تھا، بلکہ پڑھنے والوں کے حافظہ میں اگر اُس واقعہ کی یاد محفوظ ہو، جو دارالعلوم دیوبند کے اس طالب العلم کے ساتھ گذرا تھا، جسے مدرسہ کے قانون نے وظیفہ کے استحقاق سے محروم قرار دیا تھا، لیکن وظیفہ کا بھی سامان اس بے چارے کے لئے ہو گیا، اور حدیث کی کتابوں کی سماعت کے بعد غالباً پنجاب کی کسی مسجد کی امامت اختیار کر لی تھی، پھر ایک مخالف مولوی سے مناظرے کی نوبت آئی، اس وقت بھی سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے روحانی امداد کا تجربہ ان ہی صاحب کو جو ہوا تھا، یہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات و سوانح کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچئے کہ درس و تدریس کو بطور پیشہ کے اختیار کرنے والے اساتذہ اور ان کے تلامذہ کے درمیان کیا ان نمونوں کو ڈھونڈھنے میں ہم کامیاب ہو سکتے ہیں؟ پھر حضرت والا کے تدریسی مشاغل کی نوعیت اگر عام مدرسوں اور معلموں کے کاروبار سے مجھے الگ نظر آتی ہے، تو کیا اسمیں

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۴۲) اسی کی مثل وہ واقعہ بھی ہے جسے میں نے حضرت مولٰنا عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ انبہٹوی حضرت والا کے بڑے داماد اور مولانا محمد میاں مہاجر کابل مرحوم کے والد بزرگوار سے سنا ہے کہ حضرت کی عادۃ تھی کہ ماہ رمضان میں جب نانوتہ میں قیام تھا تو ہر جمعہ کو بلاناغہ وعظ فرمایا کرتے تھے اور کوئی ایک آیت یا روایت اختیار فرمالیتے اور اسی کے علوم و معارف پورے رمضان بیان ہوتے رہتے۔ فرمایا کہ میں نانوتہ میں ایک رمضان میں حاضر تھا اور پورے رمضان مقیم رہا اس رمضان میں حضرت نے حدیث من صام رمضانَ ایمانا و احتسابا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ کو اختیار فرمایا اور مسلسل تین جمعوں میں اسی کا بیان فرماتے رہے آخری جمعہ میں کچھ طبیعت ناساز ہوگئی تو مجھے فرمایا کہ مولوی عبداللہ اس جمعہ میں تم اسی حدیث کے سلسلہ میں بیان کردو۔ میں شرح جامی پڑھتا تھا میں نے عرض کیا حضرت میں تو حدیث کے مدلول کو سمجھنے کی ہی اہلیت نہیں رکھتا تقریر و بیان کیا کروں گا۔ فرمایا بھائی اللہ پر بھروسہ کر کے تم کھڑے ہو جانا خدا مدد فرمائیگا: باوجود صد انکار کے مجھے حضرت نے کھڑا کر دیا میں لرزاں و ترساں منبر کے پاس کھڑا ہو گیا خطبہ بھی پڑھ لیا حدیث بھی پڑھ لی۔ اور کچھ ترجمہ وغیرہ شروع کیا اتنا تو میں نے دیکھا کہ حضرت باہر کی سہ دری میں گردن جھکائے میری طرف متوجہ ہیں، پھر مجھے خبر نہ رہی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں تقریباً دو ڈھائی گھنٹہ میں نے بیان کیا نہ بیان سے پہلے خبر تھی کہ کیا کہوں گا نہ بعد میں خبر ہوئی کہ کیا بیان کیا مگر لوگوں نے کہا کہ نہایت اونچے اونچے علوم بیان کئے۔

(محمد طیب غفرلہٗ)

میری نظر غلط بینی کے الزام سے متہم ہونے کی مستحق قرار پا سکتی ہے ؟

کچھ بھی ہو شہادتوں کا جو مواد اس وقت تک خاص طریقہ سے پیش کیا گیا ہے، میرا خیال تو یہی ہے کہ ان کو دیکھ کر ہر صاحب انصاف کم از کم اس فیصلہ پر تو اپنے آپ کو بہرحال مجبور پائیگا کہ علمی اور ذہنی کمالات کی جتنی بھی نمائش گاہیں نہیں، ان نمائش گاہوں کا استعمال اپنے کمالات کے اظہار کے لئے خود سیدنا الامام الکبیر نے خود کبھی نہیں فرمایا، اور اس سلسلہ میں جو باتیں بھی ظاہر ہوئیں اگرچہ بقول مصنف امام

اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا، جو کمالات تھے وہ کس قدر
تھے کیا اس میں سے ظاہر ہوئے" (قدیم سوانح عمری ص۱۱)

لیکن بایں ہمہ آپ دیکھ چکے کہ دنیا آپ کے جن کمالات سے واقف ہوئی، ان سے دنیا کو روشناس کرانے میں سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے قطعاً ان تدبیروں میں سے کوئی تدبیر نہیں اختیار کی گئی جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یاد پڑتا ہے، ہمارے استاذ امام سید کشمیری مولانا انور شاہ نور اللہ ضریحہ تقریباً ہر سال دورۂ حدیث کو ختم کراتے ہوئے اُس سال کے فارغ ہونے والے طلبہ کو خطاب کر کے فرمایا کرتے تھے،

"لو بھائی! تعلم اور پڑھنے کا مرحلہ تو آپ کا ختم ہوتا ہے، اب زندگی کی دوسری منزل میں آپ لوگ داخل ہوں گے یہ بھی دیکھا جائیگا کہ کن کن ٹیلوں پر چڑھ چڑھ کے تم میں کون بازوؤں کو پھڑپھڑا کر مرغوں کی طرح بانگ دیتا ہے، میں آج ڈربے کو کھول دیتا ہوں[۱]"

[۱] تقریباً تیس پینتیس سال کی بات ہے۔ روایت باللفظ کا دعویٰ درست نہ ہوگا اسی لئے بطور خلاصہ کے خاتمہ درس کی یہ تقریر درج کردی گئی ہے، حضرت شاہ صاحب یوں تو حد سے زیادہ خاموش آدمی تھے، لیکن خاموشی کے ساتھ خوش طبعی وظرافت سے بھی کافی حصہ ان کو ملا تھا، زیرلب تبسم کے ساتھ اپنی اس تقریر کو ختم فرماتے اسی کے ساتھ یاد آتا ہے کہ مولویوں کو مرغوں سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے کہ تم نے دیکھا ہوگا کسی جگہ سے مرغ کے کان میں دوسرے مرغ کے بانگ کی آواز آتی ہے تو فوراً اپنی گردن کھڑی کرلیتا ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

حقیقت تو یہ ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کمالات کی نمائش گاہوں کے ان ٹیلوں، یا دید بانوں کی تلاش و جستجو میں بے چارے مولویوں کی سرگردانیوں اور سراسیمگیوں کے یہ ابتدائی ایام بڑے دردناک، زہرہ گداز ہوتے ہیں، قرآت وخطابت درآست تقریر و تحریر از یں قبیل مولویانہ کمالات کی حقیقی نمائش گاہیں ہیں، ان میں سے کسی ایک بلند ٹیلے، دید بان تک پہونچنے میں غریبوں کو جن ہفتخوانوں سے گذرنا پڑتا ہے، چڑھنے اور اترنے کا یہ تماشہ قابل دید ہوتا ہے، ہانپتے کانپتے چڑھ جانے میں جنھیں کامیابی بھی ہوتی ہے، ان بے چاروں کو بھی مدت تک اسی انتظار میں گذارنا پڑتا ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ کیا ان کے اردگرد اکھٹا ہوتا ہے، ان دنوں میں عوام کی بے رخیوں اور اپنی کس مپرسیوں کے احساس سے جب یہ جھنجلاتے اور زمانہ کی سفلہ پروریوں کے چرچوں سے آسمانوں کو سر پر اٹھائے پھرتے ہیں تو یہ تماشا بڑا دلچسپ اور قابل دید ہوتا ہے دیکھنے کی حد تک تو یہ بہت کچھ ہے، لیکن "علی نفسه بصیرة" کی قرآنی روشنی میں سوچنے والے اگر سوچیں گے، تو عام حالات میں ان پر یہی ہویدا ہوگا کہ سب کی خدائی اگر ممکن نہ ہو، تو چند ہی کے خدا بننے کا موقعہ مل جائے، محمود کل نہ بن سکتے ہوں تو بعض ہی کی محمودیت میسر آجائے، ان ساری سرگردانیوں کی تہ میں نفس کے اس شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری مطالبہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور جو کوا بن کر پیدا ہوا ہے، ہنس بننے کی اس کی کوشش اس کے سامنے ان ہی درماندگیوں اور قلبی رسوائیوں کو لائے گی، پھر جو بندہ بنا کر پیدا

(بقیہ صفحہ ۴۴۴) اور پہلے کچھ دھیمی دھیمی آوازوں میں برہمی کو ظاہر کرتے ہوئے پھر خود بھی اسی مرغ کی طرح چیخنے لگتا ہے، کہتے کہ اب پرانے مرغوں کی جگہ نئے مرغوں کو روانہ کیا جاتا ہے، یہی دیکھنا ہے کہ کون کتنے بلند ٹیلے پر چڑھ کر بازو پھڑپھڑا کر اپنی آواز سے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، حضرت شاہ صاحب کی بلیغ تشبیہ کے ساتھ یہ تبلیغ کافی اثر انداز ہوتی تھی، اور جیسے مولویوں کی ضیافت مرغوں والی اس تشبیہ سے فرمائی جاتی تھی اسی طرح عام اہل دنیا کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے "جانتے ہو یہ دنیا کیا ہے" خود جواب دیتے کہ میں نے اس کا نام "گدھا خانہ" رکھ چھوڑا ہے، چند گدھے جب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو ایک ان میں دوسرے پر دولتیاں جھاڑتا ہے، اور دوسرا اس پر دانتوں کو نکال کر دوڑتا ہے، یہی حال باہم دنیا والوں کا نظر آتا ہے، اپنی اس تشبیہ کی تفصیلات کو بھی دیر تک بیان کرتے۔ ۱۲

کیا گیا ہے اگر خدا بننے کا جنون اس پر سوار ہو جائے، اور اپنے اس غیر طبعی اور قطعاً غیر فطری خواہش کے ہاتھوں ان الجھنوں میں مبتلا ہونا پڑے، تو غیر طبعی تقاضوں کی تکمیل کی ہر کوشش کوشش کرنے والے کے سامنے ہمیشہ اسی انجام کو لاتی رہی ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر وہبی خداداد ودیعتوں کے ساتھ پیدا ہی ہوئے تھے، ایک جامع الکمالات استاذ کی مشفقانہ تعلیم کی اکتسابی کمالات کا وارث ان کو بنادیا تھا، ملک میں کمالاتی نمائش گاہوں کے ٹیلوں کی کمی نہ تھی، جس ٹیلے پر بھی چڑھنا چاہتے، بآسانی چڑھ سکتے تھے لیکن ان کی بڑائی کا راز ہی یہ تھا کہ ان چھوٹے، اور چھچھورے کاموں کی طرف ان کی توجہ ہی نہیں ہوئی، واقعات وشواہد کا کافی حصہ آپ کے سامنے گذر چکا، ان کی روشنی میں جو کچھ وہ مجھے نظر آئے، ہیں دوسروں کو بھی اسی روشنی میں کیا وہ اور کچھ دکھائی دے سکتے ہیں؟ سب ہانپ رہے تھے، کانپ رہے تھے، اس لئے ہانپ اور کانپ رہے تھے کہ قدرت نے ان کو بندہ بنا کر پیدا کیا تھا، لیکن وہ بندہ بنے رہنے پر راضی نہ تھے، پر جو بندہ ہی بنے رہنے پر راضی تھا، اس کے سامنے نہ نمائش گاہیں تھیں، نہ ان نمائش گاہوں کے ٹیلے اور دیدبان، سامنے کوئی ٹیلہ یا دیدبان آ بھی جاتا، تو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا، کہ یہ کیا ہے، اور کام لینے والے ان سے کیا کام لیتے ہیں۔

طبعی مقام سے جب ہڈی سرک جاتی ہے، تو وہی وبال جان بن جاتی ہے، لیکن قدرت نے جس ہڈی کو جس مقام پر جمایا ہے، جب تک وہ اسی جگہ پر جمی ہوئی ہے، کیا اس سے بھی کسی میں کبھی کوئی خلش پیدا ہوئی ہے؟

مدرسوں میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں، اور ان کے پڑھنے سے پڑھنے والوں میں جو امتیازات پیدا ہوتے ہیں، ان کا حال تو آپ سن چکے، باقی وہ لاہوتی سرمایہ جس سے آپ کا باطن مالامال تھا، اپنوں کی کیا براہ راست ان کے پیر و مرشد ہی کی یہ گواہی گذر چکی کہ

"ایسے لوگ کبھی پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے اب مدتوں سے نہیں ہوتے"

(قدیم سوانح عمری)

"کمسنی میں ولایت" کی شہادت، وقت کے قطب الہند حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن رحمۃ اللہ علیہ جس کے متعلق دے رہے ہوں، کون کہہ سکتا ہے کہ باطن کی ان راہوں سے کیا کیا سرفرازیاں ہوئی تھیں مگر سننے، اس راہ کے کمالات کے ظہور کا جو عام ذریعہ ہے، یعنی حلقہ بیعت وارادت میں داخل کرکے لوگوں کو مرید کرنا، مصنف امام اسی کے متعلق فرماتے ہیں کہ

.. مولانا (محمد قاسم صاحب) باوجود اجازت حضرت صاحب مخدوم ومکرم وقبلہ ایک زمانہ تک کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے" (ص۲۴ قدیم سوانح عمری)

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرید کرنے یا کسی کو اپنی بیعت میں لینے سے انکار پر اصرار کا زمانہ کافی دراز تھا، لوگ مرید ہونا چاہتے تھے اور خشک جواب پاکر مایوس ہو جاتے تھے، انتہا یہ ہے کہ اپنی خادم خاص اور دنیاوی معاملات میں حضرت کے گھر کے گویا جو داروغہ اور مختار کل تھے، یعنی دیوان حاجی محمد یٰسین مرحوم ان کے متعلق حضرت کے نورچشم مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم یہ لطیفہ بیان کیا کرتی تھے کہ دیوان جی نے جب بیعت ہو جانے کی آرزو ظاہر کی، تو غریب کو حکم دیا گیا کہ جاؤ مولانا گنگوہی سے مرید ہو جاؤ، دیوان حاجی یٰسین اسی وقت اٹھے اور گنگوہ پہونچ کر مولانا گنگوہی سے بیعت کرلی، مرید ہوکر سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کرنے لگے کہ اب تو میری بیعت لے لیجئے، اور اپنا مرید مجھے بنا لیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم تو مولوی رشید احمد صاحب سے مرید ہو چکے، پھر اب میں کیا مرید کروں، حاجی یٰسین نے عرض کیا کہ مولانا رشید احمد کی خدمت میں میری حاضری اور ان سے میری بیعت صرف آپ کے حکم کی تعمیل تھی ورنہ بیعت تو آپ ہی کے ہاتھ پر کروں گا، یہ تدبیر بھی ایسی تھی اور استقامت کا ایسا غیر معمولی رنگ تھا کہ حضرت والا نے مجبور ہوکر حاجی یٰسین کی بیعت لے لی (ص۱۸۶ ارواح)

اسی طرح ایک دوسرا لطیفہ اسی سلسلہ میں وہ ہے جس کا ذکر حضرت حکیم الامت تھانوی کیا کرتے تھے یہ دوسرا لطیفہ پہلے سے زیادہ دلچسپ ہے، قصص میں ہے حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

"مولانا نانوتوی کی خدمت میں ایک شخص شکر لے کر حاضر ہوئے، حاضرین میں وہ شکر تقسیم ہوگئی"

شکر پیش کرنے والے صاحب نے جب دیکھ لیا کہ اس کی لائی ہوئی شکر لوگوں میں تقسیم ہو چکی اور ہر ایک نے اپنا اپنا حصہ ختم بھی کر دیا۔ تب سیدنا الامام الکبیر سے وہی شکر والے صاحب عرض کرنے لگے کہ

"مجھے بیعت فرما لیا جائے"

حسب عادت انکار فرمایا، شاید عرض و انکار کا رد و بدل کچھ دیر ہوتا رہا، آخر میں شکر لانے والے صاحب نے کہا کہ

"خیر آپ میری بیعت نہیں لیتے، تو مت لیجئے، لیکن میری شکر واپس کر دیجئے"۔

حضرت نے حکم دیا کہ جتنی شکر یہ لائے تھے، اسی قدر واپس کر دی جائے۔ لطیفہ سننے کا یہی ہے کہ شکر لانے والے نے اصرار شروع کیا کہ

"میں تو اپنی لائی ہوئی شکر ہی لوں گا"۔

ظاہر ہے کہ ان کی لائی ہوئی شکر کو تو لوگ استعمال کر چکے تھے، اب حضرت حیران ہوئے اور فرمانے لگے کہ

"بھائی وہ تو صرف میں آگئی"۔

شکر والے صاحب نے کہا کہ کچھ بھی ہو یا تو میری لائی ہوئی شکر واپس کی جائے، ورنہ میری بیعت قبول فرمائی جائے۔

صورت حال ہی ایسی تھی کہ دوسری شق کے سوا یعنی بیعت قبول کر لینے کے سوا چارہ ہی کیا باقی تھا اور یوں شکر والے صاحب کو اپنی آرزو کے پوری کرنے کا مغتنم موقعہ مل گیا۔

شاید اس قسم کے غیر معمولی واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ تک بیعت نہ لینے پر اصرار کرنے کے بعد آخر میں حضرت والا کو اپنے طریقہ کار میں کچھ ترمیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا، خیال کیا جا سکتا ہے کہ جب بیعت کے تمنائیوں کا یہ حال ہو کہ وہ مذکورہ بالا شکر والے لطیفہ تک سے کام لینے لگیں تو آخر کہاں تک اپنے نیایش گروں کی نیاز مندیوں سے لاپروائی اختیار کی جاتی، مصنف امام

نے اسی خبر کے ساتھ کہ زمانہ تک بیعت نہ لیتے تھے۔ آخر میں جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"پھر آخر بہت تاکید کے بعد چند لوگ بیعت ہوئے" ص۴۴

واللہ اعلم بالصواب، یہ تاکید کن لوگوں کی طرف سے ہوئی، بظاہر خیال گذرتا ہے کہ غالباً بیعت سے انکار کی خبریں حضرت حاجی صاحب قبلہ تک مسلسل پہونچتی رہیں، اور یہ تاکید ان ہی کی طرف سے ہوئی ہو، یا ممکن ہے آپ کے رفیق الدنیا والآخرۃ حضرت گنگوہی کی طرف سے قدغن ہوئی ہو۔

ارواح ثلثہ میں ایک صاحب مولوی نظر محمد خاں کا یہ لطیفہ جو نقل کیا گیا ہے کہ خاں صاحب نے

"ایک پرچہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بغرض بیعت لکھ کر دیا"

حضرت نے اس پرچہ کو "جیب" میں رکھ لیا، یہ واقعہ نانوتہ کا ہے، اسی کے کچھ دن بعد حضرت گنگوہی نانوتہ تشریف لائے، مولوی نظر محمد خاں جن کا وطن نانوتہ کے متصل تھا، حضرت گنگوہی کی تشریف آوری کی خبر سن کر نانوتہ پہنچے، اور پھر ایک پرچہ میں لکھ کر حضرت گنگوہی سے بیعت کی درخواست پیش کی، پرچہ میں یہ بھی لکھدیا تھا کہ حضرت نانوتوی کی خدمت میں بھی بیعت کرنے کے لئے خاکسار نے اسی طرح لکھ کر معروضہ پیش کیا، لیکن کچھ جواب نہ دیا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مولوی نظر محمد خاں نے اس وقت پرچہ پیش کیا تھا، جب نماز ظہر کیلئے وضو فرمارہے تھے، خود مولوی نظر محمد خاں پرچہ دے کر کھڑے رہے، اور سامنے حضرت نانوتوی بھی وضو ہی کرنے کیلئے تشریف فرما تھے مولٰنا گنگوہی نے پرچہ کو پڑھ کر مسکراتے ہوئے مولوی نظر محمد خان سی کہا کہ

"ایسے گونگے پیر کو خط ہی کیوں دیا تھا جنھوں نے جواب نہ دیا"

اس فقرے پر مولٰنا نانوتوی بے اختیار ہنس پڑے اور خاں صاحب کو خطاب کر کے فرمایا کہ

"لو اب بولتے پیر کے پاس (خط تمہارا) آگیا، اب جواب مل جائیگا" ص۲۰۶

بہر حال تاکید کسی کی طرف سے ہوئی ہو، لیکن بیعت سے انکار پر اصرار باقی نہ رہا۔ لیکن پھر بھی بیعت عام کا دروازہ جیسا کہ دستور ہے کھول نہیں دیا گیا تھا، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ چند ہی گنے چنے خوش

قسمتوں کو اس سعادت سے بہرہ اندوزی کا موقعہ ملا

اور حضرت کے قرۃ العین مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم کی طرف منسوب کر کے مولانا طیب الحفید کے حوالہ سے یہ روایت جو درج کی گئی ہے

"حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ عموماً بیعت اپنے مرشد کی طرف سے کرتے تھے۔" ص۱۸۵

اس سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ معدودے چند افراد جن کی بیعت منظور فرمائی گئی تھی، ان میں بھی زیادہ تعداد ان ہی کی تھی جن کو گویا حضرت حاجی صاحب قبلہ ہی کی بیعت میں وکالۃً داخل فرمایا جاتا تھا معنے یہی ہوئے کہ مرید تو یہ لوگ حضرت حاجی صاحب قبلہ کے قرار دیئے جاتے تھے، اور حضرت والا نے اپنی حقیقت سفیر محض کی بنا رکھی تھی، البتہ محمد یٰسین صاحب مرحوم جیسے آدمی جن کا قصہ گذر چکا کہ سیدنا الامام الکبیر کے حکم کی تعمیل میں وہ گنگوہ پہنچکر مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو جانے کے بعد بھی مصر ہوئے کہ اب مجھے اپنا مرید بنا لیجئے، شاید اسی قسم کے غیر معمولی اصرار کرنیوالے جو بہرحال حضرت والا ہی کے مرید بننا چاہتے تھے اور سفیر محض والی بیعت پر راضی نہ ہوئے، ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجبور ہو گئے۔ حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

"چند ہی لوگ ایسے تھے جن کو براہ راست سیدنا الامام الکبیر نے اپنے سے بیعت فرمایا۔" ص۱۸۵

لیکن ان چند غریبوں کا انجام بھی کیا ہوا، مصنف امام رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھوں دیکھی بات ہے، انھوں نے بھی اس کی خبر دیتے ہوئے کہ چند آدمیوں کو حضرت والا کے براہ راست مرید بننے کا شرف حاصل ہوا، اور مرید ہی نہیں بلکہ وہی لکھتے ہیں کہ

"بہت سے ان میں (براہ راست مرید ہونے والوں میں) محنتی صاحب حال ہیں۔" ص۴۵

راہ و رسم منزل کے ایک باخبر باطنی البصیرت رکھنے والے بزرگ کی یہ شہادت ہے، اور گو انھوں نے تصریح نہیں کی لیکن کلام کا فحویٰ بتا رہا ہے کہ اپنی محنت اور محنت سے پیدا ہونے والے حال کی بنیاد پر کم از کم مصنف امام کے نزدیک یہ لوگ مستحق ہو چکے تھے کہ اجازت و خلافت کا افتخار بھی ان کو بخشا جائے،

لیکن ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ مریدی جس شخص کی انھوں نے اختیار کی تھی، جب خود ہی یہ فیصلہ کئے ہوئے تھا کہ مرید بنانے کا جائز استحقاق مجھے حاصل نہیں ہے تو مریدوں کو کیسے اجازت دے سکتا تھا کہ دوسروں کو اپنا مرید بنائیں۔ مصنف امام نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) نے کسی کو اجازت عطا نہیں فرمائی[1]" ص۴۱

دراصل یہ ایک تاریخی شہادت ہے، شاید ان کے اسی تحریری وثیقہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے سیدنا الامام الکبیر کے بعد آپ کی خلافت یا جانشینی کا دعویٰ نہیں کیا، اور کرنے والے بھلا اس کا دعوے بھی کرتے، تو کس لئے کرتے؟

حضرت حکیم الامت تھانوی اپنے استاذ مولٰنا محمد یعقوب (یعنی ہمارے مصنف امام) کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد قاسم جس حجرے میں (چھتہ کی مسجد) تشریف رکھتے تھے، اسی

"حجرے کے آگے ایک چٹائی بچھی رہتی تھی، جس پر کبھی جھاڑو نہیں ہوئی سیروں گرد پڑی ہوئی تھی[2]" (قصص) الہادی ماہ جمادی الثانی

---

[1] ممکن ہے کہ اجازت بھی خود اپنی طرف سے نہ دیتے ہوں جیساکہ بعیت میں بھی اپنے کو سفیر محض کے طور پر رکھتے تھے اور اس بناء پر حضرت مصنف امام نے عمومی طور پر اجازت و خلافت عطا کرنیکی نفی فرمادی ہو، ورنہ بعض حضرات کو اجازت و خلافت دینا ثابت ہے حضرت مولانا حکیم صدیق احمد صاحب مرادآبادی محلہ بغیا حضرت کے مشہور مجازین میں سے تھے جو مسلم طور پر اہل کمال سمجھے جاتے تھے نیز ابھی حال میں سفر حیدرآباد کے موقعہ پر مولانا حکیم مقصود علیخاں عرف ابن مولانا حکیم منصور علیخاں صاحب مرادآبادی نے ایک بزرگ کا مجھ سے یہ کہکر تعارف کرایا کہ ان کے والد ماجد حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے مجازین میں تھے۔ "محمد طیب"

[2] اس موقعہ پر حکیم الامت یہ اضافہ بھی فرماتے کہ وہاں عقلاً کیوں جھاڑو ہوتی، جن کا مذاق یہ تھا کہ مولٰنا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ جو مسجد میں دبا دبا کر جھاڑو دیتے ہیں، تو ہمیں بھلا نہیں معلوم ہوتا اتنا تو کرے کہ خدا کے سامنے خاکساری کی شکل تو بنالے وہ سجدہ ہی کیا ہوا جس میں ماتھے اور ناک میں مٹی نہ بھرے" ص شاید بخاری کی وہ مشہور حدیث لوگوں کو اس موقعہ پر قدرۃً یاد آجائے گی جس میں صحابی کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے فرش زمین پر سجدہ کرتے ہوئے دیکھا جس کی مٹی ناک اور پیشانی مبارک پر لگی ہوئی تھی۔ سیدنا عمر الفاروق نے بھی وفات سے کچھ دیر پہلے حکم دیا کہ پلنگ سے زمین پر ان کو ڈال دیا جائے پوچھنے والے نے وجہ پوچھی فرمایا کہ شاید میرے خاک آلود چہرے اور بال ہی پر ارحم الراحمین کو رحم آجائے۔ دیکھئے طبقات ابن سعد وغیرہ میں تفصیلات ۱۲

یہ حال تو باہر کا تھا، اندر کے سازو سامان کی روئداد بھی حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنئے

"ہمارے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس کپڑوں کی گٹھری نہ تھی نہ ٹرنک، بکس تھا"

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے بھی ارواح ثلثہ میں یہ روایت درج کی گئی ہے، اپنے حضرت الاستاذ کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگے۔

"اس منقطع عن الخلق، اور زاہد فی الدنیا ذات (حضرت قاسم العلوم) کے حجرے میں کچھ بھی تو نظر نہ آتا تھا۔ چٹائی بھی اگر ایک تھی تو وہ ٹوٹی ہوئی، گویا عمر بھر کے لئے اسی چٹائی کو منتخب فرما لیا تھا، نہ کوئی صندوق تھا، نہ کبھی کپڑوں کی گٹھری بندھی تھی"۔

یہ حضرت کے سازو سامان کا رنگ تھا اور بے سنگ و میل والے سفر کا حال بھی شیخ الہند ہی کی زبانی سنئے فرماتے ہیں کہ سفر میں بھی

"کوئی اہتمام نہ تھا، اگر کبھی ایک آدھ کپڑا ہوا تو کسی کے پاس رکھوا دیا ورنہ اسی ایک جوڑے میں سفر پورا ہوتا، جو حضر میں پہنے ہوتے، البتہ ایک نیلی لنگی ساتھ رہتی تھی، جب کپڑے زیادہ میلے ہوگئے تو لنگی باندھ کر کپڑے اتار لئے اور خود ہی دھو لئے"۔

حضرت شیخ الہند اسی کے بعد یہ فرماتے ہوئے کہ "اور وہ لباس کیا تھا؟" یعنی سفر و حضر میں جو جسم مبارک پر رہتا، پھر خود ہی اس کی فہرست بتاتے کہ

"بغیر کرتے کے بندوں دار، اچکن (یا انگرکھا) اور پاجامہ، سردی ہوئی تو مختصر سا عمامہ ورنہ عموماً کنٹوپ تمام سردی میں سر پر رہتا تھا[1]" صـ۱۴۶

[1] امیر شاہ خاں مرحوم نے براہ راست خاکسار کو یہ قصہ سنایا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ نہ اچکن ہے اور نہ انگرکھا نہ مرزئی۔ اپنا حال کسی سے بیان نہ کرتے کھلے بدن باہر آجاتے اور رینٹ کی لمبی سرخی پیٹھ پر لگا لیتے، دیکھنے والے سمجھتے کہ شاید پھوڑے پر مرہم لگا ہوا ہے اور اسی لئے بدن پر کپڑے نہیں ہیں۔ حالانکہ درحقیقت حضرت کے پاس کپڑے اس وقت ہوتے تھے ۱۲

اور تاب نظر ہو، تو اس لباس پر بھی ہلکی سی نگاہ ڈالتے چلئے جسے اتار کر شاید پہنانے والوں نے دنیا کا آخری جوڑا (کفن) پہنایا تھا، امیر شاہ خاں راوی ہیں کہ آخری علالت کے دوران میں جس کے بعد پھر صحت واپس نہ ہوئی۔

"سر پر میلا اور پھٹا ہوا عمامہ تھا، جس میں لہرے پڑے ہوئے تھے، اور چونکہ سردی کا زمانہ تھا، اس لئے ایک دھوتر کی نیلی رنگی ہوئی، مرزئی پہنے ہوئے تھے، جس میں بند لگے ہوئے تھے اور نیچے نہ کرتا تھا اور نہ انگرکھا تھا[1]، اور ایک رضائی اوڑھے ہوئے تھے، جو نیلی رنگی ہوئی اور جس میں مومی گوٹ لگی ہوئی تھی، جو پھٹی ہوئی تھی، اور کہنہ تھی، اور کہیں سے بالکل اڑی ہوئی تھی۔" ص۱۶۲

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت آپ یہ سن چکے کہ میلے ہو جانے کے بعد لنگی باندھ کر حضرت والا اپنے میلے کپڑوں کو خود دھولیا کرتے تھے، دھونے کے ساتھ اسی نیلی لنگی کے سکھانے کا جو تماشا مولنا احمد حسن امروہوی نے دیکھا تھا، آپ بھی دیکھ لیجئے، فرماتے تھے کہ شاہجہانپور نے "خداشناسی والے میلہ" تک جانے کے لئے راستہ میں ایک ندی پڑتی تھی، مولنا پیدل جا رہے تھے، ندی میں پانی تھا۔

"پاجامہ پہنے ہوئے دریا میں اتر پڑے جس سے پاجامہ بھیگ گیا"

پار اتر کر وہی فرماتے ہیں،

"لنگی باندھی، اور پاجامہ اتار کر نچوڑ کر اور پیچھے لاٹھی پر ڈال کر جیسے گاؤں کے رہنے والے ڈال لیا کرتے ہیں، تشریف لے چلے" ص۲۰۵

خلاصہ یہ ہے کہ ظاہری علوم و فنون کے آثار و لوازم کے ساتھ جو برتاؤ آپ کا تھا، بے گانگی اور

---

[1] مولنا منصور علی خاں حیدر آبادی نے لکھا ہے کہ پاجامہ ڈھیلا (یعنی چوڑے پائنچوں کا)، دوکلیہ یعنی دو پلتے والی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ ۱۲

بے تعلقی کا یہی سلوک مسلسل ان نشانیوں اور علامتوں کے ساتھ زندگی بھر کرتے رہے، جن سے باطنی کمالات کے سرمایہ داروں کو پہچانا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فرائض وواجبات میں تو خیر مجبوری تھی لیکن حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو یہ فرمایا کرتے تھے کہ

"مولانا محمد قاسم کے پاس کوئی بیٹھا ہوا ہوتا، تو اشراق وچاشت بھی قضا کر دیتے تھے[۱]"

(قصص الهادی ماه ذی قعده ۵۷ھ)

اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عام صوفیانہ مشاغل ورسوم کے ساتھ آپ کے طرزِ عمل کی نوعیت اس باب میں کیا ہوگی۔ کیونکہ کچھ بھی ہو، مذکورہ بالا نمازوں کی مسنونیت صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ لیکن جلوت کی صحبتوں میں جس کا مذاق یہ تھا کہ وہ ان کو بھی چھوڑ دیتا تھا یا چھوڑ سکتا تھا، ثبوت

---

[۱] نوافل کی یہ قضاء عبادات سے بے اعتنائی کے سبب سے نہ تھی بلکہ ان فانی فی اللہ حضرات کا دوستوں سے ملنا اور بات چیت کرنا عبادت اور بنیت عبادت ہوتا ہے وہ نوافل سے خدمت کی طرف جھک کر ایک عبادت کر دوسری عبادت کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں خصوصاً نفلی عبادت جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احیانا ترک کے ساتھ ادا فرمایا ہے اور اسی لئے وہ نفل وتطوع کہلائی پس یہ ترک بھی ایک حد تک اتباع سنت کی شان آجانے سے عبادۃ ہی تھا۔ اس لئے یہ عادۃ سے عبادت کی طرف انتقال بھی عین عبادت ہی تھا، اور پھر یہاں قضاء کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ بھی ترک محض نہ تھا ممکن ہے کہ دوسرے اوقات میں ان معمولات کو پورا فرما لیتے ہوں جیسا کہ تطوعات میں بھی اہل اللہ کی شان مداومت ہی کی ہوتی ہے۔ اسی مقام پر پوری دنیا ان کے حق میں عین دین ہو جاتی ہے۔ آخر ابراہیم علیہ السلام کے حق میں صلوۃ ونسک کے ساتھ محیای ومماتی للہ ہی کو تو اسلام کہا جاتا ہے، میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس سال میں نے حج کیا، مکہ مکرمہ میں ہیضہ بکثرت پھیلا اور میرے عام رفقاء ہیضہ کے شکار ہو گئے۔ بعضے چل بسے بعضے زندہ رہ گئے میں صبح سے شام تک ان کی تیمارداری میں مصروف رہتا، میں نے اپنے پیر ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ سے عرض کیا کہ حضرت اس بیماری کے قصہ میں ہمارا تو نہ حج رہا نہ طواف وسعی۔ حضرت نے دانتوں میں انگلی دبا کر فرمایا کہ بیٹا کیا خدمت خلق حج سے کچھ کم ہے ہرگز اس کا وسوسہ مت لانا، یہ حج سے بڑھ کر حج ہو رہا ہے۔ مجھے خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مکہ مکرمہ میں میں نے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ حضرت ہم لوگ آپ کا وقت بہت سا لے لیتے ہیں اور حضرت کے معمولات میں حارج ہو جاتے ہیں۔ فرمایا کہ بھائی دوستوں سے ملنا اور باتیں کرنا بھی تو عبادت ہی ہے۔ اس لئے عرفی عبادت سے اس غیر عرفی عبادت کی طرف آنا اور عادت کو بھی عبادت بنا لینا ان اہل اللہ کا عام معمول رہا ہے۔ اسی کے تحت حضرت والا کے اس حال کو سمجھ لینا چاہئے جو ان کے مقام کا تقاضا تھا۔ "محمد طیب غفرلہ"

ہیں جن امور کا درجہ ان سے فروتر ہے، ان کے ترک میں اس کی جراتوں کا جو حال ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

سیدنا الامام الکبیر کے تلمیذ سعید مولٰنا منصور علی خاں صاحب نے اپنی کتاب مذہب منصور میں آپ کے عام عادات اور طریقہ کار کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"سب کے آگے نہیں چلتے تھے۔ برابر ملے جلے رہتے تھے"

لکھا ہے کہ اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ

"باہر کا آنے والا اوّل ان سے مصافحہ نہیں کرتا تھا"

اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ پہچاننے والوں کے لئے شناخت کی کوئی علامت اپنی پاس حضرت والا چاہتے تھے کہ باقی نہ رہے، اسی سلسلہ میں مولٰنا منصور علی خاں مرحوم حیدرآبادی نے جو یہ لکھا ہے کہ

"مولٰنا صاحب کو چھتری لگانے سے نہایت کراہت تھی" ص۱۹۵

بلکہ مصنف امام نے اسی کی ساتھ جو یہ خبر دی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ

"ہمیشہ جب تک قوت تھی کبھی سواری کی طرف رخ نہ تھا" ص۱۷

اور طویل مسافتوں کو پیادہ پا طے کرنے کے عادی تھے، ان التزامات میں علاوہ دوسری مصلحتوں کے شاید ایک حکمت یہ بھی ہو کہ عوام کے مقابلہ میں خواص کو نمایاں کرنے کے لئے لوگ ان ہی ذرائع کو اختیار کرنے کے عموماً عادی ہیں، مجمع میں بزرگوں کو چھتری لگا کرلے چلنا یا خود پیدل چلنا اور بزرگوں کو اصرار کرکے سوار کرنا وغیرہ۔

واقعہ یہ ہے کہ جس شخص کے متعلق سنانے والے جب یہاں تک سناتے ہوں، مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"جن دنوں دہلی میں مولٰنا احمد علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کا کام حضرت والا انجام دیتے تھے، اس زمانہ میں یہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولوی کہہ کر پکارتے اور آپ بولتے نہیں،

کوئی نام لے کر پکارتا تو خوش ہوتے" ص۳۱

مولوی کے اضافہ کے بغیر نام نہ لینے پر مولویوں کو بگڑتے ہوئے تو فقیر نے بھی دیکھا ہے لیکن مولوی نہ کہنے پر خوش ہونا اور مولوی کہنے والوں سے رنجیدہ وکشیدہ ہونے کی شاید یہ اپنی آپ مثال ہو۔

اور اس سے بھی دل چسپ قصہ جامع مسجد دہلی کے سابق امام کے چچا مولوی امیر الدین صاحب کا امیر شاہ خاں بیان کیا کرتے تھے، کہتے تھے کہ مولوی امیر الدین کی مولانا سے بہت بے تکلفی تھی یہاں تک کہ،

"مولوی امیر الدین صاحب اُبے تبے کے ساتھ گفتگو کرتے تھے"

کسی نے ایک دفعہ مولوی امیر الدین صاحب کو ان کے اس طرز خطاب پر توجہ دلائی تو بیچارے نے اپنی معذوری پیش کرتے ہوئے کہا کہ

میں کیا کروں، اگر میں اس انداز سے گفتگو نہیں کرتا اور ادب سے کام لیتا ہوں، تو بولنا چھوڑ دیتا ہے۔" ص۱۶۶

لیکن جوں جوں کتمان کمالات میں آپ کی طرف سے زور دیا جا رہا تھا، اسی نسبت سے قانون قدرت جو کچھ چھپایا جا رہا تھا اسے کھولتا چلا جا رہا تھا۔ بالآخر حضر میں کتمان کا امکان جب باقی نہ رہا تو حضرت حکیم الامت کی روایت ہے کہ

"سفر میں اپنا نام کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے اور ساتھیوں کو بھی ممانعت تھی کہ کسی پر نام ظاہر نہ کریں۔"

اسم گرامی کی شہرت سرزمین ہند میں از قاف تا قاف ہو چکی تھی، نام سننے کے ساتھ میلہ لگ جاتا تھا، یہ بھی حکیم الامت ہی کا بیان ہے کہ

"اگر کوئی آپ سے پوچھتا کہ جناب کا نام کیا ہے تو فرماتے کہ خورشید حسین[1]"

---

[1] خورشید حسین تاریخی نام ہے جس کی رو سے حضرت کی عمر ۴۹ سال ہوتی ہے یعنی ۱۲۴۸ھ سن پیدائش نکلتا ہے اور ۱۲۹۷ھ سن وفات ۱۲ محمد طیب غفرلہ

اور وطن کے متعلق بھی توریہ سے کام لیتے۔ جس کا ذکر پہلے بھی کہیں آچکا ہے، یعنی بجائے نانوتہ کے الٰہ آباد نام سے اپنے مرزوبوم کو روشناس کراتے اور (بعد کو جاننے والوں سے فرمادیتے کہ ہر بستی اللہ ہی کی تو آبادکی ہوتی ہے، پھر نانوتہ الٰہ آباد نہیں تو اور کیا ہے، انتہا یہ ہے کہ جب شاہجہانپور کے میلہ میں اچانک شریک ہونے کا خیال پیدا ہوا، اور شرکت کے لئے تنہا روانہ ہو گئے اور آپ کے تلامذہ میں سے شیخ الہند اور مولانا احمد حسن امروہی آپ کی تلاش میں شاہجہانپور پہنچے، جہاں جہاں احتمال قیام کا تھا ڈھونڈھا نہ ملے تھک کر سرائے گئے۔ مولانا احمد حسن جو حضرت کے مذاق شناس تھے، جانتے تھے کہ ٹھہرنے والوں کے رجسٹر میں مشہور نام کبھی حضرت نے درج نہ کرایا ہوگا، اسی لئے جب سرائے پہنچے تو سرائے والے سے پوچھا کہ

"یہاں کوئی خورشید حسین بھی آئے ہیں"

وقت پر اُن کا ذہن منتقل ہوا، ورنہ "مولانا محمد قاسم" کے نام سے پوچھتے تو سرائے سے بھی ناکام ہی واپس ہونا پڑتا، فرماتے تھے کہ سرائے والے نے پتہ دیا کہ ہاں! اس نام کے ایک صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں، دیکھا تو

"ایک کوٹھری کے اندر مولانا تشریف رکھتے تھے"[۱] (ارواح ص۲۰۱)

واقعہ یہ ہے کہ خلوت و جلوت، طفولیت و ایام شباب، الغرض زندگی کی ہر ہر منزل کے دوامی رفیق حضرت مولانا محمد یعقوب ہمارے مصنف امام رحمۃ اللہ علیہ کی کھلی ہوئی واضح شہادت جب ان کی کتاب میں سیدنا الامام الکبیر کے متعلق ان الفاظ میں محفوظ ہے کہ

"تعظیم سے نہایت گھبراتے تھے، بے تکلف ہر کسی سے رہتے تھے" ص۲۱

[۱] بظاہر اس روایت میں کچھ خلط ہوا ہے۔ کیونکہ رسالہ میلہ خداشناسی میں شاہجہاں پور کے واقعات سفر و مباحثہ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ حضرت الامام اپنے ان مایہ ناز شاگردوں حضرت مولانا محمود حسن صاحب و حضرت مولانا احمد حسن امروہی وغیرہ اکٹھے ہی شاہجہانپور پہنچے ہیں۔ یہ روانگی دہلی سے عمل میں آئی اور ۶ رمئی کو شاہجہانپور پہنچ گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ رسالہ اسی زمانہ کی تالیف ہے جو قریب قریب مباحثہ کا زمانہ ہے اور ارواح ثلثہ کی روایت متأخر ہے جو چند وسائط سے منقول شدہ ہے۔ اس لئے صحیح روایت میلہ خداشناسی ہی کی سمجھنی چاہئے۔ (محمد طیب غفرلہ)

ایسی صورت میں سنانے والے اس قسم کے قصے جو سنایا کرتے تھے، مثلاً غریب اللہ دیا بیچارے کا قصہ ارواح ثلثہ، قصص الاکابر کے سوا سوانح مخطوطہ میں بھی جس کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس وقت سوانح مخطوطہ ہی سے ہم اس کو نقل کر رہے ہیں، دیوان حاجی محمد یٰسین جو حضرت کی خانگی زندگی کی خدمات انجام دیتے تھے، ان ہی کی روایت ہے۔

کہتے تھے کہ دیوبند میں ایک غریب آدمی الہ دیا نامی تھا، مومن برادری سے اس کا تعلق تھا، حضرت والا کا عقیدت مند تھا، ایک دن حاضر ہو کر عرض کیا کہ آج رات کا کھانا فقیر ہی کے گھر تناول فرمایا جائے، بخوشی اس غریب کی دعوت منظور کی گئی۔ اتفاق دیکھئے کہ مغرب سے کچھ پہلے بارش بھی ہونے لگی، اور غریب اللہ دیا کے ساتھ خدا جانے کیا صورت پیش آئی، کہ گھر والوں کو اس کی اطلاع بھی نہ دے سکا کہ آج مولانا کی میں نے دعوت کی ہے۔ شاید کسی کام میں مشغول ہوا، اور بھول گیا۔ لیکن جو نواب کلب علی خاں والی رامپور اور نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال کی تمنائے ملاقات کو ٹھکرا سکتا تھا۔ غریب اللہ دیا کی دعوت کا خیال اپنے دماغ سے کیسے نکال سکتا تھا، بارش تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لیتی تھی، مغرب کے بعد اللہ دیا کا حضرت انتظار فرماتے رہے، کہ آکر ساتھ لے جائے گا، لیکن رات گذرتی جا رہی تھی اور نہ اللہ دیا کا پتہ تھا، نہ اس کی طرف سے کسی دوسرے نمائندہ کا جو بلا کر ساتھ لے جاتا۔ یہیں سے سننے کی بات ہے، دیوان حاجی محمد یٰسین کہتے تھے کہ

"حضرت نے بہت انتظار کیا کہ کوئی بلانے آئے، مگر کوئی نہ آیا"

دیوان جی صاحب کہتے تھے کہ حضرت کے انتظار کی شدت اور بارش کی شدت کو دیکھ کر حاضرین میں سے بعضوں نے عرض کیا کہ اللہ دیا کے گھر سے ہم کھانا لا کر حاضر کریں۔ شاید ان بے چاروں کو خیال گذرا کہ حضرت والا کھانے کے انتظار میں بے چین ہیں، لیکن سب پر سکتہ طاری تھا جب دیکھا گیا کہ اس کالی پیلی برسات کی رات میں برستے ہوئے پانی کے نیچے اللہ دیا کے گھر پہنچنے کے ارادہ کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ کوئی کمل ہو، تو لاؤ، بیان کیا گیا ہے کہ جیسے

گاؤں والے کمل جوٹ باندھ لیتے ہیں، آپ نے کمل کا جوٹ باندھا، جوتیاں ہاتھ میں، اوپر سے بھی برس رہا ہے موسلادھار پانی اور نیچے بھی گلی کوچوں میں پانی ہی پانی، پانی کے سوا کچھ نہیں اور سیدنا الامام اسی ہیئت کذائی کے ساتھ غریب اللہ دیا کے گھر تک بہرحال پہنچ ہی کر رہے۔ اللہ دیا کو دعوت کا قصہ ہی یاد نہ تھا، دروازہ بند کئے گھر میں پڑا ہوا تھا کہ کنڈی کے کھٹکھٹانے کی آواز آئی، دروازہ کھولتا ہے، تو اپنی چوکھٹ پر اس کو پاتا ہے جس کی آستانہ بوسی کی آرزو میں بڑے بڑے والیانِ ملک تڑپتے تھے، حاجی محمد یٰسین مرحوم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو اپنے ساتھ چلنے کی بھی اجازت نہ دی، کہہ دیا گیا ہوگا کہ دعوت اس غریب نے صرف میری ہی کی ہے، اس لئے تنہا میں جاؤں گا، بہرحال بقول حاجی محمد یٰسین

"اندھیری رات، اوپر سے بارش، نیچے کیچڑ، کمل کا جوٹ باندھ جوتیاں ہاتھ میں تن تنہا اس کے (اللہ دیا کے) مکان پر تشریف لے گئے"

دعوت تم نے کی تھی، انتظار کرتے کرتے آخر میں خود آگیا، کچھ اسی قسم کے الفاظ نے غریب اللہ دیا کے ہوش اڑا دیئے، اب خیال آیا کہ میں نے یہ کیا کیا، حاجی صاحب کے الفاظ ہیں کہ

"اپنے سہو پر کمال نادم ہوا، اور حاضر ہو کر گڑگڑا کر عرض کرنے لگا کہ غلام سے قصور ہوا"

وہ گڑگڑا رہا تھا اور جس سے معذرت کی جارہی تھی، اس کی زبان پر بقول حاجی صاحب مرحوم یہ الفاظ جاری تھے کہ

"کچھ مضائقہ نہیں، غریب لوگوں کو محنت و مزدوری سے کب چھٹکارا ہوتا ہے اور میں تو تمہارے گھر کا آدمی ہوں جو کچھ حاضر ہے وہی لے آؤ"

غریب اللہ دیا کو دعوت اگر یاد بھی رہتی تو زیادہ سے زیادہ گیہوں کی روٹی پیش کرنے کی ہمت کر سکتا تھا، ما حضر اس کے گھر کا اس دن، ماش ہی کے آٹے کی روٹی اور ماش ہی کی صرف کالی دال تھی، حاجی صاحب کہتے تھے کہ

"ڈرتا ڈرتا، آپ کے سامنے وہی لے آیا"

اب آگے واقعہ کی رودُداد حاجی صاحب ہی کے الفاظ میں سنئے، کہتے تھے کہ

"آپ نے (سیدنا الامام الکبیر) نے اس کو (ماش کے آٹے کی روٹی اور ماش کی کالی دال کو) ایسی ہی رغبت سے تناول فرمایا جیسے کوئی پلاؤ قورمہ کو کھاتا ہے"

بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی، آگے وہی کہا کرتے تھے کہ

"جب حضرت اپنی معمولی غذا کھا چکے، اور ہاتھ کھینچا تو اس نے نہایت عاجزی سے عرض کیا کہ حضور آپ کے لائق تو نہیں، مگر کچھ اور بھی کھالیں، آپ نے اس کی دل داری کی وجہ سے اور چند لقمے تناول فرما کر ہاتھ کھینچا، اس سادہ لوح نے پھر عرض کیا کہ حضرت تھوڑا اور کھالیں، آپ نے باوجود سیری، چند لقمے اور تناول فرمائے"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ اس دعوت شیرازی یعنی ماش کی۔

"دال اور روٹی کی تعریف فرما کر اسی کیفیت سے واپس تشریف لائے" (سوانح مخطوطہ ص۲۶)

شاید اپنی دعوت کی تعریف ہی سے میاں اللہ دیا کی جرات بڑھتی چلی گئی، اور لطیف و نفیس غذاؤں کے متعلق جس کا حال یہ تھا جیسا کہ مولانا منصور علی خاں مرحوم حیدر آبادی لکھا ہے کہ

"خوراک ان کی (سیدنا الامام الکبیر) کی نہایت قلیل تھی، کبھی غذا کو حرص و رغبت کے ساتھ نہیں کھایا۔ چھوٹا لقمہ لیا کرتے تھے" ص۱۹۱

جیسا کہ چاہیئے تھا اللہ دیا کے اس اصرار بے جا کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس

"غذا ثقیل بلکہ اثقل سے آپ کو بہت تکلیف پیش آئی، تین دن تک کھانا نہ کھایا"

مگر اللہ دیا تو اللہ دیا حاجی یٰسین صاحب کہتے تھے کہ اپنی اس تکلیف کا حال حضرت نے

"کسی پر ظاہر نہ کیا" صـ

کہ غریب کا دل نہ دکھے، اسی لئے خود جو دکھ اٹھانے پر بخوشی تیار ہو جاتا ہو، اسی کے متعلق مولانا منصور علی خاں صاحب حیدر آبادی نے جو اپنی آپ بیتی یہ سنائی ہے، یعنی جن دنوں وہ نانوتہ میں پڑھنے کی غرض سے حضرت والا کی خدمت میں حاضر تھے، اسی زمانہ کا ایک قصہ جوان ہی کے ساتھ

گذرا تھا، بیان کرتے تھے کہ مہمانوں کی نگہداشت اُن کے خواب وخور کی نگرانی ان ہی کے سپرد تھی، ہوا یہ کہ

"ایک دن چند مہمان کھانے کے واسطے ہاتھ دھونے کو اٹھے اور دوسرے صاحب نے ان کے ہاتھ دھلادیئے، مگر ایک بڈھا مسکین شکستہ حال رہ گیا۔ اس کے کسی نے ہاتھ نہ دھلائے۔"

سیدنا الامام الکبیر اس تماشے کو دیکھ رہے تھے کہ بڈھے کو غریب ومسکین جان کر لوگوں کی توجہ اس کی طرف نہیں ہو رہی ہے، مولانا منصور علی خاں کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ

"بڈھا خود لوٹے کے واسطے جھکا ہی تھا"

کہ ان کے سامنے گویا ایک بجلی سی کوندگئی، دیکھتے ہیں کہ

مولانا صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے جھپٹ کر اس قدر جلد وہ لوٹا اٹھالیا کہ میں حیران رہ گیا، اور دونوں ہاتھوں سے نہایت ادب کے ساتھ لوٹا پکڑ کر اس بڈھے کے ہاتھ (سیدنا الامام الکبیر نے خود) دھلادیئے۔" ص۱۹۵

کچھ اسی نوعیت کے ایک واقعہ کا ذکر گلاؤٹھی کے رہنے والے مولوی حمید الدین صاحب نے اپنے ایک خط میں کیا ہے، سیدنا الامام الکبیر کے براہ راست مرید منشی سید رحیم الدین نے اس واقعہ کا ان سے تذکرہ کیا تھا کہ حضرت والا ایک دفعہ گلاؤٹھی (ضلع بلند شہر) وہاں کے لوگوں کی طلبی پر تشریف لے گئے، سید مہربان علی صاحب گلاؤٹھی کے نیک دیندار رئیس تھے، ان ہی کے یہاں مہمان تھے، سید صاحب نے حضرت والا کے اشارہ سے گلاؤٹھی میں عربی مدرسہ، اور جامع مسجد کی بنیاد ڈالی، یہ مدرسہ کسی زمانہ میں کافی مشہور تھا، بہر حال قصہ یہ ہوا کہ سید مہربان علی صاحب رئیس کے یہاں شب میں حضرت کا وعظ ہونے والا تھا، عصر کے وقت سید صاحب کی ڈیوڑھی پر کوئی سائل پہونچا، اور ملازمین کے منع کرنے پر بھی صدا لگاتا رہا، غصہ میں سید صاحب کے کسی ملازم نے سائل کو جھڑکا بھی اور ایک تھپڑ بھی رسید کیا جس پر روتے ہوئے سائل واپس

ہوگیا، اس واقعہ کی اطلاع کسی طرح حضرت والا تک پہنچی، لکھا ہے کہ سید صاحب سے تو کچھ نہ بولے، ملازم کو یہ کہتے ہوئے کہ "تم نے اس غریب کو کیوں مارا تم بھی دنیا میں ہمیشہ نہ رہو گے" عصر کی نماز کے بعد بجائے سید صاحب کے گھر آنے کے سیدنا الامام الکبیر غصہ میں جنگل کی طرف چلے گئے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے، سید صاحب کو اس حال کی جب خبر ملی، حیران تھے، کسی میں ہمت نہ تھی کہ حضرت سے کچھ عرض کرے، جلال کی کیفیت طاری تھی، آخر سید صاحب نے اس فقیر کو تلاش کر کے پانچ روپے دیئے اور کہا کہ میری طرف سے تو حضرت سے معذرت خواہ ہو، یہی کیا گیا تب راضی ہوئے، اور وعظ فرمایا۔

بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے غریبوں اور بے کسوں کی تحقیر حضرت والا کیلئے ناقابل برداشت تھی، حکیم الامت تھانوی ہمارے مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کو سبزی ترکاریاں دھنیہ پودینہ وغیرہ کی کاشت کا خاص شوق تھا، کسی زمیندار سے آپ نے کھاد کے لئے مینگنیوں کی فرمائش کی، زمیندار نے کسی رعیت کے سر پر لاد کر بھیجدیا، اس وقت سیدنا الامام الکبیر موجود تھے، مولانا یعقوب کہتے تھے کہ میں نے دیکھا غصہ میں بھرے ہوئے ہیں اور فرما رہے ہیں

"ضرور اس زمیندار نے زبردستی ظلماً اس بے چارے غریب شخص سے بیگار لی ہے"

(قصص ص۲۹)

اور اسی وقت حکم دیا کہ اس غریب کی مینگنیاں واپس کردی جائیں جس کی فوری تعمیل ہوئی

سچی بات تو یہی ہے کہ اپنی دکان کو اونچی کرنے کی فکر میں تڑپنے والے، اگر اونچی دکان والوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہوں، اور اپنی گردنوں کو بلند کرنے کی آرزو رکھنے والے گردن فرازوں کے گلی کوچوں کی خاک چھانتے پھرتے ہوں، تو جس تمنا کا گھاؤ اپنے اندر ان لوگوں نے پال رکھا ہے۔ اس گھاؤ کی خلش اور تپش کے یہ لازمی نتائج ہیں، دوسروں کی بڑائیوں میں قلم لگا کر یہ اپنی بڑائی کے پودے کو اونچا کرنا چاہتے ہیں، لیکن اپنی تعظیم و احترام کے مالیخولیا کو

ہمیشہ ہمیش کے لئے اپنے دماغ سے جو نکال باہر کر چکا ہو، اگر بجائے اونچوں کے اور بجائے بڑوں کے چھوٹوں ہی میں اس کا دل بہلتا ہو جنھیں کوئی نہیں پوچھتا ان ہی کے پوچھنے میں اسے لذت ملتی ہو، اور جن کس مپرسوں گروں پڑوں کے ملنے میں لوگ تکلف محسوس کرتے ہوں ان ہی سے بے تکلف ہو کر وہ ملتا جلتا ہو، تو آپ اس پر تعجب کیوں کرتے ہیں، چوٹ سے تو گھاؤ والے ڈرتے اور گھبراتے ہیں، لیکن جس نے اس گھاؤ کو پالا ہی نہیں وہ ہچکچائے کیوں، اور خود ساختہ مصنوعی احتیاطوں سے کام لینے پر آخر وہ کیوں مجبور ہو۔ سیدنا الامام الکبیر کی مجلس انس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ

"مولنا محمد قاسم صاحب کی مجلس میں ہنسی مذاق خوب ہوتا تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ مولنا ایک یار باش ہیں" ص۳۱ الہادی ۵۳ھ

سوانح مخطوطہ میں اسی "مجلس سعادت" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مجلس کے ایسے ارکان جو حضرت والا سے تلمذ یا ارادت کا تعلق رکھتے تھے ان تک کے ساتھ!

"اس طرح پیش آتے جیسے یاروں کے یار" مخطوطہ ص۲۶

اسی میں یہ بھی ہے کہ ان لوگوں تک کی (یعنی تلامذہ اور ارادت مندوں تک کی)

"ایسی تعظیم و توقیر فرماتے جیسے کوئی مرید یا شاگرد اپنے شیخ یا استاذ کی کرتا ہے"

اور التزام یہ تھا کہ

"ہر ایک کا پورا نام لیتے بلکہ اول میں میاں اور آخر میں صاحب بھی بڑھاتے"

اور یہ کہ ان میں سے کسی کے متعلق کبھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ

"یہ میرا مرید، اور یہ میرا شاگرد ہے، بلکہ میرا دوست، میرا مہربان، میرا عنایت فرما"

غالباً امیر شاہ خاں مرحوم ہی کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں حضرت والا کی اس حلاوت ریز شیرینی بیز مجلس کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ

"کوئی جلسہ مٹھائی سے خالی نہ ہوتا، اور اگر کہیں سے آئی ہوئی موجود نہ ہوتی تو خود

منگوا کر تقسیم فرماتے " صـ۲۰۲

اور گو بقول مولٰنا حکیم منصور علی خاں حیدر آبادی کہ اس مجلس مبارک میں تقسیم ہونے والی چیزوں میں خواہ میوہ ہو، یا شیرینی سب ہی کے متعلق حضرت والا کا دستور تھا کہ

"بقدر نمک چشی کے اس میں سے لیا کرتے، باقی سب کو دے دیا کرتے" صـ۱۹۲

لیکن باوجود اس کے " ہنسی اور مذاق " جس کی خبر حضرت تھانوی نے دی، اس کی نوعیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے، امیر شاہ خاں مرحوم ہی اس قصہ کے راوی ہیں کہ ایک دن مٹھائی کی تقسیم کا کام مولوی فاضل صاحب نامی ایک صاحب کے سپرد ہوا، تقسیم کرنے کے بعد بھی کچھ مٹھائی بچ کر رہ گئی۔ سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک پر جاری ہوا کہ " الفاضل للقاسم " (بچی ہوئی مٹھائی قاسم کی ہونی چاہیئے) مگر بے تکلفی کے اس ماحول کا اندازہ کیجئے کہ معاً سننے کے ساتھ مولوی فاضل صاحب بھی " الفاضل للفاضل والقاسم محروم[۱] " کے فقرے سے جواب دے کر اس بچی ہوئی مٹھائی پر اپنے حق کو قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کے الفاظ کہ " مولانا محمد قاسم کی مجلس میں ہنسی مذاق خوب ہوتا تھا" یہ اسی کی ایک مثال ہے، یہ مولوی فاضل صاحب حضرت والا کے خدام میں تھے، لیکن کسی کے کرم ہائے فراواں کی چھاؤں میں انبساط اور بے تکلفی کی ان حدود تک چڑھ کر پہونچ جاتے تھے۔ کسی موقعہ پر ذکر آچکا ہے کہ حماسہ وسبعہ معلقہ کے مشہور شارح، اور نٹیل کالج لاہور کے پرنسپل مولانا شبلی اور مولٰنا عبداللہ ٹونکی وغیرہم حضرات کے استاذ محترم مولٰنا فیض الحسن سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ جب حضرت والا کی مجلس انبساط وانشراح میں رونق افروز ہو جاتے تو جانبین سے لطائف وظرائف کا تبادلہ ہوتا، اور خوب ہوتا، ایک طرف مولانا فیض الحسن فرماتے کہ

"ابے جا گنوار کے لونڈے تجھے ان چیزوں (علوم) سے کیا واسطہ تو جا کر ہل جوت، کھیتی کر"

---

[۱] الفاضل للفاضل کا مطلب ہے کہ بچی ہوئی مٹھائی فاضل کی ہوئی۔ یہ لفظی تناسب سے فائدہ اٹھایا گیا باقی دوسرا فقرہ القاسم محروم یہ عربی زبان کا ایک عام محاورہ ہے کہ عموماً بانٹنے والا بے چارہ ہی حصہ سے محروم رہ جاتا ہے۔

مولانا فیض الحسن کا رنگ سانولا بھی تھا اور طول وعرض میں بھی جسم کو ترقی کا کافی موقعہ قدرت کی طرف سے ملا تھا، رنگ اور ڈیل ڈول کی ان ہی خصوصیتوں کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ان کو یہ جواب ملتا کہ

"خیر ایک بھینسا تو موجود ہے"

اور یہ تو گونہ غنیمت ہے، ایک اور لطیفہ کا ذکر اس موقعہ پر لوگ کیا کرتے ہیں، اگر وہ صحیح ہے، تو اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ شاید مولٰنا فیض الحسن کی ظرافت گدگدی پیدا کر کے تھوڑی دیر کے لئے حضرت والا کو بھی اتنا بے چین کر دیتی تھی کہ شاید روک نہیں سکتے تھے، میرا اشارہ ٹوٹی ہوئی ٹونٹیوں کے لوٹے کے لطیفے کی طرف ہے، کہتے ہیں کہ چھتہ کی مسجد میں مولٰنا فیض الحسن بھی اترے ہوئے تھے، استنجا کے لئے لوٹا تلاش کرنے لگے۔ جو لوٹا بھی ملتا اس کی ٹونٹی اتفاق سے دیکھتے کہ ٹوٹی ہوئی ہے، مزاج میں ان کے شاعری تو تھی ہی، جھنجھلا کر بولے کہ یہاں تو جو لوٹا بھی ہے سب مختون ہی مختون ہے، کچھ اس انداز سے مولٰنا نے فرمایا کہ سیدنا الامام الکبیر سے نہ رہا گیا اور بے ساختہ یہ فقرہ نکل گیا کہ

"پھر آپ کو تو بڑا استنجا نہیں کرنا ہے"[1]

اور مولٰنا فیض الحسن صاحب تو خیر آپ کے ہم عمر، ہم نوالہ وہم پیالہ بزرگ تھے، مرید بھی دونوں ایک ہی شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تھے، میں تو دیکھتا ہوں کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی دلداریاں سیدنا الامام الکبیر کی مجلس قدس میں جن شکلوں کے ساتھ کی جاتی تھیں اپنے وقار وعظمت کے محافظوں کے لئے تو شاید ان کا سننا بھی دشوار ہو۔ مولٰنا منصور علی خاں حیدر آبادی مرحوم بیان کیا کرتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر

---

[1] حضرت تھانوی نے اس روایت پر اپنی طرف سے ایک نوٹ کا اضافہ فرمایا ہے کہ عام طور پر اد باب ظرافت کا ذہن اس فقرے سے جس چیز کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اس کے سوا ایک سنجیدہ مطلب اس کا یہ بھی ہو سکتا ہو کہ بڑی ٹونٹی کے لوٹے سے پانی منظم شکل میں نہیں نکلتا اور بڑے استنجاء کے لئے شاید ناکافی ہو ۱۲۔

"بچوں سے بہت خوش طبعی کیا کرتے تھے"

مگر اس خوش طبعی میں بھی، ظرافت کے ساتھ ساتھ سمجھ بوجھ کی باتیں بھی شریک ہوتی تھیں، حکیم صاحب ہی نے ایک لطیفہ کا ذکر کیا ہے کہ:

"ایک بچے کو فرمایا کہ اس بیل کی دم سے اس کو باندھ دو"

لکھا ہے کہ "بچہ بگڑ گیا اور جھلا کر بولا کہ میں نہیں جاتا" تب بچے کی فہمائش ہونے لگی کہ

"بوجھ دونوں طرف برابر ہو جائے گا"

پھر بچے کو سمجھایا جاتا کہ دیکھ! بیل کے

"آگے سر اور گردن ہے، پیچھے تو لٹک جا" ص۱۹۶

یوں دونوں طرف کا وزن برابر ہو جائے گا'

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی یہ لکھ کر کہ "بچوں سے چھیڑ بھی فرماتے" یہ اطلاع دی ہے کہ

"خصوصاً مولانا مولوی محمد یعقوب صاحب کی ساری اولاد سے" ص۲۵

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مصنف امام کے بچوں کو شفقت و کرم عنایت و نوازش کا حصہ زیادہ عطا فرمایا جاتا تھا' مولٰنا محمد یعقوب صاحب کے بچوں میں ایک صاحبزادے جن کا نام جلال الدین تھا' امیر شاہ خاں صاحب اُن کا نام خصوصیت کے ساتھ لے کر یہ روایت بیان کیا کرتے تھے کہ

"جلال الدین صاحبزادہ مولٰنا محمد یعقوب جو اس وقت بالکل بچے تھے بڑی ہنسی کیا کرتے تھے، کبھی ٹوپی اتارتے، کبھی کمر بند کھول دیتے تھے" ص۲۰۳

اور حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے قصص الاکابر میں جو یہ اُطروفہ درج ہے کہ

ایک بچہ بڑے پیٹ والا سامنے سے (سیدنا الامام الکبیر) کے گذرا تو مسکرا کر فرمایا

"چلا پھالا، گرا بڑ جھالا"

حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

"یہ مولنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے شعر کا ٹکڑا ہے"

وہی یہ بھی فرماتے تھے کہ

"مولنا محمد یعقوب صاحب کا ایک لڑکا بڑے پیٹ کا تھا اس کے بارے میں (یہ شعر) فرمایا تھا" قصص الہادی ماہ جمادی الاول ۵۷ھ

واللہ اعلم بالصواب یہ وہی جلال الدین نامی مولنا کے صاحبزادے تھے، یا مولنا کے کسی دوسرے بچے کو یہ افتخار بخشا گیا تھا کہ خاص کر شعر ہی موزوں فرمادیا گیا تھا' اور جب وہ بچہ سامنے آتا تو زبان مبارک پر وہی شعر یا اس کا کوئی ٹکڑا جاری ہوجاتا' اور یہ بچے تو خیر برادری کے بچے اور شیخ زادوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ماسوا اس کے معصوم بچے تھے، مگر حضرت حکیم الامت تھانوی کی طرف قصص میں یہ روایت جو منسوب کی گئی، کہ دارالعلوم دیوبند کی طالب العلمی کے دنوں میں آموں کی دعوت طلبہ کی ہوئی اس دعوت میں مولنا تھانوی خود بھی شریک تھے فرماتے تھے کہ طلبہ باہم ایک دوسرے پر رس نچوڑنے لگے اور گٹھلیوں چھلکوں سے ایک دوسرے نے حملہ شروع کردیا عام اساتذہ تو ہٹ گئے، لیکن مولنا محمد قاسم صاحب طالب العلموں کے ساتھ تماشا دیکھتے رہے۔ الہادی ماہ رجب ۵۷ھ

ارواح ثلثہ میں روایت پائی جاتی ہے لکھا ہے کہ ایک پہلوان کشتی گیر، جس کا نام نبو تھا'

"دیوبند کا رہنے والا تھا"

اس شخص کے نام اور کام دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عامی آدمی تھا لیکن سنئے، بیان کیا گیا ہے کہ دیوبند کے اسی مقامی پہلوان نبو نے

"باہر کے کسی پہلوان کو پچھاڑ دیا"

اس خبر سے دیوبند کے باشندوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی' اور دوسروں کے ساتھ صرف یہی نہیں کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بڑی خوشی ہوئی"

بلکہ راوی کا بیان ہے کہ فرط مسرت سے سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا کہ

"ہم بھی نبّو کو اور اس کے کرتب کو دیکھیں گے"

اور بات خیال ہی کی حد تک محدود نہ رہی بلکہ

"حافظ انوار الحق کی بیٹھک میں اسے (نبّو پہلوان) کو بلایا گیا"

اس بیٹھک کے سامنے کوئی میدان تھا جس سے اکھاڑہ کا کام لیا گیا' اور نبّو پہلوان نے اسی میدان میں کشتی گیری کے کمالات کا مظاہرہ شروع کیا' اور جس کا خیال بھی اس زمانہ کے علمی غرور کیلئے ناقابل برداشت تھا' اسی غریب نبّو پہلوان کے

سب کرتب (سیدنا الامام الکبیر نے) دیکھے" ص۲۰۲

اور سچ تو یہ ہے کہ حال جس کا بقول صاحب سوانح مخطوطہ یہ ہو کہ

"دہلی میں مولانا (محمد قاسم) کا ایک ادنیٰ عامی شخص مہمان ہوا'

اور بپاس ادب اپنی حقہ نوشی کا اظہار نہ کیا"

معلوم ہوتا ہے کہ اس غریب کو ریاح کا عارضہ تھا' اور حقہ پینے سے فائدہ ہوتا تھا' رات کو حقہ پئے بغیر جو وہ سو رہا تو لکھا ہے کہ

"پچھلی رات کو اس کو نفخ ہوا' اور سخت تکلیف پیش آئی"

واللہ اعلم کیا صورت پیش آئی' کہ اس غریب حقہ باز کی بے چینیوں کو مولانا نے بھانپ لیا' اور بغیر کسی ہنگامہ کے راوی نے بیان کیا ہے کہ

"اسی وقت دبے دبے پاؤں جا کر مولانا (محمد قاسم) نے خود چلم بھری اور حقہ اٹھا کر اس کے (اس غریب آدمی) سامنے لائے"

ہاتھ میں حقہ تھا اور سنا جا رہا تھا' معذرت پیش کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر اسی حقہ پینے والے سے فرما رہے تھے کہ

"آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں فرمایا تھا کہ میں حقہ پیتا ہوں" ص۲۵

اسی کے ساتھ ہمیں مصنف امام کی اس اطلاع کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ سیدنا الامام الکبیر کو

جن چیزوں سے نفرت تھی ان میں حقّہ بھی تھا' اپنی کتاب میں انھوں نے لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کو حقّہ سے نفرت تھی" ص۳۵

مگر باوجود اس طبعی نفرت کے آپ دیکھ رہے ہیں کہ حقّہ کا انتظام ہی نہیں کر دیا گیا، بلکہ خود چلم بھر کر اس غریب آدمی کے سامنے آپ نے عذر کے ساتھ پیش کیا' اور حضرت مرشد تھانوی کے ملفوظات میں اس واقعہ کا جو ذکر کیا گیا ہے کہ

"ایک شخص، حضرت مولانا نانوتوی کی خدمت میں ایک چھینٹ کی ٹوپی لائے، اس میں شالباف کی گوٹ لگی ہوئی تھی' اور گوٹہ بھی ٹکا ہوا تھا"۔

یہ عجیب وغریب آدمی تھے کہ اس قسم کی ٹوپی کو پیش کرتے ہوئے بھری مجلس میں یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ حضرت والا اس ٹوپی کو استعمال فرمائیں۔ فرمائش اور عجیب فرمائش ؟ کسی اور دربار میں یہ صورت پیش آتی تو خدا ہی جانتا ہے بے چارے پر کیا مصیبت ٹوٹ پڑتی لیکن سنئے مرشد تھانوی فرماتے تھے کہ چھینٹ کی یہی گوٹہ لگی ہوئی شالباف کے گوٹ کی ٹوپی اسی مجلس میں

"مولانا نے سر پر رکھ لی"

ٹوپی سر مبارک پر تھی' اور زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے۔

"اس بیچارے کا دل خوش کرنے کیلئے میں نے (اسے) سر پر رکھ لی" (قصص الهادی جادی للادنیٰ ص۳۱)

اس کا بھی دل خوش ہوگیا' اور سامنے ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا' پھر اسی کو یہ ٹوپی ہبہ کردی گئی۔

اور اس سے بھی زیادہ دل دوز' عبرت آموز' سبق آفریں واقعہ وہ ہے جس کا تذکرہ امیر شاہ خاں مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ ارواح ثلاثہ میں بھی اس قصّہ کو شریک کیا گیا ہے، حاصل یہ ہے کہ منشی ممتاز علی مرحوم کے مطبع میں سیدنا الامام الکبیر تصحیح کی خدمت بہ مقام دہلی جس زمانہ میں انجام دیتے تھے' اسی زمانہ میں اسی مطبع میں ایک اور صاحب بھی ملازم تھے، جو حافظ جی حافظ جی کے نام سے مشہور تھے، نام کے تو حافظ جی تھے لیکن کام کے لحاظ سے ان کا حال یہ تھا کہ

"بالکل آزاد تھے، رندانہ وضع تھی چوڑی دار پائجامہ پہنتے تھے ڈاڑھی چڑھاتے تھے،

اور اسی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ

"نماز کبھی نہیں پڑھتے تھے"

مگر مطبع کی ملازمت میں خواجہ تاشی کا رشتہ سیدنا الامام الکبیر سے قائم ہوا اور روز بروز ترقی کرتے ہوئے یہی ربط اس درجہ تک پہونچ گیا کہ بقول امیر شاہ خاں صاحب

مولٰنا نانوتوی سے اور ان سے (حافظ جی سے) نہایت گہری دوستی تھی

اسی "گہری دوستی" کے مظاہر یہ تھے کہ

"وہ (حافظ جی) مولانا (محمد قاسم) کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے اور مولٰنا ان کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے، مولٰنا ان کو کنگھا کرتے اور وہ مولٰنا کے کنگھا کرتے"۔

خاں صاحب ہی کا بیان ہے کہ ان حافظ جی کا خیال سیدنا الامام الکبیر اس حد تک فرمایا کرتے تھے کہ

"کبھی مٹھائی وغیرہ اگر مولٰنا کے پاس آتی تو ان (حافظ جی) کا حصہ ضرور رکھتے تھے"

خاں صاحب مرحوم یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ

"مولٰنا کے مقدس دوست، مولٰنا کی ایک آزاد شخص کے ساتھ اس قسم کی دوستی سے ناخوش تھے، مگر وہ (سیدنا الامام الکبیر) اس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے" ص ۱۲۴

واللہ اعلم مقدس دوست سے مراد خاں صاحب کی کیا ہے، تاہم اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ دوسروں میں مولٰنا کے اس طرز عمل سے گرانی بھی پائی جاتی تھی لیکن وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ یہ سچ ہے جیسا کہ خاں صاحب نے آگے بیان کیا ہے کہ بالآخر یہ آزاد حافظ جی کی آزادی زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکی، ایک دن جب وہ اور مولٰنا تنہا تھے، کہا جاتا ہے کہ مولٰنا نے حافظ جی سے کہا کہ بھئی! ہماری دوستی کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ دونوں کا رنگ ایک ہی ہو، اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تمہاری وضع قطع کچھ اور ہو، اور تمہارے دوست کی کچھ اور، فرمایا کہ لاؤ میں ہی تمہارا رنگ اختیار کرتا ہوں، خانصاحب کی روایت ہے کہ حافظ جی بیچاروں کی

آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، اور اسی کے بعد پھر اپنے دوست کا ایسا پختہ رنگ اختیار کیا کہ پرہیزگار مسلمانوں کی وضع قطع بھی اختیار کر لی،

"اور اس روز سے پکے نمازی، اور نیک وضع بن گئے"[ملک۱]

ایسا اگر ہوا، تو نفسیات انسانی کا جو عام قانون ہے اس کا یہی مقتضا بھی تھا، آپ ناپاکوں کی تحقیر و توہین کر کے یقین مانئے ناپاکی کے ازالہ میں اتنا کامیاب نہیں ہو سکتے، حقیقی کامیابی اس تدبیر سے ہو سکتی ہے جس کا عملی نمونہ سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے طرز عمل کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

لیکن یہ خیال کہ حضرت والا کے اس طرزِ عمل میں ابتدا ہی سے یہ اصلاحی غرض پوشیدہ تھی، یعنی حافظ جی کو راہ راست پر لانے کے لئے قصداً و ارادةً ان کے ساتھ آپنے میل جول بڑھایا تھا، شاید یہ نکتہ بعد الوقوع ہی کی حیثیت رکھتا ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ آپکے فطری نہاد کا یہ اقتضا تھا اپنی مقدس پاکی کا خطرہ ہی جس کے قلب پر نہ گذرتا ہو وہ اپنے دامن کو بچانے کی فکر میں کیوں مبتلا ہوگا، آخر حافظ جی مرحوم کا یہ کوئی انفرادی واقعہ ہے، جو کچھ آپ اب تک سن چکے ان کی یاد کو بھی تازہ کیجئے۔ اور اسی کے ساتھ ملائیے، اس قسم کی روایتوں کو مثلاً وہی مولوی عبد السمیع مرحوم کا واقعہ جن سے مسئلہ میلاد" کے متعلق علماء دیوبند سے تحریری مناظروں کا بھی سلسلہ جاری تھا، اور غالباً تقریری مباحثے بھی ہو جاتے تھے۔ "براہین قاطعہ" وغیرہ اس سلسلہ کی مشہور کتابیں ہیں مگر حضرت حکیم الامت تھانوی کی روایت ہے، فرماتے تھے

"ایک صاحب نے میرٹھ میں مولانا سے دریافت کیا کہ مولوی عبد السمیع صاحب تو مولود شریف کرتے ہیں، آپ کیوں نہیں کرتے"؟

علماء دیوبند کی طرف سے اسی سوال کے جواب میں ہزارہا ہزار صفحات جس زمانہ میں شائع ہو رہے تھے، عین ان ہی دنوں میں جماعت کے امام کبیر کی زبان مبارک سے یہ جواب بھی سنا گیا تھا کہ

"بھائی! انہیں (مولوی عبد السمیع صاحب) کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ

"محبت معلوم ہوتی ہے، مجھے بھی اللہ تعالیٰ محبت نصیب کرے۔" [۲۱] (قصص الہادی فی الحج ۵۶ ص)

حضرت تھانوی یہ بھی فرماتے تھے، یہ جواب جب مولوی عبد السمیع کے کانوں تک کسی طرح پہنچ گیا، خود حکیم الامت سے کہنے لگے کہ

"ایسے سے بھلا کوئی کیا لڑے"

وہی واقعہ جس کا ذکر ارواح ثلاثہ میں بھی کیا گیا ہے، اور قصص الاکابر میں بھی حضرت تھانوی کی زبانی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ ایک صاحب جو طبقۂ مشائخ سے تعلق رکھتے تھے۔ علماء دیوبند نے جن امور کے بدعت ہونے کا فتویٰ دے رکھا تھا، ان میں وہ مبتلا تھے، لیکن سیدنا الامام الکبیر کی تعریف سن کر خدمت والا میں حاضر ہوئے، حضرت تھانوی کی روایت میں ہے کہ

"مولانا (محمد قاسم) نے نہایت عزت کے ساتھ ان کو مہمان بنایا"۔

اور بات اسی پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اسی کے ساتھ جیسا کہ حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

"سب طالب العلموں کو سمجھا دیا کہ خبردار کوئی گفتگو ان کے طریقہ کے خلاف نہ کی جائے کیونکہ مہمان کی دل شکنی نہ کرنی چاہئے" [لہ]

اسی موقعہ پر وہ صورت پیش آئی کہ حضرت گنگوہی تک آپ کے اس طرز عمل کی اطلاع پہونچائی گئی اور وہاں کی یہ تنقید کہ بدعتی کا اکرام کیوں جائز ہے، سیدنا الامام الکبیر کے سامنے نقل کرنیوالوں نے صرف نقل ہی نہیں کیا، بلکہ تنقید کا جو جواب دیا گیا تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو کافر مہمانوں کا بھی اکرام کرتے تھے، حضرت گنگوہی کو لوگوں نے جا کر سنایا۔ سن کر فرمایا کہ کافر کے اکرام میں

لہ حکیم الامت ہی کے حوالہ سے قصص الاکابر میں غالباً مزید اضافہ کے ساتھ یہی روایت دوسری جگہ بھی ملتی ہے، جس میں ہے کہ یہ صاحب ٹھسکہ کے رہنے والے تھے، حکیم الامت نے یہ بھی فرمایا کہ بدعات میں مبتلا ہونے کے باوجود خوبی ان میں یہ تھی کہ دکاندار نہ تھے یعنی دین فروخت کر کے دنیا کے خریدنے والے مشائخ میں نہ تھے، اسی میں ہے کہ حضرت نانوتوی نے رسم مشائخ کی پیروی کرتے ہوئے شاہ صاحب کی خدمت میں نذر بھی پیش کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ شاہ صاحب کی خاطر مدارات اپنے تلامذہ کے سپرد کر کے شاہ صاحب کے ساتھ جو بھنگی سائیں تھے ان کو خود کھانا کھلوایا، کہتے ہیں کہ چلتے ہوئے شاہ صاحب نے کہا کہ فقیر تو آپ ہیں ہم تو صرف نقال ہیں (قصص بحوالہ الہادی جادی الثانی ۵۶ھ)

غلط فہمی اور فساد کا احتمال نہیں برخلاف اس کے بدعتی کے اکرام میں اندیشہ ہے کہ خود بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو، یعنی سمجھنے لگے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، اسکی تصحیح کی گئی، اور دوسرے بھی چاہیں تو یہی غلط نتیجہ نکال سکتے ہیں، کہتے ہیں کہ جب حضرت نانوتوی کے سامنے حضرت گنگوہی کا یہ قول نقل کیا گیا، تو جو صاحب اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر پہونچا رہے تھے ان کو جیسا کہ حضرت تھانوی فرماتے تھے،

"مولانا (محمد قاسم) نے اس کو ڈانٹ دیا کہ یہ کیا واہیات ہے، ادھر کی اُدھر لگاتے پھرتے ہو، بیٹھو اپنا کام کرو" (قصص) بحوالہ الہادی ماہ جمادی الاول ۵۷ھ

حالانکہ چاہتے، تو اس کا جواب بھی دے سکتے تھے، لیکن خیال میں اختلاف رکھنے والوں کے احترام میں بھی کسی کوتاہی کو جس کا بے نفس دل برداشت نہیں کر سکتا تھا کیا اس میں حضرت گنگوہی جیسے ہم مشرب ہم عقیدہ ہم خیال ہم استاذ وہم رفیق الدنیا والآخرۃ کے مقابلہ کا خطرہ بھی گذر سکتا تھا، لوگ فتنہ پیدا کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے کہہ رہے ہیں، میرا تو دماغ چکرا جاتا ہے، جب امیر شاہ خاں مرحوم کی وہ بات یاد آتی ہے، جو مولنا فضل رسول بدایونی کے سلسلے میں وہی بیان کیا کرتے تھے، موجودہ نسلیں شاید مولوی صاحب کی خصوصیتوں سے ناواقف ہو چکی ہیں، بس اتنی بات سمجھ لیجئے، کہ آج دیوبندی علماء کہئے، یا ولی اللہی خانوادہ کے اہل علم کے نام سے ان کو موسوم کیجئے۔ اس طبقہ کے مقابلہ میں "بریلویوں" کی جو جماعت آستینیں چڑھا کر تقریباً ایک صدی سے کھڑی ہوئی ہے اور گفتنی ناگفتنی، کردنی ناکردنی الغرض جو کچھ سوچا بھی نہیں جا سکتا، ان سارے حرکات کا ارتکاب مسلسل کرتی چلی آ رہی ہے، یہ سارا قصہ درحقیقت بدایوں کے ان ہی مولوی فضل رسول صاحب پر منتہی ہوتا ہے، پہلی آستین ان ہی کی تھی، جو ولی اللہی تجدیدات و اصلاحات کے مقابلہ میں چڑھائی گئی۔

ولی اللہی خانوادے کے نیازمندوں میں مولوی فضل رسول صاحب کی جانب سے ایسی صورت

میں جس قسم کی گرانیاں پیدا ہو سکتی تھیں، قدرتاً وہ پیدا ہو گئی تھیں" امیر شاہ صاحب مرحوم اسی میدان کے ایک مرد خاص تھے، کہتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر خورجہ تشریف فرما تھے کسی مجلس میں مولوی فضل رسول صاحب بدایونی کا ذکر چھڑ گیا" آگے امیر شاہ مرحوم ہی کی زبان سے سنئے" ازواج ثلاثہ میں بھی یہ روایت ان کے حوالہ سے درج ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ

"میری زبان (یعنی امیر شاہ خاں کی زبان) سے بجائے فضل رسول (بضاد معجمہ) فصل رسول (بصاد مہملہ) نکل گیا"

گویا ایک نقطہ کو فضل کے لفظ سے ساقط کر کے امیر شاہ خاں صاحب مولوی صاحب کو ایک ایسی ہستی قرار دے رہے تھے۔ جو رسول کی امت کو رسول کی راہ اور سنت سے جدا کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہے، ظاہر ہے کہ تقریباً یہ وہی خیال تھا جو دیوبند کی جماعت مولوی صاحب کے متعلق رکھتی تھی، ان پر الزام ہی یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی جگہ بدعت کی ترویج سے دلچسپی رکھتے ہیں، شاید خان صاحب سمجھے ہوئے تھے، کہ ایک نقطہ کے رد و بدل سے جو نکتہ میں نے پیدا کیا ہے، وہ سیدنا الامام الکبیر کی خوشنودی کا باعث ہوگا لیکن بالکل خلاف توقع وہ سن رہے تھے کہ حضرت والا ان سے پوچھ رہے ہیں کہ

"لوگ ان کو (مولوی فضل رسول کو) کیا کہتے ہیں"

خاں صاحب نے عرض کیا کہ "فضل رسول کہتے ہیں" تب آپ نے فرمایا اور خان صاحب ہی کے الفاظ ہیں کہ ناخوش ہو کر فرمایا کہ

"تم فصل رسول کیوں کہتے ہو"

حوصلہ کی وسعت، نظر کی بلندی کی یہی وہ مثالیں ہیں، جن سے ہم سیدنا الامام الکبیر کے باطنی نفسیات کی خصوصیتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں، مخالف سے مخالف شخصیتوں کی ہلکی سی ہلکی تحقیر خواہ کنایوں اور اشاروں ہی میں کیوں نہ ہو آپ کے لئے ناقابل تحمل بن جاتی تھی، ادھر امیر شاہ خاں

صاحب جیسی محبوب ہستی کے ساتھ بھی اس معاملہ میں کسی قسم کی رواداری پر تیار نہ تھے۔ بھری مجلس میں وہ ٹوک دیئے گئے، اور ہمیشہ کے لئے ان کو سبق مل گیا۔

نظائر و امثال کو میں کہاں تک نقل کروں، وہی واقعہ کیا معمولی واقعہ ہے، جس کے راوی بھی یہی امیر شاہ خاں ہیں۔

میرٹھ میں حضرت والا کا قیام تھا، سارے شہر کے مرجع اور منظور نظر بنے ہوئے تھے امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ ایک مکان تھا، جس کے بالاخانہ پر حضرت مولنا محمد یعقوب ٹھہرے ہوئے تھے اور نچلی منزل حضرت والا کی فرودگاہ تھی، اسی مکان میں خاں صاحب کی روایت ہے کہ

"ایک رنڈی اپنی چھوکری کو جو سیانی تھی اپنے ہمراہ لائی"۔

اور ہمراہ لاکر اس نے کیا کیا؟ خاں صاحب کے الفاظ ہیں کہ

"اور مولنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ میری چھوکری ہے، مدت سے بیمار چلی جارہی ہے، میری اوقات بسر اسی پر ہے، آپ اسے تعویذ دیدیجئے یا دعا کر دیجئے"۔

پھر آگے کیا ہوا؟ چاہئے تو یہی تھا اور شاید لوگوں کو یہی سننے کی توقع بھی ہو گی کہ جھڑک کر وہ نکالدی گئی ہو گی، کم از کم اپنی علمی پوزیشن کی حفاظت ہی کے لئے سہی موقعہ اسی کا تھا کہ دھتکار کر باہر نکل جانے کا حکم اس کو دیا جاتا،

مگر امیر شاہ خاں مرحوم کی یہ اطلاع ہے کہ بجائے کچھ کہنے سننے کے (شاید ظرافۃً صرف یہ کیا) کہ بالاخانہ جس پر مولنا محمد یعقوب ٹھہرے ہوئے تھے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

"اوپر ایک بزرگ ہیں تم ان کے پاس جاؤ"

حسب الحکم وہ زینوں پر چڑھتے ہوئے اچانک مولنا محمد یعقوب صاحب کے سامنے جاکر کھڑی ہو گئی، اور اپنا معروضہ پیش کیا۔ لکھا ہے کہ بگڑتے ہوئے مولانا محمد یعقوب صاحب نیچے اتر آئے اور دریافت فرمانے لگے کہ اس عورت کو میرے پاس کس نے بھیجا تھا حضرت والا دم سادھے خاموش بیٹھے رہے، مولنا محمد یعقوب بھیجنے والے کو سخت و سست فرما رہے تھے اور مزے

لے کر حضرت سن رہے تھے۔[۱]

یہ، اور اس کے سوا کے بعد دیگرے شواہد و بینات کا طویل سلسلہ آپ کے سامنے جو پیش ہوچکا ہے، ان پھلوں کو دیکھ کر درخت کے پہچاننے میں شاید زیادہ دشواری باقی نہ رہی ہوگی؟

تاہم اس موقعہ پر یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکیم الامت کے لقب سے رفع ذکر کی سرفرازی جس ذات گرامی کو چودھویں صدی ہجری میں قدرت کی طرف سے حاصل ہوئی تھی، ان ہی کے کلمات طیبات میں اس سوال کا جو جواب ملتا ہے، سوچنے والوں کے لئے اسے ایک جگہ جمع کر کے رکھدوں،

قصص الاکابر میں ایک موقعہ پر اس کی تصریح فرماتے ہوئے کہ

مجھے مولنا گنگوہی کے ساتھ زیادہ عقیدت ہے[۲]، بہ نسبت مولنا محمد قاسم کے ان بعض

---

[۱] قصہ کا تکملہ یہ ہے کہ عورت بیمار لڑکی کے ساتھ واپس چلی گئی، اور کچھ دن بعد پھر واپس ہوئی، عرض کرنے لگی کہ آپ لوگوں کی توجہ سے لڑکی میری اچھی ہوگئی، کہتے ہیں کہ اپنے ساتھ کچھ مٹھائی بھی بطور شکرانے کے لائی تھی، رکھ کر چلی گئی مولنا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ حرام کی کمائی ہے، اسکا کھانا حرام ہے، صرف مسکینوں پر بطور خیرات کے تقسیم ہوسکتی ہے ۱۲

[۲] ایک موقعہ پر آپ ہی کی طرف قصص الاکابر میں یہ بیان بھی منسوب کیا گیا ہے کہ ذکر مولود شریف کی مجلسوں کا ہو رہا تھا مولنا اشرف علی صاحب نے فرمایا کہ حضرت مولنا محمد قاسم صاحب سے کسی نے مولود کے متعلق دریافت کیا، تو فرمایا کہ بھائی نہ اتنا برا ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں اور نہ اتنا اچھا ہے جتنا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے، سیدنا الامام الکبیر کے اس قول کو نقل کر کے حضرت تھانوی نے فرمایا کہ اس قدر جامع جواب ہے کہ ایک سالہ کا رسالہ اسکی شرح میں لکھا جا سکتا ہے، لیکن یہ گول جواب ہے، عوام نہیں سمجھ سکتے، ہر فریق اپنی تائید میں اسکو پیش کر سکتا ہے۔ پھر آگے یہ بھی مولنا تھانوی نے اضافہ فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کھلم کھلا کسی کو برا نہیں کہتے تھے، ایسے سوالات کے بہت نرم جواب دیتے تھے، پھر حضرت گنگوہی کی خصوصیت بیان کی کہ وہ بالکل صاف صاف کہتے تھے ایک ہی دفعہ میں چاہے، ٹھیرو، یا جاؤ، لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے، حضرت تھانوی نے اس کے بعد اپنے تغیر مذاق کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ پہلے میں بھی نرم جوابات کو پسند کرتا تھا، لیکن اب تجربہ کے بعد مولنا گنگوہی کا طرز نافع ثابت ہوا، نرم جواب میں یہ مصلحت سمجھی جاتی ہے کہ مخاطب کو وحشت نہ ہو، اور وہ ہم میں آجائے حالانکہ یہ غلط ہے وہ ہم میں نہیں آتے وہ تو اپنے ہی خیال کی بنا پر ہم میں آتے ہیں تو یہ در اصل آنا نہ ہوا، ہاں ہم ہی ادھر چلے گئے، وہ ہم میں نہیں رہے (بحوالہ حسن العزیز ص۱۷۱ ص۲۸۱ ج اول. ظاہر ہے کہ حکیم الامت کی بات حکیم الامت ہی کی بات ہے لیکن ایسے مسائل جن کے متعلق شریعت کے محکم و منصوص احکام موجود ہوں ان کے متعلق تو دو ٹوک الفاظ میں جواب دینا شریعت کی تقاضا ہی ہے لیکن جن مسائل کے متعلق قطعی فیصلہ آسان نہ ہو ان میں ترجیحی رائے تو دی جا سکتی ہے لیکن حتم کے الفاظ میں جواب اگر نہ دیا جائے تو شاید احتیاط کا پہلو بھی ہوسکتا ہے اور غالباً سیدنا الامام الکبیر پر اسی روش کا غلبہ تھا ۱۲

لوگ اس کے برعکس خیال رکھتے ہیں"۔

پھر مولنا گنگوہی کی خصوصیتوں کو نقل فرماتے ہوئے اپنا احساس سیدنا الامام الکبیر کے متعلق یہ ظاہر فرمایا ہے کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب میں شان ولایت کا رنگ غالب تھا، اور مولنا گنگوہی میں شان نبوت کا"۔ (ص ۱۲۵ ہادی ماہ جمادی الثانی ۵۷ھ)

ظاہر ہے کہ "شان ولایت" خود ایک مجمل بات ہوئی، غالبًا اسی لئے اس کی تشریح ایک موقعہ پر ان الفاظ فرمائی گئی ہے، کہ

"مولنا محمد قاسم صاحب مغلوب الحال[1] مغلوب الاخلاق تھے، اپنے شاگردوں کو مخدوم و مکرم لکھتے تھے"

[1] ہو سکتا ہے کہ اشخاص کے ساتھ حضرت والا کے اس ملاطفت آمیز طرز عمل کی وجہ تربیت ہو، ظاہر ہے کہ تربیت اور تعلیم میں زمین آسمان کا فرق ہے تعلیم سب کے لئے یکساں ہوتی ہے لیکن تربیت میں اشخاص کے مزاج اور طبیعت کی رعایت سے تدبیر کی جاتی ہے تعلیم کا مقصد علم پہنچا دینا ہے اور تربیت کا مقصد پہونچائے ہوئے علم پر عمل کرانا ہے جیسے تعلیم طب کا حاصل اس فن کے اصول و مسائل مستفید کے ذہن میں ڈالدینا ہے اور مطب کا حاصل ان اصول و مسائل کے تحت علاج کرنا ہے جس میں ہر مریض کے مزاج کی رعایت علیحدہ علیحدہ لازمی ہوتی ہے ایک ہی مرض کے چند مریضوں کے نسخے الگ الگ ہوتے ہیں کہ ان کے مزاج الگ الگ ہوتے ہیں۔ حضرت مولنا گنگوہی رحمہ اللہ سے ایک دیہاتی بیعت ہوا جسے افیون کی عادت تھی حضرت نے فرمایا کہ روزانہ کی مقدار سے آدھی مقدار کھالیا کرو اور پھر چند دن کے بعد اس آدھی میں سے آدھی کر دینا ظاہر ہے کہ مسئلہ کی رو سے تو افیون کی پوری اور آدھی سب ہی مقداریں حرام تھیں لیکن یہ تعلیم نہ تھی تربیت تھی جس میں چند دن ایک فعل حرام کا تحمل کیا گیا تاکہ آئندہ ہمیشہ کے لئے عادۃ بدرفتہ رفتہ چھوٹ جائے، اگر ابتدا ہی میں اکدم اسے چھڑا دیا جاتا تو یا بیمار پڑ جاتا یا اکتا کر اس تعلیم سے بیزار ہو جاتا اور ہمیشہ افیونی رہتا، اسی طرح حضرت نانوتوی رحمہ اللہ بہت سے مریضان نفوس سے اولاً موانستہ کے ذریعہ ان کے قلوب میں قبول کی استعداد پیدا فرماتے تھے اور جب ایک حد تک پیدا ہو جاتی تو آخر میں انھیں اپنے رنگ میں رنگ لیتے چنانچہ جہاں جہاں بھی حضرت والا کی یہ مسامحت قائم ہوئی ہے وہیں آخری نتیجہ مستفید کی اصلاح نکلی ہے۔ اندریں صورت مغلوبیت حال یا مغلوبیت اخلاق پر ان واقعات کو محمول کرنے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ انھیں حکمت تربیت کے ماتحت سمجھنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام تو مغلوب الحال کسی حال بھی نہیں ہوتے لیکن شخصی تربیتوں میں ان کے طریق عمل میں بھی اس قسم کی ساحتوں اور ملاطفتوں کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کفار قریش حاضر

(بقیہ صفحہ آئندہ)

مگر یہ محسوس کر کے کہ ان الفاظ سے بھی صحیح مقصد غالباً ادا نہ ہوسکا، ملفوظ نگار نے یہ لکھتے ہوئے کہ "پھر فرمایا" حضرت حکیم الامت کے آخری الفاظ یہ نقل کئے گئے ہیں کہ

"فانی وہ ہے جسے یہ بھی خبر نہ ہو، کہ میں فانی ہوں"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۷)

ہوئے تو آپ نے توقیر فرمائی۔ بعض منافقین معلوم النفاق کے ساتھ برتاؤ دوستوں کا سا تھا، محض اس رعایت سے کہ نام ان پر رفیق صحبت کا آگیا تھا بعض کفار کی عیادت کے لئے حضورؐ تشریف لیگئے معاذ اللہ یہ مداہنت نہ تھی بلکہ ملاطفت و رحمۃ کیساتھ اخلاقی تسخیر تھی جس سے سرکش جھک گئے عرب کے مشہور پہلوان رکانہ نے دعوت اسلام سن کر کہا کہ اے محمدؐ میں تو پہلوان ہوں اگر آپ مجھے کشتی میں پچھاڑ دیں گے تو میں آپ کی صداقت کا قائل ہوجاؤں گا آپ نے بآسانی اسے پچھاڑا اور تین دفعہ زیر کیا ظاہر ہے کہ یہ مخاطب کے احوال مزاج کی رعایت تھی، ورنہ انبیاء کا موضوع اکھاڑے اور کشتیاں نہیں ہیں، سلاطین دنیا کے نام فرامین جاری کرتے ہوئے ان کے لئے حضورؐ نے مُہر بنوائی اور ان پر مہر لگا کر بھیجا کہ اس کے بغیر سلاطین کسی مراسلہ کو قابل التفات نہیں سمجھتے تھے یہ محض مخاطبین کے احوال کی رعایت تھی کہ کسی طرح حق قبول کرلیں اور انکار کی کوئی حجۃ ان کے ہاتھ میں نہ رہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض ممنوعات شرعیہ تک میں محض اس لئے مسامحۃ فرمائی تھی کہ لوگ اسی بہانہ سے دین میں داخل ہوجائیں مرے مُردوں پر رسمی نوحہ و شیون کی ممانعت پر بعض نائحہ عورتوں نے کہا کہ مجھ پر فلاں میت کے سال چھ ماہ کا نوحہ جاہلیت کا باقی ہے اُسے چھوڑ دیا جائے تو میں ہمیشہ کے لئے نوحہ سے تائب ہوتی ہوں آپ نے اجازت دیدی ظاہر ہے کہ یہ محض شخصی حربیت تھی جواز نوحہ کی تعلیم نہ تھی، ورنہ ممکن تھا کہ ۶ ماہ کے نوحہ کی بندش اسے عمر بھر نوحہ زن رکھتی۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ مجھے زنا، شراب، چوری اور جھوٹ کی عادت ہے۔ مگر یہ سب حرکتیں اکدم نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ نے اس کی عادت اور مزاج کی رعایت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اچھا جھوٹ بولنا چھوڑ دے۔ حالانکہ جھوٹ ہی کی طرح بقیہ تینوں حرکتیں بھی ممنوع تھیں مگر یہ دیکھکر کہ جھوٹ کا ترک ہی انجام کار یہ سب برائیاں بھی چھوڑا دے گا، حضورؐ نے ان برائیوں سے مسامحۃ فرمائی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک شخص کے بارہ میں عرض کیا گیا کہ وہ چوری کرتا ہے۔ فرمایا نماز بھی پڑھتا ہے یا نہیں؟ عرض کیا گیا کہ نمازی ہے۔ فرمایا کہ عنقریب اس کی نماز یہ فعل بد چھڑا دے گی، یعنی ابھی اس فعل بد کے ترک کی استعداد کمل نہیں ہوئی اس لئے اس پر دارو گیر نہیں فرمائی بلکہ مسامحۃ سے کام لیا یمن کے گورنر اور قاضی حضرت ابوموسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو آپ نے فرمایا کہ یمن کی

(بقیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ فرمائیے)

جہانتک میرا خیال ہے حکیم الامت کے یہ آخری الفاظ سیدنا الامام الکبیر قدس اللہ سرہ کی باطنی کیفیت کی صحیح ترین تعبیر ہے، اور حکیم الامت کے استاذ گرامی ہمارے مصنف امام نے

(بقیہ صفحہ ۴۷۸)

عیسائی رعایا کے سامنے اولاً توحید پیش کرنا جب وہ اسے مان جائیں تب نماز بتلانا جب اس میں بھی اطاعت کرلیں تب زکوٰۃ کا فریضہ پیش کرنا یعنی اسلام قبول کرتے ہی سارے احکام اکدم پیش نہ کرنا ظاہر ہے کہ عائدشدہ فرائض کی وقتی تبلیغ سی مستحق جو اسلام لاتے ہی بیکدم سب کے سب فرض ہو جاتے ہیں اسی ترتیب کے تحت میں ہیں ورنہ تعلیمی حیثیت سے تو سب اکٹھے ہی واجب ہو چکے تھے۔ پس ان کے چند روزہ ترک اور عدم ادائیگی پر چشم پوشی مداہنت نہیں مسامحہ اور حکمت تربیت تھی۔ شراب کی حرمت جو بادل و ہلہ ہی شارع کی نظر میں حرام قطعی تھی بتدریج آئی کہ اولاً محض اسکی برائی نازل ہوئی پھر اوقات نماز میں ممنوع ہوئی پھر مطلقاً ممانعت اتری پھر اس کے مخصوص برتن بھی ممنوع الاستعمال قرار پائے، ظاہر ہے کہ حرام ہونے والی چیز ابتدا ہی سے حرام تھی مگر آخری حکم حرمت تک اس حرام کو کسی نہ کسی حد تک جائز کئے رہنا محض مزاجوں کی رعایت تھی اگر ان شراب کے پشتینی خوگروں سے اکدم شراب چھوڑنے کیلئے کہا جاتا تو باستثناء خواص یا تو لوگ اس حکم کو قبول ہی نہ کرتے یا دل تنگی سے قبول کرتے اور شارع کو حکمت تشریع اور حکمت تربیت کے ماتحت دونوں سے بچنا تھا اس لئے اس ناجائز چیز کا کچھ عرصہ تحمل کیا جاتا رہا۔ بہرحال واجبات و ممنوعات کا تجزیہ اور اجزاء میں یہ مسامحہ معالجہ نفوس کا ایک نفسیاتی اصول ہے جسے اطبا روح طب روحانی میں اور اطبا بدن طب جسمانی میں استعمال کرتے آئے ہیں، اس میں غلبۂ حال کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پس حضرت والا کا مستفیدین بالسلین کے ساتھ ملاطفت کا یہ رویہ حکمت تربیت کے ماتحت ایک ارادی اور شعوری عمل تھا اور اگر یہ حال بھی تھا تو بھی سکر نہ تھا بلکہ بمعنی جذبہ و داعیہ تھا!

دوسرے یہ کہ اصول تربیت کے استعمال میں مربیوں کی طبعی افتاد کو بھی کافی دخل ہوتا ہے، ان کے طریق سے انکی طبیعت جدا نہیں ہو سکتی۔ جیسے انبیاء علیہم السلام کی طبیعت ہی پر شریعت اترتی ہے اور اسی لئے احکام شرعیہ اور ان کے تحمل و ادا، میں نبی کا طبعی رنگ بھی جھلکتا رہتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام بالطبع جلالی طبیعت رکھتے تھے تو ان کی شریعت میں جلال و تشدد کا رنگ موجود ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جمالی طبیعت رکھتے تھے تو ان کی شریعت میں بھی تساہل و نرمی کی شان پائی جاتی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اعدل المزاج اور اعدل الطبیعت ہیں تو آپ کی شریعت کے ہر حکم میں وہی عدل و کمال نمایاں ہے ایسے ہی اولیاء کے علوم و اخلاق اور تعلیم و تربیت کے بارہ میں جو خواطر و الہامات ان کی طبائع پر اترتے ہیں وہ بھی فطرۃً الگ طبع لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ بالطبع حلم و کرم اور رحمت و رافت کے مجسمہ تھے، اسی حسب روایت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ جب مولانا محمد یعقوب صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ نے بھی وہی کتابیں پڑھی ہیں جو حضرت نانوتوی نے پڑھی ہیں۔ پھر آپ دونوں ایک ہی استاذ کے شاگرد اور ایک ہی شیخ کے مرید ہیں۔ پھر حضرت نانوتوی میں یہ علوم کہاں سے آئے جو دوسروں میں نہیں پائے جاتے (باقی صفحہ آئندہ پر)

اسی حقیقت کا اظہار ان لفظوں میں جو فرمایا ہے یعنی سیدنا الامام الکبیر کے کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ

(بقیہ صفحہ ۴۷۹) جواباً ارشاد فرمایا کہ اس کی کئی وجوہ ہیں، بڑی وجہ یہ ہے کہ مولانا نانوتوی کے دماغ کی ساخت اور طبیعت کی افتادہی ایسی تھی کہ اس پر یہی علوم فائز ہو سکتے تھے بس ظاہر ہے کہ جس ظرف میں کوئی چیز بھری جائیگی وہ ظرف کی خصوصیات سے الگ نہیں رہ سکتی. اس لئے حضرت کے تربیتی معارف کا طبعاً وہی رنگ ہونا ضروری تھا جو ان کی طبیعت کا تھا، اور طبیعت خلقۃً حلم و کرم اور رحمۃ و رأفۃ کے ساتھ کمال جامعیت سے بھرپور تھی اس لئے اس افادہ میں شفقت و رحمۃ کے ساتھ جامعیت اور ہمہ گیری کا بھی طبعاً غلبہ تھا، میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ فروعی اختلافی مسائل میں فرماتے اور یہی عمل بھی تھا کہ بیان مسئلہ تو کر دیا جائے لیکن طبیعات سے دست و گریبان ہو کر محاذ نہ بنایا جائے، اور فرماتے کہ فی زمانہ کفار کا غلبہ ہے وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں تفریق کو ہوا دیجائے جس سے ان کا کلمہ متفرق ہو کر مزید ضعف پیدا ہو بلکہ توڑنے کے بجائے جوڑنے کی فکر کیجائے۔ اسی بناء پر جماعت دیوبند کے ایک مفکر عالم (مولٰنا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ) حضرت گنگوہی کا لقب فقیہ اسلام اور حضرت نانوتوی کا حکیم اسلام بیان کیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں بزرگوں کے کارنامے ان کے انہی القاب کے تحت میں ہیں. حضرت نانوتوی عموماً مجاہدانہ رنگ سے سدِ ثغور اور سرحدات اسلام کی حفاظت کرتے تھے کہ اغیار کا اس پر غلبہ و تسلط نہ ہونے پائے اس کا قدرتی اثر اپنوں کے ساتھ خواہ وہ نام ہی کے اپنے ہوں مسامحۃ و رواداری اور ملاطفت ہونا ہی چاہئے تھا اور حضرت گنگوہی خالص اپنوں کی تربیت فرماتے تھے اس کے لئے قدرتاً سخت گیری اور مربیانہ گھور کی ضرورت تھی یہ دونوں شانیں درحقیقت انبیاء علیہم السلام ہی کی ہیں ایک اغیار کو اندر لانا اور بیرونی معاندین سے دینی حلقہ کی حفاظت کرنا اور دوسرے اندر آئے ہوئے افراد کی تربیت کر کے ان میں رنگ پیدا کرنا، پہلی چیز حکمت سے سرزد ہوتی ہے اور دوسری فقہ نفس سے پہلی شان کے لئے حکمت کیساتھ وسعت ہمہ گیری اور جامعیت کی ضرورت ہے اور دوسری شان کے لئے تفقہ کے ساتھ جمعیت اور تمکن کی ضرورت ہے اس لئے نبوۃ کی ان دونوں شانوں کو قدرتی اصول کے تحت اصولی شان کہا جائے گا غلبۂ حال سے تعبیر نہیں کیا جائیگا، اور اگر غلبۂ حال بھی کہا جائیگا تو یہ غلبۂ حال بمعنی سکر نہیں بلکہ غلبہ بمعنی رنگ طبع ہوگا، پس جبکہ یہ حضرات اپنی انہی طبیعتوں سے تربیت کی تدبیریں مجتہدانہ رنگ سے پیدا کرتے تھے تو نہ ان کے اجتہاد سے انکی طبیعت الگ رہ سکتی تھی اور نہ اجتہادات رنگ طبع سے کبھی خالی رہ سکتے تھے، اس لئے اگر اس طبعی رفتار کو غلبۂ حال بھی کہا جائیگا تو بمعنی رنگ طبع کہا جائیگا بمعنی سکر و مغلوبیت نہیں کہا جائیگا۔ حاصل یہ ہے کہ غلبۂ حال کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ کسی ایک حال سے مغلوب ہو کر دوسرے احوال صادقہ سے ذہول اور غفلت ہو جائے جسے صوفیاء کی اصطلاح میں سکر کہتے ہیں اور اکثر و بیشتر اسی حال کے آثار ہیں سے صوفیاء کی وہ شطحیات بھی ہیں جو بظاہر قواعد شرعیہ کے خلاف دکھائی دینے کے باوجود قابل تاویل بھی جاتی ہیں دوسرے معنی یہ کہ ایک خاص حال غالب ہونے کے باوجود (بقیہ صفحہ آئندہ)

اللہ تعالیٰ نے اس کمال پر یہ ضبط عنایت فرمایا کہ کبھی کوئی کلمہ خود ستائی کا یا کسی طرح کوئی صورت عونت یا خود بینی کی خلوت جلوت تنہائی مجمع اپنے بیگانوں میں کبھی ظاہر نہیں ہوتی تھی (سوانح قدیم ص۴۰)

اگرچہ اس کا مطلب بھی وہی ہے، لیکن ہمارے مصنف امام کے کلام میں "ضبط" کا لفظ جو شریک ہو گیا۔ شاید اس سے غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ اس قسم کے رجحانات جیسے عام لوگوں میں تموج پذیر رہتے ہیں، سیدنا الامام الکبیر کے نفس میں بھی اُبھرتے تھے لیکن ضبط کی قوت سے کام لے کر ان رجحانات کو ظاہر ہونے نہیں دیتے تھے، ہمارے مصنف امام کے تلمیذ رشید مولٰنا اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی جب شہادت ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے اندر سے یہ چیزیں اس طریقہ سے فانی ہو چکی تھیں، کہ خود ان کے فانی ہو جانے کا احساس بھی ان میں باقی نہ رہا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے استاذ کے کلام کا مطلب بھی وہی لیا جائے، اور سمجھا جائے کہ "ضبط" کا لفظ عموماً تعریف کے مواقع میں چونکہ استعمال ہوتا ہی تھا ان کے قلم پر بھی وہی آگیا ورنہ مراد ان کی بھی وہی تھی کہ خلوت و جلوت تنہائی و مجمع اپنوں اور بے گانوں" میں کبھی کوئی چیز آپ کے اندر سے ایسی نہیں نکلی جو بتاتی ہو کہ کسی قسم کا کوئی ہلکا سا اثر "خودی" کا آپ میں باقی رہا تھا گویا جس حد تک کمالات سے حق تعالیٰ نے آپ کو سرفراز فرمایا تھا، اسی حد تک آپ پر یہ احساس دوامی طور پر ہر حال میں مسلط رہتا تھا کہ میرا کچھ نہیں ہے۔ سب اس کا ہے جو ان کمالات کو تقسیم فرماتا رہا ہے۔

اور یہ احساس تو کمالات کے متعلق تھا، کہ ان کے فانی ہونے کا احساس بھی آپ میں باقی نہ رہا تھا، یعنی یہ نہ تھا کہ اپنے کمالات کا خیال آتا تھا، اور پھر اس کی نفی فرماتے تھے، بلکہ یہ خیال ہی کلیۃً آپ کے اندر سے نکل چکا تھا کہ کسی قسم کا کوئی کمال بھی میرے اندر پایا جاتا ہے "فانی وہ ہے جسے اس کی خبر نہ ہو کہ میں فانی ہوں" حکیم الامت کے اس حکیمانہ فقرے کا یہی مطلب ہے برخلاف اسکے اپنی "بے کمالی" کے متعلق آپکی جو اندرونی کیفیت تھی شاید کسی موقعہ پر اس کا ذکر گذرا

(حاشیہ بسلسلہ ص۴۸۰) دوسرے احوال ضرور یہ ہیں نہ غفلت ہو نہ ذہول اس حال کو شرعی اصطلاح میں شرح صدر استقامت اور تمکین وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے حضرت تھانوی قدس سرہ کی مراد غلبۂ حال سے یہی شرعی حال ہے جو طبیعت کی استقامت کا اور ہمارے صوفیا کی اصطلاح میں سکر

بھی ہے بہرحال جن واقعات کا تذکرہ اس سلسلہ میں کرچکا ہوں ان سے سمجھنے والے جو کچھ سمجھ سکتے ہیں وہ تو خیر سمجھنے کی چیز ہے لیکن اس سے زیادہ بیّن و روشن شہادت اور کیا ہوسکتی ہے جو کسی مرید و معتقد یا بنیا زمند شاگرد کی نہیں بلکہ آپ کے علمی رفیق اور معاصر جو حضرت مولنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ارواح ثلاثہ میں نقل کی گئی ہے یاد ہوگا، رامپور منہیاران میں ان دونوں حضرات (مولنا گنگوہی و مولنا نانوتوی) کے ایک دوست حکیم ضیاء[۱] الدین صاحب مرحوم تھے، اس قصبہ میں ایک خاندان تھا، جو ان حضرات سے للّٰہی بغض رکھتا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ حکیم ضیاء الدین صاحب سے ملنے کے لئے جب سیدنا الامام الکبیر رامپور جاتے، تو ان للّٰہی بغض رکھنے والوں کے گھر بھی ضرور تشریف لے جاتے، ایک دفعہ مولنا گنگوہی کی معیت میں رامپور آنا ہوا، اور حسب دستور آپ ان مخالفوں کے یہاں بھی گئے، حکیم ضیاء الدین صاحب مرحوم کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا، اور مولنا گنگوہی سے کہنے لگے کہ دیکھئے ان مفسدہ پردازوں کے یہاں مولنا نانوتوی پھر تشریف لے گئے، حکیم صاحب کو غیر معمولی طور پر متأثر پاکر حضرت گنگوہی نے اس وقت یہ کہتے ہوئے کہ

"حکیم صاحب! آپ کیا فرمارہے ہیں، آپ ان کے (سیدنا الامام الکبیر) کے قلب کی حالت ملاحظہ نہیں فرماتے"۔

آگے جو گواہی قلب قاسمی کے متعلق دی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمالات سے فانی ہونے کے ساتھ

[۱] مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کے مخصوص دوستوں اور احباب میں سے تھے آپ حضرت محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ کے خلفاء میں سے تھے اور حضرت حافظ صاحب شہید حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ کے پیر بھائی اور نہایت ذی النسبۃ حضرات میں سے تھے حتیٰ کہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی قدس سرہٗ نے وفات کے وقت حضرت حاجی امداد اللہ کو حضرت حافظ صاحب کے سپرد کیا تھا کہ اپنے چھوٹے بھائی کا خیال رکھنا۔ حضرت حافظ صاحب شہید ہی کے ہاتھ میں یوم جہاد شاملی میں علم تھا اور آپ پر شہادت کے جذبہ کی ایک غالب کیفیت طاری تھی چنانچہ آپ کی شہادت ہوتے ہی جہاد کا قصہ ختم ہوگیا۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ تکوینی طور پر جہاد کا قصہ ہی حضرت حافظ صاحب شہید کی شہادۃ کے لئے اٹھایا گیا تھا۔ اس کے ہوتے ہی جہاد ختم ہوگیا۔ ان ہی حضرت شہید کے خلیفۂ ارشد حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب رحمہ اللہ تھے جو احقر کے دادا خسر ہوتے ہیں۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

(محمد طیب غفرلہٗ)

بے کمالی کے احساس و شعور میں آپ کے قلب مبارک کا کیا رنگ تھا۔ حضرت گنگوہی نے فرمایا تھا کہ

"جس شخص کو قلب میرا ایمان کی طرح یہ راسخ ہو چکا ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ ذلیل و خوار کوئی ہستی نہیں ہے"

یہ معمولی الفاظ نہیں ہیں، ایک محدث ثقہ و حجت کے الفاظ ہیں "ایمان کا رسوخ" یقین و اذعان کے جس درجہ کی تعبیر ہے اس کو سوچئے اور اس کے بعد غور کیجئے کہ حضرت گنگوہی جیسی ہستی کی یہ شہادت ہو کہ کسی خاص طبقہ یا جماعت ہی میں نہیں بلکہ "دنیا میں اس سے زیادہ ذلیل و خوار ہستی کوئی نہیں ہے" اس کا یقین، ایمانی یقین کی طرح حضرت والا میں جاگزیں اور راسخ تھا، کیا اس کے بعد بھی بے کمالی کی یافت و شعور کا کوئی درجہ باقی رہتا ہے، کمالات سے خالی ہونے کی یہ کیفیت کہ خالی ہونے کا احساس بھی غائب ہو چکا ہے، اور بے کمالی کے یقین و اذعان کا یہ حال کہ یقین و اذعان کا جو آخری نقطہ ہو سکتا ہے۔ وہاں تک اس کا یقین ترقی کر کے پہونچا ہوا ہے، اور اسی سے شرح ہوتی ہے ان واقعات کی جن کا ذکر بطور مثال کے آپ کے سامنے کیا گیا، وہ جزئیات تھے، دراصل اسی کلی حقیقت کے "یہی بنیاد" تھی جس پر آپ کی زندگی کی تعمیر کھڑی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ دوست تو دوست دشمنوں کی بھی تحقیر برداشت سے باہر ہو جاتی تھی، بدوضع انسانوں تک کو خدمت والا میں حاضری کی جرأت پیدا ہو جاتی تھی، کبھی نہ نماز پڑھنے والے حافظ جی کے لئے میل جول کی گنجائش نکل آتی تھی،

بہرحال اس زمانہ میں کد و کاوش، کسب و کوشش سے ہندوستان کے عام مولوی جن کمالات کو حاصل کرتے تھے سیدنا الامام الکبیر کو حالانکہ جبلۃً بھی اور کسباً بھی سب ہی ہیں کافی حصہ ارزانی ہو چکا تھا، انتہا یہ ہے کہ خط کی تحسین و تزئین کو اس عہد کے علمی حلقوں میں حالانکہ چنداں خاص اہمیت حاصل نہ تھی، بلکہ پنجاب و سرحد کے علماء کے متعلق سنا جاتا ہے کہ ان میں اکثر کا حال یہ تھا کہ ساری کتابیں ختم کر چکے ہیں، ان کو پڑھا رہے ہیں، لیکن ابتدائی حروف نویسی سے بھی عموماً وہ عاجز ہوتے تھے۔ کچھ لکھنے کی ضرورت پیش آتی۔ تو کسی نویسندہ سے اس کام کو لیتے، مگر اس زمانہ کے اس غیر اہم شعبہ میں بھی سیدنا الامام الکبیر کو امتیاز کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ قصص الاکابر میں حضرت تھانوی نے ہمارے مصنف امام کا یہ قول حضرت

والا کے خط کی نوعیت کے متعلق نقل فرمایا ہے وہ کہتے تھے کہ[1]

"مولانا محمد قاسم صاحب کا خط تو نہایت صاف تھا، نقطے و شوشے تک سب پورے پورے ہوتے تھے۔" (بحوالہ الہادی رجب ۵۰ھ)

اور جو حال ظاہری کمالات کا تھا آپ سن چکے کہ وہی کیفیت باطنی نعمتوں کی بھی تھی، الغرض اندر باہر سب بھرا ہوا تھا، لیکن جتنا زیادہ بھرا جاتا تھا، اسی قدر ان سے خالی ہونے کے احساس کو اپنے اندر پختہ کرتے ہوئے اس نقطہ تک پہنچ گئے تھے کہ اس احساس کا احساس اور شعور بھی بقول حکیم الامت تھانوی آپ میں باقی نہ رہا تھا۔ مختلف حیثیتوں سے حضرت والا کے اس قسم کے اقوال کہ دو حرف کے جاننے کی تہمت نہ لگی ہوتی تو اپنے آپ کو ایسا مٹاتا، کہ دنیا یہ بھی نہ جانتی کہ قاسم نامی کوئی آدمی پیدا ہوا تھا، یہ اور اسی کے قریب قریب اس سلسلہ میں قولی و عملی شہادتیں اس کثرت سے نقل کر چکا ہوں کہ شاید پڑھنے والے اکتا چکے ہوں گے، مگر کیا کروں، باتوں میں باتیں یاد آتی چلی جاتی ہیں، حضرت والا کے مشہور تلمیذ رشید مولنا عبد العلی مرحوم محدث مدرسہ عبد الرب دہلی کی زبانی سوانح مخطوطہ کے مصنف نے یہ روایت نقل کی ہے کہ میرٹھ میں حضرت نانوتوی سے ہم لوگ جب پڑھتے تھے، اور مخلوق خدا آپ کی طرف پلی پڑتی تھی، تب ایک دن گھبرا کر آپ نے اپنے شاگردوں کو جمع کر کے فرمایا کہ بھائی! اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت تم ہی

[1] میری مراد مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ سے ہے، حضرت تھانوی اسی موقعہ پر ان ہی کا یہ دلچسپ لیکن حکیمانہ قول لوگوں کو سنایا کرتے کہ مولانا محمد یعقوب فرمایا کرتے تھے کہ دو باتیں مجھے سخت ناپسند ہیں، ایک تو تقریر میں لغت بولنا، دوسری تحریر میں شکستہ لکھنا، ناپسندیدگی کی وجہ یہ بیان فرماتے کہ تقریر و تحریر سے مقصد یہ ہے کہ اپنے دل کی بات دوسروں تک پہونچائی جائے، مگر لغت بول کر اور شکستہ لکھ کر بجائے افہام کے ابہام ہی میں زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے اور جو مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہوتا، اور یہ واقعہ ہے کہ شکستہ حروف لکھنے کی عادت کا نتیجہ ہے کہ بیسیوں تحریریں اس زمانہ میں جن سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا تھا، غیر مفید بن کر رہ گئی ہیں، گویا ان شکستہ حروف کے پڑھنے میں اسی قسم کی دشواریاں پیش آتی ہیں، جن کا تجربہ آجکل ہندی حروف کے پڑھنے میں ہو رہا ہے، اکبر مرحوم نے جس کی طرف اپنے مشہور شعر میں اشارہ کیا ہے کہ ع "بس کہ تھا نامہ اعمال مرا ہندی میں"۔

لوگ نکالو، مولٰنا عبدالعلی کے الفاظ ہیں کہ حضرت نے حکم دیا کہ

"مجھے اس خلجان سے (جس میں مخلوق کی آمد و رفت کی وجہ سے) مبتلا ہو گیا ہوں چھڑاؤ"

اور فرمایا کہ

"میری عقیدت لوگوں کے دلوں سے نکالو۔"

عقیدت پیدا کرنے کی کوشش کے مقابلہ میں عقیدت کے نکالنے کی مہم پر اپنے شاگردوں کو آمادہ کرنا، اور اس قدغن کے ساتھ بجد ہو کر ان کو مجبور کرنا کہ عقیدت مندوں کا یہ گروہ واقعی ازالۂ عقیدت کی اس مہم میں مشغول ہو گیا، مولٰنا عبدالعلی کہتے تھے کہ ہم لوگوں نے یہ قاعدہ بنا لیا تھا کہ جہاں اس قسم کا کوئی آدمی حضرت سے ملنے آتا، تو دروازے ہی پر روک کر ہم لوگ اس کو سمجھاتے کہ

ارے بھائی! تو کس دھوکے میں ہے، مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر تو) نرے مُلّان ہیں، یہ کیا جانیں فقیری کس کو کہتے ہیں، اگر تم کو کسی فقیر کی تلاش ہے تو کسی اور بزرگ کی خدمت میں جاؤ، یہاں کیا لوگے"۔ (ص۳۵ سوانح مخطوطہ)

حاجی محمد عابد صاحب مرحوم جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم ہوئے ہیں وہ بھی سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک سے سنے ہوئے، یہ الفاظ نقل کیا کرتے تھے کہ

"اگر میں یہ جانتا کہ پڑھ لکھ کر یہ دقتیں پیش آئیں گی (یعنی لوگ میرا پیچھا کریں گے تو) میں نہ لکھتا، نہ پڑھتا، صرف سیدھی سادی، نماز روزے کے مسائل سیکھ لیتا" (سوانح مخطوطہ ص۳۶)

یہ اور اس کے سوا جو کچھ بھی اس وقت تک آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے میں ہر پڑھنے والے سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کو عملی زندگی کے جن میدانوں میں سرگرم کار دم واپسیں تک پایا گیا۔ ان میں آپ خود اترے تھے، یا اتارے گئے تھے ان روشنوں میں نے بجز آخری شق کے پہلی شق کے تصور کی کسی قسم کی گنجائش باقی رہی ہے کم از کم میرا ذاتی خیال تو یہی ہے اور یہی محسوس ہوتا ہے کہ جس حد تک اپنے آپ کو چھپانے اور گم کرنے کی کوشش وہ کرتے رہے، اسی حد تک انکو نمایاں کرنیوالا، اور رفع ذکر کی نعمت سے سرفراز کرنیوالا انکو باہر نکالتا چلا جا رہا تھا گویا قرآنی

آیت۔ واللہ مخرج ماکنتم تکتمون	اور اللہ نکال کر رہتا ہے اس چیز کو جسے تم چھپاتے تھے۔

جس کی تفسیر کرتے ہوئے مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بیان کیا کرتے تھے۔

لوان رجلاً عمل فی صخرۃ صماء لاباب فیھا ولاکوۃ لخرج عملہ الی الناس کائنا ماکان (رواہ احمد والحاکم وصححہ)	اگر آدمی کسی ایسی ٹھوس چٹان کے اندر گھس کر کوئی عمل کرے جس میں نہ کوئی دروازہ اور نہ دریچہ، تو اسکا عمل بہرحال لوگوں کے درمیان نکل کر آجاتا ہے، خواہ وہ کوئی ہو اور کسی قسم کا عمل ہو۔

ہم اس کی زندہ عملی مثال سیدنا الامام الکبیر کی ذات مبارک کو پاتے ہیں انھوں نے جس حد تک اپنے آپکو گھٹانے کی کوشش کی، بڑھانے والا ان کو اسی نسبت سے بڑھاتا چلا گیا، پست اور نیچے ہونے کی ساری تدبیروں کو بلندی بخشنے والا ان کو بلندی ہی عطا کرتا جاتا تھا، زندگی کے عملی میدان میں سب سے پہلے ان کو اس وقت اتارا گیا جب والدین نے ان کو متاہل کرنا چاہا، عملی زندگی کی گویا سمجھنا چاہیے کہ اسی سے ابتدا ہوئی، آیئے اور دیکھیے کہ عمل کے اس پہلے میدان میں وہ کس طرح اترے یا اتارے گئے۔

تاہل کی زندگی سچ پوچھیے تو اس خاکدان ارضی میں قدم رکھنے کے بعد ذمہ داریوں کا واقعی بار آدمی پر اسی وقت پڑتا ہے جب بجائے ایک کے وہ دو بنا دیا جاتا ہے، بار پڑتا بھی ہے اسی کے بعد، اور زندگی ایک بوجھ ہے اس کا احساس بھی عموماً دلوں میں ازدواجی زندگی کی منزل میں داخل ہونے کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے، اب آدمی سمجھتا ہے کہ مجھ پر کچھ لادا گیا ہے[1]۔

باوجود تلاش و جستجو کے اس کا پتہ نہ چل سکا کہ سیدنا الامام الکبیر کس عمر میں بیاہے گئے، آپ کے عقد کی تاریخ تو تاریخ سن تک کے متعلق ہم کوئی متعین بات نہیں کہہ سکتے، کچھ قرائن و قیاسات سے بمشکل یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترکوں کی جو جنگ روم وروس کی جنگ کے نام سے مشہور ہے، اور مسلمانان ہند میں پہلی دفعہ "خلافت اسلامیہ" کی اعانت و امداد کا جذبہ اسی جنگ کے سلسلے میں زندہ ہوا تھا، ترکی کی امداد کے لئے

[1] بعض ظریفوں کا یہ فقرہ جو مشہور ہے کہ آدمی درحقیقت اسی وقت تک آدمی رہتا ہے، جب تک دو ٹانگوں پر چلتا ہے۔ لیکن اس کی زندگی میں بیوی شریک ہو کر بجائے دو پایہ کے اسے چوپایہ بنا دیتی ہے۔ ۱۲

چندہ کی ابتدا، اسی روم وروس کی جنگ سے ہوئی جیسا کہ معلوم ہے کہ اس جنگ کا خاتمہ ۱۸۵۳ء مطابق ۱۲۷۰ھ میں روس کی شکست پر ہوا تھا، اسی سال یا اس سے چند ماہ آگے پیچھے جب حساب سے ۲۳ اور ۲۴ سال کے درمیان حضرت والا کی عمر ہوگی، آپ کی زندگی کے اس نئے دور کا غالباً آغاز ہوا، یہ نتیجہ کس چیز سے نکالا گیا ہے، اس کا ذکر آگے آرہا ہے لیکن اس سے پہلے آپکے ازدواجی تعلق کی ابتدا، کے متعلق منتشر طریقہ سے جو باتیں مجھ تک پہنچی ہیں مناسب ہے کہ ان کو پہلے سن لیا جائے۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ خوش قسمتی اور حسن اتفاق سے سیدنا الامام الکبیر کو اپنے والدین کے ظل عاطفت سے مستفید ہونے کا کافی موقعہ ملا، گویا جن بلند اختر ماں باپ کی گود میں امت اسلامیہ ہندیہ کی یہ ذات ایک ننھے معصوم بچے کے قالب میں سپرد کی گئی تھی، دونوں اپنے اس بچہ کو ان سارے فضائل وکمالات سے آراستہ وپیراستہ دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوئے جنھیں ہم قاسمی کمالات وفضائل کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس سے تقریباً ایک صدی سے مسلمانان عالم نفع حاصل کر رہے ہیں

آپ کے والد بزرگوار شیخ اسد علی صاحب مرحوم اور آپ کی والدہ ماجدہ بی بی حبیبہ نور اللہ مرقدہا کا تذکرہ مقدمہ میں کر چکا ہوں، بالوالدین احسانا اور اطاعت والدین کے قرآنی حکم کی تعمیل میں جو عملی نمونے آئے دن حضرت والا کی طرف سے پیش ہوتے رہتے تھے، اس وقت کون جانتا تھا کہ ان نمونوں کو آئندہ چل کر تاریخ تلاش کرے گی، ورنہ ان کو اگر جمع کر دیا جاتا تو اس قانون کی عملی حدود کے جاننے اور پہچاننے میں بڑی مدد ملتی، تاہم دوسری روایات وقصص کے سلسلے میں ذیلاً بعض نمونوں کا ذکر جو لوگوں نے کیا ہے۔ اندازہ کرنے کے لئے وہ بھی بہت کچھ ہیں۔ اور سب سے زیادہ فرض یہاں ان کے درج کرنے سے یہ ہے کہ نکاح کے متعلق واقعہ کا تذکرہ لوگوں نے کچھ اس طرح کیا ہے جس سے غلط فہمی کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

مقدمہ میں آپ مجھ سے یہ سن چکے ہیں یاد ہوگا کہ حضرت والا کے پدر والا گہر شیخ اسد علی صاحب نے عربی اور اسلامی دینیات کی تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی، لیکن اس زمانہ میں حکومت کی جو دفتری زبان فارسی تھی، اسمیں کافی دستگاہ رکھتے تھے، انھوں نے یہ تعلیم دلی میں پائی تھی لیکن وطن نانوتہ واپس ہو کر زمینداری کی جھگڑوں

میں کچھ اس طرح مبتلا ہوئے اور قصباتی زندگی کا رنگ نیز کچھ اتنا غالب ہوا کہ دیکھنے والوں کے نزدیک معلوم ہوتا تھا کہ شاید کچھ زیادہ لکھے پڑھے نہیں ہیں، وضع قطع، طریقہ بود و ماند نشست و برخاست بول چال سب ہی میں ضلع سہارنپور کے قصباتی باشندوں کی خصوصیتیں ان میں نمایاں تھیں، لیکن جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ سیدنا الامام الکبیر نے اول سے آخر تک اس زمانے میں بھی جب سارا ہندوستان آپ کے غیر معمولی کمالات کے چرچوں سے گونج رہا تھا اور

ہر کجا بوئے خدا می آید خلق بیں بے سر و پا می آید

کا منظر پیش ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی ہمیشہ اپنے والد مرحوم کے ساتھ احسان و اطاعت کے قرآنی حکم کی تعمیل میں کسی قسم کی کوتاہی کیا معنے، شاید کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سفر سے حضرت والا جب نانوتہ تشریف لاتے تو دستور تھا کہ گھر سے پہلے کچھ دیر کے لئے مسجد میں قیام فرماتے، واپسی سفر کی نفل ادا کرتے، ادھر برادری والوں اور قصبہ کے عام باشندوں کے کان میں آپ کی تشریف آوری کی خبر جس وقت پہنچی سب بے تحاشا مسجد کی طرف دوڑ پڑتے کافی مجمع ہو جاتا اسی عام بھیڑ میں دوسروں کے ساتھ ملے جلے آپ کے والد بھی کھڑے ہوتے، جوں ہی حضرت والا کی نظر ان پر پڑتی تو راوی کے الفاظ ہیں:

"گھبرا کر لپکتے"

پھر جانتے ہیں آگے جو تماشا دیکھا جاتا تھا، وہ کیا ہوتا تھا، راوی کا بیان ہے کہ سیدنا الامام الکبیر اپنے والد بزرگوار کے

"قدموں پر گر جاتے"

اور اس کی بالکل پروا نہ کرتے کہ کون دیکھ رہا ہے، یا دیکھنے والے مجھے کیا سمجھتے ہیں، اور اس کا اقتضاء کیا ہے، کہتے ہیں کہ پھر والد کے قدموں سے سر اٹھاتے، اور

"ان کے ہاتھ کو چومتے"

اس موقعہ پر شیخ اسد علی صاحب اپنے بچے سے عموماً یہ فرماتے ہوئے کہ "بیٹا اچھے ہو" غالباً اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی کہا کرتے

"اب تو تم سفر میں بہت رہنے لگے! بیٹا ہمارا آخری وقت ہے اب تو ہمارے پاس ہی کہیں نہ جاؤ"

والد کی اس آرزو کو سن کر سیدنا الامام الکبیر فرماتے

"باداجی! جیسا حکم ہوگا، اسی کی تعمیل کی جائے گی"

لیکن شیخ صاحب نے اپنی آرزو کو کبھی حکم کا قالب عطا نہیں کیا "حکم" اور "آرزو" میں جو جوہری فرق ہے۔ اس کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے، جس کو حکم دیا جاتا ہے مطلب اس وقت حکم دینے والے کا یہ ہوتا ہے کہ اپنی خواہش اور اپنے ارادہ واختیار سے دست بردار ہو کر میری مرضی کی پابندی ہو جاؤ برعکس اس کے آرزو میں دست برداری کا سوال ہی نہیں ہوتا، بلکہ جس سے آرزو کی جاتی ہے اسکے معاملہ کو اس کی خواہش اس کے ارادے اور اختیار کے ساتھ وابستہ رکھا جاتا ہے، حضرت کے والد مرحوم آرزو اور تمنا کی شکل میں اپنی خواہش پیش کرتے رہے، اور حضرت چاہتے تھے کہ حکم دیں اور اس وقت جیسا کہ فرماتے تھے کہ "اسی کی تعمیل کی جائے گی" اس کے سوا اور کسی دوسری صورت کا امکان ہی نہ تھا! اور یہ تقاضا تو سفر سے واپسی کے بعد پیش ہوتا تھا، پھر جتنے دنوں تک نانوتہ میں حضرت والا کا قیام رہتا، تو یہ دوامی قاعدہ تھا کہ مسجد سے سیدنا الامام الکبیر جب گھر تشریف لاتے، تو سب سے پہلے شیخ صاحب (اپنے والد) کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت فرماتے کہ

"باداجی! آپ کی چلم میں آگ بھی ہے یا نہیں"

بوڑھے شیخ صاحب فرماتے کہ

"بھائی! بڑی دیر سے یوں ہی ٹھنڈا رکھا ہوا ہے"

اس پر حضرت یہ فرماتے ہوئے کہ "لایئے میں لاؤں" حقے کو اٹھاتے، اسے تازہ کرتے، اور والد کی خدمت میں تیار کرکے پیش فرما دیتے کہتے ہیں کہ بعض لوگ شیخ صاحب کو کبھی کبھی ٹوک دیا کرتے کہ اتنے بڑے بزرگ عالم سے آپ حقہ بھروانے کی خدمت لیتے ہیں، لوگوں کے کہنے سے شیخ صاحب کبھی کبھی متاثر بھی ہوتے کبھی کبھی اپنے اس تأثر کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے کہ

"بھائی! لوگ کہتے ہیں کہ ایسا مت کیا کرو، تم چلم نہ بھرا کرو"

جواب میں اپنے سعادت مند فرزند کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سنتے کہ

"باواجی! لوگوں کو کہنے دیجئے، میں آپ کا بیٹا ہوں اور ادنیٰ غلام ہوں"[1]

حضرت والا کے لخت جگر نور نظر حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے اپنے دادا شیخ اسد علی مرحوم کو اچھی طرح دیکھا تھا' ان کی وفات حافظ صاحب کے سامنے دیوبند ہی میں ہوئی، اسی لئے اب جس روایت کو میں درج کر رہا ہوں۔ بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حافظ صاحب کی غالباً یہ چشم دید شہادت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند جب قائم ہو چکا تھا' اور اسی وجہ سے مولانا کا قیام زیادہ تر دیوبند ہی میں رہتا تھا' تو اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے بھی اور یوں بھی شیخ صاحب کے رشتہ دار اور احباب دیوبند میں تھے۔ ان سے ملنے جلنے کے لئے ایک دفعہ دیوبند تشریف لائے۔ عمر کافی تھی بیمار پڑ گئے، حضرت کی سسرال دیوان محلہ کی بیٹھک میں مقیم تھے۔ ان کے بیمار ہو جانے کی وجہ سے سیدنا الامام الکبیر اپنی قیام گاہ چھتہ کی مسجد کو چھوڑ کر دیوان محلہ کے اسی مکان میں رہنے لگے، صرف نماز کے لئے مسجد جاتے، اور کبھی یہ بھی فرما دیتے کہ

"شریعت کی طرف سے مجھے رخصت ہے کہ میں خدمت والد کروں' اور یہیں نماز ادا کر دوں' تم لوگ نماز مسجد میں پڑھ آؤ" ۱۲

نیاز مندوں کے لئے حضرت والا کی یہ تجویز ناقابل برداشت ثابت ہوئی اور طے کیا گیا کہ شیخ صاحب مرحوم کو کیوں نہ وہیں چھتہ کی مسجد والے اس حجرے میں منتقل کر دیا جائے جو سیدنا الامام الکبیر کی قیامگاہ تھی، یہی کیا گیا، حضرت والا کی طرف سے بھی اس پر اعتراض نہ ہوا، یوں والد کی تیمارداری' اور خالق کی

---

[1] یہ دونوں روایتیں براہ راست حضرت والا کے فرزند دلبند مولانا حافظ محمد احمد مرحوم کے حوالہ سے "روایات طاہرہ" سے ماخوذ ہیں، ہمارے مصنف امام نے اس کی تو تصدیق کی ہے کہ لوگوں نے شیخ اسد علی صاحب کو حقہ بھروانے کی خدمت لینے پر ملامت کی لیکن ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حقہ بھرنے کا یہ واقعہ صرف ایک دفعہ پیش آیا اور ملامت کرنے والوں کی ممانعت سے متاثر ہو کر پھر یہ خدمت مولانا سے انھوں نے نہیں لی، ممکن ہے کہ ایسا بھی ہوا ہو مگر ایک ہی دفعہ یہ خدمت لی گئی اس باب میں ظاہر ہے کہ صاحب البیت یعنی حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان زیادہ مستحق ترجیح ہے ۱۲

دربار داری دونوں کی تطبیق کی عملی شکل نکالی، بیان کیا گیا ہے کہ، آخر دنوں میں اسہال کی شدت بڑھ گئی، اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد چوکی پر جانیکی ضرورت شیخ صاحب مرحوم کو پیش آنے لگی، قاعدہ یہ تھا کہ چوکی پر سے کھنکار کی آواز جب آتی تو لوگ شیخ صاحب کو واپس لانے کیلئے چلے جاتے، اور چوکی کے نیچے جو ٹھیکرا ہوتا اسکو اٹھاکر اسی وقت صاف کرنیکی کوشش میں حضرت اور آپ کے خدام میں مسابقت کی کشمکش پیدا ہو جاتی، حضرت چاہتے کہ اس سعادت کو میں حاصل کروں، اور خدام کی آرزو تھی کہ یہ خدمت ہم لوگوں کے سپرد کی جائے۔ لکھا ہے کہ شیخ صاحب مرحوم کش مکش کے اس منظر کو دیکھتے اور فرماتے خدا کی شان ہے، کہ مجھ جیسے نابرسان حال آدمی کے ٹھیکرے کے پھینکنے اور صاف کرنے میں اتنے بڑے بڑے علما ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنا چاہتے ہیں، فرماتے اور آب دیدہ ہو کر فرماتے کہ یہ سب کچھ اسی بچے کی بدولت دیکھ رہا ہوں ورنہ میں کہاں اور یہ علماء کہاں[1]۔

یہ اور اسی قسم کے معمولی اور غیر معمولی تماشے تو بالوالدین احسانا کے ایک رکن والد کے متعلق آئے دن دیکھے جا رہے تھے، اور والدہ مرحومہ بی بی جیبہ نور اللہ مرقدہا گھر کی رہنے والی شریف بیوی تھیں۔ باہر والے دیکھ تو نہیں سکتے تھے لیکن عام طور پر یہ مشہور تھا "روایات طاہرہ" میں ہے کہ

[1] سیدنا الاستاذ الامام حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ بھی جو بعد کو شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوئے، ان ہی خدام میں شریک تھے، کہا جاتا ہے کہ ایک دن بجائے ٹھیکرے کے زمین ہی چوکی کے نیچے کی آلودہ ہوگئی اتفاً اس وقت سیدنا الامام الکبیر بھی موجود نہ تھے اور نہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کسی ضرورت سے باہر گئے ہوئے تھے خدام جو حاضر تھے۔ وہ مشورہ کر رہے تھے کہ زمین کو صاف کرانے کیلئے بھنگی بلوا لیا جائے۔ ابھی مشورہ ہو ہی رہا تھا کہ دونوں حضرات تشریف لے آئے، حضرت نانوتوی نے دریافت فرمایا کہ یہ مشورہ کس چیز کا ہو رہا ہے۔ ابھی سوال وجواب ہی ہو رہا تھا کہ چپکے سے حضرت شیخ الہند نے چوکی کے پاس جا زمین سے نجاست کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا ٹھیکرے میں ڈال لیا۔ اور یوں ٹھیکرے کو لے کر پھینکنے کے لئے باہر نکل آئے۔
شیخ الہند کی اس جرأت و ہمت نے سیدنا الامام الکبیر پر گویا ایک حال سا طاری کر دیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے فرما رہے تھے
"اے اللہ میرے دونوں ہاتھوں کی لاج رکھ لیجیو"
دیوبند کا ایک شہزادہ الہند کا شیخ بن کر دنیا سے رخصت ہوا، اسے تو دنیا دیکھ چکی اور دنیا کے بعد الدین کا دن جب آئیگا اس وقت دونوں اٹھے ہوئے ہاتھوں کی لاج کس رنگ میں سامنے آئیگی آج اسے کون بتا سکتا ہے۔

"دونوں وقت (غالباً قیلولہ اور شب خوابی کے وقت) پیر دبانا ان کا (حضرت نانوتوی) کا معمول تھا' تشریف لائے اور پیر دبانا شروع کیا"۔

مولوی طاہر صاحب نے اس روایت کو بھی اپنے والد مولانا حافظ محمد احمد مرحوم کی طرف منسوب کرکے درج کیا ہے' وہ گھر کے آدمی تھے' ان کی شہادت کے بعد کسی دوسری شہادت کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے' اور یہ تو خیر ایک معمولی بات ہے' حضرت والا کے عقد ازدواج کی جو روداد مجھ تک پہنچی ہے۔ اسکو پیش نظر رکھتے ہوئے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپنے صرف اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت اور آرام ہی کے لئے تاہل کی زندگی کے بار کو اٹھانا منظور فرمایا تھا۔ اور اب وہی روداد آپکے سامنے پیش ہوتی ہے' یاد ہوگا مقدمہ میں بیان کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نانوتہ کے ایک ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جس کی چار پشتوں کی روشنی صرف آپکے وجود باجود کیساتھ قائم تھی' بقول مصنف امام "چار پشت تک مولانا متفرد ہوئے" ایک تو یونہی والدین کے دل میں شادی رچانے کا خیال عموماً اپنے بچوں کے متعلق اس وقت پیدا ہی ہوتا ہے جب وہ عقد کے قابل ہو جاتے ہیں۔ پھر جہاں یہ حال ہو کہ ایک نہیں چار چار پشتوں کی پشتبانی صرف ایک ہی لڑکے کی ذات کیساتھ وابستہ ہو' تو اس وقت کی امنگوں کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ سیدنا الامام الکبیر لکھ پڑھ کر عالم و فاضل ہو چکے تھے' سن رشد کو بھی پہونچ چکے تھے' بات ہی کیا باقی تھی' جس کے انتظار میں آپ کے والدین اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی مسرت' سب سے بڑے ارمان کو حیز التوا میں ڈالنے پر آمادہ ہوتے' چاہئے تو یہی کہ اس ارمان کی تکمیل کی خواہش والدین کی طرف سے بالواسطہ یا بلا واسطہ آپ تک پہنچائی گئی ہوگی' لیکن میرے پاس کوئی وثیقہ نہیں ہے جسکی بنیاد پر یہ دعویٰ کروں کہ والدین کے ارادے کی خبر آپ تک پہونچی' اور آپ نے انکار فرمایا۔ مصنف امام نے حضرت والا کے نکاح کا ذکر کرتے ہوئے ایک مختصر اور مجمل خبر تو یہ دی ہے کہ

"مولوی صاحب نکاح نہ کرتے تھے" ص ۳۲

اگر بِرّ بوالدیہ کا وہ آئینہ ہمارے ہاتھوں میں نہ ہوتا جسکی ہلکی سی جھلک چند نمونوں کی روشنی میں آپکے سامنے گذر چکی ہے' یعنی حضرت والا کا اپنے والد ماجد اور والدہ ماجدہ کے ساتھ احسان و اطاعت' خدمت

وحسن سلوک کے جو تعلقات تھے، ان سے اگر ہم ناواقف ہوتے، تو ممکن ہے کہ مصنف امام کے ان مجمل الفاظ سے ہمارا ذہن ادہر منتقل ہو جاتا کہ نکاح نہ کرنے کا یہ واقعہ آپکے والدین کی تحریک کے بعد پیش آیا ہو لیکن ظاہر ہے کہ قرآنی حکم۔ ان اشکرلی ولوالدیك الی المصیر | گن گاتے رہو میرا اور اپنے والدین کا میری طرف ہے واپسی کے بعد یہ فرماتے ہوئے کہ شرک کے معاملہ میں ان کی اطاعت نہ کی جائے، صاحبہما فی الدنیا معروفا اور دنیا میں ان کا بھی ساتھ بھلائی کے ساتھ دو) کو واجب ٹھہرایا گیا ہے۔ اور جس کی عملی تفسیر کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے کہا تھا کہ والد کی تیمارداری کیلئے مسجد کی حاضری میرے لئے ضروری باقی نہیں رہی ہے، بلکہ اسی کے ساتھ یہ فقرہ آپ کا کہ "باواجی! جو حکم ہوگا اسکی تعمیل کیجائیگی" ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا ایک لمحہ کیلئے بھی یہ سوچا جا سکتا ہے کہ نکاح جیسے امر مسنون کے متعلق والدین کے حکم سے سرتابی کا آپکے قلب مبارک میں خطرہ بھی گذر سکتا تھا' زیادہ سے زیادہ کچھ گنجائش اگر پیدا ہو سکتی ہے تو اسی کی کہ حکم نہیں بلکہ تمنا اور آرزو کی شکل میں والدین کی طرف سے خواہش نکاح کی ظاہر کی گئی ہو، اور بات بہرحال آپکی مرضی ہی پر رکھی گئی ہو، تو اس وقت والدین کے عطا کئے ہوئے اختیار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نکاح نہ کرنے کے پہلو کو ترجیح دیتے رہے، لیکن اس کی گنجائش محض اسوقت پیدا ہوتی ہے جب اس نتیجہ کو جسکی طرف مصنف امامؒ کی خبر سے ذہن منتقل ہوتا ہے، اسکو ہم صحیح تسلیم بھی کرلیں۔ حالانکہ نفس خبر میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اس بے بنیاد نتیجہ کا صحیح منشار قرار دیا جا سکتا ہو۔ "نکاح نہیں کرتے تھے" بس اس کا علم تو اس خبر سے ہوتا ہی مگر کیوں نہیں کرتے تھے اسکا جواب آپ مصنف امام کے اس مجمل فقرے کے کس لفظ سے پیدا کر سکتے ہیں؟ ایسی صورت میں یہ نتیجہ بجز ایک بے بنیاد ذہنی انتقال کے اور کیا باقی رہ جاتا ہے؟

بلکہ ہم اپنے اندوان معلومات کی یاد کو تھوڑی دیر کے لئے اگر تازہ کرلیں جو مصنف امام ہی کی اطلاعوں سے فراہم ہوئی تھیں یعنی ٹھیک عنفوان شباب انیس بیس سال کی عمر میں سیدنا الامام الکبیر کو جس حال میں پایا گیا تھا' مصنف امام کے الفاظ میں

"بال سر کے بڑھ گئے تھے، نہ دھونا، نہ کنگھی، نہ تیل، نہ کترنے نہ درست کئے" ص۳

اور اسی کے بعد وہی یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ

"مولوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہیبت عنایت کی تھی کہ انکے سامنے بولنے کا ہر کسی کو حوصلہ نہ تھا" [صفحہ]

لیکن یہ ہیبت تو عام ہیبت تھی کسی خاص وقت اور زمانے کیساتھ محدود نہ تھی، مگر خاص اس زمانہ میں اسکا رنگ ہی دوسرا تھا، خیال کرنیکی بات ہے کہ مصنف امام جو سیدنا الامام الکبیر کے ہم سن ہم وطن ساتھ کے کھیلے ہوئے، نانوتہ میں بھی ساتھ ہی دونوں رہے اور وہاں سے دلی بھی ساتھ آئے ایک ہی مکان میں نشست و برخواست خواب و خور نوشت و خواند وغیرہ سارے مشاغل ساتھ ساتھ جاری تھے، مصنف امام حضرت والا کے استاذ زادے بھی تھے، ان سے بڑھکر بے تکلفی کے تعلقات اور کس کے ساتھ ہو سکتے تھے، انھوں نے خصوصیت کیساتھ اس قصہ پر اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ فطرۃً حضرت والا

"نہایت خوش مزاج اور عمدہ اخلاق تھے" صہ

مگر باوجود ان تمام باتوں کے کچھ کہنے سننے کی جرات انکو بھی نہیں ہوتی تھی، مصنف امام کے الفاظ ہیں کہ

"میں تو کچھ نہ کہہ سکا، ایک اور دوست سے کہلایا" صہ

بہرحال اگر یہ واقعہ ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں، اور عمر کی اسی منزل میں جو تحریک عقد و نکاح کیلئے موزوں ترین وقت ہو سکتا تھا، اسی زمانہ میں سیدنا الامام الکبیر پر رعب و جلال کی ایک ایسی کیفیت مستولی ہو گئی تھی کہ بالوں کے درست کرالینے یا سر میں تیل ڈلوانے جیسی معمولی باتوں تک کے پیش کرنیکی ہمت آپ کے گھر سے گھرے بے تکلف دوست بھی نہیں کر سکتے تھے، تو شادی بیاہ یا نکاح جیسے اہم معاملہ اور مسئلہ کے ذکر کی جسارت اس زمانہ میں آپکے سامنے کون کر سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ شریف گھرانوں کے اس دستور قدیم کو بھی اگر ہم پیش نظر رکھیں کہ شادی و نکاح جیسی باتوں میں بچوں کو براہ راست والدین مخاطب بنانے سے جھجکتے تھے احباب درشرم اجازت نہیں دیتی تھی عموماً غیروں ہی کو واسطہ بنانے کا عام قاعدہ تھا، تو ان ساری باتوں کی روشنی میں یہی سمجھ میں آتا ہے کہ نکاح نہ کرنے کی خبر مصنف امام نے جو دی ہے اس کا زیادہ سے زیادہ مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اولاً تو جرات ہی اس مسئلہ کے پیش کرنیکی کوئی اس زمانہ میں نہیں کر سکتا تھا، اور ڈھکے چھپے اور دبے لفظوں میں اشارۃً کنایۃً اسکا تذکرہ آپکے سامنے کسی طرح چھڑ بھی جاتا ہوگا تو آپ کی طرف سے کوئی جواب اسکا نہ ملتا ہوگا، الغرض یہ یا اسی قسم کے قصوں سے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ آپ نکاح کرنیکا سرے سے ارادہ نہیں رکھتے، کچھ بھی ہو، والدین کے حکم سے سرتابی کا نتیجہ نہ مصنف امام ہی کی خبر سے نکلتا ہے، اور نہ ان نمونوں سے جو اطاعت والدین کے سلسلے میں

حضرت والا کی طرف سے والدین کی آخری سانس تک پیش ہوتے رہے ہیں، جو لوگ ان سے واقف ہیں کے قلوب میں اسکا خطرہ بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپکے خاص حالات اور اداؤں کو دیکھ کر یہی نتیجہ پیدا کر لیا گیا تھا کہ آپ نکاح نہیں کرنا چاہتے۔ والدین نے آپکے ذاتی رجحانات کی رعایت کرتے ہوئے زیادہ زور دینا خصوصاً جلال و جبروت کے ان دنوں میں مناسب خیال نہ کیا ہوگا، لیکن والدین آپ کے بہرحال والدین تھے، انسانی جذبات اپنے اندر رکھتے تھے اکلوتا بچہ اور وہ بھی ایسا اکلوتا کہ مسلسل چار پشتوں کی نمائندگی جس کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو۔ اسکی عدم ازدواج کے اس رجحان پر کب تک صبر کر سکتے تھے؟ خصوصاً آپکے والد شیخ اسد علی مرحوم جو گھر گرہستی سے تعلق رکھنے والے آدمی تھے انکے دل میں یہ تمنا مسلسل چٹکیاں لیتی رہتی تھی کہ اسی دلی سے پڑھ پڑھ کر نہ صرف گرد و نواح ہی میں بلکہ خود نانوتہ میں نوجوان آرہے ہیں اور ملازم ہو ہو کر اپنے گھروں کی فارغ البالیوں میں اضافہ کر رہے ہیں، اسی نانوتہ میں مولوی محمد احسن نانوتوی، احیاء العلوم اور کنز الدقائق وغیرہ کتابوں کے مترجم بھی تھے، جنکا مکان حضرت والا کے مکان سے ملحق تھا، مولنا طاہر صاحب ثانی اپنے والد مرحوم کے حوالہ سے یہ روایت اپنی یادداشت میں درج کی ہے کہ شیخ اسد علی مولنا مولوی احسن نانوتوی کے والد سے کہا کرتے کہ

"ایک تمہارا بیٹا ہے کہ مطبع نول کشور میں سنو روپے (اس زمانہ میں) پارہا ہے اور ایک ہمارا بیٹا ہے کہ باہر سے کما کر تو کیا لاتا اور الٹا گھر سے خرچ کر رہا ہے"

بقول مصنف امام سیدنا الامام الکبیر کی ذات مبارک میں جو قدرتی کشش تھی، اور نو عمری ہی سے قلوب آپکی طرف کھنچے چلے جاتے تھے نتیجہ یہ تھا کہ باہر سے جب گھر نانوتہ تشریف لاتے اور اطراف و جوانب کے لوگوں کو اسکی خبر ہو جاتی، مہمانوں کا تانتا بندھ جاتا سربراہی ان مہمانوں کی شیخ اسد علی صاحب مرحوم ہی کو کرنی پڑتی۔ مصنف امام کے الفاظ ہیں کہ جب

"وطن آتے، اور یہاں مہمان آتے، تو والدین کو دشواری ہوتی" ص۳

اور اس دشواری میں بھی سچ پوچھئے تو حضرت والا کے اس جرأت آزما ایمانی اقدام ہی کو بظاہر زیادہ

دخل تھا، جس کا اجمالاً ذکر میں مقدمہ میں کر چکا ہوں، یعنی علم سے فارغ ہونے کے بعد پہلا کام حضرت والا نے یہ کیا تھا کہ اپنی موروثی جائداد پر شریعت کے قانون میراث کی روشنی میں نظر ثانی کا انتظام فرمایا، جس کا نتیجہ بقول مولانا طیب صاحب یہ ہوا۔

"فصلوں پر غلہ اہل حق کو تقسیم کیا جاتا رہا بہت کم مقدار تھی جو حقوق سے بچکر گھر میں پہنچتی تھی چنانچہ گھر پر عسرت و تنگی رہتی تھی"

ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی اقدام نہ تھا، مولانا طیب صاحب نے سچ لکھا ہے کہ

"دنیا فرائض نکلواتی تھی حصہ لینے کے لئے، لیکن یہاں دوسروں کو حصہ دینے کے لئے فرائض نکلوائی جاتی ہے، یہ پہلا موقعہ تھا جو لوگوں کے سامنے پیش آیا تھا۔"

کم از کم شیخزادوں کی اس برادری کے لئے جو اضلاع مظفر نگر و سہارنپور کے قصبات میں پھیلی ہوئی اور عموماً زمینداری پر جن کی معاش کا دار و مدار تھا۔ ان میں تو سیدنا الامام الکبیر کے اس عجیب و غریب علمی اقدام سے سنسنی سی پھیل گئی تھی، لوگوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا، جائداد کی شرعی تقسیم کے اس قصہ کا ذکر مولانا طیب اور مولانا طاہر دونوں حضرات نے اپنی قلمی یادداشتوں میں کیا ہے، اجمالی روایت کے بعد جی چاہتا ہے کہ ان دونوں روایتوں کے بعض اجزاء کو یہاں درج کر دوں، مولانا طیب نے لکھا ہے کہ

"حضرت (نانوتوی) جب تحصیل علم سے فارغ ہو کر گھر پر آئے تو املاک کا جائزہ لیا اور تمام املاک کو مشتبہ اور بعض کو مغصوبہ پایا، والد کو بہت سمجھایا کہ یہ کمائی ناجائز اور مشتبہ ہے قیامت کے مواخذے کا تقاضا ہے کہ حقیقی حقداروں تک ان کے حصے پہونچا دیئے جائیں"

ابتداء میں تو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں "گھر کھوؤ" "گھر اجاڑ" وغیرہ خطابات والد کی طرف سے آپ کو اس عجیب و غریب مشورہ کے پیش کرنے پر ملتے رہے مگر حضرت والا نے

"ان زمینوں کے غلے کے استعمال میں احتیاط شروع فرمائی، اور والد کو بار بار ادب کے ساتھ سمجھاتے رہے"

اور اسی عرصہ میں یہ کام بھی آپ نے شروع کر دیا یعنی

"مفصل فرائض (شرعی حصے وارثوں کے) نکلوائے اور دادا پر دادا کی بعید بعید پشتوں کے حقوق اور حصے نکلوائے"

مولوی طیب صاحب نے اس موقعہ پر یہ اطلاع بھی دی ہے کہ

"فرائض کا یہ مسودہ حضرت (نانوتوی) کے قلم کا لکھا ہوا، حضرت ہی کے بیاض میں ہے اور میرے پاس محفوظ ہے۔"

خاکسار بھی اس کے مطالعہ سے براہ راست بہرہ اندوز ہوا ہے، اور خیال ہے کہ حضرت والا کے بعض قلمی "مآثر" کے ساتھ اس کا فوٹو بھی سوانح کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔

بہرحال جس طرح بھی ممکن ہوا، ان ہی شرعی سہام کے مطابق حصہ داروں تک ان کے حقوق کے پہنچانے کیلئے کسی نہ کسی طرح آخر میں اپنے والد شیخ اسد علی صاحب کو آپ نے راضی کر لیا۔ مولوی طاہر کی قلمی یادداشت کی روایت میں ہے، کہ شیخ اسد علی کو جب یقین ہو گیا کہ حصہ داروں تک ان کا لڑکا بہرحال ان کے حقوق پہنچا کر ہی رہے گا،

"تو چارپائی پر پڑے ہائے ہائے کرتے تھے"

اور سیدنا الامام الکبیر دست بستہ ان کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کر رہے تھے کہ

"باواجی میں اپنی اور آپ کی آخرت کی درستی کے لئے کر رہا ہوں، جو کچھ کر رہا ہوں۔"

مولانا طاہر سلمہٗ کی روایت میں ہے کہ اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے جاتے تھے کہ

"باواجی آپ کی اولاد میں ایک بیٹا میں ہی ہوں، انسان جو کچھ کرتا ہے اپنی اولاد ہی کیلئے کرتا ہے جب میں نہیں چاہتا اور مجھے یہ بات پسند نہیں تو آپ پھر ایسا کیوں فرماتے ہیں۔"

الغرض ردوکد کے ان قصوں کے بعد مولٰنا طیب کا بیان ہے کہ

"آخر کار آپ کے والد نے سکوت اختیار کیا اور فصلوں پر یہ غلہ اہل حق کو تقسیم کیا جاتا رہا"

مصنف امام نے جو اطلاع دی تھی کہ "مہمانوں کی آمد و رفت کی وجہ سے سیدنا الامام الکبیر کے والدین کو دشواری ہونے لگی تھی" جیسا کہ میں نے عرض کیا اسکی بڑی وجہ یہی تھی، بعد کو اس کا نتیجہ کیا ہوا، اور تقویٰ کی زندگی کشاکش کی راہ بہرحال پیدا کر کے رہتی ہے، اس قرآنی نظریہ کا تجربہ کن شکلوں میں کرایا گیا اسکی داستان تو اپنے وقت پر سنائی جائے گی، یہاں یہ کہنا ہے کہ آپ کے والد ماجد شیخ اسد علی حضرت والا کے سمجھانے بجھانے سے جیسا کہ مولٰنا طیب نے لکھا ہے چپ تو ہو گئے، لیکن آئے دن کی معاشی

پریشانیاں جن کے وہ عادی نہ تھے، قدرتاً ان کے دل و دماغ میں ہلچل ڈالے رکھتی تھیں ان دشواریوں کے حل کی صورت کیا نکالی جائیگی لے دیکر نوجوان صاحبزادے کے ساتھ امیدیں وابستہ تھیں، لیکن حضرت والا کے رجحانات کو دیکھ کر مایوس ہو جاتے۔ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"حضرت کے والد کو ...... ترک نوکری اور اختیار درویشی کا رنج تھا" ص۳۲

آخران کے دل میں بھی وہی خیال آیا جو عموماً اس قسم کے مواقع میں آیا کرتا ہے۔ یہ خیال حضرت والا کے نکاح کا تھا مصنف امام نے آپ کے نکاح کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ پر لکھا ہے کہ

"والد (یعنی شیخ اسد علی صاحب) کو یہ خیال تھا کہ ابنائے زمانہ کی طرح جب فکر ہوگا آپ ہی نوکری کرلیں گے۔" ص۳۳

یہی پرانا طوق ہے جو والدین کی طرف سے وارفتہ مزاج نوجوانوں کو فکر راہ پر لگانے کے لئے عموماً گلے میں ڈالا جاتا ہے، اور یہ ایک چلتا ہوا جادو ہے، شبابی اعصاب کا سارا کس بل عورت کے سوار ہو جانے کے بعد نکل جاتا ہے بیوی کی بشاشت کیلئے آدمی ہر اس بار کو اٹھانے کیلئے تیار ہو جاتا ہے، جس کا اس سے پہلے غریب شاید تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے، اسی عام مشاہدے اور قاعدے کے زیر اثر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چپکے چپکے اندر ہی اندر شیخ اسد علی صاحب نے مختلف خاندانوں میں آپ کی نسبت کے متعلق گفتگو شروع کی حسن اتفاق سے برادری کے ایک کافی فارغ البال صاحب ثروت خاندان والے رشتہ پر آمادہ ہو گئے۔ یہ قصبہ دیوبند کا وہی خانوادہ تھا، جو دیوان والوں کے نام سے مشہور ہے، مقدمہ میں تفصیل کے ساتھ اس خاندان کا ذکر کر چکا ہوں، بتا چکا ہوں کہ ان لوگوں سے برادری کے قدیم تعلقات شیخ اسد علی صاحب کے موروثی طور پر قائم چلے آرہے تھے، ایام طفلی میں سیدنا الامام الکبیر نے مکتبی تعلیم اسی گھر کے مکتب خانے میں پائی تھی۔ سب ہی کے جانے پہچانے تھے۔ بلندی کا جو ستارہ آپ کی پیشانی میں بچپن ہی سے چمک رہا تھا، شعوری یا غیر شعوری طور پر لوگ اس سے بھی متاثر تھے اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ آپ کے غیر معمولی ذہن و ذکاوت علم و فضل کے چرچے اس خاندان تک نہ پہنچے ہوں گے۔

بہر حال کچھ بھی ہو، مصنف امام نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ شیخ اسد علی صاحب نے حضرت والا کا

"دیوبند رشتہ کیا تھا" ص۳۲

اس کا مطلب یہی ہے، اور مراد اس سے وہی دیوان کی ڈیوڑھی والوں کا خاندان ہی۔ خاندان کے امیر اس زمانہ میں شیخ کرامت حسین مرحوم تھے، ان ہی کی صاحبزادی بیوی امّ رحم سے یہ نسبت طے پائی تھی۔

مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے کھاتے پیتے، خوش حال گھرانے کے اس رشتہ کی شیخ اسد علی صاحب کے دل میں جیسا کہ چاہیئے تھا کافی قدر و قیمت تھی، اور چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو۔ اس مغتنم موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک امیر گھرانے کی لڑکی بھی ملتی ہے، اور اسکی وجہ سے اسی کے معیار کے مطابق آمدنی حاصل کرنیکی طرف بچے کی توجہ بھی ہوگی، شیخ صاحب نے عقد کی تحریک حضرت والا کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس تحریک کو اُن کے سامنے پیش کون کرے؟ غور و فکر کے بعد نظر انتخاب حضرت والا کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ

"آخر جناب حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں (شیخ اسد علی صاحب نے) عرض کیا۔" ص۳۲

حاجی صاحب نے وعدہ کر لیا، اور جیسا کہ توقع تھی، بقول مصنف امام

"حضرت (حاجی امداد اللہ) کے فرمانے سے نکاح پر راضی ہو گئے" ص۳۲

"ہر چہ بر خود نہ پسندی بہ دیگراں مپسند" کے عام قانون کے ہوتے ہوئے اس چیز کے پسند کرنے پر حضرت حاجی صاحب نے اپنے مرید کو کیسے راضی کر لیا، جسے اس وقت تک کیا معنی زمانہ تک خود اپنے لئے پسند نہ فرماتے رہے[۱]۔ یقیناً یہ قصّہ کافی دلچسپ ہوگا، لیکن افسوس ہے کسی نے اسکی تفصیل نہ کی۔

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ جب تک ہندوستان میں رہے۔ ازدواجی تعلق سے آزاد رہے، حضرت تھانوی کے ملفوظات قصص الاکابر میں ہے کہ مکہ معظمہ کی ہجرت سے پہلے تھانہ بھون ہی میں حاجی صاحب کا جب قیام تھا تو بی بی خیر النساء سے "حضرت (حاجی صاحب) کا خطبہ (یعنی منگنی) ہوئی تھی مگر حضرت نے نکاح کرنے سے انکار کر دیا تھا" (بحوالہ الہادی ربیع الاول ۵۰ھ) اگرچہ اتفاق کی یہ عجب صورت پیش آئی کہ ہجرت کر کے حاجی صاحب قبلہ جب مکہ معظمہ ہی میں مقیم ہو گئے تو پہلے خدیجہ نامی ایک بیوی صاحبہ سے (بقیہ صفحہ ۵۰۰ پر)

بہرحال پیر و مرشد کے ارشاد کی تعمیل پر تو آپ ضرور آمادہ۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک شرط بھی آپ کی طرف سے پیش ہوئی۔ بڑی دلچسپ شرط ؟ گویا جس پَر میں دلبر کا نامہ بندھا ہوا تھا، اسی پر کو آپ نے نوچ کر رکھ دیا تھا، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ موروثی جائداد پر نظر ثانی کرنے کی وجہ سے شیخ اسد علی صاحب مرحوم جس زمانہ میں ہائے وائے کر رہے تھے تو ان کی ذات کی حد تک جیساکہ "روایات طاہرہ میں ہے" حضرت والا اپنے والد ماجد سے فرماتے

"اگر آپ اپنی راحت و آرام کے خیال سے یہ فرماتے ہیں (یعنی نظر ثانی سے روکتے ہیں) تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی راحت و آرام کا مجھے ذمہ دار ٹھہرایا ہے"۔

اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کرتے کہ

"آپ کو کھانے پینے کی جس قدر چیزیں مرغوب ہیں۔ مجھ سے فرمادی جائیں، جب تک میں زندہ ہوں انشاء اللہ تعالیٰ ان میں قصور نہ ہوگا"۔

الغرض پدر بزرگوار کے مصارف کی حد تک تو احساس ذمہ داری میں آپ کا یہ حال تھا۔ لیکن شیخ اسد علی صاحب کے سامنے راحت و آرام سے اہم تو اپنے ہم چشموں کی اولاد کی کمائی کی کیفیت تھی، بقول مصنف جسے دیکھ دیکھ کر شیخ صاحب کہا کرتے تھے کہ سب

"پڑھ پڑھ کر نوکر ہو گئے، کوئی پچاس کا کوئی سو کا۔ کوئی کم، کوئی زیادہ، سب خوش و خرم ہیں اور ان کا اپنے بچہ کا، حال ویسا ہی"

(بقیہ صفحہ ۴۹۹)

آپ نے نکاح کر لیا تھا، اور ان کا انتقال جب ہوگیا تو یہی تھانہ بھون والی بی بی خیر النساء جن سے حاجی صاحب نے نکاح کرنے سے انکار کر دیا تھا، وہی بیوہ ہو کر حج کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لائیں اور لوگوں کی تحریک سے عقد ثانی ان کا حضرت حاجی صاحب سے ہوا، مولانا نانوتوی فرماتے تھے کہ مثنوی شریف کی یہ بی بی خیر النساء بڑی عالمہ تھیں، جب بی بی خیر النساء کی بصارت جاتی رہی تو ایک دوسری معمرہ مہاجرہ عورت سے جن کا نام امۃ اللہ تھا ان کی خواہش کے مطابق آپ نے نکاح فرمالیا تھا۔ تاکہ خدمت کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ الغرض حاجی صاحب قبلہ کے گو تین نکاح ہوئے لیکن یہ سارے نکاح ہجرت کے بعد حضرت نے کئے، لیکن جو زمانہ شادی کا ہوتا ہے، اس میں آپ مجرد ہی رہے۔ تحریک کی بھی گئی لیکن انکار فرمادیا تھا۔

اور اپنے ہم عصروں، ہم چشموں کی ہمدوشی کے شوق میں ایک کافی تونگر صاحب ثروت گھرانے میں اپنے بچے کے رشتہ کے طے کرنے میں وہ کامیاب ہوئے تھے۔ خیال ان کا یہی تھا کہ دولہن جب گھر میں آئے گی تو ہمارے لئے نہ سہی اپنی دلہن کے لئے تو کمانے کا خیال لڑکے میں زندہ ہوگا وہ تو اپنے اسی خیال میں مگن تھے، اور جب ان کو اس کی خبر ملی کہ نکاح پر حاجی صاحب نے ان کے لڑکے کو آمادہ کرلیا، تو سمجھے کہ تیر نشانے پر بیٹھ گیا، مگر ان کی مایوسی کی انتہا نہ رہی جب نکاح کی رضامندی کے ساتھ یہ شرط بھی سنائی گئی کہ وہ یعنی شیخ اسد علی صاحب

"تمام عمر زوجہ کے نفقہ اور اولاد کی پرورش کے لئے کچھ کما لانے کے مجھ سے متقاضی نہ ہوں۔" ص۳۲

شرط کے یہی الفاظ مصنف امام نے نقل کئے ہیں، جو سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے اپنے نکاح کے متعلق والد ماجد کی خدمت میں پیش ہوئی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روایت باللفظ ہے، یا بالمعنی، کچھ بھی ہو، مطلب اس کا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیوی بال بچوں کے نان نفقہ کے متعلق آدمی شرعاً مکلف ہے، لیکن ہر شخص اپنی حیثیت اور اپنے حالات ہی کے مطابق مکلف ہے ولینفق ذو سعة من سعته ومن قدر علیه رزقه فلینفق مما اٰتاہ اللہ، کا قرآنی قانون حضرت کے سامنے تھا۔ مگر جانتے تھے کہ والد کا یہ خیال نہیں ہے، بلکہ بیوی بچوں کا نام لیکر وہ اپنے ہم چشموں کی اولاد کے مقابلہ میں مجھے اتارنا چاہتے ہیں اور اس شرط کے پیش کرنے کی غرض تھی بھی یہی، ورنہ العیاذ باللہ یہ مطلب نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے کہ خدائی ذمہ داریوں سے آپ راہِ گریز اختیار کرنا چاہتے تھے۔

بہرحال یہ شرط آپ کے والد کے سامنے پیش ہوئی وہ سمجھ تو ضرور گئے ہوں گے کہ بیٹے کی طرف سے یہ جوابی بینترا ہے مگر کرتے کیا۔ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"بے چاروں نے (یعنی آپ کے والد ماجد نے) ناچار یہ شرط قبول کی۔" ص۳۲

اور اسی کے بعد وہ خبر دیتے ہیں کہ

"نکاح ہوگیا" ص۳۲

سیدنا الامام الکبیر کے نکاح کے متعلق مصنف امام نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ یہی ہے، لیکن "صاحب البیت" یعنی حافظ محمد احمد مرحوم حضرت والا کے قرۃ العین کے حوالہ سے مولانا طاہر سلمہٗ کی یادداشت میں ایک اور جزء کا بھی سراغ ملتا ہے۔ حافظ صاحب مرحوم اپنی والدۂ ماجدہ کا حال بیان کرتے ہوئے (مولوی طاہر صاحب نے لکھا ہے) یہ بھی فرماتے کہ والد یعنی سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے والدہ پر قدغن تھا کہ میری دادی صاحبہ یعنی حضرت نانوتوی کی والدہ کی خدمت گزاری میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہونے پائے، اسی سلسلہ میں حافظ صاحب مرحوم اپنی والدہ ماجدہ کی زبانی یہ روایت نقل کیا کرتے تھے کہ

"مجھ سے شادی کے اگلے ہی دن (حضرت نانوتوی نے) فرمایا تھا کہ میں نے نکاح صرف اپنی "بو" (والدہ) کی راحت کے لئے کیا ہے۔"

حافظ صاحب ہی یہ بھی فرمایا کرتے تھے: غالباً خود اپنے کانوں سنی ان کی یہ بات ہے کہ حضرت نانوتوی

"اپنی والدہ کی زبان سے کبھی ہلکا لفظ بھی خدمت کے متعلق سن لیتے تھے۔"

یعنی والدہ ماجدہ کی خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی ان کی بیوی کی طرف سے ہوئی ہے، تو غصہ میں

"بار بار یہی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تو ان ہی کی خدمت کے لئے یہ بار اپنے ذمہ رکھا، ورنہ میں فقیر آدمی تھا، مجھے کیا ان چیزوں میں پھنسنے کی ضرورت تھی۔"

اس سلسلہ میں حافظ صاحب کا بیان ہے کہ کبھی کبھی شرعی قطع تعلق کی دھمکی کی نوبت بھی آجاتی تھی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ برّ بوالدتہ ہونے اور ماں کے ساتھ حسن سلوک میں جس کا حال یہ ہو، حافظ صاحب مرحوم ہی اس کے بھی راوی ہیں کہ آخر عمر میں سیدنا الامام الکبیر کی والدۂ ماجدہ مرض اسہال میں مبتلا ہوئیں، ترقی کر کے شدت اس نوبت تک پہنچ گئی تھی، کہ دن بھر میں تین تین چار چار کپڑے خراب ہو جاتے۔ حالانکہ حضرت والا کی اہلیہ محترمہ موجود تھیں، اور علاوہ دوسری خدمتوں کے کپڑوں کو بخندہ پیشانی خود دھویا کرتی تھیں۔ لیکن مولٰنا نانوتوی اصرار فرماتے کہ والدہ کے کپڑوں کے دھونے کی سعادت میں ہی حاصل کروں گا۔ میاں بیوی کا

آپس میں اس پر جھگڑا بھی ہوا، آخر اس فیصلہ پر راضی ہو گئے، کہ ایک دن تو وہ دھویا کریں گی اور ایک دن میں دھویا کروں گا، مولانا طاہر صاحب نے اس روایت کو اپنے والد مرحوم کے حوالہ سے درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی دادی صاحبہ یعنی حضرت نانوتوی کی اہلیہ محترمہ فرماتی تھیں کہ اس فیصلہ کے بعد میں یہ کیا کرتی کہ دھونے کے لئے دن بھر میں چار پانچ کپڑے جب جمع ہو جاتے تو تین چار کپڑوں کو میں خود دھو کر سکھا لیتی اور حضرت کے سامنے ایک کپڑا دھونے کی باری کے دن میں پیش کر دیا کرتی تھی۔

اپنی گم شدہ جنت الفردوس کو اپنی ماں کے قدموں کے نیچے جو اس طرح ڈھونڈھ رہا ہو اگر خدمت میں کوتاہی کی معمولی شکایت پر بیوی سے جدا ہو جانے کی دھمکی دیتا ہو تو اس پر تعجب کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

بہر حال گفتگو حضرت والا کے نکاح کے متعلق ہو رہی تھی، مصنف امام کے بیان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پیر و مرشد کے حکم کے مطابق نکاح کرنے پر راضی ہوئے، لیکن مذکورہ بالا روایت جو حضرت والا کے نور چشم کی روایت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رضامندی میں اپنی والدہ ماجدہ کی ضرورت و سہولت کا خیال بھی آپ کے سامنے تھا، بہر حال اسباب و وجوہ کچھ ہی ہوں، مگر ہوا یہی کہ جیسے امامت نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن امام بن کر آپ کو نماز پڑھانی پڑی، وعظ و خطابت سے بھاگتے تھے، لیکن ہندوستان کے بہترین خطیب و مقرر مشہور ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے، درس دینا نہیں چاہتے تھے، لیکن درس دینا ہی پڑا، اور آپ کے ہاتھوں تدریس کے اس عظیم الشان کارخانے کی بنیاد بھی قائم ہوئی، جس سے بن بن کر خدا ہی جانتا ہے اب تک کتنے مدرس نکل چکے ہیں اور نکلتے چلے جائیں گے، آپ مصنف نہیں بننا چاہتے تھے، لیکن ایک درجن سے زیادہ کتابیں آپ سے لکھوائی گئیں۔

الغرض اپنے مٹانے کا جو فیصلہ کر چکا تھا، غیب میں قدرت اسی کے باقی رکھنے کا انتظام کر رہی تھی، بلکہ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ بیرون ہند کو بھی جس کی روحانیت سے بھر دیا گیا،

اسی کے متعلق یہ دکھایا گیا کہ جو شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، اس کی شادی بھی ہوئی اور صرف ایک ہی بیوی سے جسمانی اولادیں اتنی برکت عطا کی گئی کہ عمر کے حساب سے پچاس سال بھی جس کے پورے نہیں ہوئے تھے، اور وفات پر ابھی (۳۷) سال بھی نہیں گذرے ہیں، صدی بھی پوری نہیں ہوئی ہے کہ ابتک اسی کی جسمانی ذریت[۱] اور نشانیوں کی تعداد سو سے متجاوز ہو چکی ہے[۲]۔

[۱] خاکسار کا یہ ایک اجمالی تخمینہ ہے، کاش! آپ کے اہل خاندان میں سے کوئی صاحب حضرت والا کی ذریت کا کوئی شجرہ مرتب فرما دیتے، تو اس کتاب میں اس کو شریک بھی کر دیتا، اور اسی سے لوگوں کو اندازہ ہوتا کہ حق تعالیٰ نے واقعی کتنی غیر معمولی برکت حضرت والا کی جسمانی یادگاروں میں بھی عطا فرمائی ۱۲

[۲] حضرت مصنف دام مجدہ کا تخمینہ صحیح ہے۔ حضرت والا کی ذریت سو سے متجاوز ہے اور کافی متجاوز ہے، اگر صحیح تعداد کا پتہ چل جائے تو اندازہ یہ ہے کہ دو سو سے متجاوز ہو جائے گی جس کی تفصیل یہ ہے، کہ حضرت والا کی بلاواسطہ دس اولاد ہوئی۔ مولانا محمد احمد۔ محمد ہاشم۔ محمد میاں۔ محمد میاں خورد سالی میں بعمر گیارہ ماہ فوت ہو گئے اور محمد ہاشم کا جوانی کی عمر میں مکہ معظمہ میں انتقال ہوا، نسل صرف مولانا محمد احمد صاحب سے چلی، لڑکیاں سات ہوئیں۔ اکرام النساء، رقیہ، خدیجہ، مریم، عائشہ (دو کے نام معلوم نہیں ہو سکے) ان میں سے عائشہ زندہ ہیں مگر لاولد ہیں۔ خدیجہ، مریم اور نامعلوم الاسم لڑکپن ہی میں فوت ہو گئیں۔ دختری اولاد صرف دو سے چلی۔ اکرام النساء اور رقیہ۔ تفصیل بقدر علم درج ذیل ہے۔

مولانا محمد احمد کے پانچ اولاد ہوئیں۔ محمد طیب۔ طاہر اول۔ طاہر ثانی۔ فاطمہ۔ طیبہ۔ جن میں طاہر اول اور فاطمہ خورد سال فوت ہوئے اور نسل صرف تین سے چلی جس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) محمد طیب کے نو اولاد ہوئی، چار لڑکے محمد سالم، محمد عاصم، محمد اسلم، محمد اعظم۔ پانچ لڑکیاں فاطمہ، ہاجرہ، حمیرا، عذرا، رشیدہ۔ ان میں سے محمد عاصم کا بعمر چودہ سال انتقال ہو گیا اور رشیدہ شیر خواری کی عمر میں فوت ہو گئی، باقی بحمد اللہ زندہ سلامت ہیں، اور ان میں سے چار الحمد للہ صاحب اولاد بھی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:۔

محمد سالم کے دو اولاد ہیں۔ ایک لڑکا سلمان سالم اور ایک لڑکی اسماء۔

فاطمہ کے چھ اولاد ہیں چار لڑکے۔ محمد سلیم، محمد وسیم، محمد نسیم، محمد شمیم، دو لڑکیاں سلمیٰ، رضیہ۔ ان میں سے رضیہ اسی سال شیر خوارگی میں انتقال کر گئی۔

ہاجرہ کے پانچ اولاد ہیں چار لڑکے طارق، خالد، سلمان منصور، ارشد منصور، ایک لڑکی شہناز بیگم

حمیرا کے ایک بچہ ہے، عارف احتشام سلمہٗ۔

(۲) مولوی محمد طاہر مرحوم (طاہر ثانی) کے گیارہ اولاد ہوئی۔ سات لڑکے، محمد زاہر، محمد فاخر، محمد عامر

بقیہ ص ۵۰۵ پر

یہ عجیب بات ہے کہ اس تاریخی شادی کے متعلق عام طور پر جن باتوں کے جاننے کی توقع ہوسکتی تھی، ان سے ہم تقریباً ناواقف ہیں۔ نانوتہ سے سولہ سترہ میل کا فاصلہ طے کر کے برات دیوبند کے ایسے رئیس کے گھر آئی ہے، جسکے متعلق مشہور ہے شاید پہلے کہیں اس کا ذکر آچکا ہے کہ سابقہ تیاریوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۴) محمد شاکر، محمد آصف، سعید قمر، وحید ظفر۔ اور چار لڑکیاں، راشدہ، رشیدہ اولیٰ، رشیدہ ثانیہ۔ سعدیہ۔ ان میں سے رشیدہ اولیٰ فوت ہوچکی ہے۔ باقی دس نفر بحمداللہ زندہ سلامت موجود ہیں، ان کی اولاد کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

محمد زاہر کے تین اولادیں ہیں، دو لڑکے جاوید، پرویز۔ ایک لڑکی زہرہ

راشدہ کے چار اولادیں ہیں دو لڑکے۔ راشد۔ شاہد۔ دو لڑکیاں۔ رشدیٰ۔ بشریٰ۔

رشیدہ ثانیہ کے تین اولادیں ہیں منصور سالم۔ مسرور عالم۔ ایک لڑکی یاسمین۔

(۳) طیبہ مرحومہ کے گیارہ اولاد ہوئیں جن میں سے چار زندہ سلامت موجود ہیں۔ دو لڑکے سید محمد احتشام۔ سید محمد آصف، دو لڑکیاں سیدہ خاتون، خورشیدہ خاتون۔ ان کی اولادوں کی تفصیل یہ ہے۔

سید محمد احتشام کے ایک لڑکا ہے عارف احتشام۔ (جس کا تذکرہ حمیرا بنت طیب کی اولاد میں آچکا ہے)

سیدہ خاتون کے پانچ دختری اولاد ہیں۔ رفعت۔ طلعت۔ انجم۔ کشور۔ مسعودہ۔ نرینہ اولاد ابھی تک نہیں ہوئی۔ خدا بہرہ ور فرمائے۔

خورشیدہ خاتون کے چار اولاد ہوئی، تین لڑکے طارق۔ خالد۔ عبیداللہ۔ ایک لڑکی طاہرہ۔ ان میں سے طارق کا انتقال ہوچکا ہے۔ بقیہ بحمداللہ زندہ سلامت ہیں۔ اس طرح حضرت کی پسری اولاد کی تعداد اناسی ہوتی ہے۔

ادھر حضرت والا کی لڑکیوں میں اکرام النساء اور رقیہ صاحب اولاد ہوئیں۔ جن کی اولاد اور انکے اولاد کی پوری تفصیل معلوم نہیں ہوسکی کیونکہ یہ اولاد معاشی معیار سے ملک اور بیرون ملک میں منتشر ہے۔ جہاں تک علم ہوسکا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) اکرام النساء کے (جن کی شادی مولانا عبداللہ صاحب انبہٹوی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے ہوئی) پانچ اولاد ہوئیں۔ دو لڑکے مولانا محمد میاں (رفیق خاص سیاسی حضرت شیخ الہندؒ و مہاجر کابل عرف مولانا منصور) مولانا احمد میاں (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) کے تین لڑکیاں امۃ السلام۔ امۃ المنان۔ کلثوم۔

مولانا محمد میاں مرحوم کے چار اولاد ہوئیں تین لڑکے محمود میاں۔ حامد میاں۔ حمید میاں۔ ایک لڑکی قدسیہ بیگم۔ جن میں سے محمود میاں لڑکپن میں فوت ہوگئے باقی بحمداللہ زندہ سلامت ہیں۔ ہجرت کابل کے بعد ممدوح مرحوم نے دوسری شادی کابل میں کی۔ جن سے پانچ اولاد ہوئی۔ ان کے اسماء کا علم نہیں۔ ہندوستانی بیوی حضرت مولانا صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی تھیں جن سے (بقیہ صفحہ آئندہ)

کے بغیر اچانک بعض دفعہ گذرنے والی یا دیوبند آنے والی براتوں کے کھانے کھلانے کا نظم بسہولت تمام کردیا جاتا تھا، ایک ایسے کھاتے پیتے خوش حال گھر میں براہ راست خود رئیس کی قرۃ العین، اور صاحبزادی کی برات جب آئی ہوگی تو غیر شرعی قصوں سے قطع نظر بھی کرلیا جائے،

(بقیہ صفحہ ۵۰۵) چار اولاد ہوئی۔ ان میں سے مولوی حامد میاں الانصاری غازی سابق ایڈیٹر اخبار مدینہ بجنور و حال ایڈیٹر اخبار "جمہوریت" بمبئی کے پانچ اولاد تو وہی ہیں جو سابق میں ہاجرہ بنت طیب کی اولاد دکھلائی گئی ہے اسلئے شمار میں یہاں نہیں لی گئی، اور ایک لڑکا پہلی بیوی سے ہے جس کا نام عابد میاں ہے۔ قدسیہ بیگم کے ایک لڑکا وصی نام ہے، مولانا احمد میاں مرحوم کے چار اولاد ہوئی۔ دو لڑکے محامد اللہ اور حمد اللہ اور دو لڑکیاں محمودہ اور حمیدہ جس میں سے حمیدہ خورد سال فوت ہوگئی اور محمودہ لاولد ہیں۔ صاحب اولاد صرف دو صاحبزادے ہیں جن کی نسل کی تفصیل یہ ہے کہ

محامد اللہ کے پانچ لڑکیاں وہی ہیں جو سیدہ بنت طیبہ مرحومہ کی دکھلائی گئیں۔ اسلئے یہاں شمار میں نہیں لی گئیں۔ حمد اللہ کے چار اولادیں ہیں دو لڑکے ساجد اور شاہد اور دو لڑکیاں حمیرا اور ناہید ہیں۔ امۃ السلام کے پانچ اولاد ہوئیں، دو لڑکے لطیف احمد، حنیف احمد۔ تین لڑکیاں۔ امۃ الرحمان، امۃ الدیان۔ امۃ السبحان۔ ان میں سے لطیف احمد کے چار اولاد ہوئی۔ حنیف احمد کے دو اولاد۔ امۃ الرحمان کے سات اولاد۔ امۃ السبحان کے چھ اولاد۔ امۃ المنان کے سات اولاد ہوئی، چار لڑکے۔ اسرائیل۔ الیاسین۔ یامین۔ سموئیل اور تین لڑکیاں نعیمہ۔ حسینہ۔ طیبہ۔ ان میں سے اسرائیل کے سات اولاد۔ الیاسین کی دو اولاد۔ یامین کی چھ اولاد۔ سموئیل کی اولاد کا علم نہیں۔ نعیمہ کے تین اولاد۔ حسینہ کے آٹھ اولاد۔ طیبہ کی اولاد کا علم نہیں۔ پھر ان اولادوں کی اولاد کافی ہے مگر مجھے تعداد اور اسمار کا علم نہیں۔

کلثوم کے دو اولاد۔ بشیر احمد۔ جمیل احمد ہیں۔ ان دونوں کے بھی اولادیں ہیں جن کی تعداد و اسمار کا مجھے علم نہیں۔ اسی طرح ان اولادوں کی اولاد بھی کافی ہے۔ جن کی تعداد اور کثرۃ کا تو علم ہے۔ لیکن تعداد اور اسمار کا پتہ نہیں ہے ان میں سے بہت سے تو پاکستان میں ہیں اور بہت سے ہندوستان میں ہیں مگر ان میں سے بعض نے دکن میں سکونت اختیار کرلی ہے اور بعض نے بمبئی اور دوسرے مقامات میں، اسلئے ان کے اعداد و شمار سعی سے ہی معلوم ہو سکتے ہیں جتنوں کا مجھے خود علم تھا یا حضرت والدۂ ماجدہ دام ظلہا اور حضرت عمۃ محترمہ مدظلہا سے دریافت کرنے پر علم ہوا، ان کے اسمار اور اعداد ذکر کردیئے گئے۔

(۲) رقیہ کے صرف ایک صاحبزادے ہیں مولوی محمد عمر (ناظم متفرقات دارالعلوم دیوبند) اور ان کے نو اولاد ہیں۔

الحاصل یہ تفصیل بقدر علم حضرت والا کی صہری اولاد کی ہے جس کی تعداد نواسی تک پہونچتی ہے اور گذر چکا ہے کہ نسبی اولاد کی تعداد ۷۹ ہے۔ اس لئے نسب و صہر کی اولاد کی مجموعی میزان ۱۶۸ تک ہو جاتی ہے (بقیہ ص۵۰۸ پر)

مگر شرعی حدود کے تکلفات میں قیاس تو یہی چاہتا ہے کہ کوئی کمی نہ کی گئی ہوگی۔ ریل کا تو وہ زمانہ تھا نہیں۔ رتھوں، بہلیوں، چھکڑوں پر یہ برات نانوتہ سے دھوم دھام سے نکلی ہوگی کہ شیخ اسد علی صاحب کے اکلوتے قرۃ العین کی یہ شادی تھی، لیکن بجز اس بات کے جس کے راوی حضرت الا کے حفید سعید مولانا محمد طیب ہیں۔ براہ راست اپنی جدہ ماجدہ سے سن کر یہ روایت درج کی ہے لکھتے ہیں کہ

"احقر کی دادی صاحبہ (یعنی اہلیہ محترمہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) فرمایا کرتی تھیں کہ میرے والد (شیخ کرامت حسین رئیس دیوبند) نے حضرت سے نکاح کر کے مجھے رخصت کیا، تو اس زمانہ کے لحاظ سے "جہیز بہت بڑا اور عظیم الشان" دیا"۔

پھر اس بڑے اور عظیم الشان جہیز کی تفصیل کرتے ہوئے مولانا ہی لکھتے ہیں کہ ان کی دادی صاحبہ کہتی تھیں کہ

"جس میں قیمتی زیورات، کپڑے، اور تانبے کے برتنوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا"!

بس لے دیکر رئیس دیوبند کی صاحبزادی کی تقریب شادی کے سلسلے میں یہی تین باتیں معلوم ہو سکیں کہ زیورات بھی قیمتی دیئے گئے تھے، اور کپڑوں کے ساتھ تانبے کے برتنوں کا بہت بڑا ذخیرہ جہیز میں دیا گیا تھا، لیکن براتیوں کی تعداد کیا تھی، برات کو کھانا جو کھلایا گیا تھا، اس کی نوعیت کیا تھی یہ اور اس قسم کی دوسری باتوں کے متعلق تلاش کے باوجود ہمیں کوئی آگاہی نہ حاصل ہو سکی۔ حالانکہ عموماً براتوں کی یہی باتیں مشہور ہوتی ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ خلاف توقع ایسی شادی کے متعلق ایسی باتوں سے واقفیت کی صورت نکل آئی ہے۔ جن کے علم کو کرامت کے سوا اور کیا سمجھا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ شب عروسی میں دولھا دولہن جب پہلی دفعہ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو خلوت اور تنہائی کے اس عالم کی روئداد تک رسائی کی۔ آپ ہی بتائیے کہ صورت کیا ہے؟ لیکن سیدنا الامام الکبیر کی منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی رفیقۂ حیات کے ذریعہ

(بقیہ صفحہ ۵۰۶) اگر نام معلوم الاسم والعدد اولاد کے اسماء و اعداد کا علم ہو جائے تو اندازہ یہ ہے کہ اس ذریۂ قاسمیہ کی تعداد دو سو سے متجاوز ہو جائے گی۔ "محمد طیب غفرلہٗ"

خلوت کی یہ مجلس جلوت والوں کے لئے ایک مستقل درس عبرت و بصیرت بن گئی ہے مولانا محمد طیب صاحب کی اسی تحریری یادداشت میں ہے، ارقام فرماتے ہیں کہ ان کی دادی صاحبہ یہ بھی فرماتی تھیں

"حضرت جب شب اول میں تشریف لائے تو آتے ہی نوافل شروع فرمائیں"

واللہ اعلم بالصواب "نوافل" کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہا، فرماتی تھیں کہ

"نوافل سے فارغ ہونے کے بعد میرے پاس تشریف لائے"

پاس تشریف لانے کے بعد پھر کیا ہوا ان ہی کا بیان ہے کہ "انتہائی سنجیدگی اور متانت" کے ساتھ کچھ کہتے چلے جارہے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب کیا کیا فرمایا، ہم تک جو روایتیں پہونچی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ کو مخاطب کر کے پہلے ایک تمہیدی مقدمہ پیش کیا کہ

"جب تم کو اللہ نے میرے ساتھ وابستہ کر دیا، تو نبھاؤ کی ضرورت ہے"

پھر اسی تمہیدی مقدمہ کو بنیاد بنا کر ارشاد ہوا، اور کیسی حکیمانہ استوار بات ارشاد ہوئی۔

"مگر بصورت موجودہ نبھاؤ میں دشواری ہے کہ تم امیر ہو اور میں غریب و نادار ہوں"

عدم توافق کی اس صورت حال کو پیش کرتے ہوئے منطقی شکل میں توافق کے امکانات کو پیش کر کے حضرت نے فرمایا کہ

"صورتیں اب دو ہی ہیں، یا میں بھی تونگر بنوں، یا تم میری طرح نادار بن جاؤ"

اور اسکے بعد اپنے حال اور اپنے رجحانات کو ظاہر کرتے ہوئے پہلی دفعہ بیوی صاحبہ کو دو ٹوک لفظوں میں مطلع فرمایا کہ

"میرا امیر بننا تو دشوار ہے"

عملی شکل صرف یہی رہ گئی حضرت نے فرمایا کہ

"اس لئے آسان صورت دوسری ہو سکتی ہے کہ تم میری طرح ہو جاؤ"

مولنا طیب صاحب نے بھائی صاحب (مرحوم) کے حوالہ سے اس روایت کو درج کر کے پھر اپنی سنی ہوئی روایت کو ان لفظوں میں پیش کیا ہے، یعنی ان کی دادی صاحبہ نے فرمایا کہ قریب آنے کے بعد متانت و سنجیدگی کے ساتھ حضرت ان لا سے کہہ رہے تھے کہ

"حق تعالیٰ نے تمہارے ساتھ میرا جو تعلق قائم فرمایا ہے، اس میں مجھے تربیت کا منصب اور تجھے اطاعت کا منصب دیا ہے۔"

یہ تو تمہید تھی، تمہید کے بعد ان کو سمجھایا جارہا ہے، کہ قدرتی حق کے ساتھ

"اگر تم کو کسی بات کا حکم دوں، جس میں تمہارا ہی نفع ہو، تو کیا تم کو مجھ پر اعتماد ہوگا؟"

نئی نویلی بھولی بھالی دلہن سے یہ پہلا سوال تھا، ابتدا میں جیسا کہ چاہیئے تھا ان ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خاموشی کے سوا ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں پایا گیا۔ مگر جواب کے لئے جب اصرار آخری حدود تک پہنچ گیا تو کہتی تھیں کہ

"کئی بار فرمانے پر بالآخر میں نے عرض کیا کہ مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔"

بہر حال جب قول و قرار میں عزم و ارادہ کی پوری قوت حضرت والا پر منکشف ہوئی تو نسوانی جنس سے تعلق رکھنے والے نازک دل پر آپ کی طرف سے پہلی دفعہ خلوت کی پہلی ہی مجلس میں ایسا بوجھ ڈال دیا گیا کہ اس وقت بھی جب میں اس کا تصور کرتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔

عورت اور زیور اگرچہ دونوں واقع کے لحاظ سے دو جداگانہ حقیقتیں ہیں، لیکن اس واقعہ کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عورت کا تخیل بھی زیور کے بغیر دوسرے نہیں کرسکتے۔ بلکہ جہاں تک مشاہدات کا تعلق ہے خود عورت بھی اپنے آپ کو زیور کے خیال سے الگ کر کے شاید سوچ نہیں سکتی، بناؤ سنگار زیب و زینت، آرائش و زیبائش اور جن چیزوں سے ان کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہو، ان کے خیال سے مشرق کی عورت ہو یا مغرب کی، نہ پہلے کبھی خالی نظر آئی ہے اور نہ آج تک اس خیال سے جیسا کہ چاہیئے اسے آزادی میسر آئی ہے

آج بھی یورپ و امریکہ کے بازاروں کا سب سے زیادہ چالو سودا جنس نسوانی کے زیب و زینت کا سامان ہی بنا ہوا ہے، دنیا کی تجارتی روئدادیں اسی کی شاہد ہیں، قرآن میں بھی اَوَ مَن یُنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ کے الفاظ سے صنف لطیف کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بہر حال کہنا یہ ہے، راویوں کا بیان ہے کہ جب حضرت والا کی اہلیہ محترمہ نے آپ پر کامل اعتماد ہونے کا یقین دلایا تو اسی کے بعد وہ سن رہی تھیں کہ نوجوان دولھا اپنی دلہن سے یہ کہہ رہا ہے کہ

"اچھا سب زیور اتار کر مجھے دے دو"

زیوروں کو اتار کر حوالہ کر دینے کا حکم تو فوری تھا، اور اسی کے ساتھ یہ اختیار طلب کیا گیا کہ

"جس قدر تمہارے ساتھ کپڑے، اور برتن ہیں، ان کا بھی مجھے اختیار دے دو"

برتن سے تو خیر بناؤ سنگار، زیب و زینت کا تعلق نہ تھا، لیکن جذبات کی روح "زیورات" کا اسی وقت اتروا لینا، اور اسی پر بس نہ کرنا، بلکہ لے دے کر کپڑوں کی شکل میں ان جذبات کی تسکین کی، تھوڑی بہت جو ضمانت تھی، ان سے بھی محروم کر دینے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لینا کہہ دینے کی حد تک تو ممکن ہے کہ آسان سی بات معلوم ہو، لیکن تجربہ ہی بتا سکتا ہے کہ اس قسم کے مطالبات نسوانی عواطف و میلانات میں کس قیامت کو برپا کر سکتے ہیں، مولنا طیب صاحب کی روایت ہے کہ دونوں مطالبات یعنی زیور سے فوراً خالی ہو جانے پر تیار ہو جانا، اور کپڑوں اور برتنوں کے متعلق آئندہ اختیار بدست مختار سپرد کر دینا، دونوں ہی کے مطالبات کو سن کر آپ کی بانوئے بلند اختر نے بغیر کسی تذبذب اور دغدغہ کے عرض کیا کہ

"آپ کو کلی اختیار ہے"

آگے کیا ہوا؟ عام طور پر تواتر کی شکل میں یہ روایت مشہور ہے کہ "روم و روس" کی جنگ کے نام سے جو لڑائی خلیفۃ المسلمین کے مقابلہ میں لڑی جا رہی تھی، اسی جنگ میں ترکی کی امداد کے فنڈ میں اپنی دلہن سے پہلی شب کے اتروائے ہوئے ان ہی زیوروں کو سیدنا الامام الکبیر نے شریک فرما دیا۔

روم یعنی ترکی اور روس کے درمیان جنگوں کا قصہ انیسویں صدی عیسوی میں وقفہ وقفہ سے چھڑتا رہتا تھا، یقینی طور پر نہ معلوم ہو سکا کہ اس سلسلہ کی یہ کون سی جنگ تھی، تاہم قرائن و قیاسات کا اقتضا یہی ہے کہ ہندوستان کی جنگ

آزادی ۱۸۵۷ء میں جو لڑی گئی، اس سے چار سال پہلے ۱۸۵۳ء میں کریمیا والی لڑائی روسیوں اور ترکوں میں جو ہوئی تھی، اور جیسا کہ اس جنگ میں حالات کا اقتضاء یہ ہوا کہ فرانس اور انگریز دونوں ترکی کے طرفداروں میں شریک ہو گئے تھے۔ روس کو اس جنگ میں فاش شکست ہوئی تھی جس کے بعد پیرس کا عہد نامہ ترکوں اور روسیوں کے درمیان طے پایا تھا، اور کچھ دنوں کے لئے اسی عہد نامہ کی بدولت ترکی کو سر کھجانے کی فرصت روس سے گونہ مل گئی تھی، بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اسی جنگ سے اس امداد کا تعلق تھا۔ انگریزوں نے مسلمانان ہند کو ترکوں کی امداد سے اسی لئے نہیں روکا تھا کہ وہ خود اس جنگ میں ترکوں کے طرفداروں میں تھے۔

بلکہ اسی بنیاد پر یعنی اگر یہ مان لیا جائے کہ ۱۸۵۳ء والی روم وروس والی جنگ سے اس واقعہ کا تعلق تھا، اسی سے یہ بھی متعین ہو جاتا ہے کہ ازدواجی زندگی کے دائرہ میں سیدنا الامام الکبیر کی شرکت قریب قریب اکیس اور بائیس سال کی عمر میں ہوئی، ۱۸۵۳ء میں یہی عمر آپ کی ہونی چاہیئے۔

بہرحال کہنا یہ ہے کہ زیور تو پہلی ہی رات کو اتروا دیئے گئے، اور جب صبح ہوئی تو جیسا کہ مولنا طیب صاحب ہی کی روایت ہے کہ

"علی الصباح تمام زیورات، تمام جوڑے کپڑوں کے، اور سارے برتن جو ہزاروں روپے کا سامان تھا، سب کا سب چندۂ سلطانی میں دے دیا۔"

اور یوں دیوبند کے رئیس کی لڑکی، نانوتہ کے ایک فقیر کی حقیقی معنوں میں رفیقۂ حیات بن گئیں، کوتاہ بینوں نے سمجھا کہ جو آسمان پر تھیں زمین پر اتار دی گئیں، لیکن جن کی نظر ظاہر سے زیادہ باطن پر، اور حال سے زیادہ استقبال پر تھی وہ دیکھ رہے تھے کہ رات صرف ایک رات کی رفاقت نے ایک معمولی شیخزادی کو ارتقاء وعروج کے کتنے آسمانوں کو

طے کرادیا، باہر ہی سے خالی نہ ہوجانا، بلکہ دل سے بھی ان ساری چیزوں کا نکل جانا، جن سے بھری ہوئی وہ سسرال میں پہلی دفعہ آئی تھیں، بجز ولایت اور کرامت کے اس کی توجیہ اور کیا کی جائے حضرت شاہ فضل رحمٰن قطب العصر جو فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد قاسم کو نوعمری ہی میں ولایت مل گئی۔ اس دعوے کے ثبوت کیلئے آخر اور کیا چاہا جاتا ہے، اکیس بائیس سال کی عمر عین ریعان شباب کا عہد شاداب ہے جس ساز و سامان کی ضرورت اس عہد میں ہوتی ہے سب سامنے لاکر رکھدیئے جاتے ہیں، لیکن ہمت کی بلندی دیکھئے کہ ٹھکرانے والا سب ہی کو ٹھکراکر آگے نکل جاتا ہے، اور بات اسی پر ختم نہیں ہوجاتی ہے مولانا طیب ہی کی روایت میں ہے کہ باپ کے دیئے ہوئے طلائی و نقرئی زیوروں اور قیمتی جوڑوں سے خالی ہوکر جب سسرال سے پہلی دفعہ ان کی جدّہ ماجدہ دیوبند اپنے والد کے گھر تشریف فرما ہوئیں تو خود فرمایا کرتی تھیں کہ

"میں جب دیوبند (نانوتہ) سے واپس ہوئی، تو رئیس باپ نے میرے ہاتھ پاؤں، ناک کان کو خالی دیکھ کر پوچھا کہ "زیور کیا ہوا؟"

جو واقعہ پیش آیا تھا، والد کے سامنے سب دہرا دیا گیا، سنکر شیخ کرامت حسین صاحب زبان سے تو کچھ نہ بولے لیکن دل میں خیال بے چارے کے آنے لگا کہ آخر میری بچی اعزہ اقربار کے سامنے ننگی بنی ہوئی کب تک رہیگی؟ خدا کے فضل سے کسی قسم کی تنگی بھی نہ تھی، شیخ صاحب نے جیسا کہ مولانا طیب نے لکھا ہے،

"پھر از سر نو پورا جہیز تیار کیا"

"پورا جہیز" سے غالباً مقصد یہی ہے کہ مافات کی تلافی صرف زیوروں ہی کی حد تک محدود نہ تھی، بلکہ کپڑوں جوڑوں، برتنوں، الغرض جو کچھ لیا گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر ایک ایک چیز شیخ صاحب کی طرف سے تیار ہوئی اور جب دوبارہ میکے سے سسرال لڑکی رخصت ہونے لگی تو مولانا طیب صاحب نے اپنی دادی جان کے سنے ہوئے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ

"میں پھر لد پھند کر، دوبارہ سسرال پہونچی"

دن تو خیر کسی طرح گذر گیا۔ رات آئی واپسی کے بعد پہلی رات آئی، اسمیں کیا ہوا، ان ہی کی زبانی سنئے، فرماتی تھیں،

"رات کو حضرت (سیدنا الامام الکبیر) تشریف لائے"!

دیکھا کہ جن چیزوں سے خالی کرانے میں کامیاب ہوا تھا، پھر وہی ساری چیزیں لپٹی ہوئی ہیں، گفتگو کی ابتدا، جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے۔

"پھر ترغیب آخرت"

سے شروع ہوئی اور "کل" کی تیاری کیلئے "آج" کا اختیار پھر ان چیزوں کے متعلق آپ نے اپنے ہاتھ میں لے لینے کی خواہش ظاہر کی۔ "اختیار" جو پہلے ہی دیا جا چکا تھا، اسکی واپسی کا سوال ہی کب پیدا ہوا تھا، کہہ دیا گیا کہ آپ "مختار" ہیں۔

رات تو افہام و تفہیم، عہد و میثاق کے تذکروں میں گذری، صبح ہوئی، اور وہی تماشا جو پہلی رات کی صبح کے بعد دیکھا گیا تھا، اس رات کے بعد آنے والی صبح میں دیکھنے والوں کے سامنے تھا، خود وہی جن کے ساتھ واقعہ گذرا یعنی مولنا طیب صاحب کی دادی صاحبہ بیان کرتی تھیں کہ

"صبح ہی یہ ہزاروں روپے کا سامان پھر سلطانی چندہ میں دے ڈالا"۔

شبہ ہو سکتا ہے کہ فوری مرعوبیت کا ممکن ہے کہ یہ فجائی اور اضطراری نتیجہ ہو، لیکن معتبر راویوں ہی کی زبانی ہم تک یہ خبر پہنچ چکی ہے۔ مولانا طیب صاحب ہی کا بیان ہے کہ ان کی جدہ ماجدہ حضرت نانوتوی کی اہلیہ محترمہ عموماً کہا کرتی تھیں کہ،

"اس کے بعد (یعنی حضرت والا کے دوسری بار کے اس طرز عمل کے بعد) میرے قلب سے روپیہ پیسہ اور زیور وغیرہ کی محبت ہی قطعاً نکل گئی"!

صرف "قطعاً نکل گئی" یہی نہیں بلکہ وہی فرمایا کرتی تھیں کہ

"بلکہ ان اشیاء (زیورات وغیرہ) سے ایک قسم کا تنفر پیدا ہو گیا"۔

بدلے ہوئے دل کی یہ کیفیت کتنی راسخ اور صادق کیفیت تھی کہ آئندہ ان ہی کا بیان ہے۔

"پھر عمر بھر نہ میں نے زیور بنوایا اور نہ فاخرہ لباس کی مجھ میں کبھی ہوس یا آرزو پیدا ہوئی"۔ صفحہ ۲۶

ظاہر ہے کہ چوبیس گھنٹہ ساتھ رہنے والے عزیزوں اور بچوں کے سامنے ان کا یہ دعویٰ کہ میں نے کبھی نہ

زیور ہی بنوائے اور نہ فاخرہ لباس کا شوق ہی پیدا ہوا۔ صرف دعویٰ ہی نہیں ہے بلکہ جس دعویٰ کے زندہ شاہد اور گواہ ان کے سامنے موجود تھے ان کے تائیدی مشاہدات بھی اس دعوے کے پیچھے پوشیدہ ہیں دیکھنے والوں کا علم خدانخواستہ اگر اسکے مطابق نہ ہوتا تو یقیناً انہیں کے سامنے اس دعوے کی جرات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

کچھ بھی ہو توجہ دی گئی یا سننے والے کی ذاتی صلاحیت کا یہ نتیجہ تھا کہ نسوانی جذبات کا متلاطم سمندر کسی طویل کش مکش کے بغیر چند لمحوں میں جم کر ساکن ہو گیا اور ہمیشہ کیلئے ساکن ہو گیا۔

الغرض دینے والے سے شیخ کرامت حسین کو ملتا تھا، اور وہ اپنی لڑکی کے حوالہ کرتے تھے، لڑکی کو باپ سے جو کچھ ملتا تھا، سب کو اپنے شوہر کی مرضی اور اختیار کے سپرد کر دیتی، اور شوہر پھر دینے والے ہی کے قدموں پر سب کو لاکر نچھاور کر دیا کرتا تھا۔ لین دین، داد و ستد کا یہی ایک دلچسپ چکر تھا، جو گھوم رہا تھا، مولانا طیب صاحب کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے، کہ دو دفعہ یہی صورت پیش آئی لیکن جس جذبہ کے تحت ایک دفعہ دینے کے بعد شیخ کرامت حسین مرحوم نے دوبارہ اپنی بچی کو نئے سرے سے پھر جہیز کا سامان تیار کرا دیا تھا، کیسے سمجھا جائے کہ لدی پھندی بھیجی ہوئی وہی صاحبزادی پھر ننگے ہاتھ پاؤں کان اور ناک کے ساتھ جب ان کے گھر واپس ہوتی ہوگی تو اس حال پر وہ صبر کر سکتے تھے۔ بلکہ ضیافت و مہمان نوازی کے سلسلے میں سیدنا الامام الکبیر کی اولوالعزمیوں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف امام نے اپنی کتاب میں جو یہ اطلاع دی ہے، کہ

"جب وطن آتے، اور یہاں مہمان آتے، والدین کو دشواری ہوتی، تب یہ کیا کہ بی بی کا زیور اس کی اجازت سے بیچ کر صرف کر دیا" ص۳۲

ظاہر ہے کہ یقیناً یہ زیور وہ زیور تو ہو نہیں سکتے، جو جہیز کے نام سے پہلی دفعہ اور دوسری دفعہ آپکی اہلیہ کو والد کے یہاں سے ملے تھے۔ کیونکہ اس سلسلہ کی تو جتنی چیزیں تھیں، وہ سلطانی چندے کی نذر ہو چکی تھیں، بظاہر یہی خیال گذرتا ہے کہ شیخ کرامت حسین صاحب وقتاً فوقتاً بعد کو بھی اپنی صاحبزادی کو کچھ زیور بنوا دیا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ جب تک ترکی فنڈ کی گرما گرمی کا زور رہا ہو اس وقت

تک تو شیخ صاحب نے اس لئے خاموشی اختیار کر لی ہوگی، کہ جو کچھ دیا جائیگا ترکی کے چندے میں دے دیا جائیگا۔ لیکن گو نہ اس خطرے سے اطمینان کی صورت جب پیدا ہوئی ہوگی تب کچھ زیور پھر باپ کی طرف سے بیٹی کے لئے تیار کرا دیئے گئے ہوں، لیکن شیخ صاحب بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ ترکی فنڈ میں چندہ دینے والا یاد لانے والا ترکی فنڈ میں نہیں، بلکہ اس کی خدمت میں پیش کر رہا تھا، جو ترکی فنڈ کے قائم ہونے سے پہلے موجود تھا، اور اس کے بعد بھی اس کا مطالبہ باقی رہتا ہے، ترکی فنڈ تو اسی کی خدمت میں پیش کرنے کا ایک ذریعہ تھا، وہ ذریعہ ختم ہو گیا، تو بے شمار ذرائع اسکے بعد بھی باقی تھے، جن میں اکرام ضیف یا مہمان نوازی کی مد بھی تھی، اسی مد میں پھر اس زیور کی قیمت خرچ ہو جاتی تھی جو باپ کی طرف سے بیٹی کو ملتے تھے۔

آخر روایتوں میں جب اس قسم کی روایت بھی ملتی ہے، مثلاً مولانا طیب صاحب ارقام فرماتے ہیں،

"ایک دفعہ کا ذکر ہے، کہ کسی معتقد نے ایک چادر بیش قیمت، اور ایک عدد زیور طلائی بی بی صاحبہ (یعنی حضرت نانوتوی کی اہلیہ محترمہ) کی ملک کر کے بھیجا"

خاص طور پر بی بی صاحبہ کی ملکیت کی تصریح پیش کرنے والے کی طرف سے اس لئے کی گئی تھی، کہ حضرت والا کے پاس خواہ عورتوں ہی کے استعمال کی چیز کیوں نہ پیش کی جاتی، لیکن عام دستور تھا کہ آپ بجائے اپنے گھر کے کسی دوسرے ضرورت مند کے گھر اسے بھیج دیا کرتے تھے، آپ کی اس عام عادت سے چونکہ پیش کرنے والے صاحب واقف تھے۔ اس لئے خاص کر کے انہوں نے کہا کہ بی بی صاحبہ کو میں ان چیزوں کا مالک بناتا ہوں۔ آپ صرف ان تک فقیر کے اس ہدیے کو پہنچا دیجئے۔ ظاہر ہے کہ شرعاً تصرف کی صورت اب باقی ہی کیا رہی تھی، حفظ ما تقدم کی اس احتیاطی تدبیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس کی امانت تھی اس تک امانت تو پہنچ گئی، لیکن ادار امانت کے بعد اپنے اختیار کی جو بات تھی بی بی صاحبہ کے سامنے باین الفاظ اسے پیش کرنے لگے کہ

"فی الحقیقت چادر اور زیور سے دل خوش ضرور ہوتا ہے لیکن چند روز کے استعمال سے یہ دونوں ہی چیزیں خراب ہو جائیں گی"

اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ

"جو کام اس پشمین چادر سے نکلے گا، وہی لٹھے کی سفید چادر سے بھی نکل سکتا ہے۔"

ان دونوں باتوں کو ذہن نشین کرانے کے بعد فرمایا کہ خراب ہونے سے چاہتی ہو کہ تمہاری چیز محفوظ ہو جائے تو یہ دونوں چیزیں چادر اور زیور دونوں کو اس کی حفاظت میں دیدو جسکی حفاظت میں پہنچ جانے والی چیزیں کبھی خراب نہیں ہوتیں، مطلب یہ تھا کہ کسی مستحق کے حوالہ کر دو، حضرت کے الفاظ تھے کہ

"خداوند تعالیٰ ان کے عوض، عاقبت میں پائدار لباس، اور زیور عطا فرمائیں گے۔"

باپ کی عطا کی ہوئی چیزوں کو شوہر کی مرضی کے مطابق جو بار بار اسی راہ میں لٹا چکی تھیں۔ اسلام کی اس دلبر خاتون کے لئے غیر کے پیش کئے ہوئے تحفہ کی سپردگی میں ہچکچانے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی، مولانا طیب صاحب نے اطلاع دی ہے کہ

"بی بی صاحبہ نے فوراً (چادر پشمین طلائی زیور دونوں کو) دے دیا، اور دل پر میل نہ آیا۔"

میں نے جس "چکر" کا ذکر کیا اس سے اشارہ دراصل لین دین کے ان عجیب و غریب واقعات کی طرف ہے، دینے والا دینا جاتا تھا، اور لے لے کر جو کچھ ملتا تھا اسے پھر اسی دینے والے کے سپرد کر دیا جاتا تھا، یہی قصہ تھا، جو جاری اور مسلسل جاری تھا، مولانا طیب صاحب کے الفاظ میں واقعہ کی صورت یہ تھی کہ

"مولانا (نانوتوی) کے معتقد آپ کی بی بی کے واسطے قیمتی لباس اور زیور بنا کر بھیجتے مگر مولانا (بجائے بی بی صاحبہ) کے مساکین کو دے دیا کرتے اور بی بی صاحبہ کو خبر بھی نہ کرتے۔"

شاید میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ عورت بہر حال عورت ہوتی ہے، عام حالات میں چاہئے تو یہی تھا کہ داد و ستد لین دین کا یہ عجیب و غریب "چکر" کم از کم عورت کو چکرا دیتا، لیکن واقعات بتاتے ہیں، جن کے مشاہدہ کرنے والے اس وقت تک موجود ہیں کہ چکرانا تو چکرانا، اللہ کی یہ ایک نیک بندی اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں،

دل جس کی انگلیوں میں ہیں، جب اسی کو راضی کر لیا جاتا ہے، تو سارے دل والے بھی اس سے راضی ہو جاتے ہیں، اسی کا یہ کتنا زندہ ثبوت تھا، جس کا مشاہدہ عائلی زندگی کے اس نمونے میں کیا گیا تھا۔

زن و شو کے باہمی تعلقات کی خوش گواریوں کا شاید وہ تصور بھی نہیں کر سکتے، جو اپنی بیویوں کو بشاش و بشاش رکھنے کے لئے انکے نسوانی چونچلوں کی تکمیل ہی میں اپنی ساری توانائیوں کو گم کر دیتے ہیں، جہاں تک میری معلومات ہیں، میں نہیں جانتا کہ سیدنا الامام الکبیر کو اپنی رفیقۂ حیات زوجۂ محترمہ کے طرزِ عمل سے کسی زمانہ میں کسی قسم کی شکایت کبھی پیدا ہوئی، باپ کے گھر سے لائے ہوئے زیوروں اور جوڑوں سے بھی ان کو محروم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ دوسرے پیش کرتے ہیں، تو اس کے استعمال کی بھی اجازت نہیں دیتے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن بغیر کسی جھنجھلاہٹ کے بیوی نے اپنے آپ کو شوہر کی مرضی اور خوشی میں کچھ اس طرح جذب کر دیا تھا، کہ جو کچھ ہوتا جا رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہی ان کا دل بھی چاہتا تھا، خانگی، یا عائلی زندگی کی خوش گواریوں کی روح سچ پوچھئے تو نہ دولت ہے، نہ غیر معمولی ثروت و امارت، میاں بیوی کے دل مل گئے، سمجھ لیجئے، کہ اسی زندگی میں آسمان کی جنت تھوڑی دیر کے لئے آپ کے گھر اُتر آئی۔

حیرت ہوتی ہے کہ دیوبند سے بیاہ کر جب آپ کی اہلیہ محترمہ نانوتہ تشریف لائی تھیں، اس وقت جیسا کہ بیان کر چکا ہوں، سیدنا الامام الکبیر کے والد اور والدہ دونوں ہی بقیدِ حیات تھے، ایک نئی نویلی الھڑ مومنہ غافلہ دلہن پر ایک نہیں، تین تین دلوں کی خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل کا بار اچانک ایک دفعہ پڑ گیا تھا۔ مگر مصنف امام جیسے ثقہ و حجت راوی کی آنکھوں دیکھی یہ شہادت ہے کہ

"وہ آپ کی (اہلیہ محترمہ) ایسی تابعدار تھیں کہ والدین (یعنی حضرت والا کے والدین) کی خدمت میں جو مشقت اٹھائی، مولوی صاحب کی مزاج داری ان کو علاوہ براں ہوئی" ص ۳۲

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں بظاہر ناخوشی کی وقتی صورت کبھی پیش بھی آجاتی تھی تو مصنف امام ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق خود حضرت والا کی مزاج داریوں سے نہیں، بلکہ کوتاہی کا شبہ والدین کی خدمت کے متعلق کبھی کبھی شاید ہو جاتا، لے دے کر بس اس قسم کی وقتی ناخوشی کا تعلق عموماً اسی سے ہوتا ہے، مصنف امام کے ان الفاظ سے یعنی

"اور والدین کی رضا کے لئے جب ناخوش ہوتے تو ان ہی (اہلیہ محترمہ ہی) کو کچھ

کہہ لیتے "۔ ص۳۲

اس نے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے، واللہ اعلم بالصواب، وقتی ناخوشی کے ان لمحوں میں زبان مبارک پر کس قسم کے الفاظ آجاتے تھے لیکن اپنی دادی صاحبہ قدس سرہا کی زبانی مولانا طیب صاحب نے یہ روایت جو نقل کی ہے، یعنی حضرت والا کی اس غذائی دستور کا ذکر کرتے ہوئے کہ

"حضرت (نانوتوی) کی عادت شب کو سوتے وقت دودھ کے استعمال کی تھی، گائے کا دودھ استعمال کرتے تھے، شب کی غذا عامۃً ہی یہ ہوتی تھی "۔

مولانا طیب صاحب کی جدہ ماجدہ نے فرمایا کہ

"جب حضرت نماز عشار سے فارغ ہو کر آتے، اور بالاخانے پر تشریف لے جاتے تو دودھ کا پیالہ لے کر میں پہنچ جاتی "۔

آگے جس دل چسپ واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اسی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، وہی فرماتی تھیں کہ قاعدہ یہ تھا کہ

"میرا انتظار اگر کرتے تو یہ علامت خوش دلی کی ہوتی، اور اگر انتظار کئے بغیر نوافل میں مشغول ہو گئے تو یہ علامت ناگواری کی ہوتی تھی "۔

عملاً اپنی ناگواری کو جو زیادہ سے زیادہ "نوافل کی مشغولیت" کی شکل میں ظاہر کرنے کا عادی ہو، اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ لفظی شکل میں بھی اس کی ناگواری کے ظہور کا رنگ کیا ہوگا ؟- اگرچہ "نوافل کی مشغولیت" والی یہ شکل بعض دفعہ ناقابل برداشت حد تک ترقی کر جاتی تھی، اسی روایت میں ہے کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ

"حضرت نے نوافل میں پوری شب گذار دی، اور میں بھی پوری شب پیالہ لئے کھڑی کی کھڑی رہ گئی "۔

مولانا طیب صاحب نے اس کے بعد اپنی طرف سے لکھا ہے کہ

"نہ معلوم مجاہدہ ہی کرانا مقصود ہوتا ہوگا "۔

آخر اپنی جن دادی صاحبہ میں مولانا طیب صاحب بھی سالہا سال تک ان خصوصیتوں کو تماشہ کرتے رہے ارقام فرماتے ہیں کہ

"اذان کی حی علی الصلوٰۃ پر کام کو چھوڑ کر اس طرح اٹھ جاتی تھیں کہ گویا اس کام سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ تھا' بالکل ہر چیز سے بے گانہ بن جاتیں"

علاوہ فرائض وسنن و نوافل کے دوامی التزام جن کا یہ تھا کہ

"بعد نماز صبح سر پر اور منہ پر اپنا دوپٹہ ڈال کر ہلکی ضرب سے ذکر کیا کرتی تھیں' آندھی ہو' مینھ ہو' سردی ہو' گرمی ہو' اس میں بال برابر فرق نہیں آتا تھا"

ناول خوانی اور رومانی خطوط نویسی کا سلیقہ جس تعلیم سے عورتوں میں عموماً زندہ اور بیدار ہو جاتا ہے اس نام نہاد تعلیم سے محروم رہ جانے کے باوجود خود مولانا طیب صاحب نے اپنی جن دادی صاحبہ میں گداز و رقت کی یہ کیفیت پائی ہو' ان ہی کے الفاظ میں سنئے فرماتے ہیں کہ

"میں نے (یعنی مولوی طیب نے) جب حدیث شروع کی' اور مشکوٰۃ میرے والد صاحب مرحوم کے یہاں شروع ہوئی' پھر دوسرے سال مسلم شریف بھی ان ہی کے یہاں ہوئی' تو میں سبق پڑھ کر گھر آکر سبق کی تقریر دادی صاحبہ کو سنایا کرتا تھا"

جانتے ہیں' نام نہاد تعلیم سے محروم رہ جانے والی اسلامی خاتون کے کانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا ترجمہ اور ان کے مطالب جب پہنچتے تھے' تو ان پر کس قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی' مولوی طیب صاحب ہی کا بیان ہے کہ

"جب تک میں تقریر کرتا رہتا تھا' ان کی (دادی صاحبہ) کی آنکھوں سے آنسو مسلسل جاری رہتے"

یہی سوچنے کی بات ہے کہ مجاہدہ اور ریاضت کے بغیر عمل و علم کی یہ ذوقی لطافتیں ہر ہر عامی آدمی کو کیا میسر آسکتی ہیں؟

بہر حال ازدواجی زندگی کے ابتدائی سالوں میں خوش گواریوں کے ساتھ کبھی کبھی ناگواری کی

تلخیاں اگر پیدا بھی ہو جاتی تھیں۔ تو ان کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مقصود ان سے کیا تھا؟ اور گو کوئی واضح شہادت اب تک اس کی مجھے نہیں مل سکی ہے، لیکن بظاہر قرائن کا اقتضا ہے کہ زیادہ تر ظاہری ناگواریوں کے یہ قصے غالباً اسی زمانہ تک محدود تھے۔ جب تک سیدنا الامام الکبیر کی والدہ ماجدہ بی بی جیبیہ قدس اللہ سرہا زندہ تھیں۔ ساس اور بہو اور دونوں میں چوبیس گھنٹہ کی رفاقت گھر میں رہتی تھی، ایسی صورت میں حضرت والا کی والدہ صاحبہ کو ہلکی سی شکایت بھی اپنی بہو کے کسی طرز عمل سے کبھی ہو جاتی، اور کسی طرح حضرت والا کو اس کی خبر ہو جاتی یا کسی وجہ سے اس کا وسوسہ بھی ہوتا کہ ماں کی خدمت میں کوتاہی ہوئی ہے پہلے بھی کہیں اس کا ذکر آ چکا ہے کہ اس وقت سیدنا الامام الکبیر فرماتے کہ

"میں نے تو ان ہی (والدہ ماجدہ) کی خدمت کے لئے یہ بار اپنے ذمہ رکھا، ورنہ میں فقیر آدمی تھا، مجھے ان چیزوں میں پھنسنے کی کیا ضرورت تھی" (روایات طاہرہ)

کچھ بھی ہو، خیال میرا یہی ہے کہ دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند والی کیفیت گھروں میں اس وقت تک کسی نہ کسی شکل میں بہرحال باقی ہی رہتی ہے۔ جب تک گھر کے انتظام میں بہو کے ساتھ ساس اور ساس کے ساتھ بہو دونوں کو دخل دینے کا موقعہ باقی رہتا ہے۔ اسی لئے مصنف امام کی اس اطلاع کا کہ

"آخر میں ان کے (یعنی اپنی اہلیہ محترمہ کے سیدنا الامام الکبیر) بڑے شکر گزار رہے" صہ ۳۲

مطلب میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ایک اقلیم کی دو بادشاہتوں کی شرکت کے اختتام کے بعد جو دور شروع ہوا۔ اس شکر گزاری کا تعلق اسی دور سے ہے، یعنی سیدنا الامام الکبیر کی والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد وقتی ناگواریوں کے اسباب کا بھی خاتمہ ہو گیا اور سیدنا الامام الکبیر کی وفات کے بعد دیکھنے والوں کو جن "مبشرات" سے سرفرازی میسر آئی تھی، ان میں ایک رؤیا مولنا طیب صاحب کی علاتی والدہ مرحومہ یعنی حافظ محمد احمد مرحوم کے محل اول کو جو ہوئی تھی، بیان کیا جاتا ہے،

مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں بھی ہے کہ خواب میں ان کی علاتی والدہ صاحبہ نے دیکھا کہ رنگ برنگ کے پھولوں سے بھرا ہوا ایک پلنگ آسمان پر ان کے گھر کے صحن میں اترا ہے، جس پر سیدنا الامام الکبیر جلوہ فرما ہیں ارشاد فرما رہے ہیں کہ میں وعظ کہنے کے لئے آیا ہوں، اور صبر کا اجر تم گھر والوں کے سامنے بیان کروں گا، اسی سلسلہ میں حضرت نے فرمایا کہ

"حافظ احمد کی والدہ (یعنی اپنی اہلیہ محترمہ) سے میں بہت خوش ہوں"

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ شکرگزاری کا جو احساس حضرت والا کے قلب مبارک میں اپنی زوجہ محترمہ کی خدمات کی وجہ سے پیدا ہوا تھا، اسی کا سلسلہ ناسوتی زندگی کے قالب سے الگ ہو جانے کے بعد بھی روح مبارک میں مسلسل باقی رہا۔ بلکہ عزت و وقار، جلال و جبروت کے جن حالات کا مشاہدہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات کے بعد آپ کی اہلیہ محترمہ کے متعلق کیا گیا، کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت والا کی روح پاک کی ان ہی رضامندیوں کے یہ آثار نہ تھے۔ مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں اپنی دادی صاحبہ کے ان دینی مشاغل اور پابندیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جنھیں نقل کر چکا ہوں، ان ہی کے ساتھ اپنی چشم دید گواہیاں یہ بھی درج کی ہیں، کہ

"حضرت (نانوتوی) کی نسبت سے ان کا (آپ کی دادی صاحبہ کا) ایک خاص مقام تھا، جو برادری میں ممتاز تھا"

اسی امتیاز کو مثالوں سے سمجھاتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ

"بڑی سے بڑی خاتون، ان کے لئے سرہانا چھوڑ دیتی تھیں"

اور عام دستور یہ ہو گیا تھا کہ

"برادری میں دلہن پالکی سے اس وقت تک نہیں اتاری جاتی تھی، جب تک کہ وہ (یعنی آپ کی دادی صاحبہ) سر پر ہاتھ نہ رکھ دیں، (اسی طرح) کھانا تقسیم نہ ہوتا تھا جب تک کہ ان سے اس کی ابتدا نہ کرائی جائے"

فرماتے ہیں کہ

"غرض امیر و غریب، سب انکی (دادی صاحبہ) کی عزت کرتے تھے، اور ان سے دبتے تھے"۔

دبنے کا حال جیسا کہ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے، یہ تھا کہ اور تو اور

"بسا اوقات حضرت شیخ الہند اور اکابر اساتذہ (دارالعلوم دیوبند) پر کسی وجہ سے خفگی ہوتی، تو دروازہ پر بلا کر ڈانٹ دیتی تھیں۔ اور یہ سب حضرات چوں نہ کرتے تھے، بلکہ برضا و رغبت ان کی خفگی سہہ لینے میں اپنی ترقی سمجھتے تھے"۔

دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ و عمائد پر جو رعب ان کا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب نے ایک واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے، یعنی ایک دفعہ کسی خاص قصہ میں مشہور دیوبندی خطیب و مناظر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کی زبان پر مولانا طیب صاحب کی دادی صاحبہ کے سامنے تقویٰ کا لفظ آگیا، مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ ان کی دادی صاحبہ پس پردہ بیٹھی ہوئی سن رہی تھیں، تقویٰ کا لفظ ادھر مولوی مرتضیٰ حسن صاحب کی زبان پر آیا، اور پردہ کے پیچھے سے گرجتی اور کڑکتی ہوئی یہ آواز آنے لگی۔

"ہم نے جن متقیوں کو دیکھا ہے، ان کے مقابلہ میں تم لوگوں کا تقویٰ ہماری نظر میں ہیچ نظر آتا ہے"۔

اسی کے ساتھ یہ بھی فرما رہی تھیں کہ

"پھر تقویٰ کی نصیحت تو وہ کریں جنھیں مخاطبوں کی حیثیت کا بھی لحاظ ہو"۔

آخر میں فرمایا کہ

"جاؤ! اپنے گھر والوں کو پہلے متقی بناؤ"۔

لکھا ہے کہ بے چارے مولوی مرتضیٰ حسن صاحب جو علمی مجلسوں، اور مناظروں کی محفلوں کے شیر سمجھے جاتے تھے دیکھا گیا کہ

"چپکے چلے آرہے ہیں اور (اپنی جسارت بے جا پر) نادم ہیں"۔

ایک قصباتی بی بی جو حرف آشنا بھی نہ تھیں، ہندوستان کی سب سے بڑی درس گاہ کے اساتذہ اور علماء پر ان ہی کا یہ رعب، یقیناً بلا وجہ قائم نہ تھا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ وفات کے بعد بھی

اللہ کے دوست اور ولی کا دل جس سے راضی اور خوش تھا، اسی رضا اور خوشنودی کے ظہور کی یہ ناسوتی شکل تھی۔

کچھ بھی ہو، میرا خیال تو یہی ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کی والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد خانگی زندگی کی اقلیم کی بادشاہی جب دوعملی کشمکش سے آزاد ہوگئی، اس کے بعد جو وقت بھی گذرا، وہ مصنف امام کی بیان کردہ "شکرگزاری" کے احساس ہی کے تحت حضرت والا کا گذرا،

طرفہ تماشا یہ ہے کہ دوسری طرف ان ہی بیان کرنے والوں سے ہم سنتے ہیں کہ اپنی جبلی شرم و حیا کی وجہ سے بقول مولانا طیب، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت والا کو گویا

"عورتوں سے بہت نفرت تھی"

اور یہ نتیجہ آپ کے اس طرز عمل سے نکالا جاتا تھا کہ

"کبھی گھر میں بیٹھ کر کھانا نہ کھاتے"

یہی نہیں بلکہ دیکھا جاتا تھا کہ

"گھر میں جانا، اور بیٹھنا، اور عورتوں سے باتیں کرنا"

اس قسم کی چیزوں سے دلچسپی کیا معنی بقول مولنا طیب کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ طریقہ

"بہت ناپسند تھا"

ازدواجی زندگی سے پہلے خواب و خور کے سلسلے میں غالباً اسی وجہ سے یعنی عورتوں سے حتی الوسع دور رہنے کا فطری رجحان جو آپ میں تھا، شاید اسی کا نتیجہ یہ تھا، جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب مسجد میں رہتے، رات کو مسجد میں سو رہتے، کھانا مسجد میں کھاتے، پیر بھائی دو تین تھے۔ ان کو کہا تھا کہ سب کھانا لایا کرو، اور مل کر کھا لیا کریں گے" ص۳۵

لیکن نکاح کے بعد ظاہر ہے کہ آپ کی یہ وارستہ مزاجی اسی اطلاقی رنگ میں کیسے برقرار رہ سکتی تھی، اسی کے بعد شاید یہ دستور ہو گیا تھا، مولانا طیب کی روایتوں میں ہے کہ

"بعد عشا گھر تشریف لاتے"

مگر عشار کے بعد گھر میں قیام کی مدت کتنی دیر رہتی؟ وہی اطلاع دیتے ہیں کہ

"آخر شب میں مسجد میں تشریف لاتے"۔

اور اس کے بعد مسلسل قیام مسجد ہی میں رہتا تاآینکہ

"پھر عشار پڑھ کر گھر جاتے"

اسی سلسلہ میں مولانا طیب صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"اور جب گھر میں سے نہ ہوتیں، تو رات دن مسجد میں گذارتے"۔

مراد غالباً اس سے یہ ہے کہ عشار کے بعد آخر شب تک حضرت والا کا مکان کے زنانہ حصہ میں قیام اسی زمانہ میں ہوتا تھا، جب آپ کے گھر میں یعنی اہلیہ محترمہ تشریف فرما ہوتیں، ورنہ ان کی عدم موجودگی میں اس درمیانی وقفہ کے قیام کے شرف سے بھی زنانہ حصہ محروم ہی رہ جاتا تھا،

حجاب و شرم کے جذبہ کی غیر معمولی گرفت ہی کا یہ نتیجہ بھی تھا، جس کی اطلاع مصنف امام نے ان الفاظ میں دی ہے کہ

"اول میں جب ضرورت نہانے کی ہوتی"۔ ص۳۵

تو جیسا کہ دستور تھا آخر شب ہی میں اندھیرے منھ گھر سے باہر نکل آتے، حالانکہ بقول مصنف امام

"مسجد میں پانی گرم ہوتا تھا"۔ ص۳۵

اور پچھلی رات کے سناٹے میں دیکھنے والی آنکھوں کا خطرہ بھی زیادہ نہ تھا، اور اپنی عادت کے مطابق جیسا کہ مصنف امام ہی نے لکھا ہے کہ

"تہجد کے وقت نہاتے"۔ ص۳۵

مگر حیا اور شرم کا جذبہ باہر سے زیادہ سچ پوچھئے تو باطنی تقاضوں ہی کا تابع ہوتا ہے، اور ان ہی تقاضوں کے زیر اثر بجائے حمام مسجد کے گرم پانی کے مصنف امام کا

بیان ہے کہ

"شرم کے سبب، تالاب میں جاکر نہاتے" ص۳۵

تالاب بھی کس علاقے کے؟ ہمالیہ کی برفستانی چوٹیوں کی برفبار ہواؤں کے جھونکوں کا جو خطہ پہلی گذرگاہ ہے۔ اس کو بھی پیش نظر رکھیئے اور سوچیئے رات کی پچھلی گھڑیوں کے اس تاریک اور ڈراؤنے سماں کو، اور اسی میں تن تنہا جنگل کی طرف نکل جانا اور کھلے میدانوں کے کسی تالاب یا جوہڑ میں نہانے کے لئے کود پڑنا، اور وہ بھی ایسے موسم میں جب وضو کرنا بھی پانی کو گرم کئے بغیر لوگوں کے لئے ناقابل برداشت ہو۔ مصنف امام کے قلم سے بے ساختہ اس موقعہ پر یہ الفاظ نکل پڑے ہیں۔

"یہ کڑکڑاٹ کا جاڑا پالا، اور مولوی صاحب تالاب میں نہائیں" ص۳۵

اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر پر شرم وحیاء کے جذبات کا تسلط، شدت وقوت کی کن حدود تک پہنچا ہوا تھا۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے قرائن وشواہد کی روشنی میں کم از کم میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ عورتوں اور عورتوں کی سوسائٹی سے حضرت والا کی کنارہ کشی کے قصوں میں شاید دخل آپ کی اسی افتاد طبع کو تھا، ورنہ وفات کے بعد بھی رضامندی، وخوشنودی کی خنکیاں جس کے قلب مبارک میں عورت ہی کے متعلق پائی گئی ہوں، ہم یہ کیسے باور کریں کہ اسی کے جسمانی قالب کا عورتوں سے انحراف، اعتزال کسی قلبی تنفر کا نتیجہ تھا، بلکہ جن مذاہب وادیان میں غریب عورتوں کو مذہبی تقدس کی پیشانی کا سیاہ دھبہ ٹھہراتے ہوئے بہشتی زندگی میں نسوانی وجود کے تصور تک کو بھی ناقابل برداشت بنادیا گیا ہے[۱]، ان کے مقابلہ میں ہم اسلام کے دوسرے حقائق وبینات

[۱] میرا اشارہ ان خیالات کی طرف ہے جو جنت کے متعلق عیسائیوں میں عموماً پھیلے ہوئے ہیں کہ جنت سے آدم کے نکلنے کی وجہ حوا ہوئیں، عورتوں کے وجود کو مجسم شیطنت گندگی قرار دیا گیا، اسی لئے عیسائی ذہن جنت میں حور یا ازواج مطہرات کے تصور کو برداشت نہیں کرسکتا۔ قرآن کی جنت کا نام یورپ والوں نے "حیوانی جنت" اسی بنیاد پر رکھ دیا ہے۔ حالانکہ حسن وجمال سے اثر پذیری حیوانی نہیں بلکہ انسان کی خصوصی فطرت کا (بقیہ ص۵۲۶ پر)

کے ساتھ ساتھ اس مبشرہ کو بھی پیش کر کے کہہ سکتے ہیں کہ بہشت تو بہشت عورت چاہے تو اپنی جگہ ان قلوب میں بھی پیدا کر سکتی ہے، جن کی طہارت و تقدس پر بہشتی زندگی کی بنیاد قائم ہے لیکن قلب سے جو قریب ہو، ضرور نہیں کہ قالب سے بھی اس کی قربت کا تماشا دوسروں کو کرایا جائے، اور اس طرح کرایا جائے جیسے آج چڑا اور چڑیا کی زندگی کا نقشہ اپنی ازدواجی زندگی کے نمونوں سے دوسروں کے آگے کھینچتے رہتے ہیں۔ گویا کچھ ایسا باور کرایا جا رہا ہے کہ مرد اپنے بیرونی اور اندرونی احساسات کو نسوانی وجود کی لہروں سے ایک لمحہ کے لئے بے تعلق رکھنے سے معذور ہو چکا ہے[۱]۔

خیر درمیان میں یہ چند فقرے بے ساختہ قلم سے نکل پڑے، میں ذکر سیدنا الامام الکبیر کی عائلی زندگی کا کر رہا تھا، کہ ابتداء تو اس کی تخلیہ و تجرید سے ہوئی، نکاح سے پہلے والد کی

(بقیہ صفحہ ۵۲۵) اقتصار ہے، سچ پوچھئے تو عیسائیوں کی روحانی جنت جس میں عام انسانی احساسات سے لوگ محروم کر دیئے جائیں گے، انسانی فطرت کی بدترین سزائی شکل ہو سکتی ہے اور لے دے کر سارے قصوں کی بنیاد اسی پر قائم ہے کہ جنت میں عورتوں کا وجود عیسائیوں کے لئے ناقابل برداشت ہے ۱۲

[۱] آج تو شاید انسانیت کا وہ عام حصہ جو مغربی زندگی کے زیر اثر آ چکا ہے، اس کی یہ عمومی خصوصیت قرار پا چکی ہے، گھر، باہر، دفتر، اور کچہری، پارلیمان اور مجالس قانون ساز ہر ایک میں نسوانی تجلی گاہوں کا عموماً انتظام کر دیا گیا ہے، لیکن پہلے بھی عمومیت پر تو نہیں مگر کبھی کبھی افراد پر اس قسم کے اعصابی دورے پڑتے رہے ہیں۔ اقبال نامہ جہانگیری میں مالوہ کی حکومت جس کا پایہ تخت شادی آباد مانڈو تھا، اسی کے ایک بادشاہ غیاث الدین خلجی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "پانزدہ ہزار زن در حرم خود فراہم آوردہ بود" لطیفہ اس سے زیادہ دلچسپ یہ ہے کہ "شہرے از زنان ترتیب دادہ" یعنی ایک شہر ہی اس بادشاہ نے آباد کیا تھا، جس میں عورتوں کے سوا کسی مرد کیلئے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی، لکھا ہے کہ شہری ضرورتوں کے لئے جس قسم کے حکام عہدہ داروں اور کارندوں کی ضرورت تھی، سب کی تکمیل عورتوں ہی سے کی گئی تھی، مورخ کے الفاظ میں "جمیع طوائف از اقسام و اصناف حاکم و قاضی و کوتوال، و اہل حرفہ و آنچہ بجہت نظام شہر در کار ست از اناث مقرر نمودہ"۔ الغرض کچہری ہو یا بازار، اندر ہو یا باہر، بادشاہ کا حکم تھا کہ عورتوں کے سوا وہاں اور کسی پر اس کی نظر نہ پڑے "و ہر جا نجز صاحب جمالے شنیدے تا بدست نیا وردے از پا ننشستے" صفحہ ۹۵ کہتے ہیں کہ حکومت آصفیہ کے حکمرانوں میں نظام علی خاں آصف جاہ نے بھی ایک دفعہ شہر حیدر آباد کو مردوں سے خالی کر کے اس کا تماشا دیکھا تھا کہ عورتوں کے سوا اسٹرکوں گلیوں میں کسی پر نظر نہ پڑے۔ دیکھئے رشید الدین خانی وغیرہ تاریخ دکن ۱۲

خدمت میں عرض کر دیا گیا تھا کہ بال بچوں کے لئے کما لانے کی خواہش مجھ سے نہیں کی جائے گی۔ گھر میں جب بیوی صاحبہ تشریف لائیں تو اپنے بھرے گھر سے ساتھ جو کچھ بھی لائی تھیں سب ان سے اتروالیا گیا، حقداروں تک ان کے حقوق کے پہنچانے کے سلسلہ میں موروثی اراضی کی آمدنی بھی گھٹ گئی، اور گھٹادی گئی، صرف عقلی روشنی میں دیکھنے والوں کے سامنے ظاہر ہے ایک ایسے گھر کا مستقبل جس حد تک خطرناک اور مہیب نظر آرہا ہو، تو یہی نظر آنا بھی چاہئے تھا، لیکن یہاں عقل سے بھی بالاتر ایمان و یقین کی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر قدم اٹھایا جارہا تھا، ابتدا میں کچھ ابتلائی اور امتحانی دشواریوں سے بھی گذرنا پڑا۔ لیکن آئندہ جو کچھ ہونے والا تھا، وہ تو خیر ہونے والا تھا ہی، پہلی چیز اس سلسلہ میں جو سامنے آئی، وہ آپ کی اہلیہ محترمہ کا فیصلہ تھا، وہی فیصلہ جس کے بعد خانگی زندگی میں زن و شوہر کے تعلقات سلجھتے ہوئے توافق اور ہم آہنگی کے اس نقطہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ جنت جانے سے پہلے اسی زندگی میں بہشتی زندگی کی خوشگواریوں کا مزہ میاں بیوی دونوں کو ملنے لگتا ہے، اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن یہی کہ جو کچھ حضرت والا چاہتے تھے آپ کی اہلیہ محترمہ نے اسی کے مطابق منشط و مکرہ، فراخی و تنگی، یُسر و عُسر ہر حال میں بغیر کسی کش مکش کے زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا وہی فیصلہ جس پر جہاں کہیں، اور جب کبھی عمل کر کے دکھایا گیا ہے تو عارفوں کے کانوں میں بھی یہی قدرتی نغمہ گونج اٹھا ہے۔

شکر ایزد کہ میان من و اُو صلح فتاد
حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زدند

حالانکہ رسمی تعلیم سے، عرض کر چکا ہوں، مستفید ہونے کا موقعہ آپ کی رفیقۂ حیات رحمۃ اللہ علیہا کو نہیں ملا تھا، لیکن قدرت نے زیرکی اور فرزانگی کی جس باطنی نعمت سے

ان کو سرفراز کر رکھا تھا اس کا اندازہ اسی سے کیجئے، ایام عُسرا اور تنگی کے بعض حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا طیّب صاحب نے لکھا ہے کہ اُن کی دادی جان بیان کرتی تھیں

"کبھی میں نے حضرت (مولانا نانوتوی) پر اس مشقت کا احسان جتلانا تو بجائے خود ہے اپنے تعب (جسمانی دکھ اور ماندگی) کا بھی اظہار نہیں کیا۔

خدمت و احسان کی روح کی حفاظت کی یہ کتنی اہم جوہری تدبیر تھی۔ جتا دینے کے ساتھ سب کیا کرایا خاک میں مل جاتا ہے، یقیناً انسانی نفسیات کے اس ردِ عمل پر سطحی نظر نہیں پہنچ سکتی، وہ کئے چلی جاتی تھیں، حکم دیا جاتا تھا، اور وہ بجالاتی تھیں، اُن کے سپرد اپنی بیمار ساس کی تیمار داریوں کی خدمات کے ساتھ ساتھ دن میں بار بار ان ہی کے آلودہ کپڑوں کے دھونے اور پاک کرنے کا کام کیا گیا، اور آپ سن چکے کہ سعادت خیال کر کے وہ اس کام کو کرتی رہیں، حالانکہ رئیس دیوبند کے جس گھر سے وہ آئی تھیں، اس قسم کے گھروں میں اٹھ کر خود پانی پینے کی زحمت بھی عموماً ناقابل برداشت ہی ہوتی ہے، مگر باوجود اس کے ساری ساری رات ان کی کبھی یوں بھی گذر جاتی کہ ہاتھ میں دودھ کا پیالہ ہے، وہ کھڑی ہوئی ہیں، آنکھیں تو آنکھیں ٹانگوں کو بھی آرام لینے کا موقعہ نہ ملتا، اور اس پر طرفہ تماشا یہ تھا کہ گویا سیدنا الامام الکبیر کے والد ماجد کی غرض جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، آپ کو ازدواجی قید و بند میں لانے کی بھی تھی کہ اپنے ہم چشموں کے نوجوان لڑکوں کو کماتے دھماتے وہ دیکھ رہے تھے۔ خیال ان کا یہی تھا کہ جب بیوی بال بچوں کا بار پڑے گا، تو مزاج کی وارستگی باقی نہ رہے گی، اور جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے، گو شیخ اسد علی صاحب مرحوم آپ کے والد ماجد کا یہ خیال صحیح ثابت نہیں ہوا، یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

جس زمانہ میں (حضرت نانوتوی کا) نکاح ہوا، اور والد کو یہ خیال تھا کہ ابنائے زمانہ کی طرح جب فکر ہوگا آپ نوکری کرلیں گے"۔ ص۳۳

مصنف امام نے اطلاع دی ہے کہ

"بعد گذرنے کتنی مدت کے کچھ نہ کیا، تب مایوس ہو گئے"۔ ص۳۳

جس کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اسد علی صاحب جس پیمانے پر اپنے اکلوتے بچے کی کمائی کی آمدنی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اس پیمانے پر روپیہ حاصل کرنیکی طرف توجہ حضرت والا نے نہ کی۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک کم پچاس سال کی مدت زمین کے اس خاکی کرّے پر اہل وعیال کے تعلقات کے ساتھ گذارنے کا موقعہ آپ کو بھی ملا۔ لیکن آپ کے خریطۂ حیات میں مشاغل اور کارناموں کے بیشمار خانوں میں سب سے چھوٹا سب سے مختصر خانہ آپ کی معاشی جد وجہد ہی کا نظر آتا ہے۔ آپ کی طرف منسوب کرتے ہوئے

"کچھ نہ کیا"

کے الفاظ مصنف امام کے قلم سے جو نکلے ہیں، واقعات کی رو سے ان کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ کرنا، اس سلسلہ میں گویا نہ کرنے کے برابر تھا اور اسی لئے والد ماجد کی نظر میں اس کی حیثیت گویا صفر ہی کی رہی "کچھ نہ کیا" سچ پوچھئے تو ان ہی کے نقطۂ نظر کی تعبیر ہے۔ ورنہ عرض کرچکا ہوں کہ نکاح کے بعد ہی نہیں بلکہ نکاح سے پہلے بھی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہی جب دلی میں حضرت والا مقیم تھے تو اپنی ضروریات زندگی کی فراہمی کے لئے اس زمانہ میں بھی کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہے تھے۔ تذکرہ علماء ہند کے مصنف مولوی رحمان علی کی اس خبر واحد[1] یعنی سیدنا الامام الکبیر کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے جو یہ لکھا ہے کہ

[1] حقیقتاً مولوی رحمان علی صاحب کی یہ روایت خبر واحد اور غریب ہونے سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کے متابع اور شواہد نہیں ملتے بلکہ اس کے خلاف روایتیں ملتی ہیں۔ مجھے ۱۳۴۷ھ میں جب نیابت اہتمام دار العلوم کا عہدہ سپرد کیا گیا تو میں اس سے کارہ تھا اور حضرت والد مرحوم نے ایک دفعہ بطور وصیت کے (باقی ص۵۳۰ پر)

"بعد از فراغ علوم چندے بمدرسہ انگریزی واقع دہلی تعلق گرفت"

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں "مدرسی" کا کام بھی آپ نے انجام دیا تھا، لیکن چونکہ بجز مولوی رحمان علی صاحب کے تذکرہ کے اس واقعہ کا ذکر آپ کے عام سوانح نگاروں، یا حالات کے بیان کرنے والوں کے کلام میں نہیں ملتا، اس لئے اس سے قطع نظر بھی کرلیا جائے جب بھی اسی کے بعد یہ جو خبر دی گئی ہے کہ

"وبعد ترک آں تعلق (یعنی مدرسی چھوٹ جانے کے بعد) در مطبع احمدی بہ تصحیح کتب مقرر شد"

ظاہر ہے کہ یہ خبر واحد نہیں بلکہ متواتر ہونے کی حیثیت رکھتی ہے، مصنف امام کے حوالہ سے یہ نقل کرچکا ہوں کہ اسی زمانہ میں نکاح سے پہلے

"مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی کچھ مزدوری کرلی" ص ۲۹

(بقیہ ص ۵۲۹) فرمایا بھی یہی تھا کہ تم انتظامی جھگڑوں میں مت پڑنا بلکہ اپنی جدی میراث یعنی علمی زندگی سنبھالنا مگر جب اُن ہی کی حیات میں مجھے دارالعلوم کے انتظامی سلسلہ میں لگا یا گیا تو میں نے دلگیر ہوکر حضرت والد مرحوم سے عرض کیا کہ آپ کی وصیت کے خلاف مجھے انتظامی لائن میں لیا جارہا ہے اور آپ اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے۔ فرمایا کہ میری وصیت بدستور قائم ہے باقی اس وقت مدرسہ کی مصالح کا تقاضا یہی ہے اور جب سب بزرگ مل کر ایک چیز سپرد کررہے ہیں تو سب کے خلاف جانا بھی مناسب نہیں۔ اس پر بطور تسلی دہی کے فرمایا کہ حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ (حضرت نانوتوی رح) فرمایا کرتے تھے کہ میرے معاصرین میں سب مجھ سے بڑھکر ہیں مگر ایک خصوصیت ہے جو حق تعالیٰ نے مجھے ارزانی فرمائی ہے اور وہ یہ کہ میں نے تدریس کی ملازمت کبھی نہیں کی، اور تعلیم کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ یہ واقعہ نقل فرماکر والد مرحوم نے فرمایا کہ تمہیں بھی شکر کرنا چاہئے کہ تمہارے لئے ذریعۂ معاش انتظامی لائن میں پیدا کیا جارہا ہے تعلیم پر اجرت کی صورت پیدا نہیں ہورہی ہے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حضرت والا نے ملازمتِ تدریس کبھی نہیں فرمائی۔ شخصی طور پر اگر کہیں اپنے کسی تعلق والے کو پڑھایا ہو اور اس نے بطور خود کچھ خدمت کی ہو تو اُس سے اس دعوے پر اثر نہیں پڑتا کہ انہوں نے تدریس کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ بہر حال مصنف سلمہٗ نے بھی مولوی رحمان علی صاحب کی اس خبر کو خبر واحد یا خبر غریب کہہ کر واقعہ کی اسی ندرت اور غیر مؤید ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

محمد طیب غفرلہٗ

ان ہی کی اطلاع یہ بھی ہے کہ مطبع احمدی میں تصحیح کے سوا بخاری شریف کے آخری پانچ چھ پاروں کی حاشیہ نگاری کی خدمت بھی اسی زمانہ میں آپ نے انجام دی تھی۔

ظاہر ہے کہ نکاح سے پہلے جب تصحیح و تحشیہ کا کام آپ کرتے تھے، تو گو والد ماجد سے نکاح کے وقت آپ نے عرض کر دیا تھا کہ بیوی اور بال بچوں کا نام لیکر روپے کمانے پر مجھے مجبور نہ کیا جائیگا جس سے بظاہر اشارہ وہی کمائی کے بہانے کی طرف شاید کیا گیا تھا۔ ورنہ معاشی زندگی کے لئے کسب و اکتساب کے دھندوں میں نکاح سے پہلے جو عملاً مشغول تھا۔ اسی کے متعلق یہ خیال یقیناً بے بنیاد ہوگا کہ مطلقاً کسب و اکتساب سے آپ گریز کرنا چاہتے تھے۔

گریز کیا معنی، واقعہ یہ ہے کہ جب تک دلّی میں یہ مطبع احمدی قائم رہا آپ اس میں کام کرتے رہے، پھر ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان کا عموماً اور دلّی کا خصوصاً نظم درہم و برہم ہوگیا، اور اسی فتنہ کا شکار مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مطبع بھی ہوا مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"غدر میں دہلی کا تو سب کارخانہ درہم و برہم ہو گیا تھا، مولوی احمد علی صاحب کا مطبع گیا گذرا ہوا۔" ص۳۹

اور جیسا کہ آئندہ بہ تفصیل معلوم ہوگا، ہندوستان کی آزادی کی اس جدوجہد میں براہ راست سیدنا الامام الکبیر بھی عملاً شریک تھے اور حکومت مسلطہ نے مجرم قرار دے کر آپ کے نام بھی وارنٹ گرفتاری جاری کر دیا تھا، دار و گیر، رست و خیز کے اس ہنگامہ میں اس میں شک نہیں کہ چند سال تک مطبع احمدی کی خدمت سے الگ ہونے کے بعد آپ کی زندگی اس طرح گذری کہ بقول مصنف امام

"اس زمانہ میں سوائے وطن (نانوتہ) اور کوئی جگہ جانے کی نہ تھی۔" ص۳۹

حکومت کے نمایندے آپ کی فکر میں تھے، اس لئے مصنف امام ہی کے بیان کے مطابق وقفہ کی اس مدت میں

"کبھی وطن (نانوتہ) اور کبھی دیوبند رہتے تھے۔" ص۳۹

اور آخر میں ہندوستان کو چھوڑ کر بادبانی جہاز پر سوار ہو کر حج کے ارادہ سے حجاز تشریف لے گئے بہر حال ان باتوں کی تفصیل تو آگے آ رہی ہے، یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں مطبع احمدی کی بربادی کے بعد ۱۸۶۱ء مطابق ۱۲۷۸ھ میں سفر حج سے جب ہندوستان آپ واپس تشریف لائے۔ تو چار سال وقفہ کی یہ مدت ایسی ضرور گذری ہے جس میں کسی خاص معاشی مشغلہ میں مشغول ہونے کی کوئی صورت ہی نہ تھی، اور یوں کسب و اکتساب کے قصوں سے کچھ دن کے لئے مجبوراً آپ کو الگ ہونا پڑا، لیکن حکومت مسلطہ کی نگرانی جوں ہی آپ سے اٹھائی گئی، تو دلی میں اگرچہ اپنی پہلی خدمت کی طرف واپسی کا موقعہ مطبع احمدی کے ختم ہو جانے کی وجہ سے باقی نہ رہا تھا لیکن جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے

"منشی ممتاز علی[۱] صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا۔" ص ۴۹

[۱] یہ منشی ممتاز علی جن سے بقول مصنف امام سیدنا الامام الکبیر کی پرانی دوستی تھی، اپنے وقت کے مشہور خطاط اور خوشنویس تھے، خطاطی کی دنیا میں "نزہت رقم" کے لقب سے ملقب تھے، اور خوشنویسی کے اسی کمال کی وجہ سے مطبع کے قائم کرنے میں ان کو سہولت ہوئی، منشی ممتاز علی صاحب کے بعد ان کے دو صاحبزادوں منشی مشتاق علی و منشی عبدالغنی کو بھی خطاطی کے کمال میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، خصوصاً خط نسخ (عربی) میں منشی مشتاق علی کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی کتابت کے لئے سب سے پہلے ارباب مطابع کی نظر آپ ہی پر پڑتی تھی، اور یہ کمال منشی ممتاز علی صاحب مرحوم کا ان کے لڑکوں ہی تک محدود نہ رہا بلکہ آپ کے ان دونوں صاحبزادوں نے بکثرت اس فن کی عملی تعلیم لوگوں کو دی۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جتنے کاتب پھیلے ہوئے ہیں ان کی بڑی تعداد کو بالواسطہ یا بلا واسطہ ان ہی دو صاحبوں سے شرف تلمذ حاصل ہے، یہاں اس کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ درس نظامیہ کے نصاب کی کتابوں کے خصوصاً اور اردو فارسی عربی زبانوں کی کتابوں کے عموماً دلی کے مشہور ناشر مولوی عبدالاحد مرحوم کا مطبع مجتبائی دراصل منشی ممتاز علی صاحب ہی کا وہ مطبع ہے جو اسی نام سے میرٹھ میں قائم ہوا تھا، پھر منشی ممتاز علی صاحب قیام کی نیت سے ہندوستان چھوڑ کر جب عرب جانے لگے، تو مولوی عبدالاحد مرحوم نے ان سے ان کے اس مطبع مجتبائی کو خرید لیا، اور کوئی شبہ نہیں کہ اسلامی علوم کی کتابوں کی اشاعت و طباعت میں غیر معمولی کام اس مطبع نے انجام دیا منشی ممتاز علی صاحب کچھ دن قیام کر کے عرب سے پھر ہندوستان واپس آئے اور دلی میں مطبع مصطفائی کے نام سے دوسرا جدید مطبع قائم کیا، جو کچھ دنوں چلتا رہا۔ محل وقوع اس کا کھڑکی تفضل حسین متصل زنانہ وکٹوریہ ہسپتال تھا جہاں اب بھی مطبع مصطفائی کا سائن بورڈ لگا ہوا ہے لیکن عملاً مطبع ختم ہو چکا ہے (باقی ص ۵۳۳ پر حاشیہ ۵ دیکھیں)

اور اسی چھاپہ خانہ میں وہی لکھتے ہیں

"مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کو پرانی دوستی کے سبب بلالیا" ص۳۹

اور بلا کر وہی کام جو مطبع احمدی دلی میں آپ کر رہے تھے میرٹھ میں بھی آپ کے سپرد کر دیا گیا مصنف امام نے میرٹھ کے اس مطبع سے آپ کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں آپ کے ذمّہ

"وہی تصحیح کی خدمت تھی" ص۳۹

(بسلسلہ صفحہ ۵۳۲) ان معلومات کے لئے حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب مدظلہ العالی کے خلف رشید مولانا حفیظ الرحمٰن کا ممنون ہوں۔ دریافت کرنے پر ان تفصیلات سے انہوں نے آگاہ فرمایا، واقعہ یہ ہے کہ طباعت واشاعت کے لحاظ سے منشی ممتاز علی مرحوم کی شخصیت نے غدر کے بعد ہندوستان میں اسلام کی تقریباً اسی نوعیت کی خدمت انجام دی جو فرض تدریس کے لحاظ سے دارالعلوم دیو بند نے ادا کیا۔

(متعلقہ ص۵۳۲) ۵۷ منشی ممتاز علی صاحب کی مہارتِ فن کتابت ایک مسلمہ حقیقت ہے جیسا کہ مصنف سلمہٗ نے حاشیہ بالا میں ذکر فرمائی ہے۔ منشی صاحب ممدوح کا سلسلۂ تلمذ شاہی سلسلہ ہے۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب زید مجدہ صدر شعبۂ کتابت دارالعلوم نے جو فی زمانہ اس سلسلۂ فن کی ایک سنہری کڑی ہیں اور منشی ممتاز علی صاحب کے ہی سلسلۂ تلمذ میں بواسطہ منشی محبوب علی صاحب میرٹھی داخل ہیں مجھ سے بیان فرمایا کہ منشی ممتاز علی صاحب خط نسخ میں بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے تلمیذ رشید ہیں۔ سلسلۂ تلمذ میں داخل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ انہیں بہادر شاہ سے فن حاصل کرنے کا جذبہ و شوق دامنگیر تھا، مگر بادشاہ تک رسائی مشکل تھی۔ اسلئے خط نسخ میں کچھ قطعات وعبارات طبعزاد طریق پر لکھ کر جامع مسجد دہلی میں اس جگہ آویزاں کر دیتے تھے جہاں بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ تھی ایک دن بادشاہ سلامت کی نظر ان کے قطعات پر پڑی۔ قدرتاً صاحبِ فن کو فن کی چیزوں کی طرف کشش ہوتی ہے دیکھتے ہی اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ منشی ممتاز علی لگے ہی ہوئے تھے۔ بادشاہ کے یہ دریافت کرنے پر کہ یہ قطعات کس نے لکھے ہیں فوراً سامنے آکر آداب بجالائے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ کسی سے تلمذ حاصل ہے؟ عرض کیا کہ کسی سے نہیں عرصہ سے جہاں پناہ ہی کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہونے کا شوق ہے۔ فرمایا کہ اچھا آجایا کرو۔ قلعداروں کو مطلع کر دیا گیا کہ اس نام کے شخص کو آنے سے نہ روکا جائے۔ چنانچہ منشی صاحب جاکر بادشاہ سے (جو اپنے دور میں اس فن کے یکتا مانے گئے ہیں) اصلاح لینے لگے اور وقت کے امام فن ہوئے۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب ان ہی کے ایک واسطہ سے شاگرد ہیں اور آج اس فن کے ممتاز اور یگانہ مانے جاتے ہیں جو نہ صرف عملاً ہی ماہر فن ہیں بلکہ علماً بھی اس فن پر پوری طرح قابو یافتہ ہیں۔ اہل فن کے یہاں مولانا اشتیاق احمد صاحب کے سلسلے میں منشی مشتاق علی صاحب قابل ذکر نہیں ہیں گو ان کا صاحب فن ہونا مسلّم ہے۔ محمد طیب غفرلہٗ

اور جہاں تک میرا خیال ہے کم و بیش[۱] سات آٹھ سال تک مسلسل بغیر کسی انقطاع کے آپ میرٹھ کے اسی مطبع مجتبائی میں تصحیح کی خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر جب منشی ممتاز علی صاحب عرب تشریف لے گئے اور اس مطبع کو مولوی عبدالاحد مرحوم خرید کر دلی لے آئے، اور سیدنا الامام الکبیر دوسری دفعہ اسی زمانہ میں حج کے ارادے سے مکہ معظمہ تشریف لے گئے، تو کچھ دن پھر وقفہ کا درمیان میں گذرا، لیکن جوں ہی کہ حج سے ہندوستان واپس ہوئے تو مصنف امام کا بیان ہے کہ:۔

"منشی جی (یعنی منشی ممتاز علی صاحب) کے پیچھے (جب وہ عرب میں مقیم ہو گئے تھے) میرٹھ میں مولوی محمد ہاشم صاحب کے مطبع میں کام کیا" ص ۳۹

ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مطبع ہاشمی میں آپ کی ملازمت کی مدت کتنی تھی، تاہم جب تک منشی ممتاز علی صاحب عرب میں رہے، یہی تسلیم کرنا چاہیے کہ مطبع ہاشمی میں حضرت والا کام کرتے رہے

[۱] کم و بیش سے میرا مطلب یہ ہے کہ مصنف امام کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۵ھ میں قیام کی نیت سے ہندوستان کو چھوڑ کر منشی ممتاز علی صاحب عرب چلے گئے تھے، اور ان کے بعد خیال یہی گذرتا ہے کہ اس مطبع سے سیدنا الامام الکبیر کا تعلق باقی نہ رہا۔ اس حساب سے ثابت ہوتا ہے کہ مطبع مجتبائی میں سات سال تک سیدنا الامام الکبیر کام کرتے رہے، لیکن اسی مطبع مجتبائی میرٹھ میں خاص اہتمام سے قرآن مجید کا ایک خاص نسخہ طبع ہوا تھا، کتابت اس کی خود اپنے ہاتھ سے منشی ممتاز علی صاحب نزہت رقم مالک مطبع نے کی تھی، اور تصحیح کی سعادت سیدنا الامام الکبیر نے حاصل فرمائی تھی۔ اسی نسخہ کی نقل بعد کو مولوی عبدالاحد اپنے خریدے ہوئے مطبع مجتبائی میں چھاپتے رہے، سیدنا الامام الکبیر نے فارسی زبان میں ایک خاتمہ اسی نسخہ کا رقام فرمایا اور عربی فارسی اردو تینوں زبانوں میں اس طباعت کے تاریخی مادے بھی ابجد کے حساب سے نکالے تھے۔ تبرکاً مولوی عبدالاحد اس خاتمہ اور تاریخی مادوں کو بعد کے ایڈیشنوں میں شریک کرتے رہے، ممکن ہے کسی موقعہ پر فارسی نثر اور استخراج تاریخ کے ذیل میں ان امور کا آئندہ ذکر آئے۔
یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ "امالامثل لہ: لامثال" کا مادہ تاریخ عربی یا اس کے سوا دوسرے تاریخی مادوں کی میزان ۱۲۸۶ھ ہوتی ہے، اس سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ۱۲۸۶ھ تک میرٹھ کے مطبع مجتبائی سے سیدنا الامام الکبیر کا تعلق باقی تھا اور یوں آپ کے قیام کی مدت بجائے سات سال کے مطبع مجتبائی میرٹھ میں آٹھ سال ہونی چاہیے ۱۲

کچھ دن بعد منشی ممتاز علی صاحب عرب سے پھر ہندوستان واپس ہوئے۔ میرٹھ والا مطبع مجتبائی تو ان کا بک چکا تھا۔ اس لئے مطبع مصطفائی کے نام سے دلی ہی کے محلے کھڑکی تفضل حسین متصل وکٹوریہ زنانہ ہسپتال میں منشی جی مرحوم نے دوسرا نیا مطبع جاری کیا۔ مصنف امام نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"پھر مولوی صاحب دہلی گئے، منشی جی (یعنی منشی ممتاز علی) کا چھاپہ خانہ دہلی میں ہوا" ص۳

اس کا مطلب یہی ہے کہ میرٹھ کے مطبع ہاشمی سے قطع تعلق کر کے منشی جی کی وجہ سے آپ پھر ان ہی کے نئے مطبع مصطفائی میں کام کرنے کے لئے دتی تشریف لے گئے۔ مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب خلف الرشید مولانا کفایت اللہ صاحبؒ نے بھی اپنے مکتوب سامی میں لکھا ہے۔ منشی ممتاز علی جب عرب سے ہندوستان واپس آئے اور اپنا مطبع دہلی میں جاری کیا، تو

"مولانا (سیدنا الامام الکبیر) کو بھی میرٹھ سے دہلی لے آئے"، مکتوب ص۲

افسوس ہے کہ کسی ذریعہ سے اب تک اس کا پتہ نہ چل سکا کہ دوبارہ دہلی میں آپ کا قیام مطبع مصطفائی کے تعلق سے کتنے زمانہ تک رہا۔ لیکن اتنا تو بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی عمر کا اکثر و بیشتر حصہ اسی طرح گذرا کہ آمدنی کا پیمانہ جو کچھ بھی ہو، لیکن معاشی جد و جہد سے آپ نے بہرحال اپنے آپ کو بے تعلق نہیں رکھا مختلف قرائن و قیاسات کی بناء پر میرا اندازہ یہی ہے کہ ایک کم پچاس کی عمر گرانمایہ میں سے تقریباً چالیس انتالیس سال کی عمر تک آپ مذکورہ بالا مختلف مطابع یعنی احمدی، مجتبائی، ہاشمی، مصطفائی میں علی الترتیب تصحیح کی خدمت انجام دیتے رہے۔

یہی زمانہ ہے جب ضلع سہارنپور کے قصبہ دیو بند میں ایک مدرسہ کی بنیاد پڑی، جو اب بحمد اللہ و ماشاء اللہ دار العلوم دیوبند کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اس مدرسہ کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کے تعلقات کا مسئلہ مستقل مسئلہ ہے جس پر آئندہ بحث ہوگی۔ اپنے مقام پر اس کی تفصیلات بیان کی جائیں گی، سردست تو مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اپنی ۴۹ سال کی عمر میں تقریباً چالیس سال تک حضرت والا کی خانگی زندگی جس طرز سے گذری، بلکہ اس کے بعد دار العلوم سے متعلق ہو جانے کے بعد بھی چونکہ یہ مسلم ہے کہ ہر قسم کے مالی استفادہ سے کلی طور پر اپنے آپ کو سیدنا الامام الکبیر نے

قطعاً الگ تھلگ رکھا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف کی ذاتی شہادت جسے چشم دید گواہی سمجھنا چاہئے ان ہی کے بجنسہ الفاظ میں نقل کردیتا ہوں، لکھتے ہیں

"یہ سب کو معلوم ہے کہ مدرسہ اسلامی دیوبند آپ ہی کا (یعنی سیدنا الامام الکبیر ہی) کا ساختہ پرداختہ اور کیا کچھ اس کا کارخانہ کہ چھوٹی سی سرکار، مگر ہرگز، کبھی، اس کی کسی چیز سے نفع نہیں اٹھایا۔"

آگے وہی رقمطراز ہیں

"اوائل میں اہل شوریٰ نے درخواست کی کہ آپ بھی اس مدرسہ کی مدرسی قبول فرمائیے اور اس کے عوض کسی قدر تنخواہ، مگر قبول نہ فرمایا، اور کبھی کسی طور، یا ڈھنگ سے ایک حبہ تک کے مدرسہ سے روادار نہ ہوئے حالانکہ رات دن، مدرسہ کی (خوش) اسلوبی میں مصروف رہتے اور تعلیم میں مشغول۔"

آخر میں وہی ان لوگوں کے سامنے جو سیدنا الامام الکبیر سے بھی واقف تھے اور مدرسہ سے بھی سب ہی کے سامنے وہ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ

"یہاں تک مدرسہ کے مال سے احتیاط تھی"

تمثیلاً حضرت والا کی اس عام عادت کی اطلاع دیتے ہیں کہ

"اگر کبھی بضرورت مدرسہ کے دوات وقلم سے کوئی اپنا خط لکھ لیتے تو فوراً ایک آنہ مدرسہ کے خزانے میں داخل کردیتے۔"

اور صرف داخل ہی نہیں کرتے بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی، جیسا کہ وہی لکھتے ہیں۔

"فرماتے کہ یہ بیت المال کی دوات ہے، ہم کو اس پر تصرف جائز نہیں ہے۔"

اسی سلسلہ میں انہوں نے ایک خاص قصہ کا بھی ذکر کیا ہے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

"آپ (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کے مزاج میں حرارت بہت تھی، اور موسم گرما میں سرد مکان بہت مرغوب تھا۔"

اسی کے بعد قصّہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

"مدرسہ میں ایک سردخانہ[1] تیار ہوا، اور گرمی کی بہت شدت، مولوی رفیع الدین (دارالعلوم کے مہتمم اول) نے عرض کیا کہ سردخانہ تیار ہے، وہاں دوپہر کو آرام کیا کیجئے۔"

یہی سننے کی بات ہے، مدرسہ کی دوات سے خواہ سیاہی کے چند قطرات ہی ہی، لیکن بہرحال لکھنے میں وہ خرچ تو ہو جاتے تھے۔ مگر اب سنئے "سردخانہ" ایک مکان تھا، گرمیوں میں گھنٹہ دو گھنٹے کے لئے لیٹنے کی وجہ سے "سردخانہ" میں کسی قسم کی کمی کا بھی اندیشہ نہ تھا، جوں کا توں اپنی اصلی حالت پر لیٹنے کے بعد بھی قائم رہتا، لیکن مولانا رفیع الدین صاحب کے معروضہ کے جواب میں فرمایا گیا سوانح مخطوطہ کے مصنف راوی ہیں کہ

"مولانا سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا کہ ہم کون جو اس میں آرام کریں وہ حق ہے طالب علموں کا"

آگے اسی کے بعد وہی اطلاع دیتے ہیں کہ

"اور کبھی آپ نے سردخانہ میں جا کر استراحت نہ کی اور گرمی کی تکلیفیں سہا کیں" ص۱۶

سیدنا الامام الکبیر کے تقویٰ کا جو غیر معمولی معیار تھا، سچ پوچھئے تو اس کو دیکھتے ہوئے اس قسم کے واقعات کے ذکر کی بھی ضرورت نہ تھی، لیکن اس وقت بحث آپ کی خانگی زندگی، اور ان معاشی وسائل پر ہو رہی تھی، جن کے زیر اثر اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورتوں کو آپ پوری فرماتے رہے اس کے لئے تمہیداً یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوا کہ دارالعلوم کی سرپرستی کے تعلق سے پہلے ہی، اور اس کے بعد بھی، مدرسہ سے کسی قسم کا کوئی فائدہ مادی یا غیر مادی کسی شکل میں نہ آپ نے کبھی اٹھایا اور نہ اٹھانا چاہا، بلکہ استفادہ کی ہلکی سی ہلکی صورت بھی کسی وجہ سے پیش آ جاتی، تو قصداً و عمداً اس سے احتراز ہی پر اصرار فرماتے رہے، ایسی صورت میں سوال ہوتا ہے کہ ایک کم پچاس سال کی عمر کا وہ حصہ جس میں اپنے اور اپنے متعلقین کے مصارف کی ذمہ داری آپ کے سر عائد ہوئی، عمر کا یہی حصہ کن معاشی

---

[1] یہ ہی تہ خانہ سب سے پہلے تیار ہوا ہے جو دارالعلوم کے احاطہ مولسری میں وسط میان کی شمالی درسگاہ کے نیچے ہے۔ اسکے بعد دارالعلوم میں کئی تہ خانے اور بھی بنائے گئے جو بعد میں تعمیر ہوئے۔ محمد طیب غفرلہ

وسائل کے زیر اثر گذرا ؟

مناسخہ یعنی ورثہ کے سہام کی نظر ثانی کے بعد کٹ کٹا کر یہی بچائی زمینداری کی آمدنی جو رہ گئی تھی، اس کے سوا مطابع کی ملازمتوں کی آمدنی تھی صحیح طور پر تو اس کا پتہ نہ چل سکا کہ تصحیح کی جو خدمت ان مطابع میں آپ انجام دیتے تھے، اس کے معاوضے کی واقعی نوعیت، مقدار و کمیت کیا تھی، لیکن مصنف امام کا یہ فقرہ جسے شاید پہلے بھی کہیں نقل کر چکا ہوں، یعنی انہوں نے جو لکھا ہے کہ

"نوکری آپ نے اگر کی، تو کیا کی، کسی چھاپہ خانہ میں چار پانچ روپیہ کی تصحیح کی خدمت قبول کی۔" ص۳۲

ظاہر ہے کہ "چار پانچ روپیہ" کی اس آمدنی کا تعلق روز سے نہیں بلکہ یقیناً مہینے سے ہے کیونکہ علاوہ عام شہرت کے چار پانچ روپے روز کی آمدنی خصوصاً اس زمانہ کے حساب سے تو غیر معمولی آمدنی تھی لیکن مصنف امام نے جس موقعہ پر ان اعداد کا ذکر کیا ہے، اس کا اقتضا یہی ہے کہ اس آمدنی کو وہ بہت ہی قلیل آمدنی اس زمانہ کے اعتبار سے بھی قرار دے رہے ہیں۔

یہ ممکن ہے کہ "چار پانچ" کے الفاظ تخمینی ہوں، لیکن اتنی بات بہر حال تسلیم ہی کرنی پڑتی ہے کہ حد سے زیادہ ناکافی آمدنی تصحیح کی اس خدمت سے حاصل ہوتی تھی۔

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ علاوہ اہلیہ محترمہ کے مدت تک والدین بھی آپ کی اس خانگی زندگی میں شریک رہے، اور ان کے علاوہ جیسا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بال بچوں کا اضافہ بھی ہوتا رہا مصنف امام نے نکاح کے ذکر کے بعد اطلاع دی ہے کہ

"اول کئی لڑکیاں ہوئیں، جن میں دو زندہ اب ہیں۔" ص۳۴

جس سے معلوم ہوا کہ تاہل کی زندگی کے ابتدائی سالوں ہی سے اولاد کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، نہیں کہا جا سکتا کہ اوائل میں پیدا ہونے والی ان لڑکیوں کی صحیح تعداد کیا تھی اور نہ یہ ہی معلوم ہو سکا کہ ان وفات یافتہ صاحبزادیوں کا انتقال عمر کی کن منزلوں میں ہوا تاہم آغاز تاہل ہی میں پیدا ہونے والی لڑکیوں میں سے دو لڑکیاں جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے سیدنا الامام الکبیر کی وفات

کے بعد بھی زندہ رہیں، ان لڑکیوں کے بعد مصنف امام ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے "دو صاحبزادے اور چند لڑکیاں اور بھی ہوئیں۔ صاحبزادوں میں ایک تو مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی ہے جو دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی و انتظامی نظام کے اساطین میں شمار کئے گئے[۵۹]، اور دوسرے صاحبزادے مولوی محمد ہاشم مرحوم تھے جن کی وفات سیدنا الامام الکبیر کی رحلت کے بعد مکہ معظمہ میں ہوئی، الغرض تاہل کی ابتدائی زندگی سے آخر تک آل و اولاد کا سلسلہ بھی جاری رہا جس کا مطلب یہی ہوا کہ ایک کافی بھرے بھرائے گھر کی ذمہ داری قدرت کی طرف سے آپ سے متعلق کی گئی تھی، اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ کسی زمانہ میں عائلی زندگی کی ان جھنجھٹوں سے پریشان ہو کر ان لوگوں کا طریقہ آپ نے اختیار کیا ہو، جو تارک الدنیا بن جانے کا اعلان کر کے باور کر لیتے ہیں کہ ہر قسم کی ذمہ داریوں سے اب وہ عند الخلق والخالق آزاد ہو گئے۔ بلکہ اول سے آخر تک گھر بار، یا بیوی بچوں کے جھمیلے ہی میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنی آخری سانس پوری کی، والدین کی خدمت بیوی بال بچوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ جیسا کہ مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، دو لڑکیوں کی شادی کی ذمہ داریوں سے بھی سیدنا الامام الکبیر کو ان ہی حالات میں سبکدوشی حاصل ہوئی اور اس عرصے میں ایک ہی نہیں دو دو حج کی نعمت سے سرفرازی کے مواقع میسر آئے۔ یقیناً یہ سوال اور دلچسپ سوال اس موقعہ پر پیدا ہوتا ہے، کہ اس مختصر آمدنی (یعنی نانوتہ کی زمین کی محدود پیداوار اور تصحیحی خدمت کے معاوضے میں مطابع سے دس پانچ روپے ماہوار جو مل جاتے تھے، محض اسی سے ان مصارف کی تکمیل میں آپ کیسے کامیاب ہوئے؟

واقعہ یہ ہے کہ ضروریات جن سے خاکدان ارضی کی موجودہ عبوری زندگی میں گھر گرہستی رکھنے والوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے، ان میں خورش پوشش کے سوا بڑا اہم مسئلہ مکانوں کا ہوتا ہے

---

[۵۹] اور دوران اہتمام ہی میں دکن کی عدالت عالیہ کے مفتی بنائے گئے، اور چار سال دکن کے اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ اس دوران میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کا صدر مہتمم بنایا گیا اور کارِ اہتمام حضرت ممدوح کے مشورہ سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ انجام دیتے رہے واپسیٔ دکن کے بعد آپ بدستور صدر مہتمم رہے اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم رہے۔ محمد طیب غفرلہٗ

سیدنا الامام الکبیر نے مکانی، اور تعمیری قصے کو تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ضروریات کی فہرست سے خارج ہی فرما دیا تھا۔ تو طن و قیام کا تعلق جب تک نانوتہ سے رہا، تو پرانے موروثی مکان ہی کو آپ نے کافی قرار دیا۔ پھر جب بجائے نانوتہ کے دیوبند اہل و عیال - - - - - - - - - - - - - - -

کے ساتھ منتقل ہوگئے تو یہاں بھی خود اپنے ذاتی قیام کے لئے جیسا کہ مختلف طریقوں سے اس کا ذکر آچکا ہے کہ چھتہ کی مسجد کے اس حجرے کو آپ کی قیام گاہ کا شرف حاصل ہوا، جس کے طول و عرض کا آج بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، رہے اہل و عیال، سو قرائن کا اقتضا یہی ہے کہ غالباً کچھ دن آپ کی اہلیہ محترمہ اپنے والد شیخ کرامت حسین مرحوم کی حویلی یعنی دیوان کی ڈیوڑھی میں رہی ہونگی مولانا محمد طیب صاحب کے اس بیان سے کہ:

"جب دیوبند حضرت کا قیام ہوا، تو ہمارا مسکونہ مکان (یعنی جس میں مولانا سلمہ اللہ تعالیٰ آج کل رہتے ہیں اسی مکان کو) خدام نے حضرت کو پیش کرنا چاہا مگر انکار فرمایا"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کی خدمت میں دیوبند والوں کی طرف سے مکان پیش ہوا، لیکن لینے پر راضی نہ ہوئے۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی ایک موقعہ پر اپنے ذاتی احساس کو ان الفاظ میں درج کرتے ہوئے کہ

"بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ چاہتے تو سونے کی دیواریں بنا لیتے"

آگے یہ اطلاع دی ہے کہ "مدرسہ دیوبند کے مکان کو لاکھوں اینٹوں سے تعمیر کرا دیا"

"مگر اپنے گھر میں (سیدنا الامام الکبیر نے) ایک چھوٹا روڑا بھی نہ لگوایا" ص۶

"اپنے گھر" کا مطلب شاید وہی ہے جس کی طرف مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی دیوبند کے خدام کی پیش کش جب مکان کے متعلق مسترد فرمادی گئی، تب سیدنا الامام الکبیر کے خادم خاص بلکہ عاشق زار حکیم مشتاق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی کو ایک ترکیب سوجھی۔ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ حکیم صاحب نے پہلے تو یہ کیا کہ قصبہ کے کسی صاحب سے ایک مکان خود خریدا، غالباً یہ اس لئے کیا گیا کہ موروثی مکانات جو لوگوں کی طرف سے پیش ہوئے تھے عموماً اسلام کے قانون وراثت (مما قل منه او کثر[1]) کے لحاظ سے

[1] یہ قرآنی الفاظ ہیں جن میں ہدایت کی گئی ہے کہ مرنے والے مورث نے زیادہ چھوڑا ہو یا کم ہر ایک میں وارثوں کا حق ہو مگر ہندوستان کے عام رواج کے مطابق موروثی مکانوں میں لڑکیوں کے شرعی حصہ کا (باقی صفحہ ۵۴۲ پر)

پیش کرنے والوں کی کلی ملکیت مشتبہ ہوتی تھی، مولانا طیب صاحب نے حکیم صاحب کے مذکورہ بالا طرز عمل کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ جس مکان میں آج کل وہ رہتے ہیں اسکو

"حکیم مشتاق احمد صاحب مرحوم دیوبندی نے خرید کر، اور اس کا ہبہ نامہ میری دادی صاحبہ (اہلیہ سیدنا الامام الکبیر) کے نام کرا کر یہ ہبہ نامہ ان کے قدموں پر لاکر ڈال دیا" ص۸

مکتوبات طیبات

" ان کے" کی ضمیر کا مرجع مولنٰا طیب صاحب کی دادی صاحبہ ہیں، حکیم صاحب جانتے تھے کہ براہ راست خریدے ہوئے مکان کی پذیرائی کی توقع بھی سیدنا الامام الکبیر کی ذات سے مشکل ہے یہی صورت ان کی سمجھ میں آئی کہ ملکیت کا تعلق ان سے رکھا ہی نہ جائے۔ یہی ترکیب چل گئی، اور اسی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب مرحوم کے اسی موہوبہ مکان میں حضرت والا کی اہلیہ محترمہ اپنے بال بچوں کے ساتھ اُٹھ آئیں۔ حکیم صاحب کا یہ مخلصانہ ہدیہ بڑا مبارک ثابت ہوا، آج سیدنا الامام الکبیر کی چوتھی بلکہ پانچویں[۱] پشت تک کی اولاد اسی مکان میں آباد و شاد ہے۔

ظاہر ہے کہ پانچ نسلوں سے جس مکان میں سکونت کا تعلق مسلسل قائم ہوتا چلا آرہا ہو، اس کی ظاہری شکل و صورت میں ردو بدل[۲]، ترمیم و تغیر ایک قدرتی بات ہے۔ لیکن جب تک اس موہوبہ مکان سے سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق رہا سوانح مخطوطہ کے مصنف کی شہادت اسی کے

(بقیہ ص۵۴۱) بہت کم خیال کیا جاتا ہے، جائداد میں لڑکیوں کو جہاں شرعی حصہ دینے کا دستور ہے، وہاں بھی موروثی مکانوں کے متعلق عموماً لاپروائی ہی سے کام لیا جاتا ہے اگرچہ بھائیوں کے ساتھ اس معاملہ میں بہنیں بھی مسامحت ہی سے کام لیتی ہیں، لیکن رضامندی سے خود دست بردار ہوجانا اور بات ہے، مگر رواج کی وجہ سے بہنوں کو باپ کے متروکہ مکان میں شریک نہ سمجھنا اسلام کے قانون وراثت کا انکار ہے ۱۲

(متعلقہ صفحہ ہذا) [۱] یعنی مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا طیب صاحب اور مولانا طیب کے بال بچے جن میں بعض بحمداللہ خود اس وقت صاحب اولاد ہیں، یوں سیدنا الامام الکبیر کے لحاظ سے گویا پانچویں پشت تک کو اسی گھر میں سکونت کا موقعہ مل چکا ہے ۱۲ [۲] باوجود کافی ردو بدل کے جو حضرت والا کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً ہوتا رہا حضرت والا کا جائے سکونت جو کوٹھا کے نام سے معروف ہے اپنی اسی قدیم حالت پر آج تک محفوظ رکھا گیا ہے، اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ محمد طیب غفرلہ

متعلق یہ ہے کہ

"اس میں ایک پھوٹا روڑا بھی نہ لگوایا"

حاصل یہی ہے کہ جس حال میں یہ مکان مولانا طیب صاحب کی دادی کو ہبہ کیا گیا تھا، سیدنا الامام الکبیر کی زندگی میں کسی قسم کا تعمیری اضافہ اس میں نہ ہوا، جوں کا توں اسی حال میں چھوڑ کر آپ دنیا سے تشریف لے گئے، گویا قیام دیوبند کے زمانہ میں چھتہ کی مسجد کا حجرہ دیوان خانہ اور حکیم مشتاق احمد مرحوم کا موہوبہ مکان سیدنا الامام الکبیر کا زنان خانہ رہا، کام چل ہی رہا تھا تو خواہ مخواہ غم نداری بزبخر کی دردسری میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

بہرحال مقابلہ کے میدان میں اترنے والے مسکینوں، عقل کے مسکینوں کی زندگی کے سب سے زیادہ تکلیف دہ ٹپکنے والے گھاؤ، سے الرؤف الرحیم کی رأفت رحمت نے اپنے مخلص بندے کو یوں محفوظ فرما دیا، اور سچ پوچھئے تو بالمؤمنین رؤف رحیم کی خاص نیاز مندی کا نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیے تھا[۱]۔

دوسرا معرکۃ الآرا سوال اس سلسلہ میں لڑکیوں کا بھی تھا، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے اکثر صوبوں اور علاقوں میں مسلمانوں کی عائلی زندگی میں لڑکیوں کا مسئلہ جن خطرناک حدود تک پہنچ چکا ہے، گویا کہا جا سکتا ہے، کہ

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ

اور جب ان میں کسی کو بیٹی کی خبر دی جاوے تو سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہے اور دل ہی دل میں گھٹتا رہے اور جس چیز کی اسکو خبر دی گئی ہو اسکی عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرے آیا اسکو ذلت پر لئے رہے یا اسکو زندہ مٹی میں گاڑ دے

کی قرآنی خبر کے مطابق جاہلیت کی مہیب تاریخ مسلمانان ہند کے گھروں میں واپس ہو چکی ہے،

---

[۱] صحیح حدیثوں میں ہے کہ تعمیراتی کاروبار سے دلچسپی لینے والوں کو صراحۃً تو روکا نہیں جاتا تھا لیکن ایمائی اشاروں میں اپنا منشا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عموماً ظاہر فرماتے رہتے ۱۲

یاقریب ہے کہ واپس آجائے۔شاید جاہلی تاریخ کے اعادہ کی ابتدا اسی زمانہ میں ہوچکی تھی جس زمانہ میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح قدرت کی طرف سے سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ سے اس مسئلہ میں بھی حصہ ارزانی فرمایا گیا تھا، یعنی بجائے اولاد ذکور کے جیسا کہ عرض کرچکا ہوں پہلے ابوالبنات ہی ہونے کی سعادت آپ کو حاصل ہوئی تھی، ہمارے مصنف امام نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ سیدنا الامام الکبیر کی

"اول چند لڑکیاں ہوئیں"

اسی کے بعد یہ اطلاع بھی دی ہے، کہ شیخ اسد علی مرحوم سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے

"والد اکثر مکدر رہتے تھے، اور آرزو کرتے تھے کہ پوتا ہوتا تو اس سے امید نسل جاری ہونے کی بندھتی"۔ ص۳۴

پوتے کی آرزو تو خیر بے جا آرزو نہ تھی، اور حضرت حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ جیسا پوتا خدا نے ان کو عطا بھی کیا، مصنف امام نے اس لطیفہ کو نقل کرکے کہ

"ایک بزرگ نے (شیخ اسد علی صاحب) سے کہا تم یہ (یعنی پوتے کی) آرزو کرتے ہو، اور مولوی صاحب کو ناخوش رکھتے ہو، ان کو مکدر نہ کرو، اللہ تعالیٰ تم کو بھی خوش کریگا"۔ ص۳۴

بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل لڑکیوں ہی لڑکیوں کے پیدا ہونے کی وجہ سے شیخ صاحب مرحوم جو مکدر رہتے تھے، ان کے اس طرز عمل سے سیدنا الامام الکبیر کے مزاج میں گرانی رہتی تھی، بزرگ نے ان کو فہمائش کی، جس سے متاثر ہوئے، مصنف امام کا بیان ہے کہ

"تب اللہ تعالیٰ نے میاں احمد کو عنایت کیا"۔ ص۳۴

بہرحال لڑکیوں کے ساتھ نرینہ اولاد سے حق تعالیٰ نے شیخ صاحب کی آرزو کے مطابق سرفراز فرمایا لیکن اس سے ظاہر ہے کہ لڑکیوں کا مسئلہ تو بجائے خود پھر بھی باقی ہی تھا۔

مولانا طاہر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ[۱] سیدنا الامام الکبیر کے حفید ثانی نے اپنی یادداشت میں ایک

[۱] مولانا کی اس تحریر کے وقت مولوی محمد طاہر حقیقتاً سلمہ اللہ تھے۔لیکن آج جب کہ اس (باقی ص۵۴۵ پر)

واقعہ کا تذکرہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اسد علی صاحب اپنی پوتیوں کے متعلق اسی قسم کے خیالات رکھتے تھے۔ جن خیالات میں میدان مقابلہ کے کھلاڑیوں کو غلطاں پیچاں پایا جاتا ہے اپنی برادری کے رواج کے مطابق وہ ساری باتیں کرنا چاہتے تھے جن کے نہ کرنے کی وجہ سے ناک رہتے ہوئے فرض کر لیا جاتا ہے کہ ناک والوں کی ناک کٹ گئی، غیر تو غیر خود ناک والا غریب اپنی ناک کٹنی کے مغالطہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ شیخ صاحب کے اس قصہ کا ذکر تو آگے کیا جائے گا، پہلے یہ سن لیجئے کہ لڑکیوں کے باپ بننے کا فخر جسے حاصل ہوا تھا، وہ کیا سوچ رہا تھا، اور اسی سوچ کے مطابق عائلی زندگی کے سب سے زیادہ الجھے ہوئے مسئلہ کو اس نے کتنی سہولت کے ساتھ سلجھا لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ زر زیور، لباس اور جوڑے، دان جہیز، لین دین، برادری کا کھانا دانہ، یہ سوالات تو بعد کے ہیں سب سے پہلا مسئلہ اس سلسلہ میں خود لڑکے کا مہیا ہونا ہے، وقت گذرتا چلا جاتا تھا، لیکن جہاں تک لوگوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وقت سے پہلے شاید یہ سوال ہی حضرت والا کے قلب مبارک میں کبھی نہیں ابھرا کہ آخر ان لڑکیوں کیلئے بر تلاش کرنا چاہئے، ہمارے مصنف امام نے بھی لکھا ہے، اور مولانا طاہر سلمہ اللہ تعالیٰ کی یادداشت سے بھی اسی کا پتہ چلتا ہے کہ وقت آنے پر اچانک یہ سوال آپ کے سامنے آیا۔ مولوی طاہر صاحب کی روایت ہے، میں بجنسہ ان کے الفاظ میں نقل کر دیتا ہوں، لکھتے ہیں۔

"ایک دفعہ کا قصہ ہے، کہ حضرت (سیدنا الامام الکبیر) کی خالہ صاحبہ ...... آئیں اور انہوں نے (سیدنا الامام الکبیر کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ بھائی عبداللہ (خالہ صاحبہ کے لڑکے کا نام تھا اس) کی شادی کی کیا فکر ہو گی "۔

فکر کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کی خالہ صاحبہ نے جیسا کہ مولوی طاہر صاحب نے

(بقیہ صفحہ ۵۴۴) سوانح کی تصحیح اندر خواندگی ہو رہی ہے افسوس کہ وہ رحمۃ اللہ علیہ ہو چکے ہیں۔ ۱۳ محرم ۱۳۷۲ھ کو ان کا انتقال ہو چکا ہے محمد طیب غفرلہٗ ۵ ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ

لکھا ہے یہ عجیب بات فرمائی تھی کہ

"اس کو (یعنی ان کے لڑکے عبداللہ کو) کوئی لڑکی اس لئے نہیں دیتا کہ آپ نے جو نکاح ثانی کرایا تھا، اس کی وجہ سے جو بیاہ کرتا ہے پہلی ہی شادی کی اولاد سے کرتا ہے۔"

بظاہر اس کا مطلب غالباً یہی ہے کہ عقد بیوگان کی تحریک جس کا مستقل ذکر آئندہ انشاءاللہ کیا جائیگا اس تحریک کو مسلمانان ہند کے عام رواج کے خلاف پورے جوش و خروش سے سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے اپنی برادری اور علاقے میں جب جاری کیا گیا تو اس سلسلہ میں جہاں بیسیوں واقعات پیش آئے ان میں ایک واقعہ شاید یہ بھی تھا کہ خود اپنی خالہ صاحبہ کو بیوگی کے بعد عقد کر لینے پر آمادہ فرمایا گیا۔ اور اس وقت اپنے جس لڑکے کے نکاح کی فکر کے متعلق آپ کی خالہ صاحبہ گفتگو فرما رہی تھیں، وہ عقد ثانی کے بعد ہی پیدا ہوئے تھے۔

مولنا طاہر صاحب کے اس بیان کا اقتضا تو یہی ہے کہ عقد بیوگان کی مخالفت کرنیوالوں کی طرف سے ایک رکاوٹ یہ بھی ڈالی گئی تھی کہ عقد ثانی سے پیدا ہونے والے بچوں کو برادری والے عقد اول کی اولاد کے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے عقد ثانی کی اولاد کی شادی بیاہ میں کافی دشواریاں پیدا کر دی گئی تھیں۔

بہرحال آپ کی خالہ صاحبہ کی طرف سے یہ سوال پیش ہوا، اسی کے جواب میں پہلی دفعہ دیکھا گیا، کہ سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک پر اپنی صاحبزادی صاحبہ کے عقد کا مسئلہ آیا، مولانا طاہر صاحب نے لکھا ہے،

"حضرت نے فرمایا اسکو میں اپنی بیٹی دوں گا۔"

یہ فرمایا گیا، پھر کیا ہوا؟ کیا لڑکے والوں کی طرف سے فرمائشوں کی فہرست پیش ہوئی؟ یا آپ کی طرف سے کچھ شروط اور قیود کے قصے چھیڑے گئے؟ اللہ اللہ یہی بے چاری مسلمانان ہند کی لڑکیاں ہیں؟ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اپنے ماں باپ کے لئے ان کا وجود سوہان روح بن جاتا ہے، پیدائش ہی کے دن سے ان کے زر زیور کی فکر کا بھوت والدین پر سوار ہو جاتا ہے، پھر

لڑکوں کی تلاش کی سرگردانیاں، خود لڑکوں کی طرف سے ان کے ماں باپ کی طرف سے ہوش رباسطالبے برادری والوں کے سامنے ناک کٹنے کے اندیشے، الغرض لڑکی کیا کسی گھر میں پیدا ہوتی ہے کہ گویا گھر میں جہنم اتر آتی ہے۔ والدین سل اور دق کے دماغی و روحانی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور سب کچھ کرنے دھرنے کے بعد بھی جو کچھ چاہا جاتا ہے بسا اوقات وہ پورا نہیں ہوتا، اب آئیے اور دیکھئے مسلمانان ہند ہی کے ایک شریف گھرانے کی لڑکی کا یہی مسئلہ کتنی سہولت کے ساتھ حل ہو جاتا ہے اپنی خالہ صاحبہ سے سیدنا الامام الکبیر نے وہ وعدہ فرمالیا، اور جیسا کہ مولٰنا طاہر صاحب نے لکھا ہے پہلا کام اس وعدے کے بعد صرف یہ کیا گیا کہ

"حضرت گنگوہی (مولٰنا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ) کو گنگوہ سے بلالیا۔"

بس نیوتہ دے کر یہی ایک مہمان تھے، جو باہر سے بلائے گئے، جب وہ آگئے، تو اچانک بقول مولانا طاہر سلمہ اللہ تعالٰے

"جمعہ کے دن مؤذن سے (سیدنا الامام الکبیر نے) فرمایا کہ لوگوں کو کہدو کہ آج وعظ ہوگا۔"

یہ ہدایت تو مؤذن کو کردی گئی، اور جمعہ کی نماز سے کچھ دیر پہلے جیسا کہ مولٰنا طاہر نے لکھا ہے سیدنا الامام الکبیر

"خود بہ نفس نفیس مکان میں تشریف لے گئے۔"

مکان سے مراد مکان کا زنانہ حصہ ہے، مولانا طاہر صاحب کا بیان ہے کہ

"میری بڑی پھوپی صاحبہ جن کا نام اکرامن تھا، اتفاق سے اس روز ان کو بخار بھی ہوگیا تھا۔"

یہی بی بی اکرامن صاحبہ حضرت والا کی بڑی صاحبزادی تھیں "اپنی بیٹی دوں گا" کے وعدے کا تعلق ان ہی سے تھا، مصنف امام نے بھی ان ہی صاحب زادی صاحبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"بی بی اکرامن یہ سب سے، میاں احمد سے بھی بڑی ہیں، مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کی اول اولاد یہی ہیں۔" ص۴۶

میاں احمد سے مراد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔
بہر حال بخار ہی کی حالت میں اپنی قرۃ العین ان ہی صاحبزادی صاحبہ کے پاس حضرت والا پہنچے، لہٰذا بقول مولانا طاہر

"اور ان سے اجازت چاہی"

یعنی استیذان کے شرعی حکم کی تعمیل کی گئی، اجازت حاصل کر کے جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد تشریف لائے، اور آج عائلی زندگی کا جو مسئلہ مسلمانان ہند کے لئے جان لیوا مسئلہ بنا ہوا ہے، دیکھا گیا کہ صرف دو لفظوں میں حل کر دیا گیا، مولوی طاہر کی اطلاع ہے کہ

"خود بہ نفس نفیس نکاح پڑھا"

نکاح پڑھنے کے بعد وہی لکھتے ہیں کہ

"پھر وعظ فرمایا"

افسوس ہے، کہ بیان کرنے والوں نے حد سے زیادہ اجمال سے کام لیا، باوجود تلاش کے اس کا پتہ نہ چل سکا کہ اس وعظ میں کیا فرمایا گیا تھا، مگر ظاہر ہے کہ ازدواجی فرائض و حقوق کے سوا ان خود ساختہ رسوم اور خود آفریدہ قیود پر تنقید کی گئی ہوگی، جن کی بدولت مسلمانوں نے اپنی لڑکیوں کے وجود کو اپنے سینوں کا بوجھ اور سروں کا دردِ بنا رکھا ہے۔ بہر حال قول کچھ بھی ہو اصل چیز دیکھنے کی تو "فعل" اور "عمل" ہے۔ عقد خوانی کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد مولوی طاہر صاحب کی روایت ہے کہ سیدنا الامام الکبیر مسجد سے گھر آئے اور

"جب ہی ان ہی کپڑوں میں اپنی عزیز بیٹی کو ڈولی میں بٹھا کر رخصت فرما دیا"

مولوی عبداللہ سیدنا الامام الکبیر کی خالہ صاحبہ کے صاحبزادے جن سے بڑی صاحبزادی کا عقد فرمایا گیا تھا، یہ وہی مولانا عبداللہ صاحب ہیں جو علیگڈھ کالج میں ناظم دینیات کے عہدے پر تقریباً نصف صدی تک سرسید مرحوم ہی کے زمانہ سے سرفراز رہے، اور ناظم دینیات علیگڈھ کی حیثیت سے اپنے وقت میں کافی معروف و مشہور ہستیوں میں شمار کئے جاتے تھے، ہمارے مصنف امام

نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ

"یہ احقر کے ہمشیر زادے ہیں، اور اولاد میں شاہ ابو المعالی انبھٹوی کے ہیں، اور مولوی انصار علی صاحب مرحوم کے بیٹے ہیں۔ احقر سے اکثر کتابیں پڑھی ہیں، اور مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) سے بھی پڑھا ہے، نہایت عمدہ آدمی ہیں۔" ص۴۶-۴۷

غالباً حضرت سیدنا شاہ ابو المعالی انبھٹوی قدس اللہ سرہ العزیز سے نسبی تعلق ہونے ہی کی وجہ سے جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے اپنی برادری والوں میں وہ

"میاں پیر جی مولوی عبد اللہ صاحب" ص۴۶

کے نام سے مشہور تھے۔

اور قصہ کچھ ان ہی بڑی صاحبزادی بی بی اکرامن ہی کے عقد تک محدود نہ رہا، مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صاحبزادی صاحبہ جن کا اسم گرامی بی بی رقیہ تھا، ان کے متعلق بھی یہ لکھتے ہوئے کہ

"ان کا نکاح مولوی پیر جی محمد صدیق سے کیا ہے، یہ مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کے ماموں مولوی امین الدین صاحب مرحوم کے نواسے ہیں اور اولاد میں حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں نہایت نیک و سنجیدہ مزاج ہیں۔" ص۴۷

آگے ان ہی کی روایت ہے کہ

"دونوں لڑکیوں کا نکاح بالکل سنت کے موافق کیا۔" ص۴۷

پھر "سنت کے موافق" کے اجمال کی تفصیل کرتے ہوئے وہی لکھتے ہیں کہ

"بدون اطلاع کسی کے، جمعہ کے روز بعد جمعہ نکاح کر دیا۔" ص۴۷

بظاہر مصنف امام کی اس اطلاع سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صاحبزادیوں کا عقد ساتھ ہی ایک ہی دن کر دیا گیا تھا، کیونکہ اسکے بعد وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"البتہ جناب مولوی رشید احمد صاحب کو بلوایا اور ان کو غالباً اطلاع فرمادی تھی، اور کسی کو خبر نہ تھی۔" ص۴۷

مگر مولانا طاہر صاحب کی جس روایت کو پیش کر چکا ہوں، اس میں صرف بڑی صاحبزادی کے عقد کا ذکر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب، اصل واقعہ کیا ہے، تطبیق کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ جمعہ کا دن، اور حضرت گنگوہی کی طلبی، یہ دونوں باتیں اتفاقاً عقد کے دونوں واقعات میں مشترک تھیں، آخر دونوں صاحبزادیوں کا عقد ساتھ ہی انجام پایا، تو مولوی طاہر صاحب والی روایت میں کوئی وجہ نہ تھی کہ صرف ایک ہی صاحبزادی صاحبہ کے عقد کا ذکر کیا جاتا۔[1]

مصنف امام کی روایت کے آخر میں ایک اضافہ یہ بھی ہے کہ

"اور نہ کچھ جہیز وغیرہ کی فکر کی گئی" ص۴۲

اور مولوی طاہر کی روایت کے مطابق جب اسی کپڑے میں جو صاحبزادی صاحبہ پہلے ہی سے پہنے ہوئے تھیں ان کو سسرال ڈولی میں بٹھا کر رخصت فرما دیا گیا تھا، تو جہیز وغیرہ کی فکر کا بار بھلا کیوں اٹھایا جاتا۔

مولانا طاہر صاحب کی روایت کے آخر میں جو یہ جزء پایا جاتا ہے کہ

"اس پر (یعنی عقد کے اس خاص طریقہ پر) حضرت (سیدنا الامام الکبیر) کے والد صاحب (شیخ اسد علی مرحوم) خفا ہو گئے اور خفا ہو کر نانوتہ میں بڑے دروازے میں چلے گئے"

واللہ اعلم بالصواب "بڑے دروازے" سے کیا مراد ہے۔ نانوتہ میں اس نام سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مکان مشہور تھا۔[2] وہیں خفا ہو کر شیخ صاحب بیٹے سے ناراض ہو کر شاید روپوش ہو گئے ہوں۔ لکھا ہے کہ پہلے تو سیدنا الامام الکبیر نے اپنی صاحبزادی صاحبہ کی رخصتی کا نظم فرمایا۔ جب اس سے فارغ ہو گئے تو مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے کہ

"حضرت (یعنی سیدنا الامام الکبیر) نے رخصت کر کے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے

---

[1] صورت واقعہ یہی ہے کہ دونوں عقد الگ الگ دو زمانوں میں ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ مشترک واقعات کی وجہ سے دونوں واقعوں کو ایک سیاق میں ذکر کر دیا گیا ہو۔ محمد طیب

[2] بڑے دروازے کے نام سے شیخ محمد یٰسین صاحب کی حویلی مشہور تھی جو حضرت کے قریبی عزیز اور معتقد علیہ تھے۔ میرے والد صاحب ان کو چچا محمد یٰسین صاحب کہہ کر یاد کیا کرتے تھے۔ محمد طیب

والد کے پاس منانے کے لئے بھیجا۔"

بیان کیا ہے کہ شیخ صاحب کے پاس جب مولانا گنگوہی پہنچ کر معذرت چاہنے لگے، تو شیخ اسد علی صاحب نے جھنجھلا کر فرمایا۔

"کہ ہمیں کچھ نہ کرنے دیا، ہماری برادری میں ناک کاٹ دی۔"

یہی ناک کٹی کے اس عجیب و غریب مفروضہ کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں، شیخ صاحب مرحوم تلملا رہے تھے، کہ میری پوتی اس بے کسی کے ساتھ ننگی بوچی سسرال روانہ کی گئی، نہ برات کی دھوم دھام ہوئی، نہ کھانا ہوا نہ دانہ، بہر حال جو جی میں ان کے آیا کہتے رہے، لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی ان کی باتیں خاموشی سے سنتے رہے، جب اپنے دل کی بھڑاس شیخ صاحب نکال چکے تب مولانا گنگوہی نے عرض کیا، مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے کہ

"حضرت گنگوہی نے نرمی کے ساتھ فرمایا کہ اب جو کرنا ہے کیجئے، وہ (یعنی سیدنا الامام الکبیر) آپ کو منع تو نہیں کر رہے ہیں، انہوں نے تو صرف خدا اور رسول کے طریقہ سے نکاح کر دیا۔"

ظاہر ہے کہ اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا۔ ایک طرف قوم اور ملت کا سوال تھا۔ غلط رسوم اور بیہودہ رواجوں کی جن بیڑیوں میں قوم جکڑتی چلی جا رہی تھی ان سے خلاصی کی عملی تدبیر پیش کرنی تھی، اور دوسری طرف قرآن کا اصرار

فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۝ | سو اُن (ماں باپ) کو کبھی (ہاں سے) ہوں بھی مت کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور اُن سے خوب ادب سے بات کرنا (بنی اسرائیل رکوع ۳)

پیش نظر تھا، شیخ صاحب مرحوم کو یہ سمجھانے کی جرأت کون کر سکتا تھا کہ ناک جب اونچی ہو رہی تھی اسی کو وہ اپنی ناک کٹی کا حادثہ خیال فرما رہے تھے، اور ہر بنیا بقال جو کچھ کرتا ہے، اسی کو اپنی شیخ زادگی کا امتیاز قرار دے رہے تھے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے تو کچھ کہا بھی گیا، خود سیدنا الامام الکبیر تو شاید اتنا کہہ لینے کی بھی جرأت نہ فرما سکتے تھے، منانے کے لئے بجائے اپنے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو

بھیجنے کی غرض غالباً یہی تھی کہ وہ کچھ کہہ لینے کی ہمت کرسکتے ہیں[1]۔ بہرحال کہہ سن کر جس طرح ممکن ہوا، شیخ صاحب کو حضرت گنگوہی نے راضی کرلیا، لیکن رضامندی کی شرط وہی تھی کہ کٹی ہوئی ناک کو درست کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالی جائیگی۔ مولانا طاہر صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے دادا شیخ اسد علی صاحب مرحوم مولانا گنگوہی کے منانے پر من گئے۔

"تشریف لائے، اور پھر جو ان کے جی میں تھا، دعوت وغیرہ انہوں نے کی۔"

دعوت کے ساتھ "وغیرہ" کا لفظ بھی مولانا طاہر صاحب کے بیان میں جو پایا جاتا ہے، اس اجمال کی تفصیل جو کچھ بھی ہو لیکن اتنا تو بہرحال ماننا ہی پڑے گا کہ جو کچھ بھی کیا گیا ہو گا وہ شرعی حدود ہی کے اندر رہو گا۔ اگرچہ یہ بھی جو کچھ انہوں نے کیا کون تھا جو ان کو سمجھاتا کہ ع "ہم جو زنجیریں توڑ چکے پھر لا کے وہی پہناتے ہو۔" کہنے والوں نے شاید ان ہی موقعوں کے لئے کہا ہے کہ

خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی

بیٹا خود اپنی اور اپنی قوم وملت کی آزادی کا عملی درس پیش کر رہا تھا، لیکن رواج اور رسم کی گرفت کی شدت دیکھئے کہ اور تو اور قریب سے قریب تر آدمی بھی اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر رہا تھا[2]۔

بہرحال شیخ صاحب تو برادری کے رسوم اور رواج کے مطالبوں کی تکمیل میں مصروف تھے۔ لیکن سیدنا الامام الکبیر اسی کے مقابلہ میں ان مفروضہ اوہام کی زنجیروں کے توڑنے پر اپنا سارا زور صرف فرما رہے تھے۔ مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے، کہ صاجزادی صاحبہ کو سسرال روانہ کر دینے کے بعد

"آٹھ دن تک نہ بلایا اس زمانہ میں یہ بڑا عیب شمار ہوتا تھا۔"

---

[1] بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا گنگوہی کو بلایا ہی اسلئے ہو کہ حضرت والا سمجھے ہوئے ہوں کہ میرے اس سادہ طرز عمل سے والد کو گرانی پیش آئے گی اور میں کچھ بول نہ سکوں گا تو مولانا گنگوہی ہی انسے سنبھال سکیں گے۔ محمد طیب غفرلہٗ

[2] بالکل اسی طرح برادری کی رسوم کی پروا کئے بغیر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ نے بھی اپنے اُستاذ کی مثال کو سامنے رکھ کر انتہائی سادگی سے اپنی صاجزادیوں کا عقد فرمایا۔ رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ۔ محمد طیب غفرلہٗ

. ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسم کے خلاف سیدنا الامام الکبیر کے اس طرزِ عمل پر برادری والوں میں کانا پھوسیاں ہوئیں، گویا کھلبلی سی مچ گئی، اور یہی مقصد مبارک بھی تھا، کہ واقعات کو واقعات کے رنگ میں دیکھنا چاہیئے

خدا ہی جانتا ہے کہ کیا کچھ کہا گیا، باپ پر قساوت کا، اور ماں پر کٹھور (طوطا چشم) ہونے کے الزام لگانے کے عموماً ان مواقع پر لوگ عادی ہیں، حالانکہ برسوں جس بچی کی پرورش کا بار والدین اٹھاتے رہے اگر ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ کیلئے کسی وجہ سے نہ بلائی جائے۔ تو اس میں بے رحمی، اور سخت دلی کی کیا بات ہے، لیکن ہوتے ہیں لوگ رسم ورواج کے غلام، لیکن اپنی اس غلامی کی توجیہ میں اسی قسم کی بے سر و پا باتوں کے بنانے کا عام دستور ہے، سیدنا الامام الکبیر کی اہلیہ محترمہ بے چاری بہر حال عورت تھیں ان سے زیادہ دن تک عوام کے طعنوں اور فقروں کی برداشت نہ ہو سکی۔ مولانا طاہر صاحب نے لکھا ہے کہ

"جب آٹھ دن پورے ہو گئے، تو اس وقت دادی صاحبہ (سیدنا الامام الکبیر کی اہلیہ محترمہ) نے اجازت لے کر انہیں (صاحبزادی صاحبہ) کو بلوایا"

اور یہ بھی مولوی طاہر صاحب ہی کی روایت ہے، کہ واپس بلانے کے بعد

"پھر جو کچھ سامان انہیں دیئے جانے کو مختصر سا دادی صاحبہ نے جمع کر لیا تھا، وہ دے دلا دیا"

مطلب بظاہر یہی ہے کہ پہلی دفعہ تو سسرال اسی لباس میں رخصت کر دی گئی تھیں، جو پہلے سے پہنے ہوئے تھیں۔ لیکن آٹھ دن کے بعد جب دوبارہ صاحبزادی صاحبہ اپنے میکے تشریف لائیں تب ان کی والدہ نے جامہ جوڑا، زر زیور، ظرف وظروف، الغرض ہندوستانی مسلمانوں کے شریف گھرانوں میں جو کچھ دینے دلانے کا عام دستور ہے، حضرت والا کی اہلیہ محترمہ کی طرف سے صاحبزادی صاحبہ کو عطا کیا گیا، دان جہیز کے اس سامان کی نوعیت کیا تھی؟ تفصیلی علم تو اس کو نہ ہو سکا۔ بایں ہمہ مولانا طاہر صاحب کی روایت میں "مختصر سا" کا جو لفظ ہے، اجمالاً اس سے نوعیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

باقی مصنف امام نے اس کی خبر دیتے ہوئے کہ "نہ کچھ جہیز وغیرہ کی فکر کی گئی" آگے خود اپنا مشاہدہ یہ بیان کیا ہے کہ

"مگر بعنایت خداوندی دونوں (صاحبزادیوں) کے پاس زیور کپڑا جیسے ہماری برادری میں ہوا کرتا ہے موجود ہے، نہایت خوش و خورم گذران ہے' اللہ کا شکر و احسان ہے"۔ ص۴۴

نہیں کہا جا سکتا کہ زیور اور کپڑے کے متعلق مصنف امام نے اپنی یہ شہادت جو درج کی ہے' ان کی فراہمی کی صورت کیا ہوئی؟ بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ کچھ تو سیدنا الامام الکبیر کی اہلیہ محترمہ کی طرف سے مہیا کیا گیا۔ اور اس کے بعد سسرال پہنچ کر بھی اس میں کچھ اضافہ ہوا' اور یوں مل ملا کر دونوں صاحبزادیوں کے پاس وہ سب کچھ قدرت کی طرف سے پہنچا دیا گیا جو بقول مصنف امام ان کی برادری کی عام سطح کے مطابق تھا اور جس کی فراہمی کی فکروں میں لڑکیوں کے ماں باپ ان کے پیدا ہونے کے ساتھ گھلنا شروع ہوتے ہیں۔ کچھ بھی ہو' آپ نے دیکھا کہ خود سیدنا الامام الکبیر کو ایک لمحہ کے لئے اپنی صاحبزادیوں کے متعلق کسی قسم کی خود بافیدہ الجھنوں میں نہ پھنسنا پڑا' بلکہ آخر وقت تک بقول مصنف امام "جہیز وغیرہ کی فکر" آپ کے سامنے نہ آئی' لیکن من حیث لا یحتسب بغیر کسی فکر و تردد کے تقریب کی طعامی دعوت کا بھی نظم ہو ہی گیا' اور برادری کی سطح کے مطابق صاحبزادیوں کے پاس بہت کچھ پہنچا ہی دیا گیا' اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں شادیاں بڑی مبارک شادیاں ثابت ہوئیں' مصنف امام کے الفاظ میں

"نہایت خوش و خورم گذران ہے' اللہ کا شکر و احسان ہے"۔ ص۴۴

لیکن جس حد تک خود سیدنا الامام الکبیر کے عمل کا تعلق ہے وہ اتباع سنت کے دائرہ سے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھا اور اپنی جگہ پچھلوں کیلئے مثال ثابت ہوا۔

بہرحال گھر گرہستی یا عائلی زندگی کے اہم مسائل مصارف کے نقطۂ نظر سے عموماً یہی تعبیر و تقریب کے قصے ہیں' ان ہی ضرورتوں کے لئے زمین کے قلابے آسمانوں سے ملانے والوں کو ہانپتے کانپتے ہی پایا گیا ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کی ایمانی دانش نے عائلی زندگی کے ان دونوں ہفت خوانوں کو قوت ارادی کی ایک ہی جست میں کچھ اس آسانی سے طے کرا دیا کہ ان کا ہونا

گویا نہونے کے برابر ہوگیا، بجائے پہاڑ کے غاروں کے رہے وہ بھی مکانوں ہی میں، اور یکسوئی اور عزلت گزینی کی راہبانہ زندگی کے مقابلہ میں ساری زندگی بیوی بچوں ہی میں گذاری، سب کی تو نہیں لیکن آپ دیکھ چکے کہ دو دو لڑکیوں کے فریضۂ ازدواج سے سبکدوشی کا موقعہ بھی آپ کے سامنے آگیا اور سبکدوش ہو گئے، یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن اپنے آپ کو زندگی کی اہم ضرورتوں کا ایک لمحہ کے لئے تابع بنانے پر راضی نہ ہوئے۔ بلکہ ان ضرورتوں ہی کو اپنی عقل اور اپنے ایمان کا طفیلی بنا کر رکھا (جو درحقیقت قرآنی کلمہ تبتّل کی عملی تفسیر ہے کہ قلب غیر اللہ سے خالی ہو اور مخلوق سے انقطاع نہ ہو یعنی دل بیار دست بکار۔ محمد طیب غفرلہ) یہی فرق ہے جو ابن الوقتوں کو ابوالوقتوں سے جدا کر دیتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ پورے پچاس سال بھی خاکدان ارضی پر ٹھہرنے کا موقعہ جسے نہیں ملا، اسی نے جو وقت زندگی کے اسی مختصر وقفہ میں اپنے مالک کی یاد ذکر و فکر اور اس کی راہ میں ریاضت و مجاہدہ کے لئے نکالا اس کا علم تو خیر دوسروں کو کیا ہو سکتا ہے۔ یہ تو خدا اور اس کے بندے کا معاملہ ہے، لیکن خدا کے بندوں کے لئے جن بے نظیر خدمات اور محیر العقول کارناموں کی گنجائش اس کی زندگی میں پیدا ہوئی، کہ ان کی انجام دہی کے لئے اشخاص تو اشخاص انصاف کی بات تو یہی ہے کہ جماعتوں، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ قوموں کی اجتماعی کوششیں بھی شاید عام حالات میں ناکافی ہی ثابت ہوں، یقیناً یہ گنجایش اسی وجہ سے پیدا ہوئی کہ تعمیر و تقریب جیسی چھچھوری باتوں کی آلودگیوں سے اپنے دل و دماغ کو پاک اور اپنی فطرت کو ان عامیانہ اقتضاؤں کے دباؤ سے آزاد کرنے میں وہ کامیاب ہو چکا تھا، اپنی نظر کو اتنا بلند، اور اپنے نقطۂ نگاہ کو اتنا اونچا کر چکا تھا کہ چھوٹوں، دل کے چھوٹوں کو جو باتیں بڑی معلوم ہوتی ہیں، اس کے نزدیک ان کی حیثیت پیشک شتر، اور پریشہ کے برابر نہ تھی، سڑی گلی پیازوں کی اسے کیا پروا ہو گی جس کی گود سیب و انگور سے بھر چکی ہو۔

باقی تعمیر و تقریب کے سوا زندگی کی دوسری عام ضرورتیں خورش و پوشش وغیرہ کی، سو بار بار اس کا ذکر مختلف پیرایوں میں گذر چکا ہے کہ ذاتی طور پر سیدنا الامام الکبیر کا کھانے کھلانے کے دن یعنی شباب ہی میں جب یہ حال تھا، مصنف امام کی شہادت گذر چکی کہ دلی میں جب ان کے

امکان میں فروکش تھے تو کھانے کے متعلق یہ عام دستور سیدنا الامام الکبیر تھا کہ

"روٹی کبھی پکوا لیتے تھے اور کئی کئی وقت تک اسی کو کھا لیتے تھے"۔

اس موقعہ پر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آدمی جو اُن کی روٹی پکاتا تھا، اس کو حالانکہ مصنف امام نے حکم دے رکھا تھا کہ سالن دے دیا کرو، لیکن اس ہدایت کے باوجود ان ہی کا بیان کیا چشم دید شہادت ہے کہ

"بدقت اس کے (باورچی کے) اصرار پر لے لیتے تھے، ورنہ وہی روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑ رہتے تھے"۔ ص ۲۹

ان کے شاگرد سعید، مولانا منصور علی خاں مرحوم کی اس گواہی کا ذکر کر چکا ہوں کہ

"خوراک ان کی (سیدنا الامام الکبیر) کی نہایت قلیل تھی، کبھی غذا کو بہت رغبت اور حرص سے نہیں کھایا۔ نہایت چھوٹا لقمہ لیا کرتے تھے"۔ ص ۱۹۱

اسی سلسلہ کا وہ مشہور تاریخی لطیفہ ہے جس کے راوی شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں کہ منشی نہال احمد صاحب مرحوم برادر کلاں منشی حبیب حسن صاحب وحشی نے (جن کو حضرت والا نے آریہ ورت کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی مہاراج سے مناظرہ کی شرائط طے کرنے کے لئے اُن کے پاس بھیجا) جب دیانند سرسوتی مہاراج کو رڑکی کے باغ میں دیکھا کہ سامنے تھاک کی تھاک لگی ہوئی پوریوں کا انبار ہے، اور بڑے پرات میں ترکاریاں بھری ہوئی ہیں، اور سرسوتی جی سب ہی کو چڑھا گئے، تو واپس آکر سیدنا الامام الکبیر سے عرض کیا کہ ہر چیز میں آپ پنڈت جی سے جیت سکتے ہیں۔ لیکن ایک کمال ان کا ایسا ہے جس میں آپ کو پسپا ہونا پڑے گا۔ یعنی اگر کھانے میں مناظرہ ہو گیا تو وہ تھاک کی تھاک چڑھا کر بھی دم نہ لیں گے اور آپ اس بارہ میں ان کے لگ بھگ بھی نہ جا سکیں گے۔ اسی کے جواب میں سمجھایا گیا تھا کہ میاں مقابلہ کمال میں ہوتا ہے نہ کہ نقص میں، زیادہ کھانا تو زیادہ احتیاج کی دلیل ہے، اور محتاجی کمال نہیں نقص ہے، مناظرہ علم میں ہوتا ہے نہ کہ جہل میں، بہیمیت شعبہ جہل و نادانی ہے، اور جو حالت خوراک کی تھی پوشاک کا حال بھی یہی تھا۔ ذکر اس کا بھی آچکا ہے۔ یوں

عام طور پر مشہور یہی ہے، مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں بھی ہے، کہ

"معمولی ایک جوڑہ کپڑے کے سوا کسی چیز کے مالک نہ تھے جو ان کے بدن پر رہتا تھا اور اس کی قیمت اس دور کے لحاظ سے روپیہ سوا روپیہ سے زائد نہ ہوتی تھی، صرف ایک جوڑہ[۵] رکھتے تھے، پاجامہ ایک پٹہ (یعنی چوڑے پائنچوں کا) بلاکرتہ کا ایک بندوں والا اچکن جس میں بٹن نہ ہوتے تھے ۔۔۔۔ (ان کے سوا) ایک نیلی لنگی، بس صرف یہی ایک جوڑہ رکھتے تھے، جب وہ میلا ہو جاتا تو تنہائی میں کسی تالاب پر جا کر اور لنگی باندھ کر اسے دھو لیتے، اور جب وہ سوکھ جاتا تو پہن کر چلے آتے" ص۳ یادداشت طیبیہ

اور اس رنگ کو حضرت والا نے اپنی ذات ہی کی حد تک محدود نہیں رکھا تھا، مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے، کہ

مولانا مرحوم کو جیسے اپنے نفس کی زیب و زینت مکروہ معلوم ہوتی تھی، ویسے ہی، اپنے اہل و عیال کی بھی مولانا مرحوم کا یہ حال تھا"

آگے خود وہی لکھتے ہیں کہ

"اسی طرح بی بی صاحبہ (سیدنا الامام الکبیر کی اہلیہ محترمہ) کے پاس بھی صرف دو جوڑے سادہ رہتے تھے"

سادہ کی تفصیل خود ہی کی ہے کہ،

---

۵ جوڑا کا مطلب تو وہی ہے جسے مولانا طیب صاحب نے آگے بیان کیا ہے۔ لیکن بظاہر یہاں مولانا سے تشریح میں شاید کچھ مسامحت ہوئی ہے۔ خود ان ہی کی دوسری یادداشت میں ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کا عام دستور لباس کے متعلق یہ تھا کہ "صرف دو جوڑے رکھتے تھے ایک دھوبی کے ہاں دوسرا بدن پر" امیر شاہ خاں مرحوم سے خاکسار نے بھی جہاں تک یاد آتا ہے یہی سنا تھا۔ اب تطبیق کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں، یعنی زندگی کے مختلف ادوار پر اس کو محمول کیا جائے، کسی زمانہ میں صرف ایک جوڑا کافی خیال کیا جاتا تھا۔ شاید اس وقت تک جب خود دھو لینے کی فرصت مل سکتی تھی، لیکن جب اس کا موقعہ مشاغل کی کثرت کی وجہ سے باقی نہ رہا، تب بجائے ایک کے دو جوڑے رکھنے لگے جن میں ایک بدن پر اور ایک دھوبی کے یہاں رہتا، یا پھر "جوڑے" کے لفظ کو "زوج" کے عربی لفظ کا ترجمہ قرار دیا جائے۔ اور ایک جوڑے سے مراد بدن اور دھوبی والے دونوں کپڑے ہوں، اگرچہ اردو محاورے کے لحاظ سے یہ توجیہ کچھ زیادہ وجیہ نہیں ہے

۱۲

"لباس کی زیب وزینت خلاف شرع شریف نہ تھی"

اہل یعنی بیوی صاحبہ کے زر زیور' اور قیمتی لباس وغیرہ کے متعلق کافی تفصیلات کا تذکرہ اپنے موقعہ پر کیا جا چکا ہے' جن کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ رہے عیال' سو مصنف امام نے آپ کی چھوٹی صاحبزادی صاحبہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہوئے کہ "چھوٹی صاحبزادی بی بی عائشہ' انکی عمر چار برس کی ہے' مولوی صاحب کو ان سے بہت محبت تھی" ص۱۲ ـــ بال بچوں کے متعلق حضرت والا کی طبیعت کے عمومی رجحان کے متعلق اگرچہ یہ لکھا ہے کہ

"بخلاف اور اولاد کے مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) ان کو پاس بٹھلا لیتے' اور ان سے باتیں کرتے" ص۱۲

لیکن باوجود اس کے اپنے بچوں کی' اخلاقی تربیت کے متعلق آپ کی غیر معمولی کڑی نگرانیوں کا جو حال تھا' اس کا کچھ اندازہ اس قصے سے بھی ہوتا ہے' جس کے راوی حکیم الامت مرشد تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز ہیں' شاید اس روایت کے بعض اجزار کا ذکر کہیں پہلے بھی آ چکا ہے' بہر حال یہ بیان کرتے ہوئے کہ سیدنا الامام کے پاس کپڑوں کی گٹھری نہ تھی' اور نہ کوئی ٹرنک بکس تھا' حضرت تھانوی نے فرمایا کہ ایک دفعہ

"کسی شخص نے مولانا (محمد قاسم) کی خدمت میں چند ٹوپیاں بھیجیں۔ آپ نے ان کو تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ صاحبزادہ (یعنی حافظ محمد احمد مرحوم) نے والدہ صاحبہ کی وساطت سے ایک ٹوپی مانگ لی' خود نہیں کہا"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کو کتنے داب میں رکھتے تھے کہ ٹوپی مانگنے کی خود جرات حافظ صاحب مرحوم کو نہ ہو سکی' ماں کو مانگنے میں واسطہ بنایا۔ لیکن سنئے نتیجہ کیا ہوا' حضرت تھانوی کی روایت ہے' کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"فرمایا' ہاں! تو بھی ایسی ٹوپی پہنے گا"

اور بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی' روایت کے الفاظ آگے یہ ہیں کہ اسی کے ساتھ اپنے قرۃ العین لخت جگر کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا تھا۔

"ایسا دماغ بگڑا ہے، اب یہ تکلف سوجھے گا، دیکھ تو کیسی ٹوپی پہناتا ہوں۔"

یہاں تک تو صرف "قول" تھا، قول کے مطابق "عمل" بھی شروع ہوا۔ حضرت تھانوی کا بیان ہے، کہ اس ڈانٹ کے ساتھ ساتھ

"ان کے (حافظ صاحب مرحوم) کے کپڑوں کی گٹھری دیکھی۔"

دیکھنا تھا کہ قیامت ہی ٹوٹ پڑی، حضرت تھانوی کہتے تھے کہ

"تقدیر سے صاحبزادے کی گٹھری بھڑکدار نکلی۔"

خدا ہی جانتا ہے کہ اس "بھڑکداری" کی واقعی نوعیت کیا تھی، لیکن بہرحال گٹھری کی شکل وصورت کچھ ایسی ضرور تھی جو سیدنا الامام الکبیر کے معیار کے مطابق "بھڑک دار" قرار دیئے جانے کے لئے کافی تھی، گٹھری کے بھڑک دار رنگ نے مزاج مبارک کو اتنا بھڑکا دیا کہ بقول حضرت تھانوی غصہ میں بے ساختہ یہ الفاظ سیدنا الامام الکبیر کی زبان سے نکل رہے تھے۔

"اوہو! اس بھڑکدار گٹھری میں آپ کا لباس رکھا جاتا ہے، یوں کپڑے تہ ہوتے ہیں، یہ اچکن بھی تہ ہوا رکھا ہے۔"

یہ غیظ وغضب کی آواز ادھر کانوں میں گونج رہی تھی، اور دوسری طرف دیکھنے والے یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر اسی بھڑکدار گٹھری سے تہ بہ تہ جمائے ہوئے کپڑوں کو نکال رہے ہیں، اور یوں سب کو

"کھول کھول کر صحن میں پھینک دیا۔" الہادی جمادی الثانی ۵۰ھ

(اور اسکے ساتھ غصہ میں یہ بھی فرماتے جاتے تھے کہ باوا ہے نا کہیں کا نواب جو صاحبزادہ کو یوں جوڑے تہ بتہ رکھنے کی سوجھی ہے۔ محمد طیب غفرلہ) ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ بھی سنایا اور دکھایا جا رہا تھا، اسی غیر معمولی فطری ربط اور تعلق ہی کا نتیجہ تھا جو قدرت کی طرف سے باپ اور بیٹوں کے درمیان پیدا کر دیا جاتا ہے لیکن اس قدرتی ارتباط ونسبت کے استعمال کرنے کا طریقہ مختلف ہے، یہی تعلق بڑے بڑوں کی عقلوں کو بچوں کی طفلانہ عقول کا تابع بنا دیتا ہے، بالغ بن جانے کے بعد بھی باوجود پیری کے ان ہی بالغوں کو

اور ان کے عقول کو نابالغ بنتے ہوئے دیکھا جاتا ہے، لیکن یہی اور بجنسہ اسی فطری رستہ کے استعمال کا ایک رنگ وہ بھی ہے جس کا جلوہ سیدنا الامام الکبیر کے اس طرز عمل میں نظر آرہا ہے، اور جو چھوٹوں کی چھوٹی عقلوں کو بڑائی کی طرف لے جانا چاہتا ہے، وہ یہی کرتا ہے اور یہی اس کو کرنا بھی چاہئے۔ اسی طریقہ سے چھوٹے بالآخر بڑے بن جاتے ہیں، ورنہ گنگا جہاں الٹی بہنے لگتی ہے، یا بہانیوالے اسے الٹ کر بہانے لگتے ہیں یعنی اپنی بڑی عقل کو چھوٹوں کی چھوٹی خام عقلوں، اور ان کے خام نارسیدہ تقاضوں کے دھاروں پر بہنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اگر اس کا تجربہ ہو کہ بچوں کی عقلوں میں خامی ہی کا اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، تو جو کچھ کیا جاتا ہے اسی کا تو یہ لازمی ناگزیر نتیجہ ہوتا ہے۔

اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بظاہر اپنے بچوں کے ساتھ لاڈ اور پیار والے عام طریقہ کو جیسا کہ مصنف امام نے بھی لکھا ہے، سیدنا الامام الکبیر نے اختیار نہیں فرمایا تھا۔ لیکن قلبی اور باطنی طریقہ پر قلب اس درجہ اولاد پر شفقت سے بھرپور رہتا تھا کہ زندگی ہی کی حد تک نہیں بعد وفات بھی اولاد پر آپ کی وہی نگاہ شفقت قائم رہی، چنانچہ ان ہی صاحبزادے صاحب کے متعلق جن کی بھر کر لائی گٹھری کھولی گئی، اور نکال نکال کر کپڑے اسی گٹھری سے باہر صحن میں پھینکے جا رہے تھے۔ ان ہی کے متعلق براہ راست خاکسار نے مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے جو بات سنی ہے جب کبھی اس کا خیال آجاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور ظاہر حال سے باطن پر غلط استدلال کر کے

انزلوا الناس علی منازلھم	لوگوں کو اُن ہی کے درجہ پر رکھو۔

کی وصیت نبویہ کی تعمیل کی سعادت سے جو محروم رہ جاتے ہیں، ان پر افسوس ہوتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم سے اس واقعہ کا ذکر خاکسار نے حیدر آباد دکن میں اس وقت سنا تھا جب مولانا حافظ محمد احمد صاحب حکومت آصفیہ کی شاہی عدالت عالیہ کے مفتی بن کر تشریف لائے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن فرماتے تھے کہ حیدر آباد دکن میں مشہور حادثہ رود موسیٰ کے طوفان اور اس

طوفان کی غیر معمولی تباہ کاریوں کا پیش آیا تھا۔ اتفاقاً اس زمانہ میں مدرسہ کے کام میں حافظ صاحب مرحوم حیدر آباد ہی میں قیام فرما تھے۔ جہاں تک خیال آتا ہے خود اپنے متعلق مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب نے بیان کیا کہ خواب میں حضرت مولانا نانوتوی کو دیکھتا ہوں، کہ سخت پریشان ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ احمد کیسا ہے؟ نیند سے بیدار ہونے کے بعد اخباروں سے حیدر آباد کے طوفان کا حال معلوم ہوا۔ تب میں سمجھا کہ حضرت والا کی پریشانی کی وجہ یہی تھی، مولٰنا حبیب الرحمٰن نے فرمایا کہ وفات کے بعد بھی بزرگوں کی روحوں کا تعلق جب اولاد کے ساتھ باقی رہتا ہے، تو اسی سے اندازہ کرنا چاہئے کہ اس تعلق سے لاپروائی برتنے والوں کو بزرگوں کے ساتھ عقیدت کا دعویٰ کس حد تک زیب دیتا ہے، فرماتے تھے کہ حافظ صاحب کے ساتھ میرے نیازمندانہ تعلقات پر بعضوں کو تعجب ہوتا ہے، مگر آج تیرے سامنے اصل وجہ بیان کر رہا ہوں۔ آب دیدہ تھے اور کہتے تھے کہ لیلیٰ کے کتے کو بھی مجنوں چومتا تھا۔ پھر جسے میں دوست رکھتا ہوں، اس کی اولاد سے میرا دل کیوں محبت نہ کرے رحمۃ اللہ علیہ۔

اس واقعہ سے جہاں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ کے مخلصانہ تعلق کی حقیقی بنار کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں حضرت والا کی اپنی اولاد پر شفقت بے پایاں بھی نمایاں ہو جاتی ہے جو بعد مردن بھی بدستور قائم رہی گو ظاہری طرزِ عمل تشدد آمیز تھا۔ کیونکہ تربیت اسی کی مقتضی تھی اور یہ بھی شفقت ہی کا ایک اہم جزو ہے۔

اور میرا ذاتی احساس تو یہ ہے کہ بچوں کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کے جس عام طرزِ عمل کا تذکرہ ہمارے مصنف امام نے فرمایا ہے۔ غالباً اس میں زیادہ دخل شرم و حیا کے اس جذبہ کو بھی تھا جس پر فطرۃً وہ مجبول تھے، یوں بھی مسلمانوں کے شریف گھرانوں کا عمومی دستور اس زمانہ میں یہی تھا کہ والدین کے سامنے اپنے بال بچوں کے ساتھ نوجوان ماں باپ بے تکلف ہونے میں کچھ حجاب محسوس کرتے تھے۔ گویا جب تک والدین زندہ رہتے تھے، اپنے آپ کو بھی اور اپنے بچوں کو بھی ان ہی کی اولاد تصور کرتے تھے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں سیدنا الامام الکبیر کے والد ماجد کی عمر کافی ہوئی

اور حضرت والا کی اولاد زیادہ تر اُن کی (شیخ اسد علی مرحوم) زندگی ہی میں پیدا ہوئی' اس لئے اُن کے رہتے ہوئے اپنے بچوں کے ساتھ ان تعلقات کے ظاہر کرنے پر آپ کی طبیعت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آمادہ نہ ہوتی تھی، جن کی توقع باپ ہونے کی وجہ سے ذوقًا کی جاتی ہے' آخر یہی سیدنا الامام الکبیر تو تھے مصنف امام ہی کے حوالہ سے نقل کرچکا ہوں کہ اپنی چھوٹی صاحبزادی صاحبہ بی بی عائشہ کو اپنے پاس بلاکر بٹھاتے بھی اور ان سے باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ غالبًا اس وقت آپ کے والد ماجد کی وفات ہوچکی تھی' اسی لئے رنگ بدل گیا۔ بلکہ کسی موقعہ پر بچوں کے ساتھ حضرت والا کے خاص تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے مصنف امام کے صاحبزادے مولوی جلال الدین صاحب مرحوم کے متعلق یہ روایت گذر چکی ہے کہ ان کو خاص طور پر سیدنا الامام الکبیر چھیڑا کرتے۔ پیٹ ان کا بچپن میں کچھ غیر معمولی طور پر بڑا تھا اسی لئے جب کھیلتے ہوئے سامنے آتے تو فرماتے ع چلا کچھالا اگر بڑ جھالا

بہر حال بقول شخصے ؎ راحت دنیا اگر مطلوب ہو + حاجتوں میں مختصر ہوجائیے

کے حکیمانہ نقطۂ نظر کے مطابق راحت کی یہ زندگی جو سطح بینوں کو زحمت کی زندگی محسوس ہوتی ہے[۱]

---

[۱] دنیا کے مغالطوں میں ایک دلچسپ مغالطہ یہ بھی ہے کہ کار دنیا کو دیکھ کر اس کی نہ حد ہے نہ انتہا مختصر گیری کو اپنا ضابطہ حیات جن لوگوں نے بنالیا تھا بقول حافظ ؎ مرمنزل قناعت نتواں زدست دادن + اے ساربان فروکش کیں رہ کراں ندارد + اپنا کجاوہ اتار کر جو بیٹھ گئے۔ اور جس راہ کا نہ ادھر ہے اور نہ چھور۔ اس پر چلنے والوں کو دیکھ دیکھ کر ؎ ہر آنکہ کنج قناعت بہ گنج دنیا داد + فروخت یوسف مصری بہ کمترین ثمنے۔ کے ساتھ دوسروں کو بھی پکارتے رہے لیکن نادانوں کو ان کی راحت کی زندگی زحمت سے معمور نظر آتی ہے' اس راہ کے پیشوائے اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک اہم رخ یہی ہے' لیکن بیان کرنیوالے آپ کی زندگی کے اس رخ کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والوں میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ بجائے آسان زندگی کے اس کو وہ دشوار زندگی خیال کرنے لگتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک کے اس نکتہ کو صدیقہ عائشہ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پالیا تھا' ان کی روایت ماخیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین قط الا اخذ ایسرھما یعنی ایسی دو باتیں جن میں ہر ایک کا اختیار آپ کو دیا گیا تھا تو ہمیشہ آپ کا دستور یہی تھا کہ ان دونوں میں جو آسان تر ہوتی اسی کو آپ اختیار فرماتے تھے' یہ روایت بخاری و مسلم کی ہے جس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ سارے مباحات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا۔ اسی لئے سمجھ میں آتا ہے کہ رہنے کے لئے جس قسم کے مکانات' پہننے کے لئے جس قسم کا لباس کھانے کے لئے جس قسم کی غذائیں آپ استعمال فرماتے تھے ان میں "ایسرہا" یعنی سہل تر پہلو کو (باقی ص۵۶۳ پر)

سیدنا الامام الکبیر نے اپنی ذات ہی کی حد تک اس کو محدود نہیں رکھا تھا، بلکہ اپنے اہل وعیال کو بھی چاہتے تھے کہ راحت کی اسی زندگی کا مذاق شناس بنا دیا جائے۔ (کسی عارف نے خوب ہی کہا ہی

کار دنیا کسے تمام نکرد　　　　ہر چہ گیرید مختصر گیرید)

حدیث نبوی میں اسی کلمہ عملی کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کن فی الدنیا کانك غریب او عابر سبیل وعد نفسك من اھل القبور یعنی دنیا میں بسر کرنے والے کے لئے درجہ بدرجہ تین مقامات ارشاد ہوئے ایک مثل مسافر کے ہو جاؤ۔ مسافر سے زیادہ کون مختصر سامان ہوتا ہے اس کا سارا گھر سمٹ کر ریل کی ایک سیٹ پر آجاتا ہے۔ دوسرا درجہ راہرو کا ہے جو راستہ سے گذر رہا ہو وہ یقیناً بنچ پر بیٹھے ہوئے سے بھی زیادہ مختصر سامان ہوگا اور تیسرا درجہ یہ فرمایا کہ اپنے کو اہل قبور میں سے سمجھ لو، ظاہر ہے کہ مردہ کے پاس بجز کفن کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا سیدنا الامام الکبیر نے اپنے کو قریب قریب اسی تیسرے مقام پر پہنچا دیا تھا۔ حد ہے کہ اہل وعیال کے لئے بھی یہی چاہتے تھے۔ محمد طیب غفرلہ) آخر وارستہ مزاجی جس کی اس حد کو پہنچی ہوئی ہو، کہ اسی لباس میں پہلی دفعہ اپنی لڑکی کو سسرال روانہ فرما دیا تھا، جو پہلے سے وہ پہنے ہوئے تھیں، اس کے بعد سچ پوچھئے تو اس راہ میں بلندی کا مرتبہ ہی کیا باقی رہتا ہے، صاحبزادہ کی بھڑک دار گٹھری سے کپڑوں کو نکال نکال کر پھینکنے پر، ممکن ہے اُن لوگوں کو شاید آج اچنبھا ہو، جو پیدا ہونے کے ساتھ ہی اپنے بچوں کو غلمانوں کی شکل میں رکھ کر اپنی آنکھیں سینکا کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ممکن ہے ماں باپ کی آنکھوں کو اس سے خنکی ہی حاصل ہوتی ہو، لیکن اپنی آنکھوں کی خنکی کے لئے وہ شاید اندازہ نہیں کرتے کہ ان معصوموں کے نفسیات میں غیر ضروری خواہشوں اور نہ پوری ہونے والی تمناؤں کی کتنی خطرناک جہنم کو وہ سلگا رہے ہیں، جس سمت کی طرف انجن بھاگا جا رہا ہے، اسی کی طرف دھکا دینا

(بسلسلہ صفحہ ۵۶۲) آپ نے اختیار فرمایا تھا، جو مل گیا سو کھا لیا، پہن لیا، بسہولت جس قسم کے مکان میں زندگی بسر ہو سکتی تھی خواہ مخواہ اس میں طمطراق کے طریقوں کو آپ نے اختیار نہیں فرمایا۔ اگرچہ صوفی مزاجوں پر ممکن ہے میری تشریح کچھ گراں گذریگی لیکن عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان یہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲

یہ کمال نہیں ہے۔ کمال اسی کا ہے جو موڑ کر اس انجن کو مخالف سمت کی طرف دوڑا دے، اور یہ نہ ہو سکے تو خندقوں اور کھائیوں سے بھری ہوئی راہ پر کم از کم انجن کی رفتار ہی سست کر دے۔

خیر میں کیا کہنے لگا، بات ہو رہی تھی حضرت والا کے مصارف کے متعلق، عائلی زندگی میں حاجتوں کے اختصار کا ایک بہترین عملی نمونہ آپ کے سامنے پیش ہو چکا، مولوی ہونے کی وجہ سے خیال گذر سکتا ہے کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم کتابوں کی فراہمی اور ان کی خریداری کی مد آپ کے یہاں شاید ہوگی؟ مگر کسی دوسرے عنوان کے تحت یہ تفصیل بتا چکا ہوں، خود حضرت کے مکاتیب طیبہ سے ایسی شہادتیں اخذ کر کے پیش کر چکا ہوں جن میں خود ہی اس کا اقرار فرمایا گیا ہے، کہ میرے پاس کتابوں کا کوئی ذخیرہ نہیں ہے، اور میرا حافظہ اگر غلطی نہیں کر رہا ہے تو یاد آتا ہے کہ حضرت کے فرزند رشید مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست کان میں یہ بات پڑی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات کے بعد قرآن مجید اور بخاری شریف کا وہ نسخہ جس کے آخری چند پاروں کے تحشیہ و تصحیح کا کام حضرت ہی نے انجام دیا تھا، غالباً بخاری کے ناشر حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ہدیۃً عطا فرمایا تھا، ان دو کتابوں کے سوا شاید تیسری کتاب فصوص الحکم شیخ محی الدین بن عربی کی، لے دے کر کتابی متروکہ آپ کا یہی تھا، جس وقت حافظ صاحب حیدر آباد کی کسی مجلس میں اس واقعہ کا ذکر فرما رہے تھے، تو خیال آتا ہے کہ دماغ میں میر مرحوم کا مشہور شعر ؎

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط — بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

بے ساختہ چکرانے لگا، جی تو چاہا تھا کہ پڑھ دوں، لیکن ادب مانع ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس حد تک سوچتا ہوں، اور جو معلومات مجھ تک مختلف ذرائع سے سیدنا الامام الکبیر کے متعلق پہنچی ہیں، ان میں جہاں تک غور کرتا ہوں سب کا اقتضا یہی ہے کہ عموماً اپنے خرچ ہی کو حضرت والا نے اتنا محدود کر رکھا تھا کہ دخل کی توفیر و تکثیر کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی، بس ان سارے قصوں میں صرف ایک چیز ایسی تھی جس کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ اس باب میں آپ کا حوصلہ بڑا اور کافی بڑا تھا۔ اس مد میں بجائے اختصار اور تنگی کے ممکنہ حد تک فراخی اور وسعت ہی کی طرف آپ کی فطرت کا

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ جبلّی رجحان تھا؛ بلکہ "سوانح مخطوطہ" کے مصنف نے تو "مولویوں کے گروہ" یا "طبقہ" کے لحاظ سے اس کو آپ کی فطرت کا شذوذ، اور استثنائی حال قرار دیتے ہوئے اس لطیفہ کا ذکر کیا ہے کہ

"کسی شخص نے کسی حکیم سے پوچھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ عجیب چیز کیا ہے؟"

لکھا ہے کہ حکیم نے جواب میں کہا کہ

"مولوی ہوکر سخی ہونا۔"

آگے پھر اپنے ذاتی احساس کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے کہ

"سو یہ عجیب چیز آپ ہی (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کا حصہ تھا۔" ص۲۴ مخطوطہ

پہلی بات یعنی "مولوی کی سخاوت" کو دنیا کے عجائب میں شمار کرنا، اس کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا[۱]۔ لیکن دوسری بات یعنی سیدنا الامام الکبیر میں اس خاص وصف کا مشاہدہ کوئی شبہ نہیں کہ

---

[۱] لکھنے والے صاحب کا تعلق چونکہ مولویوں ہی کے طبقہ سے ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کے اس دعوے میں کافی وثاقت پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن مشہور ادیب و متکلم جاحظ کا لطیفہ مشہور ہے کہ پیشہ وروں کی شہادت پیشہ وروں کے متعلق قابل اعتبار نہیں ہوتی۔ اس نے عام مولویوں کے متعلق تو نہیں لیکن اسی طبقہ کا ایک فرقہ قراء یعنی قرارت کرنے والوں کے مسئلے میں یہ فیصلہ کردیا ہے کہ کم از کم ان کی تنقید اپنے ہم پیشہ قاریوں کے متعلق عموماً رشک و حسد پر مبنی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں تو مولویوں کو بخیل ٹھیرانے سے زیادہ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعبیر یوں کی جائے کہ مولوی بخیل نہیں ہوتے بلکہ بخیلوں کو مولوی بن جانے کا موقعہ مختلف وجوہ سے چونکہ عموماً مل جاتا ہے، اسی کا نتیجہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مولوی عموماً بخیل نظر آتے ہیں اور یہ کیوں ہوتا ہے اس کے لئے مستقل مضمون کی ضرورت ہے آج کل تو اس کی کھلی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر ان ہی گھرانوں کے بچوں کو اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ مل رہا ہے جن کا خاندانی ماحول حد سے زیادہ پست ہوتا ہے اسی لئے دل کھول کر خرچ کرنے کا بے چاروں میں حوصلہ ہی نہیں ہوتا۔ خاندانی روایات کا بھی فراخ چشمی اور تنگ ظرفی کا قانون پابند ہوتا ہے۔ منجملہ بہت سے تجربات کے ایک تجربہ فقیر کا ایسا ہے جس کا خواہ مخواہ اس موقعہ پر خیال آرہا ہے۔ مشکوٰۃ شریف کی شرح التعلیق الصبیح کے مصنف مولانا ادریس کاندھلوی سے علماء کا طبقہ عموماً واقف ہے، تین جلدیں اس کتاب کی دمشق میں طبع ہوئیں۔ آئندہ حصہ کیوں نہ چھپ سکا۔ دلوں میں سوال ہوتا ہوگا۔ اس حصہ میں براہ راست فقیر بھی شریک تھا۔ حیدر آباد کی مجلس اشاعت العلوم سے اس کتاب کی طباعت منظور تھی، ابتدائی منظوری تقریباً پانچ ہزار کی مجلس کے ایسے صدر نے دی تھی جو کابر آئین کابر رئیس تھے۔ لیکن درمیان میں ان کی وفات ہوگئی (باقی ص۵۶۶ پر)

واقعات اور متواتر روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت والا نہ کسی ملک کے والی تھے، اور نہ کسی حکومت کے وزیر و امیر، نہ کسی شہر کے تاجر، اور نہ کارخانہ دار، الغرض جود و کرم کے "جبلی ملکہ" کے ظہور کے لئے جن امکانات کی ضرورت ہے، ان سے آپ کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ یہ سچ ہے (تقریباً ایک صدی سے جو یہ دیکھا جا رہا ہے، کہ خود دارالعلوم دیوبند کے مطبخ ہی سے نہیں، بلکہ دیوبند کے زیر اثر، یا اس کے نقش قدم کے مطابق ہندوستان کے طول و عرض کے بے شمار دینی مدارس کے باورچی خانوں سے کھانیوالوں کو جو کچھ کھلایا جا رہا ہے۔ اور اللہ و رسول کے مہمانوں، دین کے طلبہ کی ضرورتیں جو پوری ہو رہی ہیں بذل و نوال کے اس تماشے میں اسی کی ہمت اور اسی کے عزم اور ارادے کی قوت سب سے زیادہ نمایاں ہے، جس کے پاس کچھ نہ تھا، لیکن سب کچھ رکھنے والوں سے بھی جو کام بن نہ آیا، وہی کام اس کچھ نہ رکھنے والے سے قدرت کے غیبی ہاتھ نے لے لیا، گویا شکر خورے تک براہ راست نہ سہی بالواسطہ ہی سہی، شکر پہنچا دی گئی، بلاشبہ یہ ایک واقعہ ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس عام قصے سے قطع نظر واقعہ یہ ہے کہ ذاتی طور پر باوجود کچھ نہ رکھنے کے سیدنا الامام الکبیر جو کچھ کر گذرتے تھے، دیکھنے کا موقعہ تو مجھے نہیں ملا ہے لیکن دیکھنے والوں سے سن کر کم از کم میں تو مبہوت ہو جاتا ہوں، خصوصاً اس سلسلہ میں آپ کا یہ "فطری رجحان" اس وقت غیر معمولی طور پر نمایاں ہو جاتا تھا، اس سلسلہ میں دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ ہمارے مصنف امام جیسے محتاط بزرگ کے قلم سے شہادت کے یہ الفاظ بے ساختہ نکل پڑے ہیں، ارقام فرمایا ہے کہ

"مہمان نوازی مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) پر ختم ہے[۵]" ص ۳۳

(بقیہ ص ۵۶۵) نئے صدر صاحب حالانکہ ذاتی طور پر حکومت آصفیہ کی وزارت کے منصب پر فائز تھے۔ لیکن ذاتی ارتقاء کا نتیجہ یہ تھا کہ ہزار روپے کی منظوری کیلئے ممکنہ ذرائع سے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا لیکن ان کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آیا کہ حدیث کی ایک کتاب کیلئے ہزار روپے کی منظوری کیسے دی جا سکتی ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخری حصہ کتاب کا شائع نہ ہو سکا ۱۲

[۵] اس موقعہ پر مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کی اس رویا کا ذکر بھی فرمایا ہے جو بچپن میں آپ کو ہوئی تھی (باقی ص ۵۶۷ پر)

یہ ایک صوفی صافی، ثقہ وحجت محدث کی گواہی ہے، جس نے بچپن سے آخر عمر تک آپ کی زندگی کا مطالعہ کیا تھا، گرم وسرد سفر حضر میں جن کی زندگی آپ کے ساتھ گذری تھی، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی جو کچھ دیکھا تھا اسی کی روداد کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے

"مہمان آپ کے یہاں دور ونزدیک سے امیر وغریب سب ہی قسم کے اکثر ہوتے رہتے تھے۔ جوق جوق لوگ ہر طرف سے آتے تھے۔ یہ شعر شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا آپ کی شان کے مناسب تھا ؎

فطوبی لباب کبیت العتیق   حوالیہ من کل فج عمیق"

آگے اپنے مشاہدہ کو ان الفاظ میں قلمبند کرتے ہوئے کہ

"مگر اس کثرت پر کبھی تنگ دل نہ ہوتے اور کمال کشادہ پیشانی سے ان کی (مہمانوں کی) مدارات فرماتے"

ان ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"جس دن مہمان زیادہ ہوتے اس دن بہت خوشی ہوتی، اور جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا اس دن انتظار فرماتے"

اسی کے قریب قریب مولانا طیب صاحب کا بھی بیان ہے کہ

"مولانا مرحوم کے یہاں مہمانوں کی آمد ورفت بہت رہتی تھی، کوئی تاریخ کوئی دن خالی نہ جاتا تھا، جس میں کوئی مہمان نہ ہو، اور بعض اوقات بڑا مجمع ہو جاتا تھا"

آگے وہ بھی لکھتے ہیں کہ

"جس دن زیادہ مہمان ہوں، مولٰنا زیادہ نزخوش ہوتے اور جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا مولانا

(بقیہ ۵۶۶) یعنی خواب میں دکھایا گیا کہ آپ کی وفات ہو گئی دفن ہونے کے بعد جبرئیل علیہ السلام معلوم ہوا کہ سامنے آئے اور کچھ نگینے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ یہ تمہارے اعمال ہیں، ان ہی نگینوں میں ایک نگینہ غیر معمولی بڑا اور خوشنما تھا اسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے جبرئیل امین نے کہا کہ یہ عمل حضرت ابراہیم خلیل کا ہے، اس خواب کا تذکرہ کسی موقعہ پر آچکا ہے۔ میں نے بیان کیا تھا کہ مہمان نوازی میں آپ کی غیر معمولی اولوالعزمیوں کو بعضوں نے اس خواب کی تعبیر قرار دیا ہے ۱۲

ملول رہتے"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے، اپنی ساری بے سروسامانیوں کے باوجود سیدنا الامام الکبیر کے یہاں باضابطہ گویا "مہمان خانہ" ہی قائم تھا، اور کیا "مہمان خانہ" صرف کھانے پینے کی حد تک آپ کی مہمان نوازیاں محدود نہ تھیں، سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے کہ

"مہمانوں کے لئے جملہ سامان راحت کا تیار فرماتے اور بایں ہمہ عذر باقی رہتا" ص۲۸

مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں بھی ہے، کہ

"علاوہ کھانے کے مہمانوں کے جملہ حوائج اور سامان راحت کے مہیا ہوتے"۔

اسی سلسلہ میں سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس قصہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک نابرسان حال غریب آدمی سیدنا الامام الکبیر کا مہمان ہوا، بے چارے کو حقہ پینے کی عادت تھی، ادباً وہ فرمائش نہ کر سکا، اس کو نفخ کی شکایت ہوئی تب پتہ چلا، معلوم ہونے کے ساتھ خود سیدنا الامام الکبیر چلم چڑھا کر اس کے سامنے لائے اور عذر فرمانے لگے کہ

"آپ نے پہلے کیوں نہیں فرمایا تھا کہ میں حقہ پیتا ہوں"!

تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو کسی دوسری جگہ بیان کر چکا ہوں۔

بہرحال مہمانوں کے آرام و آسائش کے سلسلہ میں اور کیا کیا جاتا تھا، اس کی پوری تفصیل تو معلوم نہ ہو سکی، لیکن اس مد کے ایک جزء یعنی دسترخوان جو چنا جاتا تھا، اس کی پہلی خصوصیت تو وہی تھی جس کا ذکر سوانح مخطوطہ نے کیا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر

"کھانا مہمانوں کے ساتھ کھاتے"!

بڑے اور چھوٹے مہمان کی اس باب میں خصوصیت نہ تھی۔ بھلا ایک عامی غریب کے لئے باوجود شدید نفرت کے حقہ چڑھا کر پیش کر کے بھی جو کوتاہی کا عذرخواہ ہو سکتا ہو، اس کے متعلق بڑے اور چھوٹے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے، یاد ہوگا، کسی موقعہ پر آپ کے تلمیذ سعید مولانا منصور علی خاں مرحوم کے حوالہ سے نانوتہ کے قیام کے حالات کو نقل کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا تھا کہ مہمان نوازی کا

یہ قصہ وہاں بھی جاری رہتا تھا، نانوتہ کی مسجد کی سہ دری میں جہاں حضرت والا کا قیام رہتا تھا، جب گنجائش مہمانوں کے ٹھہرنے کی باقی نہ رہتی تو اپنے ماموں صاحب کے مکان میں مہمانوں کو اتارتے، اسی موقعہ پر خود اپنے ساتھ اس گذرے ہوئے واقعہ کا تذکرہ مولانا منصور علی صاحب نے جو کیا ہے کہ ایک دفعہ چند مہمانوں کے ساتھ ایک بڈھا مسکین شکستہ حال بھی تھا، کھانے کے وقت دوسرے مہمانوں کے ہاتھ تو دھلا دیئے گئے، مگر بڈھے کی طرف کسی نے التفات نہ کیا، مولوی منصور علی خاں صاحب نے بیان کیا ہے کہ اچانک میں نے دیکھا سیدنا الامام الکبیر بے تحاشا جھپٹ کر اس بڈھے کے پاس آئے اور لوٹے کو خود اپنے ہاتھ میں اٹھا کر اس غریب کے ہاتھ بڑے ادب کے ساتھ دھلوا رہے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ حضرت والا کے یہ بوڑھے مہمان جن کا تعارف مولانا منصور علی خاں صاحب مرحوم نے

"بڈھا، مسکین، شکستہ حال"

کے الفاظ سے فرمایا ہے، جو کچھ بھی ہوں، لیکن تھے تو بہر حال وہ مسلمان، اور حضرت کے عقیدتمندوں ہی میں ہوں گے لیکن مہمانوں کے متعلق جس کی نظر کی وسعت کا یہ حال ہو، کہ وہی ٹھسکہ والے درویش جن سے مشرباً گو نہ حضرت والا کا اختلاف بھی تھا۔ ان ہی کو ذریعہ بنا کر جیسا عرض کر چکا ہوں حضرت گنگوہی اور سیدنا الامام الکبیر کے درمیان درانداز وں نے دراندازی بھی کرنی چاہی تھی، ان ہی کا قصہ بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز فرمایا کرتے تھے کہ شاہ صاحب گھوڑے پر آئے تھے، ساتھ اُن کے سائیس بھنگی ذات کے تھے، یہی سننے کی بات ہے کہ التزاماً ہمیشہ اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانے کا جو عادی تھا، اسی کو دیکھا گیا ہے کہ شاہ صاحب کے دسترخوان پر خاطر مدارات کے لئے تو دوسروں کو بٹھا دیا گیا ہے، اور بقول حضرت تھانوی سیدنا الامام الکبیر نے

"ان کے (شاہ صاحب) کے سائیسوں کو خود کھلوایا"۔ الہادی جمادی الثانی ۵۰ھ

جب بھنگیوں کے محلہ میں مہاتما گاندھی نے اپنا مقامی "آشرم" کچھ دن کے لئے دہلی میں بنوایا تو

صرف ہندوستان ہی نہیں، ساری دنیا میں اس کا چرچا ہوا، لیکن دیکھ رہے ہو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک تربیت یافتہ غلام کو اس واقعہ سے سالہا سال پہلے اسی ہندوستان میں بھنگیوں کو مہمان بنا کر ان کی مہمان نوازی کے سلسلہ میں یہ نمونہ پیش ہو رہا ہے کہ بھنگیوں کے آقا شاہ صاحب کو دوسروں کے حوالہ کر کے بہ نفس نفیس خود بھنگیوں کو کھانا کھلوایا جا رہا ہے[ا] ۔ اور بھنگی بیچارے تو پھر بھی آدمی ہی تھے ۔ مہمان کی طرف منسوب ہو جانے کے بعد اکرام و احترام کا استحقاق جانوروں کو بھی جس کے یہاں حاصل ہو جاتا تھا، اور کیسا استحقاق! ہمارے مصنف امام راوی ہیں۔

"ایک بار مہمانوں کی کسی سواری کے لئے دانے کی ضرورت تھی چنے نہ ملے"۔

چنے نہ ملے تھے تو جو وغیرہ جیسے اناج سے بھی کام چل سکتا تھا، اور اناج ہی کی سرے سے کیا ضرورت تھی۔ جانوروں کے لئے تو گھانس بھونسہ کی خوراک بھی کافی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس وقت سوال جانور کی خوراک کا نہ تھا، بلکہ مہمان کی سواری کے جانوروں کا مسئلہ تھا۔ سنئے مصنف امام فرماتے ہیں کہ چنے جب نہ ملے تو،

"گھر میں کابلی چنے رکھے ہوئے تھے"۔

ہندوستان میں عموماً کم مقدار میں پیدا ہوتے ہیں، اور اناج کی اعلیٰ قسموں میں کابلی چنوں کا شمار ہے۔ لیکن مہمان کی سواری کے جانور کی مہمانی کے لئے سیدنا الامام الکبیر نے حکم دیا کہ کابلی چنے ہی دیئے جائیں، مصنف امام کا بیان ہے۔

[ا] اس موقعہ پر بے ساختہ دلی ہی میں گذرے ہوئے واقعہ کا خیال آگیا حضرت مولانا فخر دہلوی کے حالات میں لکھا ہے کہ بیرا نامی خاکروب دلی میں تھا۔ خانقاہ مبارک کی صفائی کا کام اس سے متعلق تھا۔ ایک دفعہ مسلسل دو دن تک بیرا پر مولانا کی نظر نہ پڑی دریافت فرمایا گیا معلوم ہوا کہ بیمار ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ "ہماں ساعت از جا برخاستند" جاتے ہوا ٹھ کر کہاں گئے۔ دیکھا گیا کہ بھنگیوں کے محلہ کی طرف جا رہے ہیں اور بیرا غریب کا جہاں جھونپڑا تھا وہاں پوچھتے ہوئے پہنچے غریب پڑا ہوا تھا، مولانا اس کی بالیں پر کھڑے تھے اور فرما رہے تھے" میاں بیرا از دو روز نیامدید واز فقیر پرسش احوال شما تاخیر شد معاف خواہید فرمود"۔ بجنسہ آپ کے سوانح نگار نے بھی یہی فقرہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ علاوہ نقد کے مولانا نے حکم دیا کہ میرے طبیب خاص میر حسن حکیم سے بیرا کا علاج کرایا جائے اور دوا وغیرہ کے مصارف میری طرف سے ادا کئے جائیں جو نہیں جانتے ہیں انکو معلوم ہونا چاہئے کہ محمد شاہ بادشاہ تک مولنا فخر رح کی خانقاہ میں حاضری دیا کرتے تھے ۱۲ سیر الاولیا ص۱۱۷

"دہی دلوا کر دانہ دے دیا" صـ۳۳

صحیح طور پر اس کا پتہ نہ چل سکا، کہ سواری کے ان جانوروں کی تعداد کیا تھی ؟ لیکن مصنف امام نے بجائے واحد کے جمع کا صیغہ "مہمانوں" کا ارقام فرمایا ہے۔ اگر یہ سواری گھوڑوں کی تھی، تو یقیناً ان کو ایک سے زیادہ تو بہرحال ہونا چاہئے، اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ کابلی چنوں کی کتنی مقدار دلوانی پڑی ہوگی ؟

مہمانوں کے آرام و آسائش کی عام ضرورتوں کے سوا، حضرت والا کا مذاق ضیافت کے سلسلہ میں یہ معلوم ہوتا ہے، کہ کھانا مقدار میں بھی کافی ہو، اور جس حد تک لذیذ و مزیدار بنایا جا سکتا ہو، اس کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کو خود

"اپنے نفس کے لئے کبھی تکلف نہ ہوتا، مگر مہمان کے واسطے بہت تکلف کا کھانا تیار ہوتا تھا"

تکلف کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ "پلاؤ" جس کی تعبیر سیدنا الامام الکبیر چاول کے لفظ سے فرماتے، مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مہمان نوازی کا شاید لازمی جزو تھا، انہوں نے لکھا ہے کہ اسی "پلاؤ" کو پیش کرتے ہوئے مہمانوں سے دستور تھا کہ سیدنا الامام الکبیر عموماً یہ فرماتے کہ

"ہم نے تمہارے لئے چاول پکانے میں تکلف نہیں کیا، بلکہ ہمارے گھر آمدنی آراضی کے یہی چاول ہوتے ہیں" صـ۳۲

اور یہ کیفیت تو ایک جز کی تھی، پلاؤ کے سوا اور جو چیزیں اس سفرۂ عام پر چنی جاتی تھیں اُن کے متعلق اس سے زیادہ لذیذ شہادت اور کیا ہو سکتی ہے، جسے اپنی یادداشت میں مولانا طیب صاحب نے نقل فرمایا ہے، لکھتے ہیں کہ

"کھانا ایسا لذیذ ہوتا تھا کہ بعض زبان کے چٹوروں کی آمد مولنا کے یہاں صرف اسی نیت سے بھی ہو جاتی تھی"

کیفاً تو ضیافتی دعوتوں کا یہ رنگ تھا، باقی کماً اور مقداراً ان کی نوعیت کیا ہوتی تھی، اسی جزئی واقعہ میں اس سوال کے جواب کو آپ پا سکتے ہیں، مصنف امام غالباً خود بھی اس وقت دستر خوان پر موجود تھے فرماتے ہیں کہ

"ایک بار دستر خوان پر کھچڑی کے ساتھ بہت سا گھی آیا، دس پندرہ آدمی تھے" ص۲۳

"بہت سا گھی" کا مطلب آپ نے سمجھا کیا تھا؟ سیدنا الامام الکبیر کے رفیق العلم والدین حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ ضریحہ بھی کھچڑی والی اس دعوت میں اتفاقاً شریک تھے۔ مصنف امام راوی ہیں، کہ دس پندرہ آدمیوں کے حساب سے گھی کی یہ مقدار اتنی زیادہ تھی کہ

"مولوی رشید احمد صاحب نے فرمایا اتنا گھی یہ فضول ہے، اس میں سے آدھا رکھ لیا، اور آدھا گھر بھیجدیا۔" ص۲۳

حاصل جس کا اس کے سوا اور کیا نکلتا ہے کہ پچیس تیس کھانیوالوں کے لئے گھی کی جو مقدار کافی ہوسکتی تھی، وہ دس پندرہ آدمیوں کے سامنے لاکر رکھی گئی تھی۔ جب گھی جیسی چیز کے ساتھ کماً اور مقداراً یہ رنگ تھا کہ دو گنی مقدار اس کی مہمانوں کے سامنے پیش ہوتی تھی تو اس دستر خوان پر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ دوسری عام چیزوں کی مقدار کا حال کیا ہوگا۔

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے مہمانوں ہی کے متعلق اس عام دستور کا بھی ذکر کیا ہے کہ،

"جس وقت کوئی مہمان آتا اس سے استفسار فرماتے کہ کھانا کھایا یا نہیں؟" ص۲۴

گویا یہی پہلا سوال تھا جو مہمان سے دریافت فرمایا جاتا تھا۔ اور نظم کچھ ایسا قائم فرما دیا گیا تھا کہ بقول ان ہی کے

"جس وقت کوئی آیا اسی وقت اس کے لئے کھانا آتا۔"

ظاہر ہے کہ مہمانوں سے اس کی توقع کہ ٹھیک کھانے کے اوقات ہی میں آتے ہوں گے، خصوصاً ہندوستان جیسے ملک میں مشکل ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ کھانے کے مقررہ اوقات میں بھی بغیر سابقہ اطلاع کے مہمانوں کے لئے کھانے کا فوراً بندوبست کرنا آسان نہیں، خصوصاً جب ایک دو نہیں، بلکہ

بلکہ عموماً کافی تعداد میں ان کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو، مگر کیا کیجئے بیان کرنے والوں کا بیان یہی ہے مصنف امام جیسے رفیق تک کی شہادت ہے کہ

"کبھی یاد نہیں کہ کسی وقت کوئی آگیا ہو، اور گھر میں کھانا نہ ملا ہو۔" ص۲۲

مولانا طیب صاحب نے بھی اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی یہ روایت درج کی ہے کہ

"بسا اوقات ہر وقت کھانا تیار رہتا تھا"

جس کا مطلب بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ گھر کے روزمرہ عام کھانے والوں کے سوا مہمانوں کے لئے بھی دستور تھا کہ کچھ زیادہ پکا لیا جاتا تھا، کم از کم ایسی چیزیں جن کی تیاری میں کچھ تاخیر کا امکان ہوتا ان کے ساتھ غالباً یہی صورت اختیار کی گئی تھی۔ تخمینہ کے مطابق مہمان آجاتے تب تو جو غرض تھی وہ پوری ہو جاتی، اور نہ آتے یا کم آتے، تو دوسروں کے مصرف میں آجاتا۔ اس موقعہ پر مولانا طیب صاحب نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

"مولانا کو حاجت تاکید یا تیاری طعام کے لئے فرمائش یا حکم کی نوبت نہیں آتی تھی۔"

اپنی جدہ ماجدہ سیدنا الامام الکبیر کی اہلیہ محترمہ کے اس دستور یا تدبیر کو نقل کیا ہے کہ وہی

"بطور خود مہمانوں کی تعداد و لیاقت کو دریافت فرما کر طعام لذیذ با فراط بھیجدیا کرتیں۔"

خلاصہ یہ ہے کہ کچھ تو تخمیناً ہر وقت کھانے کی مقدار ہی زیادہ عموماً تیار ہوتی تھی، اور اسی کے ساتھ بی بی صاحبہ کی طرف سے معلوم ہوتا ہے کہ باضابطہ گویا ڈاک ہی بیٹھا دی گئی تھی کہ آنے کے ساتھ ہی مہمانوں کی تعداد، اور مقام و مرتبہ سے ان کو فوراً مطلع کر دیا جائے، ادھر یہ نظم تو خبر رسانی کے متعلق تھا، اور دوسری طرف جیسا کہ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ ان کی دادی صاحبہ

"کھانا پکانے میں ایسی چابکدست کہ منٹوں میں سینکڑوں آدمیوں کے واسطے کھانا تیار کر دیں۔"

وہی لکھتے ہیں کہ فن طباخی میں غیر معمولی مہارت کا نتیجہ یہ تھا کہ

"دن کو دس بجے، رات کو بعد مغرب کھانا تیار۔"

اپنے سن تمیز میں مولانا طیب صاحب کو چونکہ دادی صاحبہ کے دیکھنے اور کمالات کے مشاہدہ کا موقعہ ملا تھا، اس لئے ان کے مذکورہ بالا بیان کو تقریباً عینی شہادت کے برابر ہی سمجھنا چاہئے، اور حق تو یہ ہے کہ خود سیدنا الامام الکبیر جیسا کہ مصنف امام نے نقل کیا ہے جب یہ فرمایا کرتے تھے کہ

"میری سخاوت احمد کی والدہ کی بدولت ہے، جو میں قصد کرتا ہوں، وہ مہمان نوازی میں اس سے بڑھ کر کرتی ہیں۔" ص۳۲

تو اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہی نہیں کہ سیدنا الامام الکبیر جو کچھ چاہتے تھے اسی کی تعمیل ہوتی تھی، بلکہ اس قسم کے واقعات مثلاً مولینا منصور علی خاں صاحب مرحوم نے آنے والے مہمانوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک مہمان کے متعلق لکھا ہے کہ

"وہ مولانا صاحب کے پاس چند روز مقیم رہے۔"

قیام کی اس مدت میں ان کی خاطر مدارات کے سلسلہ میں جو کچھ کیا جاتا تھا وہ تو خیر تھا ہی لطیفہ یہ تھا کہ ان صاحب کو شکار کی دھت تھی، حکیم منصور علی خاں صاحب کا بیان ہے کہ کبھی کبھار نہیں بلکہ

"وہ روزمرہ شکار کو جاتے، اور دو چار تیتر اور مور کسی حکمت سے پکڑ لاتے، اور ہم سب ہر روز ان کا گوشت کھاتے، نہایت مزیدار ہوتا تھا۔"

اس میں شک نہیں کہ ان کے اس طرز عمل سے سالن کی ایک اچھی قسم کا اضافہ دسترخوان پر ہو جاتا تھا، لیکن بقول شخصے

دردسر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید   اس کا گھسنا اور لگانا دردسر یہ بھی تو ہے

ذرا سوچئے تو سہی روز کی اس کھٹ کھٹ کو، بے چاری عورتیں ہی جانتی ہیں کہ اس قسم کے خصوصی پکوان کی وجہ سے ان پر کتنا غیر معمولی بار پڑ جاتا ہے۔ حکیم صاحب نے اس کی اطلاع دیتے ہوئے کہ مسلسل ان گرم مزاج پرندوں کے گوشت کے کھانے کی وجہ سے بیمار پڑ گئے۔

"ایک مہینہ کے بعد مجھ کو خون کا پیشاب چند سوراخوں سے آنے لگا۔" ص۱۸۹

گویا کم از کم ایک ماہ تک "روزمرہ شکار لانے اور ان کے پکانے کا" قصہ ضرور جاری رہا، میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت والا ہی کی چاہ پوری نہیں کی جاتی تھی بلکہ ان کے چاہنے والوں کی فرمائش کی تکمیل بھی بی بی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کو کرنی پڑتی تھی، آخر حکیم صاحب ہی کو دیکھئے۔ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے۔ جب حضرت والا کا قیام اپنے وطن نانوتہ میں تھا، جب وہ بیمار پڑے ہوں گے تو ان کی دوا دار و پرہیز کے انتظام کی مسافرت کی اس حالت میں خود ہی سوچئے۔ اس کے سوا صورت ہی کیا تھی کہ حضرت ہی کے گھر سے سب کچھ بھیجا جائے۔

بہر حال جود و کرم، اکرام ضیف کے مسئلہ میں نقطۂ نظر کا غیر معمولی اتحاد جس کا تماشا سیدنا الامام الکبیر اور ان کی اہلیہ محترمہ کے درمیان ہم کر رہے ہیں، بجائے خود نادر الوجود ہے، وفاق و طباق کی اتنی یکسانی زن و شو کے درمیان کمیاب اور بہت زیادہ کمیاب ہے، ہمارے مصنف امام کا احساس بھی یہی تھا بی بی صاحبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"وہ اللہ کی بندی خدا سلامت رکھے، ایسی سخی اور دست کشادہ ہے، کہ جناب مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی مہانداری کو اسی کے باعث رونق تھی۔" ص۳۲

اور کوئی شبہ نہیں کہ روزمرہ کا تجربہ بقول مولانا طیب صاحب عموماً یہ ہے کہ

"بڑے بڑے امیروں کے کارخانوں میں دیکھا جاتا ہے جہاں بہت سے باورچی خدمتگار سب سامان نقد و جنس موجود، مگر دس مہانوں کی بھی دعوت ہوتی ہے تو دن کو دوپہر، اور رات کو پچھلا پہر ہو جاتا ہے۔"

مگر آپ سن چکے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے مہانوں کے آگے صبح کو دس بجے اور شام کو بعد مغرب مولانا طیب صاحب کے الفاظ میں۔

"کھانے کے خوان کے خوان لدے ہوئے چلے آتے ہیں، یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا من و سلویٰ آسانی سے پکا پکایا چلا آرہا ہے۔"

اور بقول ان ہی کے

"یہاں نہ سامان، نہ خدمتگار، نہ باورچی"

زیادہ سے زیادہ یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ محلہ ٹولے کی بڑی بوڑھیاں جیساکہ شرفاء کے گھرانوں میں دستور تھا ان کو کچھ مدد مل جاتی ہو، مولنا طیب صاحب نے اپنی ایک یادداشت میں پیرو نامی خادمہ کا ذکر بھی کیا ہے، جسے ان کی دادی صاحبہ نے مسلمان کیا تھا اور سن تمیز تک پہنچنے کے بعد ممکن ہے کہ صاحبزادیوں کی وجہ سے بھی بیوی صاحبہ کا کچھ بار ہلکا ہوا ہو، کیونکہ عام دستور اس زمانہ میں شرفا کے گھرانوں کا یہی تھا کہ سسرال جانے سے پہلے بچیوں کو میکے ہی میں کام کاج کا عادی بنالیا جاتا تھا خود حضرت والا کی اہلیہ محترمہ بھی اس کی ایک بہترین مثال ہیں، کہ قصبہ دیوبند کے ممتاز رئیس کی حالانکہ صاحبزادی تھیں، نازو نعمت میں پلی تھیں، لیکن سیدنا الامام الکبیر کے گھر پہنچ کر جس بار کو انہوں نے اٹھالیا، غیر تربیت یافتہ ہونے کی صورت میں کیا یہ ممکن تھا۔؟

کچھ بھی ہو، باوجود ان تمام باتوں کے اصل سوال وہی رہ جاتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی مذکورہ بالا محدود آمدنی یعنی نانوتہ کی آراضی کی پیداوار کے ساتھ دس یا پانچ روپے جو تصحیح کے معاوضہ میں مطابع سے آپ کو مل جاتے تھے، محض اس معمولی آمدنی سے مہمان نوازی اور اکرام ضیف کا یہ غیر معمولی بلند و برتر معیار اور وہ بھی مہینے دو مہینے نہیں سال دو سال نہیں، زندگی کے آخری دنوں تک کیسے قائم رہا، عرض کرچکا ہوں کہ مدرسہ سے اول تو آپ کا تعلق بالکل عمر کی آخری منزل میں قائم ہوا، اور تعلق کے بعد بھی آپ سن چکے کہ مدرسہ کی دوات کی سیاہی کے ایک قطرے سے بھی استفادہ کے آپ روادار نہ تھے۔ یہ شاعرانہ مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے، لے دے کر احتمال کچھ اگر رہ جاتا ہے، تو اسی دستور کا جس سے سلفاً عن خلف علماء و صوفیہ مستفید ہوتے ہوئے چلے آئے ہیں[1]

[1] حضرت ابراہیم ادھم رح کے تذکرہ میں حافظ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ بزرگوں کا طریقہ اس باب میں مختلف رہا ہے بعض تو ان میں ایسے تھے جو نہ سلطان ہی سے لیتے تھے اور نہ اخوان سے سلطان سے مراد حکومت اور اخوان سے مراد مسلمانوں کا وہ عام طبقہ ہے جو بزرگوں سے عقیدت رکھتا تھا۔ بہرحال کچھ لوگ تو ایسے تھے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کی ایک اچھی مثال ہیں میں نے ان کی سیاسی زندگی میں اس کی پوری تفصیل بیان کی ہے، اسی طرح حافظ ابن عساکر ہی کے بیان کے مطابق بزرگوں ہی میں ایسی ہستیاں بھی گذری ہیں جو سلطان و اخوان دونوں کی مالی امدادوں کو (باقی ص۵۷۷ پر)

ہندوستان میں جس کی تعبیر نذر و فتوحات وغیرہ کے الفاظ سے کی جاتی ہے، حکومت تو ختم ہو چکی تھی، اسلئے صرف "اخوان" والی مدباقی رہ گئی تھی، اس سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر کا جو مذاق تھا، اس کا اندازہ ان مختلف واقعات و روایات سے ہو سکتا ہے جن کا کچھ حصہ مختلف مواقع پر زیر تذکرہ آچکا ہے۔

(بقیہ ص۵۷۶) قبول فرمایا کرتے تھے، اور ان ہی میں کچھ ایسے بھی تھے جو سلطان سے تو لے لیا کرتے لیکن اخوان سے لینا پسند نہیں کرتے تھے بعض اس کے برعکس اخوان سے لے لیتے تھے، لیکن حکومت یعنی سلطان کے زیر بار احسان بننے کو مصلحت کے خلاف خیال کرتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ دینی اور ملی کاموں کی مشغولیت کی وجہ سے معاشی کاروبار کا موقعہ جن لوگوں کے لئے باقی نہیں رہتا۔ یا جس پیمانے پر دین و ملت کی خدمت وہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں معاشی جدو جہد میں شریک ہونے کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوتی تھی تو ان لوگوں کے لئے حکومت کے بیت المال سے بھی بقدر ضرورت استفادہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اور عام مسلمانوں کی پیش کش کے قبول کرنے کا نمونہ بھی موجود تھا۔ پہلی بات یعنی بیت المال سے استفادہ وہ تو ظاہر ہی ہے، خلفاء راشدینؓ ہی کا نمونہ اس باب میں موجود تھا۔ خلیفہ منتخب ہو جانے کے بعد بھی حضرت ابوبکرؓ کو لوگوں نے دیکھا کہ کپڑے کی گانٹھ پیٹھ پر لئے بازار جا رہے ہیں لوگوں نے کہا یہ کیا تو بولے کہ ابوبکر کے بال بچوں کے لئے آخر کچھ کرنا چاہئے۔ تب صحابہؓ نے جمع ہو کر فیصلہ کیا کہ تجارت کے ساتھ خلافت کا کام صحیح طور پر انجام پانا ناممکن ہے اور بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا گیا "مسلمانوں کی خدمت کو اپنا حرفہ یعنی پیشہ میں نے بنا لیا" یہی حضرت ابوبکر نے اس فیصلہ کے بعد فرمایا یہی رسم بعد کو جاری رہی، فتوحات و غنائم کے بعد خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ کے اہل و عیال کی ضرورتیں گو بابیت المال ہی سے پوری ہوتی تھیں، اور فتوحات سے پہلے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف فرما ہونے کے بعد علاوہ اس کے جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے "کان الرجل یجعل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم النخلات یعنی لوگوں نے اپنے اپنے نخلستانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے درخت خاص کر دیئے تھے جنہیں قریظہ اور بنی نضیر کے فتوحات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالکوں کو واپس کر دیا تھا تفصیل کیلئے دیکھو بخاری کے ابواب مغازی سببہ خمس وغیرہ ان نخلات کے سوا جو مسلمانوں کی طرف سے پیش کئے گئے تھے وقتاً فوقتاً انصار کے خوش حال گھرانوں سے بھی پکا پکایا کھانا ہدیۃً آتا رہتا تھا سعد بن عبادہ کے جفنات (کونڈے) جن میں ثرید اور گوشت وغیرہ ہوتے ازواج مطہرات کے گھروں میں ان کی گردش مشہور ہی ہے دعوتیں بھی ہوتی رہتی تھیں ان ہی سعد بن عبادہ خزرج کے سردار کا دلچسپ قصہ ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت صلعم جب ان کے گھر پہنچے تو غسل کا انتظام کیا گیا اور ایک نئی زرد چادرہ راوی کا بیان ہے کہ زعفران میں رنگی ہوئی تھی غسل کے بعد پیش کی گئی پھر کھانا چنا گیا دعوت سے فارغ ہونے کے بعد ایک عربی گدھا کسا کسایا پیش ہوا جس پر جھالردار زین پوش پڑی ہوئی تھی سعد نے عرض کیا کہ اسی پر واپسی ہو آپ نے مان لیا مفصل ابوداؤد میں پڑھئے اسی طرح باغوں میں آنحضرت صلعم کا فصل کے زمانہ میں جانا وہاں پھل بھنے ہوئے کباب وغیرہ سے دعوت آپ کا باغ کے جھونپڑوں میں آرام فرمانا یہ اور اس قسم کی روایتوں کا ذخیرہ کتابوں میں موجود ہے جن سے بزرگوں کے اس طرز عمل کی تائید ہوتی ہے جو اخوان کے متعلق ہر زمانہ میں اختیار کرتے رہے ہیں۔ ۱۲

اس زمانہ میں شمالی ہند کے فیاض امیروں میں چھتاری کے رئیس نواب محمود علی خاں صاحب طاب ثراہ کا نام خاص طور پر اونچا تھا۔ علم و دین کی خدمت کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے، مگر ایک طرف یہ حال تھا کہ ان ہی نواب محمود علی خاں تک پہنچنے کے لئے سرسید مرحوم تڑپتے رہتے تھے، کالج کی رپورٹ ۱۸۸۳ء میں یہ لکھتے ہوئے کہ

"نواح کے بڑے رئیس نواب محمود علی خاں جن سے ہم کو بہت ہی مدد کی توقع تھی"۔

اور اس توقع کی تکمیل میں جو رکاوٹیں حائل تھیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بڑی حسرت کے ساتھ لکھتے ہیں،

"یہ (یعنی نواب محمود علی تک رسائی) بڑی مشکل ہے، اور اس پر غالب آنے کی امید کم ہے"۔ (ماہ نو کراچی مارچ ۱۹۵۱ء مضمون مولوی امین زبیری صاحب)

لیکن دوسری طرف سیدنا الامام الکبیر تھے کہ ساری عمر نواب ممدوح کی حضرت والا کی قدم بوسی کے لئے تڑپتے ہی گذری، امیر شاہ خان مرحوم کے حوالہ سے یہ بات گذر چکی کہ بار بار اپنی اسی آرزو کو لے کر کبھی علیگڈھ کبھی میرٹھ بار بار پہنچے، لیکن ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ ادھر نواب صاحب پہنچے، اور ادھر سیدنا الامام الکبیر غائب ہو گئے اور ساری عمر ان کے سامنے نہ آئے صرف زبانی یہ پیغام پہنچانے کے لئے کہدیا کہ غازی آباد کے اسٹیشن پر مسجد اگر نواب صاحب بنادیں گے، تو ان کی پالکی کا پایہ پکڑ کر چلوں گا[۱] (ارواح ثلاثہ ص۱۵۱) میرٹھ ہی کے رئیس التجار، امیر و کبیر شیخ عبدالکریم رئیس لال کرتی والے کا قصہ یاد ہو گا جنہوں نے حضرت والا کی جوتیوں میں روپے ڈالدیئے، مگر جوتیوں کو جھاڑ کر کھڑے ہو گئے ہنس کر فرمانے لگے،

---

[۱] امیر شاہ خاں مرحوم بیان کرتے تھے کہ پیغام کو سن کر نواب مرحوم نے کہلا بھیجا کہ "میں کوشش کر چکا ہوں مگر منظوری نہیں ہوئی"، واللہ اعلم بالصواب غازی آباد کے اسٹیشن کا خاص قصہ کیا تھا جو تعمیر مسجد کی منظوری حکومت سے نہیں مل رہی تھی، امیر شاہ خان یہ بھی کہتے تھے کہ پالکی کے پایہ پکڑ کر چلنے کی بات سن کر نواب صاحب ہنسنے لگے، دراصل دونوں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور پیر بھائی تھے۔ دونوں میں کوئی خاص معاملہ تھا جس کی کرانا کاتبین را ہم خبر نیست + واللہ اعلم بحال عبادہ الذین اصطفاہم، واحشلہم لذی الدار ۱۲

"فرق کو دیکھو! کہ دنیا ہمارے قدموں پر گرتی ہے، اور دنیادار اس کے قدموں پر گرتے ہیں" (ارواح ثلثہ ص۲۳۰)

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی بھولنا نہ چاہئے کہ ؎

ساقی دیرینہ را ساغر شکست
بزم رندان حجازی بر شکست

کے حادثے کے بعد ڈاکٹر اقبال مرحوم ہی کے الفاظ میں یہ دیکھا جارہا تھا کہ

می شود ہر مو درازے خرقہ پوش   آہ ازیں سوداگران دین فروش
با مریداں روز و شب اندر سفر   از ضرورتہائے ملت بے خبر

اس دردناک منظر نے شاید سیدنا الامام الکبیر کو اس فیصلہ پر مجبور کیا تھا، مولانا طیب صاحب کا بیان ہے، کہ اسلامی ہند کا

"کوئی گاؤں کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں کے باشندے آپ کی تشریف آوری کے آرزومند نہ ہوں، ہمیشہ آپ کے پاس درخواستیں دور دراز سے آتی رہتی تھیں کہ حضور یہاں آئیں۔"

لیکن وہ اطلاع دیتے ہیں کہ باوجود اس کے

"بہت جگہ کے لوگوں کی تمنائیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں، اور مولنا مرحوم کا جانا نہ ہوا۔"

اسی سلسلہ میں آگے وہی آپ کے اس عمومی دستور کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ

"مولانا مرحوم کو بلاضرورت پھرنا پسند بھی نہ تھا۔"

غالباً اسی رجحان اور فیصلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ یو، پی، اور یو، پی میں بھی خصوصیت کے ساتھ روہیلکھنڈ کے خاص خاص مقامات جو وطن مالوف کے گرد و نواح میں ہیں ان کے سوا سیدنا الامام الکبیر کی سیر و سفر کا دائرہ بہت زیادہ مختصر اور تنگ ہے، الا یہ کہ حج کے سفر میں جن جن مقامات سے گذرنا پڑا علاوہ اس کے امیر شاہ خاں مرحوم کا یہ بیان بھی ہے کہ

"مولانا نانوتوی کا قاعدہ تھا کہ سفر میں ہدیہ نہ لیتے تھے"

کیوں نہ لیتے تھے، واللہ اعلم بالصواب اس کے صحیح اسباب کیا تھے، ایک بات ان ہی کی طرف منسوب کر کے خاں صاحب ہی روایت کیا کرتے تھے، کہتے تھے کہ سفر میں کسی صاحب نے کچھ پیش کیا، تو انکار کرتے ہوئے حضرت والا نے فرمایا کہ

"میرا معمول ہے ہیں سفر میں ہدیہ نہیں لیتا ہوں، اور مصلحت یہ ہے کہ کبھی آدمی کے پاس ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا ہے، سفر میں اپنے دوستوں سے ملاقات ضرور ہوتی ہے اب اگر کسی نے پہلے سفر میں کچھ دیا تھا، اور اس سفر میں اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، تو وہ یا ملنے سے کترائے گا، اور اگر ملے گا بھی تو جھینپ اور شرمندگی کے ساتھ ملے گا" ص۱۷۵

قصہ مختصر یہ ہے، کہ فتوحات کی آمدنی کی توسیع کا بڑا ذریعہ سفر ہے، پہلے تو اسی کا دائرہ محدود کر دیا گیا تھا، اور خاص خاص اہم ضرورتوں کے لئے سفر اگر فرماتے بھی تھے، تو اس میں بھی اس آمدنی کی راہ آپ نے خود بند رکھی تھی، اب رہ گیا حضر، سو اس کے متعلق بھی اس کلی ضابطہ کو براہ راست حضرت والا ہی کی طرف منسوب کر کے امیر شاہ مرحوم بیان کیا کرتے تھے، کہ سیدنا امام الکبیر فرماتے تھے،

"جو شخص ہم کو محتاج سمجھ کر دیتا ہے، اس کا ہدیہ تو لینے کو جی نہیں چاہتا، اور جو اس غرض سے دیتا ہے کہ ہمارے (یعنی دینے والے) کے گھر برکت ہو، اور ہمارے لے لینے کو ہمارا احسان سمجھے اس کا ہدیہ لے لینے کو جی چاہتا ہے، اگرچہ وہ چار پیسے ہی ہوں" ص۹

اور اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کیا دے رہا ہے، اس پر نظر نہ رہتی تھی، بلکہ کون دے رہا ہے اور کس جذبہ کے تحت دے رہا ہے۔ صرف اسی کو دیکھا جاتا تھا۔ جو نڈے باندھ کر برستے ہوئے پانی میں اللہ دیا نور باف کے گھر پہنچ کر ماش کی دال کی روٹی جو کھا سکتا ہو، وہ چار پیسوں کے دینے والے غریب مسلمانوں کے دلوں کو توڑنے کی ظاہر ہے کہ اپنے قلب میں قوت ہی کہاں پا سکتا تھا۔

لوگوں کو بزرگوں کے نقطہ نظر کا صحیح علم نہیں ہے ورنہ غلط مثالوں کو دیکھ کر صحیح حقائق کے متعلق اشتباہ اور مغالطوں کے شکار وہ نہ ہوتے۔ خیال آگیا حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا، ان کے مشہور خلیفہ دفین اورنگ آباد دکن جو نظام الدین ثانی کے نام سے مشہور ہیں، لکھا ہے کہ ابتدا میں لوگوں کی پیش کشوں کو قبول نہیں فرماتے تھے، ان کے پیر کلیم اللہ جہاں آبادی تک یہ خبر پہنچی، آپ نے ان کو یہ خط لکھا جس میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

مسموع شد کہ از یاران و مخلصان ہر کہ از قسم نذر برائے شما می آرد قبول نمی کنند، اگرچہ از مستحسن ست،	سننے میں آیا ہے کہ دوستوں اور مخلصوں کی طرف سے بطور نذر جو کچھ پیش آتا ہے، اس کو قبول نہیں کرتے ہے، تو یہ بات بہت اچھی۔

مگر اسی کے ساتھ توجہ دلائی گئی،

اما دل شکستگی محبان درین ست	لیکن دوستوں کی دل شکنی واپس کرنیکی وجہ سے ہوتی ہے

نقطہ نظر کی تصحیح کے بعد پیر نے مرید کو حکم دیا کہ

ہر کہ باخلاص چیزے بیارد بحکم لارد ولاکد البتہ قبول نمایند	اخلاص کے ساتھ جو لاکر حاضر کرے تو "لارد و لاکد" کے اصول کے تحت چاہئے کہ اسکو قبول کرلیا جائے۔

پھر یہ فرماتے ہوئے کہ چاہے لوگوں میں تقسیم ہی کر دو، مگر رد کرنا مناسب نہیں ہے، آخری الفاظ حضرت جہان آبادی کے یہ تھے

"درگرفتن الفت ست، وناگرفتن وحشت ودلبری مخلصان صادق از ہمہ طریق فائق"۔

مثلا کتاب تکملہ سیر الاولیاء

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے سیدنا الامام الکبیر کی دوسری عام عادتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنا یہ مشاہدہ جو قلم بند کیا ہے، کہ

"آپ کا مخلص کوئی ادنی شئے بھی پیش کرتا تو نہایت خوش ہو کر اس کو قبول فرماتے اور اس کے حق میں دعا دیتے"۔ ص۲۵

اور اسی کے ساتھ اس کی خبر دیتے ہوئے کہ امراء کے مقابلہ میں ہدیے اور تحفے

"غریبوں کا جو باخلاص پیش کرنا' برغبت قبول فرماتے"۔

اور اسی طرز عمل کا ذکر دعوتوں کے متعلق بھی ان الفاظ میں کیا ہے' کہ

"دعوت سب کی قبول فرماتے' خصوصاً غربا کی کمال خوشی سے"۔ صـ۳

اور یہ کہ دعوت کے کھانے کے متعلق عام دستور یہ بھی تھا کہ

"کھانے کی آب و نمک کی تعریف فرماتے"۔

اور ان ہی کی روایت کے مطابق ماش ہی کی روٹی اور ماش ہی کی دال والی دعوت اللہ دیا نوربا‌ف کی جس نے رغبت سے کھائی ہو

جیسے کوئی پلاؤ قورمہ کو کھاتا ہے"۔ صـ۲۶

ان سارے قصوں کی تہ میں سچ پوچھئے تو وہی "دل شکستگی محبان" والا راز پوشیدہ تھا "قلوب منکسرہ یعنی ٹوٹے ہوئے دلوں میں اپنا پتہ جس نے دیا ہے' اس کے ڈھونڈنے والے اگر غریبوں کے شکستہ قلوب میں اسے ڈھونڈھ رہے تھے تو آپ ہی بتائیے کہ اسے کہاں ڈھونڈھتے امیر شاہ صاحب مرحوم نے تو قول نقل کیا ہے کہ "اخلاص سے دینے والے چار پیسے بھی دے رہے ہوں تو ان کے لینے کو جی چاہتا ہے"۔ لیکن حضرت تھانوی کی طرف منسوب کر کے قصص الاکابر کے جامع نے یہ روایت درج کی ہے کہ کوئی صاحب عبداللہ شاہ نامی تھے۔ کل چھ پیسے بے چاروں کی یومیہ آمدنی تھی' جنگل سے گھاس کھود کر بازار لاتے اور چھ پیسے جو دے دیتا' اسی کے ہاتھ بیچ دیا کرتے ان میں سے دو پیسے تو در خیرات کر دیا' اور چار بال بچوں پر خرچ کرتے' ایک دن ان ہی چھ پیسے کمانے والے صاحب نے سیدنا الامام الکبیر اور ان کے ساتھ اور بھی چند بزرگوں کو جن میں مولانا محمد یعقوب ہمارے مصنف امام بھی شریک تھے' مدعو کیا۔ دعوت منظور کر لی گئی۔ منظوری کے بعد عبداللہ شاہ نے کہا کہ پکا کر آپ لوگوں کو کھانا کھلاؤں' یہ بات میرے بس کی نہیں' ہاں پیسے لیجئے اور میٹھے چاول پکا کر میری طرف سے کھا لیجئے۔ مولانا تھانوی فرماتے تھے کہ پیسے لے لئے گئے'

مولانا محمد یعقوب صاحب کی نگرانی میں کھانا تیار ہوا،

"سب نے مل کر دو دو لقمے کھائے" ص۱ الہادی ماہ شعبان

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خیرات والے دو پیسے بجائے خیرات کرنے کے عبداللہ شاہ مرحوم نے

ل۵ اس جملہ میں کچھ تسامح ہوا ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے تواتر کے ساتھ یہ واقعہ اس طرح سے سنا ہے کہ یہ عبداللہ شاہ صاحب (دیوبندی جو اولیاء کاملین میں سے تھے) گھاس کھود کر بیچتے اور اپنی معاش اسی طرح پیدا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ ایک گٹھری گھاس کی معمولاً چھ پیسے میں فروخت کیا کرتے تھے شہر والے جو گھانس خریدنے جاتے وہ شاہ جی کی گٹھری کے منتظر رہتے۔ جوں ہی شاہ جی گٹھری لئے ہوئے آتے دکھائی دیتے وہیں ہی تمام خریدار ان کی طرف دوڑ پڑتے اور گٹھری خریدنے میں ہر ایک پہل کرنے کی کوشش کرتا۔ شاہ جی کا معمول یہ تھا کہ چھ پیسے قیمت لیکر دو پیسے تو اسی وقت صدقہ کر دیتے اور دو پیسے روز ان کے گھر کا خرچ تھا جس کا نمک تیل وغیرہ لے لیتے اور دو پیسے روز جمع کرتے تھے۔ سال بھر میں ان جمع شدہ پیسوں سے ہمارے ان اکابر حضرت نانوتوی حضرت گنگوہی مولانا محمد یعقوب صاحب وغیرہ حضرات کی دعوت کیا کرتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کا بیان ہے کہ ہم سال بھر تک اس دعوت کے منتظر رہا کرتے تھے اور جس دن یہ کھانا کھاتے تھے تو چالیس چالیس دن تک قلب میں نور محسوس ہوتا تھا اور راتوں عبادت و طاعت کرنے کو جی چاہتا تھا مصنف سلمہٗ نے متن میں جو واقعہ نقل فرمایا ہے وہ صرف ایک جزئیہ ہے کہ شاہ جی نے فرمایا کہ پکانے کا بندوبست آج میرے یہاں نہیں ہے آپ خود پکا کر کھالیں۔ اس جزئیہ میں اتنا اضافہ اپنے بزرگوں سے اور سنا ہے کہ اس پکانے اور کھلانے کا ذمہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے لیا اور اتنا اہتمام فرمایا کہ اس کھانا پکانے کے لئے غسل کیا جگہ پکانے کی صاف ستھری بنائی اور طہارت و نظافت کا غیر معمولی اہتمام کر کے کھانا پکایا اور ان بزرگوں نے ایک ایک دو دو لقمہ بڑی عقیدت سے تناول فرمائے۔ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس میں وہ خیرات کے پیسے شامل نہیں تھے، جن کا ذکر قیاسی طور پر متن میں کیا گیا ہے۔

یہ عبداللہ شاہ اولیاء کاملین میں سے تھے۔ ان کے بارے میں جناب مولانا اشتیاق احمد صاحب صدر شعبۂ کتابت دارالعلوم دیوبند نے بیان فرمایا کہ انہوں نے اپنے والد صاحب (شیخ ظفر احمد صاحب) سے سنا جو ان بزرگوں کے یہاں ہر وقت کے حاضر باش تھے کہ جب مدرسہ دیوبند قائم ہوا تو دیوبند کے تحصیلدار نے گورنمنٹ میں رپورٹ کی کہ یہ مدرسہ جہاد کی تعلیم کے لئے (اور بالفاظ دیگر گورنمنٹ کے خلاف بغاوت پھیلانے کے لئے) قائم ہوا ہے۔ یہ خبریں سنکر مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ نے عبداللہ شاہ صاحب کو بلایا اور فرمایا کہ ایسی خبریں ہیں اس کا خیال رکھئے۔ شاہ جی اس فہمائش کے بعد کچھ عرصے غائب رہے اور کچھ عرصہ کے بعد آکر ان حضرات سے ملے اور بہت ہنستے ہوئے ملے۔ غیر معمولی ہنسی اور فرحت کے لہجہ میں فرمایا خوب پڑھاؤ خوب پڑھاؤ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طے کر لیا ہے یہ مدرسہ تو ہمیشہ رہیگا۔ ان خبروں کی کوئی پرواہ نہ کرو (باقی ص۵۸۳ پر)

پیش کر دیئے ہوں گے' اسی لئے دو دو لقموں سے زیادہ کی گنجائش پیدا نہ ہوئی[۵] ۔

بہرحال کہنا یہ ہے کہ نانوتہ کی زمینداری اور تصحیح کی آمدنی کے سوا' اخوان یعنی اہل عقیدت کی طرف سے جو کچھ پیش ہوتا تھا' مذکورہ بالا قیود اور خصوصیتوں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر رد نہیں فرماتے تھے' میرے پاس کوئی مفصل فہرست یا اس سلسلہ میں جو آمدنی ہوتی تھی اس کا باضابطہ ہی کھاتہ تو نہیں ہے' لیکن چار پیسے' بلکہ اگر عبداللہ شاہ والی روایت کے متعلق میرا خیال غلط نہیں ہے تو چند پیسے تک بھی گویا لے لئے جاتے تھے' کسی موقعہ پر ذکر کر چکا ہوں کہ ایک غریب آدمی مجلس مبارک میں صرف شکر کی پڑیہ لیکر حاضر ہوا' اور اسے بھی قبول کر کے حسب دستور حاضرین میں تقسیم فرمانے کا حکم دیا گیا' اسی موقعہ پر بیعت کا لطیفہ بھی پیش آیا تھا' یاد ہوگا کہ شکر لانے والے کی

(بقیہ ص۵۸۳) اور مطمئن ہو کر پڑھاؤ۔ یہ بزرگ درحقیقت صاحب خدمت تھے اس لئے اس قسم کے انتظامی معاملات میں یہ اکابر بھی ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اکابر اولیائے پیسکا جو براہ راست دربار رسالت میں حاضر باشی اور معاملات رجوع کرنے کی سعادت سے بہرہ ور ہوں) اس درجہ پاک اور حلال وطیب ہونا کچھ زیادہ عجیب نہیں کہ دوسرے اولیاء اس کے سال بھر تک آرزومند رہتے ہوں۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اکابر جو مخلصین کی دعوت بشوق ورغبت قبول کرتے تھے' اس کا راز یہی ہوتا تھا کہ ان مخلصین کے پیسہ میں اکل حلال ہونے کی نورانیت رچی ہوئی ہوتی تھی۔ ان اکابر کی یہ آرزو بعینہ اس سنت صحابہ کے عین مطابق ہے کہ ایک بوڑھی صحابیہ چقندر وغیرہ پکایا کرتی تھیں اور ہر ہفتہ بعد نماز جمعہ حضرات صحابہ کو بلا کر کھلایا کرتی تھیں۔ ہفتہ بھر تک ان حضرات صحابہ کو اس کھانے کا انتظار رہتا تھا اور جمعہ پڑھتے ہی یہ سب مقدسین ان ضعیفہ کے یہاں پہنچ جاتے اور انتہائی آرزو اور شوق کے ساتھ ان کے یہاں کا کھانا تناول فرماتے۔ بعینہ اسی طرح یہ اکابر و اسلاف دیوبند بھی چونکہ خلوت وجلوت میں نمونۂ صحابہ تھے۔ بلکہ ان کی فطرتیں اور طبیعتیں ہی ان سلف صالحین کی رفتار کی تبع ہو چکی تھیں۔ اس اکل حلال کے سال بھر شائق اور منتظر رہا کرتے تھے۔ فرحمہم اللہ ورضی عنہم ورضوا عنہ محمد طیب غفرلہ

[۵] انا عند المنکسرۃ قلوبہم (یعنی میں ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس رہتا ہوں) بطور حدیث قدسی کے صوفیہ میں یہ روایت جو مشہور ہے اس کا تجربہ اس موقعہ پر بھی ہوا' حضرت تھانوی سے مولانا محمد یعقوب صاحب بیان کرتے تھے کہ عبداللہ شاہ کے پیسوں سے پکے ہوئے چاول جیسے ہی حلق سے اترے ایک روحانی لذت اور نور محسوس ہوا' اور لطف یہ کہ اس کا اثر مدت تک رہا" الہادی ماہ شعبان ۵۰ھ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اسی قدسی حدیث کے حاصل کو اپنے مشہور شعر میں نظم کر دیا ہے ؎

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے' ترا آئینہ ہے وہ آئینہ جو شکستہ ہو' تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں ۱۲

بیعت سے جب انکار فرمایا گیا تو اصرار کرنے لگا کہ بکری شکر واپس کر دی جائے، اس دلچسپ تدبیر سے اپنے مقصد میں وہ کامیاب بھی ہو گیا تھا، مولانا حکیم منصور علی خاں کے حوالہ سے فتوحات ہی کے سلسلہ میں یہ روایت گذر چکی کہ لانیوالے نے سات روپے لاکر حاضر کئے، قربانی کی گائے اسی سے خریدی گئی، حضرت والا کے چند علمی مکاتیب فیوض قاسمیہ کے نام سے جو شائع ہوئے ہیں، ان میں ایک خط جو مولوی دائم علی صاحب کے نام لکھا گیا ہے (نگینہ کے ایک بڑے عالم تھے) اسی خط کی ابتدار میں ایک فقرہ یہ بھی ہے، کہ

"شاید آں رفتہ ام کہ باطلاع رسیدن دو اشرفی وچغہ رقم زدہ بمولوی عبدالرب صاحب سپردہ بودم نرسید" صنہ ۳ فیوض قاسمیہ

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیسوں کے علاوہ اگر اشرفیاں بھی پیش کی گئی ہیں تو ان کو بھی آپ نے قبول فرمالیا، اشرفیوں کے ساتھ "چغہ" کا ذکر بھی فرمایا گیا ہے، یہ اور ان کے سوا دوسری روایتوں سے بھی جن میں سے بعضوں کا ذکر کر چکا ہوں، ان سے بھی پتہ چلتا ہے، کہ علاوہ نقد کے استعمالی اور برتنے کی چیزیں بھی خدمت والا میں پیش ہوتی رہتی تھیں، گاڑھے کا تھان گوٹ لگی ہوئی ٹوپی یا معمولی ٹوپیاں، مختلف حکایات کے سلسلہ میں ان کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ بلکہ مولانا طیب صاحب کے اس بیان سے جس میں ہے کہ حضرت والا کی اہلیہ محترمہ کے نام سے پیش کرنے والے نے ریشمین چادر اور طلائی زیور پیش کئے تھے، اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ گاڑھے کے علاوہ قیمتی لباس بھی لانے والے لاتے تھے، یہی "چغہ" جس کا اس خط میں ذکر ہے چاہئے تو یہی کہ معمولی نہ ہو، آخر نقد میں بجائے روپے کے جب اشرفی پیش کی گئی، تو "چغہ" بھی اشرفیوں ہی کے مطابق ہوگا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اکثر کھانے پینے پہننے برتنے کی چیزیں عمدہ عمدہ آپ کے پاس ہدیہ میں آتیں" صنہ ۲۶

اور فتوحات ہی کے سلسلہ میں مصنف امام کا یہ بیان ہے کہ

"اللہ جل شانہ نے بہت کچھ عنایت فرمایا"۔ ص۳۲

ان سے بھی مراد یہی ہے۔

لیکن یہ سب کچھ جو "تقوی کی زندگی" "لا یحتسبی" رنگ میں آپ کے سامنے پیش کرنی تھی، اس کا مصرف کیا تھا؟ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی کا جواب یہ دیا ہے، کہ

"جو کچھ بلا طلب آپ کے پاس آتا تھا، وہ وقف تھا، جس کا جی چاہے کھاؤ پیو"

وہی یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ

"فوراً اپنے شاگردوں اور مریدوں کو تقسیم کر دیتے، کبھی اپنے ہاتھ سے تقسیم فرماتے، کبھی یہ بھی فرماتے کہ جو چیز کسی کے پسند آئے لے لو"۔ ص۲۴

بظاہر اس دستور کا تعلق غیر نقدی تحائف و ہدایا سے معلوم ہوتا ہے، مولانا منصور علی خاں صاحب نے لینے کے متعلق حضرت والا کی عام عادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"کوئی شخص ادنیٰ شے بھی پیش کرتا اس کو بڑی خوشی سے لے کر خود بھی کھاتے، اور دوسرے حاضرین کو بھی کھلاتے"۔ ص۱۹۱ مذہب منصور

باقی نقدی پیش کش، سو ہمارے مصنف امام نے حضرت والا کی اہلیہ محترمہ کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ ارقام فرمایا ہے، کہ

"جو کچھ فتوح ہوتے، ان کے (یعنی بیوی صاحبہ) کے حوالہ کر دیتے"۔ ص۳۲

درحقیقت مصنف امام کی اسی اطلاع میں اس سوال کا جواب پوشیدہ ہے، جس کے لئے یہ بحث اٹھائی گئی تھی، یعنی باوجود محدود آمدنی کے اتنے بلند معیار پر اکرام ضیف کا سلسلہ آخر عمر تک جو قائم اور جاری رہا، ظاہری اسباب کے اعتبار سے اس میں دخل فتوح کی اسی آمدنی کا سمجھنا چاہئے کہ تھا، گویا سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے تو یہ التزام تھا کہ نقد جو کچھ آتا تھا، وہ بیوی صاحبہ کے حوالہ کر دیا جاتا تھا، اور جب کہ آپ دیکھ چکے پوری دیانتداری کے ساتھ حضرت والا کے حوصلہ کے مطابق ان کی مہمانوں کی مہمانداری میں جو کچھ ملتا تھا بیوی صاحبہ سب کو لگا دیتی تھیں

میر) مصنف امام کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ مہمان نوازیوں کے اس قصے میں بے چاری بی بی صاحبہ کو ابتداء میں کافی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ زیوروں کے بیچنے کی نوبت بھی آ گئی۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ جہاں اس قسم کا لنگرخانہ جاری ہو وہاں یہ دشواریاں ابتدائی زمانہ تک محدود رہی ہوں گی۔ اپنی دادی صاحبہ کی ضیافتی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں جو یہ لکھا ہے کہ کسی وقت

"اگر گھر میں کچھ نہ ہوتا تو ہمسایوں سے ادھار سدھار لے کر کام چلا لیتیں، مولنا سے نقد وجنس کا کچھ تکرار نہ تھا، نہ تقاضا نہ وقت بے وقت کا عذر"

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کیفیت کسی خاص زمانے ہی تک محدود تھی۔ مہمانوں کا نہ ٹوٹنے والا تانتا جہاں بندھا ہی رہتا تھا، وہاں اس قسم کی صورتوں کا پیش آ جانا بعید نہیں ہے۔ مولنا حکیم منصور علیخاں مرحوم نے ایک موقعہ پر منجملہ دوسری عادتوں کے سیدنا الامام الکبیر کی ایک عادت یہ بھی جو بیان کی ہے کہ

"قرض اگر لینے کا کبھی اتفاق ہوتا، تو اس کو جلد ادا کر دیتے، اور فرماتے تھے کہ دوستوں کا قرض بہت جلد ادا کرنا چاہیئے" ط۱۹ مذہب منصور

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیوی صاحبہ کو گھر میں کبھی ادھار سدھار لے کر اگر کام چلانا پڑتا تھا تو خود سیدنا الامام الکبیر کو بھی دوستوں سے دستگرداں قرض لینے کی ضرورت بھی وقتاً فوقتاً پیش آ جاتی تھی، الغرض "فتوحات" کی یہ زائد آمدنی جو ہوتی تھی سچ پوچھئے تو جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے خمس کی آمدنی کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے۔

ھو مردود فیکم	وہ بھی تم لوگوں میں واپس ہو جاتی ہے۔

گویا آقا کی زندگی کے اس پاک نمونہ اور مقدس اسوہ کا جلوہ غلام کی زندگی میں بھی اس کی بساط کے مطابق چمک رہا تھا۔ چمکایا جا رہا تھا۔ اسی مکتوب میں جو حضرت مولانا نظام الدین اورنگ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سیدنا شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے نذر و نذور یعنی فتوحات کے

متعلق لکھا تھا۔ اس میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ "البتہ قبول نمایند و بمحتاجے بدہند" آگے بڑے بلیغ پیرایہ میں مشائخ کے فتوحات کے متعلق صحیح نقطہ نظر کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے کہ،

"کارسازی محتاجان بہتر داولی تراست" صنا تکملہ سیرالاولیاء

آخر میں ایک حکیمانہ شعر بھی ہے یعنی

اینکہ ستانی و بیفشانیش   بہتر ازاں ست کہ نستانیش

خاکسار نے اپنی کتاب "نظام تعلیم و تربیت" میں مشائخ کے اس خاص طرزِ عمل پر کافی بحث کی ہے اور حقائق و واقعات کی روشنی میں دکھایا ہے کہ آج لینے والے جن غلط اغراض میں لیکر خرچ کر رہے ہیں، ان سے بزرگوں کے طریقۂ کار کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ بلکہ کہا جاسکتا ہے، کہ

توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم	لیا جائے ان کے خوش حالوں سے اور دیا جائے ان ہی کے ناداروں کو۔

کے نبوی حکم کی ایک تعمیلی شکل وہ بھی تھی، کل یعمل علی شاکلتہ فربکم اعلم بمن ھو اھدٰی سبیلا دل کا حال دلوں کا پیدا کرنیوالا ہی جان سکتا ہے، بہرحال نتیجہ کلیۃً انما الاعمال بالنیات ولکل امرءٍ مانوی کے ساتھ وابستہ ہے۔

کچھ بھی ہو، مذکورہ بالا قیود و شروط کے ساتھ "فتوحات" کے سلسلے میں جو کچھ بھی قبول کر لیا جاتا تھا اس میں شک نہیں کہ دینے والوں ہی کی مہمان داریوں میں اس کو واپس کر کے اکرام ضیف کا فرض کہئے یا ذوق دینی کی تکمیل تو کسی نہ کسی طرح ہوتی رہی، لیکن جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے، یہ آمدنی بھی اتنی نہ تھی۔ دنیا تو دنیا بعض اہم دینی ضرورتوں کی تکمیل میں بھی دشواری باقی ہی رہتی تھی، کتاب "جواب ترکی بترکی" جس میں سیدنا الامام الکبیر کے خیالات کی تعبیر اپنے الفاظ میں مدرسہ عبدالرب کے شیخ الحدیث حضرت والا کے تلمیذ رشید مولانا عبدالعلی صاحب نے کی ہے۔ اس میں ایک موقعہ پر پنڈت دیانند سرسوتی اور سیدنا الامام الکبیر کے مابین مناظرہ وغیرہ کے جو واقعات پیش آئے ہیں، ان

ہی کا تذکرہ کرتے ہوئے اور یہ لکھتے ہوئے کہ ان امور کی باضابطہ روئداد

"سب لکھے لکھائے مدت سے رکھے ہوئے ہیں۔"

شدید ضرورت تھی کہ سب کو شائع کردیا جائے، لیکن آگے وہی اطلاع دیتے ہیں کہ

"یہاں تو بوجہ تہی دستی نہ چھپ سکے نہ چھپنے کی امید۔" ص۳۷

اور یوں بھی سیدنا الامام الکبیر کے تالیفات فائقہ، جن کی ایک ایک سطر مستحق تھی کہ آب زر سے لکھی جاتی، جس قسم کے کاغذ پر وہ عموماً چھپی ہیں۔ اسی طرح طباعت وکتابت، کی جو نوعیت ان کتابوں کی ہے، خود ان ہی سے مولانا عبدالعلی صاحب کے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق ہوتی ہے' ان کتابوں کا حال کتب مدرسہ کا سا نہیں تھا، بلکہ گونہ اپنی ذاتی خودنمائی کا پہلو بھی ان میں پایا جاتا تھا' اسلئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کا قلب مبارک عام چندوں وغیرہ کی آمدنی سے ان کتابوں کی اشاعت پر راضی نہ ہوا' ذرا ملاحظہ فرمائیے "قبلہ نما" جیسی اہم ترین بدیع تصنیف کو' اور اس کی لکھائی چھپائی کاغذ کو' کہ روزمرہ شائع ہونے والے اردو اخبارات بھی آج کل اس سے کہیں بہتر کاغذ اور کتابت کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ "فیوض قاسمیہ" مجموعہ مکاتیب میں ایک خط میں اپنی کتاب "آب حیات" کے متعلق خود سیدنا الامام الکبیر نے بھی کتاب کے کسی طالب کو یہ جواب دیتے ہوئے کہ ابھی یہ کتاب شائع نہیں ہوئی ہے' یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ

" ورنہ بظاہر صورت طبعش قریب الوقوع است " ص۳۷

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے' کہ فتوحات کی آمدنی میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ اپنی کتابوں کی اشاعت کا نظم بھی اس سے فرماتے، یاد ہوگا، دلی کے سید جلال الدین صاحب کا وہ بیان کہ سو رسالے مختلف علوم وفنون ہندسہ ہیئت فلاحت جر ثقیل وغیرہ میں سیدنا الامام الکبیر سے وہ لکھوانا چاہتے تھے، لیکن شرط سید صاحب کی طرف سے یہ تھی کہ ایک ورق سے زیادہ کوئی رسالہ نہ ہو' اور حضرت والا چاہتے تھے کہ ایک جزو تک کی اجازت فی رسالہ دی جائے، سید صاحب نے لکھا ہے کہ اسی کش مکش کی وجہ سے یہ عجیب وغریب علمی کارنامہ حیز وجود میں آنے سے محروم رہا۔

آخر میں سید صاحب بے چارے نے لکھا ہے کہ حضرت والا کی فرمائش کی منظوری دینے سے اس لئے میں مجبور تھا کہ

"بوجہ اپنی بے سروسامانی چھپنے سے رہ جاویگی" مد۲ جمال قاسمی

اگرچہ اپنی بے سرو سامانی کو سید صاحب نے مذکورہ الفاظ میں ادا کیا ہے، لیکن اسی سے خود مصنف کی بھی اسی تہی دستی کا پتہ چلتا ہے جس کی خبر مولانا عبدالعلی صاحب مرحوم نے دی ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ دینی کتابوں کی اشاعت و طبع فتوحات کی آمدنی کا ایک اچھا مصرف ہو سکتا تھا، لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کی تصنیف کا انتساب حضرت والا کی طرف شاید آمدنی کی اس مد سے استفادہ میں مانع آیا، گویا مہمانوں ہی سے جو آمدنی ہوتی تھی، وہ مہمانوں پر صرف ہو جاتی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ قیود و شرائط کی جن آہنی زنجیروں میں غریب فتوحات کی یہ آمدنی حضرت والا کے یہاں جکڑی ہوئی تھی، ان کو دیکھتے ہوئے یہی غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح آپ کی اہلیہ محترمہ جیسی سلیقہ شعار بیوی کو اکرام ضیف کے اس معیار کے قائم رکھنے میں کامیابی حاصل ہوئی، تاہم باوجود ان باتوں کے جہاں تک دیکھا جاتا ہے،

الیس اللہ بکاف عبدہٗ — | کیا اللہ اپنے بندوں کے لئے کافی نہیں؟

کے قرآنی وثیقہ کی تفسیر آخر وقت تک آپ کی زندگی بنی رہی، حج ہی کا سفر دیکھئے، خیال پیدا ہوا اور ایک نہیں حج کے لئے تین طویل سفروں کو حق تعالیٰ نے آپ کے لئے آسان فرمادیا، جن کی تفصیلات کا تذکرہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے حج کے عنوان کے تحت آئندہ کیا جائیگا۔ پھر آپ مجھ ہی سے سن چکے کہ ایک ہی نہیں دو دو لڑکیوں کے فریضہ عقد سے بھی آپ سبک دوش ہوئے، اور گو خود آپ کی طرف سے کچھ نہ کیا گیا، لیکن مہیا کر دیا گیا تقریباً وہ سب کچھ جو آپ کی برادری کے معیار کا اقتضا، تھا اسی طرح دیکھتے ہیں کہ علالت کا طویل سلسلہ جب پیش آیا، جس کے بعد پھر بیمار پڑنے کی ضرورت نہ ہوئی، تفصیل تو اس علالت کی اپنے مقام پر آئے گی، یہاں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خود سیدنا الامام الکبیر کے پاس تو شاید ایک دن کے علاج کا بھی سرمایہ موجود نہ تھا، لیکن اسی علالت اور بیماری کی متعلق

مصنف امام نے اپنی چشم دید شہادت بہ قلم بند کی ہے کہ

"وہ دوائیں مولانا کے لئے بسر ہوئیں کہ جو امرا کو بھی شاید بدشواری میسر آویں"

آخر میں ان کے محتاط قلم سے یہ الفاظ تک ادا ہوئے ہیں کہ

"اور ایسا علاج ہوا کہ جو بادشاہوں کو بھی شاید ہی نصیب ہو" ص۱۲

اور امیر شاہ خاں صاحب مرحوم کی یہ روایت جو ارواح ثلثہ میں پائی جاتی ہے کہ

"مولانا نانوتوی جب مرض وفات میں مبتلا ہوئے تو آپ نے مولوی محمود الحسن صاحب سے فرمایا کہ کہیں سے ککڑی لاؤ"

اب واللہ اعلم واقعہ کی صورت کیا تھی دیوبند وغیرہ میں ککڑیاں کم ہوتی ہیں، یا اس علاقے میں ان کے پھلنے کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا، خاں صاحب کا بیان ہے کہ

"مولوی محمود الحسن فرماتے تھے کہ میں تمام کھیتوں میں پھرا، مگر صرف ایک ککڑی چھوٹی سی ملی"

ظاہر ہے کہ ایک اور وہ بھی چھوٹی سی ککڑی کا ملنا نہ ملنے کے برابر تھا، بیماری میں قاعدہ ہے کہ مریض کی لَو کسی چیز کی طرف جب لگ جاتی ہے تو جب تک خواہش پوری نہ ہو لو لگی ہی رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ یہی کیفیت سیدنا الامام الکبیر کی ککڑیوں کے متعلق ہوگئی تھی۔ اب یہی سننے کی بات ہے مانگ دل میں جس کے پیدا ہوتی ہے وہ دیوبند میں ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ دیوبند سے یہی خبر کہ مولنا نانوتوی میں ککڑیوں کی لَو پیدا ہوگئی ہے، اور وہاں نہیں مل رہی ہے، یہی خبر لکھنؤ پہنچتی ہے، اور بقول خاں صاحب کسی طرح اس کی خبر

"مولوی عبدالحئی صاحب فرنگی محلی کو ہوگئی"

پھر جانتے ہیں کیا ہوا؟ خاں صاحب راوی ہیں

"مولوی عبدالحئی صاحب نے لکھنؤ سے مولنا (سیدنا الامام الکبیر) کی خدمت میں بذریعہ ریلوے ککڑیاں بھیجیں، اور چند مرتبہ بھیجیں" ص۱۷۳

قطع نظر اس سے کہ دیوبند اور فرنگی محل کی علمی و دینی رقابت کے قصوں کو بے جان کرنے کیلئے خاں صاحب کی یہ روایت ایک بہترین وثیقہ کی حیثیت سے استعمال ہو سکتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ علمی نقاط نظر میں تھوڑا بہت اختلاف ہی باہم علما میں کیوں نہ ہو، پھر بھی ذاتی تعلقات پر ان اختلافات کا اثر نہیں پڑتا تھا۔ یہاں تو مجھے یہ دکھانا ہے کہ بڑے سے بڑے امیروں کے لئے جس چیز کا مہیا ہونا دشوار تھا، آپ دیکھ رہے ہیں، جن بندوں کے لئے ان کا مالک کافی ہو جاتا ہے، ان کے لئے اسکی ناز برداریاں کیسی کیسی عجیب و غریب شکلوں میں سامنے آتی ہیں، صرف گگڑیوں ہی کو نہ دیکھئے، بلکہ بھیجنے والے کی شخصیت کا علم اگر آپ کو ہے تو اندازہ کر سکتے ہیں کہ کسی بڑے نواب اور رئیس کے لئے بھی مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ یقیناً یہ انتظام نہ کرتے جو ایک فقیر بے نوا کی دل دہی کے لئے انہوں نے کیا، ریل سے ایک دفعہ نہیں، بار بار گگڑیوں کا بھجوانا مولانا فرنگی محلی کے قلب کے غیر معمولی تعلق کے بغیر ناممکن ہے، اپنے حلقہ اور علاقہ کے جو خود امام تھے جب خدمت لینے والا ان سے بھی خدمت لے رہا تھا، تو اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے علاج و معالجہ کے سلسلے میں جن تماشوں کو ہمارے مصنف امام کی آنکھوں نے دیکھا تھا اور ان ہی دیکھے ہوئے تماشوں سے متاثر ہو کر جن الفاظ میں اپنے احساس کا اظہار انہوں نے فرمایا ہے۔ شاید واقعہ کی تعبیر کی کوئی دوسری شکل ہو بھی نہیں سکتی تھی، اور سچ تو یہ ہے کہ سیدنا الامام الکبیر ہی نہیں بلکہ ان کے والد شیخ اسد علی مرحوم کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے کچھ دیر پہلے مولانا طاہر صاحب کے حوالہ سے جو روایت گذر چکی ہے، الہند کے شیخ الکل حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو شیخ صاحب کی چوکی کے نیچے کی زمین سے اپنے ہاتھوں میں ان کی اجابت کو اٹھاتے ہوئے جب دیکھا جا چکا تھا تو سیدنا الامام الکبیر کی بیماری کے زمانہ کے مشاہدات جو کچھ بھی بیان کئے جائیں، ان میں شک کی گنجائش ہی کیا رہ جاتی ہے۔ اسی موقعہ پر یہ کہتے ہوئے کہ بادشاہوں کو بھی شاید ہی ایسا علاج میسر آسکتا تھا، مصنف امام نے خود بھی فرمایا ہے اور بالکل صحیح فرمایا ہے کہ

"کہاں طمع اور خوف کی بات، اور کہاں عقیدت قلبی" ص۱۲۲

زمین پر رہنے والوں کے قلوب کی یہ عقیدت حب آسمان والے کی محبت کا جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے عکس ہوتا ہے تو آسمان کے احاطے سے باہر کون ہو سکتا ہے

ہر کجا بوئے خدا مے آید ۔۔۔ خلق بیں بے سروپا می آید

اسی قانون کی تو تعبیر ہے۔

اور ایک علاج و معالجہ اور قیمتی دواؤں ہی کا قصہ کیا' سچ تو یہ ہے کہ پیش کرنے کی حد تک سیدنا الامام الکبیر کی مہمان نوازیوں کے سلسلہ میں فتوحات کی آمدنی کی توجیہ میں نے پیش تو کر دی ہے، لیکن دل کی اگر پوچھتے ہیں، تو واقعہ یہ ہے' اس توجیہ سے خود میں بھی مطمئن نہیں ہوں ، جن لوگوں نے دیکھا ہے' یا دیکھنے والوں سے سنا ہے' ان کا احساس یہی تھا اور شاید یہی ہونا بھی چاہئے کہ "فتوحات" کی چادر تو اوپر سے پڑی ہوئی ہے ، ورنہ درحقیقت یہاں بھی کام جو کچھ ہو رہا تھا بجائے زمین کے اس کا رشتہ بھی آسمان سے ملا ہوا تھا۔[1]

مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں ایک موقعہ پر یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ زندگی کے ان ہی ایام میں جب نانوتہ ہی میں حضرت والا کا قیام تھا اور مہمانوں کا سلسلہ وہاں بھی جاری تھا، تو نانوتہ جو بقول مولانا طیب صاحب

"ایسا قصبہ ہے کہ وہاں نہ بازار نہ ہاٹ ، خریدار کے لئے چیز نہیں' اور چیز کے لئے خریدار نہیں ۔"

مگر بایں ہمہ وہی فرماتے ہیں کہ ان کی دادی صاحبہ کو چیزوں کی عدم دستیابی کی شکایت کبھی پیدا نہیں ہوئی' ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ

"بی بی صاحبہ کو اس عذر کے پیش کرنے کا موقعہ کبھی نہیں آیا کہ اس وقت گھی نہیں' نمک

---

[1] مصنف دام مجدہ اب اصلی راستہ پر آ گئے ہیں۔ اہل اللہ کی مرضیات کی تکمیل کا راستہ حقیقتاً اسباب پر دائر نہیں بلکہ براہ راست مسبب الاسباب سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس کی طرف صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا ایک طویل حدیث میں حضور اقدس کو خطاب کر کے اشارہ فرما رہی ہیں ان ربك یسرع فی هواك (یا رسول اللہ آپ کی مرضیات پوری کرنے میں آپ کا پروردگار بہت ہی جلدی کرتا ہے۔ ع۔ می دہد یزداں مراد متقین ۔ محمد طیب غفرلہ

نہیں، یا بازار میں ملتا نہیں، میں کیوں کر کھانا پکاؤں اور کہاں سے جنس لاؤں "
مولانا طیب صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے اور بالکل سچ لکھا ہے کہ

"بڑے بڑے شہروں میں جہاں بازار ہوتے ہیں، وہاں بھی کسی وقت کسی چیز کا ٹوٹا آجاتا ہے، کبھی نمک مصالحہ نہ ہونے سے کھانے میں دیر ہوتی ہے کبھی ترکاری کے بغیر بھی روکھی پھیکی پک جاتی ہے "

لیکن ان ہی کا بیان ہے کہ حکم تھا کہ

"نانوتہ میں دلی کے چاندنی چوک کا سا کھانا لاؤ، اور پھر ایک دن نہ دو دن، نت نئے دن "

آپ سن چکے کہ زندگی کے آخری دنوں تک یہی سلسلہ جاری رہا، ایسی صورت میں خود سوچئے کہ صرف "فتوحات کی آمدنی" کیا مہمان نوازی کی ان خصوصیتوں کی توجیہ کے لئے کافی ہوسکتی ہے؟ اسکے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے، جیسا کہ مولانا طیب صاحب نے بھی فرمایا ہے کہ

"یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟"

اور یہ تو خیر دیکھی نہیں مولانا کی سنی ہوئی باتیں ہیں، لیکن اپنے گھر میں سالہا سال تک جب تک ان کی جدہ ماجدہ طاب ثراہا زندہ رہیں۔ مولانا طیب صاحب یہ دیکھتے رہے، کہ نانوتہ کی زمین کی وہی آمدنی جو اناج کی صورت میں ان کی دادی صاحبہ کی وفات کے بعد آتی رہی، جو عموماً مصارف کے لئے کافی نہ ہوتی تھی، مگر دادی صاحبہ کی زندگی تک وہی فرماتے ہیں کہ کافی ہونا کیا معنی؟ حال یہ تھا کہ

"ختم سال پر جب نیا اناج زمینوں کا آتا تھا، تو ذخیرہ سابقہ کا باقی ماندہ دھڑیوں اور منوں کے حساب سے عزیزوں پر تقسیم فرما دیا کرتی تھیں "

وہی لکھتے ہیں کہ علاوہ عام مصارف اور مہمان داریوں کے ان کی دادی صاحبہ کا ایک دستور یہ بھی تھا

"بلا کسی رسمی محرک (مثلاً شادی بیاہ وغیرہ تقریبوں کے بغیر) اقربا کو جمع کرنا مدعو کرنا"

ان کا خاص ذوق تھا"

بتایا جائے کہ اس کی توجیہ اس کے سوا اور کیا کی جائے کہ "برکت" کے جس لفظ کو عصر حاضر کی خدا بیزار ذہنیتوں نے لفظ بے معنی قرار دے رکھا ہے، وہی اسی گھر میں "حقیقت" کا قالب اختیار کئے ہوئے تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس "حقیقت" سے صرف گھر ہی کے لوگ آگاہ نہ تھے بلکہ اس زمانہ کی یہ حقیقت مسلمہ تھی، مولٰنا طاہر صاحب کی یادداشت میں ایک اطلاع جو یہ دی گئی ہے کہ ان کی دادی صاحبہ کے زمانہ میں جو غلہ آتا تھا، اس کے متعلق عام عقیدہ تھا کہ یہ نہایت صاف پاک کمائی کا برکت دار غلہ ہے، اسی لئے وہی لکھتے ہیں کہ

"اکثر لوگ اس غلہ میں سے تھوڑا سا لے کر اپنے غلہ کی کوٹھی میں لے کر ملایا کرتے تھے"

مشہ طاہری یادداشت

اور میں سمجھتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کی خانگی زندگی کی تنظیم کے سلسلہ میں دیوان جی[1] کے نام سے حضرت والا کے سوانح نگاروں اور حالات کے بیان کرنے والوں نے غیر معمولی سیرت و کردار کی حامل ایک شخصیت کا ذکر کیا ہے۔ یاد ہوگا، کسی موقعہ پر ان ہی کے متعلق یہ لطیفہ گذر بھی چکا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر

---

[1] سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ شیخ زادوں کے کسی اونچے معزز خاندان سے ان کا تعلق تھا، بچپن میں اللہ دیا کے عرفی نام سے مشہور ہوئے۔ اصلی نام محمد یٰسین تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے گھر کا سارا کاروبار چونکہ ان ہی سے متعلق تھا، اس لئے "دیوان جی" کا لقب بھی ان کا نام بن گیا ۱۲ (از محمد طیب غفرلہٗ) یہی دیوان جی (جنہیں بچپن میں ہم نانا دیوان جی کہا کرتے تھے اور ان سے میری والدہ کا قرابت کا تعلق بھی تھا) بعد وفات حضرت نانوتوی رحمہ اللہ دارالعلوم کے کتب خانہ کے ناظم بنا دیئے گئے تھے۔ تقسیم کتب کیا کرتے تھے۔ قد وقامت بلند، رنگ سرخ و سفید چہرہ نہایت وجیہ سفید داڑھی پورے چہرے پر پھیلی ہوئی۔ حضرت والا کی کسی مجلس میں بیٹھے ہوتے اور کوئی اجنبی آجاتا تو انہیں ہی حضرت نانوتوی خیال کر کے اول ان ہی سے مصافحہ کرتا تھا۔ بعد میں پتہ چلتا کہ یہ خادم ہیں مخدوم دوسرے ہیں۔ مظفر نگر میں کسی اہم مناظرے میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ انہیں بھی ساتھ لے گئے اور اسٹیج پر بٹھلا کر مناظرہ شروع کیا۔ مناظر مخالف اور مخالف گروہ نے کہا کہ ابھی تو یہ چھوٹا مولوی ہی بول رہا ہے جس نے ناطقہ بند کر رکھا ہے جب یہ اسٹیج والا بڑا مولوی بولے گا تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟ اور حضرت شیخ کا مقصد بھی ان کے لیجانے سے یہی اثر ڈالنا تھا۔ محمد طیب غفرلہٗ

کے حکم سے مولانا گنگوہی کے دست حق پرست پر بیعت کرنے کے بعد پھر حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی درخواست کی، فرمایا گیا کہ تم تو مرید ہو چکے ہو، بولے آپ کے حکم کی تعمیل میں نے کی ہے، لیکن بیعت تو آپ ہی سے کروں گا، اور یوں حضرت کے حلقہ ارادت میں شریک ہوئے۔

بہر حال سوانح مخطوطہ کے مصنف نے ان ہی دیوان جی کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ

"مولٰنا (سیدنا الامام الکبیر) کے گھر کا سارا کام اکثر آپ ہی کرتے تھے"

اور اس قابل رشک سند کے ناقل بھی وہی ہیں، کہ

"مولانا مرحوم فرمایا کرتے کہ دیوان جی ہمارے ہاتھ پاؤں ہیں"

ظاہری شکل و صورت، وضع و قطع کے لحاظ سے جیسا کہ سوانح مخطوطہ ہی کے مصنف کا بیان ہے دیوان جی

"بظاہر دنیا دار معلوم ہوتے ہیں"

لیکن ان ہی کا بیان یہ بھی ہے کہ

"بزرگی کی جو باتیں ان کے اندر موجود ہیں، وہ بعض بعض اس زمانہ کے مشائخ میں بھی نہیں"

اور آخر میں یہ لکھتے ہوئے کہ وہ اچھے خاصے بزرگ ہیں اپنا ذاتی احساس یہ درج کیا ہے کہ

"دیوبند کے بہت شخص مولٰنا مرحوم (سیدنا الامام الکبیر) کے مرید ہیں مگر سب میں درجہ اول یہی ہیں"

بظاہر ان ساری باتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیاوی کاروبار میں دیوان جی کافی ہوشیار و بیدار مغز ہونے کے ساتھ ساتھ تقویٰ پرہیزگاری، دیانت و طہارت میں بھی غیر معمولی مقام رکھتے تھے۔ اب سوچئے اس بات کو جس نے اپنی ساری دنیاوی ضرورتوں کو ضرورتوں کے پورا کرنے والے اقتدار کے سپرد کر رکھا تھا۔ اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ اسی اقتدار نے بغیر کسی مُزد و معاوضہ کے ایک ایسی شخصیت کی خدمات کو آپ کے لئے مختص کر دیا، جس پر امانت و دیانت ہو، یا عقل و فراست کسی بھی پہلو سے غیر مطمئن ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی تھی، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے

کہ یہ دیوان جی مرحوم

"مولانا کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے، اور خلوص دل سے خدمت کرتے"

اور یہ کہ

"اول سے آخر تک مولنا کے جاں نثار رہے، اور کوئی فعل مولنا کے خلاف نہیں کیا"

اور صرف یہی نہیں جیساکہ وہی لکھتے ہیں کہ

"بہت بڑا حصہ اپنی عمر عزیز کا شیخ کی خدمت میں، اور مرضی میں گذار دیا اور دنیا و مافیہا کی طرف رخ نہ کیا"

بلکہ ان ہی کا بیان یہ بھی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے گھر کا سارا کام وفات کے بعد

"اب بھی اسی شوق و ذوق سے کرتے ہیں"

یہ روایت بھی اسی کتاب میں درج کی گئی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"مرض موت میں یہ بھی فرمایا کہ میرے اہل وعیال کی وارثی دیوان جی کریں گے"

وارثی سے مراد وہی دیکھ بھال اور خدمات ہیں، اور جو امید ان کی ذات سے وابستہ کی گئی تھی، اپنی زندگی کے آخری دنوں تک اسی کی تکمیل میں وہ مشغول رہے۔

کچھ بھی ہو، میں یہی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آخر اس واقعہ کی توجیہ "فتوحات کی آمدنی" سے کیسے کی جائے۔

پس حق یہی ہے کہ خود فتوحات کی بھی نقطۂ نظر اور میلان طبع میں اہلیہ محترمہ کا اتحاد، دیوان جی حاجی محمد یٰسین مرحوم کی مخلصانہ خدمات اور ان کے سوا اور بھی جن جن باتوں کا تجربہ سیدنا الامام الکبیر کی عائلی اور خانگی زندگی میں کیا گیا، توجیہ کرنے والے خواہ ان باتوں کی توجیہ جو کچھ بھی کریں، لیکن میرے نزدیک تو دین ہی کا نہیں، عقل کا اقتضا بھی یہی ہے کہ سب کو

من یتوکل علی اللہ فهو حسبه | جو اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اس کے لئے کافی ہے۔

کے قرآنی وعدہ کا ایفائی مرقع یقین کیا جائے۔ پڑھنے والوں کو چاہیے کہ بجائے کتابی اوراق کے اسی

"مرقع" کے آئینہ میں

ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسک لہا	اللہ جس رحمت کو کھولے، اس کا روکنے والا کوئی نہیں

اور اسی قسم کی دوسری قرآنی آیتیں مثلاً

ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم	اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے تو کوئی تم پر غالب آنیوالا نہیں۔

یا خبر دی گئی ہے کہ

انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا ویوم یقوم الا شہاد	ہم ضرور اپنے رسولوں کی اور اُن کی جو ایمان لائے مدد کرینگے دنیا میں بھی اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہو جائیں گے (یعنی یوم قیامت)

وغیرہ کی عملی تفسیروں کا مطالعہ کریں۔ یقیناً اول سے آخر تک سیدنا الامام الکبیر کی زندگی مبارک کا یہ پہلو قرآن کا ایک زندہ درس تھا۔

شخصی اور عائلی زندگی کے متعلق منتشر معلومات مختلف ذرائع سے جو فراہم ہو سکیں، ایک خاص ترتیب کے ساتھ وہ آپ کے سامنے پیش کر دی گئیں، افسوس ہے کہ جمع کرنیوالوں نے جمع نہیں کیا۔ ورنہ زندگی کے ان ہی دونوں شعبوں کے سلسلے میں ایسی نظیروں اور مثالوں کا کافی ذخیرہ دنیا کے سامنے آسکتا تھا، جن سے خدا ہی جانتا ہے کتنی مشکلات کے حل میں مدد مل سکتی تھی، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اپنے تاثرات کو ظاہر کرتے ہوئے بہت اجمالی باتوں کا تذکرہ کیا ہے مثلاً یہ کہ سیدنا الامام الکبیر کی عام عادتوں اور آپ کی خاص خاص روش طرز عمل کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ

"کبھی کسی کو بہ نظر حقارت نہ دیکھتے، کسی کا عیب ظاہر نہ کرتے، کسی شخص میں ہزار عیب اور ایک ہنر ہو، تو آپ اس کے ہنر کی تعریف کرتے، اظہار عیب نہ فرماتے۔"

بظاہر یہ چند لفظی فقرے ہیں لیکن تجربہ آپ کو بتائے گا کہ ان ہی چند کلیات میں امن و عافیت کی زندگی کا

راز پوشیدہ ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات طیبہ کا جو مجموعہ "کمالات اشرفیہ" کے نام سے موسوم ہے، اس سے بھی سیدنا الامام الکبیر کے متعلق بعض آگاہیاں حاصل ہوتی ہیں ایک جگہ ہے کہ خود اپنے اور اپنے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعض التزامی ضوابط کا ذکر کرتے ہوئے حضرت تھانوی نے فرمایا کہ

"حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو روایات سنتے ہی نہ تھے، شروع ہی میں روک دیتے تھے۔" ص۱۹۱

روایات سے مطلب ادھر ادھر کی باتیں ہیں جنھیں پہنچانے والے عموماً بڑے لوگوں تک پہنچا کر اپنی خیر خواہی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، مثلاً یہ کہ فلاں آپ کی شان میں یہ کہہ رہا تھا آپ کی طرف فلاں بات منسوب کرتا تھا، وغیرہ، سیدنا الامام الکبیر نے اس قسم کی روایات رسانیوں کا دروازہ ہی اپنی مجلس میں بند رکھا تھا، کسی نے کچھ کہنا بھی چاہا تو ابتدا ہی میں روک دیتے، سکون کے ساتھ جینے کا یہ بڑا جوہری گر ہے، اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ دنیا آپ کو جو کچھ کہتی ہو، اس کی خبریں آپ تک پہنچیں اور پہنچ بھی جائیں، تو آپ ان باد فروشوں، ہرزہ درائی کرنے والوں کا کرہی کیا لیں گے۔ بس پتہ کی بات یہی ہے کہ آدمی سرے سے بدگوئی کرنے والوں کی بدگوئیوں کو اپنے آپ تک پہنچنے ہی نہ دے۔ ایذا رسانی جو اس قسم کی ژاژ خائیوں کا مطلب ہوتا ہی ہے، اس کا بہترین جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ان بیہودگیوں کو ان ہی کی گندہ زبانوں تک محدود کر کے رکھ دیا جائے، اپنے کانوں تک پہنچنے کا موقعہ ہی نہ دیا جائے۔

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی سلسلہ میں ایک عادت حضرت والا کی یہ بھی بتائی ہے کہ

"کیسا ہی کچھ نقصان ہو جاتا مگر کبھی چہرہ پر ملال نہ آتا، اور نہ اس سے یہ فرماتے کہ تجھ سے یہ نقصان ہوا، بلکہ اس کی تسلی فرماتے[۱۵]۔"

---

[۱۵] کاش کوئی عملی مثال بھی پیش کر دیتے تو اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی۔ اس موقعہ پر سیدنا الامام الکبیر کے صاحبزادے حضرت مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات جو خود فقیر کے ساتھ گذری (باقی ص۶۰۰ پر)

ان ہی کا بیان یہ بھی ہے، کہ گو

"خود اپنے نفس کے لئے نہ کبھی امیر کے پاس جاتے، نہ کوئی رقعہ اور پرچہ تحریر فرماتے۔"

لیکن اسی کے ساتھ یہ دستور بھی تھا کہ

"اگر اہل غرض حاضر ہو کر عرض کرتے کہ فلاں امیر سے مجھ کو یہ غرض ہے، یا فلاں محکمہ میں نوکری ہے۔ آپ سفارش کر دیجئے، تو آپ فوراً خط سفارش کا لکھ دیتے اور اکثر مکتوب الیہ کو اثر ہوتا اور حاجت مند کی حاجت بر آتی۔" ص۲۸

اور فیوض قاسمیہ مجموعہ مکاتیب میں سے ایک خط میں کسی صاحب کو جواب دیتے ہوئے آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ دیوبند میں کمبل نہیں ملتے، ہاں مظفر نگر میں مل سکتے ہیں لیکن سردست وہاں جانا میرا دشوار ہے لیکن صرف اس لئے کہ فرمائش کی تعمیل کی کوئی صورت نکل آئے ان ہی کو یہ بھی ارقام فرمایا گیا ہے کہ

"با ایں ہمہ ارادہ دارم کہ بہ یکے از احباب بنویسم شاید بہم رسد۔" ص۳۸

(بقیہ ص۵۹۹) اس وقت یاد آگئی، حکومت آصفیہ کے ہائی کورٹ میں اس وقت وہ مفتی کے جلیل عہدے پر سرفراز تھے، منجملہ بہت سی مراعات کے حضور نظام ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی طرف سے ایک خاص استثنائی رعایت ان کے ساتھ یہ بھی تھی کہ خاص شاہی جوڑی سواری کے لئے مقرر تھی، فقیر ایک دن ان کے پاس گیا ہوا تھا، رات ہو گئی اور کافی رات گذر چکی تھی، میں گھر چلنے کے لئے اٹھا، تو فرمایا کہ کرایہ کی سواری راستہ میں اب کہاں ملیگی۔ اور حکم دیا گیا کہ شاہی جوڑی جو اُن کے لئے مقرر تھی اسی پر مجھے گھر پہنچا دیا جائے، میرے ساتھ اور بھی چند حضرات گاڑی میں بیٹھ گئے، گاڑی چلی، راستہ میں اچانک ایک اونٹ سے گاڑی کے گھوڑوں کی مٹ بھیڑ ہو گئی۔ گھوڑے بری طرح بھڑکنے لگے حالانکہ چار چار کوچبین اس لینڈو پر تھے، سب بھاگ گئے، اور گھوڑے رات کی اسی تاریکی میں اچھلنے بھاگنے لگے، چارۂ کار اس کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا کہ ہم لوگ گاڑی سے اتر جائیں بمشکل اترنے میں کامیابی ہوئی، اس کے بعد گھوڑے لینڈو کو لے کر بگ ٹٹ سرپٹ بھاگے۔ بیل گاڑی سے ان کی ٹکر ہوئی، ٹکر کی وجہ سے پولیس کے جوانوں کو پکڑ لینے کا موقعہ مل گیا۔ گاڑی کو کافی نقصان پہنچ چکا تھا۔ ہم ڈر رہے تھے کہ دیکھئے آج حافظ صاحب کا رنگ کیا رہتا ہے واپس لوٹ کر حادثے کی اطلاع دے کر ان کے ردعمل کا ڈرتے ڈرتے انتظار کرنے لگے لیکن دیکھا کہ خلاف توقع حافظ صاحب فرما رہے ہیں خدا نے بڑا فضل کیا کہ آپ لوگوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا، دیر تک وہ ہماری ہی تسلی کرتے رہے۔ گاڑی کے نقصان کا ذکر بھی ان کی زبان پر نہ آیا۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ایک موروثی ترکہ تھا اور سیدنا الامام الکبیر کی یہ عادت تھی ۱۲

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاطر احباب کے آبگینوں کے متعلق آپ کے احساسات کتنے نازک تھے۔ میرا تو خیال ہے کہ مولٰنا طیب صاحب نے اپنی دادی صاحبہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک موقعہ پر جو یہ لکھا ہے کہ کسی کی تکلیف اور مصیبت برداشت نہیں کر سکتی تھیں، اس میں اپنے ذاتی رجحانات کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت والا کی رفاقت اور تربیت کو بھی دخل نہ تھا۔ آپ کے ان ہی خطوط سے جو اتفاقاً محفوظ رہ گئے ہیں پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کے لئے آپ کی دل سوزیوں اور بے چینیوں کا کیا حال تھا۔ مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ایک خط قاسم العلوم میں ہے، حالانکہ خط کا تعلق ایک علمی موضوع سے ہے، لیکن ابتدا میں دوسری ہی باتوں کے ساتھ مولوی فخر الحسن صاحب کو مدرسہ نگینہ کی ملازمت کے چھوٹ جانے کا جو خطرہ پیش آ گیا تھا، اسی کے متعلق تسلی و تشفی کے ان الفاظ کو ارقام فرماتے ہوئے کہ

"خیر نظر بر خدا دارند، و ہیچ نہ ہراسند ان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا اگر درے بحکمت بندمی فرمایند چہ باک کہ درہائے دیگر خواہند کشاد"

پھر ان کو حضرت والا نے یہ عملی مشورہ دیا ہے کہ

"رائے ایں ہیچ مداں چناں مستحسن نماید کہ اول بدہلی رسند و بمنشی ممتاز علی صاحب و منشی عبد الرزاق صاحب ملاقات کنید شاید بمطبع صورتے پیدا آید" مکتوب ا ص ۲

ممکن ہے کہ ان لوگوں کو اشارہ کیا گیا ہو، یا مولوی فخر الحسن کا حضرت والا سے جو تعلق تھا اسی کو کافی قرار دیا گیا ہو۔ اسی سلسلہ میں اس کا بھی پتہ چلتا ہے، جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف مرحوم نے لکھا ہے کہ

"جس بات میں کوئی مشورہ لیتا تھا، تو اس کے نشیب و فراز سے آپ مطلع کرتے تھے کہ اگر ساری عمر بھی اپنی وہ صرف کرتا تو اس قدر باریکیاں معاملہ کی اور پس و پیش معلوم نہ ہوتا" ص ۲۲۵

الغرض سفارش ہو یا مشورہ سب ہی سے مصیبت زدوں کی امداد و اعانت، سیدنا الامام الکبیر کی معلوم ہوتا ہے کہ فطری جبلت اور عام عادت تھی، جب موقعہ ملتا، فائدہ پہنچانے میں کبھی کوتاہی سے

کام نہ لیتے ۔ مولانا منصور علی خاں صاحب نے اسی کا ذکر کرتے ہوئے کہ قصبہ منگلور جو ضلع سہارنپور میں دیوبند کے قریب مشہور قصبہ ہے اسی میں مدرسہ قائم ہوا' لکھتے ہیں کہ

"مدرسہ کے مہتمم نے مولنا صاحب (سیدنا الامام الکبیر) سے مشورہ لیا"

یعنی مدرس کس کو مقرر کیا جائے ۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں ہاپوڑ (ضلع میرٹھ) میں بغرض علاج میں مقیم تھا ' مشورہ طلب کرنے والے مہتمم صاحب کو حضرت والا نے ارقام فرمایا کہ

"ہاپوڑ سے منصور علی کو بلالو' اس کو ضرورت ہے" ۱۸۹

اور اسی مشورہ کی بنیاد پر منگلور کے اس مدرسہ میں حکیم صاحب مدرس مقرر ہو گئے ۔

اسی طرح بیماروں کی عیادت و نگرانی پرسش اور تسلی بھی آپ کا عام شیوہ تھا' سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ

"بیماروں کی عیادت کرتے"

یہ عیادت صرف رسمی عیادت نہیں ہوتی تھی' بلکہ دل سوزی' اور غم خواری جو آپ کی جبلّت تھی وہی کھینچ کھینچ کر مریض کے سرہانے پر آپ کو لاکر کھڑا کرتی رہتی تھی ۔ مولنا منصور علی خاں مرحوم نانوتہ میں تیتر اور مور کا گوشت کھانے کی وجہ سے جب سخت بیمار ہو گئے' تو لکھا ہے کہ حضرت ان کو نانوتہ سے اپنے ساتھ دیوبند لے آئے اور دیوبند پہنچ کر اپنے خاص مخلص مرید و عاشق زار حکیم مشتاق احمد صاحب کو علاج کا حکم دیا' آرام کے خیال سے مولنا منصور علی خان صاحب نے لکھا ہے کہ

"حافظ کلو صاحب کی بیٹھک میں مولنا صاحب نے مجھے بھجوادیا کہ وہاں آرام رہیگا"

ان ہی کا بیان ہے کہ

"عیادت کے واسطے ہر روز مسجد چھتہ سے تشریف لایا کرتے تھے"

حافظ کلو صاحب مرحوم کی بیٹھک کہاں پر ہے' خاکسار چونکہ اس سے ناواقف ہے' اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ چھتہّ کی مسجد اور ان کی اس بیٹھک کا درمیانی فاصلہ

کتنا تھا؟ لیکن آگے اسی کے بعد مولانا منصور علی خاں صاحب نے خود ہی یہ خبر جودی ہے کہ کسی ضرورت سے ان کی علالت کے ان ہی دنوں میں سیدنا الامام الکبیر کو سہارنپور جانا پڑا، ادھر مولوی منصور علی خاں صاحب کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی، گھبرا کر انہوں نے سہارنپور عریضہ روانہ کیا، ان کا بیان ہے کہ خط پانے کے ساتھ ہی سہارنپور سے دیوبند تشریف لے آئے اور

"فوراً آتے ہی میرے پاس تشریف لائے، اور فرمایا کہ تیری وجہ سے میں جلد چلا آیا ہوں" ص۱۸۹

ظاہر ہے کہ ایک معمولی غریب الوطن طالب علم سے زیادہ اس زمانہ میں مولانا منصور علی خاں صاحب کی حیثیت ہی کیا تھی، مگر ان کی اسی غریب الوطنی نے ان کو رحم و کرم کا زیادہ مستحق بنا دیا تھا، اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسروں خصوصاً اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کے ساتھ اس معاملہ میں آپ کے طرزِ عمل کی نوعیت کیا ہوگی، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہی ہے کہ

"اپنے قریبوں کے ساتھ بہت سلوک فرماتے، صلہ رحمی کا بہت خیال[۲] تھا" ص۲۷

خلاصہ یہ ہے کہ خلق اور خالق دونوں ہی کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کے تعلقات کی استواری سچ تو یہ ہے کہ شاید حد اعجاز تک پہنچی ہوئی تھی، دونوں پہلوؤں کو نباہنا اور پوری قوت کے

---

[۱] یہ بیٹھک اب تو موجود نہیں۔ میرے بچپن میں موجود تھی، میرے مکان سے (جو حضرت کا وہی مکان ہے جسے سکونت دیوبند کے لئے حضرت کی اہلیہ محترمہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا) جانب شمال متصل مسجد کمال، اور مسجد چھتہ سے تقریباً سات آٹھ سو قدم کے فاصلہ پر واقع تھی۔ محمد طیب غفرلہ

[۲] میں نے اپنی پھوپھی صاحبہ سے سنا کہ حضرت کی حقیقی پھوپھی دیوبند محلہ ابوالبرکات میں بیاہی تھیں غربت بہت تھی۔ بعض وقت صاف گذر جاتے۔ حضرت وقتاً فوقتاً پھوپھی سے ملنے جایا کرتے تھے اور ہر بار چپکے سے مٹھی بند کر کے انہیں کچھ نہ کچھ دے آتے تھے۔ وہ بھی اللہ کی بندی اس درجہ فراخ حوصلہ تھیں کہ کچھ ملتے ہی اگلے ہی دن چولھے پر کافی رونق آجاتی اور سب اہل محلہ سمجھ لیتے کہ کل کے مولانا کے آنے کا یہ اثر ظاہر ہو رہا ہے۔ یہی کیفیت اور اعزہ کے ساتھ بھی تھی محمد طیب غفرلہ

ساتھ زندگی کے آخری لمحات تک اس طریقہ سے نباہتے چلے جانا، کہ ایک طرف خلق کے متعلق سوانح مخطوطہ کے مصنف اگر اپنی چشم دید شہادت ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں کہ۔

"یتیموں اور شکستہ حالوں کی خبر گیری فرماتے، متوکل لوگوں کی خفیہ خدمت کرتے"

تو خالق کے ساتھ آپ کے تعلق بیدار کا حال یہ تھا، مولانا منصور علی خاں فرماتے ہیں کہ

"نماز با جماعت ادا کرتے، اور تکبیر اولیٰ کو کبھی ترک نہ کرتے، اذان ہوتے ہی نماز کا اہتمام شروع کر دیتے[ل]" ص۱۹۲

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بالکل سچ لکھا ہے کہ

"مولانا مرحوم کی چال سہل ممتنع تھی"

اور جو کچھ انہوں نے دیکھا اور پایا تھا، اسی کو ظاہر کرتے ہوئے بے ساختہ ان کے قلم پر یہ الفاظ آ گئے ہیں

"آپ کے (سیدنا الامام الکبیر کے) اکثر حالات مناسبت رکھتے تھے حالات فیض آیات، حضرت سید الکونین، رسول الثقلین، ختم المرسلین، محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے" ص۱۵

غلام کی زندگی میں آقا کے خط و خال کی یہی جھلک ہے، جس کی طرف مسلسل اشارے کرتا ہوا چلا آیا ہوں، اور اب آپ کے ذاتی حالات، اخلاق و عادات کی اس بحث کو اسی

لہ میں نے اپنی دادی صاحبہ مرحومہ سے سنا فرماتی تھیں کہ عادت حضرت کی یہ تھی کہ اذان میں مؤذن کا کلمہ حی علی الصلاۃ جوں ہی کان میں پڑتا تو لیٹے ہوتے تو فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور کسی کام میں ہوتے تو اسی دم اس کام کو چھوڑ کر نماز کی تیاری میں مشغول ہو جاتے بعینہ یہی حال احقر نے دادی صاحبہ مرحومہ کا دیکھا۔ الصلوٰۃ لوقتہا کی پابندی ان کی مثالی تھی۔ اذان کی آواز سنتے ہی ہر کام کو (جس میں مشغول ہوتیں) اس طرح ایک دم چھوڑ کر نماز میں لگتیں کہ گویا انہیں اس مشغلہ سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں، اور اذان کے بعد ہر ایک سے اجنبی بن جاتیں

محمد طیب غفرلہ

چشم دید شہادت پر ختم کرتا ہوں، سیدنا الامام الکبیرؒ ہی کا ایک بیان اساتذہ سے کانوں تک پہنچا ہوا ہے، فرمایا کرتے تھے کہ درزی کو نمونہ کا کوئی کپڑا مثلاً قمیص اچکن دے دیا جاتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ اسی نمونے پر کپڑے سیتے چلے جاؤ، خراش تراش سلائی وغیرہ کے اعتبار سے جس حد تک اس نمونے کے مطابق کپڑوں کے سینے میں درزی کامیاب ہوگا، اسی حد تک سلانے والے سے مزد و انعام کا مستحق ہوگا۔" اس تمثیل کو پیش کرکے ارشاد ہوتا، کہ" اسوۂ حسنہ محمدیہ" قدرت کا بخشا ہوا نمونہ ہے، ساری انسانیت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اپنے آپ کو رنگ میں ڈھنگ میں چال میں چلن میں فکر میں نظر میں اسی نمونے کے مطابق ڈھالتے چلے جائیں۔ جو جس حد تک اس نمونہ کے مطابق ہوگا اسکو اسی حد تک اپنے محبوب کی محبوبیت سے حصہ عطا کیا جائے گا ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ اور اتبعونی یحببکم اللہ کی یہی تفسیر فرمائی جاتی تھی۔ گویا جو کچھ کہا جا رہا تھا، وہی کیا جاتا تھا۔ فصلی اللہ تعالیٰ علی النبی الخاتم المصطفیٰ وعلیٰ آلہ واصحابہ و الذین اتبعوھم باحسان۔

شخصی زندگی کا ایک پہلو یعنی سیدنا الامام الکبیرؒ کی آخری علالت، اور اس علالت کا آخری نتیجہ جس کے بعد علیل و بیمار ہونے کا قصہ ہی ختم ہوجاتا ہے اگرچہ بعض بعض مواقع میں کسی دوسرے مسئلہ کے سلسلہ میں اس" فاجعہ کبریٰ" کے بعض اجزاء کا ذکر گذر ا بھی ہے، لیکن درد کی یہ داستان ایک مستقل داستان ہے۔ چاہئے تو یہی تھا کہ ذاتی حالات کے سلسلے میں اس کو بھی درج کردیا جاتا، لیکن جی یہی چاہتا ہے، کہ جو کچھ ابھی لکھنا ہے، اس سے فارغ ہونے کے بعد آخر میں ماتم کی یہ صف بچھائی جائے۔ کیونکہ سیدنا الامام الکبیرؒ کی علالت کا یہ آخری حادثہ اگرچہ کوئی نیا واقعہ نہ تھا لیکن موت العالِم موت العالَم کا صحیح مرقع تھا۔

باوجود اعتدال قوٰی، اور استواری اعصاب کے جن کی تفصیل اپنے موقعہ پر کرچکا ہوں، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بجائے سواری کے عموماً پیدل چلنے کے عادی تھے۔ سخت سے سخت سرد موسم اور کڑا کے کے جاڑوں میں میدانی تالابوں میں غسل کرتے تھے، لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ جہاں اختیاری سعادتوں میں اپنے محبوب پیشوا صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو کافی حصہ ارزانی ہوا تھا، وہیں اضطراری سعادتوں کے نمونوں سے بھی ان کو محروم نہیں رکھا گیا، صدیقہ عائشہ ام المؤمنین رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے حوالہ سے امام احمد بن حنبل کی مسند میں یہ روایت پائی جاتی ہے، ام المومنین فرماتی تھیں

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یسقم عند آخر عمرہ مسند احمد ج ۶ ص۱۶۷	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر عمر میں کچھ نہ کچھ علیل رہتے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے خطوط جو عموماً وفات سے کچھ دن پہلے لکھے گئے ہیں، ان میں تفقد حال کرنے والوں کو اس قسم کی اطلاعیں حضرت والا کی طرف سے دی گئی ہیں۔ ایک خط جو حکیم عبدالصمد صاحب نامی کسی بزرگ کے نام ہے، ارقام فرماتے ہیں

"آپ کا عنایت نامہ پہنچا تھا، مگر امراض خفیفہ کی آمد و شد میں جو اس سال کسی قدر رہی، ناتوانی اکثر رہتی ہے" ص۴۲ فیوض قاسمیہ

معلوم نہیں یہ حکیم عبدالصمد صاحب کون تھے، اور کہاں رہتے تھے، لیکن خط کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں وہ تھے وہاں کے باشندوں کی طرف سے حضرت والا کی تشریف فرمائی کی تمنا پیش کی گئی تھی۔ اسی کا جواب دیتے ہوئے اور علالت کا عذر پیش کرتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ

"مدت سے احباب دہلی متقاضی ہیں، ادھر اپنا شوق بھی ادھر کو کھینچتا ہے، اس لئے ارادہ تھا کہ دیوبند پہنچا تو اُدھر سے اُدھر

دھلی بھی ہو آؤں گا۔ مگر تواتر امراض کے باعث یہ ارادہ ملتوی رہا۔" ص۱۴۷

ایک اور گرامی نامہ جو "جمال قاسمی" والے مجموعہ میں پایا جاتا ہے، اور حسن اتفاق سے "تاریخ بھی خط کی پیشانی پر پائی جاتی ہے، یعنی ۱۲۹۵ھ میں لکھا گیا ہے گویا سال وفات ۱۲۹۷ھ سے دو سال پہلے ارقام فرمایا گیا ہے، اسی کے شروع میں سید جمال الدین صاحب جن کے نام یہ خط ہے، تاخیر جواب کی معذرت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"کیا کروں ان دنوں یہ خستہ مبتلائے بلا تھا، ڈاڑھ کے درد نے ایسا بے تاب و نتواں کر رکھا تھا کہ کیا عرض کروں، اس کے بعد ناتوانی نے کچھ ہونے نہ دیا، وہ کچھ کم ہوئی، تو کچھ کچھ اعضاء شکنی اور خفیف سا بخار دم ساز رہنے لگا۔" ص۸

اور مصنف امام نے آپ کے مرض الموت کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ

"اور مولانا نے برخلاف عادت اس مرض میں جو علاج ہوا، اس کو قبول کیا، جو دوائی کھلائی، کھائی، جو تدبیر کسی نے کی اس کو کر لیا۔" ص۴۴

اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ اکثر و بیش تر علاج و معالجہ سے گریز ہی کا جذبہ آپ پر ابھی ان بیماریوں کے سلسلہ میں غالب رہا، علاج اور تدبیر کچھ کرتے بھی تھے تو اس کی نوعیت کا اندازہ خود آپ ہی کے اس بیان سے ہوتا ہے، جو "فیوض قاسمیہ" کے ایک خط میں پایا جاتا ہے۔ خط کی زبان فارسی ہے اور آپ کے مشہور مخلص دوست مولانا حکیم ضیاء الدین کے نام ہے، اسی میں اپنی بیماری کی خبر ان الفاظ میں دی ہے،

"در اول رسید مبتلائے بخار لرزہ شدہ بودم، دو نوبت بشدت

گذشت، بہجوم استفراغ وغلبہ حرارت در سینہ وشدت تشنگی
چنان بیتابم نمود کہ تابِ ضبط ہم نمی ماند اول روز پس از
ہفت صد شاخہا تشنگی فرو شد و در نوبت دوم بہ شش صد
تدارک آن شد"

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاید ملیریا کا حملہ ہوا تھا' جاڑے کے ساتھ بخار آتا تھا۔ مگر جانتے ہیں' کہ " دو نوبت بشدت گذشت" کا جو دورہ لرزہ بخار کا آپ پر پڑا تھا' اس کے علاج میں کیا تدبیر اختیار کی گئی' خود ہی ارقام فرماتے ہیں' کہ

"آخر کار از صبح روز دوم' بعلاج مسنون' غسل از آب تازہ
تدبیرہ کردہ شد"

جاڑا اور بخار کے اس شدید دورے میں نہانے کا آدمی تخیل بھی نہیں کر سکتا' لیکن " علاج مسنون " کی عقیدت نے اسی علاج کو آسان بنا دیا اور آب تازہ سے غسل فرمایا گیا' خدا جانے اطبا اور ڈاکٹروں کے نزدیک اس طریقۂ علاج کے اختیار کرنے کا نتیجہ کیا ہونا چاہئے۔ لیکن حضرت والا خود ہی اطلاع دیتے ہیں کہ

" خداوندِ حقیقی بہ برکتِ ایں عمل شفائم بخشید" صلہ

سیرتِ قاسمی کے ایک فانی یعنی حضرت شیخ الہند مولٰنا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کو خاکسار نے بھی ایک دفعہ دیکھا' شدید بخار میں مبتلا تھے' شدت حرارت نے جسم مبارک پر ہاتھ رکھنا بھی دشوار تھا' لیکن اسی حال میں خوب یاد ہے' حضرت شیخ الہند مدرسہ تشریف لائے اور مدرسہ کی مسجد کی مشرقی سمت میں جو کنواں ہے' اسی کے پاس آکر

بیٹھ گئے۔ طلبہ موجود تھے، حکم دیا گیا کہ ڈول نکالتے جاؤ اور مجھ پر ڈالتے جاؤ، غالباً اس عمل میں شرکت کی سعادت اس فقیر کو بھی ہوئی تھی۔ صحیح طور پر تو نہیں کہہ سکتا، لیکن حافظہ اگر غلطی نہیں کر رہا ہے تو کہہ سکتا ہوں کہ چمڑے کے بڑے ڈول سے تابڑ توڑ یکے بعد دیگرے تقریباً اسّی ڈول ڈالے گئے، طلبہ بھرتے جاتے تھے، ایک تھکتا تھا، تو دوسرا گھرنی کو گھمانے میں مصروف ہو جاتا تھا، حضرت بخار کی اسی حالت میں ڈول پر ڈول اپنے اوپر انڈلواتے چلے جاتے تھے۔ کانپ رہے تھے، میں حیران تھا سوچتا تھا، دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے بس کرنے کا حکم دیا گیا۔ آنکھیں سرخ تھیں، اُن کی سرخی کا جمال آج بھی قلب کے لئے مایۂ نشاط و سرور ہے، اُٹھ گئے کپڑے سے بدن پونچھا گیا۔ جہاں تک خیال ہے، بخار کا نام بھی اس عمل کے بعد باقی نہ رہا۔

بہر حال مصنف امام کے بیان سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عموماً علاج و معالجہ کے سیدنا الامام الکبیر عادی نہ تھے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس سے غرض ان کی یہی ہے کہ عام طبی علاج کے عادی نہ تھے۔ پھر یا علاج ہی نہ کرتے تھے، اور دفع مرض کا موقعہ طبیعت ہی کو عطا فرمایا جاتا تھا، یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ براہ راست

واذا مرضت فھو یشفین	اور جب میں بیمار پڑوں تو وہ ہی مجھے شفا دے گا۔

کے تحت اپنے آپ کو ڈال کر شافی حقیقی سے شفاء کی نعمت حاصل کرنے کے عادی[۱]

[۱] اس سلسلہ میں حضرت والا کی عام زندگی پر (جو آخر کی اس زندگی سے پہلے کی رفتار ہے، جس پر متن میں بحث کی جا رہی ہے) ذیل کے اس واقعہ سے کافی (باقی صفحہ ۶۱۰ پر)

تھے، اور علاج بھی کرتے تھے، تو وہ طبیبوں اور ڈاکٹروں والا علاج نہ ہوتا تھا، بلکہ صحت میں جس کی زندگی اُن کے لئے واحد نمونہ بنی ہوئی تھی، مرض میں بھی

(بسلسلہ صفحہ ۶۰۹) روشنی پڑسکتی ہے۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ حضرت والد مرحوم بیمار ہوتے تو معمولی بیماری میں بھی کول کراہ سے بے تابی اور بے چینی کا اظہار زیادہ کرتے۔ جیسے کوئی عظیم مرض لاحق ہوگیا ہے۔ ایک بار ملیریا میں مبتلا ہوئے اور حسب عادت کول کراہ اور ہائے وائے بہت کر رہے تھے تو میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضرت یہ اتنا آہ دبکا تو بظاہر صبر و توکل اور تسلیم و رضا کے خلاف معلوم ہوتا ہے، تو قدرے مسکرا کر فرمایا کہ بھائی میں نے اپنے تین بزرگوں کو دیکھا ہے اور دیکھا ہی نہیں برتا بھی ہے۔ حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب (جو اُن کے شیخ تھے) حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ (یعنی حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) اور حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (جو اُن کے اُستاد حدیث تھے) بیماری میں تینوں کے تین حال تھے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو معمولی سی بیماری میں ہائے وائے اتنا کرتے کہ مکان کو سر پر اٹھا لیتے۔ عرض کیا گیا کہ حضرت کیا یہ تسلیم و رضا کے خلاف نہیں؟ فرمایا کہ تو کیا میں اپنے اللہ کے سامنے بہادر بنوں کہ آپ کے ابتلاء و امتحان کے تحمل کی مجھ میں بڑی طاقت ہے۔ یہ کہہ کر فرمایا کہ عبدیت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے ابتلاء کے سامنے بندہ اپنے عجز و بے چارگی اور ناتوانی کو پیش کرے کہ خداوندا میں تیری آزمائش کو اٹھانے کے قابل نہیں، بہت ہی ضعیف و ناتواں ہوں، تو بلا آزمائش ہی مجھ پر فضل فرما دے۔ پھر والد مرحوم نے فرمایا اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شان یہ تھی کہ بڑی سے بڑی بیماری سر پر آجاتی تو کبھی زبان سے اُف نہ فرماتے اور اس قدر خموشی اور سکون سے گذارتے کہ بہت سی بیماریوں کا تو پتہ بھی نہ چلتا۔ علاج و معالجہ تو بعد کی بات ہے۔ دفع مرض کے بعد کبھی خود ہی زبان سے نکل جاتا تو گھر اور باہر والوں کو پتہ چلتا کہ بڑی شدید بیماری آئی تھی، اور فرماتے کہ اللہ کی طرف سے جو حالت بھی آئے اُسے صبر و تسلیم کے ساتھ گذار دے کہ ع ہرچہ از دوست می رسد نیکوست۔ فرمایا کہ عبدیت کا تقاضا یہی ہے کہ دوسروں کے سامنے چون و چرا نہ کرے اور معاملہ شانِ مطلق پر چھوڑ دے (باقی صفحہ ۶۱۱ پر)

اسی "نمونہ" کو اختیار کرکے اپنے مرض کو بھی صحت ہی بنا لیتے تھے اور آخری علالت میں جس طرزِ عمل کو بقول مصنف امام اختیار فرمایا گیا، یعنی جو دوائی کھلائی کھالی، اور جو تدبیر کسی نے کی اس کو کرلیا، اگر ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مذکورہ بالا روایت کے اس جزء کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے جو مسند احمد ہی میں گذشتہ بالا الفاظ کے بعد ہے کہ

کانت تقدم علیہ وفود العرب من کل وجہ فتنعت لہ الانعات وکنت اعالجہا لہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہر طرف سے عرب کے وفود کا سلسلہ لگا ہوا تھا، اور یہی آنے والے لوگ آپ کے لئے دوائیں بتاتے اور میں ان دواؤں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تیار کیا کرتی تھی۔

تو عادت کے برخلاف ہر بتانے والی دوا کے استعمال میں بھی کیا وہی رنگ نظر

(بسلسلہ صفحہ ۶۱۰) اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے بارہ میں فرمایا کہ وہاں بیماری آتی تو نہ سکوت تھا نہ شور بلکہ علاج و معالجہ کی طرف توجہ فرماتے اور اس بارہ میں کاحد من الناس ہو جاتے اور فرماتے کہ عبدیت کا تقاضا یہی ہے کہ منشط و مکرہ میں اتباع کا دامن نہ چھوڑا جائے، اور مرض میں علاج مسنون کیا جاتا رہے۔ یعنی اُن کے یہاں ظواہر سُنّت پر عملدرآمد ہی عبدیت کی روح تھی، یہ تینوں واقعے بیان کرکے فرمایا کہ بھائی میں بیماری کی حالت میں کبھی اپنے شیخ کی سنت پر عمل کرتا ہوں اور کبھی اپنے ان دونوں بزرگوں کے طریقہ کو معمول بناتا ہوں۔ اس واقعہ سے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی عام عادت فنائیت اور محوِ رضا و تسلیم ہو جانا نکلتی ہے۔ گویا آپ مظہر تام تھے۔ انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ کے ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

محمد طیب غفر لہٗ

نہیں آتا جس رنگ پر جینے اور مرنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا، بلکہ اسی سلسلہ میں مصنف امام ہی نے یہ خبر بھی جو دی ہے کہ ایک طرف یونانی طب کے ماہروں کا مشورہ جہاں قبول فرمایا جاتا تھا، وہیں انگریزی طریقۂ علاج ڈاکٹری جو اس زمانہ کے لحاظ سے ایک نئی چیز تھی اس سے بھی انکار نہیں فرمایا گیا، بلکہ آئندہ مرض الموت کی تفصیلات کا تذکرہ جہاں کیا جائے گا، وہاں معلوم ہوگا کہ علاج کے ان دونوں طریقوں کے نمائندوں کو ایک ہی نظر سے دیکھا گیا۔ طبقات ابن سعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری زندگی کی علالتوں کے سلسلہ میں یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں کہ

کانت العرب تنعت له فیتداوی بما تنعت له العرب وکانت العجم تنعت له فیتداوی	عرب کے لوگ دواؤں کی نشاندہی کرتے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو استعمال فرماتے، اور عجم والے بھی ان دواؤں کی نشان دہی کرتے تو
ص۱۱۶ الجزء الاول من القسم الثانی۔	ان کو بھی استعمال فرماتے۔

اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مانوس اور غیر مانوس یعنی عربی اور عجمی علاج کے دونوں طریقوں کو اختیار فرمایا گیا تھا، اگر طبقات کی اسی روایت کا پرتو سیدنا الامام الکبیر کے مذکورہ بالا طرز عمل میں سوچنے والوں کو نظر آ رہا ہو، تو کیا اس کو بے بنیاد ٹھہرانے کی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے؟

جلد اوّل تمام شد

مناظر احسن گیلانی

رجب ۱۳۵۴ھ

برائٹ پروسس سٹریٹ ۲۲ ریوے روڈ لاہور